

بسم الله الرحمن الرحيم

# عشق زار

یہ بارگاہِ عشق ہے، بے خوف ہو کے آ۔۔۔

زارون علی

## نوت:

جملہ حقوق بحق مصنف اور راہ ادب رائٹر زالیسو سی ایشن آف پاکستان محفوظ ہیں۔ بن اجازت ناول نقل کرنے والے کے خلاف کاپی رائٹ ایکٹ کے تحت سائبہر کرامہ سے رجوع کیا جائے گا۔

میں عشق زار کی تشهیر لکھ نہیں سکتا

خواب لکھتا ہوں تعبیر لکھ نہیں سکتا

میرے بزرگوں کی پہچان ہیں یہ میرے اخلاق

میں اپنے آباء کی جاگیر لکھ نہیں سکتا

غريب بستي جو لکھتا ہوں ہاتھ روتے ہیں

میں اس نگر کا فقیر لکھ نہیں سکتا

میر ااثاہ ہیں یہ شعر یہ سخن یہ دیوان

ملی جواس سے ہے تو قیر لکھ نہیں سکتا

میرے ارمان قیدی ہیں میرے دل کے قفس میں

میں ان کے پاؤں کی زنجیر لکھ نہیں سکتا

---

عجیب شخص ہوں زارون میں خوابوں کی ...

اثاث لکھتا ہوں تعمیر لکھ نہیں سکتا ....

زارون علی

-----

کہانیاں زندگی کا ایک اہم جزو ہیں جو ہمیں اپنے کرداروں سے اس طرح جوڑ دیتی ہیں کہ ہمیں ان پہ گزرتا ہر لمحہ اپنی زندگی کی عکاسی کرتا نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم انہی کرداروں میں کہیں زندہ ہوں۔ ہمارا ہنسنا، رونا حتیٰ کہ ہماری سوچ تک ان صفحات سے جا ملتی ہے جن میں لکھے گئے الفاظ نہ صرف ہماری زندگی میں ادھوری رہ جانی والی خواہشات کو پورا کر رہے ہوتے ہیں بلکہ وہ ہمیں ان مایوسیوں سے نکالتے ہیں جو ہم نے اپنے ارد گرد اس وجہ سے بکھیریں ہوتی ہیں کہ جو ہم چاہتے تھے وہ نہیں ہوا یا جو ہمیں چاہیے تھا وہ نہیں ملا۔

ہم نرم دل رکھنے والے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں جو نہ چاہتے ہوئے بھی افسانوی دنیا میں اس قدر کھو جاتے ہیں کہ دل کرتا ہے کہ کاغذ پر لکھے ان کرداروں کی زندگی میں کچھ برانہ ہو، جو کسک یاد کھہ ہماری زندگی میں آئے ان کی زندگیوں میں نہ آئیں در حقیقت ہم ان داستانوں میں کبھی دکھ دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ کوئی محبت کرتا ہے تو اُسے اپنی محبت مل جائے، کوئی پر خلوص ہے تو اُسے سب پر خلوص ہی ملیں، کوئی دھوکہ دیتا ہے تو مكافات عمل سے اُسے بھی سزا ملے، معصومیت کے بد لے معصومیت اور تلخی کے بد لے تلخی، پر یہ سب تو ہماری سوچ ہے، کرنا تو مصنف کو ہی سب ہوتا ہے اور جو وہ لکھتا ہے بہت سوچ سمجھ کے لکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کہانی کو اصل زندگی کے قریب تر بنانے کے لیے کو نسانقطعہ اہم ہے۔

انسان کی فطرت میں یہ چیز شامل ہے کہ وہ ہمیشہ لا حاصل کی جانب کھنچتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو چیز اُسے نہیں ملی وہ اُس کے لیے بہت اہم اور بہتر تھی مگر یہ صرف وقتی سوچ ہوتی ہے کیونکہ ایک ذات جو کامل اور بہتر علم رکھنے والی ہے وہ زندگی کے کسی موڑ پر اُسے اس خلل سے باہر نکال دیتی ہے کہ جو وہ چاہتا تھا وہ غلط تھا اور جو اللہ پاک نے اُس کے لیے کیا وہ نہ صرف بہتر بلکہ بہترین تھا اس لیے کبھی لا حاصل کے پیچھے بھاگ کر اپنی زندگی کا حاصل مت گنوایئے اور ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کریں کہ اُس نے آپ کو جس حال میں رکھا ہے وہ سب سے بہترین ہے۔ بے شک اللہ پاک کے علاوہ نہ

کوئی آپ کو جان سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے اور جو فیصلہ وہ کرتا ہے اُس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ کبھی بھی آپ کے لیے غلط ہو سکتا ہے اس لیے کبھی بھی خود کو ما یو سیوں کے اندر ہیروں میں نہ دھکلیں اور ہمیشہ اپنی امیدوں اور صلے کا اختیار اُس سے ہی دیں جو سب کچھ عطا کرنے والا ہے۔

---

اسلام آباد کی خوبصورتی میں گھری و سیچ و عریض عمارت جسے دیکھتے ہی نور کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں تھیں۔ ”اللہ یہ یونیورسٹی تو بہت بڑی ہے“۔ وقفہ و قنے سے موجود عمارتوں کا جائزہ لیتے ہوئے اُس نے سوچا اور ولیسے ہی حیرت سے ہر چیز کو دیکھتے آگے بڑھی۔

”بابا کو میں نے کہا بھی تھا کہ میرے ساتھ چلیں پر نہیں بیٹی کے لیے نا تم، ہی نہیں ہے اور وہ رضا بد تمیز، میں نے مدد کا کہا تو آپی میں لیٹ ہو جاؤں گا اور اب راستے میں کسی سہیلی کی مدد کرنی پڑ جائے تو دل و جان شارکر دے گا جیسے اُس سے زیادہ ثواب کا کام کوئی نہیں“، غصے سے بڑھاتے اپنی سست طبیعت کی وجہ سے وہ با مشکل سامنے موجود ڈپارٹمنٹ کی بلڈنگ تک ہی پہنچ سکی تھی۔

---

”اُفف اب میں اپنا ڈپارٹمنٹ اور کلاس کیسے ڈھونڈوں، ہم کسی سے پوچھ لیتی ہوں“، خود کلامی کرتے وہ اپنی سوچ کی تکمیل کے لیے سامنے سے آتی ایک لڑکی کی جانب بڑھی اور اُسے ادب سے مخاطب کیا۔

”ایکسکیو زمی آپ، وہ آپ...“  
 ”ایکسکیو زمی مس، یہ آپ نے آپی کس کو کہا؟ میں آپ کو آپی نظر آتی ہوں کیا؟ تقریباً آپ سے دو، چار سال چھوٹی ہی ہوں گی میں، اس لیے پلیز یونیورسٹی میں آکر خود کو نئی منی بچی سمجھنا بند کر دیں“، نور کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اُس لڑکی نے اپنے لہجے میں طنز لیے کہا اور ایک غصے بھری نظر اُس کے چہرے پہ ڈالتے اپنے راستے پر آگے بڑھ گئی۔

”توبہ کتنے بد تمیز لوگ ہیں یہاں کے“، اپنی بے عزتی پر آنکھوں میں نمی لیے اُس نے سوچا اور خود کو سنبھالتے ایک اور لڑکی کی جانب بڑھی تاکہ اُس سے کمپیوٹر سائنس ڈپارٹمنٹ کا پوچھ سکے۔  
 ”ایکسکیو زمی سسٹر“، اب کی بار اُس نے خود کو آپی کہنے سے باز رکھا اور دوسرا لڑکی کو مخاطب کیا جس کی پشت اُس کی طرف تھی۔

”سسٹر پلیز آپ مجھے...“، نور نے ایک بار پھر سے بڑی نرمی اور لحاظ سے اپنی بات مکمل کرنے کی کوشش کی پر اُس کے پلٹنے ہی اُس کے الفاظ منہ میں رہ گئے۔۔۔

”آئی ایم سوری مجھے لگا کوئی لڑکی ہے“، اس کے چہرے پر ہلکی شیود کیختے ہی نور کو کچھ گڑ بڑ محسوس ہوئی تب ہی دوسری طرف سے کچھ سننے سے پہلے ہی اس نے معذرت کی۔

”تو کیا ہوا؟ آپ جیسی حسین پری کے لیے تو مجھے لڑکی بننے میں بھی کوئی قباحت نہیں“، دوسری طرف سے بھر پور گرم جوشی کا مظاہرہ کیا گیا اور اس لڑکی نما لڑکے نے اپنے لمبے بالوں کو ایک ادا سے پچھے کیا جس کے دھوکہ میں آگر نوراً سے سستر کہہ بیٹھی تھی۔

”وہ میں... نہیں میں کسی اور سے پوچھ لیتی ہوں“، اس کی بے ہودگی پر گھبرا تے نور نے جلدی سے بات مکمل کی اور اپنی کتابیں مضبوطی سے تھامے تیز تیز قدموں سے لان کی جانب بڑھی۔

”اففف توبہ کس مصیبت میں پھنس گئی ہوں یہاں تو سب ہی پاگل ہیں یا شائد مجھے بنار ہے ہیں“، بینچ پر بیٹھتے ہی اس نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کو بحال کرنے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا جو گھبراہٹ اور بے بسی سے کسی بھی جگہ، کسی بھی وقت بہہ نکلتے تھے۔

”اللہ پلیز میری مدد کریں پہلے ہی گھر کی سینگ کی وجہ سے میں نے پچھلے ایک ہفتے سے کوئی کلاس نہیں لی اور اگر آج بھی مجھے کلاس نہ ملی تو یہ یونیورسٹی والے مجھے ویسے ہی فارغ کر دیں گے“، پریشانی سے سوچتے ایک بار پھر سے آنسوؤں نے آنکھوں کی باڑ توڑی جنہیں لوگوں کی نظر پڑنے سے پہلے ہی اس نے اپنے دوپٹے سے صاف کیا۔

”میں نے بابا سے کہا بھی تھا کہ میرے ساتھ چلیں مجھے نہ تو یہاں راستوں کا پتا ہے اور نہ ہی میں کسی کو جانتی ہوں جو میری مدد کر دے پر بابا کو بھی آج ہی سارے کام یاد آنے تھے اور رضاۓ تو میں کبھی معاف نہیں کروں گی“، سرخ ہوتی ناک کو ایک بار پھر سے دوپٹے سے رگڑتے اُس نے خود کلامی کی اور خود کو سنبھالتے ہوئے ایک بار پھر سے کسی ایسے انسان کی تلاش میں نظر دوڑائی جو پہلے والے دونمونوں کی طرح نہ ہو۔

”ہاں یہ کچھ اچھا لگ رہا ہے، شکل بھی اچھی ہے بلکہ کافی پیارا ہے“، ایک سائیڈ پپ بیٹھے لڑکے کی طرف نظر پڑتے ہی نور نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا اور اپنا بیگ اور کتابیں اٹھائے اُس کے قریب آئی جو اپنی ہی دنیا میں مگن کتاب کھولے کچھ پڑھ رہا تھا۔

”ایکسیکیو زمی بھائی“، اُس کے قریب رک کر نور نے ایک بار پھر سے اپنی ناک کو رگڑا تو مقابلے کسی انجان آواز پر سر اٹھاتے اُس کے تعاقب میں دیکھا۔

”پلیز آپ میری مدد کر دیں گے؟“، اپنی بھوری آنکھوں سے مقابلے کی کالی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے نور نے دنیا جہاں کی معصومیت اپنے چہرے پر سجائی تو زارون نے اُس کا سرتاپاڈ کے جائزہ لیا جو پنک کلر کی گھٹنوں تک آتی فراک کے ساتھ سفید ٹراوزر پہنے، اُسی رنگ کے دوپٹے کے

ساتھ جاپ کی طرح لیے گئے دو پٹے میں میک اپ سے عاری چہرہ لیے اُسے سب سے مختلف اور پاکیزہ لگی۔

”بھائی کیا ہوا؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“ اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر نور کو بُرا لگاتب ہی اُس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہراتے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا جو جلدی سے نظریں ہٹاتے نہیں میں سر ہلا گیا۔

”پچھو نہیں، کیسی مدد چاہیے آپ کو؟“ کتاب بیگ میں رکھ کر اُس نے اُس کی طرف دیکھنے سے مکمل اجتناب کیا۔

”وہ مجھے کمپیوٹر سائنس ڈپارٹمنٹ کا پوچھنا تھا وہ ایکچو یلی ہم اسلام آباد میں نئے شفت ہوئے ہیں جس کی وجہ سے میں یہاں کسی کو نہیں جانتی اور کوئی مجھے ٹھیک سے راستہ بتا بھی نہیں رہا تو پلیز آپ مجھے بتا دیں بلکہ آپ مجھے چھوڑائیں۔ وہ کیا ہے نا بابا کہتے ہیں میں معصوم ہوں اور لوگ مجھے آسانی سے بے وقوف بنادیتے ہیں اس لیے میں چاہتی ہوں کہ کوئی میری معصومیت کا فائدہ اٹھاتے مجھے تنگ نہ کرے“، اُس کے نرمی سے بات کرتے ہی نور نے نان ٹاپ بولنا شروع کیا تو زارون نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کر کے ایک بار پھر سے اُس لڑکی کی جانب دیکھا جو بس شکل سے ہی معصوم تھی۔

”ٹھیک ہے چلیں میں چھوڑ دیتا ہوں“، اپنا بیگ اٹھاتے اُس نے اُس کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی کہا اور خاموشی سے یونیورسٹی کے دائیں حصے کی جانب چلنے لگا۔ ”شکریہ، آپ کو دیکھتے ہی میں سمجھ گئی تھی کہ آپ ایک اچھے انسان ہیں اور میری مدد ضرور کریں گے“، اُس کے ساتھ چلتے نور نے خوش دلی سے کہا تو زارون نے بس سر ہلانے پر اکتفا کیا اور پھر سے خاموشی اختیار کرتے اُس سے دو قدم آگے چلنے لگا۔

”بھائی آپ گونگے ہیں کیا؟؟“، ابھی اُسے چلتے با مشکل ایک ہی منٹ گزرا تھا جب نور نے پھر سے سوال کیا جس پر رکتے زارون نے اُسے حیرت سے پلٹ کر دیکھا جو پلکیں جھپکتے اپنے جواب کی منتظر تھی۔

”جی گونگا ہی ہوں بس ضرورت پڑنے پہ کبھی کبھار بول لیتا ہوں“، اُسی کے انداز میں جواب دیتے وہ پھر سے چلنے لگا۔

”ٹھیک ہے، مطلب مجھ سے تھوڑا تھوڑا بول لیں گے آپ؟ ویسے کیا میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں؟“، آنکھوں میں تجسس لیے اُس نے زارون کو پھر سے سیر نہیں دیکھ کر پوچھا۔

”زارون علی“، تیز تیز قدم اٹھاتے اُس نے مختصر سا جواب دیا۔

”اچھا نام ہے پر میں آپ کو زار کھوں گی کیونکہ اتنا میبا نام مجھ سے نہیں بولا جاتا“، نور نے چہرے پر مسکراہٹ سجا تے کہا تو زارون نے جواب دینے کی بجائے سر جھکائے چلنے پر اکتفا کیا۔

”ویسے میرا نام نور حرم ہے اور سب پیار سے مجھے نور کہتے ہیں اور اب آپ بھی کہہ سکتے ہیں“، بات کرتے کرتے وہ ایک لڑکا لڑکی کو ساتھ تصویریں بناتے دیکھ کر رکی۔

”پلیز آپ جلدی چلیں گی مجھے دیر ہو رہی ہے“، اُس کی آواز آنابند ہوئی تو زارون نے تھوڑی دور جا کر پلٹ کر دیکھا تو وہ پچھے ہی کھڑی دلچسپی سے اُس جوڑے کو دیکھنے میں مصروف تھی۔

”جی جی چل رہی ہوں“، اُس کی آواز پر ہوش میں آتے اُس نے سر ہلا کیا اور پھر سے اُس کے ساتھ چلنے لگی جو اپنی بات ختم کرتے پھر سے تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

”زار بھائی پلیز آہستہ چلیں مجھ سے اتنی تیز نہیں چلا جاتا“، نور نے اُس کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش میں ناکام ہوتے کہا تو زارون نے اپنی رفتار آہستہ کی۔

”آپ کو پتا ہے؟؟“، اُس کی رفتار آہستہ ہوتے ہی نور نے ایک بار پھر سے باتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ”نہیں“، زارون نے اُس آفت کو ایک نظر دیکھ کر نفی میں سر ہلا کیا جو اُس کی اپنی ہی خریدی ہوئی تھی۔

”مجھے مسکراتے ہوئے لوگ بہت پسند ہیں پر لگتا ہے آپ کم کم ہی مسکراتے ہیں اس لحاظ سے ہماری دوستی نہیں ہو سکتی اس لیے آپ میری مدد کرنے کے بعد مجھے یہ مت کہیے گا کہ مجھ سے دوستی کرو یا اپنا نمبر دے دو“، کندھے اچکاتے اُس نے زارون کو پہلے ہی اپنی پسند سے آگاہ کیا۔

”مطلوب، میں کیوں دوستی کروں گا آپ سے؟“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے ایک دم سے رکتے جیران نظر وں سے اُسے دیکھا۔

”وہ میری دوستیں کہتی ہیں کہ جو سیر نہیں ہیر و ہوتے ہیں نا وہ معصوم لڑکیوں کو بہت جلدی پسند کر لیتے ہیں اور پھر ان سے شادی کر کے اپنا حکم چلاتے اور ان پر ظلم بھی کرتے اور میں نہیں چاہتی کہ آپ مجھ سے دوستی کرنے کے بعد مجھ شادی کر لیں اور میں ساری زندگی آپ کے ظلم برداشت کرتی رہوں“، نخرے سے کہتے اُس نے انگلی اٹھاتے زارون کو وارن کیا جس نے حیرت سے پوری آنکھیں کھولے اُس معصوم نظر آنے والی چڑیل کو دیکھا جو اتنی بڑی بات کتنی آسانی سے کہہ چکی تھی۔

”مجھے لگتا ہے آپ کو اپنی کلاس لینے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے جو آپ میرا اور اپنادونوں کا وقت ضائع کر رہی ہیں“، اُس کی نہ رکنے والی زبان کو دیکھتے زارون نے اندازہ لگایا اور واپسی کے لیے پلٹا۔

”سوری مجھے لگتا ہے میں کچھ زیادہ بول گئی ہوں پر اب نہیں بولوں گی“، نور نے اُسے پلٹتاد کیکھ کر جلدی سے اُس کے سامنے آتے معدرت کی تو زارون نے اُسے آنکھیں دکھاتے رکنے کی بجائے آگے قدم بڑھائے۔

”آپ پہلے ہی میرا کافی وقت ضائع کر چکی ہیں اور میں مزید آپ کی باتیں سننے کے موڑ میں نہیں ہوں اس لیے پلیز مجھے معاف کریں“، باقاعدہ ہاتھ جوڑتے زارون نے تپے ہوئے انداز میں کہا تو نور کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”اب میں نہیں بولوں گی پلیز مجھے ڈپارٹمنٹ تک چھوڑائیں“، سوں سوں کرتے اُس نے اپنے مقصد کے لیے دو جھوٹے آنسو بھائے تو زارون نے لمبی سانس لیتے اپنا غصہ کم کرنے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے پر جلدی چلیں بالکل اپنی زبان کی طرح“، چہرے پر کسی قسم کا کوئی بھی تاثر لائے بغیر اُس نے کہا تو نور نے بات سمجھنے کی بجائے اثبات میں سر ہلا یا اور جلدی جلدی اُس کے پیچھے چلنے لگی۔

”یہ لیں آگیا آپ کا ڈپارٹمنٹ“، کچھ منٹ بعد ایک عمارت کے سامنے رک کر جو یونیورسٹی کے بالکل آخری حصے میں تھی زارون نے کہنے کے ساتھ اشارہ کیا۔

”شکر یہ زار آپ بہت اچھے ہیں پر اب میں آپ کو بھائی نہیں کہوں گی کیونکہ میری دوستیں کہتی ہیں کہ کسی لڑکے کو بھائی نہیں کہنا چاہیے ہو سکتا ہے بعد میں اُس سے ہی آپ کی شادی ہو جائے اور پلیز آپ کبھی کبھی ہنس لیا کریں اچھے لگیں گے“، اپنا مطلب نکلتے ہی اُس نے ایک بار پھر سے بولنا شروع کیا تو زارون نے اکتا ہوئی نظر وہ سے اُسے گھورا۔

”شت اپ کتنا بولتی ہیں آپ اور میں آپ جیسی چڑیل سے کیوں شادی کروں گا کیا میرے لیے باقی دنیا کی لڑکیاں مر گئیں ہیں اور پلیز دو بارہ میرے سامنے مت آئیے گا کیونکہ یہ آپ کے ساتھ گزارے دس منٹ ہی میرے لیے کافی انمول ثابت ہوئے اور میں مزید آپ جیسی قیچی کی طرح چلتی ہوئی زبان والی لڑکی کو برداشت نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے میں اپنی کلاس سے لیٹ ہو چکا ہوں“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے لفظوں کو چباتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”ہاں ہاں مجھے بھی کوئی شوق نہیں آپ جیسے بد تمیز انسان کے منہ لگنے کا، توبہ میں نے تھوڑی لفت کیا کروالی آپ تو میرے سر پہ چڑھ کے بولنے لگ گئے اور ہاں پلیز جائیں جا کر اپنی کسی گرل فرینڈ کے ساتھ گھوم کے آئیں تاکہ آپ کا دماغ کچھ ٹھنڈا ہو۔ آئے بڑے مجھے ڈاٹنے والے“، ایک ہی سانس میں اپنا بدلہ لیتے وہ زارون کو ہکابکا کھڑا چھوڑ کر نوٹس بورڈ کی جانب بڑھی۔

”بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں، تو بہ کتنی فضول اور بد تمیز لڑکی ہے“، اپنے غصے پر قابو پاتے اُس نے خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھا اور اپنے ڈپارٹمنٹ کار اسٹہ لیا جہاں پہنچتے ہی اُسے پتا چلا کہ سر بس حاضری لگا کر جا چکے ہیں۔

”سارا دن خراب کر دیا میرا اُس چڑیل نے“، سی آر کی بات سنتے ہی زارون کو نور پر مزید غصہ آیا تب ہی اُس نے باقی کوئی بھی کلاس لینے کا ارادہ ترک کرتے اپنا رخ گھر کی جانب کیا تاکہ کچھ دیر آرام کرے اور اپنے دماغ کو سکون دے سکے جو صحیح ہی صحیح اُس لڑکی کی وجہ سے خراب ہو چکا تھا۔

-----

گھر پہنچتے ہی اُس کا پہلا سامنا عابدہ بیگم سے ہوا جو کچن میں کسی کام میں مصروف تھیں۔

”السلام علیکم“،

”و علیکم السلام، زارون تم اس وقت؟ یونیورسٹی نہیں گئے تھے کیا آج؟؟؟“ عابدہ بیگم نے بیٹی کے سستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر سوال کیا۔

”گیا تھا پر کوئی کلاس نہیں تھی تو واپس آگیا“، جگ سے پانی گلاس میں انڈیلیتے ہوئے زارون نے اصل بات کو گول کرتے جواب دیا۔

”اچھا پھر اتنے پریشان کیوں ہو؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ عابدہ بیگم نے نرمی سے اُس کی پیشانی کو چھوتے ہوئے پوچھا۔ ”جی میں ٹھیک ہوں بس سر میں تھوڑا درد ہے اس لیے سوچ رہا ہوں کہ کچھ دیر آرام کر لوں،“ پانی ختم کرتے اُس نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ سجا تے عابدہ بیگم کی پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کی جو چند سالوں سے اُس کی چھوٹی سے چھوٹی بات کو لے کر فکر مند ہو جاتی تھیں۔

”اچھا ٹھیک ہے کر لینا آرام پر پہلے کچھ کھالو بلکہ میں چائے بنائی ہوں ساتھ کوئی پین کلر بھی لے لینا،“ کہنے کے ساتھ ہی انہوں نے اپنا رخ چو لہے کی جانب کیا۔

”نهیں امی مجھے کچھ نہیں کھانا اور چائے پینے کا بھی موڈ نہیں ہے بس کچھ دیر سو جاؤں گا تو درد خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ پلیز پریشان نہ ہوں،“ زارون نے انہیں تسلی دی اور ان کے روکنے کے باوجود بھی انکار کرتے کچن سے نکل کر سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں چلا گیا جہاں ہر چیز بہت سیلے اور نفاست سے سمجھی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر گرنے کے انداز میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر ویسے ہی خاموشی سے آنکھیں بند کیے لیٹے رہنے کے بعد اُس نے کچھ یاد آنے پر دوبارہ اٹھتے ہوئے اپنا بیگ کھولا اور اُس میں سے اپنی ڈائری نکال کر بیڈ پر بیٹھ گیا تاکہ

اُس میں لکھے الفاظ کو پڑھ کر خود کو ایک بار پھر سے اذیت دے سکے جو پچھلے چند سالوں سے وہ دیتا آیا تھا۔

## ماضی

زارون نے پورے پنجاب سے ماس کمپنیکیشن میں ٹاپ کیا تھا اور اسی سلسلے میں وہ احمد صاحب اور عابدہ بیگم کے ساتھ لاہور گیا جہاں تقریب انعامات کا انتظام کیا گیا تھا۔ تقریب سے فارغ ہونے کے بعد اُس نے احمد صاحب اور عابدہ بیگم کو اپنے مامور کے گھر چھوڑا جو وہیں لاہور میں قیام پذیر تھے اور خود اپنے دوست فہد سے ملنے کے لیے اُس کی بتائی ہوئی جگہ کی طرف روانہ ہوا پر گھر سے کچھ دور جاتے ہی اُسے ایک انجمن نمبر سے کال آنے لگی جسے پہلے تو اُس نے دیکھ کر اگنور کر دیا مگر پھر مسلسل ہوتی بیل سے اکتا کر کال ریسیو کی۔

”السلام عليکم“، زارون نے کال ریسیو کرتے ہی سلام کیا پر دوسری طرف سے کسی لڑکی کے ہنسنے کی آواز سنتے ہی موبائل کان سے ہٹاتے اُسے گھورا۔

”جی کون؟“ دوبارہ سے موبائل کان سے لگاتے اُس نے پوچھا پر مقابل نے جواب دینے کی بجائے کال کاٹ دی۔

”اُفف کیا عجیب پاگل لوگ ہیں منہ میں بڑ بڑاتے اُس نے موبائل ہاتھ میں پکڑا اور فہد کو دیکھتے ہی گاڑی سائیڈ پر لگائی۔

”یارا تھی دیر کردی تم نے میں کب سے کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں“، فہد نے اُسے دیکھتے ہی شکوہ کیا جو مسکراتے ہوئے اُس کے گلے لگ چکا تھا۔

”ہاں بس یار تقریب کافی لمبی ہو گئی اور پھر میں امی لوگوں کو ماموں کی طرف چھوڑنے چلا گیا تھا“، زارون نے معدودت خواہانہ لبھے میں لیٹ آنے کی وجہ بتائی۔

”چل خیر ہے، بس اب چلو تمہاری کامیابی کی خوشی میں کہیں اچھا سا کھانا کھاتے ہیں اور ساتھ با تین بھی کر لیں گے پر بل تم ہی پے کرو گے فہد نے کہیں بھی جانے سے پہلے اپنی شرط رکھی۔

”ہاں، تم تو ہمیشہ کنجوس ہی رہنا“، زارون نے گاڑی کی چابی اُس کی طرف اچھا لتے ہوئے کہا تو اُس نے دانتوں کی نمائش کرتے سر خم کیا، چابی کو مہارت سے کبیخ کرتے گاڑی کے دوسری طرف جاتے اُس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبحالی۔ تقریباً دس منٹ بعد گاڑی کو ایک ریஸٹورنٹ کے سامنے پارک کرتے وہ زارون کو اپنی دونی گرل فرینڈز کے بارے میں پوری تفصیل بتاچکا تھا۔

”یار یہاں کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے“، گاڑی سائیڈ پر لگاتے فہد نے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا تو زارون اُس کی تقلید میں چلتے اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوا جس پر پھر سے اُسی نمبر سے کال آر ہی تھی جسے کاٹتے اُس نے اپنا موبائل آف کر دیا اور چیئر پیچے کرتے فہد کے سامنے بیٹھا جواب اُسے اپنی تیسری گرل فرینڈ کی فیملی کے متعلق بتا رہا تھا۔

”یار بس کر دے اب، ایک تو یہ تمہاری گرل فرینڈ، توبہ میرا تو سُن کے ہی دماغ خراب ہو جاتا ہے اور تم پتا نہیں کیسے ایک ساتھ دو چار کو برداشت کر لیتے ہو“، زارون نے اُس کی باتوں سے اکتا تھا ہوئے ٹوکا۔

”بس یار کیا کروں تیرابھائی حسین، ہی اتنا ہے کہ ہر لڑکی دل ہار جاتی ہے“، ویٹر کو اشارے سے بلا تے اُس نے فخر سے جواب دیا۔

”ہونہے بس دیکھ لینا اس خوبصورتی کے چکر میں ایک دن یہ نہ ہو کہ آنٹی تمہیں گلی میں بٹھا کر جوتے ماریں وہ بھی وجہ بتائے بغیر“، اُس کا سارا غرور خاک میں ملاتے زارون نے ویٹر کو مینیو سے آگاہ کیا۔

”بچہ مجھے تو امی سے جو تیں پڑنی پر جو تمہارے حالات ہیں ناتم نے آگے چل کے اپنی بیوی سے جو تیاں نہیں بلکہ ڈنڈے کھانے ہیں وہ بھی گن گن کے“، زارون کی بات سنتے ہی فہد نے بُرا سما

منہ بناتے حساب برابر کیا جس پر مسکراتے ہوئے زارون نے اُس کی توجہ جوس کی جانب دلائی جو ویٹرا بھی رکھ کے گیا تھا۔

”دل جلا دیا ہے تم نے میرا۔ حد ہے تمہیں تو داد دینی چاہیے مجھے کہ میں اتنا عقل مند ہوں جو ایک ساتھ چار چار لڑکیوں کو قابو میں کیے ہوئے ہوں“، جوس کا سپ لیتے فہد نے ایک بار پھر سے اپنی خوبی بیان کی۔

”عقل مندی نہیں میری جان یہ سب سے بڑی بے وقوفی ہے جس کی وجہ سے تم تقریباً بیس بار کے قریب جوتے کھا چکے ہو پر مجال ہے کہ تمہیں اثر ہو“، جوس کا سپ لیتے زارون نے اُس کی ساری خوبیوں پہ پانی پھیرا۔

”ہوننہ بس مجھے پتا ہے تم میرے حُسن سے جلتے ہو تب ہی ایسی باتیں کر رہے ورنہ تو دل سے تم بھی میرے ٹیلینٹ کو مانتے ہو“، ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھتے اُس نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے ایک بار پھر سے زارون کو گھورنے پر مجبور کیا۔

”بھاڑ میں جائے تمہارا حُسن اور ٹیلینٹ اور یہ میری آخری وارنگ ہے اگر تم نے پھر سے اپنی کسی گرل فرینڈ کا قصہ شروع کیا تو میں واپس گھر چلا جاؤں گا وہ بھی بل پے کیے بغیر“، زارون نے اب کی بار فہد کو بھر پور طریقے سے دھمکایا۔

”اچھا یا رب چھوڑونا تم تو غصہ ہی کر گئے“، بل کے نام پر اپنی زبان کو بریک لگاتے اُس نے زارون کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”تو تم بھی کچھ لحاظ کرو میں یہاں تم سے اپنی باتیں کرنے آیا ہوں اور تم میری سے بغیر ہی پچھلے ایک گھنٹے سے مجھے سارہ، فریجہ اور آمنہ کی کہانیاں سنانے میں مصروف ہو“، ویٹر کو کھانا لگاتے دیکھ کر زارون نے اپنی آواز پیچی رکھتے اُس کی غلطی کا احساس دلا یا تو فہدنے مسکراتے ہوئے سر کھجا یا اور اُس سے معذرت کی۔ ”اچھا چلواب تم بتاؤ کہ آگے کیا کرنے کا ارادا ہے؟“، زارون کا موڈ ٹھیک ہوتا دیکھ کر فہد نے پلیٹ اُس کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا اور اپنی پلیٹ میں بھی کھانا نکالنے لگا تو زارون نے پڑھائی کے متعلق اُسے اپنے اگلے پلین سے آگاہ کیا۔

زارون اور فہد بچپن کے دوست تھے لیکن زارون کے ابو نے اپنا تمام کار و بار اسلام آباد میں سیٹ کیا تو اپنی فیملی کو اپنے ساتھ وہیں لے گئے پر وہاں شفت ہونے کے بعد بھی زارون اور فہد کی دوستی ویسی ہی رہی۔ وہ ہر وقت فون پہ ایک دوسرے سے رابطے میں رہتے تھے اور زارون جب بھی لا ہو رہا ناساراٹاً فہد کے ساتھ گزارتا۔ اچھے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک دوسرے کی ہر بات کے رازدار تھے۔ کھانا ختم کرتے ہی زارون نے فہد سے چلنے کا کہا کیونکہ با توں ہی با توں میں کافی وقت گزر چکا تھا۔

”ہاں ٹھیک ہے چلو“، گھری پر ایک بجتاد کیھ کر فہد نے زارون کی بات کی تائید کی اور وہ دونوں گھر کی طرف روانہ ہوئے زارون نے پہلے اُس کے گھر چھوڑ اور پھر خود گاڑی کو اشرف صاحب کے گھر کے راستے پہ ڈالا۔

گھر پہنچتے ہی وہ سب سے ملا اور کچھ دیر با تین کرنے کے بعد تھکاوٹ کا کہتے کزن کے ساتھ اُس کے کمرے میں چلا گیا۔ جہاں آتے ہی اُس نے فریش ہونے کے بعد کپڑے تبدیل کیے اور سونے سے پہلے اپنا موبائل آن کرتے چیک کیا جہاں اُسی انجان نمبر سے بہت سی کالز موجود تھیں۔

”افف پتا نہیں لوگوں کو دوسروں کو پریشان کر کے کیا حاصل ہوتا ہے“، خود کلامی کرتے اُس نے موبائل سائیڈ پر رکھا اور خود سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ابھی اُسے لیٹے چند سینڈز ہی گزرے تھے کہ ایک بار پھر سے اُسی نمبر سے کال آنے لگی جسے دیکھتے ہی زارون کے ماٹھے پر بل پڑ گئے۔ اس کی تو میں طبیعت صاف کرتا ہوں اچھے سے“، ایک نظر اپنے کزن پر ڈالتے (جو کانوں میں بینڈ فری لگائے موہی دیکھنے میں مصروف تھا) وہ اٹھ کر بالکونی میں آگیا۔

”جی کیا مسئلہ ہے آپ کو کیوں بار بار مجھے کال کر کے پریشان کر رہے ہیں؟“ سلام دعا کے بغیر ہی زارون نے غصے سے سوال کیا تو دوسرا جانب کچھ دیر خاموشی کے بعد کسی لڑکی کی آواز اُبھری۔

”سوری، زارون صاحب ہم لوگ تو ویسے ہی آپ کو تنگ کر رہے تھے پر آپ تو ناراض ہی ہو گئے“، نسوانی آواز کی بجائے زارون اپنے نام پر چونکا۔

”کون ہیں آپ؟ میرا نام کیسے جانتی ہیں اور میرا نمبر کہاں سے ملا آپ کو؟“ غصہ کی جگہ اب تجسس نے لے لی تھی تب ہی ایک ہی سانس میں دماغ میں آنے والے سارے سوالات پوچھ ڈالے۔

”جہاں آج آپ گئے تھے مطلب تقریب میں، وہاں میں بھی موجود تھی اور آپ کا نام اور نمبر وہاں سے ہی پتا چلا بلکہ میں نے بہت کوشش کے بعد پتا کیا“، دوسری طرف سے پر سکون لبھے میں بتایا گیا جو زارون کو مزید تپانے کے لیے کافی تھا۔

”انسان میں تمیز نام کی کوئی چیز بھی ہوتی ہے پر لگتا ہے آپ کا شمار ان انسانوں کے حلقے میں نہیں ہوتا“، غصے سے کہتے زارون نے فون بند کیا اور دوبارہ اندر آتے اپنے بیٹ پہ لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا پر اُس آواز کی خوبصورتی اور کھنک نے اُس کی ساری نیند اڑادی تھی۔ وہ ناچاہتے ہوئے بھی اُس انجان آواز کے بارے میں سوچنے لگا جسے ابھی چند سینڈ زپہلے ہی اُس نے ڈالنا تھا۔

-----

نور نے تمام کلاس ختم ہونے کے بعد کچھ دیر رضا کا انتظار کیا پر اُس کے آنے کا کوئی نام و نشان نہ دیکھ کر اُس نے اپنا موبائل نکالتے اُسے کال ملائی جو شائد واپسی پہ اُسے یونیورسٹی سے پک کر نابھول گیا تھا۔

”رضا کہاں ہو تم؟؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں“، دوسری طرف سے ہیلو کی آواز ابھرتے ہی نور شروع ہو چکی تھی۔

”صحیح بھی تم نے بد تمیزی کی میری کلاس ڈھونڈنے میں مدد کیے بغیر ہی چلے گئے اور اب بھی میں یہاں کھڑی کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں پر تم ہو ہی بد تمیز، سیلیوں سے فرصت ملے تو بہن کا خیال آئے۔ میں بتا رہی ہوں اگر تم اگلے پانچ منٹ میں یہاں نہ پہنچے تو میں بابا کو کال کر دوں گی“، اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر (جو بار بار اُسے مخاطب کرتے کچھ بتانے کی کوشش میں تھا) ہی نور نے حکم دیتے کال کاٹ دی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ظہیر صاحب کے نام کی دھمکی سنتے ہی وہ شہر کے کسی بھی کونے میں ہو فوراً اسے لینے کے لیے پہنچ جائے گا اور ایسا ہی ہوا اگلے سات منٹ میں رضانے بائیک لا کر اُس کے قریب روکی جو سخت ناراضی کے باوجود خاموشی سے اُس کے پہنچے بیٹھ گئی۔

”سوری آپی سچ میں بائیک کا ٹائر پنکھر ہو گیا تھا اسی لیے مجھے اتنا ٹائم لگ گیا“، بائیک گھر کے راستے پہ ڈالتے اُس نے نور کی طرف سے خاموشی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری بائیک جو صرف میرے ہی کام کی دفعہ پنکھر ہوتی ہے“، کہنے کے ساتھ ہی نور نے اُسے ایک تھپٹر رسید کیا۔

”آپی کیا ہے راستے میں لڑکیوں کے سامنے تو مت ماریں۔ میرا سارا اتحج خراب ہو جاتا ہے“، ایک ہاتھ سے جلدی سے اپنے بال سیٹ کرتے اُس نے مسکین سی صورت بنائی۔

”تو ہوتا رہے خراب تم میرے بھائی ہو وہ بھی چھوٹے اس لیے میرا جب دل کرے گا جہاں دل کرے گا میں تمہیں تمہاری غلطیوں کا احساس دلانے کے لیے مار سکتی ہوں اور پچھے تم ذرا گھر پہنچو میں بابا کو ایسی شکایتیں لگاؤں گی تمہاری کے لگ پتا جائے گا کہ بہن کو کیسے اتنی دیر انتظار کرواتے ہیں“، ایک اور تھپٹر اُس کے کندھے پہ مارتے نور نے اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔

”نور آپی کیا ہے آپ کو، پلیز اب بس بھی کریں اور اپنی انر جی گھر کے لیے بچا کر رکھیں جہاں پہنچتے ہی آپ کو میرے اور اپنے لیے کھانا بنانا پڑے گا“، موڑ کا ٹنے رضانے اُسے مزید چڑایا۔

”کیوں میں کیوں کھانا بناؤں گی ماں کہاں ہیں؟“، اس کی بات سنتے ہی نور نے پریشانی سے پوچھا۔

”اما بابا خالہ کی طرف گئے ہیں کچھ ضروری کام تھا“، اُس کی پریشانی کو انجوائے کرتے رضانے جواب دیا جسے سنتے ہی نور کی شکل رو نے والی ہو گئی۔

”مجھے نہیں بنانا کھانا، پہلے ہی میں سارا دن یک پھر لے کر تھکی ہوئی ہوں اور اب گھر جا کر مجھ میں کوئی کام کرنے کی ہمت نہیں اس لیے تم یہاں سے ہی کچھ لے لو“، بگڑے ہوئے موڈ کے ساتھ اُس نے انکار کیا تو رضانے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے خود ہی اپنے منہ سے منع کرتے اُس کی جان بچا لی۔

”ٹھیک ہے آپ کوئی مسئلہ نہیں میں ابھی جا کر کچھ لے آتا ہوں اور ہاں شکر یہ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا“، گھر کے سامنے باسیک روکتے رضانے سر خم کیا تو نور نے باسیک سے اُترتے نا سمیحی سے اُس کی جانب دیکھا جواب خود بھی باسیک کھڑی کرتے اُترا تھا۔

”کونسا احسان؟“، اُس کے پیچھے ہی گیٹ کی جانب آتے نور نے سوال کیا۔

”میری جان بچانے کا احسان۔ مجھے اپنے نایاب ہاتھوں سے لذیذ شرب بنانا کرنہ کھلانے کا احسان“، لاک کھولنے کے ساتھ ہی اُس نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”مطلوب؟“، نور نے اندر دا خل ہوتے نا سمیحی کے انداز میں پوچھا۔

”مطلوب کہ آپ بہت پہنچی ہوئی شیف ہیں جو وہ وہ چیزیں بھی بنایتی ہے جو دنیا کا آج تک بڑے سے بڑا شیف بھی نہیں بناسکا“، اپنی آواز کو تھوڑا اونچا کرتے رضا نے فخر یہ انداز میں اُس کی تعریف کی۔

”مثلا میں کوئی نسی ایسی چیز بناتی ہوں جو کوئی نہیں بناسکتا؟“، اپنی تعریف پر دل ہی دل میں خوش ہوتے نور نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

”بھنڈی کی نایاب بخوبی جس میں آپ نے پورے دو گلاس پانی کے ڈالے تھے اور ہاں وہ رس ملائی بھی جو باقاعدہ آپ نے رس ڈال کر بنائی تھی۔ ہائے کیا یاد کروادیا اففف ایسی لذیذ ڈشز تو کوئی دو بار مر کے دوبارہ زندہ ہوتا بھی نہیں بناسکتا“، رضا نے اپنی ہی دھن میں بولتے نور کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا جو شامداب اُس کی شرارت سمجھ چکی تھی۔

”رضا میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی“، خفگی سے سرخ ہوتے رنگ کے ساتھ وہ اُسے مارنے کے لیے اُس کے پیچھے بھاگی جو اس کے ہاتھ آنے سے پہلے ہی گیٹ کی طرف دوڑا گا چکا تھا۔

”تم گھر آؤ ذرا دیکھنا کیسی طبیعت سیٹ کرتی ہوں تمہاری“، پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ اُسے گیٹ سے باہر نکلنادیکھ کر نور نے بریک لگائی اور غصے سے گیٹ لاک کر کے اپنا بیگ اٹھائے اندر کی جانب بڑھی جو رضا کو پکڑنے کے چکر میں صحن میں گر گیا تھا۔

”آج کادن ہی منہوس تھا پہلے وہ بد تمیز لڑکی پھر وہ زار، ہونئے جلا دکھیں کا اور اب یہ رضا سارے ہی میری بے عزتی کر رہے ہیں“، اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے بیگ اور بکس بیڈ پر پھینکتے خود کلامی کی اور کلاک پر نظر پڑتے ہی آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے جلدی سے وضو کرنے چلی گئی تاکہ ظہر کی نماز ادا کر سکے۔

---

## ماضی

رات اُسی انجان آواز کو سوچتے جانے کب اُس کی آنکھ لگی جو صحیح تقریباً نوبجے کے قریب کھلی۔ ”اُف اتنا مامِ ہو گیا“، اپنے ساتھ والی جگہ کو خالی دیکھ کر وہ اٹھا اور جلدی سے فریش ہو کر کمرے سے باہر آیا جہاں اُس کا سب سے پہلا سامنے اشرف صاحب سے ہوا جو ڈائینگ ٹیبل پر موجود اخبار پڑھنے کے ساتھ ساتھ چائے پینے میں مصروف تھے۔

”السلام علیکم ماموں“، اُن کے ساتھ والی کرسی کو پیچھے کر کہ بیٹھتے اُس نے سلام کیا۔

”و علیکم السلام“، کیسے ہو برخورد اور کیسی گزری رات؟ اچھے سے نیند آگئی تھی؟؟؟، اخبار سائیڈ پر رکھتے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”جی ماموں نیند تو بہت اچھی آئی اور اب بس چائے کی طلب ہو رہی ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں میں ابھی تمہاری مامی سے کہتا ہوں،“ اُس کی بات سننے ہی انہوں نے اپنی بیوی کو آواز لگائی۔

”رخسانہ، زارون کے لیے بھی چائے لاو بلکہ ناشستہ ہی بنادورات بھی اس نے کچھ نہیں کھایا،“

”نہیں ماموں میں فہد کے ساتھ کھانا کھا کر آیا تھا بس اب چائے پی کے اسلام آباد کے لیے نکلوں گا،“

”کیوں بھی اتنی بھی کیا جلدی ہے ابھی رک جاؤ کچھ دن،“ اُس کی بات سننے ہی اشرف صاحب نے ٹوکا۔

”نہیں ماموں، معاز کو بھی کام کے سلسلے میں کراچی جانا ہے اور امی ابو کا بھی آپ کے ہاں کچھ دن رکنے کارادہ ہے تو گھر کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتے،“ زارون نے معقول سی وجہ بتائی۔

”تو کیا ہے؟ گھر کون سا کوئی اٹھا کر لے جائے گا پیچھے اتنے ملازم ہیں خود ہی دیکھ لیں گے،“ رخسانہ بیگم نے چائے اور کیک اُس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں امی ایسی کوئی بات نہیں بس انسان خود گھر ہو تو پریشانی نہیں ہوتی ویسے بھی آج کل ملازموں پر اعتبار کرنے کا انجمام تو آپ جانتی ہی ہیں“، اُن کے اصرار پر زارون نے پھر سے جواز پیش کیا۔

”پہلے ہی تم اتنے طالم بعد آئے ہو اور ابھی تو ہم نے تمہاری کوئی مہمان نوازی بھی نہیں کی“، پھر سے اشرف صاحب نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔

”میں پھر چکر لگاؤں گا اور آپ کو اچھے سے اپنی مہمان نوازی کا موقع دوں گا“، چائے کا سپ لیتے زارون نے اُنہیں تسلی دی۔

”چلو ٹھیک ہے پر ابھی تم کہیں نہیں جا رہے دو پھر تک تور کو، کھانا کھا کر جانا“، اشرف صاحب نے اُس کی بات سنتے ہی کہا تو زارون کو اب کی بار منع کرنا مناسب نہ لگا۔

”جی ٹھیک ہے میں کھا کر چلا جاؤں گا اور یہ امی ابو ہیں کہاں نظر نہیں آرہے؟“، زارون نے اُن کی بات کامان رکھتے ہوئے پوچھا تو رخسانہ بیگم اُس کے رکنے کا سنتے ہی خوشی سے واپس کچن کی جانب بڑھیں تاکہ کھانے کی تیاری کر سکیں۔

”وہ دونوں قبرستان گئے ہیں امی ابو کی قبر پہ“، اشرف صاحب نے اُسے بتایا جو اثبات میں سر ہلاتے اُن سے اُن کے بزنس کے متعلق پوچھنے لگا۔

وہ نماز ادا کر کے فارغ ہوئی تو رضا بھی کھانا لے کر آپ کا تھا۔ ”آپی آجائیں میں کھانا لے آیا ہوں“، اُس کی ناراضی کے پیش نظر وہ خود ہی اُسے کمرے میں لینے آیا۔

”تو میں کیا کروں جاؤ جا کر کھالو میں نے کون سانوا لے بنائے تمہارے منہ میں ڈالنے ہیں“، دوپٹہ کھول کر لیتے اُس نے اپنی خفگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”اچھا نا سوری میں تو ویسے ہی آپ کو تنگ کر رہا تھا“، جیب سے چاکلیٹ نکال کر اُس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے رضا نے معدرت کے ساتھ ساتھ اُسے رشوٹ کی پیشکش کی جیسے جھٹ سے اُس کے ہاتھ سے لیتے نور نے اپنا موڑ ٹھیک کیا۔

”ہاں تو میں نے کون سا غصہ کیا ہے“، اپنی بھوری آنکھوں میں چمک لیے اُس نے للاچاتے ہوئے چاکلیٹ کو دیکھا۔

”تو پھر چلیں کھانا کھاتے ہیں مجھے بہت بھوک لگی ہے“، اُس کا مزانج ٹھیک ہوتا دیکھ کر رضانے اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کچن کارخ کیا جہاں وہ پہلے ہی ٹیبل پر تمام چیزیں لگا کر گیا تھا۔

”میرا غصہ ختم ہوا ہے پر ابھی بھی میں تھوڑا تھوڑا ناراض ہوں کیسے تم نے میرے کھانے کو بُرا کہا اور میری بے عزتی بھی کی“، کرسی پر بیٹھتے ہی اُس نے چاکلیٹ کو ٹیبل پر رکھتے رضا سے کہا جو پہلے اُس کی پلیٹ میں سالن نکالتے اب اپنی پلیٹ میں ڈال رہا تھا۔

”تو میں وہ تھوڑی سی ناراضی بھی آپ کے لیے چائے بنایا کر ختم کر دوں گا اس لیے اب آپ ایسے بُرا سامنہ بنایا کرنے بیٹھیں اور کھانا کھائیں ٹھنڈا ہو رہا ہے“، اُس کے دل کی بات بولتے رضا کو مزید مکھن لگانا پڑا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے خراب موڈ کی وجہ ظہیر صاحب کے کانوں تک پہنچے۔

ظہیر صاحب جو ایک اصول پرست انسان ہونے کے ساتھ ساتھ نیک اور کم گو طبیعت کے مالک ہیں۔ اُن کی دو ہی نیچے ہیں۔ جن میں نور بڑی اور بی ایس کمپیوٹر سائنس کی طالب علم ہے۔ وہ ظہیر صاحب کی لاڈلی ہونے کے ساتھ ساتھ کافی حساس اور نازک مزاج طبیعت کی مالک ہے جبکہ اُس سے دو سال چھوٹا رضا جو ابھی ایف اے کا طالب علم ہے اور نائلہ بیگم کے بے شمار لاڈپیار کی وجہ سے کافی شراری اور نرم طبیعت بھی۔ سارا دن نور کی ناک میں دم کیسے رکھنا اس کا بہترین مشغله ہے۔ ظہیر صاحب ایک سرکاری ملازم ہیں جن کا تبادلہ کچھ دن پہلے ہی فیصل آباد سے اسلام آباد ہوا جس کی وجہ سے وہ اپنی اس چھوٹی سی فیملی کو لیے یہاں آکر آباد ہو گئے۔

”رضامیں سونے جا رہی ہوں، جب ماما با آجائیں تو مجھے جا گادینا“، نور نے کھانا کھانے کے بعد بر تن وغیرہ سیمٹے اور اُسے ٹُوی پر کوئی فلم دیکھنے میں مصروف دیکھ کر کہا۔ ”تو آپ اب چائے نہیں پیس گی کیا؟“، اُس کی بات سنتے ہی رضا نے ٹُوی کی آواز بند کرتے خوشی سے پوچھا۔

”نہیں میں بہت تھک گئی ہوں اس لیے تھوڑا آرام کروں گی تم بس مجھے کچھ دیر میں جا گادینا اور ہاں شام کی چائے تم بناؤ گے اس لیے یہ مت سمجھنا کہ میں نے تمہاری چائے بنانے سے تمہاری جان بخشی کر دی“، اُس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر نور نے پلٹ کر کہتے اُس کی ساری خوشی پر پانی پھیرا۔

”جی ٹھیک ہے بنالوں گا“، منہ پھلاتے اُس نے پھر سے ٹُوی کی آواز تیز کی تو نور نے اُس کے چہرے پر بارہ بجتے دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”توبہ اللہ ایسی ظالم بہن بھی کسی کونہ دے، آمین“، اُس کے کمرے کا دروازہ بند ہوتے دیکھ کر رضا نے ہاتھ اٹھا کر دعا کی اور دوبارہ سے ٹُوی کی جانب متوجہ ہو گیا۔

ماضی

دوپہر کے کھانے کے بعد زارون نے اشرف صاحب سے اجازت طلب کی اور احمد صاحب اور عابدہ بیگم کو اپنا خیال رکھنے اور جلد گھر واپس آنے کا کہتے ڈرائیور کے ساتھ اسلام آباد کی جانب روانہ ہوا۔ گاڑی گھر سے نکلی تو اُس نے اپنارات سے بند پڑا موبائل آن کیا جس کی سکرین فوراً سے ہی لا تعداد میسجز سے بھر چکی تھی۔

”اُفف یہ کیا مصیبت ہے“، اُسی انجان نمبر سے کیے گئے میسجز کی ایک لمبی فہرست دیکھ کر اُس کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”پتا نہیں ایسے لوگ کہاں سے اٹھ کر آ جاتے ہیں دوسروں کو تنگ کرنے کے لیے“، باری باری تمام میسجز کھول کر پڑھتے اُس نے خود کلامی کی۔

”ہونہ اب سوری بولنے کا کیا فائدہ، حد ہے دوسو میسجز میں تقریباً دو ہزار بار سوری بول دیا اس لڑکی نے، اُفف“، کچھ میسجز پڑھنے کے بعد اُس نے باقی ویسے ہی ڈیلیٹ کر دیے اور ڈرائیور سے اُس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگا جو پچھلے دونوں خراب تھی۔

”جی چھوٹے صاحب اب میں ٹھیک ہوں بڑے صاحب نے ڈاکٹر کو دیکھایا تھا اور ساتھ دو ایسا بھی لے کر دیں اور اب اللہ کے کرم سے میری طبیعت پہلے سے کافی بہتر ہے“، حامد نے پوری تفصیل سے زارون کو جواب دیا۔

”اچھا اللہ پاک بس صحت دے آپ کو، باقی دوائیاں اب وقت پر لیتے رہیے گا“، اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوتے زارون نے انہیں نصیحت کی۔

”جی صاحب“، اثبات میں سر ہلاتے اُس نے گاڑی کو موڑوے پہ ڈالا تو زارون نے سوری کے میسجز سے تنگ آگرنا چاہتے ہوئے بھی ”اُس اور کے“ کا میسج لکھ کر سینڈ کیا۔

”آپ نے سچ میں معاف کر دیا ہے نا؟“ اگلے ایک سینڈ کے اندر اندر پھر سے اُسے یقین دہانی کے لیے ایک میسج موصول ہوا۔ جس کو پڑھنے کے بعد چڑنے کی بجائے زارون کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”جی کر دیا ہے معاف اور اب پلیز آپ مجھے سوری مت کہیے گا“، مسکراہٹ والے کچھ ایموجی کے ساتھ کیے جانے والے میسج کو پڑھتے ہی حبہ کی رات سے انکی ہوئی سانس بحال ہوئیں۔

”تحقینک یو سوچ زارون“، اپنی مسکراہٹ چھپاتے اُس نے پھر سے میسج ٹائپ کرتے سینڈ کیا۔

”ویکلم اور یہ آپ کو میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنے کا خیال کیسے آیا؟ مطلب کیوں آپ نے میرا نمبر چوری کیا؟“، رات سے دماغ میں آتے سوال کو زارون نے لفظوں کی زبانی اُس تک پہنچایا۔

”ہاہاہا نہیں ایسی بھی بات نہیں ہے اب، میں نے چوری نہیں کی وہ تو وہاں پڑی لست دیکھی تو اُس پہ لکھا تھا یا شائد یہ کہہ لیں کہ میرا دماغ آپ کی پر سمنٹی دیکھ کر متاثر ہوا تو دل نے فوراً سے آپ سے

بات کرنے کی خواہش کی جو قبولیت کا وقت ہونے کی وجہ سے اُسی وقت قبول ہو گئی، اپنے سفید آنچل کو ٹھیک سے لیتے اُس نے مسج طائپ کرتے سینڈ کیا جسے پڑھ کے زارون کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ اُس کی بات کا ب کیا جواب دے۔

”کیا ہوا؟ لگتا ہے آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی؟“ کچھ دیر دوسری طرف سے جواب کا انتظار کرنے کے بعد جبہ نے خود ہی مسج طائپ کرتے سینڈ کیا تو فوراً سے زارون کا رپلانی آیا۔

”نہیں ایسی بات نہیں بس آپ کی بات مجھے کچھ پریشان کر گئی،“

”کیوں؟ اور کیا آپ پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتے ہیں؟“ چہرے پر پریشانی کے آثار سجائے اُس نے ایک اور سوال کیا۔

”نہیں، میں پہلی نظر کیا میں تو محبت پر بھی یقین نہیں رکھتا،“ زارون نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں، میں سب کچھ سیکھا دوں گی آپ کو محبت بھی اور یقین کرنا بھی۔ ویسے میر انام جبہ ہے۔ میں بی ایس سی کی اسٹوڈنٹ ہوں تقریب میں اپنی دوست کے ساتھ آئی تھی۔ ابو بزنس میں ہیں شاہد آپ جانتے ہوں سلطان آفندی کو، لاہور کے اہم لوگوں میں اُن کا شمار ہوتا ہے اور امی سو شل ور کر ہیں۔ میں اکلوتی ہوں اور آج سے پہلے کبھی اتنی ڈھٹائی سے کسی کو مسج نہیں کیا اور کبھی

کسی کی اتنی باتیں بھی نہیں سنی پر آپ خوش قسمت ہیں کہ حبہ آنندی کا دل آپ پہ آگیا اور اُس نے آپ کی اتنی باتیں سننے کے ساتھ ساتھ رات بھر جاگ کر آپ سے معتدرت کی، اپنے بالوں کو کندھے سے پچھے کرتے اُس نے مسیح ٹائپ کرتے سینڈ کیا جسے پڑھتے زارون کے چہرے پر ایک بار پھر سے مسکراہٹ آگئی۔

”اوو تھینک یو میم آپ نے اس بندہ ناچیز پہ اتنی عنایت کی“، مسیح کا جواب دیتے زارون نے سلطان آنندی کے بارے میں سوچا جو ایک جانی مانی شخصیت تھے اور وہ کافی بار اُن کو اخبار میں دیکھ چکا تھا۔

”اب ایسے کہہ کہ مجھے مزید شر مند نہ کریں اور کیا آپ مجھ سے دوستی کریں گے؟“ اپنی خوبصورت آنکھوں میں چمک لیے اُس نے خود ہی پہل کی۔

”ہم سوچ کے بتاؤں گا اور اب آپ سو جائیں کیونکہ بقول آپ کے آپ نے ساری رات جاگ کر مجھ سے معتدرت کی تو مجھے لگتا ہے اب آپ کو آرام کی ضرورت ہے“، زارون نے اپنی جان چھڑوانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے پر وعدہ کریں کہ آپ پھر مجھ سے بات کریں گے بلکہ جب میں مسیح کروں آپ جواب دیں گے؟“

”جی ٹھیک ہے دے دول گا اب آپ ریسٹ کریں“، اُس کے وعدہ لینے پر پھر سے مسکراہٹ نے زارون کے لبوں کو چھوا۔

”اوے کے ٹھیک ہے اور تھینک یو میری معذرت قبول کرنے کے لیے“، آخری مسیح ٹائپ کرنے کے ساتھ ہی وہ لیٹ چکی تھی پر اب آنکھوں میں نیند کی بجائے ایک خوبصورت چمک تھی جسے برقرار رکھنے کے لیے اُسے بس تھوڑی سی مزید محنت کرنا تھی کیونکہ حبہ آفندی کی نظر جس چیز پر پڑ جاتی وہ پھر اُسے اپنا بنانا کر ہی چھوڑتی تھی اور اس بار تو چیز کی جگہ ایک انسان تھا جس نے پہلی دفعہ میں ہی حبہ آفندی کے دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔

-----

نور کی آنکھ رضا کے جگانے سے کھلی جو اُسے نائلہ بیگم اور ظہیر صاحب کے آنے کا بتا کر چلا گیا تھا۔ ”افف اتنا نامم ہو گیا“، کچھ دیرستی سے لیٹے رہنے کے بعد جیسے ہی اُس کی نظر کلاک پر پڑی وہ فوراً سے اٹھ کر بیٹھی۔

”میں نے رضا سے کہا بھی تھا کہ مجھے جلدی جگادینا پر اس لڑکے کو کبھی میری بات سمجھنے نہیں آتی“، منہ میں بڑھاتے اُس نے چادر سائیڈ پر کی اور اٹھ کر واش روم میں چلی گئی۔ کچھ منٹ بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر لاؤنچ میں آئی جہاں ظہیر صاحب خبریں دیکھنے میں مصروف تھے۔

”السلام علیکم بابا“، دوپتہ ٹھیک کرتے اُس نے اُن کے قریب بیٹھتے ہوئے سلام کیا۔ ”وعلیکم السلام کیسی ہے میری بیٹی اور کیسار ہا آج یونیورسٹی کا پہلا دن؟“ اُس کے سلام کا جواب دیتے انہوں نے بیٹی کی آواز آہستہ کی۔

”جی بابا ٹھیک تھا دن بس سارا دن یہ کلاس وہ کلاس تھک گئی میں“  
”اچھا کوئی بات نہیں خود ہی ایک دو دن میں سب سیٹ ہو جائے گا بس اب تم نے دل لگا کر پڑھنا ہے“، اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے انہوں نے نصیحت کی جس پر سر ہلاتے نور نے نائلہ بیگم کا پوچھا۔ ”ماما کہاں ہیں؟“

”نماز پڑھ رہی ہیں۔ کھانا کھایا تھا تم نے؟“ گر نہیں کھایا تو اٹھو، میں بریانی لے کر آیا ہوں گرم کر کے کھالو“

”نہیں بابا، تم نے کھانا کھایا تھا۔ میں بھی نماز پڑھ لوں پھر دیکھتی ہوں بھوک ہوئی تو کھالوں گی“، صوفے سے اٹھتے اُس نے اپنی بات مکمل کی۔

”اچھا ٹھیک ہے پڑھ آؤ نماز، جب تک نائلہ بھی فارغ ہو جائے گی اور رضا بھی ابراہیم سے نوٹس لے کر آجائے گا پھر سب اکٹھے کھانا کھائیں گے“، سکرین پر نظریں جماتے انہوں نے نور سے کہا جوان کی بات مکمل ہوتے ہی ”ٹھیک ہے“ کہتے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

---

## ماضی

گھر پہنچتے ہی زارون کا پہلا سامنا معاذ سے ہوا جو اُسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ ”یار اتنا لام لگا کر کیوں آئے ہو، میں کب سے انتظار کر رہا تھا“، زارون سے ملتے معاذ نے شکوہ کیا۔

”ہاں بس، شام کا وقت تھا تو رش کافی تھا اسی وجہ سے لیٹ ہو گیا، تم بتاؤ کب تک جانے کی تیاری ہے؟“ اُس کی بات کا جواب دیتے زارون نے سوال کیا۔

”ہاں بس نکل رہا ہوں۔ تمہارا ہی انتظار تھا“، باہر ہارن کی آواز سننے اُس نے زارون سے کہا اور اپنا بیگ لینے اندر کی جانب بڑھا۔

”سلیم، بابر صاحب سے کہو کہ معاذ صاحب اپنا سامان لے کر آتے ہیں“، پھر سے ہارن کی آواز سننے زارون نے اپنے چوکیدار کو آواز لگائی اور خود بھی معاذ کے پیچھے ہی اندر کی جانب بڑھا۔

علی احمد صاحب جو کہ ایک کاروباری آدمی ہیں اور اسلام آباد میں اپنی فیملی کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے چار بیٹے جنید، مزمل، معاذ اور زارون ہیں اور ایک بیٹی ماہم جو سب سے بڑی اور شادی شدہ ہونے کے ساتھ کافی عرصے سے سعودیہ میں اپنے شوہر اور دو بچوں عبیرہ اور سجان کے ساتھ خوشگوار زندگی گزار رہی ہے۔

جنید اور مزمل دونوں ہی شادی شدہ ہیں اور اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ دبئی میں مقیم ہیں۔ جنید کا ایک بیٹا عثمان ہے اور بیگم حنا جو سادہ طبیعت کی مالک اور خوش اخلاق لڑکی ہے۔

مزمل کی ایک بیٹی ایمان اور بیوی ہما جو کچھ تلخ طبیعت کی ہونے کے باوجود بھی اپنے گھر کو باخوبی سنبھالے ہوئے ہے۔

معاذ جو ابھی اپنی تعلیم مکمل کر کے فارغ ہوا ہے وہ فی الحال احمد صاحب کے ساتھ ان کے کاروبار میں ان کا ساتھ دے رہا ہے پر کچھ ہی عرصے میں وہ بھی جنید اور مزمل کی طرح بیرون ملک سیط ہونے کارادہ رکھتا ہے۔

زارون گھر میں سب سے چھوٹا اور لاڈلا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوش اخلاق اور زندہ دل انسان ہے جس نے اپنا اسکول کا سارا وقت شرارتوں اور گھروالوں کو تنگ کرنے میں گزار اپر کا لج میں قدم رکھتے ہی اُس کے مزاج میں کافی تبدیلی آچکی تھی۔

---

اگلے دن وہ یونیورسٹی پہنچی تو اسے سامنے ہی ایک لڑکا ڈانس کرتا دکھائی دیا جسے پراشتیاق نظر وہ سے دیکھتے وہ اُس کے قریب چلی آئی جہاں اُس کے علاوہ تقریباً بیس پچیس لڑکوں کا ایک گروپ چیز رکھے بیٹھا اُس کا ڈانس انجوائے کرنے میں مصروف تھا۔

”اووئے ٹھیک سے کر اور کیا یہ لڑکیوں کی طرح ایک ہی جگہ جمے اسٹیپ مار رہے ہو“، اُسی گروپ میں سے ایک لڑکے نے اُسے ایک ہی طرح کے پوز مارتے دیکھ کر ٹوکا تو ڈانس کرنے والے لڑکے کی شکل بالکل رونے والی ہو گئی۔

”بھائی صاحب کر تور ہوں“، اپنے چشمے کو ٹھیک کرتے اُس نے مسکین سی صورت بناتے ایک دو مزید اسٹیپ مارے۔

”اففف عمریہ کو نسانہ پکڑ لائے ہوتم، اسے تو کچھ بھی نہیں آتا“، ان میں سے ایک لڑکا جو سب سے آگے بیٹھا تھا اس نے اپنے پاس کھڑے لڑکے کا نام پکارتے غصے سے کہا۔

”ارحم بھائی ناگن ڈانس کروالیں اس سے، مجھے لگتا ہے یہ وہ اچھا کر لے گا“، عمر نامی اس لڑکے نے سن گلاس سر لگائے بیٹھے اُس مغربو رلڑکے کو مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے ناگن ڈانس کرو اور اب کی بارا گر تم نے مجھے بد مزہ کیا تو پھر اپنی سزا کے لیے تیار رہنا“، انگلی اٹھا کر اُسے وارنگ دیتے وہ کرسی کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

”بھائی پلیز مجھے نہیں آتا“، اُس لڑکے نے اُس پوری فوج کے سامنے بے بس ہوتے مداخلت کرنے کی کوشش کی تو اُس عمر نامی لڑکے نے آکر اُسے گردن سے دبوچا۔

”اوے تیری اتنی ہمت کہ تو ارحم بھائی کو منع کرے، ابھی بتاتا ہوں تجھے“، عمر نامی اس لڑکے نے کہنے کے ساتھ ہی اُسے ایک تھپٹر سید کیا تو وہ لڑکا خوف کے مارے فوراً ہی بیٹھ کر ناگن ڈانس کرنے لگا۔

”افف کسی اور کو لے کر آؤ اس عینک والے جن سے کچھ نہیں ہونا“، ارحم نے اشارے سے منع کرتے عمر سے کہا جو فوراً ہی سر ہلاتے ایک دوسرا نمونہ گردن سے پکڑ کر اُس کے سامنے کھڑا کر چکا تھا۔

”ہاں بھئی کیا کیا کر لیتے ہو تم؟“ اسی گروپ میں سے ایک نے اُس سے سوال کیا تو نور نے ہوش میں آتے ادھر اُدھر دیکھا اور وہاں کچھ گڑ بڑ محسوس کرتے کھسکنا چاہا پر اُس سے پہلے ہی ارحم کی نظر اُس پر پڑ گئی۔

”عمر اُس لڑکی کو لاویا ہاں“، سرتاپیر اُس کا جائزہ لیتے ارحم نے حکم دیا جس کی یتکیل کے لیے عمر نے فوراً ہی اُس جگہ کا رخ کیا جہاں نور کھڑی تھی۔

”مس آپ کو سر بُلار ہے ہیں“، اُس کے قریب آتے ہی عمر نے بتیس دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔

”سر، یہ کون سے سر ہیں؟“ سر کا لفظ سنتے ہی نور کو لگا کہ وہ کوئی ٹیچر ہیں۔

”یہ ہمارے سر ہیں اور اب آپ کے بھی اس لیے پلیز آپ وہاں آئیں تاکہ سر آپ سے کچھ جان پہچان بڑھا سکیں“، عمر نے حتی الامکان اپنے لبھ کو سنجیدہ اور نرم رکھا۔

”اچھا اچھا سمجھ گئی مطلب سر تعارف کر رہے سب نئے اسٹوڈنٹس کا“، عمر کی بات سنتے ہی نور نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے کہا اور اُس کے اشارہ کرنے پر اُس جانب بڑھی جہاں ارحم بیٹھا تھا۔

”افففف عباس اسے تودھ کرو“، عمر کے ساتھ نور کو آتا دیکھ کر ارحم نے اُس دوسرے نمونہ کی بے سُری آواز سے تنگ آتے کہا۔

”جی ارحام بھائی“، اُس کا حکم ملتے ہیں عباس نے اٹھ کر اُس لڑکے کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور گراونڈ سے باہر لے گیا۔

”السلام علیکم سر“، نور نے اُس کے پاس رکتے بڑے ادب سے سلام کیا تو ارحام نے گلاسز اتارتے عمر کو اشارہ کرتے اُس ادب کی وجہ پوچھی۔

”بھائی آپ کو ٹیچر سمجھ رہی ہے“، عمر نے اُس کے کان کے قریب جھکتے سر گوشی کی تو ارحام نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے گلاسز پہنیں۔

”و علیکم السلام، تو مس کیا نام ہے آپ کا؟“، سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے اُس نے پہلا سوال کیا۔

”سر، نور حرم پر سب پیار سے مجھے نور کہتے ہیں آپ بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ میرے بابا کہتے ہیں کہ استاد بھی والدین کی جگہ پر ہوتے ہیں“، نور نے نام کے ساتھ ہی ارحام کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی لاجواب کیا جو چند ہی منٹ میں اُس کے ماں باپ کی جگہ لے چکے تھے۔

”ٹھیک ہے ماشاء اللہ بہت پیار انام ہے بالکل آپ کی طرح اور بتائیں آپ اس یونیورسٹی میں کیا کرنے آئی ہیں میرا مطلب کہ کیا پڑھنے آئی ہیں؟“، سنجیدگی سے ایک اور سوال پوچھا گیا۔

”جی میں بی ایس کمپیوٹر سائنس کی اسٹوڈنٹ ہوں آج میرا دوسرا دن ہے۔ ویسے تو میں ڈاکٹر بننا چاہتی تھی پر بابا کہتے کہ تمہارے نمبر کم ہیں تمہیں میڈیکل میں ایڈ میشن نہیں ملنا اس لیے میں نے سوچا انسانوں کی نہ صحیح کمپیوٹر کی، ہی ڈاکٹر بن جاؤں، ویسے میں نے ایف ایس سی میں مینڈک کا آپریشن کیا تھا اور تھوڑا تھوڑا مجھے انسانوں کا بھی کرنا آتا ہے مگر میں کرتی نہیں کیونکہ بابا کہتے ہیں ایسے کسی کا آپریشن نہیں کرتے“، نور نے ایک بار پھر سے بولنا شروع کیا تو ارحمنے گلا سزا آنکھوں سے نیچے کرتے اُس بولتی ہوئی مشین کو دیکھا جو ان سب کی بولتی بند کیے اپنا ہی پر گروام شروع کیے ہوئے تھی۔

”افف اب یہ نمونی کہاں سے لائے ہو؟“، فہد نے عمر کے کان کے قریب ہوتے سرگوشی کی جو خود اس شکل سے معصوم ٹیپ ریکارڈر کو سننے میں مصروف تھا۔

”اچھا دیکھتے ہیں کہ آپ اس یونیورسٹی میں رہنے کی اہل ہیں یا نہیں کیونکہ ہم اپنے اسٹوڈنٹس کو پڑھائی کے ساتھ ساتھ مختلف سرگرمیوں میں حصہ دلا کر اُن کے اندر مضبوطی پیدا کرتے ہیں اس لیے آپ کو بھی میرا دیا ایک چیلنج پورا کرنا ہو گا اگر آپ اس چیلنج کو پورا نہ کر سکیں تو آپ کو سزا ملے گی اسیے ہر حال میں آپ کو چیلنج پورا کرنا پڑے گا“، ارحمنے اُس کی چک چک سے تنگ آکر مطلب کی بات پر آتے کہا۔

”جی جی سر میں کچھ بھی کر سکتی ہوں آپ بتائیں مجھے کیا کرنا ہو گا“، بھر پور اعتماد کے ساتھ کہتے وہ چیلنج قبول کر چکی تھی۔

”ٹھیک ہے وہ سامنے آپ کو سفید شرط والا لڑکا نظر آ رہا ہے؟“  
 ”وہ جس کی پشت میری طرف ہے؟“ نور نے تصدیق چاہی۔ ”جی جی وہی بس آپ کو کرنا یہ ہے کہ آپ اُس کے پاس جائیں اور اُس سے پانچ سورو پے مانگ کر لے آئیں“  
 ”پانچ سو؟ وہ بھی مانگنے ہیں؟ یہ کیسا چیلنج ہے؟“ حیرت سے منہ کھولے اُس کی طرف دیکھتے نور نے نا سمجھی سے پوچھا۔

”بس چیلنج تو چیلنج ہوتا ہے اب اگر آپ پورا نہیں کریں گی تو سزا کے لیے تیار رہیں“، ارحم نے کندھے اچکاتے باقی سب کو انکھ ماری۔

”نہیں میں لاتی ہوں“، سزا کا سنتے ہی اُس کچھ منٹ پہلے ناگن ڈانس اور لڑکے کو پڑنے والے تھپٹر یاد آئے تب ہی اُس نے مزید کوئی بات کیے بغیر اُس سفید شرط والے لڑکے کی جانب قدم بڑھائے جس کی پشت اُس کی طرف تھی۔

”بھائی بات سُنئے“، نور نے اُس لڑکے کے قریب جاتے اُسے مخاطب کیا جو اپنے موبائل پر کچھ دیکھنے میں مصروف تھا۔

”اُفف تم پھر آگئیں، میں تمہیں کہیں کارستہ نہیں بتاؤں گا“، اُس پر نظر پڑتے ہی زارون نے صاف انکار کیا۔

”اووزار یہ آپ ہیں۔ شکر ہے میں نجح کئی“، اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے نور نے شکر ادا کیا۔

”آپ بھی یہاں پڑھتے ہیں کیا؟“، اپنے مطلب کے لیے کل والی تمام باتوں کو ایک طرف کرتے اُس نے نرمی سے پوچھا۔ ”نہیں، میں یہاں گول گپوں کی ریڑھی لگاتا ہوں“، غصے سے واپس اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوتے اُس نے جواب دیا۔

”نجح میں کیا؟ ویسے آپ شکل سے ریڑھی لگانے والے لگتے نہیں ہیں پر کیا کریں قسمت سب کی اپنی اپنی“، لمبی سانس لیتے اُس نے زارون سے اظہارِ افسوس کیا جس پر چند پل کے لیے اُس کے موبائل پر چلتے ہاتھ ساکت ہوئے۔

”وہ مجھے پانچ سورو پے چاہیے تھے، مطلب مجھے نہیں بلکہ وہ دیکھیں پیچھے، آپ کو وہ سر نظر آرہے ہیں ناؤں ہوں نے مجھے چیلنج دیا ہے کہ میں آپ سے پانچ سورو پے لے کر آؤں اور اگر آپ نے مجھے نہ دیے تو وہ مجھے سزادیں گے اس لیے پلیز آپ مجھے دے دیں“، نور نے اُس کے قریب بیٹھ پر بیٹھتے منت کی۔

”میرے پاس اتنے فضول پسیے نہیں ہیں اس لیے جائیں کسی اور سے مانگیں“، ایک نظر اپنے سے کچھ فاصلے پر موجود سر ارجمند پر نظر ڈالتے (جس نے اُس کے دیکھتے ہی اُسے اشارے سے پسیے دینے سے منع کیا تھا) اُس نے انکار کیا۔

”پلیز دے دیں، دیکھیں میں آج ہی آپ کی ریڑھی سے پانچ سو کے گول گپے کھالوں گی اور آپ نہیں دیں گے تو وہ سرمجھے سزادیں گے“، نور نے ایک بار پھر سے اصرار کیا۔

”تو اس میں میرا قصور نہیں اور اچھا ہے ذرا سزا بھگتیں تاکہ آپ کا دماغ ٹھکانے پر آئے جو شائد بچپن سے تھوڑا اپنی جگہ سے کھسکا ہوا ہے“، ماتھے پر بل ڈالنے اُس نے ایک بار پھر سے منع کیا۔

”زار پلیز دے دیں میں آپ کو واپس کر دوں گی“، نور نے رونے والی شکل بناتے ایک آخری کوشش کی۔

”نہیں ہیں میرے پاس کہنا اب مزید میرا دماغ خراب نہ کریں“، کہنے کے ساتھ ہی اُس نے اپنا بیگ اٹھایا اور نور کے روکنے کے باوجود بھی اٹھ کر کینٹین کی جانب چلا گیا۔ ”ہوننہ کنجوس، جلاد بد تمیز کہیں کا کیا تھا اگر پانچ سوروں پر دے دیتا تو“، زارون کے جاتے ہی اُس نے بسی سے پیچھے مر کر اس فوج کو دیکھا جو چھرے پر فتح کی چمک لیے اُسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”ہاں تو مس نور مل گئے آپ کو پانچ سورو پے یا نہیں؟“ اس کے قریب آتے ارحم نے سوال کیا تو نور نے نفی میں سر ہلا کیا۔

”اوو تو پھر شاباش یہ بیگ اور بکس ہمیں کپڑائیں اور ایک ٹانگ پر پوری یونیورسٹی کا چکر لگائیں“، عمر نے اس کا نفی میں ہلتا سردیکھتے ہی جلدی سے فیصلہ سنایا۔

”نہیں میں نہیں لگاسکتی اور سر پلیز آپ مجھ سے پانچ سورو پے لے لیں“، نور نے عمر کی بات سنتے ہی بد حواس ہوتے ایک نظر پوری یونیورسٹی پر ڈالتے معذرت کی۔

”نہیں جو میرے اسٹینٹ نے کہہ دیا آپ کو کرنپڑے گاورنے میں ابھی کے ابھی آپ کا ایڈیشن کینسل کروادوں گا“، اپنا موبائل نکالتے ارحم نے بڑی سنجیدگی سے کہا جسے سنتے ہی نور کے ہوش اڑ چکے تھے۔

”نہیں سر میں لگاتی ہوں“، اپنا بیگ اور بکس عمر کی جانب بڑھاتے اس نے جلدی نے ایک پاؤں اٹھاتے چنان شروع کیا تو ارحم کی اس پوری فوج نے بھی مسکراہٹ چھپاتے اس کے پیچھے ہی قدم بڑھائے جو یونیورسٹی کا کچھ حصہ عبور کرتے باقی اسٹوڈنٹس کو اپنے اوپر مسکراتا دیکھ کر رونے لگی تھی جس کی وجہ سے ترس کھاتے ارحم نے اُسے معاف کرتے کلاس میں جانے دیا۔

”میں اس زار کا منہ توڑ دوں گی بد تمیز کہیں کا اگر مجھے پسے دے دیتا تو میرا سب کے سامنے تماشہ نہ بتتا“، چار قدم اٹھانے کے بعد ٹانگوں میں ہونے والی درد کی وجہ سے وہ وہیں بیٹھ کر روتے ہوئے دل میں زارون علی سے بد لہ لینے کا رادہ کر چکی تھی۔

### ماضی

حبہ سے باتوں کا سلسلہ جو شروع ہوا وہ رکا نہیں بلکہ آہستہ آہستہ مزید بڑھتا گیا۔ زارون جس نے آج تک کسی لڑکی سے بات نہیں کی تھی وہ اپنا سارا وقت حبہ سے باتوں میں گزار دیتا کیونکہ اُس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا کہ کسی بھی انسان کے دل میں باآسانی گھر کر لیتا۔ سارا سارا وقت ایک دوسرے سے بات کرتے رہنے کے بعد وہ اس قدر قریب ہو چکے تھے کہ بات دوستی سے محبت تک جا پہنچی تھی۔ دو سال کا عرصہ یوں نہیں گزرا تو حبہ کے گھر میں اُس کے رشتے کا ذکر چھڑ گیا جسے سنتے ہی اُس نے فوراً سے زارون کو آگاہ کرتے اپنے ماں باپ کو اُس کے ہاں بھیجنے کا کہا۔

”ٹھیک ہے میں امی سے بات کرتا ہوں اور تم پریشان نہ ہو میرے والدین مجھے مایوس نہیں کریں گے“، حبہ کی بات سنتے ہی زارون نے اُسے تسلی دی اور کال بند کرتے عابدہ بیگم سے بات کرنے کی غرض سے اُن کے کمرے میں آیا۔ ”امی؟“ دروازے پر دستک دیتے زارون نے آواز لگائی۔

”زارون آجاو“، عابدہ بیگم جو کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹی تھیں انہوں نے زارون کی آواز سنتے ہی اجازت دی۔

”وہ امی مجھے بات کرنی تھی اگر آپ فارغ ہیں تو...“، کمرے کے اندر آتے ہی اُس نے اپنے آنے کا مقاصد بیان کیا۔

”ہاں ہاں میں فارغ ہی ہوں، آؤ بیٹھو اور بتاؤ کیا بات کرنی ہے؟“، عابدہ بیگم نے اپنے قریب اُسے بیڈ پہ جگہ دی۔

”وہ امی میں نے آپ کو کچھ مہینے پہلے ایک لڑکی کے بارے میں بتایا تھا نا؟“، کوئی تمہید باندھنے کی بجائے زارون نے اصل بات پہ آتے تصدیق چاہی۔

”ہاں بتایا تھا کیوں کیا ہوا اسے؟؟؟“، عابدہ بیگم جو پہلے سے ہی اُس کی زبانی حبہ کے متعلق سب کچھ جانتی تھیں انہوں نے بغیر کسی تردید کے ہامی بھری۔

”وہ امی اُس کے گھروالے اُس کا کہیں رشتہ دیکھ رہے ہیں۔ مطلب، وہ مجھے پسند ہے اس لیے میں چاہتا ہوں آپ اور ابو اُس کے گھروالوں سے بات کریں“، زارون نے تھوڑا ہچکچاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو عابدہ بیگم کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”پر فیصلہ آپ کا ہی ہو گا میں نے بس اپنی پسند بتائی ہے“، ان کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کر زارون نے جلدی سے اپنی صفائی پیش کی۔

”ہاں ہاں جانتی ہوں کہ فیصلہ ہمارا ہی ہو گا اور تمہیں پتا ہے ناکہ ہمارے فیصلے کبھی بھی تم لوگوں کی خوشنی اور خواہش کے بر عکس نہیں ہوتے“، اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھتے عابدہ بیگم نے نرمی سے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے تسلی دی۔

”تو مطلب میں حبہ سے کہہ دوں کہ آپ لوگ اُس کے گھر آ رہے ہیں؟“، ان کی بات سنتے ہی زارون نے خوشنی سے پوچھا۔

”نہیں، ابھی مجھے تمہارے ابو سے توبات کرنے دو پھر بتانا بلکہ میں آج ہی بات کر لوں گی، کیونکہ تمہاری خالو کی طبیعت خراب ہے تو شائد ہمیں کل لا ہور جانا پڑے تو ہم یہ کام بھی ساتھ ہی کر لیں گے“

”ٹھیک ہے جیسے آپ ٹھیک سمجھیں میں ذرا حبہ کو حوصلہ دے کر آتا ہوں صحیح سے اسی بات کو سوچ سوچ پا گل ہو رہی ہے“، ان کی بات ختم ہوتے ہی زارون نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

نور کا درد سے براحال تھا اسے رہ رہ کے زارون پر غصہ آرہا تھا جس کی وجہ سے اُس کا سب کے سامنے مذاق بنا۔

”کہہ دیانا نہیں دوں گا پسیے، ہوننہ تو بہ ایسے غصے سے مجھے منع کیا جیسے میں اُس کی بیوی ہوں اور شاپنگ کرنے کے لیے پسیے مانگ رہی ہو“، گھر آکر روئے دھونے سے فرصت ملتے ہی اُس نے کوئی بیسویں بار زارون کی نقل اُتارتے اُسے کوسا۔

”آپی چپ کر جائیں کیوں بار بار غصہ کر کے اپنا خون جلا رہی ہیں“، رضا جو پچھلے تین گھنٹوں سے اُس کی باتیں سن سُن کر پک چکا تھا اس نے اب کی بار اکتا تھے ہوئے اُسے سمجھایا۔

”کیوں چپ کروں میں، وہ بد تمیز، کھڑوس، جلا د جو خود کو پتا نہیں کیا سمجھتا ہے اُس نے سب کے سامنے میری بے عزتی کروائی اور وہ سر ٹنڈے کی شکل والا اُس نے مجھے صرف اُس کنجوس سڑے ہوئے کر لیے کی وجہ سے سزادی۔ میں اُسے ایسا سبق سیکھاؤں گی کہ زندگی بھر یاد رکھے گا“، اپنے پاؤں پہ ہاتھ رکھ کے دباتے نور نے عزم کیا تو رضا اپنا سر پکڑتے اُس کے قریب جا بیٹھا۔

”ٹھیک ہے سیکھا لیجیے گا سبق پر ابھی تو بس کریں چھوڑ دیں اُس بچارے غریب کی جان“

”کون بچارہ؟ وہ زار؟ وہ بچارہ نہیں ہے پورا یک نمبر کا بد تمیز انسان ہے ایسے سڑا ہوا منہ بنائے پھرتا ہے جیسے ابھی کسی کا قتل کر دے گا اور مجھے تو لگتا ہے کہ وہ شادی شدہ ہے اور گھر سے اپنی بیوی کی جو تیاں کھا کر آتا ہے تب ہی ساری یونیورسٹی میں مسکین سی شکل بنائے بیٹھا پڑھتا رہتا یا پھر دوسروں کو سزا نہیں دلاتا....“، ایک بار پھر سے نور کو سب کے ہستے ہوئے چہرے یاد آئے تو اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

”افف آپی چپ کر جائیں آپ کی وجہ سے میری ساری فلم کا بیڑا غرق ہو گیا ہے“، اس کی تمام باتوں کو ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکالتے رضا پھر سے ٹوی سکرین کی جانب متوجہ ہوا جہاں اس کی پسندیدہ فلم لگی تھی۔

”میں یہاں تمہیں اپنا سمجھ کر اپنے ساتھ ہونے والے حادثے کا بتا رہی تاکہ میرا دکھ کچھ کم ہو جائے اور تمہیں اپنی فلم کی پڑی ہے۔ اللہ کیا وقت آگیا ہے یہاں تو اپنا ہی خون سفید ہو چکا ہے پر میں بتا رہی ہوں کہ اگر اب تم نے میری باتیں ٹھیک سے نہ سُنیں میں بابا کو تمہاری دونوں گرل فرینڈز کا بتا دوں گی“، سوں سوں کرتے نور نے اپنی سرخ ناک کو ٹشو سے صاف کیا۔

”آپی خدا کا خوف کریں کچھ، مجھ معموم پر اتنا بڑا الزام۔ تو بہ توبہ ڈریں اُس وقت سے جب اللہ آپ کو ایک معموم پر تھمت لگانے کے جرم میں جہنم میں ڈالے گا“، نور کی بات سنتے ہی رضانے اُسے ڈریا جو جہنم کے نام پر اپنی پوری آنکھیں کھولے اُسے پاس پڑا کشن اٹھا کر مار چکی تھی۔

”نور بس کرو، کیا بد تمیزی ہے یہ اور کچھ نہیں ہوتا ساری یونیورسٹی میں نئے اسٹوڈنٹس کو سینئر ز ایسے ہی تنگ کرتے ہیں تمہیں بھی تھوڑا کر لیا تو کیا ہوا“، نائلہ بیگم جو کب سے کچن میں کام کرنے کے دوران ان کی باتیں سُن رہی تھیں بلا آخر انہوں نے باہر آتے اُسے ڈالنا۔

”تھوڑا سا تنگ کیا؟ ماما انہوں نے مجھے ایک ٹانگ پر یونیورسٹی کا چکر لگوایا“، نائلہ بیگم کے غصے سے بولتے ہی نور نے مزید آنکھوں کو آنسوؤں سے بھرا۔

”مجھے لگا تھا کہ آج میں مر جاؤں گی“، بھری ہوئی آواز میں کہتے اُس نے ڈبے میں سے آخری ٹشو نکالتے اپنے آنسو صاف کیے۔ نور کی بات سنتے ہی نائلہ بیگم نے سر کپڑا۔

”نور آپی حوصلہ رکھیں، آپ جتنی بڑی ہستی یو نہی اتنی چھوٹی سے بات پر دھرتی کا بوجھ ہلاکا نہیں کرتی بلکہ آپ جیسے عظیم لوگ تو اپنے گھروالوں کو مار کر مرتے ہیں تاکہ انہیں آپ کے ختم کے دانے کھانے کا بھی موقع نہ ملے“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے رضانے سنجیدگی سے اپنی بات جاری رکھی۔

”ویسے میں سوچ رہا یہ دانوں کا رواج پر انا ہو گیا ہے کیوں ناہم آپی کا ختم پیزے، بر گرا اور پاستے پر دلائیں؟“ نائلہ بیگم کی جانب سوالیہ نظر وں سے دیکھتے رضا نے ان کی رائے مانگی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے پیزے، پاستے اگروہ زار بد تمیز ہے ناتو تم اس سے بھی دوہاتھ آگے کی چیز ہو“، غصے سے ایک اور کشش اٹھا کر اُسے رسید کرتے نور نے نائلہ بیگم کو بھی مسکراتے دیکھ کر اپنے کمرے کا رخ کیا۔ ”افف شکر ہے کچھ دیر میرے کانوں کو سکون ملا“، اُس کے جاتے ہی رضا نے باقاعدہ ہاتھ اٹھاتے شکر کیا اور اُسے ایک گھوری سے نوازتے نائلہ بیگم اپنے کام ننمٹانے والپس کچن کی جانب بڑھیں۔

اگلے دو دن وہ بخار اور ٹانگوں میں ہونے والے درد کی وجہ سے یونیورسٹی نہ جاسکی اور آج تیسرے دن وہ یونیورسٹی پہنچی تو پہلی تین کلاسز فری ہونے کا سنتہ ہی اُس کے چہرے پر بارہ نج گئے۔ ”پتا نہیں کیسے ٹپھر زہیں یہاں کے آئے روز چھٹی کر لیتے ہیں“، ایک لڑکی سے پچھلے دودن کے ٹکچر لیتے وہ لان میں بیٹھتے بڑھاتی۔

”چلو ایک کام تو اچھا ہے کلاس فری ہیں تو میں اپنے نوٹس مکمل کر لوں گی“، خود کلامی کرتے اُس نے رجسٹر کھولتے اپنا کام شروع کیا۔ کام میں مصروف اُسے ایک گھنٹہ گزر چکا تھا جب تھک ہار کر اُس نے رجسٹر بند کیا اور اپنا سرا اور پر کرتے گردن کو پر سکون کرنے کی کوشش کی جو مسلسل نیچے جھکائے رکھنے کی وجہ سے اکڑ چکی تھی۔ ”ہائے اللہ پتا نہیں لوگ کیسے اتنا اتنا کام منڈوں میں کر لیتے ہیں اور ایک میں ہوں کہ پورا ایک گھنٹہ لگا کر بھی بس چار صفحات ہی لکھے ہیں“، رجسٹر کی طرف دیکھتے اُس نے جھنجھلاتے ہوئے سوچا۔

”ویسے مجھے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس کی فوٹو کاپی کروالیتی۔ حد ہے نہ جانے میرا دماغ بعد میں ہی وہ بات کیوں سوچتا ہے جو اسے پہلے سوچنی چاہیے“، اپنے دماغ میں آنے والے آئینڈیا پر خود کو بُرا بھلا کہتے وہ اپنا بیگ سیمٹ کر اٹھتی تاکہ باقی نوٹس فوٹو کاپی کرواسکے پر کچھ دور جاتے ہی اُس کی نظر زارون پر پڑی جو ایک بیٹھا اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔

”اس سے تو میں آج بدله لے کر ہی دم لوں گی“، اس کی نظر پڑنے سے پہلے ہی وہ پاس ہی موجود درخت کی اوٹ میں چھپ کر اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کوئی ترکیب سوچنے لگی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے پر یہ تو بیٹھا ہے“، اپنے بیگ سے پانی کی بوتل نکالتے وہ تھوڑا مایوس ہوئی پر اُسی لمحہ زارون کے موبائل کی بیبل ہوئی جسے رسیو کرتے وہ اپنی ڈائری اور کتابیں وہیں چھوڑ کر بیٹھ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہائے اللہ جی آپ بہت اچھے ہیں“، آسمان کی طرف دیکھتے اُس نے شکر ادا کیا اور زارون کے بیٹھنے سے پہلے ہی اُس کی پشت پر نظر رکھے جو دوسری جانب تھی وہ آگے بڑھی اور بہت ہوشیاری کے ساتھ بوتل میں موجود پانی بیٹھ پہ گرا دیا۔

”اب آئے گامزہ“، جلدی سے واپس اُسی درخت کی اوٹ میں چھپتے نور نے آنکھوں میں چمک لیے سوچا اور زارون کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگی جواب لان میں چہل قدمی کرنے لگا تھا۔

”اللہ جی پلیز اس جلا د کی نظر بیٹھ پر نہ پڑے“، نور نے اُسے ٹھلٹا دیکھ کر دعا کی اور بے چینی سے اُس کے بیٹھنے کا انتظار کرنے لگی۔

”اچھا بھائی میں آپ سے گھر جا کر بات کروں گا میری کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے“، اپنی گھڑی پر گیارہ بجتے دیکھ کر زارون نے جنید سے کہا اور فون بند کرتے واپس آکر بیٹھا تاکہ اپنی ڈائری میں لکھی تحریر کو پورا کر سکے پر بیٹھ پر بیٹھتے ہی اُسے کچھ گڑ بڑ کا احساس ہوا جسے محسوس کرتے ہی وہ فوراً سے کھڑا ہوا۔

”شٹ یہ کس نے کیا؟“ بیٹھ پر پڑے پانی کو دیکھ وہ اپنی پینٹ کا حال سوچتے ہی جلدی سے واپس بیٹھ کی خشک جگہ پر بیٹھا تو نور نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھتے با مشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کیا۔

”کس نے کیا ہے یہ سب“، خفگی کے مارے سرخ ہوتے چہرے سے اُس نے اپنی چاروں طرف دیکھا جہاں بس اکاد کا ہی اسٹوڈنٹس موجود تھے۔

”میں منہ توڑ دوں گا اُس کا جس نے یہ بے شرموں والی حرکت کی ہے“، غصے کے مارے اپنی مٹھیوں کو بند کرتے اُس نے اپنا موبائل نکالا تاکہ ارحم کو اپنی مدد کے لیے ملا سکے۔

”اب آیا نامزہ، بڑے آئے میرے پاس نہیں ہیں پسیے ہوننہ نور کا مذاق بنوایا تھانا تو اب بھگتو“، اُسے موبائل پر مصروف دیکھ کر نور نے بوتل اپنے بیگ میں ڈالی اور اپنار جسٹر تھامے اُس کے سامنے آئی جو اُسے دیکھتے ہی سب سمجھ چکا تھا۔

”السلام علیکم زار کیسے ہیں آپ؟“ چہرے پر سنجیدگی سجائے اُس نے بڑے احترام سے سوال کیا جس پر آگ بگولہ ہوتے زارون نے اُسے کھاجانے والی نظروں سے گھورا۔

”یہ سب تم نے کیا ہے؟“ اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے وہ غصے سے کھڑا ہوا۔ ”مطلوب، کیا کیا ہے میں نے؟ اور آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں؟“ اپنی ہنسی کو روکتے اُس نے سنجیدگی برقرار رکھتے آنکھیں جھپکائیں۔

”میں تمہارا قتل کر دوں گا“، اپنی گلی پینٹ کا خیال آتے ہی وہ جلدی سے واپس بیٹھا۔

”ہاہاہا میرا قتل؟ مسٹر زار عرف جلاد، آپ پہلے کھڑے تو ہو جائیں پھر میرا قتل بھی کر لیجیے گا“، اُس کی دھمکی پر مسکراتے ہوئے نور نے بڑے پر سکون انداز میں کہتے اُسے مزید تپایا اور منہ چڑاتے اُس کے پکڑنے سے پہلے ہی وہاں سے بھاگ گئی۔

”میں دیکھ لوں گا تمہیں“، پیچھے سے اوپھی آواز میں کہتے وہ بس پیچ تاب کھاتارہ گیا اور وہ اپنا کام مکمل کرتے اُس کی نظر وہ سے او جھل ہو چکی تھی۔

---

## ماضی

عبدہ بیگم نے علی احمد صاحب سے بات کی تو انہیں بھی زارون کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں تھا پر ابھی معاذ کی باری تھی تو اس سے پہلے چھوٹے بیٹے کی شادی کا سوچتے انہیں کچھ عجیب لگا۔

”آپ کو نہیں لگتا عبدہ کہ ہمیں پہلے معاذ کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہیے“، دل کی بات اپنی زبان تک لاتے احمد صاحب نے تشویش کا اظہار کیا۔

---

”جی بالکل پرحبہ کے رشتہ آرہے ہیں تو زارون کو ڈر ہے کہ اُس کے والدین اُس کے لیے کسی اور کو پسند نہ کر لیں اس لیے بس وہ فی الحال اتنا چاہتا ہے کہ ہم اُس کے گھر جائیں اور رشتے کی بات کریں اور ویسے بھی ہم کو نسا بھی شادی کر رہے ہیں۔ ایک بار بس بات پکی ہو جائے تو پھر دونوں بچوں کی پڑھائی ختم ہونے کے بعد دیکھیں گے تب تک اللہ پاک معاذ کا بھی کہیں سبب بنادے گا“، ان کے قریب بیٹھتے عابدہ بیگم نے تسلی دی تو احمد صاحب نے مطمئن ہوتے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے، پھر ہم کل واپسی پہنچنے کے گھر بھی ہوتے آئیں گے آپ زارون سے ان کے ایڈریس وغیرہ کا پوچھ لیں اور پلیز ایک کپ چائے بنادیں سارا دن میٹنگز اٹینڈ کر کر کے سر میں درد ہو گیا ہے میرے“، اپنی عینک اٹار کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے انہوں نے کہا تو عابدہ بیگم ان کی بات سنتے ہی کچن کی جانب بڑھیں جہاں زارون پہلے سے ہی موجود اپنے لیے چائے بنارہاتھا۔

”زارون تمہارا چائے پینے کا دل تھا تو مجھے بول دیتے“، عابدہ بیگم نے اُسے کپ میں چائے ڈالتے دیکھ کر ٹوکا۔ ”کوئی بات نہیں اور آپ پہلے ہی سارا دن گھر کے کام کر کہ تھک جاتی ہیں اب میں اس چھوٹے سے کام کے لیے آپ کو تنگ کروں کیا“، احمد صاحب اور ان کا کپ ٹرے میں رکھتے اُس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر بھی تم مجھے بول دیتے میں بنادیتی اور ہاں تمہارے ابو کہہ رہے ہیں کہ حبہ سے اُس کے گھر کا ایڈر لیں پوچھ لو کل ہم واپسی پر ان کے گھر سے ہوتے ہوئے آئیں گے“، ان کے ہاتھ سے ٹرے پکڑتے عابدہ بیگم نے اُسے خوش خبری سنائی۔

”مطلوب ابو مان گئے ہیں؟“، زارون نے بے یقینی سے پوچھا۔ ”ہاں، انہیں پہلے کبھی تمہاری کسی بات سے اعتراض ہوا ہے جو آج ہوتا بس تم اب یاد سے حبہ سے پوچھ کہ اپنے ابو کو بتا دینا“، ایک بار پھر سے اپنی بات دھراتے انہوں نے زارون سے کہا جس کے چہرے پر ایک الگ سی چمک آچکی تھی۔ ”شکر یہ امی آپ بہت اچھی ہیں اور میں ابھی پوچھتا ہوں حبہ سے“، ان کی پیشانی پر بوسہ دیتے زارون نے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور کپ اٹھاتے حبہ کو یہ خوشی خبری سنانے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

### ماضی

کمرے میں آتے ہی زارون نے حبہ کو کال ملائی تاکہ جلد از جلد اسے یہ خوش خبری سناسکے۔

”السلام علیکم“، دوسری بیل پر ہی کال رسیو ہوئی تو زارون نے چھکتی ہوئی آواز میں کہا۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ كَيْا ہوا؟ اتنے خوش کیوں ہیں؟“، ہمیشہ کی طرح حبہ نے اُس کی آواز سننے ہی اُس کے خوش ہونے کا اندازہ لگایا۔

”اُف ایک تو تمہیں میری آواز سن کے فوراً ہی پتا چل جاتا کہ میں خوش ہوں، پر یشان ہوں یا ادا س۔ پتا نہیں کیا چیز ہوتی،“، اُس کی بات سننے ہی زارون کی مسکراہٹ مزید گھری ہوئی۔

” بتائیں نا کیا ہوا؟ کیوں خوش ہیں؟“، اُس کی بات کو اگنور کرتے حبہ نے اپنے مطلب کی بات پر آتے سوال کیا۔

” وہ میں نے کہنا تھا کہ اپنے گھر کا ایڈریس میسج کر دو،“، زارون نے اپنے لمحے کو سنجیدہ کرتے آنکھوں میں شرارت بھری۔

” کیوں میرے گھر کے ایڈریس کیا کرنا ہے؟“، حبہ نے نام صحیح سے سوال کیا۔

” وہ تم سے ملنا تھا اس لیے پوچھ رہا ہوں، کیا ہے ناتم نے تو مجھے دیکھا ہے پر میں نے ابھی تک تمہیں نہیں دیکھا تو سوچ رہا ہوں کہ دیکھ لوں تاکہ شادی والے دن مجھے پچھتا نانہ پڑے،“، مسکراہٹ چھپاتے زارون نے اپنے لمحے کی سنجیدگی کو برقرار رکھا۔

” مطلب آئی انکل مان گئے؟“، ایک دم سے اٹھ کر بیٹھتے اُس نے پوچھا تو زارون نے قہقهہ لگایا۔

”توبہ بہت بد تینیز ہو، کیسے فوراً سے بات سمجھ جاتی ہو اور ہاں امی ابو مان گئے ہیں اب بس تم مجھے ایڈر لیں سینڈ کرو۔ کل وہ تمہارے گھر آ رہے ہیں“، زارون نے اُسے مزید شنگ کرنے کا رادہ ترک کیا اور تفصیل سے ساری بات بتائی۔ ”کل؟ اتنی جلدی؟ افف زارون میں نے تو ابھی تک کوئی تیاری بھی نہیں کی“، اُس کی بات سنتے ہی حبہ نے پریشانی سے کہا۔

”تو کوئی بات نہیں کل کا پورا دن ہے کر لینا تیاری اور ہاں گھر میں بھی ایک بار ضرور بات کر لینا تاکہ انکل آنٹی کو امی ابو کی آمد کا مقصد پتا ہو“، اب کی بار سیر یہیں ہوتے زارون نے حبہ سے کہا جو اُس کی بات سنتے مزید کشمکش میں پڑ چکی تھی۔

”اچھا میں کوشش کروں گی لیکن مجھے نہیں لگتا امی میری بات سنیں گی پر آپ پریشان نہ ہو میں بات کر لوں گی“، حبہ نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے زارون کو تسلی دی جس نے دوبارہ اُسے ایڈر لیں میسح کرنے کی تاکید کرتے ماہم کی کال آتی دیکھ کر اُسے کچھ دیر بعد بات کرنے کا کہہ کے کال کاٹ دی۔

-----

نور کی حرکت پر زارون کو پہلے ہی غصہ تھا اور سے ارحم نے بھی یہ کہتے آنے سے انکار کر دیا کہ وہ مصروف ہے۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری مصروفیت“، اس کا جواب سنتے ہی زارون نے غصے سے کہتے کال بند کی اور اپنی پینٹ خشک ہونے کا انتظار کرنے لگا، اس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ نور کو کچا چبا جائے۔ ”اس چڑیل کی تو میں ایسی طبیعت صاف کروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گی کہ زارون علی کس آفت کا نام ہے“، دل میں ارادہ کرتے وہ بس اب اپنی پینٹ کے خشک ہونے کے انتظار میں تھا جو بلہ آخر ایک گھنٹے بعد ختم ہوا اور وہ اپنا بیگ اٹھاتے سیدھا کمپیوٹر سائنس ڈپارٹمنٹ کی جانب بڑھا۔

”اس چڑیل کو تو آج میں ڈھونڈ کے ہی سانس لوں گا“، مختلف کلاسز میں دیکھنے کے بعد اس نے سیر ھیاں چڑھتے اوپر کارخ کیا تو وہ اُسے راستے میں ہی مل گئی۔

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے تمہیں؟“، اس کا بازو پکڑ کر وہیں سڑھیوں پر روکتے زارون نے غصے سے لفظوں کو سختی سے ادا کیا۔

”مطلوب، کیا مسئلہ ہے میرا؟ میں سمجھی نہیں“، اپنا بازو سے اس کا ہاتھ جھکلتے نور نے بے خوف ہو کر لا علمی کا اظہار کیا۔

”زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ بتاؤ کیوں پانی گرایا تھا تم نے بیٹھ پہ؟“، زارون نے بغیر کسی لحاظ کے ایک بار پھر سے اُس کے بازو کو دبوچا تو نور کے منہ سے کراہ نکلی۔

”اُفف، میرا بازو چھوڑیں تو بہ کتنے سخت ہاتھ ہیں آپ کے،“ نور نے اُس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کرتے نیچے دیکھا جہاں کچھ سٹوڈنٹس ان دونوں کو دیکھ کر رک گئے تھے۔ ”میں پوچھ رہا ہوں تم نے کیوں میرے بیٹھ پہ پانی گرایا؟ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“ اب کی بار زارون نے مزید اُس کے بازو کو دباتے سوال کیا تو درد سے نور کی آنکھوں میں پانی آنے لگا۔

”وہ آپ نے بھی مجھے سب کے سامنے بے عزت کروایا تھا اگر آپ مجھے پسیے دے دیتے تو...“  
”تو کیا؟ میں تمہارا غلام نہیں ہوں جو تمہاری ہر بات مانوں اور خبردار جو تم نے دوبارہ مجھ سے کوئی مذاق کرنے یا میرے سامنے آنے کی کوشش کی...“ جھٹکے سے اُس کا بازو چھوڑتے اُس نے نور کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ٹوکا اور غصے سے جلدی جلدی سیڑھیاں پھلانگتے وہاں کھڑے تمام سٹوڈنٹس کو اگنور کرتے ڈپارٹمنٹ سے باہر نکل گیا۔

”کیا ہوا یہ زارون تمہیں کیوں ڈانت رہا تھا؟“ رابعہ جو نور کی کلاس فیلو تھی اُس نے زارون کے جاتے ہیں نور کے قریب آتے سوال کیا جواب روتے ہوئے اُس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر تیزی سے سیڑھیاں اُترتے باہر کی جانب چلی گئی تاکہ اُن سب کی نظر وہ سے او جھل ہو سکے۔

”میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی“، لان میں قدرے ایک سنسان جگہ پر بیٹھتے اُس نے اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپایا اور زارون کے رویے کو سوچتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

---

گھر آنے کے بعد بھی نور کا مود کافی آف تھاتب ہی اُس نے کھانا کھائے بغیر ہی خود کو کمرے میں بند کر لیا۔ رضا اور نائلہ بیگم مسلسل دروازے پہ دستک دے رہے تھے اور ساتھ اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھتے ہوئے دروازہ کھولنے کا بول چکے تھے پر وہ اندر خاموشی سے غصے سے بھری بیٹھی کسی کی بھی بات سننے کو تیار نہ تھی۔ زندگی میں پہلی بار اُس سے کسی نے ایسے بات کی تھی جس کی وجہ سے وہ کافی ہرٹ ہوئی تھی۔

”میں اُس جlad کو کبھی معاف نہیں کروں گی اللہ کتنی زور سے میرا بازو دبايا، اوپر سے مجھے سب کے سامنے ڈالنا“، آنکھوں میں نمی بھرتے اُس نے اپنے بازو پر پڑے نشان کو دیکھا۔ ”اللہ جی پلیز زار کو کالی موٹی افریقہ کے جنگلوں سے آئی خونخوار سی بیوی دینا جو ایسے ہی اُسے مارے تب اُسے پتا چلے گا“

---

کہ کیسے کسی کو تکلیف دیتے ہیں؟، سوں سوں کرتے اُس نے اپنے دل کی ساری بھڑاس لفظوں کے ذریعے نکالی اور پھر سے دروازے پہ ہونے والی دستک کو سنتے اٹھ کر منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔

”نور کیا ہوا ہے تمہیں؟ جب سے یونیورسٹی سے آئی ہو بس دروازہ بند کر کے بیٹھی ہو، کیا ہوا ہے؟“ نائلہ بیگم نے دستک دینے کے ساتھ آواز لگائی تواب کی بار نور نے واپس روم سے نکل کر اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”ٹھیک ہوں میں بس سر میں درد تھا اس لیے سو گئی تھی،“ دروازہ کھولتے ہی اُس نے نائلہ بیگم سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

”چہرے سے لگ تو نہیں رہا کہ تم سوئی تھیں،“ اُس کی سو جھی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھتے انہوں نے فکر مندی کا اظہار کیا اور اصل بات جاننے کی کوشش کی۔

”سچ میں سوئی ہی تھی پھر مجھے اپنی ساری پرانی دوستیں یاد آگئی تو بس دل بھر آیا،“ جھوٹ کا سہارا لیتے اُس نے زارون کی حرکت کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

”اُفف، ایک تو میری بیٹی کارونا... اگر فرح لوگ اتنی یاد آرہی تھیں تو انہیں کال کر لینی تھی اس میں رونے کی کیا ضرورت تھی؟ نور تم اب بڑی ہو گئی ہو ماشاء اللہ تھر ڈائیر کی اسٹوڈنٹ ہو، اپنے اندر حوصلہ پیدا کرو اور یہ بات پر رونا پریشان ہونا چھوڑ دو کیونکہ ابھی تو ہم لوگ ہیں تمہیں

پیار کرتے تمہاری ہر بات سنتے پر آگے آنے والی زندگی میں ہو سکتا ہے تمہیں ہم جیسا کوئی نہ ملے تو اس لیے اپنے دل کو پہلے ہی مضبوط کرو، اُس کی آنکھوں میں پھر سے نمی دیکھ کر نائلہ بیگم نے پیار سے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔

”بس اب پھر سے دریامت بہانا پہلے ہی تم اپنی آنکھوں کا کافی بُرا حال کر چکی ہو،“ اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے نائلہ بیگم نے اُسے خود سے الگ کیا۔

”نہیں میں اب رو تو نہیں رہی اور مجھے بھوک لگی ہے آپ کھانا لگائیں میں نماز پڑھ کے آتی ہوں،“ اُن کی بات سنتے ہی نور نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو صاف کرتے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے جلدی آجائو،“ اُس کی بات سنتے ہی نائلہ بیگم نے اُسے تاکید کی اور کچن کی جانب بڑھیں تو نور نے بھی اب وقت ضائع کیے بغیر وضو کیا اور جائے نماز بچھاتے مغرب کی نماز ادا کرنے لگی۔

ماضی

اگلے دن عابدہ بیگم اور احمد صاحب حبہ کے گھر پہنچے تو ملازم نے انہیں ڈرائیور میں بیٹھایا۔  
”گھر تو اچھا لگ رہا ہے بس اب لوگ بھی اچھے ہی ہوں“، ایک نظر ڈرائیور کے چاروں طرف ڈالتے عابدہ بیگم نے دعا کی۔

”آمین“، احمد صاحب نے اُن کی بات سنتے آہستہ آواز میں کہا اور بیرونی دروازے کی جانب متوجہ ہوئے جہاں سے ایک باوقار عورت اور مرد ڈرائیور میں داخل ہوئے۔ ”السلام علیکم“، اُن دونوں کو دیکھتے ہی عابدہ بیگم اور احمد صاحب نے کھڑے ہو کر خوشدلی سے کہا۔

”وعلیکم السلام، سارہ بیگم نے اُن دونوں پر سرسری سی نظر ڈالتے عابدہ بیگم سے ہاتھ ملانے کی بھی زحمت نہیں کی۔

”بیٹھیں آپ لوگ کھڑے کیوں ہیں“، آندی صاحب نے سارہ بیگم کا سر درویے دیکھتے ہی بات سننچانے کی کوشش کی۔

”جی جی، آپ بھی بیٹھیں“، احمد صاحب نے عابدہ بیگم کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے آندی صاحب سے کہا جو سارہ بیگم کی نسبت خوش اخلاق اور سمجھ بو جھ والے انسان تھے۔ ”جی کیسے آنا ہوا آپ کا؟“، حال احوال کے بعد آندی صاحب نے سوال کیا۔

”ہم اپنے بیٹے زارون کے سلسلے میں آئے ہیں آپ کی بیٹی حبہ کا ہاتھ مانگنے“، احمد صاحب نے بے حد نرمی سے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا جسے سنتے ہی سارہ بیگم کے چہرے کے زوایے بد لے۔

”مطلوب آپ کو لگتا ہے کہ آپ کا پیٹا ہماری بیٹی کے قابل ہے؟“ احمد صاحب کی بات سنتے ہی سارہ بیگم نے آفندی صاحب کے آنکھیں دکھانے کے باوجود بھی طنزیہ انداز میں پوچھا۔

”رشتوں میں قابلیت نہیں بلکہ احترام، خلوص اور پیار دیکھا جاتا ہے جس کی نہ تو ہم میں کمی ہے نہ ہی ہمارے بیٹے میں“، سارہ بیگم کے طرز بھرے لمحے کے باوجود احمد صاحب نے بہت نرمی سے اپنی بات کہی۔

”ہوننہ ان بڑی بڑی باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا۔ پیٹ بھرنے کے لیے پسیے کی ضرورت ہوتی ہے جس کی ہمارے پاس فروانی ہے۔ ہماری بیٹی منہ میں سونے کا چچہ لے کر پیدا ہوئی ہے اور آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے اُس کی کوئی ضرورت، کوئی خواہش رد کی ہو۔ وہ کڑوڑوں کی چیز پسند کر لے تو تب بھی ہم دونوں میں سے کسی نے انکار نہیں کیا بلکہ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ وہ چیز اُسی وقت اُسے دلادی جائے“، غرور سے گردان اکڑاتے انہوں نے احمد صاحب کو اپنے رتبے اور حیثیت سے باور کروا یا۔

”تو ہم بھی کسی گرے پڑے خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ اللہ کا شکر ہے ہم میں بھی اتنی طاقت ہے کہ آپ کی بیٹی کی ہر خواہش پوری کر سکیں“، اب کی بار عابدہ بیگم نے مداخلت کی۔

”ہاہاہا، میں نے کروڑوں کی بات کی چند لاکھ کی نہیں اور میں کسی صورت یہ رشتہ نہیں ہونے دوں گی اس لیے اپنے بیٹے کو سمجھائیں کہ میری بیٹی کو ورغلانا بند کرے“، غصے سے بھر پور لمحے میں کہتے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں تو آفندی صاحب کے ساتھ ساتھ احمد صاحب اور عابدہ بیگم بھی کھڑے ہو گئے۔

”سارہ یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ حبہ نے ہمیں خود بتایا ہے کہ وہ زارون کو پسند کرتی ہے“، سعید صاحب نے اُن کے مزید کچھ بولنے سے پہلے ہی ٹوکا۔

”اس کی عقل پر توان کے بیٹے نے اپنی محبت کے پردے ڈال دیے ہیں پر میری عقل ابھی سلامت اور میں اچھے سے جانتی ہوں ایسے لڑکوں کو اور اُن کی چالوں کو جو پہلے بڑے گھروں کی لڑکیوں کو پیار کے جھوٹے خواب دکھاتے ہیں پھر اُن کی ساری جائیداد ہڑپ کے انہیں ایک کونے سے لگا دیتے ہیں اور میں اپنی بیٹی کو کسی ایسے انسان کے ہاتھ نہیں چڑھنے دوں گی جونہ تو اُس کے معیار کا ہو نہ ہی ہمارے“، ایک حقارت بھری نظر عابدہ بیگم اور احمد صاحب کے چھروں پر ڈالتے جوان کی

توہین آمیز باتوں سے سرخ ہو چکے تھے سارہ بیگم نے اپنی بات مکمل کی اور ڈرائیگ روم سے نکل گئیں۔

”بھائی صاحب میں سارہ کی طرف سے آپ سے معافی مانگتا ہوں پلیز آپ لوگ بیٹھیں ہم بات کرتے ہیں“، آندی صاحب جن کی کبھی بھی سارہ بیگم کے سامنے نہیں چلی تھی انہوں نے اُن کے جاتے ہی احمد صاحب سے کہا جو صرف بیٹی کی خاطر اب تک خاموش کھڑے سب سُن رہے تھے۔

”نہیں بھائی صاحب آپ کا بہت بہت شکریہ بس اب ہم لوگ چلیں گے“، احمد صاحب کے کچھ بولنے سے پہلے ہی عابدہ بیگم نے اپنا بیگ اٹھایا۔

”پلیز بہن میری بات سنئیے، میں جانتا ہوں کہ سارہ کا رویہ غلط تھا پر آپ حبہ اور زارون کا سوچیں اُن بچوں کا اس میں کیا قصور، پلیز آپ بیٹھیں ہم تسلی سے بات کرتے ہیں“، آندی صاحب نے بیٹی کی خاطر ایک اور کوشش کی۔

”نہیں، بس ہم چلتے ہیں اور آپ پریشان نہ ہوں ہمارے بچوں کی قسمت میں جو ہوا اُنہیں مل جائے گا“، اُن کی بات سنتے احمد صاحب نے عابدہ بیگم کو چلنے کا کہا اور خود بھی آندی صاحب سے مصافحہ کرتے باہر کی جانب بڑھے۔

ماضی۔

حبہ کب سے تیار بیٹھی نیچے سے بلاوے کا انتظار کر رہی تھی پر کافی وقت گزرنے کے بعد جب کوئی بھی اُسے بلا نے اوپر نہیں آیا تو وہ خود ہی فکر مندی سے نیچے آئی۔ ”شرفو، امی ابو کہاں ہیں؟“ نیچے آکر حبہ نے اپنے ملازم کو آواز دیتے پوچھا۔

”بڑی بی بی تو اپنے کمرے میں ہیں اور صاحب ڈرائیور میں،“ شرفونے اُس کے قریب رکتے بتایا۔

”امی ڈرائیور میں نہیں گئیں؟“ اُس کی بات سنتے ہی حبہ کو لگا کہ مہمان ابھی یہیں ہیں۔ ”جی گئیں تھیں بس پانچ منٹ پہلے، ہی اپنے کمرے میں آئی ہیں،“ شرفونے اُس کی معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

”کیوں مہمان چلے گئے ہیں کیا؟“ نظریں ڈرائیور میں پر جمائے حبہ نے ایک اور سوال کیا۔ ”جی چلے گئے بلکہ ابھی ابھی گئے ہیں،“ شرفونے اُس کے سوال کا جواب دیا تو حبہ نے پریشانی سے اُس کی طرف دیکھا۔

”اچھا تم جاؤ“، اُسے اشارے سے جانے کا کہتے وہ خود ڈرائیور میں کی جانب بڑھی جہاں آفندی صاحب اپنا سر پکڑے بیٹھے تھے۔

”ابو کیا ہوا؟ اور یہ مہمان مجھ سے ملے بغیر ہی چلے گئے؟“ حبہ نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اپنی جانب متوجہ کرتے سوال کیا تو آفندی صاحب نے سر اٹھاتے اُسے دیکھا جو چہرے پر پریشانی کے آثار سجائے اپنے جواب کی منتظر تھی۔

”ہاں چلے گئے بلکہ تمہاری ماں نے انہیں بے عزت کر کے بھیج دیا“، اپنے کندھے پر دھرے اُس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے انہوں نے کچھ بھی چھپانے کی بجائے حبہ کو تمام صورت حال سے آگاہ کیا جسے سنتے ہی اُس کے چہرے کا رنگ زرد پڑنے لگا۔

”مطلوب؟ امی نے ایسا کیوں کیا؟ رات کو جب میں نے بات کی تھی تب انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا“، آنکھوں میں نمی کے ساتھ ساتھ کئی سوال لیے اُس نے آفندی صاحب کی جانب دیکھا۔

”تب بھی اُسے اعتراض تھا پر اُس نے ظاہر نہیں کیا، کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تم زارون کے گھر والوں کو یہاں آنے سے منع کرو“، بیٹی کے چہرے کے رنگ پھیکے پڑتے دیکھ کر آفندی صاحب نے اُسے اپنے سینے سے لگایا جو کسی بھی وقت رو دینے کو تھی۔

”پرابو، امی نے ایسا کیوں کیا؟ انہوں نے تو زندگی بھر میری تمام خواہشیں پوری کی ہیں تو اب...“ خود کو سنبھالتے حبہ نے اپنے آنسوؤں کو اندر اٹا رانے کی ناکام کوشش کی۔

”اب یہ کہ میں تمہیں اس محبت کے پاگل پن میں آکر ایسا فضول فیصلہ نہیں کرنے دوں گی جس کی وجہ سے ہماری پورے خاندان میں ناک کھلے، آفندی صاحب کی بجائے اُس کی آخری بات کا جواب سارہ بیگم نے دیا جوا بھی ابھی وہاں آئی تھیں۔

”مطلوب آپ کو اپنی ناک اور خاندان والوں کی فکر ہے پر میری نہیں،“ اُن کو دیکھتے ہی حبہ نے اپنے آنسو صاف کیے اور اٹھ کر اُن کے سامنے آئی۔

”ہاں مجھے تمہارے اس بے وقوفانہ فیصلہ کی بجائے اُن لوگوں کی فکر ہے جو بعد میں باقی میں کر کر کے ہمارا اور تمہارا جینا حرام کر دیں گے۔ حبہ میری جان تم کیوں نہیں سمجھ رہیں کہ وہ لڑکا تمہارے قابل نہیں ہے وہ نہ تو تمہاری ضروریات کو پوری کر سکتا ہے اور ہی خواہشات کو ویسے بھی ایسے لوگوں کا کوئی بھروسہ نہیں کب کہاں دھوکہ دے جائیں،“ اُس کا ہاتھ تھامتے سارہ بیگم نے سختی کرنے کی بجائے اپنے لبھ کو نرم رکھتے حبہ کو سمجھایا۔

”تو آپ رات کو ہی مجھے یہ سب کہہ دیتیں کیا ضرورت تھی آپ کو زارون کے والدین کی بے عزتی کرنے کی؟“ اُن کا ہاتھ جھکتے حبہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔

”ضرورت تھی، ایسے لوگوں کو ان کی اوقات وقت پر نہ بتائی جائے تو وہ آپ کے سرچڑھنے میں دیر نہیں لگاتے اور پلیز تم یہ رونا دھونا اور چلانا بند کرو کیونکہ تمہارے اس جذباتی ڈرامے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہونا۔ میں ایک بار جو فیصلہ کر چکی ہوں اُس سے پیچھے نہیں ہٹوں گی یہ تم بھی سُن لو اور تمہارا باپ بھی“، ایک نظر آفندی صاحب پر ڈالتے وہ جانے کے لیے پلٹیں۔

”تو آپ بھی سُن لیں اگر میری زارون سے شادی نہ ہوئی تو میں خود کو آگ لگالوں گی“، سارہ بیکم کی ہٹ دھرمی دیکھتے ہبہ نے بھی اپنا فیصلہ سُنا یا اور تیزی سے ڈرائیکٹ روم سے نکل کر سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

ہونہے بڑی آئی اپنے آپ کو آگ لگانے والی۔ ماچس آج تک کبھی جلائی نہیں اور آگ لگائے گی خود کو، اُس کی بات کو زیر لب تمسخر سے دھراتے وہ سر جھٹکتے ہوئے واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں اور آفندی صاحب اُن ماں بیٹی کی ضد پر خاموش بیٹھے آنے والے وقت کے بارے میں سوچنے لگے۔

نور کو یونیورسٹی جاتے دو ہفتے گزر چکے تھے اور اُس واقعے کے بعد اُس کا زارون سے دو بارہ سامنا نہیں ہوا مگر ان دنوں میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ اُس کی ایک رابعہ نامی لڑکی سے دوستی ہو گئی جو ایک سادہ اور پر خلوص انسان ہونے کے ساتھ ساتھ کافی خوش اخلاق تھی جس کی وجہ سے نور چند ہی دنوں میں اُس سے مانوس ہو گئی۔

”یار میں کہہ رہی ہوں ناکہ تم فنکشن میں ضرور آؤ گی تو بس اب خاموشی سے شام کو تیار ہو کر آجانا“، یونیورسٹی میں نئے سٹوڈنٹس کے لیے ویکم پارٹی کا انتظام کیا گیا تھا اور رابعہ بھی پچھلے ایک گھنٹے سے نور کو اسی پارٹی میں آنے کے لیے منار ہی تھی۔

”نہیں یار میرا بالکل دل نہیں ہے“، نظریں رابعہ کے پیچھے آنے والے شخص پہ جمائے اُس نے ایک بار پھر سے انکار کیا۔ ”مطلوب تم اب میری بات بھی نہیں مانو گی اور یہ تمہارا دھیان کدھر ہے؟“ سوال پوچھتے اُسے اپنے پیچھے کسی جانب متوجہ دیکھ کر رابعہ نے خود بھی مرڑ کر دیکھا۔

”ہائے کیسی ہو کزن؟؟ اور یہ بولنے والی مشین تمہارے ساتھ کیا کر رہی ہے؟“ اُس کے قریب آتے ہی ارحم نے نظریں نور پر جماتے ہوئے رابعہ کے کان کے قریب جھکتے سر گوشی کی جواب آنکھوں میں حیرت لیے ارحم کو رابعہ سے بات کرتا دیکھ رہی تھی۔

”کو نسی مشین؟ یہ تو نور ہے میری دوست اور کلاس فیلو اور نور یہ میرا کزن ہے ارحم۔ اسی یونیورسٹی میں ماں کمیونیکشن میں ماسٹرز کر رہا ہے“، رابعہ نے اُن دونوں کا تعارف کروایا جس پر ارحم نے چہرے پر مسکراہٹ سجائتے اُسے ہیلو بولا تو نور نے اُسے گھوری سے نوراتے نیچے زمین پر کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

”نور کیا ہوا کیا ڈھونڈ رہی ہو؟“ رابعہ نے اُسے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے دیکھ کر پوچھا۔

”پتھر“

”کیوں؟“

”تمہارے کزن کے سر میں مارنا ہے اس ٹنڈے کی شکل والے نے ہی اُس دن مجھے بے وقوف بنا کر یونیورسٹی کا چکر لگوایا تھا“، ایک طرف موجود پتھر پر نظر پڑتے ہی نور نے اُسے جلدی سے اٹھایا۔

”سوری مس نور، میں نے آپ کو بے وقوف نہیں بنایا بلکہ آپ تو بنی بنائے ہیں“، آنکھوں میں مصنوعی خوف لیے ارحم نے ایک بار پتھر سے نور کو غصہ دلایا جواب ہاتھ میں پتھر کپڑے اُس پر نشانہ کس چکی تھی۔

”نور یا مری بات سنو، یہ تو ہے ہی بد تمیز تم کیوں اس کی باتوں میں آئیں“، رابعہ نے بات گلترتی دیکھ کر جلدی سے مداخلت کی۔

”میں اس کی باتوں میں نہیں آئی تھی اس نے جان بوجھ کر مجھے پاگل بنایا اور رابعہ تم پیچھے ہٹوں میں اس کا سر پھاڑ دوں گی“، نور نے اُسے پیچھے کرنے کی کوشش کی۔

”تو پھاڑو، منع کس نے کیا ہے“، ارحم نے رابعہ کے پیچھے سے سر نکالتے اُسے مزید چڑایا تو نور نے مزید کچھ سوچے بغیر ہاتھ میں پکڑا چھوٹا سا پتھر اُس کے پاؤں پہ مارا۔

”ہائے اللہ میں مر گیا، توبہ یہ لڑکی تو سچ میں پاگل ہے اپنا پاؤں پکڑتے بیٹھ پر بیٹھتے ہوئے ارحم نے دوہائی دی تو نور نے جلدی سے ہاتھ میں پکڑا دوسرا پتھر ایک سائیڈ پہ پھینکا۔

”زیادہ لگی ہے کیا؟“، رابعہ اُس کے سب ڈرامے سمجھتی تھی اسی لیے کمر پہ ہاتھ رکھے وہیں کھڑی رہی جبکہ نور نے جلدی سے اُس کے قریب بیٹھتے پوچھا۔

”ہاں بہت زور سے لگی ہے“، ارحم نے جوتے سے پاؤں نکالتے نور کو دکھایا جو پریشانی سے اب اُس کے پاؤں پر چوٹ ڈھونڈ رہی تھی۔

”پر یہاں تو کچھ نہیں ہوا“، چہرے پر فکر مندی کے آثار سجائے اُس نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا جو اُسے رونے کے لیے تیار دیکھ کر مسکرانے لگا تھا۔

”ویسے تم بہت پیاری ہو، کیا میری بہن بنو گی؟“ نظریں اُس کے چہرے پر جمائے ارحمنے پاؤں والپس جوتے میں ڈالتے سوال کیا تو نور نے جواب دینے کی بجائے ایک نظر اُس ڈرامے باز شخص کے چہرے پر ڈالی۔

”بہن؟“

”ہاں نا میں تو تمہیں بیوی بنانے کا سوچ رہا تھا پر یہ جو چڑیل کھڑی ہمیں خاموشی سے دیکھ رہی ہے نا؟ رابعہ کی طرف اشارہ کرتے ارحمنے اپنی بات کو جاری رکھا۔ یہ میرا قتل کردے گی اس لیے پلیزا بھی کے لیے تم میری بہن ہی بن جاؤ، آنکھوں میں شرارت بھرتے ارحمنے باآسانی نور کا دھیان اپنی چوٹ والی بات سے ہٹا دیا تھا۔

”مطلوب یہ آپ کی بیوی ہے؟“ اس کی بات سنتے ہی نور نے پوری آنکھیں کھولیں۔

”نہیں پر متوقع بیوی ہے اس لیے تم زیادہ پریشان نہ ہو“، رازدارانہ انداز میں کہتے ارحمنے اُسے تسلی دی جس کے چہرے پر اب مسکراہٹ آچکی تھی۔

”نور تم اس کی باتوں میں بالکل مت آنایہ بہت چالاک ہے“، نور کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھتے ہی رابعہ نے اُن کے قریب بیٹھتے اُسے خبردار کیا۔

”ہوننہ بس کبھی میرا فائدہ مت ہونے دینا“، ارحمنے رابعہ کی بات سنتے ہی خود کلامی کی۔

”تم نے کچھ کہا؟“

”نہیں میری اتنی مجال، توبہ کرو“، کانوں کو ہاتھ لگاتے ارحم نے عمر کے آواز لگانے پر اٹھ کر دوسری طرف کا رخ کیا اور نور بھی رضاکی کال آنے پر رابعہ کو اللہ حافظ کہتے گیٹ کی جانے بڑھ گئی۔

ماضی

زارون پچھلے دو گھنٹوں سے حبہ کی کال کا انتظار کر رہا تھا پر اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی اُس کی کوئی کال نہ آئی تو اُس نے خود ہی حبہ کا نمبر ملا یا، تاکہ اُس سے وہاں کے حالات کے بارے میں جان سکے۔

”السلام علیکم حبہ کہاں ہو تم؟ اور کیا بنا امی ابوا بھی تک وہیں ہیں کیا؟“، زارون نے دوسری طرف کال روپیسو ہوتے ہی بے چینی سے پوچھا۔

”جی چلے گئے ہیں“، اپنی آواز کو حتی الامکان ٹھیک رکھنے کی کوشش کرتے حبہ نے جواب دیا۔

”کیا ہوا تم رورہی ہو؟؟؟“ اُس کی بھرائی ہوئی آواز کو سنتے ہی زارون نے اندازہ لگایا۔

”نہیں رو نہیں رہی، وہ گلا خراب ہے میرا رات سے“، خود پہ ضبط کرتے اُس کی زارون کو کچھ بھی بتانے کی ہمت نہ ہوئی۔

”اچھا، تم نے مجھے تو نہیں بتایا اور کیوں گلا خراب ہے؟ کیا کھایا تھا؟ یقیناً کچھ اللہ سیدھا کھایا ہو گا“

”جی بس رات کو آئسکریم کھائی تھی“، اُس کی فکر مندی پر حبہ کے آنسوؤں نے بند توڑا۔

”تب ہی خراب ہوا، کتنی بار کہا ہے کہ ایسی الٹی سیدھی چیزیں مت کھایا کرو پر تمہیں اثر نہیں ہوتا“، اپنی ہی دھن میں بولتے وہ اُسے ایک بار پھر سے ڈانتے ہوئے نصیحتیں کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے دوبارہ نہیں کھاؤں گی“، اُس کی بے شمار نصیحتیوں کے جواب میں حبہ نے مختصر سا جواب دیتے بات ختم کی۔

”اچھا بس خیال رکھو کرو اپنا، اور کیا بنا انکل آنٹی نے کیا جواب دیا؟“، اصل بات پر آتے زارون نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں، بننا کیا تھا اور مجھے لگتا ہے آپ کو آنٹی انکل کی زبانی سب سننا چاہیے“

”ہونہ مطلب تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی؟“

”نہیں“

”کیوں؟“

”ویسے ہی میں چاہتی ہوں کہ انکل آنٹی آپ کو سب بتائیں“

”اچھا ٹھیک ہے۔ میں اُن سے پوچھ لوں گا اور اب تم بتاؤ کیسے لگے تمہیں اپنے سر اال والے؟“ زارون نے اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے ایک اور سوال کیا۔

”میں ملی ہی نہیں“، حبہ کی زبان سے سچ نکلا۔

”مطلوب؟ تم کیوں نہیں ملیں؟ وہ تم سے ہی تو ملنے آئے تھے“، اُس کی بات سنتے ہی زارون کے لان میں چھل قدمی کرتے قدم رکے۔

”حبہ کیا ہوا ہے؟ بتاؤ مجھے، امی ابو نے کچھ کہا ہے کیا؟ کیا مسئلہ ہے تم کچھ چھپا رہی ہو نا مجھ سے؟“ دوسری طرف خاموشی محسوس کرتے زارون نے ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

”آنٹی انکل نے کچھ نہیں کہا“

”تو کیا ہوا، تم کیوں نہیں ملیں؟“

”امی نے رشتے سے انکار کر دیا ہے اور انکل آنٹی کی بہت بے عزتی کی ہے۔ زارون پلیز میرا ایقین کرو میں نے رات کو امی سے بات کی تھی تب انہوں نے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا تھا“، حبہ

نے اپنی صفائی دیتے بات کو جاری رکھا۔ ”پتا نہیں امی کو کیا ہو گیا ہے کیوں انہوں نے ایسا کیا، ابو بتا رہے تھے کہ امی نے بہت بُرا بھلا کہا انکل آنٹی کو پروہ خاموشی سے سنتے رہے۔ میں تو نیچے سے بلاوے کا انتظار کر رہی تھی پر جب کوئی نہیں بلانے آیا تو میں خود نیچے گئی تب تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ امی نے اپنے عمل سے نہ صرف مجھے بلکہ ابو کو بھی بہت شرمندہ کیا۔ میں خود انکل آنٹی سے معافی مانگوں گی،“، حبہ نے آفندی صاحب کی زبانی سنی بات زارون کو بتائی۔

”زارون کیا ہوا؟ آپ سن رہے ہیں نا؟“ اپنی بات ختم کرتے دوسری طرف بالکل خاموش محسوس کرتے ہوئے حبہ نے پوچھا۔

”ہاں سُن لیا ہے میں کچھ دیر میں تم سے بات کرتا ہوں“، حبہ کی تمام باتیں سننے کے بعد زارون نے کال کاٹ دی۔

”زارون، میری بات...“، حبہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی زارون کے کال کاٹنے پر خاموش ہو گئی۔

”امی میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی“، دوبارہ سے نمبر ڈائل کرتے اس نے خود کلامی کی۔

”زارون پلیز کال ریسیو کرو“، مسلسل جاتی بیل پر بھی جب دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو حبہ نے بے چینی سے مسجح ٹائپ کرتے سینڈ کیا جسے پڑھتے ہی زارون نے موبائل آف کر دیا۔ وہ اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ حبہ کی باتیں سننے کے بعد اس کا دماغ کام کرنا چھوڑ

رہا تھا اسے رہ رہ کر اپنی جلد بازی اور سارہ بیگم پہ غصہ آرہا تھا جنہوں نے صرف دولت کی ہوس میں اُس کے والدین کو اتنا ذلیل کیا۔

---

## ماضی

حبہ اُسے بار بار فون کر رہی تھی پر زارون کا موبائل پچھلے تین گھنٹوں سے مسلسل آف تھا۔  
”زارون پلیزا ایک بار میری کال رسیو کرو“، حبہ نے بے شمار میسجز کرنے کے بعد ایک آخری کوشش کی۔

”ٹھیک ہے اگر اسے میری فکر نہیں تو میں کیوں رور و خود کو ہلکا ن کر رہی ہوں“، حبہ کو زارون کی طرف سے اتنی سکند لی کی امید نہیں تھی اور سارہ بیگم کے با تین سنانے میں اُس کا کیا قصور تھا جو وہ اس طرح اُسے سزادے رہا تھا۔

”میں بھی اب دوبارہ فون نہیں کروں گی“، دل میں ارادہ کرتے اُس نے واش روم کا رخ کیا تاکہ فریش ہو سکے اور دوسری طرف زارون جوتب سے غصے کی آگ میں جل رہا تھا اُس نے احمد صاحب کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی جلدی سے نیچے کا رخ کیا۔

”امی آپ ٹھیک ہیں؟“ عابدہ بیگم کو اندر دا خل ہوتا دیکھ کر اُس نے فکر مندی سے سوال کیا۔

”ہاں پیٹا ٹھیک ہوں میں اور یہ تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اُڑی ہوئیں ہیں؟“ گھر میں سب خیریت ہے نا؟“ اُس کے زرد پڑتے رنگ کو دیکھتے ہوئے عابدہ بیگم نے نرمی سے پوچھا۔

”جی سب ٹھیک ہے“، اُن سے نظریں ملائے بغیر زارون نے جواب دیا اور احمد صاحب کی جانب بڑھا۔

”بھئی کیا ہو گیا ہے یہ تم ہم سے ایسے کیوں مل رہے ہو جیسے ہم صدیوں بعد گھر آئے ہوں“، اپنے چہرے یا لبجھ سے کسی بھی قسم کی کوئی بھی بات ظاہر کیے بغیر احمد صاحب نے اُسے خود سے الگ کیا۔

”سوری ابو“، اُن سے نظریں ملائے بغیر زارون نے اُن کا ہاتھ تھاما۔

”کس بات کی سوری؟“ سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے احمد صاحب سب جانتے بوجھتے انجان بن گئے۔

”مجھے حبہ نے سب بتایا ہے کہ اُس کی امی نے کیسے آپ کو باتیں سنائیں۔ سب میری وجہ سے ہوا میں آپ کونہ وہاں جانے کا کہتا اور نہ یہ سب ہوتا“، چہرے پر شرمندگی لیے اُس نے عابدہ بیگم کا بھی ہاتھ تھاما۔

”کچھ نہیں ہوتا یا رشتؤں میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں اور انکار یا اقرار کرنا بھی بیٹھی والوں کا حق ہوتا ہے“

”پر ایسے کسی کو بے عزت کر کے انکار کرنا کسی کا حق نہیں۔ وہ آپ کو ویسے ہی منع کر دیتیں تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوتا“

”اچھا تم پر بیشان نہ ہو، اُن کا جتنا ظرف تھا انہوں نے اُس کے مطابق جواب دیا“، اب کی بار عابدہ بیگم نے اُسے سمجھایا جو ان دونوں کا ہاتھ پکڑے ابھی تک نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

”پلیز مجھے معاف کر دیں میں اب اپنی زبان سے کبھی حبہ کا نام نہیں لوں گا“، آنکھوں میں نمی لیے اُس نے اُن دونوں کی طرف دیکھا تو عابدہ بیگم نے اُس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھتے اپنے ساتھ لگایا۔

”ادھر آدمیرے پاس بیٹھو“، اپنے ساتھ صوف کی جانب لاتے انہوں نے زارون کو اپنے پاس بیٹھایا۔

”دیکھو زارون ہمیں تمہاری خوشی بہت عزیز ہے اور اگر جب تمہیں نہ بتاتی تو ہم یہ سوچ کے آئے تھے کہ ہم دونوں تمہیں کچھ نہیں بتائیں گے اور ایک بار پھر سے آندھی صاحب سے بات کریں گے....“

”نہیں امی اب آپ کبھی ان سے بات نہیں کریں گی کیونکہ مجھے آپ لوگوں کی عزت اپنی خوشی سے زیادہ عزیز ہے اور جہاں میرے ماں باپ کی عزت نہیں میں وہاں سب کچھ قربان کر دوں گا“، احمد صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے زارون نے عابدہ بیگم کی بات کاٹتے ہوئے جلدی سے بولا۔

”کسی بھی معاملے میں اس قدر جذباتی نہیں ہوتے اس لیے خود کو پر سکون رکھو۔ باقی اگر جب تمہاری قسمت میں ہوئی تو اس کی والدہ جتنی بھی کوشش کر لیں وہ تمہیں مل کے رہے گی“، احمد صاحب نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے تسلی دی۔

”پر، ابو....“

”بس اب چھوڑ اس بات کو بعد میں ڈسکس کریں گے اور اٹھو ہمارے لیے چائے بناؤ کر لاؤ“، احمد صاحب نے اُس کے دل کا بوجھ ہلا کرتے اُسے مزید کچھ بولنے سے روکا۔

”ٹھیک ہے میں بناؤ کر لاتا ہوں آپ جب تک ہاتھ منہ دھو کے فریش ہو جائیں“، اُن کی باتوں اور لمحے سے زارون کو تھوڑی تسلی ہوئی تب ہی اُس نے اٹھ کر کچن کا رخ کیا۔

”پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی میرے بچے کی خوشیوں کو“، زارون کے جاتے ہی عابدہ بیگم نے آہ بھری۔

”آپ پریشان مت ہوں اللہ سب بہتر کرے گا“، احمد صاحب نے پریقین لمحے میں کہتے ہوئے کمرے کا رخ کیا تو عابدہ بیگم بھی آمین بولتے اُن کے پیچھے ہی اپنے کمرے کی جانب بڑھیں۔

-----

”ماما دیکھ لیں رضا پا نج منٹ کا بول کر گیا تھا پر اب پورے بیس منٹ گزر چکے ہیں اور وہ ابھی تک نہیں آیا“، نور جو فنکشن میں جانے کے لیے تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلی تھی اُس نے رضا کی بائیک صحن میں نہ پا کرنا نہ بیگم سے شکایت کی۔

”بیٹا آجائے گا تم کیوں پریشان ہو رہی ہو“، نائلہ بیگم نے کمرے سے باہر آتے اُس سے تسلی دی جو بار بار کلاک کی جانب پریشانی سے دیکھ رہی تھی۔

”میں نے رابعہ سے کہا بھی تھا کہ مجھے نہیں آنا پر اُسے تو میری کوئی بات سمجھہ ہی نہیں آتی“، اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے اُس نے جھنجھلاتے ہوئے لاڈنچ سے نکل کر گیٹ کی جانب دیکھا۔

”جب بھی میں نے کہیں جانا ہو یہ رضابد تمیز ایسے ہی مجھے لیٹ کروادیتا ہے“، نور نے واپس لاڈنچ میں آتے ایک بار پھر سے نائلہ بیگم سے شکایت کی جواب کچن میں موجود روٹی بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔

”نہیں لیٹ کرواتا اور فنکشن میں سب سٹوڈنٹس ہی لیٹ آتے ہیں اس لیے تم بھی سات بج تک جانا“، فرتنچ سے آٹا انکال کر سلپ پر رکھتے نائلہ بیگم نے اُسے سمجھایا۔

”اچھا ٹھیک ہے اور آپ دیکھیں میں اچھی لگ رہی ہوں نا؟“، ان کی بات سن کر نور نے اثبات میں سر ہلاتے ایک اور سوال کیا۔

”ماشاء اللہ بہت پیاری لگ رہی ہو“، اُس کے سادہ سے بلیک فراک کو دیکھتے جس کے ساتھ اُس نے اُسی رنگ کا ٹراوزر اور دوپٹہ لیا تھا، نائلہ بیگم نے تعریف کی۔

”تحقینک یوپر مامواہاں تو سب لڑکیاں اتنا اتنا میک اپ کر کے آئی ہوں گی اور ہاں یونیورسٹی میں تو عام روٹین میں بھی لڑکیاں اتنے اسٹاٹکش کپڑے پہننے ہیں آج تو پھر فنکشن ہے“، وہ صحیح سے اپنے دماغ میں گھومتی بات کو لبؤں تک لا لی تو نائلہ بیگم کے روٹی بیلتے ہاتھ رکے۔

”نور بیٹا وہ جیسے بھی کپڑے پہنئیں آپ کو ان سے کوئی غرض نہیں، وہ میک اپ کریں نہ کریں ہمیں اس سے کیا۔ ہمیں تو وہ کرنا ہے جو ہمیں اچھا لگتا ہے اور کبھی بھی کسی کی طرف دیکھ کر اس جیسا بننے کی کوشش نہیں کرتے کیونکہ انسان کا سب سے بڑا خسارہ یہی ہے کہ وہ دوسروں کی طرف دیکھ کر یہ سوچے کہ جو اس کے پاس ہے وہ ہمارے پاس بھی ہواں طرح انسان ایک تو احساسِ کمتری کا شکار ہوتا ہے اور دوسرا اُس سے مایوسی اور ناشکری جیسے مرض لاحق ہو جاتے ہیں اس لیے میری جان جو اللہ پاک نے دیا ہے اُس میں خوش رہو اور ہمیشہ یہ سوچو کہ جو چیز آپ کے پاس نہیں ہے اُس میں اللہ پاک کی حکمت ہے اور جو ہے اُس میں بہتری اور ایک بات ہمیشہ یاد رکھو کہ اچھا لباس اور خوبصورتی سب وقتی ہیں اور آپ کے اچھے اخلاقِ دائی جو آپ کو دنیا میں بھی کامیاب کریں گے اور آخرت میں بھی“، نائلہ بیگم نے آسان لفظوں میں اُس کے دماغ میں چھائے اُس اندھیرے کو صاف کیا جس کی وجہ سے وہ کب سے اس کشمکش میں تھی کہ فنکشن پہ جائے یا نہ جائے۔

”ٹھیک ہے ماما مجھے سمجھ آگئی ہے اب میں دوبارہ ایسی بات نہیں کروں گی“، اُن کی بات کو باغور سننے کے بعد نور کے چہرے پر اعتماد کی چمک بکھری جسے دیکھتے ہی نائلہ بیگم کو کچھ اطمینان ہوا۔

”شاباش، اٹھو اپنا بیگ اور موبائل لورضا آگیا ہے“، باہر ہارن کی آواز سنتے نائلہ بیگم نے اُس سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھی۔

---

رضانے اُسے یونیورسٹی چھوڑا تو رابعہ اُسے گیٹ سے کچھ فاصلہ پہ ہی کھڑی اپنی منتظر ملی۔ ”شکر ہے آگئیں تم، میں کب سے یہاں کھڑی تمہارا انتظار کر رہی ہوں“، اُسے دیکھتے ہی رابعہ نے اُس کے سلام کا جواب دیتے کہا۔

”ہاں بس رضانے ملائم لگا دیا“، اُسے بھی اپنی طرح سادہ سے لباس میں ملبوس دیکھ کر نور کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ ”اچھا بس چلو پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے“، رابعہ نے اُس کی بات مکمل ہوتے ہی کہا اور اپنے ساتھ لیے یونیورسٹی کے اُس حصے کی جانب بڑھی جہاں فنکشن کا انتظام کیا گیا تھا۔

”اللہ یہاں تو بہتر شہ ہے“، نور نے ہال میں داخل ہی تمام نشستوں کو پر دیکھ جیرت سے کہا۔

”ہاں تو یار پورے ڈپارٹمنٹ کا فنکشن ہے رش تو ہو گا“، رابعہ نے کسی خالی نشست کی تلاش میں نظر دوڑاتے جواب دیا۔ ”آؤ ہاں بیسٹھتے ہیں“، ایک طرف اشارہ کرتے رابعہ اسے اپنے ساتھ لیے اُس جانب بڑھی جہاں اُن کی کلاس کی کچھ لڑکیاں پہلے سے ہی برجمان تھیں۔

”اللہ یہ کیا بھوت بن کے آگئی ہے،“ نور نے وہاں بیٹھتے ہی رابعہ کی طرف جھکتے سر گوشی کی۔ ”نور چپ کرو یار،“ رابعہ نے اُسے آنکھیں نکالتے تسبیہ کی۔ ”میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی کہ انسان تھوڑی کم بیس لگایتا ہے۔ دیکھو تو کتناز یادہ میک اپ کیا ہوا ہے جیسے فنکشن پہ نہیں بلکہ بھائی کے ولیے پہ آئی ہوں،“ رابعہ کی آنکھیں نکالنے کا اثر لیے بغیر نور نے اپنی بات مکمل کر کے ہی دم لیا۔

”افف نور تم کیوں ان کے ہاتھوں اپنی عزت افسرائی کا سامان پیدا کر رہی ہو،“ رابعہ نے زبردستی مسکراتے ساتھ بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو شائد ان کی باتیں سُن چکی تھی۔ ”ہاں تو میں کیا غلط بول رہی ہوں تم دیکھو تو صحیح کہ پاؤں کارنگ اور ہے، چہرے کا اور، انسان نے اگر بیس لگانی ہی ہے تو تھوڑی پاؤں پہ....“

”افف نور چپ کرو،“ اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی رابعہ نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔ ”ہونہے چپ ہی ہوں۔ یہ حراء ہے نا؟ جو ہم سے پچھلی چیز پر بیٹھتی ہے؟“ اُس کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹاتے اُس نے دو نشستیں چھوڑ کر بیٹھی لڑکی کی جانب اشارہ کیا۔

”ہاں وہی ہے“، اُس کی انگلی پکڑ کر نیچے کرتے رابعہ نے پھر ان کی طرف مسکرا کر دیکھا جو نور کے دیکھنے اور اشارہ کرنے کی وجہ سے اب پوری طرح ان کی جانب متوجہ تھیں۔ ”ہاں، وہی ہے“، رابعہ نے اُس کا ہاتھ دباتے جواب دیا۔

”توبہ میں نے تو پہچانا ہی نہیں“، پوری آنکھیں کھولتے اُس نے ایک بار پھر سے اُس کی طرف دیکھا۔

”نور اٹھو ہم پیچھے چل کے بیٹھتے ہیں“، رابعہ نے اُس کی بد تمیزیاں بڑھتی دیکھ کر اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ ”کیوں، پیچھے کیوں بیٹھنا ہے؟“ اپنا پاؤچ اٹھاتے اُس نے رابعہ کے ساتھ کھنچے ہوئے پوچھا۔

”کیوں کہ مجھے اُن چڑیوں سے جوتے کھانا کا کوئی شوق نہیں پر جو تمہارے حالات ہیں تم مجھے جوتے پڑوا کے ہی سانس لوگی“، وہاں سے اٹھ کر پیچھے والی نشستوں کی جانب بڑھتے اُس نے غصے سے جواب دیا۔

”مطلوب میں نے کوئی غلط بات کر دی تھی کیا؟“ چہرے پہ معصومیت لیے اُس نے تصدیق چاہی تو رابعہ نے اُس کا ہاتھ چھوڑتے اپنا سر پکڑا۔

”یا کیا چیز ہو تم حد ہے“، ماتھے پر بل ڈالنے والے سے مزید اُس کا ساتھ برداشت نہ ہوا تو وہ اُسے وہیں چھوڑ کر کچھ فاصلے پر موجود نشست پر جائیجھی۔

”سوری، میں اب کسی پہ تبصرہ نہیں کروں گی“، اُسے منه پھلانے بیٹھا دیکھ نور نے اُس کے ساتھ واپی نشست سن بھا لتے معدرات کی تو رابعہ نے استیج سے نظر ہٹا کر اُسے دیکھا۔

” وعدہ؟“، رابعہ کو ابھی بھی اُس پر شک تھا۔

”ٹھیک ہے وعدہ ہے پر تھوڑا کچا والا“، نور نے آنکھوں میں شرارت بھرتے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو رابعہ نے مسکراتے ہوئے اُسے گھورا۔

”اُفف تم ٹھیک نہیں ہو سکتیں“، واپس استیج پر نظریں جماتے رابعہ نے افسوس سے نفی میں سر ہلا یا تو نور نے بے فکری سے کندھے اچکائے اور استیج کی جانب دیکھا جہاں ایک لڑکا ہاتھ میں گٹار لیے کھڑا تھا۔

” یہ کون ہے؟“، اُس کی پشت تھی ان دونوں کی جانب تب ہی وہ اُس کا چہرہ نہ دیکھ سکی۔

” اس پیور سٹی کا سریلا سنگر زارون علی جس نے اُس دن تم پر غصہ کیا تھا“، نظریں استیج کی جانب مرکوز کرتے رابعہ نے اُس کا تجسس ختم کیا۔

”زارون؟ مطلب زار؟ وہ جلا د؟“ رابعہ کی بات سنتے ہی نور نے اُس کی جانب مڑتے حیرت سے اُس کی بات کی تصدیق چاہی تو رابعہ نے سر ہلاتے استھج کی جانب اشارہ کیا جہاں اب وہ نور کی نظروں کے بالکل سامنے اپنا گٹار لیے چیز پر بیٹھ چکا تھا۔

خدا کو دیکھ رہا ہو گا نادل تجھ سے جدا ہو گا تیری تقدیر میں مجھ کو وہ اب تو لکھ رہا ہو گ تیرا، ہی  
بس ہونا چاہوں تیرے درد میں رونا چاہوں تیرے دل کے ان زخموں پر مر ہم میں ہونا  
چاہوں کر لے قبول خدا یا میرے سجدے اب تو نصیب میں میرے اُسے لکھ دے کر لے قبول  
خدا یا میرے سجدے اب تو نصیب میں میرے اُسے لکھ دے

زارون نے گانے کا ایک بند مکمل کیا تو نور نے پوری آنکھیں کھولے اُسے حیرت سے دیکھا جواب  
گٹار پر اُسی گانے کی دھن بجارتھا۔

”ہائے یہ زار، ہی ہے نا؟“ اُس سے نظر ہلاتے نور نے رابعہ سے ایک بار اور پوچھنے کے ساتھ  
ہاتھوں سے اپنی دونوں آنکھوں کو مسلا، جیسے ابھی بھی اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آیا ہو۔

”ہاں تو زارون ہی ہے اور کون سا اس کا بھوت ہے ویسے یہ اُس دن تمہیں ڈانٹ کیوں رہا تھا؟“

رابعہ نے یاد آنے پر نور سے سوال کیا جواب نظریں اُس سے ہٹا کر واپس استیج پر جما چکی تھی۔

”دماغ خراب تھا اس لیے اور تم کیوں مجھے اُس دن کی یاد دلا کر میرا موڈ خراب کر رہی ہو،“ نور نے واپس اُس کی جانب دیکھتے تیوری چڑھائی۔

”میں نے کب موڈ خراب کیا؟ میں تو بس وجہ پوچھ رہی تھی اور اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو کوئی بات نہیں پھر کبھی بتا دینا،“ رابعہ نے لاپرواٹی سے جواب دیتے نور کے پیچھے کسی کو ہاتھ ہلا کیا تو اُس نے پلٹ کر دیکھا۔

”یہ ٹنڈے کی شکل والا تمہارا کزن پھر سے آگیا،“ ارحم کو اپنے قریب آتا دیکھ کر نور نے منہ میں بڑھاتے ہوئے سامنے دیکھا جہاں زارون اب اگلا بندگا نے لگا تھا۔

تو پھر ناسویا ہو گا، شاید پھر رویا ہو گا آنسو میری پلکوں پہ یو نہیں نا آیا ہو گا دینا مجھ کو آوازیں، یا سُن میری فریادیں گھیریں ہیں مجھ کو یادیں، بن تیرے تجھے ہی بس پانچا ہوں خود کو میں کھونا چاہوں تیرے دل کے ان زخموں پہ مر ہم میں ہونا چاہوں خدا کو دیکھ رہا ہو گا...“

”ہیلو لیڈیز، یہاں اتنا پچھے کیوں بیٹھی ہو؟؟“، ارحم نے اُن کے قریب آگر رابعہ کے ساتھ والی چیز پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ کی بہن کی مہربانی ہے“، رابعہ نے ارحم کی بات سننے اپنی آواز پنجی رکھتے طرز کیا۔

”مطلوب؟“

”مطلوب کے آپ کی بہن نے ساتھ بیٹھی لڑکیوں کے میک اپ پر ایسا تبصرہ کیا کہ ہمیں وہ جگہ چھوڑ کر یہاں آکے بیٹھنا پڑا“، رابعہ نے نور کو اپنی جانب متوجہ پا کر ارحم کو بتایا۔ ”تو کیا ہے میری بہن سچ بولتی ہے جو سب کو ہی بُرالگ جاتا کیوں نور؟ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“، ارحم نے رابعہ سے بات کرتے کرتے اُسے مخاطب کیا جوتب سے خود کولا تعلق ظاہر کیے خاموشی سے بیٹھی تھی۔ ”جی، ایسا ہی ہے“، ارحم کی ہاں میں ہاں ملاتے وہ مسکراتی۔ ”تمہیں ابھی ابھی ٹنڈے کی شکل والا کہا ہے اس نے“، اُسے مسکراتا دیکھ کر رابعہ نے ارحم کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہونہ اب اتنی بھی شکل نہیں بُری میری اور اتنا بھی سچ نہیں بولتی تمہاری دوست“، رابعہ کی بات سننے ہی ارحم نے منہ بسورا تو رابعہ کے ساتھ ساتھ نور کو بھی ہنسی آگئی۔ ”ہنس لو تم لوگ میں جا رہا اپنے دوست کے پاس“، اپنی بے عنقی سی محسوس کرتے ارحم وہاں سے اٹھ کر اسٹیچ کی جانب بڑھا جہاں زارون ابھی آخری بند گنگنا رہا تھا۔

دل نے عبادت کی ہے، تیری بس چاہتا کی ہے دل نے عبادت کی ہے، تیری بس چاہتا کی ہے  
 لکھ آیا رضیوں میں، تم بن جینا نہیں ہے مجھ میں اب میں کہاں ہوں تجھ میں رہنے لگا ہوں میں  
 تو بس جی رہا ہوں، بن تیرے تجھ خواب میں دیکھنا چاہوں تیری سانس میں کھونا چاہوں تیرے  
 دل کے ان زخموں پہ مر ہم میں ہونا چاہوں خدا کو دیکھ رہا ہو گا نادل تجھ سے جدا ہو گا تیری  
 تقدیر میں مجھ کو وہ اب تو لکھ رہا ہو گا

گانا ختم ہوتے ہی سارا اہال تالیوں سے گونج ٹھا سب لوگ پر جوش انداز میں زارون کو داد دے  
 رہے تھے جو گٹارہاتھ میں پکڑے سر خم کرتے سب کاشکریہ ادا کرتے ہوئے استھن سے اٹار تھا۔  
 ”واہ بھئی کیا بات ہے“، ارحم نے زارون کے قریب جاتے تعریف کی جو مسکراتے ہوئے اُس  
 کے گلے لگا۔

”ہاں بس سرنے کہا تو میں انکار نہیں کر سکا۔ تم سناؤ کب آئے ہو؟“ اُسے اپنے ساتھ لیے رش کی  
 وجہ سے ہال سے باہر نکلتے زارون نے بتایا اور اُس سے لیٹ آنے کی وجہ پوچھنے لگا۔

-----

اللہ اللہ کر کے فنکشن ختم ہوا تو نور نے رابعہ کے روکنے کے باوجود بھی رضا کے آنے کا کہتے باہر کا رخ کیا۔

”ہائے اللہ اتنی رات ہو گئی ہے، کاش میں رابعہ کی بات مان لیتی اور اُسے اپنے ساتھ گیٹ تک لے آتی“، جلدی جلدی گیٹ کی جانب قدم اٹھاتے اُس نے لان میں پھیلے اندھیرے سے خوف کھاتے جھر جھری لی اور اپنی رفتار مزید تیز کی۔

”اللہ پلیز آج خیر خیریت سے گھر پہنچا دے دوبارہ میری توبہ جو میں رات کو کسی فنکشن میں آئی“، منہ میں بڑ بڑاتے اُس نے تقریباً بھاگتے ہوئے گیٹ تک پہنچنے کی کوشش کی اور اپنے ہی دھیان میں چلتے وہ سامنے سے آتے کسی وجود سے ٹکرائی۔

”ہائے اللہ بھو و و ووت“، اندھیرے کی وجہ سے نور کو کچھ سمجھ نہیں آئی تب ہی اُس نے گھٹی ہوئی آواز میں چخ ماری۔

”ہونہ میں بھوت نہیں بلکہ تم چڑیل ہو“، اُسے خود سے الگ کرتے زارون نے نیچے پڑا اُس کا پاؤچ اٹھایا۔

”اُفف زار آپ ہیں، توبہ مجھے لگا کوئی بھوت ہے“، نور نے اُس کی آواز سنتے ہی اپنی رکی ہوئی سانس بحال کی۔ ”چڑیوں کو بھوت ہی نظر آتے ہیں انسان نہیں مس نور“، پاؤچ اُس کی جانب بڑھاتے

زارون نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اُس کا جائزہ لیا جو چہرے پر گھرا ہٹ اور پریشانی کے آثار لیے اُسے گھور رہی تھی۔

”زیادہ فری مت ہوں میرے ساتھ اور ہاں پلیز مجھے گیٹ تک چھوڑائیں مجھے ڈر لگ رہا ہے“، نور نے اُسے مسکراتا دیکھ کر فوراً ہی اپنا مطلب نکالنے کی کی۔

”ٹھیک ہے چلیں“، زارون اُس دن کی غلطی کا مد او اکرنے کے لیے ہی فوراً ہی اُس کی مدد کے لیے تیار ہو گیا۔

”وہ میں نے آپ سے معتدرت کرنی تھی اُس دن مجھے کچھ زیادہ ہی غصہ آگیا تھا“، دو قدم چلتے زارون نے اُس کی جانب دیکھے بغیر بات کا آغاز کیا۔

”زیادہ نہیں بلکہ بہت زیادہ غصہ کیا آپ نے اُس دن۔ وہ بھی سب کے سامنے پتا ہے کتنا روئی میں اور ہاں وہ آپ نے میرا بازو دبایا اُس کا نشان ابھی تک میرے بازو پہ ہے“، اُس کے معتدرت کرتے ہی نور نے اُسے مزید شرمندہ کیا۔ ”سوری، بس اُس وقت غصے میں مجھے کچھ سمجھ نہیں آئی“، زارون نے اُس کی بات سننے پھر سے معتدرت کی۔

”میری ماما کہتی ہیں انسان کو غصے میں اپنی سمجھ قائم رکھنی چاہیے ورنہ بڑے بڑے نقصان ہو جاتے ہیں“، نور نے آہستہ آہستہ قدم آگے بڑھتے اُسے مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے میں آئیندہ کوشش کروں گا کہ آپ کی ماماکی بات پر عمل کروں“، زارون نے گیٹ پر پہنچنے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے جواب دیا۔

”تھیک یو، ویسے تو میں اتنی بھی ڈرپوک نہیں ہوں کہ اتنا تھوڑے سے فاصلہ کے لیے آپ جیسے بد تمیز انسان کی مدد لیتی پر میں نے محسوس کیا کہ آپ مجھ سے معافی مانگنا چاہتے ہیں تب ہی میں نے آپ پر ترس کھاتے آپ سے مدد لیتا کہ آپ مجھ سے معافی مانگ سکیں اس لیے مجھے ڈرپوک بالکل مت سمجھیے گا“، گیٹ پر رکتے نور نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

”شکریہ کہ آپ نے مجھ پر احسان کیا“، زارون نے سر خم کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی جھکتے اس کی احسان نوازی کو دل سے قبول کیا۔

”خبر ہے کوئی بات نہیں میں ایسے چھوٹے موٹے احسان سب پہ کرتی رہتی ہوں“، آنکھوں میں چمک لیے نور نے جتنا ضروری سمجھا۔

”ویسے آپ بہت اچھا گاتے ہیں پر کاش کے آپ خود بھی اچھے ہوتے“، نور نے گیٹ سے باہر نکلتے واپس مرکر تعریف کے ساتھ ایک ٹھنڈی آہ بھری تو زارون نے اب کی باراؤ سے گھوری سے نوازا جسے دیکھتے ہی نور نے مسکراتے ہوئے قدم باہر کی جانب بڑھائے۔

”پاگل لڑکی“، اُس کے باہر نکلتے ہی زارون نے خود کلامی کی اور اپنے دل کی تسلی کے لیے واپس جانے کی بجائے چند منٹ وہیں کھڑا ہو کر اُسے دیکھتا رہتا کہ وہ ٹھیک سے اپنے بھائی تک پہنچ جائے جو گیٹ سے کچھ فاصلہ پر کھڑا تھا۔

---

”آپ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ اگر آئندہ آپ کو اس وقت کسی فنکشن میں جانا ہو تو، میں نہ تو آپ کو چھوڑنے آؤ گا نہ ہی لینے“، نور کے بیٹھتے ہی رضا نے اُسے سنائی۔  
 ”تونہ آتا میں بابا کو بول دوں گی“، اُس کی بات سنتے نور نے لاپرواں سے کندھے اچکائے تو رضا کو مزید غصہ آیا۔

”سارا دن بھی میں آپ کے کام کروں، کبھی رضا یہ لادو، کبھی وہ اور رات کو بھی مجھ معموم جان کو آپ اور ماما کہیں چین نہیں لینے دیتیں“، رضا نے اُس کی لاپرواں دیکھتے ایک بار پھر سے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کارونارویا۔

”بس کرو ہمارے کام تم فری میں نہیں کرتے ہر کام پہ تم اپنا کمیشن لیتے ہو، صحیح یاد ہے ناجب ماں نے تمہیں دہی لانے کا کہا تھا تو تم نے پورے سوروپے رشوٹ کے طور پر لیے تھے“، نور نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ مارتے یاد ہانی کروائی تو رضا نے منہ بسورا۔

”بس کریں میں نے کب رشوٹ لی وہ تو مامانے خود زبردستی دیے تھے“  
”ہاں جانتی ہوں تم تو نہیں لے رہے تھے اور ویسے میں بھی تمہیں گھر پہنچ کر کچھ رشوٹ دینے کا ارادہ رکھتی تھی پر...“، نور اپنی بات مکمل کیے بناء ہی رکی۔

”پر کیا؟“ موڑ کا ٹنٹے رضا نے بے چینی سے پوچھا۔

”پر یہ کہ تم تو رشوٹ لیتے نہیں وہ تو مامانے زبردستی دیے تھے نا“، نور نے اُس کی بات اُسی کو لوٹائی۔

”ہوننہ ابھی میں اتنا بھی ایماندار نہیں ہوا کہ ہاتھ آئی دولت سے انکار کروں اور ویسے بھی جو پسیے آپ مجھے دیں گی وہ رشوٹ نہیں بلکہ میری محنت کی کمائی ہو گی“، رضا نے اُس کی بات سننے ہی جلدی سے صفائی پیش کی۔

”کوئی محنت؟ اور شرم تو نہیں آتی بہن کے کام کے لیے اُس سے پسیے مانگتے ہوئے“، نور نے ایک اور چیت اُس کے کندھے پر رسید کرتے اُسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

”جب بہن کو شرم نہیں آتی اپنے معصوم بھائی کو بار بار مارتے ہوئے تو بھائی کو پسیے لیتے کیوں آئے اور ہاں آپی میں سوچ رہا تھا کہ میری تو چند سالوں میں آپ سے جان چھوٹ جائے گی پر اُس بچارے کا کیا ہو گا؟“، بائیک آہستہ کرتے رضانے تشویش کا اظہار کیا۔

”مطلوب؟“

”مطلوب یہ کہ وہ معصوم تو ساری زندگی آپ کی مار کھائے گا تو بہ توبہ مجھے تو ابھی سے اُس کی حالت کا سوچ کے ترس آرہا ہے“، رضانے لمحے میں افسردگی سموتے نفی میں سر ہلا کیا۔

”کس پہ ترس آرہا ہے؟“، اُس کی بات سنتے نور نے نامموجھی سوال کیا۔

”اُسی پہ جس سے آپ کی شادی ہو گی بچارہ جنتی انسان، زندگی میں ہی سارے عذاب برداشت کر لے گا“، رضانے جتنے دکھ بھرے لمحے میں کہا نور نے سمجھ آتے اُتنی ہی زور سے اُسے تھپٹر سید کیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارا وہ بچارہ جنتی انسان۔ شرم تو نہیں آتی بہن سے ایسی باتیں کرتے ہو، بس تم پہنچو گھر میں جاتے ہی بابا کو بتاؤں گی“، نور نے غصے اور خفگی سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اُسے دھمکی دی جو بائیک ایک آئسکریم پارلر کے سامنے روک چکا تھا۔

”مطلوب آپ نے آئسکریم نہیں کھانی؟“

”آئسکریم؟ تم کھلاوے گے؟ نور نے بائیک سے اترتے حیرت سے پوچھا۔

”جی میں ہی کھلاوں گا کیونکہ آج مجھے پاکٹ منی ملی ہے تو میں نے سوچا کہ کسی غریب کو کچھ کھلا دوں تاکہ پورا مہینہ میرے پیسوں میں برکت رہے، سنجیدگی سے کہتے رضا نے بائیک کو ایک سائیڈ پلے لگایا۔

”میں تمہیں غریب نظر آتی ہوں؟ دفع ہو جاؤ مجھے نہیں کھانی آئسکریم، بس گھر چلو نور نے اب کی بار غصہ سے کھاتور رضا کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

”اچھانا آپی اب ناراض نہ ہوں اور اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ غریب نہیں تو بل آپ دے دیجیے گا، ہوشیاری سے اپنا کام نکلواتے رضا نے اُس کی جانب دیکھا جو منہ پھلانے کھڑی اُسے گھور رہی تھی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے، ایسے تم غیریب لگو گے، رضا کا مشورہ سنتے ہی نور نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے خوشی خوشی حامی بھری۔

”ٹھیک ہے کوئی بات نہیں، آپ کی خاطر تو میں غریب، فقیر، مسکین سب بننے کے لیے تیار ہوں اپنے مقصد کو کامیاب ہوتا دیکھ کر رضا نے فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے کہا اور اُس کے پیچھے ہی اندر کی جانب بڑھا۔

## ماضی

دودن گزرنے کے بعد بھی جب زارون نے اُس کی کال رسیو نہیں کی اور نہ ہی مسج کا کوئی جواب دیا تو حبہ نے غصے میں سارہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا جن سے وہاب تک ناراض تھی۔ دروازے پر دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی تو سارہ بیگم اپنی کسی دوست سے بات کرنے میں مصروف تھیں۔ ”شناہ میں تمہیں کچھ دیر میں کال کرتی ہوں“، حبہ کو دیکھتے ہی انہوں نے مو باٹل کے دوسری جانب کہا اور مو باٹل بند کرتے سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔

”مجھے آپ سے بات کرنی ہے“، حبہ نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”ہاں کرو“، سارہ بیگم نے بے اعتنائی بر تے پر سکون لجھے میں اجازت دی۔

”میں چاہتی ہوں کہ آپ زارون کے والدین سے اپنے رویے کی معافی مانگیں وہ بھی آج ہی“، حبہ نے بغیر کوئی تمہید باندھے اصل بات پر آتے سارہ بیگم سے کہا جو اُس کی بات سنتے ہی اگ بگولہ ہوئیں۔

”دماغ ٹھیک ہے تمہارا؟؟ یا اس لڑ کے نے وہ بھی خراب کر دیا۔ میں اور معافی وہ بھی ان بے کار لوگوں سے کبھی نہیں“، سارہ بیگم نے حبہ کی بات سنتے ہی درشتی سے جواب دیا۔

”امی پلیز آپ کیوں ضد کر رہی ہیں۔ وہ لوگ اچھے خاصے امیر ہیں اور میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ان سے رشتہ داری کرنے پہ آپ کی ناک نہیں کٹے گی۔ پلیز میرا یقین کریں زارون بہت اچھا لڑکا ہے اور سب سے بڑی بات کہ وہ مجھے پسند ہے۔ آپ نے تو کبھی میری کسی بات سے انکار نہیں کیا اور نہ ہی کبھی میری پسند کی ہوئی چیز کو رد کیا ہے تواب کیوں آپ ایسا کر رہی ہیں؟“، حبہ نے غصے سے بات بتتی نہ دیکھ کر اپنے لہجے کو نرم کیا۔

”کیونکہ میں جانتی ہوں کہ یہ تمہاری پوری زندگی کا فیصلہ ہے اور تم اسے جذباتی ہو کر کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ حبہ میری جان ادھر آؤ“، سارہ بیگم نے اُس کی سرخ سو جھی ہوئی آنکھوں کو دیکھتے پیار سے اپنے قریب بُلا یا۔ ”دیکھو بیٹا تم جس ماحول میں پلی بڑھی ہو وہ اُس ماحول سے بہت مختلف ہے جس میں تم جانے کا فیصلہ کر رہی ہو۔ تم نے جو آرام و آسانیات یہاں دیکھی ہیں وہ زارون تمہیں چاہ کر بھی کبھی نہیں دے سکتا“، سارہ بیگم نے اُس کا ہاتھ تھماتے سمجھانے کی کوشش کی۔

”امی زندگی کے لیے آرام و آسائش سے زیادہ عزت و احترام اور پیار کی ضرورت ہوتی ہے اور میں زارون کے ساتھ ہر حال میں گزارا کر سکتی ہوں کیونکہ وہ میری پہلی محبت ہے جسے میں نے دل و جان سے چاہا ہے پلیز آپ میری بات کو سمجھیں اگر میں اُس کے بغیر نہیں رہ سکتی تو میرے لیے آپ کے اور ابو کے بغیر بھی زندگی گزارنا مشکل ہے اس لیے آپ مجھے اس امتحان میں نہ ڈالیں جس میں مجھے خسارے کا سودا کرنا پڑے“، حبہ نے بے بسی سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات کمل کی۔

”خسارے کا سودا تو تم اب کر رہی ہو۔ یہ پیار محبت کچھ نہیں ہوتا یہ سب ایک دنیاوی دھوکہ ہیں جب ان کی چمک ختم ہوتی ہے اور آپ کو زندگی کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کسی اور کام تھا جو ناپڑتا ہے تو تب سمجھ آتی ہے کہ زندگی پیار محبت اور عزت و احترام کے میسر ہونے سے آسان نہیں ہوتی بلکہ اس لیے آرام، سکون اور آسائشیں بھی ضروری ہیں“، سارہ بیگم نے اپنا موقف بیان کرتے اُسے ہم خیال بنانے کی کوشش کی۔

”امی پلیز مجھے ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں آپ بس زارون کے والدین سے اپنے رویے کے لیے معافی مانگ لیں وہ بہت اچھے لوگ ہیں“، حبہ نے اُن کی باتوں کو پس و پشت ڈالتے ایک بار پھر سے اپنی بات کہی۔

”میں معاف نہیں مانگوں گی اس لیے تم بھی اپنی ضد چھوڑ اور بھول جاؤ اس لڑکے کو جس کی وجہ سے آج ہم دونوں میں اختلاف پیدا ہو رہا ہے“، اُس کا ہاتھ چھوڑتے انہوں نے اپنا فیصلہ سُنا یا توبہ نے خود کو مزید کوئی بات کہنا سے باز رکھتے خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

---

## ماضی

زارون جو پچھلے دو دنوں سے بالکل خاموش تھا عابدہ بیگم نے اُسے اپنے کمرے میں بلا یا۔ ”جی امی آپ نے بلا یا تھا؟“ دروازے پر دستک دیتے وہ اندر آیا۔

”ہاں، آؤ ادھر بیٹھو صوفے کی جانب اشارہ کرتے انہوں نے الماری کا دروازہ بند کیا جس میں وہ احمد صاحب کے کپڑے تھے لگا کر رکھ رہی تھیں۔

”جی، خیریت ہے؟“ صوفے پر بیٹھتے زارون نے سوالیہ نظر وہ سے انہیں دیکھا جواب اُس کے قریب آکر بیٹھ چکی تھیں۔ ”ہاں ہماری طرف سے تو سب خیریت ہے پر مجھے تمہاری طرف سے کچھ پریشانی ہے“، عابدہ بیگم نے نظریں اُس کے چہرے پہ جمائے بات کا آغاز کیا۔

، کیسی پر یشانی؟“، زارون نے انجان بننے سوال کیا۔

”تم نے دوبارہ حبہ سے بات نہیں کی؟“، اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے عابدہ بیگم نے اندازہ لگایا۔

”نہیں..“، اب کی بار زارون نے اُن سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

”کیوں؟“

”بس جب اب آگے زندگی میں ساتھ نہیں چلنا تو پھر میں بات کر کے اُسے یا اپنے آپ کو جھوٹی اور بے بنیاد تسلیاں کیوں دوں“، اپنے ہاتھوں پر نظریں جمائے اُس نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”مجھے پتا ہے اس وقت میرا اپنے ہٹ جانا مناسب نہیں تھا۔ مجھے حبہ کا ساتھ دینا چاہیے تھا پر امی آپ کو کیا لگتا ہے اگر میں اُس کا ساتھ دوں تو اُس کی امی ہمارے لیے مان جائیں گی؟“، زارون نے بات کے درمیان میں رکتے عابدہ بیگم سے پوچھا جو خاموشی سے اُس کی باتیں سُن رہی تھیں۔

”اگر وہ نہ بھی مانیں تب بھی تمہیں کوشش ضرور کرنی چاہیے کیونکہ تم نے حبہ سے کئی وعدے کیے ہو نگے اُسے اپنے ساتھ کئے خواب دکھائے ہو نگے تو اُنکے توب کسی کو اتنے آسرے اور سہارے دینے کے بعد ایک دم، ہی چھوڑ دینا ناصرف خود غرضی ہے بلکہ محبت کی بھی توہین ہے“، عابدہ بیگم نے بہت نرمی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

”پرائی میں تو اس لیے پیچھے ہٹا ہوں کہ میں اُس کے اور اُس کے گھروالوں کے درمیان آگر اُس کے لیے مزید مشکلات پیدا نہ کروں اور اگر پہلی ہی بار اُس کی امی نے آپ سے اتنی بد تمیزی کی ہے تو آگے جا کر اگر ہمارا ساتھ لکھا بھی ہو اتب بھی وہ ایسا ہی کریں گی کیونکہ انہیں لگتا ہے کہ میں اُن کی بیٹی کے قابل نہیں۔ پسیے کا غرور ہے انہیں اور انسان کی عادتیں بدل بھی جائیں پر فطرت کبھی نہیں بدلتی“، زارون نے اُن کی بات کو با غور سننے کے بعد اپنا موقف پیش کیا۔

”ہاں تمہاری بات بھی ٹھیک ہے ہمارا حق تم پہ حبہ سے بھی پہلے ہے اور تمہارا فرض ہے کہ ہماری عزت کرو اور کرو اپر زارون میں نہیں چاہتی کہ کل کو حبہ تمہارے سامنے سوال بن کر کھڑی ہو کہ تم نے اُسے کوشش کرنے کا ایک بھی موقع نہیں دیا اور بیٹا اس میں اُس بچی کا کوئی قصور نہیں وہ بے قصور ہے۔ بد کلامی تو اُس کی امی نے کی وہ توہر بات سے انجان شائد ہمارے سامنے آنے کی منتظر بیٹھی تھی اس لیے اُسے سزا مت دو کیونکہ عورت صرف محبت کرنے کا اختیار رکھتی ہے پر مرد مضبوط ہوتا ہے وہ محبت بھی کر سکتا ہے اور اُسے حاصل کرنا بھی اچھے سے جانتا ہے اس لیے مرد ہو کہ یہ بے بنیاد باتیں کہ میرے والدین کی بے عزتی ہوئی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا تمہاری امی نہیں مانیں میری بہن نہیں مانی۔ زارون یہ سب وہ باتیں ہیں جو انسان کو محبت کرنے والے سے دھوکہ باز بنا دیتی ہیں اور کیا تم چاہتے ہو کہ حبہ تمہیں دھوکہ باز سمجھے تم سے نفرت کرے؟“

”نہیں..“، عابدہ بیگم کے سوال کے جواب میں زارون نے پر سوچ انداز میں نفی میں سر ہلا�ا۔

”تو بس پھر جائز طریقہ اختیار کرتے ہوئے اُس کی امی کو منانے کی کوشش کرو اور جس معاملے میں تم طاقتور ہو اُس میں کبھی بھی خود کو کمزور ظاہر کر کے کسی کو اپنی ذات پر بات کرنے کا موقع فراہم نہ کرو باقی تب تک کوشش کرو جب تک تمہیں حبہ کی امی کے منانے کی تھوڑی سی بھی امید ہے“، عابدہ بیگم نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائتے اُسے حوصلہ دیا۔

”ٹھیک ہے میں بات کرتا ہوں حبہ سے کہ وہ اپنی امی سے بات کرے“، ان کی بات سن کر زارون کو خود بھی اپنے فیصلے پر شرمندگی ہوئی۔

”ٹھیک ہے، بس جب دوبارہ جانا ہو ہمیں بتا دینا، ہم پھر سے حبہ کے گھر چلے جائیں گے“، دوبارہ سے اٹھ کر بیڈ پر پڑے کپڑے الماری میں رکھتے عابدہ بیگم نے اُس سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے حبہ سے بات کرنے کی غرض سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکلا۔

~~~~~  
ماضی

زارون نے کمرے میں آتے ہی جبکہ کوکال ملائی جو چند بیل جانے کے بعد ہی رسیو کر لی گئی۔ ”کیسی ہو؟“ سلام کا جواب دیتے اُس نے دوسری طرف خاموشی محسوس کرتے ہوئے خود ہی بات کا آغاز کیا۔

”آپ کو کیا ہے میں جیسی بھی ہوں“، خفگی کا اظہار کرتے اُس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔  
”مطلوب ناراض ہو؟“

”نہیں، میں نے کیوں ناراض ہونا ہے ناراض ہونے کا حق تو بس آپ کے پاس ہے“، پلکیں جھکتے اُس نے آنسوؤں کو بند توڑنے سے روکا۔

”پتا ہے دودن میں کتنے گھنٹے، کتنے منٹ اور کتنے سینڈز ہوتے ہیں“، اعتراض کرتے آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں اُس کی آواز دھیمی ہوئی۔

”اُفف ایک تو تم لڑ کیاں، پتا نہیں کونسا پانی کا پلانٹ لگا ہے تم لوگوں کی آنکھوں میں جو ہر موقع پر رونے شروع کر دیتی ہو“، زارون نے اُس کے لمحے کی لڑکھڑاہٹ کو محسوس کرتے بات کو تبدیل کرنے کی کوشش کی۔

”ہوننہ نہ بات کریں مجھ سے، حد ہے امی کے اس طرح کے رویے میں میرا کیا قصور تھا جو دو دن آپ نے مجھے اتنی بڑی سزادی“، حبہ نے اُس کی بات سنتے ہی اپنے آنسو صاف کرتے ایک بار پھر سے شکوہ کیا۔

”میری جان میں کیوں سزادوں گا تمہیں اور شامد ان دنوں میں مجھے خود بھی سمجھ نہیں آیا کہ مجھے تم سے بات کرنی چاہیے یا نہیں کیونکہ جیسے تمہارے لیے تمہارے والدین اہم ہیں میرے لیے بھی ہیں اور آج تک کبھی میں نے اپنی وجہ سے اپنے والدین کو کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہونے دیا مگر...“، زارون نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”مگر میں جانتی ہوں کہ امی نے غلط کیا اور میں نے آج بھی امی کو سمجھانے کی کوشش کی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ بہت جلد میری بات مان جائیں گی۔ سوری زارون میں امی کی طرف سے انکل، آنٹی سے معافی مانگ لوں گی“، اُس کی آواز سنتے ہی حبہ کا دل پھر سے مضبوط ہو چکا تھا اور دو دن سے دل میں پیدا ہونے والے خدشات بھی اب غائب ہو چکے تھے۔

”ٹھیک ہے تم گھر میں بات کرو آنٹی کو پیار سے مناؤ ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا اور ہاں میں تمہارے ساتھ ہوں“، اُس کی بات سنتے زارون نے بھی نارمل انداز میں اپنے ہونے کا یقین دلا یا تو

ایک بار پھر سے حبہ کی مسکراہٹ لوٹ آئی اور باتوں کا سلسلہ جو تھم گیا تھا ایک بار پھر سے شروع ہو گیا۔

---

”نور، لاو مجھے دو میں کروادیتا ہوں“، وہ کب سے نوٹس فوٹو کاپی کروانے کے لیے یونیورسٹی کے شاپ پر کھڑی رش کم ہونے کا انتظار کر رہی تھی تب ہی ایک آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

”نهیں میں کروالوں گی شکریہ“، آواز کے تعاقب میں پچھے کھڑے شخص کو دیکھتے ہی اُس کے ماتھے پر بل پڑے۔

”میں نے کہا نالاؤ میں کروادیتا ہوں“، ارحم جو زارون کے ساتھ اُس شاپ پر آیا تھا نور کو وہاں رش میں پریشان کھڑا دیکھ کر اُس کے قریب آ کے کہنے لگا۔

”نهیں کوئی بات نہیں میں کروالوں گی“، مروتا ایک بار اور انکار کرتے اُس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی پر سامنے سے ملنے والے دھکے کی وجہ سے وہ گرتے گرتے پچی۔

”کیا انکلیف ہے تم لوگوں کو انسانوں کی طرح کھڑا ہونا نہیں آتا“، نور کو سنبھالتے ہی ارحم نے آگے موجود دولٹ کوں کو گریبان سے پکڑتے لائے سے باہر نکالا جو کافی دیر سے ایسی ہی حرکتیں کرتے پیچھے موجود لٹر کیوں کو تنگ کر رہے تھے۔

”اوے کون ہے تو اور تیری جرات کیسے ہوئی میرا گریبان پکڑنے کی؟“ وہ لٹر کا جو نیا ہونے کی وجہ سے ارحم سے ناواقف تھا اس نے اس کا ہاتھ جھکلتے غصہ دکھایا تو سب ہی اُن کی جانب متوجہ ہوئے۔

”چھوڑیں آپ کیوں ان کے منہ لگ رہے ہیں“، نور نے ارحم کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

”نور تم جاؤ یہاں سے“، نظریں اس لڑکے کے چہرے پہ جمائے ارحم نے اُسے جانے کا اشارہ کیا۔ ”اووئے ہوئے ہوئے لگتا ہے گرل فرینڈ ہے تیری جو ہمارے دھکادینے پر اتنا بھڑک رہے ہو۔ ویسے یار، ہے بڑا مست مال اس لیے اگر کبھی چھوڑنے کا ارادہ ہو تو ہمیں ضرور بتانا“، اس کے ساتھ موجود دوسرے لڑکے نے نور کی فکر مندی دیکھ کر ارحم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے سر گوشی کی تو اس نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر وہیں تھپڑوں کی بارش شروع کر دی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بہن کے بارے میں ایسی بات کرنے کی؟“ غصے میں پاگل ہوتے وہ اُن دونوں لڑکوں کو مسلسل مار رہا تھا مگر وہاں کھڑے لوگوں میں سے کسی میں اتنی جراءت نہیں تھی کہ کوئی اُسے روکتا تھا، ایک لڑکا جوار حم کی کلاس کا، ہی تھا اور زارون کو کچھ دیر پہلے فون پر کسی سے بات کرتے شاپ سے باہر جاتا دیکھا چکا تھا اُس نے جلدی سے باہر کاڑخ کرتے اُسے آواز لگائی جو شاپ سے کچھ فاصلہ پر کھڑا معاذ سے بات کر رہا تھا۔ ”زارون اندر ارحام کی کسی سے لڑائی ہو گئی ہے۔ وہ بہت بُرے طریقے سے اُن لڑکوں کو مار رہا ہے“، زید نے اُس کے قریب جاتے بتایا تو جلدی سے کال بند کرتے اندر کی جانب بڑھا۔

”ارحام یاد کیا کر رہے ہو؟“، زارون نے آتے ہی اُسے سن بھالا۔

”میں انہیں جان سے مار دوں گا“، پہلے لڑکے کو چھوڑتے اُس نے دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کی جو موقع ملتے ہی شاپ سے نکل کر بھاگ گیا۔

”کیا ہو گیا ہے پاگل ہو کیا؟ ہوا کیا اور کیوں مار رہے ہو انہیں؟“، زارون نے وہاں کھڑے تماشہ دیکھتے لوگوں پر نظر ڈالتے اُسے ہوش دلانے کی کوشش کی جو غصے میں یو نہی آپ سے باہر ہو جایا کرتا تھا۔

”ان لوگوں نے نور کو دھکا دیا پھر اُس کے بارے میں فضول بات کی میں ان کی طبیعت صاف کر کہ دم لوں گاتا کہ دوبارہ یہ کسی کی بہن بیٹی کو تنگ کرنے یا اُن کے بارے میں کوئی فضول بات کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ لیں“، اپنے ہونٹ سے نکلتے خون کو صاف کرتے جو ان میں سے ہی ایک لڑکے کے مکامارنے سے نکلا تھا وہ زارون کی بات سنتے غصے سے دھاڑا۔

”اچھا چھوڑو انہیں سبق مل گیا ہے تم میرے ساتھ آؤ باہر“، ایک نظر کونے میں سہمی ہوئی کھڑی نور پہ ڈالتے زارون نے اُس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے کہیں نہیں جانا اور تم لوگ کب سے کھڑے اُن کی یہ حرکتیں دیکھ رہے تھے ناتم لوگوں سے انہیں کیوں نہیں روکا“، ارحم نے ایک طرف کھڑے لڑکوں کو آڑے ہاتھوں لیتے سوال کیا۔

”یا ربس کرو اور چلو باہر“، نظریں نور پر کھے زارون نے زبردستی اُسے وہاں سے لیے نکلا تو نور نے اپناز کا ہوا سانس بحال کیا۔

”توبہ میں تو اسے ٹنڈے کی شکل والا سمجھتی رہ گئی پر یہ توہیر و نکلا وہ بھی ولن والا“، اُن کے جاتے ہی نور نے خود کلامی کی اور نوٹس بعد میں کسی وقت فوٹو کاپی کروانے کا سوچتے وہاں سے باہر نکلی تاکہ ارحم کی چوٹ کا پوچھ سکے جو اُس کی وجہ سے لگی تھی۔

-----

”یار کیا ضرورت تھی تمہیں کسی اور کے لیے جھگڑنے کی“، زارون نے بیگ سے ٹشوں کا لکڑا کر اُس کے ہونٹ سے نکلتا خون صاف کیا۔

”کیوں ضرورت نہیں تھی؟ اگر میں آج ان لڑکوں کو سبق نہ سکھاتا یا نرمی سے بات کرتا تو وہ کبھی بھی ایسی حرکتوں سے باز نہ آتے“، اُس کے ہاتھ سے ٹشوں لیتے ارحم نے خود اپنے ہونٹ کو صاف کیا۔

”حرکتوں سے باز تو شائد وہاب بھی نہ اٹھیں اور یار ہر بات کا حل لڑائی جھگڑے، مار کٹائی نہیں ہوتا بلکہ کچھ باتیں اور کام پیار سے بھی ہو جاتے ہیں ہو سکتا ہے تم اگر نرمی سے بات کرتے تو انہیں اپنی غلطی کا احساس زیادہ بہتر طریقے سے ہو جاتا“، ارحم کی بات سنتے ہی زارون نے اپنی نرم اور تحمل والی طبیعت کے پیش نظر اُسے ہمیشہ کی طرح لڑائی جھگڑوں سے منع کیا۔

”نه باز آئے تو میں اُن کی ایک بار اور مرمت کر دوں گا، ایسے ڈھیٹ لوگ نرمی کی زبان نہیں سمجھتے اور تمہیں اندازہ نہیں کے کہ کس قسم کی گھٹیا بات کی انہوں نے نور کے بارے میں“، زارون کا لیکھر مکمل ہوا تو ارحم نے اپنے موقف پر قائم رہتے جواب دیا۔

”بس کرو یا اور جس کے لیے تم لڑ رہے تھے نا وہ بھی سب کی طرح وہاں کھڑی تماشہ دیکھ رہی تھی۔ ارحم یا ر تمہیں کیوں سمجھ نہیں آتی کیوں تم آئے دن اپنے لیے نئے نئے دشمن پال رہے ہو“، زارون نے ایک بار پھر سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”پہلی بات کہ وہ جو بھی کرے میں نے اُسے بہن کھاتھا اور تمہیں پتا ہے نا کہ میں ایک بار کسی کو اپنے ساتھ جوڑ لوں تو پھر پچھے نہیں ہٹتا کیونکہ میرے پاس یہ سب رشتے نہیں ہیں اسی لیے مجھے ان کی قدر ہے مجھے اچھا لگتا ہے ان کے لیے کچھ کرنا اور دوسرا بات جو بات غلط ہے وہ غلط ہے وہاں بے شک میرے ساتھ کوئی دشمنی پالے یا محبت، مجھے فرق نہیں پڑتا“، اب کی بار اُس کی باتوں کا غصہ کرتے وہ اپنی بات مکمل کرتے اٹھ کر جانے لگا تو زارون نے اُسے ہاتھ پکڑ کر روکا۔

بس کرو اور میرے سامنے یہ زیادہ ہیر و بنے کی کوشش مت کیا کرو“، اُس کی خفاسی صورت دیکھ کر زارون نے واپس اُسے اپنے ساتھ بٹھایا تو نور ان کے قریب رکتے ارحم کو مخاطب کیا۔

”ارحم بھائی آپ ٹھیک ہیں نا؟“، زارون کو اگنور کرتے اُس نے ارحم سے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہوں اور مس نور باقی سب کے سامنے تو آپ کی بڑی زبان چلتی ہے پر ان لڑکوں کے سامنے آپ ڈر کیوں گئی تھیں؟“، اُسے دیکھتے ہی ارحم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

”نہیں میں کیوں ڈروں گی، میں تو خود ہی خاموش ہو گئی تھی کہ کہیں مجھے غصہ نہ آجائے“، نور نے ارحم کی بات سنتے ہی اپنا بھرم قائم رکھنے کے لیے بہادری سے کہا۔

”اچھا گرآپ کو غصہ آ جاتا تو آپ کیا کرتیں؟“ ارحم کی بجائے زارون نے اُس کی بات سنتے سوال کیا۔

”میں بھی ارحم بھائی کی طرح انہیں مارتی۔ میں نے کتنی ہی بار اپنے بھائی کو مارا ہے اور میں اچھے سے جانتی ہوں کہ کیسے کسی کی پٹائی کرتے ہیں؟“، نور نے فخر سے گردن اکڑاتے اپنا کارنامہ بتایا جسے سنتے ہی ارحم نے قہقہہ لگایا اور زارون نے سر نیچے کرتے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

”مطلوب آپ کو گلتا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ ارحم کے قہقہے پر نور نے اُسے ناراض نظر وں سے دیکھا۔

”نہیں، ہمیں پورا یقین ہے کہ تم ایسے ہی مارتی ہو گی ویسے نور تمہارا بھائی کتنے سال کا ہے؟ مطلب یہی کوئی دو یا تین سال کا ہو گا؟ جو تم سے مارا کھا لیتا اور تم اُسے مارا بھی لیتی ہو“، ارحم نے اپنی ہنسی کنٹرول کرتے اندازہ لگایا۔

”نہیں تو بڑا ہے وہ“، اُس کی بات سمجھے بغیر ہی نور نے جواب دیا جس پر ارحم کے ساتھ ساتھ اب کی بار زارون نے بھی قہقہہ لگایا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ دونوں“، ان کے اس طرح ہنسنے پر نور کو تھوڑی شرمندگی محسوس ہوئی تب ہی وہ انہیں وہیں چھوڑ کر اپنے ڈپارٹمنٹ کی جانب بڑھی۔

”ہونہ رابعہ نے بھی آج ہی چھٹی کرنی تھی اور یہ زارون جلا دے ہے ہی بد تمیز ہر وقت مجھے تنگ کرتا ہے“، منہ میں بڑ بڑاتے وہ پھر سے زارون کو بُرا بھلا کہتے ہوئے اپنی کلاس میں داخل ہوئی۔

### ماضی

”سلطان مجھے آپ سے بات کرنی ہے“، سارہ بیگم جو حبہ کی ناراضی کی پرواکیے بناء اُس دن سے اپنے مشن میں لگی تھیں آج اُس کی تکمیل ہوتے ہی انہوں نے سلطان صاحب سے بات کرنے کی ٹھانی۔

”ہاں کرو“، سلطان صاحب جو خود بھی اُس دن سے سارہ بیگم سے خفاظت ہے انہوں نے چائے کا سپ لیتے سر سری سی نظر ان پہ ڈالی۔

”شام کو گھر میں کچھ مہمان آرے ہے ہیں حبہ کے رشتے کے سلسلے میں اس لیے آپ آفس سے تھوڑا جلدی آجائیے گا“، بریڈ پر مکھن لگاتے انہوں نے بہت پر سکون انداز سے بتایا۔

”حبہ کے رشتے کے لیے؟ سارہ تم کیوں اپنی بیٹی کی خوشیوں کے پیچھے پڑی ہو، جب تمہیں بتا ہے کہ وہ زارون کو پسند کرتی ہے تو پھر یہ سب کیا ہے“، سلطان صاحب نے ان کی بات سنتے ہی کپ واپس ٹیبل پر رکھا۔

”میں ماں ہوں حبہ کی کوئی دشمن نہیں ہوں جو اُس کی خوشیوں کے پیچھے پڑوں باقی مجھے وہ لڑکا اور اُس کے گھروالے پسند نہیں ہے اور سب سے بڑی بات ان کی ذات ہماری ذات سے الگ ہے اس لیے میں کسی صورت بھی اپنی بیٹی کا رشتہ وہاں نہیں کروں گی یہ بات آپ بھی سمجھ لیں اور حبہ کو بھی سمجھادیں جو ایک غیر کی خاطر پورے تین ہفتے سے ماں سے منہ پھلانے پڑھی ہے“، گلاں میں جو سڑالتے انہوں نے اپنے لبھ کو حتی الامکان سخت رکھا۔

”سارہ پلیز میری بات سنو، دیکھو یہ رشتے ایسے زور زبردستی پہ بن بھی جائیں تو انہیں قائم رکھنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور یہ ذات برادری اب کون دیکھتا ہے سب اپنی اولاد کی خوشی اور سکون دیکھتے ہیں اور ہمیں بھی چاہیے کہ اس ذات پات کے فرق کو پس و پشت ڈالتے اپنی اکلوتی اولاد پر اپنی مرضی مسلط نہ کریں اور اُس کی خوشی میں خوش ہوں“، آفندی صاحب نے غصے کی بجائے نرمی سے انہیں سمجھایا۔

”سلطان مجھے حبہ کی خواہش پر کوئی مسئلہ نہیں پرمیں اُسے جانتی ہوں کہ وہ وہاں ایڈ جست نہیں کر پائے گی آپ کو یاد ہے ناکہ بچپن میں اُسے کوئی چیز پسند آجائی تو وہ اُسے لے کے ہی دم لیتی تھی اور پھر گھر آتے ہی وہ اُسے کہیں سچینک دیتی یا تواریخی اور یہ عادت بچپن تک محدود رہتی تو میں زیادہ فکر مند نہ ہوتی اور رہی بات ذات پات کے فرق کی تو آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ فرق نسلوں تک چلتا ہے اور اس بات کو بنیاد بنا کر خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں“، سارہ بیگم نے زندگی میں پہلی بار سلطان آفندی پر اپنی مرضی مسلط کرنے کی بجائے انہیں اپنی بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”اس کی اب بھی یہی عادت ہے اُسے کوئی بھی چیز پسند آجائی ہے تو اُسے شوق سے لے تو لیتی ہے پر بعد میں گھر آتے ہی وہ چیز اپنی قدر کھو دیتی ہے اور میں نہیں چاہتی زارون کو حاصل کرنے کے بعد بھی وہ ایسا ہی کرے اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ حبہ کی ضد بن چکا ہے جسے وہ ہر حال میں حاصل کرنا چاہتی ہے“، اپنے خدشے کا اظہار کرتے انہوں نے سلطان صاحب کو بھی سوچ میں ڈال دیا۔ ”بات تمہاری غلط نہیں ہے پر سارہ وہ سب چیزیں تھیں جنہیں وہ گھر لا کر بھول جایا کرتی تھی یا حاصل کرتے ہی ان کی قدر حبہ کے لیے بالکل ختم ہو جاتی تھی۔ زارون کوئی چیز نہیں ہے وہ ایک جیتنا جا گتا انسان ہے جس کے لیے زندگی میں

پہلی بار حبہ نے اپنے دل میں کوئی احساس پیدا کیا ہے اور مجھے لگتا ہے ہمیں کسی بھی فیصلہ کے لیے کچھ وقت لینا چاہیے باقی جو اللہ کی مرضی ہوئی ہونا وہی ہے باقی رہی خاندان کی بات تو جس نے ہم سے رشتہ توڑنا ہوا بغیر کسی وجہ کہ بھی توڑ دینا ہے اس لیے ہمیں کسی کی ناراضی کا سوچتے اپنی بیٹی کی خوشیاں داؤ پر نہیں لگانی چاہیے“، سلطان صاحب نے اُن کی بات سے انکار کیے بغیر ایک سلچھے ہوئے انسان کی طرح اپنی بات کہی۔ ”ٹھیک ہے پھر میں اُن لوگوں کو کچھ وقت کے لیے منع کر دیتی ہوں“، اُن کی بات سنتے ہی سارہ بیگم نے زور زبردستی سے بات بنتی نہ دیکھ کر سلطان صاحب کو شیشہ میں اٹارنے کے لیے اپنے لہجے کو نرم رکھتے جواب دیا اور گلاس اٹھاتے جوس کے سپ لینے لگیں۔

”یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟“، ارحم جو کلاس کے فوراً بعد ہی رابعہ کی کال آنے پر اُس کی بات سنتے چلا گیا تھا وہ اپسی پر زارون کو اکیلے خاموشی سے لان کے ایک کونے میں بیٹھا دیکھ کر اُس کے پاس آیا۔

”جب دوست کو پروانہ ہو تو انسان اکیلا ہی ہو جاتا ہے“، اپنے ہاتھ میں موجود ڈائری کو بند کرتے اُس نے طنز کیا۔ ”ہونہے بس گھر یلو عورتوں کی طرح طعنے مارنے شروع کر دیا کرو خود تو کسی کی مدد کرنی نہیں مجھے بھی کرنے نہیں دیتے“، اُس کے قریب بیٹھتے ارجمنے ایک بازو اُس کے کندھے پر رکھا۔

”بس کرو زیادہ فرشتہ بننے کی ضرورت نہیں اور تم جن کی مدد کے لیے دوڑے دوڑے جاتے ہونا اُن دو ہستیوں کو بھی میں اچھے سے جانتا ہوں، جن میں ایک تمہاری منہ بولی بہن مس نور عرف معصوم چڑیل اور دوسرا تمہاری متوقع بیوی جس کے بارے میں تمہارے گھروالوں کے علاوہ باقی ساری دنیا کو خبر ہے“، اپنی بات مکمل کرتے اُس نے ارجمن کا بازو اپنے کندھے سے ہٹایا۔

”تمہیں مسئلہ میرے مدد کرنے سے ہے یا ان دونوں کی مدد کرنے سے؟ پلیز یہ بات واضح کر دو تاکہ میں احتیاط کروں اور ہاں دوبارہ میری بہن کو چڑیل مت کہنا اُس دن بھی وہ تمہاری وجہ سے مجھ سے ناراض ہو گئی اور اب میں نہیں چاہتا کہ تمہارے منہ سے اپنے لیے یہ نام سن کرو وہ پھر سے مجھ سے خفا ہو“

”چڑیل کو چڑیل ہی کہوں گانا شہزادی تو کہنے سے نہیں رہا اور یہ تم کسی اور کے لیے مجھ سے کیسے بات کر رہے ہو؟ وہ چار دن پہلے آئے لڑکی تمہارے لیے اتنی اہم ہو گئی کہ تم مجھے اپنے چار سال

پرانے دوست کو اُس کے لیے گھور رہے ہو،“،زارون نے اُسے اپنی جانب گھورتا ہوا پا کر غصے سے کہا۔

”بس کرو یار کیا تم اُس معصوم کے پچھے پڑ گئے ہوا تینی کیوٹ تو ہے اور دوست کی بات تو تم نہ ہی کرو ہونہ ایک ہفتہ پہلے جب تم نے اکیلے آنٹی کے ہاتھ کی بنی ہوئی بریانی کھائی تھی تب تمہیں یہ دوستی یاد نہیں آئی اور نہ ہی تب جب تم نے پرسوں اکیلے ہی کینٹیں جا کر چیز سینڈ وچ اور چائے پی، آئے بڑے چار سال پرانی دوستی کا بتانے والے،“ اُس کے ہاتھ سے موبائل پکڑا جسے ان کر کے دیکھتے ہوئے زارون بظاہر خود کو اُس کے سامنے مصروف ظاہر کر رہا تھا۔

”تمہاری بہن جیسے دو تین کیوٹ اور معصوم دنیا میں اور آگئیں تو دنیا تباہ ہو جانی اور رہی بات میرے کھانے کی توجو کل تم امی سے بریانی بنوائے کیلئے ٹھونس کے آئے ہو اُس کا کیا؟ اور جو ابھی ابھی تم اپنی بہن اور متوقع بیوی کے ساتھ کینٹیں میں بیٹھے بر گرنوش فرمائے تھے تب تمہیں احساس نہیں ہوا کہ دوست صرف تمہارے انتظار میں بھوکا بیٹھا ہے،“ اپنا موبائل اُس کے ہاتھ سے جھپٹتے زارون نے حساب برابر کیا۔

”یہ کیا تم آنٹی کے ساتھ رہ کر عورتوں جیسی باتیں کرنے لگ گئے ہو اور فون دو اپنا میں نے بیلنس شئیر کرنا ہے،“ اُس کے طعنوں سے تنگ آتے ارجمنے بات ختم کرتے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”حرام کے پسیے نہیں ہیں میرے پاس جو میں تم جیسے فضول انسان پہ لوٹا تاپھروں اور ہاں یہ جو تم بیلنس شنیر کرنے کے بہانے جاسوس بیویوں کی طرح میرے فون کی تلاشی لیتے ہو نامیں اچھے سے جانتا ہوں اس لیے دوبارہ میرے موبائل کو ہاتھ مت لگانا“، بیگ اٹھاتے زارون نے اُسے تنبیہہ کی۔

”بس کرو یار، کیوں مجھے ہارت اٹیک کروانے کا ارادا ہ کر رہے ہو اور تم جیسے سڑیل انسان کی بیوی بننے سے اچھا میں کنوراہی ہی مرجاوں“، ارحم نے اُس کی بات سنتے ہی بھر پورا داکاری کرتے ہوئے چہرے پر مصنوعی گھبراہٹ سجا کے ڈالاگ مارا تو زارون نے ناراضی کاظھار کرنے کے لیے کوئی جواب دیے بغیر ہی اپنا بیگ اٹھایا اور اٹھ کر دوسرا جانب چل پڑا۔

”زارون یار کو، تم تو ناراض ہی ہو گئے، اُس کے اٹھتے ہی ارحم نے اُسے پیچھے سے جا کر کپڑا۔“ نہ بات کرو مجھ سے“، اپنی مسکراہٹ چھپاتے زارون نے ایک بار پھر سے اُس کے ہاتھ جھٹکے۔ ”اففف یار یہ ناراض محبوبہ کی طرح منہ نہ بنایا کرو قسم سے مجھے رات کو بھی رابعہ کی جگہ خواب میں تم ہی نظر آنے لگتے ہو“، اب کی بار ارحم نے اُس کے چہرے پر خفگی دیکھتے منہ بسورا تو زارون کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”دفع ہو تم اور تمہاری محبوبہ اور چلو کیٹن، بھوک لگی ہے مجھے اور ہاں بل بھی تم ہی دو گے“، اپنا موڈ ٹھیک کرتے زارون نے شرط رکھی۔

”ٹھیک ہے دے دوں گا پر تمہارے والٹ سے“، ارحم نے کہتے ساتھ ہی اپنی بائیں آنکھ دبائی تو زارون نے نفی میں سر ہلاتے اُس کے ساتھ ہی کینٹ کا رخ کیا۔

### ماضی

”چلو ایک مرحلہ تو آسانی سے حل ہو گیا بس اب حبہ کو منانا باقی ہے“، آندی صاحب کے آفس جاتے ہی سارہ بیگم نے خود کلامی کی اور شرف کو آواز دیتے بر تن اٹھانے کا کہہ کے اپنارخ سڑھیوں کی جانب کیا۔

”آجائیں..“، حبہ جو ابھی ابھی سو کے اٹھی تھی اُس نے دروازے پر دستک کی آواز سنتے اجازت دی۔

”گلڈ مارنگ بے بی اٹھ گئی ہو“، کمرے کے اندر قدم رکھتے سارہ بیگم نے چہرے پہ مسکراہٹ سجاتے ہوئے پوچھا۔

”جی اُٹھ گئی ہوں“، ان کو صحیح اتنے خوشگوار مود میں دیکھ کر حبہ کی چھٹی حس نے اُسے خبردار کیا۔

”لگتا ہے میری بیٹی اس بار مجھ سے کچھ زیادہ ہی خفا ہے؟“ اُس کے قریب ہی بیڈ پر بیٹھتے اُنہوں نرمی سے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا جواب بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکی تھی۔

”نہیں میں خفائنہیں ہوں“، ان سے نظریں ملائے بغیر حبہ نے سرسری ساجواب دیا۔

”خفائنہیں ہو تو ایسے ہی تین ہفتے سے ماں سے بول چال بند کی ہوئی ہے؟“ نرمی سے اُس کے رخسار پر ہاتھ پھیرتے اُنہوں نے شکایت کی۔

”نہیں، ایسی بات نہیں ہے بس مجھے لگا کہ اس وقت بات کرنا اپنے اور آپ کے درمیان موجود اختلاف کو مزید بڑھاوا دینے کے متداف ہو گا اس لیے میں چپ ہو گئی تھی“، ان کی بات سنتے ہی حبہ نے اپنے رویے کی وضاحت کی۔

”ہم مطلب تمہیں لگا کہ ایسے خاموش ہو جانے سے ہمارے درمیان موجود اختلاف ختم ہو جائے گا اور میں تمہاری بات مان لوں گی؟“

”نہیں مجھے ایسا نہیں لگا میں بس آپ کو مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔“

”پریشان تو تم اب بھی مجھے کر رہی ہو۔ دیکھو جب آج تک میں نے یا تمہارے ابو نے تمہاری کوئی ایسی خواہش نہیں ہے جو پوری نہیں کی اور یہ ہمارا فرض بھی تھا پر اب زندگی میں پہلی بار ہم نے تمہاری کسی خواہش کو رد کیا ہے تو تم ہمارے ساتھ ایسا روایہ برتر رہی ہو، کیوں بیٹا؟ کیا سارے حقوق و فرائض ماں باپ کی اوپر رہی لاگو ہوتے ہیں یا صرف اولاد کا ہی حق ہوتا ہے کہ وہ ہر جائز اور ناجائز بات اپنے والدین سے منوائیں؟“، سارہ بیگم نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے سوال کیا۔

”امی میں آپ کی کسی بات سے انکار نہیں کر رہی اور آپ کا مجھ پر مجھے سے زیادہ حق ہے۔ آپ اپنی مرضی سے میرے لیے جو بھی فیصلہ کرتیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا مگر تب جب مجھے یہ بتا ہوتا کہ آپ میری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتیں۔ مجھے تو یقین تھا کہ میرے والدین میری زندگی کے اتنے اہم فیصلہ میں پہلے میری پسند کو ترجیح دیں گے اسی لیے تو میں نے بے خوف ہو کر آپ کو زارون کے بارے میں بتا دیا“، حبہ نے اُن کا ہاتھ تھامتے اپنی بات کا دفاع کیا۔

”حبہ میری جان ہم تمہاری پسند کے خلاف نہیں ہیں بس میں تمہیں اتنا سمجھا رہی ہوں کہ وہ شخص صرف وقتی طور پر تمہارا جنون ہے جس کے پورے ہوتے ہی تمہیں سب بے معنی اور بے وقت لگنے لگے گا اس لیے ابھی تمہارے پاس موقع ہے سوچو، سمجھو اور پھر فیصلہ کرو کیونکہ شادی ایک ایسا رشتہ ہے جس میں ایک شخص نہیں بلکہ پورا خاندان دوسرے خاندان کے ساتھ جڑ جاتا۔“

ہے اور تمہیں پتا ہے ناکہ ان لوگوں کی ذات بھی ہم سے الگ ہے،“ سارہ بیگم نے اپنے انکار کی ایک ٹھوس وجہ اُس کے سامنے رکھی جو انہیں ان کے خاص ملازم نے زارون کے بارے میں معلومات فراہم کی تھی۔

”امی ذات سے کیا ہوتا ہے؟ انسانوں کی پہچان تو اچھے اخلاق اور تربیت سے ہوتی ہے ذاتوں سے نہیں اور رہی بات خاندان کی تو ہمارا خاندان ہے ہی کتنا؟ میں آپ اور ابو، باقی سب خاندان نہیں بلکہ لوگ ہیں جو کسی کو خوش دیکھ کر خوش نہیں ہوتے،“ اپنے موقف پر قائم رہتے حبہ نے ان کے دماغ میں موجود خلل کو دور کرنے کی کوشش کی۔

”مطلوب تم اپنی بات سے پچھے نہیں ہٹوگی؟“ اُس کی ہٹ دھرمی دیکھتے سارہ بیگم نے سوال کیا۔ ”امی یہ ہٹ دھرمی نہیں ہے بس میں آپ کو یہ سمجھا رہی ہوں کہ اگر آپ یہ دولت اور ذات دیکھ کر انکار کر رہی ہیں تو پلیز ایک بار اس فیصلہ پہ غور کر لیں کیونکہ میں زارون کے علاوہ کسی اور کہ بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی،“ ان کا ہاتھ چھوڑتے حبہ نے اپنی بات مکمل کی۔

”میں اپنے فیصلہ پہ بہت پہلے غور کر چکی تھی اور اُس میں گنجائش دیکھ کر ہی میں نے تمہارے ابو سے بات کی تھی مگر جب سے مجھے یہ پتا چلا ہے کہ ان لوگوں کی ذات بھی ہم سے مختلف ہے میرا فیصلہ اٹل ہو چکا ہے اس لیے تم بھی اپنے دماغ سے اُس لڑکے کا بھوت اُتار اور خود کو مضبوط کرو“

کیونکہ میں نے مسز گیلانی نے اپنے بیٹے کے لیے تمہارے رشتے کی بات کی ہے اور میں نے انہیں کچھ دنوں میں گھر آنے کی دعوت بھی دے دی ہے جب تک تم اپنے آپ کو سمجھالو کیونکہ اگر تم نے زارون کے حق میں فیصلہ دیا تو ہم تمہارے لیے مر گئے اور تم ہمارے لیے، اپنی بات مکمل کرتے وہ حبہ کو ہکابکا بیٹھا چھوڑ کر کمرے سے نکل گئیں۔

سارہ بیگم کی بات سنتے ہی حبہ کے ہوش اڑ چکے تھے بے ساختہ ہی اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی امی جنہوں نے آج تک اُس سے کبھی غصے سے بات نہیں کی وہ آج اُسے چھوڑنے کی باتیں کر رہی تھیں۔

”اللہ پلیز میری مدد کریں۔ پتا نہیں کیوں امی ایسا کر رہی ہیں؟“، بے بسی سے کہتے جب اُسے کچھ سمجھ نہیں آیا تو اُس نے موبائل اٹھاتے زارون کا نمبر ڈائیل کیا۔

”ہیلو...“، دوسری طرف مسلسل جاتی بیل پہ زارون نے بند آنکھوں سے ہی کال ریسیو کرتے موبائل کان سے لگایا۔

”السلام علیکم گذمار نگ، اٹھے نہیں ابھی آپ؟“، اپنی آواز کو ہموار رکھتے اُس نے سوال کیا۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ گُدْمَارِنَگ، ہاں بس اُٹھ گیا ہوں۔ تم بولو آج صحیح صبح میری یاد کیسے آگئی؟“، اُس کی آواز پر پوری طرح بیدار ہوتے زارون کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

”بس ویسے ہی دل تھا تو کر لی کال“، پلکیں جھپکتے اُس نے سارہ بیگم کی کہی بات کو ایک بار پھر سے سوچا۔ ”اچھا، ویسے تمہارے لبھ سے لگ نہیں رہا کہ تم نے ویسے ہی کال کی ہے۔ بتاؤ کیا بات ہے؟“ گھر میں کچھ ہوا ہے یا کسی نے کچھ کہا ہے جو ایسے افسردہ ہو۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ ویسے ہی میں سو کے اُٹھی ہوں تب ہی آپ کو ایسا لگ رہا ہے“، اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی حبہ نے صفائی دی۔

”ہم ٹھیک ہے جب مناسب لگے کہ تمہیں اب مجھے بتانا چاہیے تب بتا دینا کہ کیا مسئلہ ہے باقی اب اُٹھو اور ناشستہ کرو“، اُس کی بات کامان رکھتے زارون نے نرمی سے کھا تو حبہ کے سارے ضبط جواب دے گئے۔

”امی آئیں تھیں ابھی، وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے کوئی رشتہ دیکھا ہے میرے لیے اور وہ لوگ کچھ دنوں میں آئیں گے“، اپنی آواز کی لڑکھڑاہٹ کو کنٹرول کرتے اُس نے اپنی بات کا آغاز کیا تو زارون کے چہرے پر موجود مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”صاف لفظوں میں بول کر گئیں ہیں کہ اگر میں نے آپ کے حق میں فیصلہ کیا تو وہ مجھ سے ہر رشتہ ختم کر دیں گی“، لفظوں کو توزٹتے اُس نے با مشکل اپنی بات کمکل کی۔ ”زارون میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی پر میں امی ابو کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ ان گزرے ہفتوں میں امی کے رویے کو سوچ سوچ کر پہلے ہی پریشان تھی اور اب مجھے لگتا ہے جو وہ میرے ساتھ کرنا چاہتی ہیں بہت جلد میں ذہنی مریض بن جاؤں گی۔ زارون میں دو کشتبیوں میں سوار ہو چکی ہوں اُن میں سے میں جس بھی کشتبی کو چھوڑتی ہوں خسارہ میرا ہی ہے“، آنسوؤں کے درمیان اُس نے اپنی بات کمکل کی۔

”پریشان مت ہو یا راللہ پاک سب بہتر کرے گا اور جو ہماری قسمت میں ہوا وہی ہمیں ملے گا باقی میں امی ابو سے ایک بار پھر بات کرتا ہوں کہ آنٹی سے بات کریں“، اُس کی ساری بات سننے کے بعد زارون نے اُسے تسلی دی۔

”نهیں زارون آپ انکل، آنٹی سے بات کرنے کا مت کہیے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے آپ کا اور ان کا رشتہ خراب ہو“، ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کو رگڑتے ہبہ نے اُسے منع کیا۔

”کچھ نہیں ہوتا ہمارے رشتے کو اور جب تم میرے لیے آنٹی کی ناراضی مول لے سکتی ہو تو کیا میں تمہارے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا“، اپنے لمحے اور مقصد کو مضبوط کرتے زارون نے اُسے اپنے ہونے کا یقین دلا یا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کو مناسب لگتا ہے کر لیں پر آنے سے بہتر ہے کہ آنٹی امی سے فون پہ ایک بار بات کر لیں کیونکہ میں نہیں چاہتی پچھلی بار کی طرح اس بار بھی امی آنٹی انکل کو بے عزت کریں“، حبہ نے اُس کی بات سننے کے بعد ایک معقول سامشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے تم گھر کا یا آنٹی کا نمبر سینڈ کر دو میں امی سے کہہ دوں گا کہ بات کر لیں“، اُس کی بات سننے زارون نے اُسے سب ٹھیک ہو جانے کی تسلی دی اور ناشتہ کرنے کا کہتے خود بھی کال بند کرتے اٹھ کے فریش ہونے چلا گیا۔

یونیورسٹی میں پیپر زکا آغاز ہوا تو سب اپنی کتابوں میں سردیے تیاری میں مصروف ہو گئے۔ رابعہ بھی کب سے نور کو اُس کے مس ہوئے پیکھر ز سمجھانے میں مصروف تھی کہ کچھ یاد آنے پر اُس نے اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالتے کچھ تلاش کرنے لگی۔

”رابعہ پیزیہ ایک بار پھر سے بتادو“، نور نے ایک اور ٹاپک اُس کے سامنے کیا جواب بیگ سے ایک ڈبہ برآمد کرتے اُس نے نور کی طرف بڑھایا۔

”یہ لو تمہارے لیے“

”اس میں ہے کیا؟“ اُس سے ڈبہ لیتے نور نے نوٹس نیچے رکھتے اُسے دیکھا۔  
”چاکلیٹس ہیں۔ کل اپنے لیے لی تو تمہارے لیے بھی لے لیں“، باہر پڑی کتاب بیگ میں ڈالتے رابعہ نے اُسے بتایا۔

”اچھا مجھے لگا کسی چیز کے لیے رشوٽ دے رہی ہو مجھے“، ارحم کو اپنے قریب آتا دیکھ کر نور نے شرارت سے اُسے چھپرا۔

”ہاں نارشوٽ ہی سمجھو“، ان دونوں کے قریب بیٹھتے رابعہ کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ارحم نے اُس کی آخری بات سننے تجسس سے کہا۔

”مطلوب؟ کیسی رشوٽ؟“ نا سمجھی سے اُس کی جانب دیکھتے نور نے رابعہ سے پوچھا۔  
”ایویں فضول میں تمہیں پریشان کر رہا ہے کوئی رشوٽ نہیں ہے“، ارحم کی نظروں میں شرارت دیکھ کر رابعہ نے اُسے گھورا۔

”ہونہ نور میں بھلام سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟ میں سچ بول رہا ہوں یہ لڑکی تمہیں چاکلیس کی آڑ میں رشوت دے رہی ہے تاکہ تم ٹرپ والے دن ہمارے درمیان کباب میں ہڈی نہ بنو“، رابعہ کی جانب ایک آنکھ دباتے ارحام نے اپنی نظروں میں شرارت برقرار رکھتے اُسے اپنی بات کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

”ارحم بھائی کباب میں ہڈی نہیں ہوتی وہ تو بون لیس چکن سے بنتا ہے یہ بات مجھے مامانے کل ہی بتائی ہے“، نور نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ان دونوں کو سر پکڑنے پر مجبور کیا۔

”افف نور تم بہت ہی معصوم ہو۔ میری پیاری بہن یہ کباب میں ہڈی ایک محاورہ ہے جو تب بولتے ہیں جب آپ کو لگے کہ کوئی تیسرا انسان آپ کے درمیان مداخلت پیدا کرے گا“، ارحام جس کی اپنی بھی اردو کچھ ناساز تھی اُس نے نور کو سمجھانے کی کوشش کی جو غور سے اُس کی بات سُن رہی تھی۔

”اچھا میں سمجھ گئی ہوں اب آپ بتائیں ٹرپ کب جا رہا ہے اور کہاں؟ اور اگر آپ کو لگتا ہے کہ میں ہڈی ہوں تو میں نہیں جاؤں گی۔“

”کیوں نہیں جاؤ گی تم اور ہم سب جا رہے ہیں تم بھی ہمارے ساتھ جاؤ گی“، ارحام کی بجائے رابعہ نے اُس کی بات سنتے اصرار کیا۔

”ہاں ہاں تم اس ہڈی کو ساتھ ہی رکھنا تاکہ یہ سارا وقت تم پر قبضہ کرتے میرا خون جلاتی رہے“، رابعہ کی بات سننے ارجمنے منہ بسورا۔

”ارحم بس کرو کیوں تنگ کر رہے ہو تم میری دوست کو“، نور کی سرخ ہوتی آنکھوں کو دیکھ کر رابعہ نے اُس کی زبان کو بریک لگوائی۔

”میں کیوں تنگ کروں گا ویسے زارون ٹھیک کہتا ہے یہ بس چہرے سے ہی معصوم ہے باقی اس کے سارے کام چڑیوں والے ہیں اور تم شرم کرو اپنی دوست کے سامنے اپنے متوقع شوہر کی بے عزتی کر رہی ہو“، نور کے جذباتی انداز میں ارحم نے بلیک میل ہونے کی بجائے دل کھول کر ان کو باتیں سنائیں۔

”ارحم بھائی آپ بہت بُرے ہیں جو اپنے اُس کھڑوس دوست کے پیچھے لگ کہ اپنی بہن کو چڑیل بول رہے ہیں اور ہاں میں نے رابعہ پہ کوئی قبضہ نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی آپ جیسے بندر کے منہ لگنا پسند نہیں کرتی“، سوں سوں کرتے نور نے حساب برابر کیا تو اُس کی بات سننے ہی رابعہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

”ہونہ بس کرو اور ٹرپ پہ جانے کی تیاری کر لو میں نے تم دونوں کا بھی نام لکھوادیا ہے“، ڈبہ نور کے ہاتھ سے لیتے ارجم نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا تو وہ دونوں خوشی سے چھکتے ایک دوسرے کے گلے لگ گئیں۔

---

## ماضی

حبل سے بات کرنے کے بعد زارون نے عابدہ بیگم کے پاس جا کر ان کو ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور انہیں سارہ بیگم سے بات کرنے کا کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم مجھے نمبر سینڈ کر دو میں دن میں بات کر لوں گی“، زارون کی ساری بات تسلی سے سننے کے بعد عابدہ بیگم نے اُس سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے اپنے موبائل سے نمبر ان کے موبائل پہ سینڈ کرنے لگا جوا بھی کچھ دیر پہلے ہی حبل نے اُسے بھیجا تھا۔

”ابو آفس چلے گئے ہیں؟“، نمبر سینڈ کرتے ہیں زارون نے اپنا موبائل ٹیبل پر رکھتے احمد صاحب کی غیر موجودگی محسوس کرتے سوال کیا۔

”ہاں وہ تو صبح ہی چلے گئے تھے تاکہ کام ختم کر کے گھر جلدی آسکیں“، اُس کے قریب سے اٹھتے عابدہ بیگم نے چوہا جلاتے چائے کا پانی چڑھایا۔

”کیوں جلدی کیوں آنا ہے سب خیریت ہے نا؟ آپ لوگوں نے کہیں جانا ہے کیا؟“  
 ”نہیں، وہ معاز کا ویزہ کنفرم ہو گیا ہے بس آج ٹکٹ وغیرہ کروانی ہے تو اس لیے تمہارے ابو جلدی آجائیں گے“، فرنج سے بریڈ نکال کے سلیپ پہ رکھتے عابدہ بیگم نے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”کیا مطلب ویزہ کنفرم ہو گیا؟ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں اور یہ معاز تو اس دن سے کراچی ہی جا کر بیٹھا ہوا ہے واپس کیوں نہیں آ رہا“، اتنے دن سے زارون کو اپنی بے خبری پر خود ہی افسوس ہوا۔  
 ”ہاں، وہ آج آجائے گا اور تمہیں اُس کے دوستوں کا توپتا ہی ہے ایک بار لے کر نکلتے ہیں تو واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے“، ٹو سٹر میں بریڈ رکھتے عابدہ بیگم نے انڈہ توڑ کر فرائی پین میں ڈالا۔

”یہ تو ہے، ویسے امی کیسے فضول سے دوست بنائے ہیں نامعازنے، بالکل ہی لا پرواہیں“، اٹھ کر اُن کے قریب آتے زارون نے ٹو سٹر سے بریڈ نکالتے پلیٹ میں رکھی۔

”ہاں ایسا ہی کچھ ہے اب دیکھو ایک مہینہ ہونے کو آیا ہے پر نہ انہیں گھر کا کوئی ہوش ہے نہ ہی ہمارے صاحبزادے کو“، انڈہ پلیٹ میں نکالتے عابدہ بیگم نے چائے کے لیے دودھ ڈالا تو زارون

نے معاز کی اس بار پکی کلاس لگنے پر دل ہی دل میں مسکراتے دوچار باتیں مزید لگا کر عابدہ بیگم کو بتائیں تاکہ اُن کا غصہ معاز کو دیکھتے ہی ٹھنڈا نہ ہو۔

---

## ماضی

کام وغیرہ ختم کرنے کے بعد عابدہ بیگم نے سارہ بیگم سے بات کرنے کے لیے اُن کا نمبر ڈائل کیا جو کچھ دیر بیل جانے کے بعد دوسری طرف سے رسیو کر لیا گیا۔

”السلام علیکم“، ہیلو کی آواز ابھرتے ہی عابدہ بیگم نے سلام میں پہلی کی۔

”و علیکم السلام، جی کون؟“، انجان نمبر کی وجہ سے سارہ بیگم دوسری طرف موجود خاتون کی آواز سنتے کچھ مطمئن ہوئیں۔

”جی میں عابدہ، زارون کی والدہ بات کر رہی ہوں“، عابدہ بیگم نے نام بتانے کے ساتھ ساتھ اپنا تعارف کروایا جس سنتے ہی سارہ بیگم کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

”جی فرمائیے کیوں زحمت کی ہے آپ نے مجھے فون کرنے کی اور ہاں یہ آپ کو میر انبر کس نے دیا؟“، باخوبی اندازہ ہونے کے باوجود بھی سارہ بیگم نے اُن کی زبانی جانا ضروری سمجھا۔

”جی وہ حبہ سے لیا تھا۔ وہ دراصل مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔ زارون اور حبہ کے سلسلے میں“، اُن کے کرخت سے لبج پر عابدہ بیگم نے اپنی آواز کو حتی الامکان ناپسندیدہ کے احساس سے صاف رکھنے کی کوشش کی۔ ”مطلوب آپ کو اپنی پہلے بے عزتی بھول گئی ہے جو آپ نے پھر سے وہی بات کرنے کے مجھے فون کر لیا“، دوسری طرف سے طنزیہ سوال ہوا۔

”بہن مہربانی کر کے آپ ایک بار میری بات سن لیں، دیکھیں اگر میں سب بھول کر آپ سے دوبارہ بات کرنے کی ہمت کر رہی ہوں تو بس اس وجہ سے کہ مجھے اپنے بیٹی کی خوشیاں عزیز ہیں اور اولاد کی خوشیوں کے لیے تو ماں کو کسی بھی حد تک جانا پڑے تو وہ چلی جاتی ہے بس اسی لیے ایک بار پھر سے میں آپ کے سامنے دست سوال لے کر آپ کی بیٹی کا ہاتھ مانگ رہی ہوں“، سلچھے ہوئے انداز میں عابدہ بیگم نے اُن کو اپنے پھر سے فون کرنے کا مقصد بتایا۔ ”اگر آپ کو اپنے بیٹی کی خوشیاں عزیز ہیں ناتو مجھے بھی اپنی بیٹی کے اچھے بُرے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار ہے اور میں نہیں چاہتی کہ کل کو ہمیں کوئی یہ طعنہ دے کہ پتا نہیں بیٹی میں کو نسا عیب تھا جو یوں غیر برداری میں اُس کا رشتہ کر دیا اور ہاں یہ بتیں صرف یہاں تک محدود نہیں رہتی بلکہ نسلوں تک

چلتی ہیں اس لیے آپ لوگ اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں اور اپنے بیٹے کو بھی سمجھائیں کہ ہماری بیٹی کا پچھے چھوڑ دے کیونکہ نہ تو مالی طور پر ہمارے اور ہماری بیٹی کے قابل ہے اور نہ ہی خاندانی طور پر، ان کی بات سنتے ہی سارہ بیگم نے اپنے لہجے میں فرق لائے بغیر ویسے ہی سختی سے بات کی۔ ”بہن رشتؤں اور نسلوں پر ذاتوں یا خاندانوں کا نہیں بلکہ ذہنیت کا اثر ہوتا ہے اور اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں باقی ہماری ذات کوئی کمی فقیر تو ہے نہیں جو آپ اس بات کو بنیاد بنارہی ہیں اور مالی حالات ہمارے آپ سے تھوڑے کم سہی پر اللہ کا شکر ہے بہت اچھے ہیں کسی چیز کی کمی نہیں ہے ہمارے گھر“، عابدہ بیگم نے نرمی سے انہیں اپنی بات پر متفق کرنے کی کوشش کی۔

”کمی ہو یانہ ہو بس میں نے جب ایک بار انکار کر دیا تو اب ہاں کی کوئی گنجائش نہیں اس لیے پلیز آپ ہمارا اور ہماری بیٹی کا پچھا چھوڑ دیں اور اگر ذرا سی بھی غیرت پچی ہے آپ میں تو مجھے دوبارہ کال مت کریے گا اور ہاں ایک بات سُن لیں اور اپنے بیٹے کو بھی بتا دیں کہ میں حبہ کارشتب طے کر چکی ہوں وہ لوگ ایک دو دن میں آکر ملنگی کی رسم کر جائیں گے اس لیے نہ تو اب آپ کوئی آس رکھیں اور نہ ہی اپنے بیٹے کو دلائیں“، اپنی بات مکمل کرتے انہوں نے ٹھک سے فون بند کیا۔

”پتا نہیں کیسے فضول لوگ ہیں اور حبہ بیٹا اپنی ماں سے ضد لے کر تم نے اچھا نہیں کیا“، غصے سے خود کلامی کرتے انہوں نے صحیح سلطان صاحب سے کی گئی بات کو فراموش کرتے ہوئے مسز گیلانی کا نمبر ملا یا اور انہیں شام سات بجے کا وقت بتاتے گھر آنے کی دعوت دے دی۔

---

پیپروں کے اختتام کے ساتھ ہی پورے ڈپارٹمنٹ میں مری جانے کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں سب ہی اپنے اپنے پر میشن لیٹر جمع کروانے میں مصروف تھے تب ہی نور نے بھی رابعہ کے کہنے پر آج گھر جاتے ہی ہمت کرتے ظہیر صاحب کے کمرے کا رخ کیا تاکہ ان سے اجازت لے سکے۔

”آجائیں“، اُس نے دروازے پر دستک دی تو ظہیر صاحب نے اندر سے آواز لگائی۔

”بابا آپ مصروف ہیں تو میں بعد میں آجائوں گی؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے ظہیر صاحب کو اپنے حساب کتاب کے بارے میں رجسٹر میں لکھتا دیکھ کر کہا۔ ”نہیں، آجائو میں تو ویسے ہی فارغ تھا تو سوچا اس مہینے کا حساب رجسٹر پر لکھ لوں“، نور کو دیکھتے ہی انہوں نے عینک اُتارتے اُسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں بولو کوئی بات کرنی تھی کیا؟“، رجسٹر بند کرتے سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر انہوں نے نور کی جانب متوجہ ہوتے سوال کیا جو دماغ میں بات کرنے کے لیے لفظ ترتیب دے رہی تھی۔ ”جی، وہ بات نہیں کرنی بس مجھے اجازت چاہیے تھی..“

”کس بات کی اجازت؟“، ظہیر صاحب نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”وہ بابا ہمارے ڈپارٹمنٹ کا ٹرپ جارہا ہے مری اور میرا بھی دل ہے کہ میں ساتھ جاؤں“، ان کے کندھے پر سر رکھتے نور نے مکھن لگانا ضروری سمجھا۔

”جانے کا کوئی مسئلہ نہیں پر آپ کو پتا ہے ناسفر میں آپ کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے“، ظہیر صاحب نے انکار کی، بجائے اپنی فکر مندی کا اظہار کیا۔

”بابا میں میدیسین کھالوں گی اور اب تو میں بڑی ہو گئی ہوں۔ نہیں ہو گی طبیعت خراب پلیز آپ مان جائیں نا“، نور نے ان کی بات سنتے ہی سر اٹھاتے چہرے پہ معصومیت سجا تے اصرار کیا۔

”نور بیٹا منانے کی بات نہیں ہے میں بس آپ کو اتنا کہہ رہا ہوں کہ پہلے تو ہم ساتھ ہوتے تمہاری طبیعت خراب بھی ہوتی تو ہم سن بھال لیتے ہیں پر ایسے ان جان لوگوں کے نقچ تمہیں کون دیکھے گا اس لیے میرا نہیں دل مان رہا کہ تم جاؤ“، اُس کا سروال پس اپنے کندھے پر رکھتے ظہیر صاحب نے نرمی سے سمجھایا۔

”بaba میری دوست ہے ساتھ وہ بہت اچھی ہے اور میں میدیں کھالوں گی ناصح میں نہیں ہو گی میری طبیعت خراب آپ پریشان نہ ہوں“، نور نے ایک بار پھر سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی تو اس کے اصرار پر ظہیر صاحب نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے چلی جاؤ پر ایک شرط پر کہ تم اپنا بہت خیال رکھو گی“، ظہیر صاحب نے اجازت دینے کے ساتھ ہی تاکید کی۔

”پکا وعدہ میں اپنا خیال رکھوں گی اور میدیں بھی کھا کر جاؤں گی۔ تھینک یو بابا آپ بہت اچھے ہیں“، نور نے خوشی سے چہکتے ان کی گردان میں دونوں بازوؤڑا لے تو ظہیر صاحب نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”بس اب زیادہ مکھن نہ لگاؤ اور ٹرپ جانا کب ہے؟“، اُسے خود سے الگ کرتے ظہیر صاحب نے سوال کیا۔

”پرسوں جانا ہے، اور میں آپ کو مکھن نہیں لگا رہی بس تھوڑا سا پیار کیا ہے“، ان کی بات کا جواب دیتے نور نے منہ بسورا تو ظہیر صاحب نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”ٹھیک ہے اٹھو اب اور رضا کو کہو کہ اپنی ماما کو دیکھئے کب سے ابراہیم کے گھر گئی ہوئی ہیں“، ظہیر صاحب نے اُس کے خرے بڑھتے دیکھ کر کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے باہر کی جانب بڑھی۔

”رضا کو جلاتی ہوں پہلے بڑا کہہ رہا تھا کہ بابا آپ کو نہیں جانے دیں گے“، ظہیر صاحب کے کمرے سے نکتے ہی نور نے رضا کی صحیح کہی گئی بات کی نقل اُتاری اور اُس کے کمرے میں داخل ہوئی جہاں وہ کانوں میں بینڈ فری لگائے کوئی فلم دیکھنے میں مصروف تھا۔

”رضا...“ نور نے اُسے مخاطب کرنے کے ساتھ ہی اُس کے ایک کان سے بینڈ فری نکالی۔

”آپی کیا مسئلہ ہے آپ کو مجھے مووی دیکھنے دیں“، رضا نے اُسے دیکھتے ہی چڑتے ہوئے کہا اور بینڈ فری دوبارہ سے اپنے کان میں لگائی۔

”میری بات تو سنو بہت ضروری بات ہے“، اب کی بار دو نوں ہند فری اُس کے کان سے نکلتے نور نے آنکھوں میں تجسس لیے کہا۔

”جی بولیں“، مووی کو پوز کرتے اُس نے لیپ ٹاپ گود سے نکلتے بیڈ پر رکھا۔

”میں نے بابا سے ٹرپ پہ جانے کی بات کر لی ہے“، اُسے اپنی جانب متوجہ پا کر نور نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”تو بابا نے کیا کہا؟ منع کر دیا ہے نا؟ میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہا تھا“، نور کی پوری بات سننے سے پہلے ہی رضا نے اُس کے چہرے پر سنجیدگی دیکھ کے اندازہ لگایا۔

”مان گئے ہیں بابا وہ بھی خوشی خوشی اور یہ کو نسامم تھے جسے بابا کہیں جانے کے نام پر ڈانٹ کراپنے کمرے سے نکال دیتے“، نور نے چہرے پر مسکراہٹ سجا تے بتانے کے ساتھ ہی اُس کے زخموں پہ نمک چھڑ کا۔

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں نا؟“ اُس کی بات سن کے رضا کو حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہوا کیونکہ ابھی ایک ہفتہ پہلے جب اُس نے کالج کے ٹرپ کے ساتھ جانے کی بات کی تو ظہیر صاحب نے اُسے بُرے طریقے سے ڈانتٹے اپنی پڑھائی پر توجہ دینا کا کہتے انکار کر دیا تھا۔

”نہیں میں کیوں جھوٹ بولوں گی ابھی پر میشن لیٹر پر دستخط کرواؤ کے تمہیں دیکھا دوں گی۔ اللہ کتنا مزہ آئے گا اور ہاں تمہیں اپنی صحیح والی بات یاد ہے نا کہ تم نے کہا تھا کہ اگر میں نے بابا کو منالیا تو تم مجھے چاکلیٹ لے کر دو گے“، نور نے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”کو نسی چاکلیٹ اور کو نسی بات میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی اور آپ آپ سفر میں زندہ بچیں گی تب ہی مزہ آئے گا نا آپ کو“، رضا نے صدمے سے نکلتے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

”ہائے اللہ، رضا بھاڑ میں جاؤ تم اور کہتے ہیں شکل اچھی نہ ہو تو انسان بات ہی اچھی کر لے پر تم پیدا کشی بد تیز ہو اور ہاں میں تمہیں ایسے اتنی آسانی سے اپنی بات سے مکرنے نہیں دوں گی“، آنکھیں سکریٹ تے نور نے کشن اٹھا کے اُسے رسید کیا۔

”مکر نہیں رہا آپی بس یہ بتا رہا کہ ابھی کل، ہی میں نے آپ کے اوپر پورے پانچ سو بیس روپے خرچ کیے ہیں اس لیے اب مجھے میں گنجائش نہیں مزید آپ کے ناز خزر اٹھانے کی“، کشن اپنے سر کے نیچے رکھتے رضانے اکتا ہٹ سے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے بھاڑ میں جاؤ تم اور دو بارہ سے اپنی اس انمنٹ خود ہی بنانا“، رضا کی بات کو سنبھال گئی سے لیتے نور نے اپنی طرف سے اُسے دھمکا یا۔

”تو ٹھیک ہے نآپ بھی واش روم اور کمرے سے چھپکی خود ہی بھگا لیجیے گا“، رضانے دھمکی کی پروا کیے بناء لا پرواٹی سے کندھے اچکائے تو نور نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”میں تمہیں پوچھ لوں گی اور اس بات کا بدلہ تو لے کر ہی رہوں گی اور ہاں بابا کہہ رہے تھے کہ ما کو ابراہیم کی طرف سے بلالا و“، اُس کی بات پر زخم ہوتے نور نے غصے اور دکھ کے ملے جلے تاثرات چہرے پر سجائتے اُسے تنبیہ کرتے ظہیر صاحب کا پیغام دیا اور اُس کی کوئی بات سنے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

”أفف اللہ نے ایک ہی بہن دی وہ بھی نک چڑھی، سڑیل..“ پاس پڑے لیپ ٹاپ کو ایک نظر دیکھتے رضانے اُسے بند کیا اور خود کلامی کرتے نائلہ بیگم کو بلا نے کی غرض سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

”یار کیا مصیت ہے میں نے ایک بار کہہ دیا ناکہ مجھے کہیں نہیں جانا تو کیوں ضد کر رہے ہو؟“ اس بار زارون نے اکتاہٹ سے ارحم کو بیڈ سے دھکا دیا جو پچھلے دو گھنٹوں سے اُس کے کمرے میں دھرنادیے بیٹھا تھا۔

”توبہ کیا زمانہ آگیا ہے دوست ہی دوست کو دھکے دے کر اپنے کمرے سے نکال رہا ہے“، اپنی کمر پر ہاتھ پھیرتے ارحم نے ایک دکھ بھری نظر زارون پہ ڈالی۔

”تو دوست شرافت کی زبان سمجھ لے اور خاموشی سے اپنے گھر چلا جائے کیونکہ میں دوست کو مزید اپنے کمرے میں برا داشت نہیں کر سکتا جو پچھلے دو گھنٹے سے میرے سر پہ سوار ہمارے فرتش میں موجود ہر چیز کا صفائی کر چکا ہے“، زارون نے اُس کی ڈرامہ بازی سے تنگ آتے بیڈ پر بکھری چیزوں اور پلیٹوں کو دیکھا۔

”زارون تمہیں اللہ پوچھے، تم کب سے میرے کھانے پینے پر نظر رکھے بیٹھے ہو۔ حد ہو گئی میں تو تمہیں دوست سمجھتا رہا پر تم تو استین کے سانپ نکلے وہ بھی ڈسنے والے“، لفظوں کو چباتے ارحم نے اُسے طعنہ مارا جواب بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

”اچھی بات ہے سمجھ آگئی ہے تواب اگر ذرا سی شرم باقی ہے تو اپنے گھر دفع ہو جاؤ اور میری جان چھوڑو“، اپنا موبائل اٹھاتے زارون نے باقاعدہ اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ ”نہیں جاؤ گا، جب تک تم مان نہیں جاتے میں کہیں نہیں جاؤ گا اور رہی شرم کی بات تو میں پیدائشی بے شرم ہوں ایسی چھوٹی مولیٰ باتوں کا مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہوتا“، لاپرواٹی سے کندھے اچکاتے وہ اپنی ڈھنڈائی برقرار رکھتے ہوئے واپس بیڈ پہ لیٹ گیا۔

”تو بیٹھے رہو“، نظریں موبائل کی سکرین پر مرکوز رکھتے زارون نے اُس کی کسی بھی بات کا اثر لیے بغیر جواب دیا۔

”میں ساری رات یہی رہوں گا اور ایسے ہی تمہاری ناک میں دم کر کے رکھوں گا“، ارحم نے پھر سے دھمکی دی۔

”تورہ لو، میں نے کب منع کیا“، زارون نے پھر سے بے اعتمانی بر قی توارحم نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”یار کیا ہے مان جاؤ اب“، لبھ کو سنجیدہ کرتے ارحم نے ایک بار پھر سے اُس کی منت کی۔

”یار مجھے نہیں جانا اور مری تو بالکل بھی نہیں کیونکہ ایک ہی جگہ کو بار بار دیکھ کے میں بور ہو چکا ہوں اور کون سا ہمارا ڈپارٹمنٹ جا رہا ہے جو ہم ساتھ جائیں“، زارون نے انکار کے ساتھ ایک ٹھوس وجہ پیش کی۔

”ہمارا ڈپارٹمنٹ نہیں بھی جا رہا تو بھی ہم لازمی جائیں گے کیونکہ میری متوقع بیوی بھی جا رہی ہے اور اس کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے“، ارحم نے ایک عزم سے کہا۔ ”تو وہ تمہاری متوقع بیوی ہے میری نہیں جو میں ساتھ جاؤں“

”زارون یار بے مرمت نہ بنو۔ دیکھو میرا میری بیوی کے بغیر تو گزارا ہو جائے گا پر تمہارے بغیر نہ تو میرا گزارا ہونا اور نہ ہی مجھے مزہ آنا اس لیے پلیز مان جاؤ“، اسے لکھن لگاتے ارحم نے منانے کی کوشش کی۔

”یار تم چلے جاؤ پر پلیز اللہ کا واسطہ مجھے بخش دو“، زارون نے اس کی مسلسل چلتی زبان سے تنگ آتے ہاتھ جوڑے۔

”جا بچہ بخش دیا تمہیں، بابا تجھے دعا دیتا ہے کہ تو سدا سہاگن رہے تیرا گھر ہمیشہ آباد اور قائم رہے“، زارون کی بات سنتے ہی ارحم نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے دعا دی۔

”تم باز نہیں آؤ گے“، اس کا ہاتھ ہٹاتے زارون بے ساختہ مسکرا یا۔

”ہائے لڑکی مان گئی“، اُس کے مسکراتے ہی ارحام نے بیڈ کے اوپر ہی کھڑے ہوتے بھنگڑاڑا۔

”میں کب مانی افف میرا مطلب مانا؟؟؟“

”ابھی ابھی مانے جب مسکراتے وہ بڑے بزرگ کہتے ہیں لڑکی کا مسکر ان اُس کا اقرار ہی ہوتا ہے“، بیڈ سے نیچے چھلانگ لگاتے ارحام نے اپنی جیکٹ اٹھائی۔

”بکواس بند کرو میں لڑکی نہیں ہوں“، اپنا غصہ برقرار رکھتے زارون نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”لڑکی نہیں ہو پر مان تو گئے نابس اب تیاری کر لینا میں نے تمہاری پے منٹ کر دی تھی“، جیکٹ

پہنچتے اُس نے زارون کی معلومات میں اضافہ کیا جواب خاموشی سے بیٹھا اثبات میں سر ہلاچ کا تھا۔

”اور ہاں مجھے یہ بات یاد رہے گی اور بیٹا کوئی نہیں تم پہ بھی یہ وقت آتا ہے جب اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے تم میری منتیں کرو گے“، جاتے جاتے وہ پلٹ کر زارون کو دھمکی دینا نہیں بھولا۔

”اللّد نہ کرے مجھ پہ کبھی یہ وقت آئے اور ہاں میرے لیے ایک نصیحت ہی کافی تھی“، زارون نے مسکراتے ہوئے اُسے اٹھ کر دروازے سے باہر نکالتے دروازہ بند کیا جو اُس کی بات سنتے پھر سے بیٹھنے کا سوچ رہا تھا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم“، باہر سے دروازے پر پاؤں مارتے ارحام نے اُس کی حرکت کا غصہ نکالا۔

”تم بھی“، زارون نے اندر سے آواز لگاتے حساب برابر کیا تو احمد پھر کسی وقت اس بات کا بدلہ لینے کا سوچتے سیڑھیاں اُترتے باہر کی جانب بڑھا۔

---

## ماضی

”امی میں کسی کے سامنے ٹرے لے کر پیش نہیں ہوں گی اور میں نے آپ کو صحیح بھی بتایا تھا کہ میں زارون کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی“، سارہ بیگم نے مسز گیلانی سے بات کرنے کے بعد حبہ کے سر پر بم پھوڑا جو ٹیبل پر موجود ناشستہ کرنے میں مصروف تھی۔

”تم نے صحیح جو بھی بتایا ہو مجھے اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور آج تم نے مہمانوں کے سامنے کوئی بات یا بد تیزی کی یا ان سے نہ ملی تو حبہ تم پھر یہ سمجھ لینا کہ تمہاری ماں تمہارے لیے مرچکی ہے“، سارہ بیگم نے اُس کی بات سنتے ہی دھمکی دی۔

”امی پلیز آپ کیوں نہیں سمجھ رہیں کہ میں کسی اور کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی“، ان کو بگڑتا دیکھ کر حبہ نے اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔

”جب نکاح ہو جاتا ہے تو محبت بھی خود ہی پیدا ہو جاتی ہے اور انسان خوش رہنا بھی سیکھ جاتا ہے اس لیے تم اُس زارون نامی لڑکے کا پیچھا چھوڑ دو اور خاموشی سے شام کی تیاری کرو کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ وہ لوگ تمہیں دیکھنے کے بعد یہاں سے مايوس لوٹیں“، اپنا فیصلہ سُناتے سارہ بیگم نے حبہ کی کوئی بھی بات نہیں سُنی اور شرف کو اپنے کمرے میں آنے کو کہتے وہاں سے چلی گئیں۔

”امی میں آپ کو اس کے لیے کبھی معاف نہیں کروں گی“، پلیٹ کو ہاتھ مارتے حبہ نے آنکھوں میں نمی لیے بے بسی سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھی تاکہ سلطان صاحب کو فون کر کے سارہ بیگم کے رویے اور ارادوں کے بارے میں آگاہ کر سکے۔

کمرے میں آتے ہی اُس نے سلطان صاحب کا نمبر ڈائل کیا جو تیسری نیل پر انہوں نے رسیو کر لیا۔

”ابو کہاں ہیں آپ؟“، دوسری طرف ہیلو کی آواز ابھرتے ہی حبہ نے سلام دعا کے بغیر ہی سوال کیا۔

”میں آفس میں ہوں کیوں خیریت؟“، اپنے سامنے موجود فائیل کو بند کرتے سلطان صاحب کو اُس کی آواز سے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔

”ابو پلیز آپ فوراً گھر آجائیں“، اب کی بار حبہ نے روتے ہوئے ان سے درخواست کی۔

”حبہ میری جان ہوا کیا ہے؟ اور تم روکیوں رہی ہو؟ سب خیریت ہے نا؟“ اپنی کرسی سے اٹھتے سلطان صاحب نے بے چینی سے ایک ہی سانس میں کئی سوال کیے۔

”کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے ابو، پتا نہیں امی کو کیا ہو گیا ہے کیوں وہ میری خوشیوں کے پیچے پڑی ہیں۔ میں نے انہیں منع بھی کیا پر انہوں نے اپنی کسی دوست کو ان کے بیٹے کے ساتھ گھر بلا لیا ہے۔ بس پلیز آپ جلدی گھر آجائیں اور امی کو سمجھائیں“، حبہ نے اپنے آنسو صاف کرتے اٹکتے ہوئے ساری بات سلطان صاحب کو بتائی جو خود بھی ان کی بات سن کر حیران و پریشان تھے کیونکہ ابھی صحیح ہی تو سارہ بیگم نے ان لوگوں کو کچھ دن روکنے کی بات تھی۔

”اچھا تم پریشان نہ ہو، میں بس کچھ دیر میں گھر پہنچتا ہوں“، اُسے تسلی دیتے سلطان صاحب نے فون بند کرتے اپنا والٹ اٹھایا اور باہر کی جانب بڑھے تاکہ جلد از جلد گھر پہنچ کر اس معاملے پر سارہ بیگم سے بات کر سکیں۔

ماضی

سلطان صاحب گھر پہنچ تو سارہ بیگم اپنے کمرے میں موجود تیار ہونے میں مصروف تھیں۔

”شر فو بیگم صاحبہ کہاں ہے تمہاری؟“ سلطان صاحب نے آتے ہی اُس سے پوچھا جو ڈرائیور میں روم کی صفائی کر رہا تھا۔ ”سلام صاحب، وہ بیگم صاحبہ تو کمرے میں ہیں“، ہاتھ ماتھے تک لے جاتے شر فونے سلام کرنے کے ساتھ ہی اُن کی بات کا جواب دیا جو اُس کی بات سنتے ہی اپنے کمرے کی جانب بڑھے۔

”سلطان آپ؟ آپ اتنی جلدی آگئے؟ ویسا اچھا ہی ہوا آپ خود ہی آگئے میں ابھی بس آپ کو ہی فون کرنے والی تھی؟“، سلطان صاحب کو اس وقت گھر پر دیکھ کر سارہ بیگم کو کافی حیرت ہوئی جسے نامحسوس طریقے سے انہوں نے اپنی مسکراہٹ میں چھپایا۔

”مجھے کیوں فون کرنے والی تھیں؟ اور یہ آپ کہیں جا رہی ہیں کیا؟“ اُن کی تیاری کو دیکھتے سلطان صاحب نے حبہ سے ہوئی بات کا کوئی بھی تاثر دیے بغیر صوفے پر بیٹھتے اپنے شوز اٹارے۔

”نہیں جاتو نہیں رہی بس گھر میں کچھ مہماں آرہے ہیں اسی لیے تیار ہوئی ہوں“، ڈرائیور میبل سے برش اٹھا کر اپنے بالوں میں پھیرتے انہوں نے سلطان صاحب سے نظریں ملائے بغیر بتایا۔ ”کونسے مہماں؟“، ہاتھ روک کر انہوں نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”صحیح میں نے آپ کو کچھ مہمانوں کے آنے کا بتایا تھا، بس وہی لوگ آرہے ہیں حبہ کو دیکھنے“، برش واپس رکھتے انہوں نے اپنے ٹالپس اٹھا کر پہنے۔

مطلوب؟ آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ابھی کچھ دن کے لیے ان لوگوں کو منع کر دیں گی پھر یہ اچانک...؟، اٹھ کر ان کے قریب آتے سلطان صاحب نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”بس میں نے منع کیا تھا پر مسز گیلانی نہیں مانی اور بار بار ایک نظر جبکہ کو دیکھنے پر اصرار کرنے لگی تو میں انکار نہیں کر پائی“، گلے میں چین پہننے انہوں نے من گھڑت کہانی سلطان صاحب کو سنائی۔

”آپ جانتی ہیں ناکہ جبکہ اس بات پر بالکل بھی تیار نہیں ہو گی اور آپ ایسے زور زبردستی کر کے بات کو مزید خراب کر لیں گی۔ جوان اولاد ہے اپنے منہ زور ہو کر کوئی فیصلہ کر لے تو ہم کسی کو منہ دیکھنے کے قابل نہیں رہیں گے“، سلطان صاحب نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ساتھ انہیں بھی خبردار کیا۔

”منہ دکھانے کے قابل تو ہم اُس کی بات مان کر بھی نہیں رہیں گے اس لیے آپ پریشان نہ ہوں میں نے جبکہ سے بات کر لی ہے اور پلیز اب آپ اپنی بیٹی کی سایہ لے کر میرا موڈ خراب مت کریئے گا“، سلطان صاحب کو کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر سارہ بیگم نے فٹ سے ٹوکا۔ ”سارہ اس میں موڈ خراب کرنے کی بات نہیں ہے بس میں تمہیں اتنا سمجھانا چاہ رہا ہوں کہ ہم زبردستی کریں گے تو جبکہ کوئی ٹھاسیدھا قدم نہ اٹھا لے اور تم صحیح کیوں نہیں ہو کہ یہ زور زبردستی کے رشتے صرف چند دن ہی با مشکل چل پاتے ہیں اور اگر بالفرض دو فریق اُس رشتے کو

نہجانے کا سوچ بھی لیں تو بس وہ سمجھوتے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور سمجھوتے سے رشتے تو چل جاتے ہیں پر زندگیاں نہیں، تم کیا چاہتی ہو کہ ہماری بیٹی ساری عمر ہماری خوشی کے لیے سمجھوتا کر لے؟؟ دیکھو سارہ ٹھنڈے دماغ سے سوچو ذات کا فرق کوئی معنی نہیں رکھتا اور ہو سکتا ہے ہماری بیٹی کی پسند اُس کے حق میں ہمارے پسند کیے گئے لڑکے سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہوا س لیے بعد میں پچھتا نے سے بہتر ہے کہ تم ابھی اس ذات پات اور دولت کے فرق کو فراموش کرتے سکون سے فیصلہ کرو جونہ صرف حبہ کے بلکہ ہمارے حق میں بھی بہتر ہو، ان کو دونوں کندھوں سے تھامتے سلطان صاحب نے دل لیلیں دیتے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں فیصلہ کر چکی ہوں اور اگر حبہ کو اپنی مرضی کرنی ہے تو وہ مجھے ہمیشہ کے لیے بھول جائے میں اُس کا اپنے آپ سے اور اس گھر سے ہر رشتہ ختم کر دوں گی“، ان کے ہاتھ ہٹاتے سارہ بیگم نے کرخت لبجے میں کہا اور انہیں تیار ہو کر باہر آنے کا کہتے خود انتظامات دیکھنے چلی گئیں۔

”اللہ کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں میں“، ماں کو سمجھتا ہوں وہ نہیں سنتی اور بیٹی اپنی ضد پر قائم ہے ان کے جاتے ہی سلطان صاحب سے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام جوآنے والے وقت کا سوچ کر ہی چکرانے لگا تھا۔

-----

”یہ جlad بھی ہمارے ساتھ جائے گا؟“ نور نے بس میں بیٹھتے ہی زارون کو اپنے ساتھ والی سیٹ پر ارحم کے ساتھ بمیٹھاد لکھ کر رابعہ کے کان میں سر گوشی کی۔

”نور شرم کرو تم، ایک اچھے خاصے ہند سم انسان کو جlad بول رہی ہو“، ایک نظر زارون کو دیکھتے جو بلیو جیز کے اوپر سفید شرت پہنے، شفاف چہرے پر سلیقے سے سیٹ کیے بالوں میں عام دنوں کی نسبت کہیں زیادہ اچھا لگ رہا تھا رابعہ نے اُسے ٹوکا جو اُس کی بات سنتے ہی مسکرا نے لگی۔ ”ہند سم اور یہ بند رہا ہا ہا شکل دیکھی ہے تم نے اس کی؟ ایسے ہے جیسے ابھی ابھی بیوی سے مار کھا کر آیا ہو“، اپنے بیگ سے چاکلیٹ نکالتے اُس نے ایک بار پھر سے رابعہ کی بات کو رد کیا۔

”نور ہمارے لیے بھی کچھ کھانے کو لائی ہو یا اکیلے اکیلے ہی سب کھانے کا ارادا ہے؟“ ارحم نے اُسے چاکلیٹ کا روپ کھولتے دیکھ کر سوال کیا۔

”بریانی لاٹی ہوں آپ کے لیے وہ بھی ماما سے بناؤ کے۔ آپ کو پتا ہے ارحم بھائی میری ماما بہت مزے کی بریانی بناتی ہیں“، نور نے جواب کے ساتھ پوری تفصیل ارحم کو بتائی۔ ”واہ، دل خوش کر دیا تم نے میرا، ویسے بھی مجھے اور زارون دونوں کو بریانی بہت پسند ہے“، ارحم نے للچاتے ہوئے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا تو زارون نے اپنے نام پر اُسے گھورا۔

”زارون پلیز کوئی گاناسنا دو، ہم کب سے بور ہو رہے ہیں“، پچھلی سیٹ پر بیٹھے ایک لڑکے نے اُس سے فرما کش کی جو ان کے ساتھ ہی پر و گرامنگ سیکھ رہا تھا۔

”سوری یار میرا اگلا خراب ہے“، ایک معقول سی وجہ کے ساتھ اُس نے معذرت کی۔

”زارون یار، پلیز تھوڑا سا سنا دو، سچ میں ہم لوگ کافی بور ہو رہے ہیں“، اُس کی بات سننے ایک اور لڑکے نے اصرار کیا۔

”ثاقب یار سچ میں میرا اگلا خراب ہے“، زارون نے اُس کے اصرار پر ایک بار پھر سے انکار کیا تو ارحم جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”میرے بھائیوں آپ لوگ کیوں اس نک چڑھے انسان کی منتیں کر کے اپنا قیمتی وقت بر باد کر رہے ہو اور آپ کو گناہ سننا ہے ناتو میں کس مرض کی دوا ہوں“، ارحم نے بلند آواز میں کہتے ان سب کے سامنے اپنا سر خم کیا اور گلا کھنکھارتے ہوئے خود کو سُر لگانے کے لیے تیار کیا۔

دل دے دے دے دیا ॥۱॥ ہے....

جان تجھے دے دے دے گے....

ارحم نے گانا شروع کیا تو رابعہ سیمت سب سٹوڈنٹس نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھا اور زارون نے اٹھ کر ارحم کے منہ پہ۔

”بس کرو اتنا ہی بہت ہے“، اُسے واپس اپنے ساتھ سیٹ پر بٹھاتے زارون نے ہاتھ ہٹایا۔  
”کیا مسئلہ ہے تمہیں مجھے پتا ہے تم میری سریلی آواز سے جلتے ہو“، ایک بار پھر سے کھڑے ہوتے

ارحم نے سُر لگانے کی کوشش کی تو پچھلی سیٹ پر بیٹھے لڑکے نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

”ارحم بھائی آپ کی مہربانی اپنی سریلی اور قیمتی آواز و اشروم میں گانے کے لیے سنبحال کر رکھیں کیونکہ ہمارے نازک کان آپ کی خوبصورت آواز کے جادو کو برداشت نہیں کر پا رہے“، اُس لڑکے نے بڑی عزت کے ساتھ ارحم کی بے عزتی کی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم سب“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے ارحم نے غصے سے اُسے پیچھے سیٹ پر دھکا دیا اور سب کے قہقہہ لگانے پر واپس اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

”اب میری اتنی بھی بُری آواز نہیں جتنی تم لوگ سمجھ رہے“، زارون اور رابعہ کو بھی مسکرا تا دیکھ کر ارحم نے دانت پسیے۔

”بُری نہیں بلکہ بہت بے سُری آواز ہے تمہاری، کیوں رابعہ؟“ زارون نے اُس کے ناراض چہرے کو دیکھتے مزید عزت افزائی کرتے رابعہ سے تصدیق چاہی جس نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلا�ا۔

”تم دونوں ہو ہی بے مردود اور باقی سب ہنسے مجھے اتنا دکھ نہیں ہوا جتنا تم دونوں کے ہنسنے پر ہوا ہے“، خنگی سے کہتے اُس نے نور کی جانب دیکھا جو خاموشی سے بیٹھی تھی۔

”ارحم بھائی میں نہیں ہنسی اور یہ لوگ بے مردود ہیں میں نہیں“، اُسے اپنی جانب دیکھتا پا کر نور نے فوراً سے وضاحت دی۔

”ہاں مجھے معلوم ہے میری بہن ان جیسی بد تمیز نہیں“، نور کی بات سنتے ہی ارحم کو کچھ ہمت ملی۔

”پر ارحم بھائی گانا میں بھی آپ کا نہیں سُنوں گی کیونکہ میرے بابا نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں اپنا خیال رکھوں گی اور آپ کی آواز سننے کے بعد تو میں نے بھی بے ہوش ہونا ہوا تو ہو جانا ہے اس لیے پلیز آپ غصہ مت کریے گا“، نور نے اپنی معصومیت برقرار رکھتے ہوئے اُس کو اپنی مجبوری بتائی تو زارون اور رابعہ ارحم کی رو نے والی شکل دیکھتے زور سے ہنسے۔

”بھاڑ میں جاؤ تم سب“، نور کی بات سنتے ہی ارحم نے غصے سے کہا اور ان کے پاس سے اٹھ کر آگے جانے لگا جب زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑ کے اُسے روکا۔

”اچھا بس اب ناراض نہ ہو جو ہونا تھا ہو چکا اور وہ کہتے ہیں نہ آئی کو کون روک سکتا ہے بس یہی سمجھو کہ عزت افرائی کا وقت آیا تھا تمہارا“

”بھاڑ میں جاؤ تم اور ڈوب مر جا کر شرم نہیں آتی دوست کی بے عزتی پر مزید مسالہ چھڑ کتے“، اُس کا ہاتھ جھٹکتے ارحمنے شکوہ کیا تو زارون نے اُس کے کندھے پر بازو رکھا۔ ”اچھا نا سوری دوبارہ سے میں مسالہ نہیں چھڑ کوں گا بلکہ مر چیں چھڑ کوں کا وہ بھی سرخ“، دائیں آنکھ دباتے زارون نے اُسے مزید تپایا۔

”زارون تم نے میرے ہاتھوں قتل ہو جانا ہے“، ہاتھ اُس کے گلے کی جانب بڑھاتے ارحمنے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

”اچھا نا اب زیادہ جذباتی مت ہو اور موڈٹھیک کرو اپنا“، زارون نے اُس کے ہاتھ اپنی گردن سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

”ہم ایک شرط پہ کروں گا موڈٹھیک“  
”کیسی شرط؟“

”یہی کہ تم میرا پسندیدہ گاناسنا کر مجھے مناؤ گے وہ بھی ابھی اور اسی وقت اور ساتھ مجھے کچھ دیر رابعہ کے ساتھ بیٹھ کر با تین کرنے کا موقع بھی فراہم کرو گے“، ارحم نے بڑی چالاکی کے ساتھ اپنا مطلب نکالا۔

”ٹھیک ہے گانا میں سُنادیتا ہوں پر رابعہ کے ساتھ بیٹھنے کا موقع فراہم کرنا میرے بس میں نہیں اس کے لیے تمہیں خود ہی کچھ سوچنا پڑے گا“، اُس کی بات سمجھے بغیر ہی زارون نے لاپرواٹی سے کہا۔

”ٹھیک ہے بس تم میری مدد کر دینا تھوڑی سی“، اُس کے کان میں گھستے ارحم نے اپنی بات کہی۔ ”اچھا ٹھیک ہے کر دوں گا“، اُس کے شیطانی دماغ میں چلتے ارادوں سے بے خبر زارون نے اثبات میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے اب سُناؤ گانا“، ارحم نے اپنے مقصد کی تکمیل پر مسکراتے ہوئے دوسری جانب دیکھا جہاں رابعہ کسی سے فون پہ بات کر رہی تھی اور نور بار بار او نگھتے ہوئے خود کو سونے سے روکنے کی کوشش کرنے میں مصروف تھی۔

-----

میری قسمت کے ہر اک پنپھ میرے جیتے جی بعد مرنے کے میرے ہر اک کل ہر اک لمحہ میں  
تو لکھ دے میرا اُسے ہر کہانی میں سارے قصوں میں دل کی دنیا کے سچے رشتؤں میں زندگانی  
کے سارے حصوں میں تو لکھ دے میرا اُسے اے خدا اے خداجب بنا اُس کا ہی بنا اے خدا  
اے خداجب بنا اُس کا ہی بنا

زارون کی آواز کانوں میں پڑتے ہی جہاں سب اُس کی جانب متوجہ ہوئے وہاں رابعہ نے بھی  
ریحانہ بیگم کو کچھ دیر بعد بات کرنے کا کہتے فون بند کیا اور نور بھی نیند کے جھونکوں سے بیدار  
ہوتے سیدھی ہو کر بیٹھی۔

اُس کا ہوں اس میں ہوں اُس سے ہوں اُسی کا رہنے دے میں تو پیاسا ہوں وہ دریا وہ ذریعہ جی بنے  
کا میرے مجھے گھردے گلی دے شہر دے اُسی کے نام کے ۔۔۔ قدم یہ چلے یارو کے اب اُسی  
کے واسطے دل مجھے دے اگر درد دے اُس کا پر ۔۔۔ اُس کی ہو وہ ہنسی گونجے جو میرا گھر اے  
خدا اے خداجب بنا اُس کا ہی بنا اے خدا اے خداجب بنا اُس کا ہی بنا

سب لوگ اُس کی خوبصورت آواز کے سحر میں کھو سے گئے تھے جو پوری دنیا سے بے خبر بس ایک چہرے کو اپنی بند آنکھوں کے پردے میں رکھے گانے میں مصروف تھا۔

میرے حصے کی خوشی کو ہنسی کو تُو چاہے آدھا کر----- چاہے لے لے تو میری زندگی پر یہ مجھ سے وعدہ کر اُس کے اشکوں پہ غموں پہ دُکھوں پہ ہر اُس کے زخم پر----- حق میرا، ہی رہے ہر جگہ ہر گھٹری ہاں عمر بھر اب فقط ہو یہی وہ رہے مجھ میں ہی ہو جدا کہنے کو نچھڑے ناپر کبھی--- اے خدا اے خدا جب بنا اُس کا ہی بنا اے خدا اے خدا جب بنا اُس کا ہی بنا

گانے کے اختتام پر ہر طرف تالیوں کی گونج پر زارون نے آنکھیں کھولتے ہی ارحم کو اپنی جانب متوجہ پایا جو اُس کے چہرے پر لکھے درد کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”اففف زارون تم بہت اچھا گاتے ہو“، سب سے پہلے رابعہ نے اُس کی تعریف کی جس پر اُس نے بس مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”واقعی بہت اچھا گاتا ہے زارون“، ایک اور لڑکے نے رابعہ کی بات کی تائید کی تو ارحم نے زارون کے چہرے سے نظریں ہٹاتے پیچھے کی جانب پلیٹ کراؤ سے گھورا۔

”سوری ارحم بھائی میں نے تو ویسے ہی تعریف کی تھی بس“، اُس کے دیکھتے وہ لڑکا سمجھ چکا تھا تب ہی اُس نے فوراً سے معدرت کی۔

”تعریف کرنی ہے تو سید ہے سید ہے کرو کسی کی بات کو پکڑ کر نہیں اور رابعہ تم شرم کرو اپنے متوقع شوہر کو چھوڑ کر تم اس سڑیل کی تعریف کر رہی ہو“، اُس لڑکے کو اپنی بات سمجھاتے ارحم نے رابعہ کو آڑے ہاتھوں لیا جو سب کے سامنے متوقع شوہر کی بات سننے ہی شرم سے لال ہوتے بس اُسے آنکھیں دکھاتے خاموش ہو گئی۔

”زارون ویسے سچ میں تم اچھا گاتے ہو، کیوں نور؟“، اب کی بار ارحم نے تعریف کرتے نور سے تصدیق چاہی جو کافی دیر سے خاموش تھی۔

”سو گئی ہے“، تھوڑا پیچھے ہوتے اُس نے اپنی ساتھ والی سیٹ کی جانب اشارہ کیا جہاں وہ بالکل بے سود ہو کر سور ہی تھی۔

”یہ جب سے بیٹھی ہے ایسے ہی کچھ دیر بعد سو کیوں جاتی ہے؟“، اُس کے ہاتھوں زارون کی ہونے والی متوقع بے عزتی پر ارحم نے بد مزہ ہوتے پوچھا۔

”طبعت خراب ہوتی ہے سفر میں، چکر آتے ہیں وہ میٹ ہونے لگتی ہے اسی لیے سفر کرنے سے پہلے میڈیسین کھائی تھی اس نے اور مجھے لگتا انہی میڈیسین کا اثر ہے“، رابعہ نے زارون کو اپنے موبائل میں مصروف دیکھ کر ارحم کو پوری تفصیل بتاتی۔

”اُف ایک تو میری بہن میری ہی طرح نازک مزاج ہے پر اس کے سونے کا ہمیں کافی فائدہ ہو سکتا ہے اگر زارون چاہے تو..“ رابعہ سے بات کرتے کرتے ارحم نے اُس کی طرف دیکھا جو باطنہ خود کو مصروف ظاہر کر رہا تھا۔

”وہ کیسے؟“ رابعہ نے تجسس سے پوچھا تو ارحم نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے اپنارخ زارون کی جانب کیا۔

”زارون یا پلیز میری مدد کر دو“، اُس کے کان سے ہینڈ فری نکالتے ارحم نے کہا جو اُس نے اُسے اپنی جانب متوجہ ہوتا دیکھ، ہی کان میں لگالی تھی۔

”کیسی مدد؟“

”پلیز تم وہاں کچھ دیر رابعہ کی جگہ پر جا کر بیٹھ جاؤ“  
”کہاں؟ اُس معصوم چڑیل کے ساتھ؟ نہیں میں نہیں بیٹھوں گا“، اُسکی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی زارون نے اُس کا مفہوم سمجھتے فٹ سے جواب دیا۔

”پلیز یار تم نے ابھی کچھ دیر پہلے کہا تھا کہ تم میری مدد کرو گئے“، ارحم نے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”مدد کا کہا تھا یہ نہیں کہا تھا کہ تمہاری خاطر میں موت کے کنویں میں چھلانگ لگادوں گا“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے جھر جھری لیتے جواب دیا۔

”پلیز یار وہ تو سوئی ہے اُس نے تمہیں کیا کہنا ہے“، اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ارحم نے اُس کی ایک بار پھر سے منت کی تو زارون نے اُس کی بات پر نظر ثانی کرتے نفی میں سر ہلا�ا۔

”یا را گروہ اٹھ گئی نا تو تمہارے ساتھ ساتھ وہ میرا بھی قیمہ بنادے گی“، زارون نے پھر سے اپنے خدشہ کا اظہار کرتے انکار کیا۔

”کچھ نہیں کہتی بس تم اٹھو، میں ہوں نا گر خدا نخواستہ وہ اٹھ بھی گئی تو میں سب سنہجال لوں گا“، ارحم نے اُسے یقین دہانی کرواتے اپنارخ رابعہ کی جانب کیا جو کب سے انہیں آپس میں کوئی کھھڑی پکاتا دیکھ رہی تھی۔

”رابعہ تم ادھر آجائو میرے ساتھ“، ارحم نے اُس کی جانب دیکھتے آواز دھیمی رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں میں یہاں ہی ٹھیک ہوں“، زارون پر نظر پڑتے ہی رابعہ نے فوراً ہی انکار کیا۔

”تم آتی ہو یا میں گھر فون کر کے بتاؤں کہ میں بھی تمہارے ساتھ مری جا رہا ہوں“، آہستہ آواز میں اُسے دھمکی دیتے ارحم نے ساتھ ہی اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائی جسے خونخوار نظروں سے دیکھتے رابعہ اپنی جگہ سے اٹھی اور پھر زارون کو بھی چاروں ناچار اپنی جگہ چھوڑنی پڑی۔

---

”اللہ جی پلیز ایک بار بچالینا دوبارہ میں کبھی بھی اس منحوس کی مدد نہیں کروں گا“، نور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہی زارون نے دعاۓ خیر کی۔

”پتا نہیں مجھے بھی ایک مصیبت پڑی تھی اس جیسا خود غرض اور بد تمیز دوست بنانے کی“، خود کلامی کرتے ایک نظر اس نے نور پہ ڈالی جو کھڑکی کے ساتھ سر ٹکائے بے خبر سورہی تھی۔ ”پتا نہیں کیسے لوگ ہوتے ہیں جو سفر میں بھی اتنے سکون سے سوئے رہتے ہیں“، کندھے اچکاتے اُس نے ہینڈ فری اپنے کانوں میں لگائی اور سیٹ کی بیک سے سر لگاتے آنکھیں موندے کچھ دیر سکون کی غرض سے بیٹھ گیا پر ابھی اُسے بیٹھے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ اپنے کندھے پر وزن محسوس کرتے اُس نے فٹ سے آنکھیں کھولے دوسری جانب دیکھا جہاں نور اسے شامِ رابعہ سمجھ کر بڑے آرام سے اُس کے کندھے پر سر رکھے سورہی تھی۔

”اُفف میرے خدا اب یہ کیا مصیبت ہے“، اُس کی جانب دیکھتے ہی زارون نے سیدھے ہو کر بیٹھنے کی بجائے ویسے ہی بیٹھے بیٹھے اپنار کا ہوا سانس بحال کرتے مدد طلب نظرؤں سے ارحم کی جانب دیکھا جو پہلے سے ہی اُس کی جانب متوجہ تھا۔

”واہ لگتا ہے کافی دوستی ہو گئی ہے“، زارون کے دیکھتے ہی ارحم نے تھوڑا اُس کے قریب ہو کے سرگوشی کی۔

”بھاڑ میں جائے دوستی، ارحم پلیز یار کچھ کرو اگر یہ نیند کی دکان اٹھ گئی اور اس نے مجھے اپنے ساتھ بیٹھے دیکھ لیا تو یقیناً یہ میر آخڑی ٹرپ ہو گا جو مری پہنچنے سے پہلے ہی اختیام پذیر ہو جائے گا“، آہستگی سے کہتے زارون نے اُسے آنکھیں دکھائیں جو کوئی بھی اثر لیے بغیر ان دونوں کوساتھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”یار شیر بناؤ ایک لڑکی ہی تو ہے اور دیکھو ناکتنی پیاری لگ رہی ہے تمہارے کندھے پر سر رکھ کر سوتے ہوئے“، ارحم نے اپنی ڈھنڈائی برقرار رکھتے سرگوشی کی تو زارون نے اُسے کھاجانے والی نظرؤں سے گھورا۔

”ارحم پلیز یہ مذاق کا وقت نہیں ہے اور نہ ہی میرا تمہارے فضول قسم کے جو ک سننے کا کوئی موڑ ہے“، اُس کا ہاتھ پکڑتے زارون نے لفظوں کو چباتے ہوئے ارحم کو تنبیہ کی جو اُس کی حالت سے

محفوظ ہوتے رابعہ کو بھی اشارے سے اُن کی جانب متوجہ کروایا جو تب سے اُن کی دونوں کو اپس میں سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ”ہائے اللہ یہ کیا ہوا، میں سیدھا کر کے لٹاتی ہوں نور کو“، ارحم کی نظروں کے تعاقب میں اُس نے تھوڑا آگے ہوتے دیکھا تو فوراً سے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھتے اُٹھی۔

”بیٹھ جاؤ سکون سے اور لیٹی رہنے دونور کوتا کہ اس کھڑوس کو بھی پتا چلے کہ مشکل وقت کسی پر بھی آسکتا ہے“، اپنا ہاتھ زارون کے ہاتھ سے چھڑواتے ارحم نے رابعہ کا بازو پکڑتے اُسے واپس بٹھایا۔

”ارحم پلیز جانے دو“، زارون کی طرف دیکھتے رابعہ نے اُس کا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔ ”نہیں جانے دوں گا اس بد تمیز کو سبق سکھنے دو کیونکہ اس نے ابھی کچھ دن پہلے ہی مجھے ایک لڑکی کی جوتیاں کھانے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اس کو اتنی آوازیں دیں پر یہ ایسا بھاگا کہ چچھے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا حالانکہ قصور اس کا اپنا تھا۔ سچ میں رابعہ یار میں نے بس اتنا ہی کہا تھا کہ زارون وہ دیکھو کتنی پیاری لڑکی ہے دل کر رہا ہے تیری بھا بھی بناؤ کر گھر لے جاؤ“، رابعہ کو اپنی طرف حیرت سے دیکھتا پا کر ارحم نے سارا الزام زارون پر ڈالتے ہوئے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”اس بد تمیز انسان نے مجھے شے دی اور میں اُس سے شادی کا پوچھنے چل پڑا اور یقین جانو اُس نے اتنی جوتیاں ماریں کہ مجھے گنتی بھی یاد نہیں اور اب اس کو بھی کھانے دو“، ارحم نے اپنا راز خود ہی فاش کرتے اپنے پاؤں پہ کلہاڑی ماری۔

”ارحم تم ایسے نکلو گے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا“، اُس کا ہاتھ جھٹکتے رابعہ نے پھر سے اُٹھنے کی کوشش کی۔

”یار یہ تو بہت پرانی بات ہے تم پریشان مت ہواب تمہارے علاوہ میری زندگی میں کوئی نہیں ہے“، اُسے واپس سیٹ پر بٹھاتے ارحم نے گڑ بڑاتے ہوئے صفائی پیش کی۔

”پرا بھی تو تم نے کہا کچھ دن پہلے کی بات ہے؟“، رابعہ نے اُس کی بات سننے ہی یاد ہانی کروائی تو زارون نے ان دونوں کو جھگڑتا دیکھ کر اپنی جانب متوجہ کیا۔

”یار تم لوگ بعد میں لڑ لینا پہلے میری اس مصیبت سے جان چھڑواو“، نور نے اُس کی جانب کروٹ لی تو زارون نے سانس روکے ارحم کی منت کی جو اسے ہاتھ سے دفع کرتے پشت اُس کی جانب کر کے بیٹھ گیاتا کہ رابعہ کو منا سکے۔

”میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا“، نور کے جاگ جانے کے ڈر سے زارون وہیں سیٹ پر بیٹھا رابعہ کو اشارے سے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرتا بس پیش و تاب کھا کر رہ گیا۔

”أَفْفَ اللَّهُدِيَا نَهِيْس مِن اس لِرِكِيْ كُوَابِ خَوْدَسِيْ إِلَكِ كِيْسِيْ كَرُوْ؟“، أَن دُونُوْسِيْ كِيْ بِيْ مِرْوَتِيْ دِيْكِيْ  
كَرِ زَارُونَ نِيْ خَوْدَهِيْ اپِنِيْ مَدِ كَاسِوْچَا اورِ نُورِ كَاسِرِ اپِنِيْ كَنِدِهِيْ سِيْ هَمَانِيْ كِيْ كُوشِشِيْ كِيْ پِرِ اسِيْ  
خَوَابِيدِهِ چَهَرَے پِرِ نَظَرِ پِرِتِهِيْ وَهَرِكِيْ گِيَا۔

”سوَتِهِيْ كِتَنِيْ مَعْصُومِيْ لَكَتِيْ ہِيْ کَاشِيْ كَجَاتِهِيْ ہَوَيْ بِھِيْ يِهِ مَعْصُومِيْتِ بِرِ قَرَارِ رِهَتِيْ“، بِ  
اِختِيَارِهِيْ نَظَرُوْنِ سِيْ اسِيْ اِيكِ اِيكِ نقِشِيْ كُو باِغُورِ دِيْكِيْھَتِيْ زَارُونَ كُو اپِنِيْ ہَارِٹِ بِيْٹِيْ كِيْ رِفَقَارِ  
بِرِھَتِيْ ہُوَيِيْ مَحْسُوسِ ہُوَيِيْ تِبِهِيْ اسِيْ نَجْدِيْ سِيْ خَوْدِ پِهِ قَابُوْپَاتِ نَظَرُوْنِ كَا زَادِيْهِ بِدَلَا اورِ اَرِحَمِ كِو  
اپِنِيْ جَانِبِ مَتَوَجَّهِ كِرَنِيْ كِيْ لِيْهِ هَاتِھِ مِنِيْ مُوجُودِ ہِينِڈِ فَرِيْ كَا اِيكِ سِرِ اپِنِيْ هَاتِھِ مِنِيْ پِكِيْڑِيْ دَوِ سِرَا  
اُسِيْ كِيْ كِمْرِپِهِ مَارَا۔

”يَارِ كِيَا مَسْلَهِ ہِيْ؟ كِيُوْسِ سَبِ مَجَھِ غَرِيبِ كِيْ پِيْچِھِيْ پِرِتِهِيْ ہَوِيْ؟“، اَرِحَمِ نِيْ اُسِيْ پِلَطِ كِرِ دِيْكِيْھَتِيْ  
بِيْ زَارِيْ سِيْ اپِنِيْ كِمْرِپِهِ هَاتِھِ پِھِيرَا۔

”مَسْلَهِ مِنِيْ تِمْهِيْسِ بَعْدِ مِنِيْ سَمْجَھَاوِيْنِ گَاهِيْلِيْ اسِيْ مَصِيْبَتِ سِيْ مِيرِيْ جَانِ چَھَرِ وَأَوْرَنِهِ مِنِيْ تِمْهَارِ اَحْلِيَهِ  
بِگَارِدِوْنِ گَا“، زَارُونَ نِيْ آوازِ نِچِيْ رِكَتِيْ اُسِيْ دِھِمَكِيْ دِيْ۔

”بِسِ پِانِچِ منِٹِ بِرِداشتِ كِرَلَوِ“، اسِيْ كِيْ سَامِنِيْ هَاتِھِ جَوَرِتِهِيْ وَهَوَيْ اِپِسِ رِابِعِهِ كِيْ جَانِبِ مَتَوَجَّهِ ہَوَاجُو  
تِبِهِيْ سِيْ اُسِيْ سِيْ لِرِيْ جَارِهِيْ تِخِيْ۔

”اس منہوس کی تو میں ایسی طبیعت صاف کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گا اور آئندہ کبھی بھی میں اس کے ساتھ کہیں نہیں جاؤں گا“، اُسے پھر سے اپنی جانب پشت کرتا دیکھ کر زارون کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ ابھی اُس کا قتل کر دیتا۔

”پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے“، منه میں بڑھاتے اُس نے اپنے غصے کو کم کرنے کی کوشش کی اور نظروں کا رخ پھر سے نور کی جانب کیا جوا بھی بھی بے سُدھ تھی۔

”توبہ ہے انسان سوتے ہوئے تھوڑا تو ہوش رکھتا ہے کہ آیا جس کے کندھے پہ سر رکھا کے سویا تھا، وہ وہی انسان ہے بھی یا نہیں“، نظریں اُس کی پلکوں پہ جمائے زارون کو اب نور کی اس قدر بے خبری پر غصہ آیا جو اپنے چہرے پر کسی کی نظریں محسوس کرتے تھوڑا سماں کا۔

”ہائے اللہاب تو میں گیا“، سانس روکے زارون نے اُس کو ہلتا دیکھ کر سوچا جو اُس کے کندھے سے سر ہٹاتے سید کی بیک کے ساتھ لگا چکی تھی۔

”شکر ہے بچ گیا“، نور کی آنکھیں بند دیکھ کر زارون نے اپنا رکا ہوا سانس بحال کیا اور جلدی سے وہاں سے اٹھا۔

”رابعہ پیزاب تم اپنی جگہ پہ چلی جاؤ“، ان دونوں کے سر پر کھڑے ہوتے زارون نے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر رابعہ سے کہا جو اُس کی بات سنتے ہی خفگی سے ارحم کو گھورتے ہوئے اٹھ کر اپنی سیٹ پہ چلی گئی۔

”مجھ سے بات مت کرنا“، ارحم نے دوسری سیٹ کی جانب گھسکتے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو زارون نے انگلی اٹھاتے اُسے تنبیہ کی۔

”اچھانا یار سوری وہ تو میں بس ایسے ہی تمہاری کھنچائی کر رہا تھا“، ارحم نے اُس کا موڈ خراب دیکھ کر دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑے۔

”فی الحال تم میرے منہ مت لگو کیونکہ جو تم نے آج میرے ساتھ کیا ہے نامیں زندگی بھرنہیں بھولوں گا“، زارون نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا جواب اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھے، چہرے پہ معصومیت سجائے خاموشی سے بیٹھ چکا تھا۔

”بس اب ایسے ہی خاموشی سے بیٹھے رہو ورنہ میں وہاں پہنچتے ہی واپسی کی بس پکڑلوں گا“، زارون نے اُس کی مصنوعی شرافت پر دھمکی کا لیبل لگایا تو ارحم نے پوری آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

”زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں یہ اپنی دھمکی اپنے پاس رکھو کیونکہ مجھ پہ ان کا کوئی اثر نہیں ہونے والا اور ہاں سیدھے سیدھے ناراضی ختم کرو ورنہ میں اپنی بہن کو سب بتا دوں

گا، ڈھٹائی سے مسکراتے ارحم نے اُسے چھیڑنے کے لیے شرات سے کہا تو زارون نے اُسے گردن سے پکڑتے دوچار تھپڑ رسید کیے۔

”بس کرو یار کیوں میری عزت خراب کر رہے ہو،“ دو تین تھپڑ لگانے کے بعد ارحم نے اپنے بال سیٹ کیے جیسے زارون نے ایک بار پھر سے بگاڑتے اپنا حساب چلتا کیا۔

---

اگلے ایک گھنٹے میں وہ لوگ مری پہنچ تورابعہ نے نور کو جگایا جو تب سے بس سوئی جاگی کی سی کیفیت میں تھی۔ ”تو بہ ہے یار تم نے تو سارا سفر سوتے ہوئے ہی گزار دیا،“ بس سے نیچے اُترتے رابعہ نے اُسے پھر سے جمائیاں لیتے دیکھ کر شکوہ کیا۔

”میں نہیں سوئی تھی بلکہ میدیسین نے مجھے زبردستی سُلا دیا تھا،“ اپنے ہینڈ بیگ سے چاکلیٹ نکالتے نور نے ارحم کی آواز پر پلٹ کر دیکھا۔

”ہیلو سلپینگ بیوٹی کیسی ہو؟“ اُس کے ہاتھ سے چاکلیٹ پکڑتے ارحم نے سوال کیا۔

”میں ٹھیک ہوں اور میری چاکلیٹ والپس دیں،“ نور نے اپنی چاکلیٹ جھپٹنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

---

”نه اب تو یہ تمہیں واپس نہیں ملے گی“، نور کی بات سنتے ہی ارحم نے جلدی سے چاکلیٹ کھوئی اور کھانے لگا۔

”ارحم بھائی بھاڑ میں جائیں آپ اور اللہ کرے آپ کے پچاس بچے ہوں اور آپ ساری عمر بس انہیں چاکلیٹ خرید کر ہی دیں اور آپ کو ایک بھی چاکلیٹ کھانا نصیب نہ ہو“، نور نے اپنی آخری چاکلیٹ ارحم کے پیٹ میں جاتی دیکھ کر صدمے سے بدد عادی جسے سنتے ہی جہاں ارحم نے زور سے قہقهہ لگایا وہیں رابعہ نے شرم سے سرخ ہوتے نور کو گھورا۔

”ہائے اللہ میں کچھ غلط بول گئی ہوں کیا؟“ ارحم کو ہنستا دیکھ کر نور نے رابعہ کے قریب ہوتے سر گوشی کی جس نے جواب دینے کی بجائے بس اُسے گھورنے پر اکتفا کیا اور اپنے ساتھ لیے دوسری جانب بڑھ گئی۔

”اُفف اللہ پچاس بچے توبہ توبہ، اوئے زارون بات سن“، اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھتے ارحم نے زارون کو آواز دی جو پاس ہی کھڑا ان کی ساری باتیں سُن چکا تھا۔

”یار میرے پچاس بچے ہوئے تو مجھے ان کے لیے الگ سے ایک سکول کھولنا پڑے گا جس میں ٹھپر میں تمہیں رکھوں گا اور ہاں اتنے بچے کار میں تو آمیں گے نہیں تو میں سوچ رہا ہوں ایک ٹرک لے

لوں، کیا خیال ہے تمہارا؟“ نور کی بات کا مذاق اڑاتے ارحم نے زارون سے مشورہ کیا جو اُس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا چکا تھا۔

”میری طرف سے ٹرین لے لو“، سنجیدگی سے کہتے زارون نے اپنا غصہ برقرار رکھا۔

”ہاہاہا آسیڈ یا بُرانہیں اور اس بات سے مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے تمہارا غصہ کچھ ٹھنڈا ہو گیا ہے تو کیا میں پھر سے اپنی بہن سے کہوں کہ تمہارے کندھے پر سر رکھے“، ارحم نے بُرا مانے بغیر آنکھوں میں شرات لیے سوال کیا تو زارون نے نیچے زمین پر پڑا ایک چھوٹا پتھر اٹھایا۔

”یار میں مذاق کر رہا تھا“، اُس کا ارادہ بھنا پتے ہوئے ارحم نے دوسری جانب دوڑ لگائی جہاں اب نور اور رابعہ اپنی تصویریں بنانے میں مصروف تھیں۔

”پلیز گر لز مجھے اس جنگلی انسان سے بچالو“، ان دونوں کے پیچھے چھپتے ارحم نے دوہائی دی۔

”تم لوگ پیچھے ہٹ جاؤ رونہ میں ارحم سیمت تم دونوں کو بھی پیچھے کھائی میں دھکادے دوں گا“، اُسے مارنے کی کوشش کرتے زارون نے دھمکی دیتے انہیں اشارے سے پیچھے ہٹنے کا کہا۔

”آپ ہوتے کون ہیں ہمیں دھکادیں والے اور خبردار اگر آپ نے ارحم بھائی کو ہاتھ بھی لگایا“، نور نے اُس کے سامنے آتے بے خوف ہو کر کہا۔

”کیا کر لوگی تم خود اپنا آپ سنبھالا نہیں جاتا اور آئی بڑی ارحم بھائی کو ہاتھ مت لگائیے گا“، زارون جیسے پہلے ہی ان سب پہ غصہ تھا اُس نے نور کی بات پر مزید بھڑکتے اُس کی نقل اُتاری۔

”بہت طاقتوں ہے میری بہن دیکھا نہیں تھا بس میں؟“ رابعہ کے پیچھے سے سر نکالتے ارحم نے معنی خیز الفاظ میں اُسے اپنی بات سمجھائی جسے سنتے ہی زارون کو مزید آگ لگائی۔

”میں تمہارا منہ تو ڈدوں گا“، اُس کی بات کا مطلب سمجھتے ہی وہ مارنے کے لیے ارحم کی جانب لپکا تو نور پھر سے اُس کے سامنے آگئی۔

”میں نے کہانا میرے بھائی کو ہاتھ مت لگائیے گا ورنہ اچھا نہیں ہو گا“، انگلی اٹھاتے اُس نے زارون کو وارن کیا۔

”کیا اچھا نہیں ہو گا اور میں نے کہانا کہ تم ہمارے درمیان مت آؤ“، اُس کی دھمکی پر زارون نے اُسے آنکھیں دکھائیں جس کی پرواکیے بناء نور اُس کے سامنے ڈٹ کر کھڑی رہی۔

”نور چلو تم، ہم سامنے شاپ میں چلتے ہیں“، رابعہ نے زارون کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ کر بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں کہیں نہیں جاؤں گی“، اُس کا ہاتھ جھکلتے اُس نے دو قدم زارون کی جانب بڑھائے تو زارون جلدی سے بوکھلاتے ہوئے پیچھے ہٹا۔

”کیا بد تمیزی ہے“، اُس کے دو قدم اور بڑھانے پر وہ مزید پیچھے ہوتے جھنجھلایا۔

”بد تمیزی نہیں ہے بس آپ کی باتوں کا جواب ہے“، مزید آگے بڑھتے نور نے بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”کیا فضول حرکت ہے یہ؟“ زارون نے چاروں طرف موجود لوگوں کی وجہ سے اپنی آواز دھیمی رکھتے اُسے آنکھیں گھورا۔

”وہی جو آپ نے ابھی میرے اور میرے بھائی ساتھ کی ہے“، اُسے کچھ دور کھڑے پانی کے بالکل قریب لے جاتے نور نے رکتے ہوئے سوری بولنے کا کہا۔

”تم اور تمہارا بھائی دونوں ہی عقل سے پیدا ہوا اور زارون علی سوری بول کر کسی کے سامنے نہیں جھکتا“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے دیکھے بغیر ہی ایک اور قدم پیچھے کی جانب بڑھایا تو نور کے ساتھ ارحام کا بھی قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

”میں تمہارا گلاد بادوں گا“، جھیل کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ کھاتے اُس نے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تو نور نے اپنی ہنسی کنٹرول کرتے پیچھے دیکھا جہاں ارحام کے علاوہ کچھ اور اسٹوڈنٹ بھی زارون کی حالت پر ہنس رہے تھے۔

”وہ کیا ڈائیلاگ تھا؟ ہاں زارون علی کسی کے سامنے نہیں جھکتا، تو زارون علی آپ جھکتے نہیں بلکہ سیدھے گر جاتے ہیں وہ بھی پانی میں“، اُسے ایک لڑکے کا ہاتھ تھا مے باہر نکلتا دیکھ کر نور نے اپنی بات مکمل کی اور اس سے پہلے کی وہ اُس تک پہنچتا وہ موقع ملتے ہی وہاں سے بھاگ گئی۔

”میں اس لڑکی کا قتل کر دوں گا“، سب کو اپنے اوپر ہستادیکھ کر زارون نے دانت پسیے اور غصے سے سامنے موجود ہو ٹل کی جانب بڑھا تو رحم بھی اُس کا پارہ ہائی دیکھتے ہوئے اپنی ہنسی کنڑوں کرتے اُس کے پیچھے لپکا۔

”یہ لو کپڑے بدال لو“، اُس کے پیچھے ہی واش روم کی جانب آتے ارحم نے اپنے بیگ سے ٹی شرٹ اور جینز نکالتے اُس کی جانب بڑھائی جو اُس نے شام کو تبدیل کرنے کے لیے رکھی تھی۔

”مجھے نہیں چاہیے اور دفع ہو جاؤ میری نظروں سے دور“، خفگی سے کہتے زارون نے اُسے اپنے آگے سے ہٹایا۔

”اچھا نا یار غصہ بعد میں کر لینا بھی یہ کپڑے تبدیل کرلو“، ارحم نے پھر سے کپڑے اُس کی جانب بڑھائے۔

”میں نے کہانا یہاں سے دفعہ ہو جاؤ“، اب کی بار زارون نے دھاڑتے ہوئے اُسے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”ہونندہ دفع تو میں ہو جاؤ! گا بس یہ بتادو کہ دفع ہونا کہاں ہے؟“ اُس کے غصے کی پرواکیے بناء، ہی ارحم نے پر سوچ انداز میں سوال کیا۔

”جہنم میں وہ بھی اپنی اُس چڑیل بہن کے ساتھ“، غصے کی شدت سے لفظوں کو چباتے زارون نے اُس کا گریبان پکڑا۔ ”ٹھیک ہے تمہیں بھی ساتھ ہی لے کر جائیں گے ورنہ میری بہن تو بور ہو جائے گی وہاں“، اُس کی کسی بھی بات کو دل پہ لیے بغیر ارحم نے ڈھنڈائی کامظاہرہ کرتے ہوئے کہا تو زارون نے اُس کا گریبان چھوڑتے اُس کے ہاتھ سے کپڑے جھپٹنے والے انداز میں پکڑے اور تبدیل کرنے کی غرض سے واش روم میں گھس گیا۔

”توبہ کتنا دماغ خراب ہے اس لڑکے کا“، اُس کے زور سے دروازہ بند کرنے پر ارحم نے خود کلامی کی اور وہیں کھڑے ہو کر زارون کے باہر نکلنے کا انتظار کرنے لگا جو اگلے دس منٹ میں اپنے گیلے کپڑے ہاتھ میں پکڑے واپس آیا۔

”لاو مجھے دو میں کسی سے کہہ کر خشک کروادیتا ہوں“، ارحم نے ہاتھ آگے بڑھانے کے ساتھ ہی وہاں موجود ایک ملازم کو آواز لگائی۔

”جی صاحب..“ ارحم کی آواز سنتے ہی وہ شخص ان کے قریب آیا۔

”پلیز یہ کپڑے ڈرائی کروادیں اور پریس بھی کروادیجیے گا،“ کپڑوں کے ساتھ ہی ارحم نے اپنے والٹ سے کچھ پیسے نکال کر اُس کی جانب بڑھائے۔

”شکریہ صاحب میں بس کچھ دیر میں کروا کے لاتا ہوں جب تک آپ یہاں بیٹھ جائیں،“ اُس شخص نے مودبانہ انداز میں کہتے انہیں سامنے موجود کر سیوں کی جانب اشارہ کیا۔

”بس تھوڑا جلدی کروادیجیے گا،“ ارحم نے اُس سے درخواست کی جو اثبات میں سر ہلاتے تیز قدم اٹھاتے سامنے موجود ایک کمرے کی جانب بڑھا۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟ آؤ وہاں بیٹھتے ہیں،“ اُس شخص کے جاتے ہی ارحم نے اپنے قدم ایک طرف موجود ٹیبل کی جانب بڑھائے تو زارون نے اُسے وہیں چھوڑ کر اپنا رخ باہر کی جانب کیا۔

”میں کہیں بھی جاؤں تمہیں میرے پیچے آنے کی ضرورت نہیں،“ باہر کی جانب بڑھتے اُس نے ارحم کو ٹوکا جو اُس کے پیچے پیچے چل رہا تھا۔

”یار رکونا میری بات سنو،“

”مجھے کچھ نہیں سُننا اور تم نے جنتی میری بے عزتی کروانی تھی ناتم کرو اچکے اب مزید میرا سر کھانے کی ضرورت نہیں“، ایک سینڈ کے لیے رکتے زارون نے اپنی بات کامل کی اور پھر سے چل پڑا۔

”اچھانا اب غصہ چھوڑو اور میری بات سنو، دیکھنا یہی دوست اب تمہاری بے عزتی کا بدلا لے گا“، آنکھوں میں تجسس لیے اُس نے ایک عزم سے کہا اور زارون کے سامنے آتے اُسے روکا۔ ”ٹھیک ہے تو جا کر اپنی بہن کا گلاد بادو اس سے میرا بدله بھی پورا ہو جائے گا اور ساتھ دنیا کہ بہت سے لوگ اُس کی بد تمیزیوں سے چجائیں گے اور ہاں تم وہ دوست ہو جو دشمنوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں“، اُس کے بازو اپنے گلے سے نکلتے زارون کا غصہ کسی طور بھی کم نہیں ہو رہا تھا۔

”گلاد با تو نہیں سکتا پر دکھاضرور سکتا ہوں“، نور کو ایک گول گپے والے اسٹال پہ کھڑا دیکھ کر ارحم نے زارون کی طرف دیکھا جو اُس کی بات کا مفہوم سمجھے بغیر اُس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھنے لگا۔

”اب دیکھنا ذرا میں کیسے اس سے تمہاری بے عزتی کا بدله لیتا ہوں“، گرم جوشی سے کہتے وہ نور کی جانب بڑھا تو زارون نے جلدی سے اُس کا ہاتھ پکڑتے روکا۔

”مطلوب کیا کرو گے تم؟“

”بس دیکھتے جاؤ“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے ارحام نے اُسے اپنی جانب نظریں مرکوز رکھنے کا کہتے اپنارخ نور کی جانب کیا۔

”ہیلو کیوٹ سستر کیا کر رہی ہوا اور یہ رابعہ کہاں ہے؟“ ارحام نے ہوشیاری سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ آٹی کی کال آئی تھی ناؤں سے ہی بات کر رہی ہے“، نور نے اُسے جواب دینے کے ساتھ ہی ایک گول گپہ منہ میں رکھا۔

”تمم ٹھیک ہے وہ میں تمہیں شکر یہ بولنے آیا تھا کہ تم نے میری زارون سے جان بچالی“، اب اُسے دوسرا گول گپہ اٹھاتے دیکھ کر ارحام نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”کوئی بات نہیں ارحام بھائی ویسے بھی میں ایسے چھوٹے موٹے احسان کرتی رہتی ہوں“، نور نے بہت نرمی کے ساتھ اُسے جتا یا۔

”یہ چھوٹا موتا نہیں بلکہ بہت بڑا احسان تھا جس کے لیے میں ساری عمر تمہارا شکر گزار رہوں گا اور تمہیں گول گپے پسند ہیں کیا؟“، اپنے مقصد پر آتے ہی ارحام نے اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے بات کا آغاز کیا۔

”جی بہت زیادہ پسند ہیں اور میرا تو بس نہیں چلتا کہ میں یہ سارے ہی گول گپے کھاجاؤں“، نور نے اُس کی بات سنتے ہی اسٹال پر پڑے شاپر زکی طرف اشارہ کیا۔

”ہاہا تم ہو ہی چڑیل یہ سارے کیا تم تو پوری دنیا کے گول گپے کھاجاؤ مولو کہیں کی اور ہاں مجھے بھی گول گپے بہت پسند ہیں اور میں بھی یہ سارے گول گپے کھاسکتا ہوں“، اُس کا مذاق اڑاتے ارحام نے اُس کی بات کو معمولی ظاہر کرنے کے لیے بڑی آسانی سے کہا۔

”ارحم بھائی میں نے آپ کو کتنی بار منع کیا ہے کہ مجھے چڑیل مت کہا کریں اور ہاں آپ مجھ سے زیادہ گول گپے کبھی بھی نہیں کھاسکتے“، نور نے جواب دینے کے ساتھ ہی ایک اور گول گپا اٹھا کر اپنے منہ میں رکھا۔

”ہم چلو ذرا اس بات کا بھی فیصلہ کر لیتے ہیں کون کتنے پانی میں ہے“، اپنی شرط کے بازو اور پر کرتے اُس نے نور کو چیخ کیا۔

”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے جلدی سے اُس کا چیخ قبول کیا۔

”تو ٹھیک ہے ہم شرط لگا کر گول گپے کھائیں گئے اگر میں ہارا تو میں تمہاری کوئی بات مانو گا اور اگر تم ہاری تو تم میری بات مانو گی؟“، ارحم نے اُسے شیشے میں اترنا دیکھ کر جلدی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

”ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے“، کچھ سوچتے ہی نور نے حامی بھری توار حم نے اُس آدمی کو گول گپے بنانے کا کہتے زارون کو آواز لگائی جو کچھ ہی دور کھڑا ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

”آپ اس جلاڈ کو کیوں بُلارہے ہیں؟“ ارحام کے پلٹتے ہی نور نے آہستہ آواز میں اُس سے پوچھا۔ ”ہار جیت کا فیصلہ کرنے کے لیے بھی کوئی ہونا چاہیے نا اس لیے بُلایا ہے زارون کو“، اُس کی بات سننے ہی ارحام نے وضاحت کی۔

”تو کسی اور کو بُلایں اس جلاڈ کو بُلانا ضروری تھا۔ دیکھیں کیسے مجھے کھا جانے والی نظر وہ سے گھور رہا ہے“، زارون کے قریب آتے ہی نور مزید کچھ کہتے کہتے رکی۔ ”مس نور میں حرام چیزیں نہیں کھاتا اور تم جیسی بد تمیز لڑکی بلکہ زہریلی چھپکلی تو میں کبھی بھی نہ کھاؤں“، زارون نے اُس کی آدھی بات سننے ہی غصے سے کھا تو نور نے حیرت سے منہ کھولا۔

”یہ چھپکلی کس کو بولا آپ نے؟“ اُس کے سامنے کھڑے ہوتے نور نے آنکھیں سکُریٹے ہوئے سوال کیا۔

”تمہیں اور کسے“، زارون نے لاپرواائی سے کندھے اچکائے۔

”آپ خود ہوں گے چھپکلے اور دوبارہ مجھے یہ چھپکلی کہانا تو میں آپ کا سر پھوڑ دوں گی“

”ہیں یہ اب چھپکلا کس بلا کا نام ہے؟“، زارون کے بجائے ارحم نے ان دونوں کو غصے میں دیکھ کر مداخلت کی۔

”وہ چھپکلی سے تھوڑا بڑا ہوتا ہے اور چھپکلی کے ابو جیسا لگتا ہے“، نور نے کچھ سوچتے ہوئے پہلے ارحم کو اُس کی بات کا جواب دیا اور پھر زارون کی طرف دیکھا جو اُس کی لا جواب وضاحت پر بس اُس کا چہرہ تکتارہ گیا۔

”ہاہاہا ویسے نور تمہاری معلومات بہت اچھی اور اعلیٰ ہے“، ارحم نے تعریف کرنے کے ساتھ ہی زارون کو ہاتھ پکڑ کر روکا جو وہاں سے جانے لگا تھا۔

”رُک جاؤ تم کہاں جا رہے ہو، ابھی فیصلہ بھی کرنا ہے نا“، ارحم نے اُسے آنکھیں دکھاتے رکنے کا کہا۔

”مجھے نہیں کرنا کوئی فیصلہ“، اُس کا ہاتھ جھٹکتے زارون نے نور کی طرف دیکھا جو سامنے ٹیبل پر جا بیٹھی تھی۔

”یار سمجھا کرواب ہی تو بدله لینے کا وقت ہے اور کیوں بنانا یا کھیل بر باد کر رہے ہو“، نور کی طرف مسکرا کر دیکھتے ارحم نے اُس کے کان میں گھستے سر گوشی کی۔

”مطلوب؟“ اس کی بات سنتے ہی زارون نے ابر واچکا تے اُس کے ارادوں کے بارے میں جانے کی کوشش کی۔

”بس تم یہ سمجھو کہ تمہیں پوری آزادی ہے جتنی مر چیں دل کرتا ہے گول گپوں میں ڈال دو پر میرے نہیں میری بہن کے“، ارحم نے ایک آنکھ دباتے اُسے اوپھی آواز میں گول گپے لانے کا کہتے خود اپنا رخ اُس ٹیبل کی جانب کیا جہاں نور پیٹھی تھی۔

”بھائی یہ اس پلیٹ میں مر چیں اور ڈالیں بلکہ مر چیں ہی ڈال دیں آکو چنے کی جگہ بھی“، ارحم کے جاتے ہی زارون نے اسٹال والے کو ہدایت دی۔

”صاحب جی سچ میں ڈال دوں؟“ زارون کی بات سنتے اُس آدمی نے تصدیق چاہی۔

”جی ڈال دیں تیز کر دیں مر چیں“، زارون نے اُسے تاکید کرتے جلدی کرنے کا کہا تو اُس نے تیز تیز ہاتھ چلاتے دو پلٹیں بنائے زارون کے حوالے کیں۔

”صاحب جی اس والی میں مر چیں زیادہ ہیں“، اُس اسٹال والے نے اشارے سے اُسے بتایا تو زارون اثبات میں سر ہلاتے پانی اور پلٹیں ٹرے میں رکھے واپس ٹیبل کے قریب آیا جہاں نور اور ارحم برجمان تھے۔

”لو بھئ آگئے گول گپے چلو شروع کرواب“، دونوں پلٹیں ٹیبل پر رکھتے زارون نے ارحم کو اشارے سے کچھ بتایا۔

”ہاں بس شروع کرتے ہیں زارون تم ظاہم نوٹ کرو ہم یہ بیس گول گپے پانچ منٹ میں کھائیں گے جو ہارا وہ دوسرے کا چینچ پورا کرے گا“، ارحم نے کہنے کے ساتھ ہی ایک پلیٹ نور کی طرف بڑھائی تو اس نے ایک نظر زارون کے چہرے کی طرف دیکھتے ارحم کے سامنے موجود پلیٹ کو اپنے سامنے کیا۔

”کیا ہوا؟ تم نے میری پلیٹ کیوں اٹھائی ہے؟“ اس کی حرکت پر ارحم نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”کچھ نہیں میں بس گن رہی تھی کہ آپ کی پلیٹ میں بھی بیس ہی گول گپے ہیں یا نہیں“، اس پلیٹ کے بجائے نور نے اپنے والی پلیٹ ارحم کے سامنے کی جو اس کی ہوشیاری دیکھے بغیر ہی مسکرانے لگا۔

”اچھا ہے اچھے سے گن لو، بس گن لیے شروع کریں اب“، زارون کے چہرے کی چمک پھیکی پڑتے دیکھ کر نور نے ارحم سے تاکید چاہی۔

”ہاں ہاں کرو شروع“، زارون کا اشارہ سمجھے بغیر ہی ارحم نے فخر سے کہا اور اسے ٹائم نوٹ کرنے کا کہتے اس کے اسٹارٹ کہنے پر گول گپے کو پانی سے بھرتے ارحم نے بڑی خوشی کے ساتھ اسے اپنے منہ میں رکھا جس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں پانی آگیا۔

”زارون یہ کیا کیا؟؟؟“ نور کو کھانے میں مگن دیکھ کر ارحم نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا جو اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے چپ رہنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

”ارحم بھائی کھائیں نا“، نور نے جلدی جلدی کھاتے اسے ہاتھ روکے زارون کی طرف دیکھتا پا کر کہا۔

”ہاں ہاں کھارہاہوں دوسرے گول گپے میں پانی بھرتے اس نے زارون کو بے بسی سے دیکھتے اسے اپنے منہ میں رکھا۔“ ایک سو ایک بار لعنت ہے ارحم تیرے پلان پر اور زارون کی کرتوت پر، با مشکل منه ہلاتے ارحم نے نور کی طرف دیکھا جو اسے کھانے کا اشارہ کرتے تقریباً آدھی پلیٹ چٹ کر چکی تھی۔

”میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں“، تیسرا گول گپا اٹھاتے ارحم کی آنکھوں سے پانی نکلنے لگا تو زارون کو اپنی خیریت خطرے میں محسوس ہوئی۔

”ٹائم ختم ہو گیا ہے“، ارحم کی حالت دیکھتے زارون نے ایک منٹ پہلے ہی نور کو کھانے سے روکا۔

”یا یا ہو میں جیت گئی“، ارجمند کی پلیٹ کی جانب دیکھتے ہی نور نے زور سے آواز لگاتے ٹشو سے اپنا منہ صاف کیا۔ ”ارجمند بھائی کیا ہوا آپ کو آپ روکیوں رہے ہیں؟“ اپنی خوشی مناتے ایک دم ارجمند پر نظر پڑتے ہی وہ خاموش ہوئی۔

”کچھ نہیں میں آتا ہوں“، با مشکل اُسے جواب دینے ارجمند نے اٹھ کر اسٹال کی جانب دوڑ لگائی اور اُسے دیکھتے زارون بھی پریشانی سے اُس کے پیچھے ہی چل پڑا۔

”انہیں کیا ہو گیا؟؟“ ان دونوں کواس طرح جاتے دیکھ نور نے مشکوک انداز میں خود کلامی کی اور رابعہ کی آواز پر اُس کی جانب پلٹی۔

## ماضی

سلطان صاحب کی گاڑی کا ہارن سننے کے بعد وہ کچھ دیر تک اُن کا انتظار کرتی رہی کہ وہ بات کرنے کے لیے اُس کے کمرے میں آئیں گے پر آدھا گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی جب وہ اُس کے پاس نہ آئے تو وہ نے خود ہی ہمت کرتے نیچے کارخ کیا جہاں سارہ بیگم کچن میں موجود مہمانوں کے لیے مختلف لوازمات تیار کروانے میں مصروف تھیں۔

”شکر ہے امی اپنے کام میں مصروف ہیں“، ان کی کچن سے آتی آواز پر حبہ نے سکون کا سانس لیا اور کمرے کی جانب بڑھی۔

”آجائیں“، سلطان صاحب جو ابھی تک صوفے پر بیٹھے سارہ بیگم کی باتوں اور ضد کو سوچ رہے تھے دروازے پر دستک کی آواز سننے ہی اُس جانب متوجہ ہوئے جہاں جواب پاتے ہی حبہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی۔

”حبہ بیٹا آؤ بیہاں میرے پاس بیٹھو“، صوفے کی جانب اشارہ کرتے سلطان صاحب نے اپنے لبھ کونار مل رکھنے کی کوشش کی۔

”میں آپ کا کب سے کمرے میں انتظار کر رہی تھی“، حبہ نے بیٹھتے ہی بات کا آغاز کیا۔

”میں بس کپڑے تبدیل کر کے تمہارے ہی کمرے میں آنے لگا تھا“، اُس کے چہرے پر درج سوال سے نظر چراتے سلطان صاحب نے وضاحت دی۔

”آپ کی امی سے بات ہوئی؟“، حبہ نے تمہید باندھے بغیر ہی سیدھا اپنے مطلب پہ آتے سوال کیا۔

”ہاں ہو گئی ہے“، سلطان صاحب جس سوال سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے حبہ کے وہی سوال پوچھنے پر انہوں نے لمبی سانس لیتے خود کو پر سکون کیا۔

”تو کیا کہا امی نے؟“، سوالیہ نظروں سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

”کہنا کیا ہے تم جانتی نہیں ہو کیا اپنی ماں کی ضد کو جو بات کہہ دیتی ہے پھر وہ کر کے ہی دم لیتی ہے“

”مطلوب“، حبہ نے سمجھی سے اُن کی جانب دیکھا۔

”مطلوب کہ وہ مہماںوں کو گھر بلاچکی ہیں میں نے سمجھانے کی بہت کوشش کی پر اُن کا فیصلہ اٹل ہے اُنہیں لگتا ہے کہ اُن کا انتخاب تمہارے لیے بہت بہتر ثابت ہو گا“، سلطان صاحب نے مختصر الفاظ میں حبہ کو سارہ بیگم کے ارادوں سے آگاہ کیا۔

”مطلوب امی اپنی ضد نہیں چھوڑیں گئی؟“ بے لبی اور دکھ کے ملے جلے تاثرات چہرے پہ سجائے حبہ نے ایک بار پھر سے امید لیے سلطان صاحب سے پوچھا۔

”نہیں، سارہ کو اپنا مقام اور حیثیت بہت عزیز ہے وہ اُس کے لیے تمہیں تو چھوڑنے کے لیے تیار ہے پر اپنی ضد کو نہیں“، سرجھ کاتے سلطان صاحب نے حبہ کو بتایا جس کی آنکھوں سے انسوؤروں وال ہو چکے تھے۔

”حبہ میری جان، پلیز رومت دیکھو تم بھی تھوڑا اٹھنڈے دماغ سے کام لو ہمارا معاشرہ اپنی برداری میں بے شک کسی لنگڑے، ناکارہ اور ظالم انسان کو تو اپنی بیٹی سونپ سکتا ہے پر انکی ضد میں کسی غیر برداری سے رشتہ جوڑنا نہیں گناہ لگتا ہے حالانکہ دیکھا جائے تو یہ ذاتوں کا نظام تو انسان کا خود کا بنایا

ہوا ہے اللہ کی نظر میں تو سب مسلمان مساوی ہیں پر یہ بات صرف سمجھ بوجھ رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ رشتے نجحانے کے لیے دماغ کہ ساتھ ساتھ دل کی آمادگی بھی ضروری ہے اور تمہاری ماں کا شمار اس وقت انہی لوگوں میں ہو رہا ہے جو اپنی ضد اور انا کو برقرار رکھنے کے لیے تمہاری خوشیوں کا گلا گھوٹنے میں دیر نہیں لگائے گی اس لیے اب تم چاہو تو اپنا فیصلہ کر سکتی ہو، ”اس سے نظریں ملائے بغیر سلطان صاحب نے اپنی بات مکمل کی۔

”میں کیا فیصلہ کروں گی؟ میرا فیصلہ تو امی کر چکی ہیں اور ابو میں ابھی اتنی بھی نا سمجھ نہیں ہوئی کہ اپنی ایک خواہش کے لیے ماں باپ کی عزت داؤ پہ لگادوں، ”ان کی بات کا مطلب سمجھتے ہی حبہ نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے اور سلطان صاحب کی روکنے کے باوجود بھی مزید کوئی بات کہے بغیر اپنے کمرے میں آگئی۔

-----  
ماضی

”امی آپ نے حبہ کی امی سے بات کی تھی؟“، زارون جو معاذ کے آنے کے بعد اس کے ساتھ اُس کی شانپنگ کروانے مار کیٹ چلا گیا تھا اُس نے شام کو واپس آتے ہی سب سے پہلے عابدہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا تاکہ سارہ بیگم سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں جان سکے۔

”ہاں ہو گئی تھی“، ٹوی کی آواز آہستہ کرتے انہوں نے زارون کی بات کا جواب دیا۔

”کیا بات ہوئی اور کچھ دماغ ٹھنڈا ہواں کا یا نہیں؟“، ان کے قریب ہی صوفے پر بیٹھتے زارون نے سوال کیا۔

”نہیں، انہوں نے پھر سے انکار کر دیا ہے۔ اس جواز کے ساتھ کہ ہماری ذات کے ساتھ ساتھ مالی حیثیت میں بھی فرق ہے اور وہ حبہ کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتی ہیں تب ہی انہوں نے اُس کارشنہ کہیں طے کر دیا ہے“، عابدہ بیگم نے کوئی بھی بات چھپانا مناسب نہیں سمجھا اس لیے زارون کو سب صحیح بتا دیا۔

”رشته طے کر دیا؟ پر کب؟ حبہ نے تو مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا؟“، عابدہ بیگم کی بات سننے ہی زارون نے حیرت سے کھڑے ہوتے پوچھا۔

”کیا مطلب پھر سارہ بیگم جھوٹ بول رہی تھیں؟“

”پتا نہیں امی پر حبہ نے صبح بس مجھے اتنا بتایا کہ اُس کی امی کسی رشتہ کی بات کر رہی تھیں پر یہ نہیں بتایا کہ اُس کی امی اُس کا رشتہ کہیں طے کر چکی ہیں“، عابدہ بیگم کی بات کا جواب دیتے ساتھ ہی زارون نے اپنا موبائل نکال کے حبہ کا نمبر ڈائل کیا۔

”میں بات کرتا ہوں حبہ سے“، زارون نے دوسری جانب بیل جاتے کال ریسیو ہونے کا انتظار کرتے عابدہ بیگم کو تسلی دی اور ان کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

”حبہ پلیز فون اٹھاؤ“، دوسری طرف مسلسل جاتی بیل پر زارون نے بے چین ہوتے خود کلامی کی اور دوبارہ سے نمبر ڈائل کیا جو پھر سے بیل جانے کے بعد بند ہو چکا تھا۔

”حبہ کہاں ہوتا ہے؟ میری کال ریسیو کرو پلیز“، میسح ٹائپ کرتے زارون نے سینڈ کیا اور موبائل ہاتھ میں ہی کپڑے دوسری طرف سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔

”پتا نہیں کہاں ہے انسان کوئی ایسی ویسی بات ہو گھر میں تو بتا ہی دیتا ہے“، دس پندرہ منٹ انتظار کرنے کے بعد زارون نے پھر سے اُس کا نمبر ڈائل کیا جو پہلے کی ہی طرح بیل جانے کے بعد بند ہو گیا۔

”پتا نہیں کیا کرتی پھرتی ہے یہ لڑکی میں نے اتنی بار کہا ہے جو بھی بات ہے مجھے بتایا کرو پر نہیں ہمیشہ ایک ہی بات کہ میں آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے نہیں بتایا“، بار بار نمبر ڈائل کرتے زارون نے سنجیدگی سے اُس کی بات کو دھرا یا۔

”پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے“، مسلسل کو شش کرنے کے بعد بھی جب حبہ نے کال ریسیو نہیں کی تو زارون نے کچھ دیر بعد فون کرنے کا سوچا اور اٹھ کر فریش ہونے چلا گیا۔ دوسری طرف حبہ جو سلطان صاحب کے کمرے سے آتے ہی اپنے موبائل پر زارون کی مسلسل آتی کال کو دیکھ چکی تھی اُس نے پہلے اُسے ریسیو کرتے ساری صورت حال سے آگاہ کرنے کا سوچا پر پھر اُس کے رد عمل کا خیال آتے ہی اُس نے خود کو ایسا کرنے سے باز رکھا اور موبائل آف کر دیا۔

”یا اللہ میری مدد کراس پیار کو تو نے ہی میرے دل میں ڈالا ایک نامحرم کی محبت کو میرے دل میں پروان چڑھانے کا اختیار تو بس تیرے ہی پاس تھا۔ تو اب تو ہی میری مشکل آسان کر مجھے ہمت دے کہ میں اپنے ماں باپ کو مطمئن کر سکوں“، روتے ہوئے اُس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر زار و قطار روتے ہوئے اپنے رب سے اپنے لیے آسانی کی التجاء کرنے لگی۔

ماضی

کچھ دیر رونے کے بعد جب اُس کا دل کچھ ہلکا ہوا تو اُس نے زارون کو کال کرنے کا سوچا اور اس سے پہلے کے وہ اپنی سوچ کو عملی جامہ پہناتی دروازے پر دستک کے ساتھ ہی شرفوں کی آواز اُبھری۔

”چھوٹی بی بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ مہمان آگئے ہیں اس لیے آپ جلدی سے تیار ہو کر نیچے آجائیں“، شرفونے باہر سے ہی آواز لگائی۔

”ٹھیک ہے آتی ہوں“، اپنا چہرہ صاف کرتے حبہ نے جواب دیا اور ہمت کر کے اٹھی تاکہ کپڑے تبدیل کر کے نیچے جاسکے۔

”پتا نہیں کہاں ہے یہ لڑکی کب سے فون کر رہا ہوں پر احساس ہی نہیں ہے کہ ایک میسج کر کے اپنی خیریت کی اطلاع کر دے“، زارون نے واش روم سے آتے ہی پھر سے حبہ کا نمبر ملایا جواب بند تھا ”کیا کروں اب“، موبائل ہاتھ میں کپڑے بے چینی سے کمرے میں ادھر ادھر ٹھلتے زارون کو اب صحیح معنوں میں فکر ہوئی کیونکہ آج سے پہلے حبہ کبھی بھی اتنی دیر اُس سے بے خبر نہیں رہی تھی۔

”لینڈ لائن پے کال کروں؟“ خود سے سوال کرتے اُس نے موبائل سے نمبر نکالا۔ ان ”ہیں، پتا نہیں کون اٹھائے گا“، یہ سوچ آتے ہی اُس نے جھنجھلاتے ہوئے موبائل بیٹڈ پر اچھالا اور اپنا سردونوں ہاتھوں میں تھامے صوفے پر گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا۔ مختلف سوچیں اور

وسو سے اُس کے دماغ کا احاطہ کیے اُسے حبہ کی جانب سے مزید فکر مند کر رہے تھے اسی لیے دوبارہ سے موبائل اٹھا کے اُس نے ایک آخری کوشش کی۔

”حبہ پلیزا کی بار بتادو کہ تم ٹھیک ہو؟“ کال رسیونہ ہونے پر مسج ٹائپ کرتے زارون نے دوسری طرف سینڈ کیا جہاں ابھی بھی پہلے جیسی ہی خاموشی برقرار تھی۔

-----

تیسرا پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ارجمنے خونخوار نظروں سے زارون کو گھورا جو اُس کے پاس کھڑا مسلسل اپنی ہنسی کنڑوں کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”زیادہ دانت نکالنے کی ضرورت نہیں یہ سب تمہاری وجہ سے ہی ہوا ہے“، بوتل منہ سے ہٹاتے ارجمنے سارا الزام اُس پہ ڈالا۔

”میری وجہ سے نہیں بلکہ تمہاری اپنی کم عقلی کی وجہ سے یہ سب ہوا ہے“، زارون نے اُس کی بات سنتے ہی سارا الملہ اُس پہ ڈالا۔

”بس کرو میری کم عقلی نہیں بلکہ تمہاری ناہلی کی وجہ سے مجھے اتنی مرچوں والے گول گپے کھانے پڑے اور اگر نور نے پلیٹ تبدیل کر دی تھی تو تم مجھے بتا دیتے“، آنکھوں سے نکلتے پانی کو صاف کرتے ارحم نے اُس کے ہاتھ میں پکڑی چاکلیٹ جھپٹی۔

”بس کرو یاراب یہ تم تہمت لگا رہے ہو میرے اوپر۔ میں نے تمہیں اتنے اشارے کیے اور تم بھی تو پاس ہی تھے نا؟ شیخی مارنے کی بجائے آنکھیں کھلی رکھتے تو اُس چڑیل کی چالاکی سمجھ آتی“، ایک ہاتھ کمر پر رکھتے زارون نے چاکلیٹ اُس کے ہاتھ سے واپس لیتے ہوئے اُسے کھولا۔

”ہونہ وہ اشارے تھے کیا؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی لڑکی کو پر پوز کر رہے ہو اور میں نے تمہیں مرچیں تیز کروانے کا کہا تھا یہ نہیں کہ اٹھوا کے پورا ڈبہ ہی گول گپوں میں ڈالوادو“، پانی کے مزید دو گھونٹ لیتے ارحم نے اپنی بہتی ہوئی ناک کو صاف کیا۔

”ہونہ مجھے کیا پتا تھا کہ کسی غیر کاشکار کرتے کرتے میری اپنی ہی مچھلی جال میں پھنس جائے گی اور اگر پتا ہوتا تو تھوڑی اور مرچیں ڈالوادیتا“، آخری بات منہ میں بڑا بڑتے زارون نے چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا اُس کے منہ میں ڈالا۔

”جو بکواس کرنی ہے ناذر اونچی آواز میں کرو“، چاکلیٹ کھاتے ارحم نے اُسے گھورا۔

”میں نے تو کچھ نہیں کہا بس یہ کہہ رہا تھا کہ اگر یہ مر چیں تمہاری بہن کو لگتی ناہائے مزہ آجاتا ہے“، زارون نے بات بدلتے حسرت سے کہا۔

”میری جان اگر اسے یہ مر چیں لگی ہوتی تو تم اس وقت یہاں بیٹھ کر مسکرانے کی بجائے جہنم واصل ہو چکے ہوتے وہ بھی ملکٹ کے بغیر ہی“، دانت پیستے اُس نے پاس پڑی بوتل اُٹھا کے زارون کو رسید کی جسے مہارت سے کچ کرتے وہ اُس کی طرف واپس اچھال چکا تھا۔

”اتنی بھی جراءت نہیں ہے اب تمہاری بہن میں کہ مجھے کچھ کہے اور مجھے لگتا ہے کہ اُس نے ہماری باتیں سُن لی تھیں جو اتنی چالاکی سے اُس نے پلیٹ تبدیل کر دی“، زارون نے اندازہ لگاتے اُس سے تصدیق چاہی جو اپنی آنکھوں سے نکلتے پانی کو صاف کر رہا تھا۔

”ہاں بالکل، دیکھونا وہ چار دن میں تمہاری شکل سے تمہارے کرتوت جان گئی اور میں بے وقوف تم جیسے گدھے کے ساتھ چار سال رہ کر بھی تمہاری اصلاحیت پہچان نہ پایا“، افسوس سے نفی میں سر ہلاتے ارجمند کو خود پہ غصے آیا۔

”بس کرو یاراب تم ایک پرانی لڑکی کے لیے اپنے دوست کو باتیں سُنارے ہے ہوا اور ہاں یہ کیا تم ذرا سی مر چوں پرتب سے واویلا مچائے بیٹھے ہو“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے منہ بسورتے اُسے صدمے میں مبتلا کیا۔

”وہ ذرا سی مر چیں تھیں؟“ ہونقوں کی طرح منہ کھولے ارحم نے سوال کیا تو زارون نے چاکلیٹ کا ایک اور ٹکڑا اُس کے منہ میں ڈالتے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”بھاڑ میں جاؤ، تم ہو ہی گھٹیا انسان یہاں مجھے اندر تک آگ لگائی اور تمہیں وہ ذرا سی مر چیں لگ رہی ہیں۔ چلو میرے ساتھ میں وہی گول گپے اب تمہیں کھلاؤں گا“، اُس کا ہاتھ تھامتے ارحم نے اُسے اپنے ساتھ باہر کی جانب کھینچا۔

»یار معاف کرو کیوں بچ کی جان لینے کے پیچھے پڑے ہو“، اپنا ہاتھ چھڑواتے زارون نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو ارحم نے ہاتھ میں پکڑی بوتل اُس کی طرف اچھاہی۔

”رک جاؤ زارون، اب کہاں بھاگ رہے ہو“، اُس کے پیچھے ہی اُسے پکڑنے کے لیے بھاگتے ارحم نے آواز لگائی۔

”اپنے کپڑے لینے جا رہا ہوں تم بس میں بیٹھو میں آتا ہوں“، ویسے ہی بھاگتے ہوئے زارون نے اُس کی بات کا جواب دیا اور ہوٹل کے اندر کی جانب بڑھا کیونکہ انہوں کچھ دیر میں اُس جگہ سے نکلا تھا۔

”ہیلو گر لز کیا ہو رہا ہے؟“ ارحم نے بس میں چڑھتے رابعہ اور نور کو کسی بحث میں مصروف دیکھ کر انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

”ڈانس کر رہے ہیں تم بھی کرو،“ رابعہ نے اُس کے بے تکے سوال پر کڑھتے ہوئے جواب دیا۔

”تو چلو اٹھونا کرتے ہیں۔ ویسے مجھے کپل ڈانس بہت پسند ہے،“ معنی خیزی سے کہتے ہوئے اُس نے رابعہ کا ہاتھ تھاما۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور شرم کرو کچھ،“ خفگی سے سرخ ہوتے اُس نے جلدی سے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔

”ہوننہ خود ہی تو کہا کہ ڈانس کرو اور اب خود ہی ڈانٹ رہی ہو،“ آنکھیں سُکیریے اُس نے نور کو گھورا جوان دنوں کی باتیں سُن کر مسکرار ہی تھی۔

”نور مجھے تمہیں کچھ بتانا تھا،“ زارون کو بس میں سوار ہوتا دیکھ کر ارحم نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”جی بتائیں،“ سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھتے نور نے پوچھا۔

”زارون بتا دوں کیا؟“ اُسے پاس سے گزرتا دیکھ کر ارحم نے اُس کے کان کے قریب ہوتے سر گوشی کی۔

”کیا بتانا ہے؟“ سیٹ پر بیٹھتے زارون نے نارمل انداز میں پوچھا۔

”وہی جو نور نے تمہارے کندھے پر سر رکھا تھا“، ارحم نے آنکھوں میں شرارت لیے اُسے چھیڑا۔ ”میں تمہیں تمہاری بہن سیمت بس سے باہر پھینک دوں گا اگر تم نے اب کوئی فضول بکواس کی تو“، اُس کا گریبان پکڑتے زارون نے دھمکی دی۔

”زیادہ دھمکی دینے کی ضرورت نہیں ہے مجھے اور ہاں اب تو میں نور کو بتا کر ہی دم لوں گا“، ارحم نے کہتے ساتھ ہی اپنا رخ دوسری جانب کیا۔

”ارحم کیا بد تمیزی ہے یار نہ تنگ کرو“، اُس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی زارون نے اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

”کیا ہوا ارحم بھائی اور آپ نے کیا بتانا تھا مجھے؟“ ان دونوں کو اپس میں سر گوشیاں کرتے دیکھ کر نور نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”ہاں وہ میں کہہ رہا تھا کہ....“، ہاتھ ہٹاتے ارحم نے بات کا آغاز کیا تو زارون نے واپس اُس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔

”یار کیوں تم میری جان کے پیچھے پڑے ہو پلیز چپ ہو جاؤ۔ کیا سوچے گی وہ میرے بارے میں اور میرے کیوں ہم سب کے بارے میں“، زارون نے اُسے چپ کرواتے خبردار کیا۔ ”ٹھیک

ہے نہیں بتاتا کچھ، پر چپ رہنے کی قیمت لگے گی،“، نور کو ایک منٹ رکنے کا اشارہ کرتے ارحم نے زارون کے طرف سیدھے ہو کر بیٹھتے شرط رکھی۔

”کیسی قیمت؟“ ابر واچ کاتے زارون نے سوال کیا۔

”بس زیادہ نہیں یہی کوئی پانچ دس ہزار“، پر سکون انداز میں کہتے اُس نے زارون کی طرف دیکھا جواب اُسے گھور رہا تھا۔

”بس پانچ دس ہزار؟“ اُس کی بات کو دھراتے زارون نے تصدیق چاہی۔

”ہاں بس“، ارحم نے بے شرمی سے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں؟“

”اتنے بھی زیادہ نہیں اور ہاں تم میرے دوست ہوا سی لیے منه بند کرنے کی قیمت میں نے بہت مناسب لگائی ہے“، اُس پر احسان جتانے والے انداز میں کہتے ارحم نے دوسری جانب دیکھا جہاں اب نور اور رابعہ موبائل میں کچھ دیکھنے میں مصروف تھیں۔

”یار یہ پھر بھی زیادہ ہیں تھوڑے کم کرو“، زارون نے اُسے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے دیکھ کر منٹ کی۔

”یہ تمہاری زندگی کی قیمت ہے“، ارحم نے سنجیدگی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلوب یہ کہ دیکھو اگر میں نور کو یہ سب بتادوں گا کہ جب اُس نے تمہارے کندھے پر سر رکھا تھا تو تم نے نہ صرف اُس کے چہرے کا تفصیل سے جائزہ لیا بلکہ اُس کا سروال پس سیٹ ساتھ بھی لگایا تو سوچو کہ یہ سب سننے کے بعد وہ تمہارا کیا حاشر کرے گی“، ارحم نے مزید دو چار باتیں اپنے پاس سے لگاتے ہوئے زارون کو حیرت میں مبتلا کیا۔

”تم جیسا خبیث انسان میں نے اپنی پوری زندگی میں کوئی نہیں دیکھا“، اپنا والٹ سے پیسے نکلتے زارون نے اُس کی ہتھیلی پہ رکھے۔

”بہت بہت شکر یہ، بس اب مجھے طریقہ مل گیا ہے تم سے پیسے نکلوانے کا“، پیسے اپنی جیب میں ڈالتے ارحم نے شرات سے کہا جسے سنتے ہی زارون نے جواب دینے کی بجائے بس اُسے غصے سے دیکھنے پر اتفاق کیا۔

”اچھا اچھا میں تو بس مذاق کر رہا تھا“، اُس کے خطرناک تیور دیکھ کر ارحم نے جلدی سے بات بدلتی۔

”جو تم مذاق کر رہے تھے نامیں اپھے سے جانتا ہوں“، اپنے موبائل پر آتی احمد صاحب کی کال ریسیو کرتے زارون نے اُسے آئینہ دکھانا لازمی سمجھا جو اشارے سے شکریہ ادا کرتے رابعہ کی طرف متوجہ ہوا۔

”گر لز مجھے بھی کوئی لفت کروادو۔ کیا دیکھ رہی ہو تم دونوں تب سے موبائل میں گھسی؟“ زارون کو مصروف دیکھ کر ارحم نے سراو پر کرتے موبائل میں جھانکنے کی کوشش کی۔  
”کچھ نہیں دیکھ رہے ہم اور تم نے بڑی لفت کروائی ہے مجھے صح سے جو میں تمہیں منہ لگاؤ“، شکوہ کرتے رابعہ نے موبائل بند کیا۔

”اففف غصے میں تو تم اور بھی حسین لگتی ہو“، ارحم نے اُس کے شکوے کی پرواکیے بناءدل لوٹنے والے انداز میں کہا۔

”فضول ڈائیلاگ مارنے کی ضرورت نہیں ہے اور ہاں تم نور کو کچھ بتانے والے تھے نا؟“ تیوری چڑھاتے اُس نے کچھ دیر پہلے والی بات کے بارے میں پوچھا۔

”کیا بتانے والا تھا؟ میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی“، صاف مکرتے ارحم نے زارون کی طرف دیکھا جو رابعہ کی بات پر اُن کی ہی جانب متوجہ تھا۔

”ارحم بھائی آپ نے خود ہی کہا تھا کہ کچھ بتانا ہے“، اُس کو مکرتا دیکھ کر نور نے اُسے یاد ہانی کروائی۔

”اچھا اچھا یاد آگیا۔ وہ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس جگہ اب ہم جا رہے ہیں نا وہ بہت خوبصورت ہے،“ ان دونوں کو ایک ہی بات پر جمے دیکھ کر ارحم نے مہارت کے ساتھ بات گھمائی تو زارون کی جان میں جان آئی۔

”اچھا تو ہم کب تک پہنچیں گے پھر؟“ نور نے تجسس سے پوچھا۔

”بس کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے،“ اس کی بات کا جواب دیتے ارحم انہیں راستے میں آتی چیزوں کے بارے میں بتانے لگا۔

---

”ارحم بھائی بالکل سچ کہہ رہے تھے یہ جگہ تو سچ میں بہت پیاری ہے،“ نور نے بس سے اُترتے ہی چاروں طرف موجود اونچے درختوں اور سر سبز پہاڑوں کو دیکھتے پوری آنکھیں کھولیں۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں ابھی تم کشمیر مانسہرہ کے علاقے دیکھو وہ اس سے بھی زیادہ خوبصورت ہیں،“ رابعہ نے تصویریں بناتے ہوئے نور کی معلومات میں اضافہ کیا جو حیرت سے چاروں طرف دیکھنے میں مصروف تھی۔

”وہ بھی دیکھ لوں گی اور ہاں رابعہ تمہاری منگنی کا فنکشن کب ہے؟“ نور نے یاد آنے پر اُس سے سوال کیا۔

”پتا نہیں یارا بھی کچھ کنفرم نہیں ہوا،“ اُسے جواب دیتے رابعہ نے ارحم کی طرف دیکھا جو خود ہی نور کی لائی ہوئی بریانی والا ڈبہ کھول کے اُس کے ساتھ انصاف کرنے میں مصروف تھا۔

”ویسے ابھی تو مجھے یہ بھی نہیں پتا کہ میں اس جیسے بندر سے شادی کرنا بھی چاہتی ہوں کہ نہیں،“ رابعہ نے ارحم کی طرف اشارہ کرتے اپنی قسمت پر افسوس کیا۔

”ہونہ اچھی بھلی شکل ہے ارحم بھائی کی اور تم بندر کہہ رہی ہو،“ اُسے بے صبری سے کھاتا دیکھ کر نور نے مسکراتے ہوئے اُسے ٹوکا۔

”ہاں شکل سے تو اچھا ہے پر کرتوت انسانوں والے نہیں اسی لیے میں ہر بار اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہوں،“ نور کی تصویر بناتے رابعہ نے آہ بھری۔

”مطلوب کیا سچ میں تمہیں ارحم بھائی پسند نہیں؟“ اُس کی بات سن کے نور نے ناممجبھی سے سوال کیا۔

”پسند تو بہت ہے تب ہی تو اتنی کوششیں کر کے اپنے گھروالوں کو اس کے لیے منایا ہے۔ ابو تومان ہی نہیں رہے تھے پھر زارون نے مدد کی اور انہیں ارحم کے لیے قائل کیا“، چہل قدمی کرتے رابعہ نے نور کو بتایا جو زارون کے نام پہ تیوری چڑھاچکی تھی۔

”ہونہمہ جلاڈ کی شکل دیکھ کر، ہی انکل بچارے ڈر گئے ہوں گے تب ہی انہوں نے ہاں کر دی“، نور نے مسکراتے ہوئے زارون کی تعریف پر اُس کا مذاق اُڑایا اور اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوئی جہاں رضاکی کال آرہی تھی۔

”شکر ہے اسے بھی میری یاد آئی۔ نور نے کال ریسیو کرتے سلام میں پہل کی۔

”وعلیکم السلام نور آپی آپ ابھی تک زندہ ہیں؟“ نور کی آواز سنتے ہی رضانے حیرت سے سوال کیا۔ ”تو کیا مر کے تم سے بات کر رہی ہوں حد ہے رضا زندہ ہوں تب ہی تمہاری کال ریسیو کرتے تم سے بات کر رہی ہوں نا اور تمہیں صحیح سے اب میری یاد آئی ہے کہ بہن کا حال پوچھ لوں؟“، نور نے اُس کے بے تکے سے سوال پر آنکھیں سُکیریں۔

”بس کریں آپی کیوں مجھ بچارے پر بے بنیاد الزام لگا رہی ہیں۔ میں نے آپ کو اتنے میسجز کیے پر آپ نے کسی کا جواب نہیں دیا“

”اُس وقت میں سور ہی تھی اور بعد میں، میں نے جواب دیا تو تھا، ”اُس کی بات سنتے ہی نور نے فٹ سے کہا۔

”تب میں مصروف تھا اس لیے جواب نہیں دیا،“  
 ”کہاں مصروف تھے تم؟“ اپنی کمرپہ ساتھ رکھتے نور نے پھر سے سوال کیا۔  
 ”وہ میں سوچنے میں مصروف تھا،“ رضانے اپنے مسکراہٹ دباتے تجسس برقرار کھا۔  
 ”کیا سوچنے میں مصروف تھے؟“

”یہی کہ مری والوں کا کیا حال ہو گا آج،“ نچلا ہونٹ دباتے رضانے نور کے چہرے کے تاثرات سوچتے ہوئے اپنی ہنسی کنٹول کی۔

”مطلوب کیا حال ہو گا؟“ نور نے ناممکنی سے سوال کیا۔  
 ”وہ آپی ایک چڑیل نازل ہوئی ہے نام مری شہر میں اس لیے بس سوچ رہا کہ پتا نہیں کیا بنا ہو گا بچاروں کا،“ افسوس کے ساتھ کہتے رضانے نفی میں سر ہلا کیا۔

”مطلوب یہاں کو ناسی چڑیل نازل ہوئی ہے؟“ اُس کی بات سنتے ہی نور نے خوف سے جھر جھری لی۔

”آپ اور کون،“ نور کی بات سنتے ہی رضانے قہقہہ لگاتے جواب دیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم، میں تمہیں چڑیل نظر آتی ہوں“، غصے سے چختے نور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اُسے فون سے نکل کر تھپڑ لگا دے۔

”نہیں آپ آپ چڑیل نہیں آپ ڈائن ہیں میری پیاری بہن ہیں، وہ عینک والے جن میں بل بتوڑی آتی تھی نا؟ آپ بالکل ویسی ہی ہیں“، اپنی بات مکمل کرتے ہیں رضانے کا لکاٹ دی۔

”میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں مجھے بل بتوڑی کہا تم خود کھوتے گدھے ہو بندر ہو“، نور نے اُس کے کا لکاٹ پر دل ہی دل میں اُسے مختلف القابات سے نوازا۔

”نور کیا ہوا؟“، کس کا فون تھا اُسے غصے سے سرخ ہوتا دیکھ کر رابعہ نے اُس کے قریب آتے سوال کیا۔

”رضانے کا فون تھا“

”اچھا، لگتا ہے ادا س ہو گیا تھا“

”ادا س بس وہ اس لیے تھا کیونکہ آج صحیح سے اُس نے میرا خون نہیں جلا یا تو کھانا ہضم نہیں ہوا ہو گا بس وہی ہضم کرنے کے لیے فون کیا تھا“، دانت پیستے نور کا بس نہیں چل رہا تھا کہ رضا کو کچا چبا جائے۔

”ہاہاہا اچھا وہ دیکھو سامنے کیا ڈرامے ہو رہے ہیں“، اس کی بات پر مسکراتے رابعہ نے سامنے سڑک کی طرف اشارہ کیا جہاں ارحم سڑک کے نیچے دھرنادیے بیٹھا تھا۔

---

## ماضی

زارون مسلسل حبہ کوفون کرنے کو شش کر رہا تھا جو پچھلے دون سے لگاتار بند جا رہا تھا۔ وقفے وقفے سے ہزاروں میسجرا اور کالز کرنے کے بعد بھی جب دوسری جانب سے کوئی جواب نہ آیا تو مختلف خیالات اور وسوسوں نے زارون کے دل و دماغ میں جنم لیتے اُسے خوفزدہ کر دیا۔

”حبہ پلیزا ایک بار مجھے بتا دو کہ تم ٹھیک ہو پھر بے شک کبھی بات نہ کرنا“، ایک آخری کوشش کے طور پر زارون نے مسج طاسپ کرتے سینڈ کیا پر کچھ دیر گزرنے کے بعد بھی دوسری طرف جواب نہ پا کر اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تب ہی اُس نے حبہ کے گھر کا نمبر ملایا جو بد قسمتی سے سارہ بیگم نے رسیو کیا۔

”السلام علیکم“، دوسری طرف ہیلو کی آواز پر زارون نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام جی کون؟“، سلام کا جواب دیتے سارہ بیگم نے سوال کیا۔

”جی میں زارون بات کر رہا ہوں پلیز اگر حبہ گھر میں ہے تو اس سے میری بات کروادیں۔ میں دو دن سے ٹرائی کر رہا ہوں اس کا نمبر بند ہے“، اپنا تعارف کرواتے ہی زارون نے فون کرنے کی وجہ اور مقصد دونوں بیان کیے۔

”حبہ کسی سے بات نہیں کرے گی اور تمہارے لیے بھی اچھا ہو گا کہ آج کے بعد یہاں کال نہ کرو“، زارون کی دلیری پہ سارہ بیگم نے سختی سے کہا۔

”آنٹی آپ پلیز میری حبہ سے بات کروادیں میں بس ایک بار اس سے بات کرنا چاہتا ہوں پھر جیسا آپ بولیں گی ویسا ہی ہو گا“، زارون نے سختی کی بجائے اپنے لہجے کو نرم رکھتے ہوئے ایک بار پھر سے اُن سے درخواست کی۔

”میں حبہ کی طرح بے وقوف نہیں ہوں جو تم جیسے مکار لڑکے کی باتوں میں آجائوں اور ہاں میں نے کہہ دیانا کہ حبہ تم سے بات نہیں کرے گی تو بس دوبارہ یہاں فون مت کرنا اور خدا کے لیے میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دیکیوں تم ہاتھ دھو کہ اُس کے پیچے پڑ گئے ہو“، کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر سارہ بیگم نے غصے سے کہا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی اگر آپ میری بات نہیں کروائیں گی تو مجھے اور بھی بہت سے طریقے آتے ہیں“، ان کی بات سنتے ہی زارون نے بھی انہی کی طرح کا لہجہ اپناتے ہوئے دھمکی دی۔

”مجھے دھمکیاں مت دو۔ میں تم جیسے دو ٹکے کے لڑکوں کو اچھے سے جانتی ہوں جو محبت کا جھانسا دے کر امیر لڑکیوں کو اپنے جال میں پھنساتے ہیں پھر انہیں ایک کونے پہ لگا کر ان کی ساری دولت ہڑپ کر جاتے ہیں اور باقی رہی بات اور طریقوں کی تو میں تمہارا ہر حربہ ناکام کرنے کی طاقت رکھتی ہوں“، غصے سے آگ بگولہ ہوتے انہوں نے اپنی بات مکمل کرتے زور سے فون کر یڈل پر رکھا۔

”پتا نہیں کہاں سے آ جاتے ہیں“، خود کلامی کرتے وہ سڑھیوں کی جانب بڑھی تاکہ حبہ کو دیکھ سکیں جسے انہوں نے اپنی نہاد عزت کے خراب ہونے کے ڈر سے مو باٹل لے کر کمرے کی حد تک محدود کر دیا تھا۔

”امی پلیز مجھے میرا مو باٹل دے دیں میں بس ایک بار زارون سے بات کر لوں وہ پریشان ہو رہا ہو گا“، انہیں دیکھتے ہی حبہ نے دودن سے لگائی رٹ ایک بار پھر سے دہرائی۔

”ہاں تاکہ تم مزید ہمارا منہ کالا کر سکو، جیسے اُس دن مہمانوں کے منہ پہ جواب دے کر کیا، ایک بار میں تم پہ بھروسہ کر کہ غلطی کرچکی ہوں پر اب نہیں کروں گی اور ہاں میں نے تمہارا راشٹہ تمہارے ماموں کے بیٹے احتشام سے طے کر دیا ہے اس ہفتے کو تمہارا انکا ح ہے اس لیے اب کوئی بھی اللائیڈھا قدم اٹھانے سے پہلے ہزار بار سوچ لینا کہ یہ تمہاری آخری غلطی ہو گی جس کی سزا تمہیں میرا مر اہوا منہ دیکھ کر بھگتی پڑے گی“، انگلی اٹھاتے انہوں نے سرخ آنکھوں کے ساتھ اسے دھمکی دی جواب آنکھیں میں آنسو لیے اُن کے چہرے کی جانب بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔

”امی پلیز اتنا بڑا ظلم نہ کریں۔ پلیز میری بات سنیں آپ مجھے بس ایک بار زارون سے بات کر لینے دیں، سچ میں پھر دوبارہ میں کبھی اُس کا نام نہیں لوں گی“، اُن کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے حبہ نے فریاد کی۔

”میں نے ایک بار منع کر دیا تاوب دوبارہ میں تمہارے منہ سے اُس لڑکے کا نام نہ سنو“، سلطان صاحب کی گاڑی کا ہارن سنتے (جو پچھلے دو دن سے اپنی ایک ضروری میئنگ کے سلسلہ میں کراچی گئے تھے) وہ حیرت سے اُس کے کمرے سے نکلتے نیچے آئیں۔

”آپ نے تو کل آنا تھا نا؟“، سلام کرتے انہوں نے سلطان صاحب کے ہاتھ سے اُن کا بیگ لینا چاہا۔

”میرا گھر ہے۔ میں جب چاہوں واپس آ سکتا ہوں“، شر فو کو آواز دیتے سلطان صاحب نے اُسے اپنا بیگ تھما یا اور حبہ کے بارے میں پوچھتے اُس کے کمرے کی جانب بڑھے تو ایک ملازم کے سامنے اپنی تذلیل پر پچھ و تاب کھاتے سارہ بیگم بھی اپنے کمرے کی جانب بڑھیں۔

---

## ماضی

دروازے پر دستک دے کہ وہ اندر داخل ہوئے جہاں حبہ کا حال دیکھ کر اُن کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

”ابو....“ سلطان صاحب کی جانب دیکھتے ہی وہ جلدی سے اٹھ کر اُن کے سینے سے آ لگی۔ ”حبہ میری جان یہ کیا ہوا ہے؟“ اُس کی سو جھی ہوئی آنکھیں اور گال پر انگلیوں کے نشان دیکھ کر سلطان صاحب کو اپنے آپ پر غصہ آیا جو بیٹی کو ان حالات میں اکیلا چھوڑ کر کراچی چلے گئے۔ ”یہ سب کس نے کیا ہے؟ سارہ نے؟“ اُس کے گال پر ہاتھ پھیرتے اُنہوں نے تصدیق چاہی تو حبہ نے روتے ہوئے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”پتا نہیں کیوں اس عورت کا دماغ اس حد تک خراب ہو گیا ہے۔ اُس دن مجھے لگا کہ بس یہ بول کہ اپنا غصہ ٹھنڈا کر چکی ہے تب ہی میں کراچی چلا گیا پر مجھے کیا پتا تھا کہ میرے جانے کے بعد یہ اس

---

طرح سے تم سے اپنی بے عزتی کا بد لے لے گی، اُس کے آنسو صاف کرتے سلطان صاحب نے اُسے صوفے پر بٹھاتے شر فو کو آواز لگائی اور پانی لانے کا کہا۔

”ابو، امی نے میرافون بھی لے لیا ہے اور آپ کے جاتے ہی انہوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا تھا،“ ہچکیوں کے درمیان بولتے حبہ نے ساری بات سلطان صاحب کو بتائی جنہیں سارہ بیگم سے ایسے جاہلانہ سلوک کی بالکل بھی توقع نہیں تھی۔

”اچھا بس یہ پانی پیو میں بات کرتا ہوں سارہ سے“، شر فو سے گلاس لیتے سلطان صاحب نے اُس کے ہونٹوں سے لگایا جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

”کھانا کھایا ہے تم نے؟“، ٹیبل پر رکھی کھانے کی تین، چار ڈشز کو ویسا ہی دیکھ کر سلطان صاحب نے سوال کیا۔ ”نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے“، نفی میں سر ہلاتے حبہ نے اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔

”کیوں بھوک نہیں ہے اُنھومنہ ہاتھ دھو اور شر فو تم میرا اور میری بیٹی کا کھانا ہی اوپر ہی لے آؤ“، حبہ سے کہتے سلطان صاحب نے اُسے اشارہ کیا جو جی صاحب کہتے کمرے سے جا چکا تھا۔

”ابو پلیز مجھے میرا مو باٹل لادیں امی سے“، اُٹھنے کی بجائے حبہ نے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے اُن سے نظریں ملائے بغیر کہا تو سلطان صاحب نے اپنا مو باٹل نکال کے اُس کے سامنے کیا۔

”یہ لوکر لو بات اور اب تم جو بھی فیصلہ کرو گی میں تمہارے ساتھ ہوں“، سارہ بیگم کی سکندری دیکھتے سلطان صاحب نے بیٹی کی خوشیوں کی خاطر فیصلہ کرنے میں چند سینڈ ز لگائے اور موبائل اُسے تمہاتے سارہ بیگم سے بات کرنے کی غرض سے کمرے سے نکل گئے۔

”ہیلو زارون؟“، سلطان صاحب کے جاتے ہی حبہ نے زارون کا نمبر ڈائل کیا جو تیسری بیل پر ریسیو کر لیا گیا۔

”حبہ یا تم کہاں تھیں؟ تمہیں بتا ہے پچھلے دو دن سے میں نے تمہیں کتنی کالز کتنے میسجز کیے ہیں“، اُس کی آواز پہچانتے ہی زارون نے کہا جو سارہ بیگم سے بات کرنے کے بعد لاہور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

”زارون پلیز مجھے یہاں سے لے جاؤ“، حبہ نے روتے ہوئے اتجاء کی۔

”میں لاہور ہی آ رہا ہوں پلیز تم پریشان نہ ہو اور رونا تو بند کرو۔ بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے اور تمہارا موبائل کہاں ہے؟“، زارون نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کرتے اُسے اپنے ہونے کا یقین دلا یا تو حبہ نے مہماںوں کے آنے سے لے کر اب تک کی تمام باتیں اُسے تفصیل سے بتائیں جسے سُن کر اُسے سارہ بیگم پر مزید غصہ آیا جو اپنی ضد کو پورا کرنے کی خاطر اس حد تک پہنچ چکی تھیں۔

”اچھا بس تم پریشان نہ ہو میں بس تین، چار گھنٹوں کے اندر اندر لا ہور پہنچ جاؤں گا اور یہ نمبر کس کا ہے؟“، زارون نے اُسے تسلی دیتے سوال کیا۔

”ابو کا ہے وہ ابھی آئے ہیں کراچی سے واپس“، زارون سے بات کرنے کے بعد حبہ کو تھوڑا حوصلہ ہوا تب ہی اُس نے جواب دیتے زارون کو جلدی آنے کی تاکید کی۔

”ہاں میں بس نکل رہا ہوں تم خود کو سنبھالو اور اپنا خیال رکھنا اللہ سب بہتر کرے گا“، اُسے ہمت دیتے زارون نے فون بند کیا اور اپنا والٹ اور گاڑی کی چابی لیے سیڑھیاں اُترتے نیچے آگیا۔

### ماضی

”زارون کہاں جا رہے ہواں وقت“، اُسے باہر کی جانب جاتا دیکھ کر عابدہ بیگم نے پیچھے سے آواز دی۔

”لا ہور جا رہا ہوں“، بغیر پلٹے ہی جواب دیتے وہ آگے بڑھا۔ ”لا ہور، پر کیوں؟ سب خیریت ہے نا؟“، اُس کے پیچھے ہی باہر آتے عابدہ بیگم نے فکر مندی سے پوچھا۔

”حبہ کے گھر جا رہا ہوں اُس کی امی سے بات کرنے“، اُن کی فکر مندی پر رک کر جواب دیتے  
زارون نے احمد صاحب کو بھی اپنی طرف آتے دیکھا جو چوکیدار کو کچھ ہدایت دے رہے تھے۔

”تم خود اُن سے بات کرنے جا رہے ہے؟“ عابدہ بیگم کی بجائے احمد صاحب نے اُس کی بات سننے ہی  
حیرت سے سوال کیا۔

”جی“، سر جھکاتے زارون نے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”اچھا دھر آؤ اور بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے جو تم اتنی ایسی جنسی میں وہاں جا رہے ہو“، اُسے اپنے ساتھ  
لیے لان میں پڑی چیزیں کی جانب بڑھتے احمد صاحب نے بڑے تحمل سے معاملہ جانے کی کوشش  
کی تو زارون نے کچھ بھی چھپانے کی بجائے انہیں ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔

”ہم مطلب معاملہ کافی خراب ہو چکا ہے اور مجھے ایسے میں تمہارا اکیلے وہاں جانا کچھ مناسب نہیں  
لگ رہا اگر تم چاہو تو میں اور تمہاری امی ایک بار پھر سے سارہ بیگم سے بات کر سکتے ہیں“، اُس کی  
ساری بات توجہ سے سننے کے بعد احمد صاحب نے سمجھداری سے ایک بہتر حل اُس کے سامنے  
رکھا۔

”نہیں میں آپ لوگوں کو دوبارہ وہاں نہیں بھیجوں گا بس مجھے جانے دیں میں خود ہی انہیں اپنے  
طریقے سے قائل کرنے کی کوشش کروں گا“

”اپنا طریقہ مطلب؟ اور مجھے تمہارے انداز سے بالکل نہیں لگ رہا کہ تم وہاں انہیں قائل کرنے جا رہے ہو“، اُس کی بات کا ٹھے احمد صاحب نے سوالیہ نظر وہ سے اُس کی جانب دیکھا جواب دونوں ہاتھ کی انگلیاں آپس میں پیوست کیے خاموش بیٹھا تھا۔

”دیکھو زارون یہ کوئی ضد بازی کے کام نہیں ہے اور اگر تم کوئی غلط قدم اٹھانے کا راداہ رکھتے یہاں سے جا رہے ہو تو میں ہرگز تمہیں جانے نہیں دوں گا“، اُس کی خاموشی پر اپنی بات کی تصدیق ہوتے احمد صاحب نے سختی سے اُس کے ارادوں سے باز رکھنے کی تلقین کی۔

”تو کیا کروں؟ میں نے سیدھا طریقہ اختیار کیا تھا نا آپ لوگوں کو عزت سے اُن کے گھر بھیجا پر کیا کیا انہوں نے اور رہی بات غلط قدم کی تو انہوں نے مجھے خود مجبور کیا ہے ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا“، زندگی میں پہلی بار زارون نے احمد صاحب کے سامنے بغاوت کی تو عابدہ بیگم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھے مزید کچھ کہنے سے روکا۔ ”همم ٹھیک ہے اگر تم چاہتے ہو کہ ساری زندگی تمہاری بیوی ایک گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی کا بوجھ اپنے دل و دماغ میں لیے زندہ رہے تو میری طرف سے اجازت ہے جب نکاح کرنا ہوا بتا دینا میں لاہور پہنچ جاؤں گا“، بات ختم کرتے انہوں نے زارون کو مزید کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر ہی ہاتھ کے اشارے سے روکتے اندر کا رخ کیا۔

”امی پیز آپ ابو کو سمجھیں اور میں ایسا کب چاہتا ہوں پر حبہ کی امی نے ہمیں یہ سب کرنے پر مجبور کر دیا ہے“، احمد صاحب کے جاتے ہی زارون نے جھنجھلاتے ہوئے عابدہ بیگم کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”میں نے اُس دن بھی تم سے ایک بات کہی تھی کہ مرد کبھی مجبور نہیں ہوتا جب تک وہ خود نہ ہونا چاہے باقی اگر حبہ کی امی اس حد تک چلی گئی ہیں تو بہتر ہے کہ اب تم پیچھے ہٹ جاؤ تاکہ حبہ آسانی سے اپنی زندگی کا فیصلہ کر سکے کیونکہ ابھی تو وہ تمہاری محبت میں یہ قربانی دے دے گی پر ساری زندگی ماں باپ کو دیکھنے کی چاہ دل میں لیے اندر ہی اندر ختم ہو جائے گی۔ زارون تمہارا کچھ نہیں جائے گا سارا خسارہ صرف حبہ کے حصے میں آئے گا تمہارے تونہ والدین تم سے خفا ہوں گے اور نہ ہی بہن بھائی پر حبہ؟ اُس کے پاس تو پہلے ہی دور شستے ہیں اگر وہ ان کو بھی کھو دے گی تو اُس کی زندگی میں کچھ نہیں بچے گا۔ تمہارے ساتھ وہ خوش تورہ لے گی پر سکون میں نہیں رہ پائے گی کیونکہ ماں باپ کو ناراض کرنے کی تڑپ کبھی بیٹی کے دل سے نہیں جاتی خواہ غلطی اُس کی ہو یانہ ہو پر وہ زندگی بھرا پنے آپ کو ہی قصور وار سمجھتے سزادیتی رہے گی اس لیے ابھی وقت ہے ایک بار کوشش کر لو اگر سارہ بیگم مان جاتی ہیں تو ٹھیک ورنہ حبہ کو سمجھاؤ اور اُس کے حال پر چھوڑ دو کیونکہ بے وفائی کے زخم کسی اور سے پیار ملنے پر بھر جاتے ہیں پر بد نامی اور ماں باپ کا دل دکھانے

کی کسک مرتے دم تک باقی رہتی ہیں،” نرمی کے ساتھ عابدہ بیگم نے اُسے سمجھاتے احمد صاحب کو دیکھنے کے لیے اندر کا رخ کیا تو زارون وہیں اپنا سر پکڑے بیٹھا اُن کی باتوں کو سوچنے لگا جو تلخ ہونے کے ساتھ ساتھ حقیقت پر مبنی تھیں۔

---

”ہائے میں مر گیا، پتا نہیں کس منحوس مارے کی نظر لگ گئی مجھے،“ سڑک کے درمیان میں اپنا پاؤں پکڑ کر بیٹھے ارحام نے دوہائی دی۔

”تم سے زیادہ منحوس اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اس لیے یقیناً اپنی ہی لگی ہو گی،“ اُسکے قریب ہی اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے زارون نے فٹ سے جواب دیا۔

”بس کرو۔ میں سب جانتا ہوں کہ مجھے کس کی نظر لگی ہے،“ پاؤں پہ لگی ہلکی سی خراش کو دکھ بھری نظر سے دیکھتے ارحام نے دانت پسیے۔

”کسی کی نظر نہیں لگی بس جوتب سے بیٹھے بریانی ٹھونس رہے تھے ناؤں کا اثر ہے،“ زارون نے اُس کے ڈرامے دیکھ کر سہارا دینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”تھپٹر کھالو اور بریانی کا اثر پیٹ پہ ہونا تھا یا پیروں پہ“، اُس کی بات پہ بدمزہ ہوتے ارحم نے اُس کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکا۔

”لوگوں کے پیٹ پہ پر تمہارے دماغ پر ہوتا ہے کیونکہ تم ایک ساتھ ایک ہفتے کا کھانا کھا لیتے ہو“، اپنی بات کی وضاحت کرتے زارون نے زبردستی اُس کا ہاتھ تھام کے اٹھانا چاہا۔

”مجھے اٹھاؤ، میں چل نہیں سکتا“، دونوں بازو پھیلاتے ارحم نے خفگی سے کہا۔

”تو کھا کم لینا تھا تھوڑا اور تمہیں اٹھا کر میں نے اپنی کوئی ہڈی پسلی نہیں تزویں اس لیے تنگ مت کرو اور شرافت سے اٹھ جاؤ“، زارون نے اُس کے نخزے بڑھتے دیکھتے ہوئے آنکھیں نکالیں۔

”زیادہ گھورنے کی ضرورت نہیں ہے اور یہاں میں مر رہا ہوں تمہیں اپنی ہڈی پسلی بچانے کی پڑی ہے“

”بس کرو ڈرامے اس ذرا سی خراش پر تم مرنے والے نہیں اور حرام کھانے والے تو سو سوال زندہ رہتے ہیں“، اُس کی بات نقچ سے کاٹتے زارون نے تیوری چڑھائی۔

”میں نے کون سا حرام کھایا تو بہ توبہ کیا وقت آگیا ہے دوست، دوست پہ ہی اتنا بڑا الزام لگا رہا ہے“، کانوں کو ہاتھ لگاتے ارحم نے آنکھوں میں حیرت سموتے دہائی دیتے پاس سے گزرتے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

”ارحم بس کرو اور انھوں یہاں سے، سب لوگ دیکھ رہے ہیں“، اُسے بازو سے پکڑتے زارون نے کھڑا کرنے کی کوشش کی جو ڈھیٹ بناؤ ہیں جما بیٹھا تھا۔

”نہیں انھوں گا۔ تم نے مجھ پر الزام لگایا ہے بلکہ تم تھمت لگائی ہے کہ میں حرام کھاتا ہوں۔ بتاؤ ذرا میں نے کب حرام کھایا“، ناراضی سے کہتے ارحم نے وضاحت چاہی۔

”پانچ ہزار روپے رشتہ کس نے لی تھی مجھ سے ابھی تھوڑی دیر پہلے اور ہاں جو پسیے تم نے شرٹ لینے میں بر باد کیے تھے وہ سب تم پر حرام ہی تھے جنہیں تم نے اپنے ابو کومال سمجھ کر خرچ کیا“، اُس کی ہٹ دھرمی پر زارون نے شرم دلانا ضروری سمجھی۔

”بس کرو وہ تم نے سب اپنے فائدے کے لیے مجھے دیے میرا مند بند کروا نے کے لیے میں نے کو نساز بردستی لیے تھے اور ایسے پسیے حرام نہیں بلکہ حلال ہوتے ہیں جو آپ کسی کی جان بچانے کے عوض وصول کرتے ہیں“، ارحم نے پچھے کھڑے گاڑی والے کو ہارن دیتا سن کر دو منٹ رکنے کا اشارہ کرتے زارون سے دودو ہاتھ کیے۔

”ہاں تم پر تو کچھ بھی حرام نہیں۔ بس کرو اب یہ ڈرامہ انھوں یہاں سے ورنہ جو جو تیاں تمہیں پڑنی وہ بھی حلال ہی ہونی“، گاڑی والے کو بار بار ہارن دیتا دیکھ کر زارون نے ارحم کا ہاتھ تھاما جسے جھٹکتے وہ کسی صورت اُس کی بات ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔

”پڑ لینے دو جو تیاں ویسے بھی مجھے امید ہے کہ میرے جو تیاں پڑتی دیکھ کر تمہیں سب سے زیادہ خوشی ہونی ہے“، منہ بسورتے ارحم نے اپنی بات مکمل کی تو گاڑی والے نے پھر سے ہارن دیا۔

”ہاں بالکل میرے پانچ ہزار کھائے ہیں وہ بھی ناجائز تواب میرا اتنا تو حق بنتا ہے کہ تمہیں جو تیاں پڑتی دیکھ کر کم از کم تالیاں ہی بجا سکوں اُسے سڑک سے اٹھتا دیکھ کر زارون نے گاڑی والے سے معذرت کی جواب کھڑکی سے سر نکالے اُنہیں سخت الفاظ میں سڑک خالی کرنے کا کہہ رہا تھا۔  
”قسم سے یار بڑے ہی بے مرودت ہو، ایک میں نے تمہاری اتنی بڑی مصیبت سے جان چھڑائی اور اوپر سے تم مجھے ہی با تین سُنار ہے ہو حد ہے بھلانی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا“، افسوس سے سر ہلاتے وہ بس میں سوار ہوئے۔

”میں اچھے سے جانتا ہوں جتنی تم میری بھلانی کا سوچتے ہو“، رابعہ اور نور کی جانب دیکھتے زارون نے آہستہ آواز میں کہا۔

”شکر ہے کچھ تو احساس ہوا تمہیں ورنہ مجھے تو لگا تھا کہ میں تمہیں احساس دلائے بغیر ہی مر جاؤں گا“، اُس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ارحم نے ڈائیلگ مارا۔

”وگھر پہنچوڑ را پھر بتانا ہوں میں تمہیں کہ کتنا احساس ہے مجھے“، اُکی بک بک سے تنگ آکر زارون نے ہینڈ فری کانوں میں لگائی۔

”اچھا بات سنو تو ایسے یہ سفر سب سے زیادہ یاد گار تھا“، ہینڈ فری کھینچتے ارحمنے ابر واچکاتے تصدیق چاہی۔

”ہاں کچھ زیادہ ہی“، زارون نے طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے والپس ہینڈ فری کانوں میں لگائے کچھ دیر آنکھیں بند کرتے سیٹ کی بیک سے سر ٹکاتے لیٹ گیا تو ارحمنے رابعہ اور نور کی طرف دیکھا جو بس میں بیٹھتے ہی شائد سارا دن تھکنے کی وجہ سے نیند کی وادی میں اُتر چکی تھیں۔

”اُفف اب میں کیا ان تینوں کی نگرانی کروں“، خود کلامی کرتے ارحمنے بُرا سامنہ بنایا اور زارون کے کندھے پر سر رکھ لیا

”دور ہو کے لیٹو“، زارون نے آنکھیں کھولے اُسے پیچھے کیا۔ ”ہونہ لڑکیوں کو تو بڑے سہارے دے دیتے ہو اور دوست نے ذرا سر کیا رکھ لیا ساتھ ہی شروع ہو گئے“، شکوہ کرتے ارحمنے بے شرمی سے والپس سر اُس کے کندھے پر رکھا تو زارون نے لمبی سانس لیتے خاموشی اختیار کی اور والپس سیٹ کی بیک سے سر لگائے بیٹھ گیا۔

-----

اُن لوگوں کو اسلام آباد پہنچے پندرہ منٹ گزر چکے تھے پر رضا کے آنے کا بھی تک کوئی نام و نشان نہیں تھاتب ہی نور نے پانچویں بار اُسے کال کی۔

”رضا کہاں ہو تم؟“ ہیلو کی آواز آتے ہی اب کی بار نور نے غصے سے سوال کیا۔

”آپ بس دو منٹ میں پہنچ رہا ہوں“، دوسری طرف جواب دیتے ہی کال کاٹ دی گئی۔

”پتا نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو میں نے کہا بھی تھا کہ ٹائم سے پہنچ جانا“، نور نے رابعہ کے قریب آتے خود کلامی کی جو ابھی تک اُسی کے لیے وہاں رکی ہوئی تھی۔

”کوئی بات نہیں آجائے گا تم پر یہاں نہ ہو اور دیکھو ابھی زارون اور ارحم بھی یہاں ہیں“، رابعہ نے ایک طرف اشارہ کرتے اُسے مطمئن کیا جو شائد سب لوگوں کے چلے جانے کی وجہ سے گھبرائی تھی۔

”ہاں پر بہت ٹائم ہو گیا ہے۔ باگھر میں ہوتے تو مجھے ایک سینڈ بھی ڈیٹ نہ کرنا پڑتا“، یونیورسٹی کے گیٹ کی جانب دیکھتے نور نے پھر سے شکایت کی۔

”اچھا چلو چھوڑو تم بتاؤ میری ملنگی پہ آؤ گی؟“، رابعہ نے اُس کا دھیان بٹانے کی خاطر سوال کیا۔

”ہاں آؤ گی پر ابھی ڈیٹ تو فائنل ہو لینے دو“

”وہ بھی ہو جائے گی ابھی کچھ دیر پہلے ہی آپی کا مسج آیا تھا۔ بتارہی تھیں کہ پرسوں ارحم کے امی ابو منگنی کی ڈیٹ فائل کرنے آرہے ہیں“، رابعہ نے شرماتے ہوئے نور کو بتایا۔

”ہیں سچ میں؟ اللہ کتنا مزہ آئے گانا“، اُس کے دونوں ہاتھ تھامتے نور نے خوشی کا اظہار کیا تو رابعہ نے شرمانے کے چکر میں بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا۔

”مزے تو آئے گا پر یہ بند رمح ہی پسند آنا تھا کیا“، رابعہ اُسے اچھلتے ہوئے اپنی جانب آتا دیکھ کر منہ میں بڑ بڑائی۔

”یہ تم دونوں آدمی رات کو کس کی چغلیاں کرنے میں مصروف ہو“، ارحم کے قریب آتے ہی وہ دونوں خاموش ہوئیں تو اُس نے مشکوک انداز میں انہیں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”آپ کی ہی کر رہے تھے نور نے موبائل پر رضا کی آتی کال کو دیکھ کر جواب دیا۔

”اچھی بات ہے میرے گناہ کم ہو جائیں گے پر چغلیاں ہو کس بارے میں رہی تھی؟“، آنکھیں سُکیرے ارحم نے اُن دونوں کی جانب دیکھا تو نور نے رابعہ کی جانب اشارہ کیا۔ ”اس سے پوچھ لیں میرا توجہ ایسی آگیا۔ میں جا رہی ہوں“، اُن دونوں کو اللہ حافظ بولتے وہ گیٹ کی جانب بڑھی جہاں رضا بائیک کے میٹر پر کہنی ٹکائے اُس کا انتظار کر رہا تھا۔

”ہاں بتاؤ کیا چغلی کی ہے تم نے میری بہن سے؟“ نور کے جاتے ہی ارحم نے بازو سینے پر باندھتے ہوئے سوال کیا۔ ”یہی کہ تم بندر ہو اور میری قسمت اتنی خراب ہے کہ تم جیسا بد تیز انسان ہمیشہ کے لیے میری زنگی میں شامل ہونے جا رہا ہے“، رابعہ نے اسد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو زارون سے کھڑا باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

”میں بندر تو تم بھی بندر یا ہو اور تمہاری تو بس قسمت خراب ہے اور میری تو ساری ساری کی پھوٹی نکلی جو تم جیسی بیوی اور زارون جیسا بے مرودت احسان فرمواش دوست ملا“، رابعہ کے ہی اسٹائل میں ارحم نے اُسی بات میں کچھ تبدیلی کر کہ اُس کو لوٹائی تو رابعہ نے جماں لیتے اسد کو آواز دی۔

”اسد بھائی آجائیں مجھے نیند آرہی ہے“، ارحم کی بات کا جواب دینے کی بجائے اُس نے اپنا رخ گاڑی کی جانب کیا تو وہ بھی اُس کے پیچھے گاڑی کی جانب لپکا۔

”اچھا پرسوں امی ابو تمہارے گھر آرہے ہیں منگنی کی ڈیٹ فائل کرنے بس اب تم جیسی بھی ہو میں صبر شکر کر کہ برداشت کر لوں گا اس لیے پلیزا چھے سے تیار ہو جانا“، آنکھوں میں شرارت

لیے اُس نے رابعہ کو چھیڑا جو اُس کی بات سنتے ہی اُس کے بال کپڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھا چکی تھی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور اب تو میں پکا انکار کروں گی“، ارحم کے بروقت پیچھے ہونے پر اُس نے منہ پھلاتے گاڑی میں پڑی بوتل اٹھا کے اُسے ماری۔

”کیا ہو گیا ہے یہ اندر سے بو تلوں کی بارش کیوں ہو رہی ہے“، اسد نے اُن دونوں کے قریب آتے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس ابھی تو بارش شروع ہوئی ہے اگر تم فوراً اپنی بہن کو گھرنہ لے کر گئے تو پا طوفان آجانا اس لیے بھائی بڑی مہربانی آپ اس طوفان کو ٹال دیں“، ارحم نے اسد کے گلے لگتے سر گوشی کی جس پر مسکراتے ہوئے اُس نے ایک نظر رابعہ کو دیکھا جو ارحم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”ارحم یار آجاو“، زارون نے اُسے وہیں کھڑے باتوں میں مصروف دیکھ کر آواز لگائی تو اسد نے اللہ حافظ بولتے گاڑی میں بیٹھتے اُسے اسٹارٹ کیا تو ارحم نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے رابعہ سے سوری بولا جوانجہان بننے سامنے دیکھنے لگی۔

”کیا مسئلہ ہے دو منٹ بھی مجھے سکون سے بات بھی نہیں کرنے دی تم نے“، گاڑی کے گیٹ سے نکلتے ہیں اُس نے زارون کی طرف آتے شکایت کی۔

”بس کرو تین گھنٹے سے باقتوں میں مصروف تھے اور ابھی بھی میں نے بات نہیں کرنے دی“، اپنی گاڑی کی جانب بڑھتے زارون نے اُس کی بات دھراتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں تو پیار کی باتیں الیسی ہی طویل ہوتی ہیں پر تم کیا جانو سڑیل انسان“، ارحم نے طعنہ مارتے گاڑی کا درازہ کھولا۔

”بس کرو اور رابعہ کے چہرے کے تاثرات دیکھ کے لگ نہیں رہا تھا کہ تم پیار بھری باتیں کر رہے تھے“، اُس کے بیٹھتے ہی زارون نے گاڑی اسٹارٹ کرتے گیٹ سے باہر نکالی۔

”ہاں بس اُس کا موڈ تھوڑا خراب ہو گیا تھا“، شیشے میں دیکھ کر اپنے بال سیٹ کرتے ہوئے ارحم نے سر سری سے انداز میں بتایا۔

”کیوں؟“ گاڑی کو سڑک پر ڈالتے زارون نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”کیونکہ میں نے اُسے بتایا کہ میں آج رات زارون کے گھر اُس کے ساتھ اُس کے کمرے میں سوؤں گا تو خفا ہو گئی“،

”مطلوب تم میرے ساتھ میرے گھر جا رہے ہو؟“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے بریک پہ پاؤں رکھا۔

”ہاں تو اب رات کے دو بجے میں مسکین، معصوم کہاں جاؤں گا۔ سڑک پہ سو جاؤں کیا؟“ اُس کی حیرت پر بد دلی سے اُس نے الٹا زارون سے سوال کیا۔

”تو سو جاؤ اور جتنے تم مسکین اور معصوم ہو میں اچھے سے جانتا ہوں“، بریک سے پاؤں ہٹاتے زارون نے گاڑی کو اپنے گھر کے راستے پہ ڈالا۔

”مجھے تم سے اسی جواب کی امید تھی اور غریب کو سڑک پر تو نیند آجائی پر خالی پیٹ نہیں“، کرب سے کہتے ارحم نے معصوم سے شکل بنائی۔

”بس کرو یار کیا کھا کھا کے پھٹنا ہے تم نے ابھی کوئی پندرہ منٹ پہلے ہی چار بسکٹ کے پیکٹ کھائے ہیں وہ بھی دو کپ چائے کے ساتھ توبہ ایسی غریبی تو اللہ کسی کونہ دے“، نفی میں سر ہلاتے زارون نے دعا کی۔

”یار تم اُدھر بیٹھے میرے چائے کے کپ اور بسکٹ کے پیکٹ گن رہے تھے کیا؟“ صدمے سے اُس کی جانب دیکھتے ارحم نے سوال کیا تو زارون نے اثبات میں سر ہلاتے گھر کے سامنے گاڑی روک کے ہارن دیا۔۔۔

”گن رہا تھا اس لیے کیونکہ بل میں نے دینا تھا“، گاڑی گیٹ سے اندر لے جاتے زارون نے ٹکاسا جواب دیا۔

”ہونہ بس ایک بل کیا دے دیا اب تم سو بار مجھے اُس کا طعنہ مارو گے پر اثر مجھے پھر بھی نہیں ہونا اس لیے اپنی انرجی ضائع کرنے کی بجائے اندر جا کر کھانے کا انتظام کرو بہت بھوک لگی ہے مجھے“، اُسے گاڑی لا کر کرتا دیکھ کر ارحم نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہے صبری سے کہا تو زارون نے مسکراتے ہوئے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”چلو کھانے کے دشمن کھلا دیتا ہوں کھانا“، زارون نے کہتے ہوئے اُسے اپنے ساتھ لیا اور اندر کی جانب بڑھا۔

”تم لیٹ کیوں ہوئے تھے؟“ نور نے گھر پہنچتے ہی رضاکی کلاس لینی شروع کی جو نیند کی وجہ سے لاڈنچ کے صوفہ پر ہی ڈھیر ہو چکا تھا۔

”کیا ہے آپ لیٹ پہنچا پر آپ کو لے تو آیا ہوں بس اب صبح لڑ لیں گے ابھی سونے دیں مجھے“، کشن اپنے سر کے نیچے رکھتے اُس نے بند آنکھوں سے ہی جواب دیا۔

”صحح اٹھ کے میں تمہیں منہ نہیں لگاؤں گی اور تم لڑنے کی بات کر رہے ہو اور ہاں جو میں گفت وہاں سے تمہارے لیے لائی ہوں ناؤں سے بھی چھٹی سمجھو،“ کشن اُس کے سر کے نیچے سے کھینچتے نور نے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”نور آپی اتنی تو ظالم ناہیں۔ اب دیکھیں ذرا سارا دن میں آپ کے کتنا کام کرتا ہوں اور ابھی بھی رات کے اس پھر میں آپ کو یونیورسٹی سے لے کر آیا ہوں، بتائیں مجھے دنیا کا کوئی بھی بھائی اپنی بہن کا اتنا خیال کرتا ہے کیا؟“ دوسرا کشن اپنے سر کے نیچے رکھتے رضا نے گفت کے نام پر فوراً آنکھیں کھولیں۔

”ہاں ہاں پتا ہے جو تم میرے کام کرتے ہو رشوت لے لے کر۔ نور آپی کام ہو جائے گا بس پڑوں لگے گا بس سورو پے لگیں بس پچاس ہونہ،“ اُس کے قریب صوفے پر بیٹھتے نور نے اُس کی نقل اُتاری

”ہاں تو اور کیا کروں اب میں نے بھی تو اپنا خرچا پانی نکالنا ہوتا ہے نا اور باہمیک پڑوں سے چلتی ہے پانی سے نہیں،“ اُسے ایک پتے کی بات بتاتے رضا نے ایک اہم نقطہ اٹھاتے ہوئے نور کو سوچنے پر مجبور کیا۔

”بس آتے ہی شروع ہو گئے ہو“، نائلہ بیگم جو تہجد کے نوافل پڑھ رہی تھیں انہوں نے اُن کے شور پر کمرے سے باہر نکلتے ٹوکا۔

”ماما میں نہیں لٹر رہی یہ رضا جان بوجھ کر مجھ سے لڑتا ہے“، اُٹھ کر اُن کے گلے لگتے نور نے ماں سے شکایت کی۔

”اچھا بس چھوڑو تم اور بتاؤ کہ سفر کیسار ہا اور مزہ بھی آیا یا نہیں؟“ رضا کے ہاتھ جوڑنے پر نائلہ بیگم نے نور کو باتوں میں لگا کے اُس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی۔

”جی بہت مزہ آیا سفر بھی بہت اچھا رہا“، نور نے تفصیل بتاتے اپنا حجاب اُتار کے دو پٹے کی طرح لیا۔

”اچھا ٹھیک ہے بس اب تم جاؤ اور آرام کرو اور اپنے بابا کو بتا دیا تھا؟“ اُسے مزید باتیں کرنے کا ارادہ رکھتے دیکھ کر نائلہ بیگم نے بات کا ٹنے ہوئے سوال کیا۔

”جی بتا دیا تھا“، وہیں لاڈنچ میں ہی صوفے پر لیٹتے اُس نے جواب دیا تو نائلہ بیگم اُس سے کھانے کا پوچھا۔

”نہیں، بھوک نہیں ہے بس صحیح ہی ناشستہ کروں گی“، جواب دیتے نور نے رضا کا کان کھینچا جو سوچ کا تھا۔

”نور سکون سے لیٹو اور بھائی کو تنگ مت کرنا،“ اس کی شرارت دیکھ کر نائلہ بیگم نے تنبیہ کی اور واپس اپنے کمرے کی جانب چلی گئیں۔

---

”کیا مصیبت ہے یار؟“، زارون نے چوتھی دفعہ ارحم کی ٹانگ جو اُس کی گردن پر تھی پچھے کی۔

”حد ہے خود تو بس میں بھی نیند پوری کر لی اور اب بھی رات سے بادشاہوں کی طرح پورے بیٹ پر قبضہ جمائے لیٹا ہے“، زارون نے بے زاری سے کہتے اپنا سائیڈ ٹیبل پر پڑا موبائل اٹھایا اور اُس پہ پانچ منٹ بعد کالارم سیٹ کرتے ارحم کے کان کے قریب رکھ دیا جو بے خبری سے نیند کے مزے لینے میں مصروف تھا۔

”کیا ہوا؟“، ایک دم سے آنے والی الارم کی آواز پر بدحواسی سے اٹھتے اُس نے ادھر ادھر دیکھا۔

”کچھ نہیں ہوا بس تمہیں اٹھانے کے لیے الارم لگایا تھا“، اپنا موبائل اٹھاتے زارون نے لاپرواں سے کندھے اچکائے۔

”بھاڑ میں جاؤ تم، بہت ہی خبیث انسان ہو۔ گھر آئے مہمان کو کوئی ایسے ڈرا کر جگاتا ہے کیا؟“، اپنی رکی ہوئی سانس بحال کرتے اُس نے زارون کو شرمندہ کرنا ضروری سمجھا۔ ”ہمارے گھر میں بن بلائے مہمانوں کا جگانے کا یہی طریقہ ہے اور میں کل بھاڑ میں جاؤں گا پرانی الحال تم اٹھو اور اپنے گھر

---

کارستہ لوتا کہ میں کچھ دیر سکون سے سو سکوں۔ پتا نہیں کس جنگل سے اٹھ کر آئے ہو جو انسانوں کی طرح سونا بھی نہیں آتا تھیں۔ تو بہ ساری رات میرے چہرے پر ٹانگیں مار مار کر بری حالت کر دی ہے، انگڑائی لیتے زارون نے اپنی گردن کو آگے پیچھے کر کہ دیکھا۔

”اچھی بات ہے پر یکیش ہو گئی“، دوسرا تکیہ زمین سے اٹھا کر سر کے نیچے رکھتے ارحم نے تجسس برقرار رکھا۔

”کس چیز کی پر یکیش؟“

”اپنی بیوی کی ٹانگیں کھانے کی اور کس چیز کی“، باہمیں آنکھ دباتے ارحم نے اُسے چھیڑا۔

”بکواس نہ کرو اٹھو جلدی سے اور میرے کمرے سے باہر دفعہ ہو جاؤ“، اُس کے سر کے نیچے سے تکیے کھینختے زارون نے دروازے کی جانب اشارہ کیا۔

”یار حد ہو گئی ہے۔ میں کون سا تمہارے کمرے پر قبضہ کرنے لگا ہوں جو تم مجھے ایسے دھکے دے دے کر جانے کا کہہ رہے ہو“، اُس کی بے نیازی پر گڑھتے ہوئے ارحم نے آہ بھری۔

”رات سے تم نے میرے کمرے کی بُری حالت کر دی ہے اور ابھی کہہ رہے ہو قبضہ نہیں کیا؟“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے صوف کی طرف اشارہ کیا جہاں رات کو ارحم نے ایک شرط نکالنے کے چکر میں اُس کی پوری الماری خالی کرتے ہوئے کپڑوں کا انبار صوف پر لگادیا تھا۔

”اور یہ کیا ہے؟“ اپنے پاؤں کے نیچے آئے چسپس کے پیکٹ کو اٹھاتے زارون نے بیڈ پر جگہ جگہ پڑے رپیرز کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کوئی بات نہیں تم پر بیشان نہ ہو آنٹی سب صاف کر دیں گی“، زارون کے غصے کی پرواکیے بناء ارحمنے اُس کے ہاتھ سے چسپ کا پیکٹ پکڑتے تسلی دی۔

”امی تو صاف کر، ہی دیں گی مگر اس سے پہلے میں تمہاری طبیعت صاف کروں پلیز مہربانی کر کہ اپنا بوریابستر سمیٹو اور اپنے گھرد فع ہو جاؤ“، کشن اٹھا کر اُسے رسید کرتے زارون نے ہاتھ جوڑے۔

”چلا جاؤ گا بس یہی کسر رہ گئی تھی وہ بھی تم نے آج پوری کر دی۔ دل ہی توڑ دیا ہے تم نے آج میرا پر میں ایسا ہر گز نہیں ہوں میں اپنی پیاری آنٹی کا دل نہیں توڑ سکتا پتا نہیں کتنے چاہ سے اٹھ کر انہوں نے میرا لیے ناشتا تیار کیا ہو گا بس وہ کر کہ چلا جاؤ گا“، آنکھوں سے مصنوعی آنسوؤں صاف کرتے ارحمنے اٹھ کروش روم کارخ کیا۔

”تم جانے والے بنو میں آنٹی کا پیار اور ناشتا دونوں تمہیں ٹی سی ایس کروادوں گا“، زارون نے اُس کے ڈرامے دیکھ کر آفر کی۔

”مطلوب تم ہر حال میں یہاں سے بھیج کر ہی دم لو گے؟“ دروزے سے سر نکالتے ارحمنے زارون سے اُس کے فیصلے کے متعلق پوچھا۔

”ہاں بالکل“، بیڈ سے رپر زاؤٹھاتے اُس نے ایک عزم کے ساتھ سر ہلا�ا۔

”ٹھیک ہے پھر میں ناشستہ کر کہ ہی چلا جاؤں گا اور یہ میرا تمہارے گھر میں آخری ناشستہ ہو گا“، دکھ بھرے لبجے میں کہتے اُس نے اوپھی آواز میں زارون کو سنائی۔

”ٹھیک ہے تو جلدی کرونا۔ فریش ہو کر اپنا آخری ناشستہ نوش فرمائیں میرے گھر سے دفع ہو جاؤ“، بیڈ شیٹ پر جگہ جگہ لگے چالکیٹ کے داغ دیکھ زارون نے اکتا تھے ہوئے کہا۔ ”ہوننہ ناشستہ آخری ہے پر لنج اور ڈنر نہیں اس لیے تم زیادہ خوش فہمی میں بتلانہ ہو“، آنکھیں سکریٹرے اُس نے زارون کی ساری خوشی پر پانی پھیرا تو اُس نے غصے سے پاس پڑا جوتا اُس کی طرف اچھالا جس کے پہنچنے سے پہلے ہی ارحم نے واش روم کا دروازہ بند کر لیا۔

### ماضی

”سارہ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟؟ کیوں تم اپنی اولاد کی خوشیوں کے پیچے ہاتھ دھو کے پڑ گئی ہو“، کچھ دیر بحث کرنے کے بعد بلا آخر سلطان صاحب نے ہارمان نے نرمی سے بات کی۔

”میں پڑی ہوں خوشیوں کے پیچھے؟ ایک ماں کیا اپنی اولاد کی خوشیوں کے پیچھے پڑ سکتی ہے؟ آندھی صاحب بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے آپ کی سوچ پہ“، نفی میں سر ہلاتے سارہ بیگم نے دکھ سے ان کی بات کاٹی۔

”ماں ہوتا ہی تو تم سے ایسی امید نہیں تھی اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ تم میرے جانے کے بعد حبہ سے اس طرح کا سلوک کرو گی تو باخدا میں کبھی بھی اپنی بیٹی کو تمہارے سہارے چھوڑ کرنا جانتا اور کیا جرم تھا اس کا جو تم نے اُس پہ ہاتھ تک اٹھایا؟ یہی ناکہ اُس نے تمہارے لائے ہوئے رشتے سے انکار کر دیا تو سارہ بیگم یہ اُس کا حق ہے وہ اپنے جیون ساتھی کے معاملے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہے اور تم زور زبردستی کے ذریعے اُس سے یہ حق نہیں چھین سکتیں“، انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے انہوں نے اپنا غصہ ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی۔

”ٹھیک ہے اگر میری بات کی اور میری اس گھر میں کوئی وقت نہیں ہے تو میں چلی جاتی ہوں یہاں سے پھر آپ کا اور آپ کی بیٹی کا جدول کرے گا کر لیجیے گا“، سلطان صاحب کی بات سننے ہی سارہ بیگم نے طیش میں آتے چلاتے ہوئے جواب دیا اور الماری سے اپنے کپڑے نکال کر بیڈ پر پھنکنے لگیں۔

”ٹھیک ہے تمہارا بھی جو دل کرتا ہے کرو بس یہ بات یاد رکھنا کہ اگر تم نے اس گھر سے قدم باہر نکالا تو میں تمہیں ویسے نہیں بھیجوں گا بلکہ طلاق کے کاغذات تمہارے ہاتھ میں تھما کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے اور اس گھر سے رخصت کر دوں گا“، غصے سے پا گل ہوتے سلطان صاحب نے روز روڑ کے لڑائی جھگڑے سے تنگ آ کر اپنا فیصلہ سنایا۔

”ٹھیک ہے دے دیں طلاق بس اس بات کی کسر رہتی تھی وہ بھی پوری کر دی آج آپ نے اور مرد کر بھی کیا سکتا ہے؟ جب دیکھا کہ عورت کو نیچا دکھانا ہے بس طلاق کی دھمکی دی اور اپنی بات منوالی پر قصور آپ مردوں کا نہیں بلکہ ہم جیسی عورتوں کا ہے جو اپنے حق پر خاموشی اختیار کرتے سب برداشت کرتی رہتی ہیں اور کون سانا جائز مطالبہ کیا تھا میں نے؟ بس اتنا کہ اپنی اکلوتی اولاد کی زندگی کا ایک فیصلہ اپنی مرضی سے کر سکوں۔ طلاق کے پیپر ز تیار کروالیں میں شام تک انتظار کر لوں گی“، آنکھوں سے رواں ہوتے آنسوؤں کو بے دردی سے ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے سارہ بیگم نے سلطان صاحب کے سامنے کھڑے ہوتے بے خوفی سے کہا تو وہ ہوش میں آئے۔

”سارہ میری بات سنو یہ سب میں نے غصے میں کہا“  
”بس جو الفاظ زبان سے نکل جائیں واپس نہیں آتے آپ کو آپ کی بیٹی اور یہ گھر بہت بہت مبارک ہو میں اب یہاں نہیں رہوں گی اس لیے جتنا جلدی ہو سکتا ہے پیپر ز تیار کروالیں“، ہاتھ کے

اشارے سے انہیں مزید کچھ کہنے سے روکتے سارہ بیگم نے اپنی بات مکمل کی اور سلطان صاحب کو وہیں خاموش کھڑا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکلتے ٹھٹھک گئیں۔

”امی میری بات سنیں“، حبہ جوان کی لڑنے کی آوازیں سن کے نیچے آئی تھی اُس نے ان دونوں کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سن لی تھی تب، ہی جلدی سے سارہ بیگم کے سامنے آتے انہیں روکنے لگی جو اسے دیکھتے ہی بیرونی دروازے کی جانب چل پڑی تھیں۔

”ہٹ جاؤ میرے راستے سے“، گرج دار آواز میں کہتے ہوئے سارہ بیگم نے اُس کا ہاتھ جھٹکا۔

”امی پلیز آپ دونوں میرے لیے نہ لڑیں اور اب سے جیسا آپ کہیں گئی ویسا ہی ہو گا پر امس“، حبہ نے انہیں آگے بڑھنے سے روکتے وعدہ کیا۔

”مجھے تمہارے کسی وعدے کی ضرروت نہیں اور جب اس گھر میں میری بات کی اور میری کوئی وقت نہیں ہے تو میرا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں“، سلطان صاحب کو اپنے قریب آتا دیکھ کر سارہ بیگم نے غصے سے کہا۔

”کیوں نہیں ہے وقت آپ کی بس میں نے کہنا اب سے جو آپ کہیں گئی ویسا ہی ہو گا میں اپنی زبان سے کبھی بھی زارون کا نام نہیں لوں گی پر امس“، حبہ نے بات اس حد سے بگڑتی دیکھ کر اپنے دل پر پتھر رکھتے ایک کٹھن فیصلہ کیا۔

”میں نے کہا نامیرے راستے سے ہٹ جاؤ ویسے بھی اب تو تمہارا باپ تمہاری خوشی کی خاطر مجھے طلاق دینے کو بھی تیار ہو گیا ہے تو بس اپنی خوشیاں انجوائے کرو۔ خوش ہو جاؤ کے ماں باپ کے درمیان اتنی بڑی دراڑ ڈال کر تمہیں تمہاری محبت ملنے جا رہی ہے“، کندھے اچکاتے سارہ بیگم نے حبہ کو مزید شرمندہ کیا۔

”سارہ بس کرو میں نے تمہیں بتایا ناکہ میں وہ سب غصے میں بول گیا تھا“، حبہ کو سر جھکائے خاموش کھڑا دیکھ کر سلطان صاحب نے آگے بڑھتے صفائی دی جو ان کی آوازیں سُن کر کمرے سے باہر آئے تھے۔

”پر میں غصے میں نہیں ہوں اپنے ہوش و حواس میں آپ سے پھر سے کہہ رہی ہوں کہ دے دیں مجھے طلاق کیونکہ میں تو ظالم ہوں۔ ماں کے روپ میں ناگن ہوں جو آپ کی بیٹی کی خوشیوں کی دشمن بنے بیٹھی ہوں“، سارہ بیگم نے ان دونوں کو جذباتی دیکھ کر ایک اور پتہ پھینکا۔

”امی پلیز ایسا نہ کہیں میں کہہ رہی ہوں نا آپ جیسا چاہتی ہیں ویسا ہی ہو گا آپ احتشام سے میرے رشتے کی بات کر رہی تھیں نا؟ مجھے قبول ہے بس آپ اور ابواس طرح طلاق کی باتیں نہ کریں“، یونچے ان کے قدموں کے قریب بیٹھتے حبہ نے ہاتھ جوڑے تو سارہ بیگم نے جلدی سے اُسے کھڑا کرتے اپنے ساتھ لگایا۔

”میری جان میری حبہ، بیٹا میں تمہاری دشمن نہیں ہوں جو تمہارے خواہش کو رد کروں پر مجھے وہ لڑکا کسی صورت بھی تمہارے لیے مناسب نہیں لگا اس لیے...“، اپنے مقصد کے پورا ہوتے ہی سارہ بیگم نے مگر مجھ کے آنسو بہاتے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”بس آپ کو مناسب نہیں لگا تو مجھے بھی اب اُس سے کوئی سر و کار نہیں جس شخص نے میری زندگی میں آتے ہی مجھے آپ دونوں سے دور کر دیا میں اب اُس سے کوئی رشتہ نہیں رکھوں گی“، ان دونوں کا ہاتھ تھامتے ہوئے حبہ نے آنسوؤں کے درمیاں ایک مشکل فیصلہ کیا اور ایک بار پھر سے سارہ بیگم کے ساتھ لگتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

### ماضی

سارہ بیگم کا موڈ ٹھیک ہوتے ہی حبہ اپنے کمرے میں آگئی تاکہ زارون کو لا ہو رآنے سے منع کر سکے۔ سلطان صاحب کا موبائل اٹھاتے اُس نے کانپتے ہاتھوں سے اُس کا نمبر ڈائل کیا جو دو چار بیل جانے کے بعد رسیو کر لیا گیا۔

”کہاں ہیں آپ؟“ آواز اور لمحے دونوں کو مضبوط رکھتے حبہ نے سوال کیا۔

”میں گھر میں ہی ہوں ابھی، بس کچھ دیر میں نکلتا ہوں۔ تم ٹھیک ہو؟“، زارون جو عابدہ بیگم کی باتیں سُننے کے بعد لا ہور جانے اور نہ جانے کی کشمکش میں پھنس گیا تھا اس نے حبہ کی رندھی ہوئی آواز سُننے سوال کیا۔

”جی میں ٹھیک ہوں۔ زارون مجھے کچھ کہنا تھا“، دماغ میں الفاظ ترتیب دیتے حبہ نے بات کا آغاز کیا۔

”ہاں کہو..“، اُس کے لمحے سے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوتے ہی زارون نے اجازت دی۔  
”وہ زارون... آپ لا ہور مت آئیے گا“، آنسو ضبط کرتے اُس نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔

”کیوں؟“ سانس روکے با مشکل زارون نے پوچھا۔

”قسمت نے مجھے آج اُس موڑ پہ لا کھڑا کیا تھا جس پہ مجھے اپنی محبت اور ماں باپ میں سے کسی ایک کو چننا تھا“، نچلے ہونٹ کا کونڈا نتوں میں دباتے اُس نے خود پہ ضبط کرنے کی ناکام کوشش کی۔  
”تو...؟“ سوال پوچھتے رکی ہوئی سانس مزید گلے میں اٹکی۔

”تو میں نے ماں باپ کو چن لیا“، آنسوؤں کی لڑی بے قرار ہو کر رخساروں پر بہہ نکلی تو حبہ نے انہیں بہنے دیا۔

”ہم ٹھیک کیا“، اپنے سینے پہ ہاتھ پھیرتے زارون نے مختصر ساجواب دیا کیونکہ اب اُس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔

”میں مجبور تھی...“، جواب سنتے ہی دوسری طرف سے وضاحت آئی۔

”میں نے کہانا ٹھیک ہے۔ بس تم جہاں بھی رہو خوش اور آباد رہو میرے لیے یہی کافی ہے“، ضبط کے مارے سرخ ہوتی آنکھوں سے زارون نے اپنی آواز کو ہموار کھنے کی کوشش کی۔

”سوری زارون میں ایسا نہیں چاہتی تھی پر...“، حبہ کچھ کہتے کہتے رکی۔

”پر شامد ہمارا ساتھ بس یہی تک کا تھا اس لیے خود کو ذمے دار مت سمجھو“، اُس کی ادھوری بات کو مکمل کرتے زارون خاموش ہوا تو دوسری جانب بھی سننا لاچھا گیا۔ ”حబہ...؟“ اُس کی موجودگی کو محسوس کرنے کے لیے چند سینکڑے بعد زارون نے اُسے مخاطب کیا تو وہ زارو قطار رونے لگی۔

”چپ ہو جاؤ پلیزا یسے رو کر خود کو ہلاکان مت کرو اور اللہ پر بھروسہ رکھو ہو سکتا ہے تمہاری زندگی میں آنے والا شخص تمہیں مجھ سے بھی زیادہ پیار دے اور تمہارے حق میں بہتر ہو“، اپنے آنکھ سے نکلنے والے ایک آنسو کو صاف کرتے زارون نے اُسے تسلی دی تو حبہ نے نفی میں سر ہلاایا۔

”وہ مجھے آپ سے زیادہ بھی پیار کر لے تب بھی آپ کونہ پانے کی کسک زندگی بھر میرے دل میں رہے گی کیونکہ لا حاصل کی تڑپ انسان کو اندر تک کھو کھلا کر دیتی ہے اور کھو کھلا انسان بس ایک

مشین کی مانند بن جاتا ہے جو دوسروں کے اشاروں پر ہنس بول تو سکتا ہے پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا اُسے خوب سے خوب تر مل جائے پر پھر بھی ایک ملال رہ جاتا ہے جو قبر تک اُس کا پیچھا نہیں چھوڑتا، آنسوؤں کے درمیان حبہ نے اپنی بات مکمل کی تو دوسرا طرف زارون کے چہرے پر ایک کربناک سی مسکراہٹ ابھری۔

”اللہ تمہیں بہت سی خوشیاں دے بس اپنی زندگی میں پر سکون رہو اور کبھی کوئی بھی ملال اپنے دل میں مت پالنا کیونکہ یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں تمہاری غلطی نہیں تھی بس اللہ کو ہمارا ایک ہونا منظور نہیں تھا، پلکیں جھپکاتے زارون نے اپنے آنسوؤں پر ضبط کرنے کی کوشش کی جو باہر نکلنے کے لیے بے تاب تھے۔

”آپ بھی خوش رہیں،“ حبہ کی ہمت جواب دے چکی تھی تب ہی اتنی سی بات کہتے اُس نے کال کاٹ دی تو زارون کی آنکھوں سے بے اختیار ہی آنسو چھلک پڑے۔

-----  
ماضی

محبت بے شک چار دن کی ہو یا کئی سالوں پر محیط، انسان پر اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے اور زارون کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا حبہ کی شادی کی اطلاع اُسے اُس نے خود ہی دی تھی جسے سُن کر زارون نا چاہتے ہوئے بھی ہمت ہار گیا تھا اُس نے خود کو کمرے میں بند کر لیا پڑھائی، دوست حتیٰ کہ اپنے ماں باپ تک کو فراموش کیے وہ بس سار اسارا دن خاموشی سے اپنے کمرے میں بیٹھا رہتا۔ عابدہ بیگم اور احمد صاحب اُسے سمجھانے کی کوشش کرتے تو وہ خاموشی سے اُن کی تمام باتیں سنتا اور کوئی بھی اثر لیے بغیر پھر سے خود کو کمرے میں قید کر لیتا۔ کچھ ہی دنوں میں اُس نے اپنے آپ کو بالکل تنہا کر لیا تھا، بس ایک خدا ہی تھا جس سے شکوئے گلے کر کہ وہ اب تک زندہ تھا۔

”احمد مجھے تو زارون کی حالت دیکھ کر خوف آنے لگ گیا ہے۔ سار اسارا دن کمرے میں بند رہتا ہے نہ کسی سے ملتا ہے اور نہ ہی یونیورسٹی جاتا ہے پلیز آپ ہی اُسے سمجھائیں کہ ایک انسان کے پیچھے زندگی ختم نہیں ہو جاتی“، عابدہ بیگم جو اُسے صحیح سے لے کر اب تک با مشکل دونوں لے کھلانے میں کامیاب ہوئی تھیں انہوں نے نیچے آتے ہی احمد صاحب سے اپنی فکر مندی کا اظہار کیا جو خود بھی زارون کی وجہ سے پریشان تھے۔

”ہم فکر تو مجھے بھی ہو رہی اور آپ کے سامنے میں ہر روز اُسے کتنا سمجھتا ہوں پر وہ کچھ بھی سمجھنے کو تیار نہیں ہے باقی مجھے لگتا ہے کہ وقت کہ ساتھ وہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا ابھی زخم نیا نیا ہے تب

ہی شائد وہ خود کو سنبھال نہیں پا رہا،“ احمد صاحب نے عابدہ بیگم کی بات سننے ان کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی تسلی دی۔

”پتا نہیں کس طرح کی ماں تھی ایک چھوٹی سی بات کو بنیاد بنا کر اپنی اور ہماری دونوں اولادوں کی خوشیاں بر باد کر دیں۔ پتا نہیں احمد ماں باپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ رشتے ان ذاتوں اور دولت کو دیکھ کر نہیں بنتے بلکہ رشتے تو پیار محبت اور عزت کے ہوتے ہیں جنہیں اُسی طرح ہی جوڑا جائے تو قائم رہ سکتے ہیں ورنہ جس عمارت کی بناد کھو کھلی ہو وہاں پر ہم لوگ جتنی بھی دولت کی مضبوطی فراہم کر دیں آخر کار وہ ایک دن گرہی جاتی ہے“، عابدہ بیگم نے دکھ میں اسکر شکوہ کیا تو احمد صاحب نے انہیں روکا۔ ”بس ایسا نہیں کہتے دعا کرو اللہ پاک اُس پچی کو اپنے گھر کا سکون اور خوشیاں عطا کرے اور ہمارے بیٹے کو بھی صبر دے“

”آمین“، خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھتے عابدہ بیگم نے سرجھ کایا۔

ماضی

حبہ کی شادی کو دو ماہ گزر چکے تھے پر زارون خود کو نارمل زندگی میں واپس نہیں لا پایا تھا۔ عابدہ بیگم اور احمد صاحب اپنی طرف سے ہر کوشش کر کے دیکھ چکے تھے مگر وہ کسی کی بات سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا، ایسا احمد صاحب نے معاذ سے بات کی جو تین ماہ پہلے ہی سعودی عرب گیا تھا۔

”ابو آپ زارون کو میرے پاس بھیج دیں میں خود ہی اُسے سمجھالوں گا اور ویسے بھی یہاں رہے گا لوگوں سے ملے گا تو خود ہی دل بھل جائے گا“، معاذ جس کی نئی نئی نوکری ہوئی تھی اور وہ اُسے چھوڑ کر پاکستان نہیں آسکتا تھا اسی لیے اُس نے احمد صاحب کو زارون کو وہاں سمجھنے کا مشورہ دیا۔ ”جی ٹھیک ہے۔ میں کل ہی ویزے کے لیے اپلائی کرتا ہوں آٹھ دس دن میں لگ جائے تو ٹکٹ کنفرم کر کہ تمہارے پاس بھیج دوں گا پرانی الحال تم اُسے فون کرو اور سمجھاؤ کہ خود کو یوں بر بادنہ کرے“، احمد صاحب نے معاذ کی بات سے متفق ہوتے اُسے تاکید کی۔

”جی ٹھیک ہے میں بات کرتا ہوں پتا نہیں کیوں ایک لڑکی کے پیچھے پا گل ہو گیا ہے“، اُن کی بات سنتے معاذ نے تسلی دی اور جلد اُسے اپنے پاس سمجھنے کا کہہ کے کال کاٹ دی۔

احمد صاحب نے کوشش کر کہ چند ہی دنوں میں اُس کا ویزہ لگو اکر عابدہ بیگم کے منع کرنے کے باوجود بھی انہیں سمجھا کے اُسے معاذ کے پاس سعودی عرب بھیجا دیا تھا جہاں کچھ ہی دنوں میں

معاذنے اُسے پیار محبت سے سمجھاتے زندگی کی طرف واپس لانے کی کوشش کی تو زارون نے اپنے دل کا سارا حال کھول کر بیان کر دیتا کہ اُس کی تکلیف کچھ کم ہو۔

”بس زندگی اسی چیز کا نام ہے اور اگر وہ تمہیں نہیں ملی تو اس میں کوئی بہتری ہے۔ اللہ پاک تمہیں اس نعمت کے چھین جانے کے بد لے اس سے بھی بہترین عطا کرے گا تو کیوں مایوس ہو کر خود کو بر باد کر رہے ہو۔ امی ابو کی ہی طرف دیکھو جن کی جان اٹکی ہوئی ہے تم میں“، معاذنے موقع ملتے ہی اُسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

”مجھے پتا ہے امی ابو میری وجہ سے پریشان ہیں پر میں کیا کروں؟؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا کہ بے سکونی کی کیفیت میرے دل و دماغ پہ حاوی ہو رہی ہے جسے میں چاہ کر بھی خود سے الگ نہیں کر پا رہا۔ مجھے لگتا ہے ایک انسان کے کھو جانے سے میں باقی رشتہ اور محبتوں سے بھی باغی ہو گیا ہوں۔ مجھے نہ تو امی کے آنسو نظر آتے ہیں نہ ابو کی فکر“، اُس کے ساتھ لگتے زارون نے بے بسی سے کہا تو معاذنے کسی چھوٹے بچے کی طرح اُسے ایک نئے سرے سے سمجھانا شروع کیا۔

”بے سکونی انسان اپنے اندر خود پیدا کرتا ہے کیونکہ وہ یہ سوچنے کی بجائے کہ اس چیز کے نہ ملنے میں کیا بہتری تھی؟ اللہ سے شکوئے شکایت شروع کر دیتا ہے جو اللہ کو ناپسند ہے اس لیے ہمیشہ صبر کرنا سیکھو زندگی میں بڑی بڑی باتیں ہو جاتیں ہے اپنے قربی رشتہ ہمیشہ کے لیے چھن جاتے

ہیں تو کیا ب انسان اُن کے ساتھ ہی قبر میں دفن ہو جائے؟ نہیں ناہم صبر کرتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہمیں صبر کی طاقت دیتا ہے کیونکہ وہ اپنے بندے کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا اور اللہ پاک تمہیں بھی ہمت دے گا بس تم یہ یقین رکھو کہ جو ہوا وہ بہتر تھا اور جو ہو گا وہ تمہارے حق میں بہترین ہو گا اور یہ بڑکیوں کی طرح آنسو بہانہ بند کرو اور اُٹھو تمہاری بے سکونی کا علاج تو میں ابھی کر دوں گا،“ معاذ نے کمپنی جانے کا ارادہ ترک کرتے زارون کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ چہرہ صاف کرتے ناممتحنی سے اُس کی جانب دیکھنے لگا جو بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کا بہت اچھادوست بھی تھا۔

”کہیں جانا ہے؟“

”ہاں..“

”کہاں؟“

”بس تم اُٹھو تمہیں سکون چاہیے نا تو میں آج تمہیں ایک پر سکون جگہ پہ لے کر جاتا ہوں،“ اُس کا ہاتھ پکڑ کر خود ہی کھڑا کرتے معاذ نے تجسس برقرار رکھا تو زارون پانچ منٹ کا بولتے کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔

## ماضی

تقریباً پانچ گھنٹے کا طویل سفر طے کرنے کے بعد معاذ نے اُسے اُترنے کا کہا تو زارون نے باہر قدم رکھنے سے پہلے اُس جگہ کو سانس روکے دیکھا۔

”مجھے لگتا ہے دنیا کا سارا سکون سیمٹ کر بس اس ایک جگہ میں آکر آباد ہو گیا جہاں سے کوئی بھی خالی ہاتھ لوٹایا نہیں جاتا۔ مجھے امید ہے کہ تم میری بات سے اتفاق کرو گے“، گاڑی سے نکل کر اُس کی طرف کا دروازہ کھول کے معاذ نے اُسے ساکت بیٹھا دیکھ کر چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ سجائے اپنی بات مکمل کی تو زارون نے بے یقینی کی سی کیفیت میں اُسے دیکھا۔

”چلیں؟“، اپنی مسکراہٹ برقرار رکھتے وہ زارون کی دلی کیفیت سمجھ سکتا تھا تب ہی خود ہی اُس کا ہاتھ تھامتے اُسے گاڑی سے باہر نکلا جس کی نظریں ان درود یوار پر جم سی گئی تھیں۔

”چلواب رک کیوں گئے؟“، کچھ دور جاتے معاذ نے اُسے پھر سے رکنا دیکھ کر کہا۔

”نهیں...“، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسکا ہاتھ تھامتے زارون نے انکار کیا۔

”کیوں؟“، اُس کے انکار پر معاذ نے تعجب سے پوچھا۔

”بس میں اس قابل نہیں ہوں“، ادب سے نظریں جھکاتے زارون کے آنسو بے اختیار ہی آنکھوں کے بند توڑ چکے تھے۔ ”تم کس قابل ہو اس کا اندازہ تمہیں خود کو اس جگہ پا کر ہو جانا چاہیے کہ

تمہاری اتنی سی تکلیف پر اللہ پاک نے تمہیں اُس ہستی کے پاس پہنچا دیا ہے جو دو جہانوں کی دل جوئی کرنے والے ہیں تو بس چلو اندر یہ سوچ کے اللہ پاک نے تمہیں تمہاری تکلیف کا بہترین صلہ عطا کر دیا ہے، مسکراتے ہوئے معاذ اُسے اپنے ساتھ لیے اندر داخل ہوا جہاں سبز گنبد پر نظر پڑتے ہی زارون کو اپنے اندر تک سکون اُترتا محسوس ہوا اور وہ وہیں صحن میں بیٹھتے زار و قطار رونے لگا تو معاذ بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا تاکہ وہ اپنادل ہلاک کر سکے۔  
کچھ دیر رونے کے بعد جب زارون کا دل ہلاک ہوا تو اُس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔

”اے اللہ میں شکر ادا کرتا ہوں آپ کی اس عنایت پر جو آپ نے میری ذرا سی تکلیف کے بد لے مجھے عطا کی اور میں شر مند ہوں اپنے عمل پر اپنے الفاظ میں جو میں نے ایک انسان کے نامنے پر شکوہ کی صورت آپ سے کیے، بے شک میں ایک نافرمان انسان ہوں بے حد گناہ گار پر آج آپ کے محبوب کے درپر بیٹھا میں آپ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتا ہوں۔ میں نے اپنے ماں باپ کا دل دکھایا اُنہیں اپنے رویے سے تکلیف دی جو میں دینا نہیں چاہتا تھا۔ اے اللہ مجھے معاف کر دے اپنے حسیب کے صدقے مجھے معاف کر دے“، اپنا چہرہ واپس ہاتھوں کے پیالے میں چھپائے وہ ایک بار پھر سے رونے لگا تو معاذ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”نماز کا وقت ہو گیا ہے اٹھواند رچلتے ہیں“، اذان کی آواز آتے ہی اُس نے زارون سے کھا جو ہاتھ سے اپنا چہرہ صاف کرتے اٹھ کر اُس کے ساتھ ہی وضو کرنے چلا گیا۔

---

نماز ادا کرنے کے بعد زارون کا دل و دماغ بالکل ہلاک ہو چکا تھا اور بے سکونی کی کیفیت جو کچھ مہینوں سے اُس کے دل و دماغ پہ طاری تھی اک دم سے سکون میں بدل چکی تھی تب ہی اُس نے معاذ سے وہاں موجود ہر چیز کی زیارت کی خواہش کی تو معاذ نے اُسے ساتھ لیے ہر جگہ کی زیارت کروائی اور ہر مقام کے بارے میں بتاتے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ رات گئے تک وہ دونوں مسجد نبوی میں رہے اور پھر صحیح فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد واپس روانہ ہوئے کیونکہ معاذ کی ایک اہم مینگ کی وجہ سے اُس کا آفس جانا ضروری تھا۔

زارون مزید دس دن معاذ کے پاس رہا اور پھر پاکستان واپس آگیا کیونکہ پہلے ہی وہ اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اپنے دوسال کی پڑھائی کو سمسٹر فریز نہ کروانے کی وجہ سے ضائع کر چکا تھا پر اب وہ مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے اپنی زندگی کی طرف واپس جانا چاہتا تھا تب ہی اُس نے آتے ہی دوبارہ

---

سے اپنا ایڈ میشن کروا یا اور باقاعدگی سے یونیورسٹی جانے لگا جہاں ارحم کی صورت میں بنانے والے دوست نے اُس کی زندگی کی ہر کمی کو پورا کر دیا تھا۔

ارحم کو کمرے سے نکالنے کے بعد زارون نے اپنے سارے کپڑے تہہ کر کہ الماری میں سیٹ کیے اور باقی چیزیں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھنے کے بعد بیڈ شیٹ تبدیل کر کے فریش ہونے چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہ فریش ہو کر باہر نکلا تو نسرین نے اُس کے دروازے پر دستک دی۔

”صاحب جی بیگم صاحبہ آپ کو ناشتے کے لیے نیچے بُلار ہی ہیں“، دستک دینے کے ساتھ ہی اُس نے آواز لگائی۔

”آرہا ہوں“، برش سے اپنے بال سیٹ کرتے زارون نے اندر سے ہی جواب دیا جسے سنتے ہی وہ نیچے چلی گئی۔

”السلام علیکم“، کچن میں داخل ہوتے اُس نے سامنے بیٹھے ارحم کو ایک گھوری سے نوازتے اپنارخ عابدہ بیگم کی جانب کیا جو بریانی کو دم دینے میں مصروف تھیں۔

”کیسی ہیں آپ؟“، اُن کے کندھے پر تھوڑی ٹکاتے زارون نے لاڈ سے پوچھا۔

”وعلیکم السلام، میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟ اور سفر کیسار ہا؟“ اپنا کام مکمل کرتے ہی انہوں نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”جی ٹھیک ہوں۔ سفر بھی اچھا رہا اور یہ نمونہ بھی تک پہنچا ہے،“ کرسی پیچھے کر کے بیٹھتے زارون نے اُسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی جو اپنی ناراضی کے اظہار کے لیے بظاہر خود کو مصروف ظاہر کرنے کے لیے موبائل میں گیم کھیل رہا تھا۔

”زارون بد تمیزی نہ کرو،“ نمونہ کا لفظ سنتے ہی عابدہ بیگم نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”ویسے کیا تمہیں اپنے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ملتا جو میرے گھر آتے ہی میری امی سے فرمائشی پروگرام شروع کر دیتے ہو،“ تھوڑا آگے ہو کر اُس کی جانب جھکتے زارون کو اُس کا خاموش بیٹھنا کچھ ہضم نہیں ہوا۔

”سب ملتا ہے پر تمہاری طرح ماں کے ہاتھ کا نہیں،“ موبائل سے نظریں ہٹاتے ارحم نے عابدہ بیگم کو جذباتی کرنے کے لیے اپنی آواز کو حتی الامکان اونچار کھاتا تو اُس کی چال سمجھتے ہی زارون نے جلدی سے پیچھے ہو کر بیٹھا۔

”زارون کیوں تنگ کر رہے ہو تم ارحام کو اور بنائکر میں دیتی ہوں تم نہیں جو اتنا چھل رہے ہو“، ارحام کی آنکھوں میں ادا سی دیکھ کر عابدہ بیگم نے زارون کی کلاس لی جو بس ماتھے پر بل ڈالتے پچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

”آنٹی دیکھیں زارون مجھے کیسے گھور رہا ہے۔ صحیح بھی اس نے دھکے مار کے مجھے اپنے کمرے سے نکالا تھا اور میری اتنی بے عزتی کی پھر بھی میں آپ کے صرف ایک بار کہنے سے رک گیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی بد تمیزیوں کی وجہ سے اپنی پیاری آنٹی کا دل توڑتا“، ارحام نے عابدہ بیگم کو اپنی سائبین پر دیکھ کر زارون کو مزید تپایا۔

”زارون شرم کرو کوئی گھر آئے مہمان کے ساتھ ایسا کرتا ہے کیا۔ کیوں نکالا تم نے ارحام کو اپنے کمرے سے؟“ اس کا کان پکڑتے عابدہ بیگم نے اُس کی خبر لی جو ارحام کی چالاکی پر ہکابکا سا بیٹھا تھا۔ ”امی آپ بھی کس کی باتوں میں آرہی ہیں۔ یہ سارے ڈرامے ہیں اس کے اور تم میری ماں پر حق جمانے کی کوشش مت کرو“، اپنا کان چھڑواتے زارون نے اُسے تنبیہ کی جو چہرہ نیچے کیے مسکرا رہا تھا۔

”زارون سوری بولو بھائی سے اور یہ تم کس طرح بات کر رہے ہو شرم نہیں آتی“، عابدہ بیگم نے ایک بار پھر سے اُسے ڈاٹنٹے فرنچ سے دہی نکالا۔

”کس بات کی سوری بولوں؟ میں نہیں بولوں گا“، عابدہ بیگم کے رویے پر افسرده ہوتے زارون نے ارحم کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”اُسی بات کی جو تم نے صحیح صیرے ساتھ کیا پہلے تو مجھے جلی کٹی بتیں سُنائی اور پھر ایک ظالم ساس کی طرح دھکے دے کر اپنے کمرے سے نکال دیا اور میں بچارہ مظلوم باہر کھڑا فریاد کرتا رہا پر تم نے ایک نہیں سنی“، ارحم نے شکوہ کرتے عابدہ بیگم کو مزید غصہ دلایا جواب ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑے اپنا کام کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

”بس کرو، تم اور مظلوم دوالگ الگ باتیں ہیں اور ہاں تمہارے جیسے مظلوم اس دنیا میں دوچار اور آگئے تو میرے جیسے معصوم تو ویسے ہی اپنی امی کی مار کھانے کے لیے رہ جائیں گے“، خفگی سے کہتے زارون نے اٹھ کر فر تج سے جوس کی بوتل نکالی اور واپس اپنی چیسر پر آبیٹھا۔

”ویسے آنٹی آپ کیسی ساس بنیں گی؟“، اپنارخ عابدہ بیگم کی جانب کرتے اُس نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

”مطلوب کیسی ساس بنوں گی؟ میں تو پہلے سے ہی ساس بن چکی ہوں وہ بھی دودو بہوؤں کی“، ارحم کے سوال پر مسکراتے ہوئے انہوں نے یاد دہانی کروائی۔

”نہیں میرا مطلب تھا کہ زارون کی بیوی کے لیے آپ کسی ساس بنیں گی؟؟ بقول جنید اور مزمول بھائی کے زارون کی طرح وہ بھی آپ کی چمچی ہو گی نا؟“، ارحم نے تفصیل سے اپنی بات انہیں سمجھائی تو زارون نے با مشکل جوس گلے سے نیچے اٹا را۔

”میں تمہیں چمچے لگتا ہوں؟“

”چمچے مطلب لاڈلا ہوتا ہے اس لیے مجھ سے زیادہ لڑنے کی ضرورت نہیں ہے اور ویسے بھی میں بس اپنی معلومات میں اضافہ کر رہا ہوں کہ تمہارا مستقبل آگے جا کر کیسا ہوا گا“، لاپرواں سے وضاحت دیتے ارحم نے کندھے اچکائے۔

”اچھا بس کرو اب تم دونوں لڑنا اور زارون تم اٹھو اور چوکیدار سے بول کے آؤ کے دودھ والے سے آج دو کلو دودھ زیادہ لے لے“، عابدہ بیگم نے برتن اُس کے ہاتھ میں تھما تے ہوئے حکم دیا۔ ”بس یہ ایک کام رہ گیا تھا وہ بھی کروالیں“، منه میں بڑھاتے وہ باہر کی جانب بڑھا تو ارحم اپنے مو بائل کی جانب متوجہ ہوا۔

”ارحم تمہاری منگنی کی ڈیٹ فائل ہو گئی ہے یا نہیں؟“، برتن نکال کر ٹیبل پر رکھتے عابدہ بیگم نے اُس سے سوال کیا۔

”پتا نہیں آنٹی ابھی تو امی ابو کل جائیں گے رابعہ کے گھر پھر ہی کچھ فائل ہو گا“، رابعہ کو گڈ مارنگ کا مسج سینڈ کرتے اُس نے جواب دیا۔

”اچھا چلو اللہ بہتر کرے گا“، ٹرے میں چاول نکالنے اُنہوں نے نسرین کو آواز لگائی جو کب سے باہر مالی کو لان کی صفائی اچھے سے کرنے کا کہنے کے لیے گئی تھی۔

”لائیں آنٹی میں رکھ دیتا ہوں“، ان کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ارحمنے مدد کی پیشکش کی۔

”نہیں، پیٹا تم بیٹھو میں کر لوں گی“

”پیٹا بھی کہتی ہیں اور مدد بھی کرنے نہیں دے رہیں“، گلاس ٹیبل پر رکھتے ارحمنے شکوہ کیا تو عابدہ بیگم نے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے زارون کو آواز لگائی۔

”جی امی بس آگیا“، کچن میں داخل ہو کر اُس نے دودھ سلیپ پر رکھا۔

”اچھا بیٹھو تم لوگ کھانا کھاؤ میں ذرا نسرین کو دیکھ کر آتی ہوں“، اُس کے آتے ہی عابدہ بیگم نے کہا اور باہر کی جانب بڑھیں۔

”آجاویا مجھے تو بہت بھوک لگی ہے“، لمبا سانس لیتے ارحمنے بریانی کی خوشبو اپنے اندر اُترتے زارون کو جلدی کرنے کا کہا جو ہاتھ دھورا تھا۔

”ہاں بس آگیا ہوں چلو ہو جاؤ شروع بلکہ ٹوٹ پڑو کھانے پہ“، زارون نے کرسی پر بیٹھتے ہی اُسے شرمندہ کیا۔

”ہاں میں نے پہلی بار کھانا دیکھا ہے ناجوٹ ٹوٹ پڑوں اور حد ہوتی ہے پتا نہیں صحیح سے کس منحوس ساس کی روح تمہارے اندر آئی ہے جو میری بے عزتی ہی کیے جا رہے ہو“، خفگی سے کہتے ارحم نے منہ پھلاایا۔

”خیر ہے تمہیں کون سا محسوس ہونی ہے اس لیے ٹائم ضائع کیے بناء ہی شروع ہو جاؤ“، ہنسی دباتے زارون نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”ہاں تو میں نے محسوس کرنی ہی نہیں کیونکہ بے عزتی جتنی محسوس کریں اُتنی ہی لگتی ہے“، اُس کا ہاتھ جھکستے ارحم نے دانتوں کی نمائش کی اور ایک پلیٹ میں چاول نکال کر زارون کے سامنے کرتے خود ڈش میں ہی شروع ہو گیا۔

”اُفف تم نہیں سُدھر سکتے“، اُسے بے شرموں کی طرح کھاتا دیکھ کر زارون نے آہ بھری۔

”میں سُدھرنا چاہتا بھی نہیں اس لیے تم اس بات کے لیے اپنے چھوٹے سے دماغ پر زور دینے کی بجائے کھانے پر زور دو“، ایک سینڈ کے لیے ہاتھ روک کر ارحم نے اُسے جواب دیا اور کھانے کا اشارہ کرتے پھر سے اپنی ڈش کی جانب متوجہ ہوا۔

”آپ کل بھی چھٹی ہے آپ کی؟“ رضانے بیزاری سے فرش پر جھاڑو لگاتے ہوئے سوال کیا۔

”کل ہے تو چھٹی پر مجھے لا بسیری سے کچھ بکس لینی ہیں اس لیے جانا پڑے گا پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“ اُس کی بات کا جواب دیتے نور نے فرش پر پانی گراتے سوال کیا۔ ”ویسے ہی پوچھا ہے تاکہ مجھے پتا چل سکے کہ کل میرے مستقبل میں کیا بننا لکھا ہے“، ہاتھ روکے رضانے پر سوچ انداز میں کہتے تجسس برقرار رکھا۔

”کیا مطلب، کیا بننا لکھا ہے؟“ نور نے رضا کی بات پر ناٹھی سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا جواب دل و جان سے جھاڑو کو بیٹ بنائے فرش پر موجود پانی کے شارت لگانے میں مصروف تھا۔

”دیکھیں، آج صبح سے ہی میں ایک کام والی ماں بناؤ ہوں اس لیے سوچ رہا تھا کہ کل بھی اگر آپ کی چھٹی ہوئی تو آپ مجھے کیا بنائیں گی؟“، کمر پر ہاتھ رکھتے اب وہ سیدھا کھڑا ہو کر سوچنے لگا تو نور نے مزید پانی گراتے اُسے جھاڑو پھیرنے کا اشارہ کیا۔

”کل تمہارے مقدر میں صح کے ٹائم مالی اور گیارہ بجے کے قریب میرے ڈرائیور کے فرانٹ سر ان جام دینا لکھا ہے اس لیے اب اپنے نازک دماغ پر بوجھ دینے کی بجائے کام پر دھیان دو“، نور نے پانی کا ڈبہ بھر کر اُس کے سر پہ ڈالا جوا بھی تک جھاڑ و پکڑ کر سوچنے کی ایکنگ کر رہا تھا۔

”آہ نور آپی پانی کیوں ڈالا، اللہ کتنا محنڈا ہے“، رضانے جھر جھری لیتے اُسے دیکھا جواب اپنی کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی اُس کی حالت دیکھ کر مسکرار ہی تھی۔

”اللہ کہاں پھنسا دیا مجھے؟ اچھا بھلا میں نے آنٹی راحیلہ کے گھر پیدا ہو جانا تھا پر نہیں، مامانے دعائیں مانگ مانگ کر مجھے اس چڑیل کے پلے پڑا دیا“، رضانے اُس کی مسکراہٹ پر کڑھتے ہوئے خود کلامی کی۔

”تمہیں کیسے پتا کہ تم نے آنٹی راحیلہ کے گھر پیدا ہونا تھا؟ نور نے رضا کی بات سُننے ہی سنجدگی سے پوری آنکھیں کھولے جیرت سے پوچھا۔

”آپی کیا سانپ کے کان ہیں آپ کے؟ جو میری خود سے کی گئی بات بھی آپ کو سُنائی دے رہی ہے؟“، رضانے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری خود کلامی کسی اعلان سے کم نہیں تھی جو مجھے سننے کے لیے سانپ کے کانوں کی ضرورت پڑتی“، پھر سے ڈبہ بھرتے نور نے اُس کی طرف اچھا لاجو بروقت رضا کے پیچھے ہونے پر اُس کی بجائے سامنے موجود دیوار کو گیلا کر گیا۔

”اچھا آپی بس کریں غصہ کیوں کر رہی ہیں میں تو مذاق کر رہا تھا مجھے لگا کہ شامد آپ کے پاس لوگوں کے دماغوں میں چلنے والی باتیں جاننے کی طاقت ہے جو آپ نے اتنی آسانی نے میری بات سن لی پر سمجھ آپ کو پھر بھی نہیں آئی۔ بے فکر ہیں میں آپ کو تفصیل سے سمجھتا ہوں“، جھاڑ وہا تھی میں ہی پکڑے رضانے سنجیدگی سے کہتے سب سے پہلے اُس کے ہاتھ سے ڈبہ پکڑتا کہ وہ پھر سے اُسے پانی سے بھر کر اُس کے اوپر نہ ڈالے۔

”اچھا تو آپ پوچھ رہی تھیں کہ مجھے کیسے پتا چلا کہ میں نے آنٹی راحیلہ کے گھر پیدا ہونا تھا؟“، جھاڑ و بازو میں دبائے رضانے کسی استاد کی طرح نور کا سوال دھرا یا جواب پوری طرح اُس کی جانب متوجہ تھی۔

”ہاں یہی پوچھ رہی تھی“، دوپٹہ کھول کر اوڑھتے ہوئے نور نے ٹل بند کیا اور اپنے جھولے پر جا کر بیٹھ گئی تو رضا بھی اس پہلو پر سوچ بچار کرتے اُس کے قریب آیا۔

”دیکھیں آپی آنٹی راحیلہ کی ییٹیاں کتنی خوبصورت، سمجھدار اور خوش مزاج ہیں اور ان کے ہاتھ کے بنے کھانے ہائے ہائے اتنا ذائقہ ہے کہ نہ پوچھیں“، رضا نے باقاعدہ منہ میں پانی لاتے ان کی تعریف کی۔

”ہاں وہ تو ہے پران سب باتوں کا تمہارے ان کے گھر پیدا ہونے سے کیا تعلق ہے؟“ اس کی بات کی تائید کرتے نور نے سمجھی سے پوچھا۔

”تعلق ہے نا بہت گہرا تعلق ہے“، جھاڑو نیچے زمین پر رکھتے اس نے پیچھے جاتے نور کو جھولادینے تجسس قائم رکھا۔ ”اچھا وہ کیسے؟“ سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھتے نور نے جاننا چاہا تو رضا جھولارو کتے اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

”وہ ایسے کہ مجھے ذرا غور سے دیکھیں میں بھی ان کی ہی طرح خوبصورت، لاکن، سمجھدار اور نرم دل انسان ہوں جس کا آپ جیسی ظالم، کھڑوس، ہر وقت حکم چلانے والی ڈائیکٹ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں بنتا تھا پر افسوس ماما کی دعائیں رنگ لے آئیں اور فرشتے نے مجھے ساتھ والے گھر کی بجائے یہاں اُنار دیا“، رضا نے افسردہ سامنہ بناتے اپنی بات مکمل کی اور نور کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے ہی گیلے کپڑوں کی پرواکیے بناء باہر کی جانب دوڑ لگادی۔

”رک جاؤ رضا میں تمہیں ڈائن لگتی ہوں“، زمین پہ پڑا جھاڑ و اٹھاتے وہ اُس کے پیچھے بھاگی تو رضا نے ایک دم سے بریک لگائی۔

”آپ....“ نور کو رکنے کا اشارہ کرتے رضا نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے اپنی سانس ہموار کرنے کی کوشش کی۔

”کیا ہوا تم ٹھیک ہونا؟“ نور کو گاکہ اُس کی طبیعت خراب ہے جب ہی جلدی سے جھاڑ و پھینک کے اُس کی جانب بڑھی۔

”میں ٹھیک ہوں بس یہ بتانا تھا کہ آپ ڈائن نہیں ہیں“، ویسے ہی تیز تیز سانس لیتے اُس نے اپنی بات کو جاری رکھا

”تو....“

”تو آپ چڑیل ہیں وہ بھی خون پینے والی ظالم چڑیل جسے اللہ نے کوہ قاف میں اُتارنے کی بجائے ہمارے گھر اُتار دیا“، اُس کی فکر مندی کافائدہ اٹھاتے اُس نے جلدی سے اپنی بات پوری کی اور جب تک نور کو سمجھ آتی اور وہ کوئی رد عمل ظاہر کرتی رضاد و چھلانگیں مارتا ہوا گیٹ سے باہر نکل چکا تھا۔

”تم ذرا واپس گھر آؤ پھر میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میں خون پینے والی چڑیلیں ہوں یا جوتے پڑوانے والی“، دانت پسیتے نور نے غصے اور دکھ سے آنکھوں میں آنے والی نمی کو صاف کیا اور پاؤں پٹختے لا دُنج میں آئی تاکہ نائلہ بیگم کو فون کر کے والپس آنے کا پوچھ سکے جو صحیح سے اپنی بہن کے گھر گئی ہوئی تھی۔

---

”آپ آپ کتابیں ایشو کروالیں میں ایک گھنٹے تک آجائوں گا آپ کو لینے کے لیے“، رضا نے یونی کے سامنے باسیک روکتے بتایا تو نور نے کوئی جواب دینے یا اس کی طرف دیکھنے کی بجائے اپنے بیگ کندھے پر ڈالا۔

”اپنے دوست کی طرف جا رہا ہوں کچھ کام ہے۔ چلا جاؤں کیا؟“، اس کی چپ پر رضا نے بیزاری سے سوال کیا۔

”چلے جاؤ“، مختصر سا جواب دیتے اس نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا اور گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔

”اللہ جی یہ کیا مسئلہ ہے میرے ساتھ، لوگوں کی گرل فرینڈ ناراض ہو جائیں تو انہیں اتنا دکھ نہیں ہوتا جتنا مجھے اپنی بہن کے ناراض ہونے پر ہورہا ہے“، بائیک کوک مارتے اُس نے نور کو نظر وہ سے اوچھل ہونے تک دیکھا۔

”واپسی پر منالوں گاویسے بھی ان کو منانا کون سا مشکل ہے ایک آئس کریم لے کر دوں گا تو دو منٹ میں مان جائیں گی“، دل میں ارادہ کرتے اُس نے بائیک آگے بڑھا۔

”نور جو کل کی بات پر اُس سے ابھی تک ناراض تھی۔ رضا نے کافی بار اُسے منانے کی کوشش کی پر وہ اُس کی کوئی بھی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوئی۔

”چلا جاؤں دوست کی طرف؟ بڑا آیا مجھ سے اجازت لینے والا“، رضا کی نقل اُتارتے وہ اپنے ڈپارٹمنٹ میں داخل ہوئی اور متلاشی نظر وہ سے اوھراؤ ہر دیکھنے لگی۔

”اب یہ رابعہ کہاں ہے؟“ ایک نظر کلاس میں دیکھتے نور نے خود کلامی کی اور اُسے مسج کرنے کی غرض سے اپنا موبائل نکالا جہاں پہلے سے ہی رابعہ کے یونیورسٹی نہ آنے کا مسج موجود تھا۔

”اففف اسے بھی آج ہی چھٹی کرنی تھی“، موبائل بیگ میں رکھتے اُس کو رابعہ کے ساتھ ساتھ اپنے آپ پہ بھی غصہ آیا۔

”میں گھر ہی موبائل دکھ لیتی کیا ہو جانا تھا اب رضا کو بھی ایک گھنٹے کا وقت دے دیا ہے“، بیز اری سے سوچتے وہ لاہوری کی جانب بڑھی تاکہ کتابیں ایشو کروا سکے۔

”آج کادن ہی خراب ہے، پہلے رضا سے بات نہیں کی اور اب رابع بھی نہیں آئی“، نور نے چلتے ہوئے خود کلامی کی اور اپنی ہی دھن میں چلتے سامنے سے آتے شخص سے ٹکرائی جو شائد اس سے بھی زیادہ جلدی میں تھا۔

”ہائے اللہ میرا پاؤں“، اُسے پچھے کی جانب دھکا دیتے نور نے دبی سی چینماری جوبے دھیانی میں پورا وزن اُس کے پاؤں پہ ڈال کر کھڑا تھا۔

”اندھے ہو کیا؟ اللہ میرا پاؤں توڑ دیا“، زمین پر بیٹھتے اُس نے جوتے سے اپنا پاؤں نکال کر دیکھا جو سرخ ہو چکا تھا۔

”انسان دیکھ کے چل لیتا ہے پر لگتا ہے آپ تو آنکھیں گھر رکھ کے آتے ہیں اور لوہافٹ کروایا ہے کیا اپنے جو توں میں؟“، مقابل کی جانب دیکھے بغیر ہی نور نے صدمے سے اپنے پاؤں کو دیکھا۔

”میں تو صرف اپنی آنکھیں ہی گھر رکھ کر آتا ہوں پر شائد مس نور آپ اپنا دماغ بھی گھر رکھ آتی ہیں جو اپنے آپ سے باتیں کرتے یہ دھیان ہی نہیں رکھتیں کہ سامنے سے کوئی اور بھی آرہا ہے“، زارون

جولا نبیری سے کتاب ایشو کرواتے جلدی میں وہاں سے نکل رہا تھا بے دھیانی میں اُسے گرنے سے بچاتے اُس کے پاؤں پہ چڑھ گیا۔

”ہونہ، میں کیسے بھول گئی کہ مجھے آپ کے علاوہ کوئی تکلیف نہیں دے سکتا“، اُس کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھتے نورنے خفگی سے کہا۔

”ہاں میری توس سال پرانی دشمنی ہے تم سے جو میں تمہیں جان بوجھ کے تکلیف دوں گا اور ہاں انسان کا اپنا دماغ کام نہ کرتا ہو تو دوسروں کو الزام نہیں دیتے“

”میں الزام نہیں دے رہی بلکہ آپ نے جان بوجھ کر میرے پاؤں پہ پاؤں رکھا ہے“، اُس کی بات کا ٹھنڈنے غصے سے کہا۔

”میں نے جان بوجھ کر نہیں رکھا اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھ پہ اس قسم کا گھٹیا الزام نہ لگاؤ“، انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتے وہ آگے بڑھا۔

”میں کوئی الزام نہیں لگا رہی آپ نے مجھ سے بدله لیا ہے ٹرپ والے دن کا اور اللہ نے جو اتنی بڑی بڑی آنکھیں دی ہیں نا وہ دیکھنے کے لیے ہی دی ہیں پر نہ تو آپ کو نظر آتا ہے اور نہ ہی محسوس“، درد کی شدت سے آنے والے اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے کی کوشش میں اُس کی آواز بھاری ہوئی تو زارون نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا جواب سرجھ کائے بیٹھی تھی۔

”میں نے کہا نامیں نے کوئی بدلہ نہیں لیا ہے اور ہاں تم بھی تو دیکھ کے چل سکتی ہو نا آنکھیں تو تمہاری بھی اتنی بڑی ہیں پر خود ہوا کے گھوڑے پر سوار تھیں اور اب ساری بات مجھ پر ڈالتے تب سے مجھے باتیں سُنائی جا رہی ہو۔ عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے تم میں“، اس کی بات سنتے ہی زارون نے حساب برابر کیا اور اس کے قریب ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

”اچھا برونا بند کرو اور دکھاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟ زیادہ درد ہو رہا ہے کیا؟“، ایک لمبا سانس لیتے زارون نے اپنے غصے کو کم کرتے اس سے سوال کیا جواب اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر رونے میں مصروف تھی۔

”جانکیں آپ، کچھ نہیں ہوا مجھے اور ہاں اگر میں مر بھی رہی ہوں ناتب بھی آپ جیسے بد تمیز انسان کی مدد نہ لوں۔ یہ تو پھر ایک معمولی سی چوٹ ہے“، پلکیں اٹھاتے اس نے پانیوں سے بھری آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا جو اس کی نفرت کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

”اچھا جب مرو گی تب مدد نہ لینا پرا بھی تو پاؤں آگے کرو مجھے دیکھنے دو کہ کیا ہوا ہے“، اس کے غصہ کی پرواکیے بغیر زارون نے نرمی سے کہا۔

”میں نے کہا ناجانکیں آپ..“، ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتے نور نے اپنی ناراضی برقرار رکھی۔

”نوراب تم ضد نہ کرو اور شرافت سے پاؤں آگے کرو ورنہ...“

”ورنہ کیا؟ ماریں گے مجھے؟ غصہ کریں گے تو کر لیں میں ڈرتی نہیں ہوں“، اُس کی دھمکی پر ڈرے بغیر نور نے بہادری کا مظاہرہ کیا۔

”مارنے اور غصہ کرنے کے لیے انسان کو کسی نہ کسی رشتہ کی ضرورت ہوتی ہے اور آپ کے ساتھ تو میں تاقیامت کوئی رشتہ نہ بناؤں“، اُس کی ضدی سے تنگ آتے زارون نے خود ہی اُس کا پاؤں اپنے ہاتھ میں پکڑا۔

”چھوڑیں مجھے میں کہہ رہی ہوں نا...“

”نور پلیز خاموش ہو جاؤ“، زارون نے پاس سے گزرتے اسٹوڈنٹس کی وجہ سے اُسے شور کرنے سے روکا جو نور کو تو نہیں پر اُسے اپھے سے جانتے اور پہنچانتے تھے۔

”نہیں ہوں گی چپ میں، چھوڑیں میرا پاؤں“، اس کا ہاتھ ہٹاتے نور نے غصے سے اوپھی آواز میں چلاتے ہوئے کہا تو زارون نے سب لوگوں کی نظریں خود پر مرکوز دیکھ کر شرمندگی کے مارے زور سے اُس کا پاؤں چھوڑا تو نور نے درد سے چیختے پھر سے رونا شروع کر دیا۔

”نور پلیز بس کرو اور اٹھو یہاں سے“، اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی زارون نے جانے کی بجائے اُسے چپ کروانے کی کوشش کی تو بہت سے لوگوں کی آنکھیں اُسے ایک لڑکی کے پاس بیٹھے اُسے

خاموش کروانا دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ ان چار سالوں میں پہلی بار وہ یوں کسی لڑکی کے پاس بیٹھا یوں اُس کی فکر کر رہا تھا۔

”میں نہیں اٹھوں گی اور کیا کر لیں گے آپ، زبردستی اٹھا کر لے جائیں گے کیا“، اُس کی حرکت پر غصہ ہوتے نور نے اپنی ضد برقرار رکھی۔

”ہاں بالکل میں تمہیں یہاں سے اٹھا کر سیدھا لے جا کر نہر میں پھینک دوں گا جہاں سے دوبارہ تم کبھی نہ ملو“، اب کی بار اُس نے اس نک چڑھی لڑکی کو گھور کر دیکھتے دھمکی دی اور اُس کا بیگ اور نوٹس اٹھانے لگا جو وہ اپنے ادر گرد پھیلائے بیٹھی تھی۔

”میں خود جا سکتی ہوں“، اُس کی دھمکی سنتے ہی نور نے دیوار کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے پاس سے گزرتے دو لڑکوں کو گھورا جو اُس کی طرف دیکھ کر مسکرار ہے تھے۔

”دیں میرا بیگ“، جھپٹنے والے انداز میں اُس کے ہاتھ سے بیگ لیتے وہ دیوار کے سہارا ہی دو قدم آگے بڑھی اور پھر سے بیٹھ گئی کیونکہ درد کی وجہ سے اُس کے پاؤں پہ وزن نہیں آ رہا تھا۔

”جب چلا نہیں جا رہا تو اتنی بہادر کیوں بن رہی ہو“، ایک دوبار اُسے ایسے ہی دو قدم چل کے بیٹھتا دیکھ کر زارون نے قریب آتے کہا اور پھر سے اُس کا پاؤں اپنے ہاتھ میں پکڑتے جائزہ لینے لگا جواب سونج چکا تھا۔

”یہ تو سوچ گیا ہے“، اُس کی جانب دیکھتے زارون نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”تو کیا نہ سوچتا تو بہ پتا نہیں کس بات کا بدلہ لیا آپ نے مجھ سے“، آنسو صاف کرتے جو درد کی وجہ سے بار بار رخساروں پر بہہ رہے تھے نور نے اُسے شرمندہ کرنا لازمی سمجھا۔

”افففف کتنی زبان چلتی ہے آپ کی پلیزاب چپ کر جائیں اور چلیں وہاں پیش پر بیٹھیں“، پاؤں چھوڑ کر زارون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا جسے کچھ سیکنڈز سوچنے کے بعد نور نے تھام لیا۔ سہارا دیتے وہ اُسے کچھ ہی فاصلہ پر موجود پیش تک لا یا۔

”ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟“، اُس کے چہرے پر درد کے آثار دیکھ کر زارون نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں آپ جائیں۔ میں اپنے بھائی کو کال کر دیتی ہوں وہ پاس ہی اپنے دوست کی طرف گیا ہے“، اپنے بیگ سے موبائل نکالتے نور نے نرمی سے کہا تو زارون کو یقین ہو گیا کہ اُسے زیادہ چوت آئی ہے ورنہ اتنے آرام سے تو وہ کبھی بھی اُس سے بات نہیں کرتی۔

”السلام علیکم رضا مجھے ابھی یونی لینے آجائے میرے پاؤں پر چوت لگی ہے مجھ سے چلانہیں جا رہا“، نمبر ڈائل کرتے اُس نے نم آواز میں کہا۔

”جلدی آجانا“، دوسری جانب جواب سنتے ہی اُس نے تاکید اور فون بند کیا۔

”اویں گیٹ تک چھوڑ دیتا ہوں“، اُس کے کال بند کرتے ہی زارون نے ہمدری سے پیشکش کی۔  
 ”نہیں میں چلی جاؤں گی آپ نے جتنی مدد کی ہے اُس کے لیے آپ کا شکر یہ“، اُس کی جانب دیکھے بغیر ہی نور نے موبائل بیگ میں رکھا اور متلاشی نظرؤں سے ادھر ادھر دیکھا جہاں اپنی ایک کلاس فیلو کو دیکھتے ہی اُس نے آواز لگائی اور زارون کو وہیں کھڑا چھوڑ کر اُس کے سہارے چلتے گیٹ کی جانب بڑھی۔

”آپ کیا ہوا؟ کیسے لگی ہے یہ چوت؟“، رضا جو اگلے پانچ منٹ میں یونیورسٹی کے گیٹ کے سامنے تھا اُس نے نور کو لنگڑا کے چلتادیکھ کر جلدی سے باسیک سے اُتر کر اُس کا ہاتھ تھاما۔  
 ”کچھ نہیں ہوا بس تھوڑی سی ہی لگی ہے“، نور نے اُسے پریشان دیکھ کر تسلی دی۔  
 ”یہ تھوڑی سی ہے؟ آپ کا سارا پاؤں سو جا ہوا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں بس تھوڑی سی ہے“، رضا نے اُس کے پاؤں کی طرف اشارہ کرتے اُس کی بات کی تردید کی۔

”اچھا بزیادہ بتیں ناکرو اور گھر چلو مجھے درد ہو رہا ہے“، نور نے اپنی آنکھوں میں آئے آنسو صاف کیے اور اُس کا ہاتھ چھوڑا تو رضا نے اثبات میں سر ہلاتے بائیک پر بیٹھتے اُسے اسٹارٹ کرتے نور کی بیٹھنے میں مدد کی۔

”ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس جائیں گے پھر گھر“، اُس کے ٹھیک سے بیٹھتے ہی رضا نے بائیک آگے بڑھائی۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گی ڈاکٹر کے پاس وہ میری آنس کریم، چاکلیٹ، گول گپے سب بند کر دے گا“، نور نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ڈاکٹر کا نام سنتے ہی رونا دھونا بھولتے جواب دیا۔

”آپی چوت آپ کو پاؤں پہ آئی ہے نہ کہ گلے پہ جو ڈاکٹر آپ کا کھانا پینا بند کر دے“، رضا نے بائیک کی اسپیڈ آہستہ کرتے یاد دہانی کروائی۔

”تمہیں نہیں پتار ضایہ ڈاکٹر بہت چالاک ہوتے ہیں چوت کہیں بھی آئے پر وہ پیٹ یا گلے سے کنکشن بناتے کھانا پینا بند کر دیتے ہیں“، نور نے منہ بناتے ہوئے خود کو صحیح ثابت کرنے کے لیے تمہید باندھی۔

”اچھا وہ کیسے آپی؟“، رضا نے اُسے باتوں میں لگاتے تجسس سے سوال کیا تاکہ وہ کچھ دیر کے لیے اپنے درد کے بارے میں بھول کر اُسے اپنی نایاب تحقیق سے آگاہ کر سکے۔

”دیکھو اب میرے پاؤں پہ چوت آئی ہے ناپڑا کٹرنے اس کا لکنشن کہیں ناکہیں میرے گلے سے جوڑ دینا ہے“

”وہ کیسے؟“ رضانے بہن کی سائنس پر ہنسی دباتے تجسس سے پوچھا۔

”وہ ایسے کے پہلے توڈا کٹر صاحب کہیں گے کہ مس نور آپ کے پاؤں کی ویز سیدھی آپ کے دماغ کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اس لیے چوت کی وجہ سے آپ کے دماغ پہ بھی تھوڑا اثر ہوا ہے۔ جس نے بروقت آپ کو چیخنے سے نہیں روکا اور جب آپ چوت کے صدمے سے اوپنجی آواز میں چلائی تھیں تو آپ کے گلے کی ویز کو شدید نقصان پہنچا ہے اس لیے آپ کی آلس کریم، گول گپے بند ہیں اب بس آپ اپنے دل اور دماغ کے ٹیسٹ کرو کے مجھے چیک کروائیں کیونکہ مجھے آپ کا کیس بہت سیر میں لگ رہا ہے“، نور نے ایک ہی سانس میں ڈاکٹر کی نقل اُتارتے ہوئے اپنے پاؤں کی چوت کا گلے کے ساتھ ایسا لکنشن کیا کہ رضا اسے داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ ”واہ آپ آپ تو بہت زیادہ عقل مند ہیں“، رضانے اپنے ہنسی کو روکتے ہوئے اُس کی تعریف کی۔

”ہاں وہ تو میں شروع سے ہی ہوں پر تمہیں ہی قدر نہیں ہے“، فخر سے گردان اکڑاتے نور نے اُس کے کندھے پہ ایک چپت رسید کی۔

”آپ کی بھائی آپ کی اتنی لمبی تقریر کے بعد آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے آیا ہوں تاکہ ان بچاروں کو بھائی آپ سے کچھ سیکھنے کا موقع مل سکے“، بائیک ایک لینک کے باہر روکتے رضاۓ اُس کے انکار کرنے کے باوجود بھائی اُسے لے کر اندر داخل ہوا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نور انجلشن سے بچنے کے لیے یہ سارے ڈرامے کر رہی تھی۔

---

”ایسے منہ بنائے کیوں بیٹھے ہو؟ کہیں تمہیں یہ دکھ تو نہیں ہو رہا کہ میری منگنی ہو رہی ہے اور تمہیں ابھی تک کسی لڑکی نے گھاس تک نہیں ڈالی“، ارحم نے زارون کو خاموش بیٹھا کیچھ کر سوال کیا۔

”نہیں یار کچھ نہیں ہوا“، مختصر ساجواب دیتے اُس نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔  
”کچھ نہیں ہوا تو ایویں ہی مجنوں جیسی شکل بنائے میرے سامنے بیٹھے ہو“، ارحم نے مشکوک انداز میں اُسے دیکھتے آنکھیں سُکیریں۔

”کہا نا کچھ نہیں ہوا تو بس اس بات کو چھوڑو اور کچھ آرڈر کرو مجھے بھوک لگی ہے“، زارون نے اب کی بار اکتاہٹ سے کہتے مینیو کار ڈاوس کی طرف بڑھایا۔

”ہم ٹھیک ہے جب دل ہو بتا دینا اور آرڈر تم کرو کیونکہ ٹریٹ میری طرف سے ہے تو تم اپنی مرضی سے جو منگوانا چاہو منگوالو“، کارڈ اس کی جانب کھسکاتے ارحم نے اپنے سے کچھ فاصلہ پر موجود لڑکوں کے گروپ کو دیکھا۔

”ٹریٹ تمہاری طرف سے ہے تو خود آرڈر دو یہاں میں کوئی مہنگی چیز آرڈر کر دوں اور تمہارے پاس پیسے نہ ہوں تو سارا بل مجھے بھرنا پڑے گا“، زارون اس کی ہر چالاکی سے واقف تھاتب ہی اس نے مینیو کارڈ اس کی جانب بڑھایا۔ ”ٹریٹ میری طرف سے ہے پر پیسے تم ہی دو گے اور تم زیادہ اصرار کر رہے ہو تو میں آرڈر دے دیتا ہوں“، ارحم نے مینیو کارڈ کھولتے اسے مزید تپایا جو پہلے ہی نور کی وجہ سے پر لیشان تھا۔

”اوے ہیلو مسٹر ارحم مفہمنی آپ کی ہو رہی میری نہیں جو میں اتنے مہنگے ریسٹورنٹ کا بل بھرتا پھروں“، زارون نے اس کی بات سنتے ہی مینیو کارڈ اس کے ہاتھ سے جھپٹا۔ ”کیوں یار تمہیں میری ملنگی کی کوئی خوشی نہیں ہے کیا؟، آنکھیں پھیلاتے ارحم نے بے یقینی کی سی کیفیت میں سوال کیا۔

”خوشی ہے پر اتنی بھی نہیں کہ اپنے ایک مہینے کا جیب خرچ میں تمہارے ایک وقت کے کھانے پر لٹادوں اور خوشی کا اظہار میں اس سے بہتر طریقے سے کر سکتا ہوں“، تیوری چڑھاتے زارون نے ویٹر کو اشارہ کرتے اپنے پاس بلا یا۔

”وہ کیسے؟“

”تمہیں چار جو تے لگا کروہ بھی فری میں“، لفظوں کا چباتے زارون نے خود ہی ویٹر کو آرڈر لکھوا یا۔ ”بس کرو یاراب اتنی بھی خوشی نہ مناؤ۔ ابھی تو میری شادی بھی ہونی ہے اُس کے لیے بھی کچھ بچا کر رکھو“، زارون کو آنکھ مارتے ارحم نے شرارت سے کہا جو بائیں جانب بیٹھے کچھ لڑکوں کی جانب متوجہ تھا۔

”تم نہیں سدھر سکتے“، ویٹر کو آرڈر لکھوانے کے بعد اُس کا شکریہ ادا کرتے زارون نے ارحم کی بات پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”ویسے کیا ہوا تھا آج جو اتنے چپ تھے؟“ اُس کا مودٹھیک ہوتا دیکھ کر ارحم نے پھر سے اپنا سوال کیا۔

”اُفف مطلب تم اس بات کا پیچھا نہیں چھوڑو گے“

”بالکل بھی نہیں، تمہیں پتا ہے ناجب تک میں تمہارے دل میں موجود رازوں سے واقف نہ ہو جاؤں مجھے سکون نہیں آتا“، نفی میں سر ہلاتے اُس نے بے چینی سے وضاحت دی۔ ”تمہاری بہن کے پاؤں پہ چڑھ گیا تھا میں آج، پربے دھیانی میں“، لمبا سانس لیتے زارون نے بات کا آغاز کیا۔ ”میری بہن مطلب؟ معموم چڑیل میرا مطلب نور کے پاؤں پہ چڑھ گئے؟ پر کیسے؟“ اُس کی بات سنتے ہی ارجمند نے حیرت سے پوچھا۔

” بتایا تو ہے بے دھیانی میں میرا پاؤں اُس کے پاؤں کے اوپر آگیا تھا“، ”تو یار تمہیں پاؤں رکھنے کے میری ہی بہن کا پاؤں ملا تھا؟ حد ہے ویسے لاپرواٹی کی دیکھ کے چل لیا کرو“، اُس کا جواب سنتے ہی ارجمند نے اُسے مشورہ دیا۔

”میں دیکھ کر ہی چلتا ہوں وہ خود ہی ہر وقت ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتی ہے اس میں میرا کیا قصور“، اُس کے مشورے پر لعنت بھیجتے زارون نے اُس کو کھا جانے والی نظر وہ دیکھا۔ ”تو اس سارے معاملے میں تمہارا منہ کیوں بننا ہوا تھا؟“ اُس کی بات کو نظر انداز کرتے ارجمند نے ایک اہم نقطہ اٹھایا۔ ”اس لیے کہ قصور اس کا اپنا تھا پر با تین مجھے سنائیں وہ بھی طعنوں کی شکل میں“، افسردگی سے کہتے زارون نے سر اٹھاتے ساتھ وائل ٹیبل کی جانب دیکھا جہاں وہ لڑکے فی میل ویٹر لیس سے کوئی بات کر رہے تھے۔

”تو جان تم نے کونسے چنے ڈالے ہوں گے منہ میں جو میری بہن نے با تیں سنائی اور تم نے خاموشی سے سُن لیں“، ارحم نے نور کی طرف داری کرتے ایک بار پھر سے زارون کو آگ لگائی۔

”یا ر تم میرے دوست ہو یاد شمن؟ جو میری سائیڈ لینے کی بجائے اُس چڑیل کی سائیڈ لے رہے ہو“، ارحم کا نور کی سائیڈ لینا زارون کو کچھ ہضم نہیں ہوا تب ہی اُس نے خنگی سے کہتے مینیو کارڈ اُس کی طرف اچھالا۔

”اچھا غصہ ناکرو میں تمہارا ہی دوست ہوں بس کیا ہے نامیں ایک نرم دل انسان ہوں کسی کو تکلیف میں نہیں دیکھ سکتا اسی لیے نور کی سائیڈ لی۔ پتا نہیں میری معصوم سی بہن کو کتنی چوت آئی ہو گی“، ارحم نے افسردگی سے کہتے سوچنے کی ایکٹنگ کی۔

”زیادہ ہی آئی تھی سارا پاؤں سرخ ہو گیا تھا۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی یہ لڑکیاں اتنی نازک کیوں ہوتی ہیں۔ اک ذرا سا پاؤں ہی تو آیا تھا اور پاؤں ایسے سونج گیا جیسے کسی ٹرک کے نیچے آگیا ہو“، زارون نے اُس کی بات کا بُرا مناء بغیر اپنی بات کہی۔

”تم کو ناسکسی ٹرک سے کم ہو تقریباً ستر کلو کے قریب تو ہونا ہے تمہارا وزن اور میری بہن بچاری پھولوں سی نازک ہے تم جیسے جلا دکا وزن کیسے برداشت کرتی“، زارون کی بات کا جواب دیتے ہی ارحم نے پلیٹ سیدھی کی۔

”دفع ہو تمہیں تو کوئی بات بتانا ہی فضول ہے“، اُس کی طرف ناراضی سے دیکھتے زارون نے آوازیں اوپنچی ہونے پر اپنے سے کچھ فاصلہ پر بیٹھے لڑکوں کو دیکھا جواب اُس لڑکی کو تنگ کر رہے تھے جو مینیو کارڈ ہاتھ میں پکڑے سہمی سی کھڑی تھی۔

”کیا مسئلہ ہے آپ لوگوں کو کیوں تنگ کر رہے ہیں آپ انہیں“، اس سے پہلے کہ وہ لڑکے مزید کوئی بد تیزی کرتے زارون نے کر سی پیچھے کرتے اُن میں سے ایک کا ہاتھ پکڑا جو اُس لڑکی کو چھونے کے لیے آگے بڑھا رہا تھا۔

”مسئلہ ہمیں نہیں بلکہ تمہیں ہے جو ہمارے کام میں مداخلت کر رہے“، زارون کا ہاتھ جھٹکتے وہ لڑکا کھڑا ہوا تو اُس کے باقی ساتھی بھی کھڑے ہو گئے۔

”آپ یہاں سے جانیں پلیز“، زارون نے اُسے کچھ کہنے سے پہلے اُس لڑکی سے کہا جواب خوف سے کانپ رہی تھی۔ ”کیوں تم اس کے بھائی ہو کیا؟ جو اتنی ہمدردی جتار ہے ہو“، اُس لڑکی کا راستہ روکتے اُس کے ایک ساتھی نے زارون کا گریبان پکڑتے سوال کیا۔

”ہاں ہوں بھائی جوان لوگوں کی طرح بے شرم نہیں جو کب سے اس معصوم کا تماشہ بننے دیکھ کر سکون سے کھڑے ہیں“، غصے سے اُسے پیچھے کی جانب دھکا دیتے زارون نے ریسٹورنٹ میں موجود باقی لوگوں کی جانب اشارہ کیا۔

”تو مطلب تم ہیر و بننا چاہتے ہو پر شائد تم یہ نہیں جانتے کہ ہم کس کے بندے ہیں“، ابھی تک کرسی پر برجمان بیٹھے شخص کی طرف اشارہ کرتے اُس لڑکے نے اُسے ڈرانے کی کوشش کی۔

”تم جس کے بھی کتے ہو ہمیں اُس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور آپ جائیں یہاں سے“، ارحم نے معاملہ خراب دیکھ کر غصے سے اٹھتے ہوئے مداخلت کی اور لڑکی کو جانے کا کھاتوں کے لیڈرنے اٹھ کر اُس لڑکی کا ہاتھ تھامتے اپنی گرفت میں لیا۔

”زیادہ بھڑکنے کی ضرورت نہیں ہے شائد تم جانتے نہیں کہ میر انام مراد شاہ، مشہور سیاست دان حیدر شاہ کا اکلوتا بیٹا جو اپنی پسند کی ہوئی چیز کبھی بھی استعمال کیے بناء نہیں چھوڑتا اس لیے اگر جان پیاری ہے تو زیادہ ہیر و گری مت کرو اور فوراً یہاں سے رفوچکر ہو جاؤ“، گن نکال کر اُس لڑکی کے سر پر رکھتے مراد شاہ نے پورے جلال کے ساتھ چینختے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”اوو و تو یہ سیاست کا گندہ خون ہے جو ڈی آئی جی کے بیٹوں کے سامنے زور مار رہا ہے“، ارحم نے بڑی چالاکی سے اُسے باتوں میں لگاتے دھکا دے کر گن اپنے قابو میں کی اور لڑکی کو بھاگنے کا کہا۔

”تم نے مجھے دھکا دیا مراد شاہ پر ہاتھ اٹھایا تمہاری اتنی جراءت...“، لڑکی کے ہاتھ سے جانے اور ارحم کے دھکا دینا پر آگ بگولہ ہوتے مراد شاہ اُس کی جانب بڑھا تو زارون نے راستے میں ہی اُسے دبوچ لیا۔

مارکٹائی کا سلسلہ شروع ہوا تو سارے ریسٹورنٹ مئٹھوں میں خالی ہو گیا، وہ دونوں ان چھ لوگوں کو کسی کپڑے کی ماندھونے میں مصروف تھے تب ہی زارون نے اپنے پیچھے سے آتے لڑکے کے اوپر مکا کساجو بروقت نیچے ہونے پر اُس کی بجائے ارحم کی آنکھ پر لگتے اُس کے چودہ طبق روشن کر گیا۔

”ہائے اللہ میں مر گیا، زارون دشمن وہ ہیں میں نہیں“، کراہتے ہوئے ارحم پیچھے موجود کرسی پر بیٹھا۔ ”سوری یار غلطی ہو گئی“، کانوں کو ہاتھ لگاتے زارون نے مراد شاہ کو ایک ٹانگ رسید کی جو اُسے مارنے کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔

ہاتھاپائی کے دوران پولیس کب اور کیسے وہاں پہنچی کسی کو کچھ خبر نہ ہوئی جنہوں نے آتے ہی موقع کا جائزہ لیا اور زارون اور ارحم سیمت مراد شاہ اور اُس کے تمام ساتھیوں کو گرفتار کر کے لے گئی جو مار کھا کھا کے پہلے ہی ادھ موعے ہو چکے تھے۔

-----

”کون سے جنم کی دشمنی نکالی ہے تم نے میرے ساتھ؟“ ارحم نے اپنی سوچی ہوئی آنکھ سے ہاتھ ہٹاتے زارون کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا جو سر جھکائے پر یشان سا بیٹھا آگے آنے والے وقت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”مطلوب؟ کوئی دشمنی؟“ سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھتے ہی زارون نے اپنی بات ادھوری چھوڑی اور زور سے قہقہہ لگایا۔

”اس دشمنی کی بات کر رہے ہو؟“ اس کی آنکھ کی جانب اشارہ کرتے (جو ارد گرد سے ساری نیلی ہو چکی تھی) زارون نے کمرے سے باہر کھڑے حوالدار کے گھورنے پر جلدی سے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھتے ہنسی کنٹول کی۔

”جی بالکل میں اسی کی بات کر رہا ہوں جو تم نے مکے کی صورت جوش میں آکر دشمن کے بجائے اپنے دوست کی آنکھ پر دے مارا۔ ویسے زارون صح نور نے تمہارے ساتھ بالکل ٹھیک رو یہ اختیار کیا تھا۔ تم ہو ہی بے عزتی کے قابل،“ اس کے ہنسنے پر ارحم نے تیوری چڑھاتے اپنے اندر کی بھڑاس نکالی جو کب سے خود کو پولیس موبائل کے شیشے میں دیکھ دیکھ کر دل میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔

”ٹھیک ہے میں تو چلو بے عزتی کے قابل ہی ہوں اور تم؟ تم توجوٰتے اور مکے کھانے کے قابل ہو تب ہی اس طرح سے کارٹون جیسی شکل بنائے بیٹھے ہو“، اپنی آواز پنجی رکھتے زارون نے حساب برابر کیا تو ارحام نے ہونقوں کی طرح منہ کھولے اُسے دیکھا۔

”زارون اپنی زبان کو لگام دو میں نے بڑی عزت سے تمہاری بے عزتی کی تھی پر تم نے میری بے عزتی بھی بے عزت کرنے والے طریقے سے کی ہے جسے اگر میں نے ذرا سے بھی دل پالے لیا تو تم ساری زندگی کے لیے اسی جیل میں بند ہو کر رہ جاؤ گے“، اُسے دھمکی دیتے ارحام نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے۔

”میری جان پہلے خود تو باہر نکل جاؤ پھر مجھے بھی یہاں بند کرنے کی دھمکیاں دے دینا“، اُس کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر زارون نے بڑی نرمی سے اُسے آئینہ دکھایا۔

”ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں پر اس میں میرا قصور نہیں ہے بس پہلی دفعہ یہاں آیا ہوں نا اس لیے تھوڑا ہل گیا ہوں“، زارون کو مسکراتا دیکھ کر ارحام نے اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے بند کرتے وضاحت دی۔

”ہاں میں تو پیدا ہی جیل میں ہوا تھا اور جب تک دن میں ایک دفعہ یہاں کا چکر نالگالوں مجھے کھانا ہضم نہیں ہوتا“، اس کی بات سنتے ہی زارون نے بھڑکتے ہوئے طنز کیا تو ارحام نے پوری جان سے قہقہہ لگایا۔

”واہ یار پہلے تو تم نے کبھی اس بات کا ذکر میرے سامنے نہیں کیا“، حوالدار کے سلاخ میں ڈنڈا مارتے ہی ارحام نے اپنی ہنسی کو بریک لگائی۔

”یاد ہی نہیں رہا کہ اپنے اس عظیم کارنامے سے تمہیں بھی آگاہ کر دوں“، اپنی شرط کی آستین اوپر چڑھاتے زارون نے انسپکٹر کو اپنی جانب آتا دیکھ کر ارحام کو بھی نظر وں سے اشارے سے اُس کی طرف متوجہ کروایا جو حوالدار سے کچھ کہتے واپس جا چکا تھا۔

”چلو آؤ، تم دونوں کو صاحب جی بular ہے ہیں“، انسپکٹر کے جاتے ہی اُس حوالدار نے دروازہ کھولتے اُن سے کہا جو سوالیہ نظر ووں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے باہر نکلے۔

”صاحب جی میں لے آیا ہوں اُن دونوں لڑکوں کو“، ارحام اور زارون کو کمرے سے باہر کھڑا کرتے اُس حوالدار نے اندر داخل ہو کے اطلاع دی۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ اور اُن دونوں کو اندر بھیج دو“، اس کی بات سنتے ایس پی بلال نے حکم دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے اُن دونوں کو اندر آنے کا کہہ کے خود سلیوٹ کرتے باہر نکل گیا۔

”بیٹھ جائیں“، کرسیوں کی جانب اشارہ کرتے ایس پی بلال نے فون اٹھایا جو نج رہا تھا۔

”لگتا ہے اب کچھ دیر بات چیت کے بعد ہمیں جو توں والی جیل بھیجا جائے گا“، ایس پی بلال کو فون پر مصروف دیکھ کر ارحام نے زارون کے قریب ہو کے سرگوشی کی جو پر سکون طریقے سے بیٹھا تھا۔

”جس کی جو اوقات ہو اسے خیالات بھی ویسے ہی آتے ہیں“، اُسی کے انداز میں سرگوشی کرتے زارون نے دانت پسیے اور ایس پی بلال کی جانب متوجہ ہوا جو بات مکمل کر کے فون کریڈل پر رکھ چکے تھے۔

”کیا نام ہے آپ دونوں کا؟“

”میں ارحام ہوں یہ زارون“، اُس کی بات سنتے ہی ارحام نے اپنا اور زارون کا تعارف کروا یا۔

”ہم آپ دونوں کو پتا ہے آپ نے کس بندے پر ہاتھ ڈالا ہے؟ مراد شاہ جو کہ مشہور سیاست دان حیدر شاہ کے بیٹے ہیں“، ان کا تعارف لیتے ہی ایس پی بلال نے مہذب طریقے سے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”جی جانتے ہیں اور حیدر شاہ بڑا ہو گا اپنے گھر میں پراؤں کے بڑے ہونے کا کیا فائدہ؟ جب وہ اپنے بیٹے کو عورتوں کی عزت کرنا نہ سکھا سکا“، ایس پی کی بات سنتے ہی زارون نے فٹ سے جواب دیا۔

”آن کے بیٹے نے غلطی کی وہ وہاں ایک لڑکی کو بلا وجہ اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ مل کر تنگ کر رہا تھا۔ ہم نے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی پر جب اُس نے اپنی اکٹھ برقرار رکھی تو مجبوراً ہمیں مار کٹائی کرنی پڑی ورنہ نہ تو ہمارا کوئی ایسا ارادا تھا اور نہ ہی ترجیح“، ارحم نے بھی زارون کی بات کی تقلید کرتے مزید وضاحت دی۔

”ٹھیک پر مجھے لگتا ہے ایسے لوگوں کے منہ لگنا آپ جیسے شریفوں کا کام نہیں ہے اس لیے بہتر ہے آپ لوگ انہیں معاف کر دیں“، اُن دونوں کو غصے میں دیکھ کر ایس پی بلال نے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی کیونکہ ریسٹورنٹ میں موجود لوگوں نے مراد شاہ کو قصور وار ٹھہراتے ہوئے اُس کے خلاف ہی مقدمہ درج کروایا تھا۔

”ہم شریف ضرور ہیں پر بے غیرت نہیں جو کسی بہن بیٹی کو مصیبت میں دیکھ کر اس ڈر سے منہ موڑ کے بیٹھ جائیں کہ سامنے کوئی سیاست دان کا بیٹا ہے یا وکیل کا۔ ہم نہ تو کسی سیاست دان کے بیٹے سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی ڈریں گے۔ معافی کی بات سنتے ہی ارحم نے بھڑکتے ہوئے ایس پی کی بولتی بند کی۔

”ارحم ٹھیک کہہ رہا ہے ہم نے آج اُسے معاف کر دیا تو بے خوف ہو جائے گا اور ایسے ہی دوسروں کی ماں بیٹیوں کو تنگ کر کے اُن کی زندگی عذاب بنادے گا“، ارحم کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے زارون نے اُسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے خود تسلی سے ایس پی کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔

”ویسے افسوس کی بات ہے آپ جیسے قانون کے رکھوالوں کے منہ سے مجھے ایک گناہ گار کو معاف کرنے کی بات سُن کر کافی مایوسی ہوتی ہے اگر آپ لوگ ہی ان کا ساتھ دیں گے تو اس جیسے جرام کم ہونے کی بجائے مزید وسعت اختیار کر سکتے ہیں“، زارون کے روکنے کے باوجود بھی ارحم نے اپنی بات مکمل کرتے دم لیا جسے سنتے ایس پی کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”یا ر تم لوگ توجہ باتی ہی ہو گئے ہو میں تمہیں انہیں معاف کرنے کا نہیں کہہ رہا بس یہ سمجھا رہا ہوں کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا اچھا نہیں ہے“، ایس پی نے ارحم کو غصے میں دیکھ کر اپنی بات کا مفہوم سمجھایا۔

”سر جذباتی ہونے کی اس میں کوئی بات نہیں ہے اور ہم اپنا اچھا برا سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اس لیے آپ ہمیں بتانے کی بجائے ان لوگوں کی اچھے سے خاطرداری کریں تاکہ دوبارہ یہ ایسا کام کرنے کے بارے میں ہزار بار سوچیں“، ارحم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالتے زارون نے تحمل سے اپنی بات ایس پی تک پہنچائی۔

”ٹھیک ہے جیسی آپ لوگوں کی مرضی اور یہ ہاشم صاحب آپ دونوں میں سے کس کے والد ہیں؟“ ان کی بات سنتے ایس پی نے سوال کیا۔

”میرے ابو ہیں“، نامجھی سے زارون کی جانب دیکھتے ارحم نے جواب دیا۔

”ٹھیک ہے، انہوں نے آپ دونوں کی ضمانت کروادی ہے اس لیے آپ دونوں یہاں سے جاسکتے ہیں“، ایس پی نے ان کی چیزیں ان کے سامنے رکھتے ہوئے بتایا تو ارحم کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا کیونکہ اُس نے موہل ضبط ہونے سے پہلے مختصر آہاشم صاحب کو جیل کا نام اور وجہ بتاتے ضمانت کا بول دیا تھا پر اُسے یقین نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی ان کی ضمانت کروادیں گے وہ باپ جس نے اُس کی دس فون کال کرنے پر کبھی وقت پر جواب نہیں دیا تھا آج ایک میسج پر اُس کی بات کو اہمیت دینانا قابل یقین تھا۔ ”اپنا ہی کوئی فائدہ ہونا اس میں بھی“، اپنی سوچ پر سر جھکلتے ارحم ایس پی کی جانب متوجہ ہوا جو مزید کچھ بتا رہا تھا۔

”انہیں نے ڈی آئی جی صاحب سے کال کروائی ہے تم دونوں کی ضمانت کی اور ڈی آئی جی صاحب اب خود ہی معاملے کو دیکھیں گے اس لیے آپ لوگ بے فکر ہو کر گھر جائیں کیونکہ مراد شاہ کی ضمانت کچھ دن تک ملتی ہو چکی ہے“، ایس پی نے تفصیل بتاتے انہیں مطمئن کیا۔

”ٹھیک ہے بس آپ اُسے اچھے سے سبق سکھائیے گا تاکہ وہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے“، ایس پی کی بات سنتے ہی زارون نے اٹھ کر اپنی چیزیں اٹھائیں اور اُس سے مصافحہ کیا تو وہ ارحم کی جانب متوجہ ہوا۔

”آپ اپنی آنکھ کا کچھ کرو ابھی گا کیونکہ مجھے اپنے ذرائع سے کچھ دیر پہلے ہی ہاشم صاحب کے بیٹے کی اتوار کو ہونے والی ملنگی کے بارے میں پتا چلا ہے اور غالباً آپ اُن کے اکلوتے بیٹے ہیں“، ارحم کو چیزیں اٹھاتا دیکھ کر ایس پی نے اُس کے زخموں پر نمک چھڑرا کا۔

”آپ کے ذرائع کے مطابق یہ خبر بالکل ٹھیک ہے۔ میری ہی ملنگی ہے اور آپ کو ابھی سے انویشن دے رہا ہوں ضرور آئیے گا اور اس کا بھی یہاں سے نکل کر کچھ کرتا ہوں“، ارحم نے اُن کی بات سُن کر اپنے غصے کو ضبط کرتے کہا تو ایس پی نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”شکریہ میں ضرور کوشش کروں گا اور یہ چوت آپ کو آئی کیسے؟ مراد شاہ کے بندوں میں سے کسی نے مارا ہے؟“ تجسس کے مارے ایس پی بلاں نے سوال کیا تو ارحم نے خونخوار نظروں سے زارون کی جانب دیکھا جو اپنی ہنسی دبانے کی کوشش میں ہلکاں ہو رہا تھا۔

”اُن کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ مجھے ہاتھ لگاتے یہ تو میرا دوست اندھا ہو گیا تھا۔ سر پر اتنا غصہ سوار تھا کہ دوست اور دشمن کی پہچان ہی نہ کرسکا“، زارون کی جانب اشارہ کرتے ارحم نے اپنی بات جاری رکھی۔

”اگر آپ چاہیں تو کچھ دن اسے بھی اس جرم میں اپنا مہمان بناسکتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں“، زارون کو مسلسل مسکراتا دیکھ کر ارحم نے آنکھیں سکریٹرے اُس کی مسکراتا ہٹ کو بریک لگائی۔

”اگر آپ کو مجھے مہمان بنانا ہے تو میں ابھی سے بتا رہا ہوں کہ آپ کو اسے بھی مہمان بنانا پڑے گا کیونکہ میں یہ ہر گز برداشت نہیں کر سکتا کہ میں یہاں جوتے کھاؤں اور میرا دوست ان جو توں سے محروم رہ جائے“، زارون نے فوراً سے جواب دیتے ایس پی کو مسکرانے پر مجبور کیا۔

”ٹھیک ہے آپ لوگ جب تک چاہیں ہمارے مہمان بن سکتے ہیں“، اُن دونوں کی بحث پر مسکراتے بلال نے پیشکش کی تو ارحم اور زارون دونوں نے جلدی سے اپنے کان پکڑے۔ ”شکر یہ سر ہم ایسی جگہ مہمان بننے سے اچھا کسی روڈ پہ بھیک مانگ کے کھالیں“، آنکھیں پھیلاتے ارحم نے مصنوعی خوف چہرے پر سجا کے کہا تو ایس پی بلال نے اُس کی بات سنتے قہقہہ لگایا جواب مزید وقت

ضائع کیے بغیر اُس کا شکریہ ادا کرتے وہاں سے نکلے تو زارون نے گھر جانے کی بجائے گاڑی کا رخ ڈاکٹر کے کلینک کی جانب کیا۔

---

احمد صاحب اور عابدہ بیگم لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے جب زارون نے ارحم کو گھر چھوڑنے کے بعد گاڑی لا کر پورچ میں کھڑی کی۔

”السلام علیکم“، گاڑی سے نکلتے ہی وہ انہیں اپنی جانب متوجہ دیکھ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ان کے قریب آیا۔ ”وعلیکم السلام بر خوردار کیسے مزاج ہیں اور کہاں غائب تھے صح سے؟“، اُسے اپنی ساتھ والی کرسی پر بیٹھا دیکھ کر احمد صاحب نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

”کہیں نہیں بس ارحم کے ساتھ تھا“، زارون نے اصل بات بتا کر انہیں پریشان کرنے کی بجائے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”تو ارحم کہاں ہے وہ تمہارے ساتھ نہیں آیا؟“، اُس کی بات سنتے ہی عابدہ بیگم نے سوال کیا۔ ”نہیں اُس کی حالت یہاں آنے والی نہیں تھی اس لیے میں اُسے اُس کے گھر چھوڑ کر آیا ہوں“، زارون کی زبان سے بے اختیار ہی سچ نکلا۔

---

”کیوں کیا ہوا اُس کی حالت کو اور یہ تمہاری شرط کیوں پھٹی ہے؟ کسی سے لڑ کے آئے ہو کیا؟“ اُس کی بات کو پکڑتے احمد صاحب نے مشکوک انداز میں اُس کی جانب دیکھتے سوال کیا تو زارون کو اپنی جلد بازی پر غصہ آیا۔

”نہیں ابو جھگڑا نہیں ہوا یہ تواریخ نے ویسے ہی شرارت میں پھاڑ دی،“  
”تو پھر ارحم کی حالت کو کیا ہوا ہے جو یہاں لانے والی نہیں تھی؟“ اُس کے جواب سے مطمئن نہ ہوتے احمد صاحب نے ایک اور سوال کیا تو زارون تھوڑا گڑ بڑاتے ہوئے کوئی بہانہ سوچنے لگا۔  
”وہ میرے ہاتھوں تھوڑا ظلم ہو گیا تھا اُس پر اس لیے...“، ان دونوں کو اپنی جانب متوجہ پا کر زارون نے جلدی سے جواب دیا۔

”کیسا ظلم؟ اور یہ کیا یہ پہلیاں بجھوار ہے ہو انسانوں کی طرح پوری بات بتاؤ،“ اُس کے الٹے سیدھے جوابوں سے تنگ آ کر احمد صاحب نے تیوری چڑھائی۔

”وہ ابو میں تھوڑا ہل گیا تھا دراصل ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا کسی کے ساتھ،“ احمد صاحب کو غصے میں دیکھ کر زارون نے چاروں چاراں نہیں اصل بات بتائی۔

”جھگڑا کس سے ہوا اور کس بات پر؟ تمہیں کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟“، چائے کا کپ ٹیبل پر رکھتے عابدہ بیگم نے فکر مندی سے ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں بس ارحام کی آنکھ پر لگی ہے وہ بھی میں اُس لڑکے کو مارنے لگا تو وہ بروقت نیچے ہو گیا تو ارحام کو لگ گئی“، عابدہ بیگم کی فکر پر انہیں تسلی دیتے وہ جھگڑے کی وجہ بتانے لگا۔

”کون لوگ تھے وہ؟“ اُس کی ساری بات سننے کے بعد احمد صاحب نے سوال کیا۔

”کسی سیاست داں کا پیدا تھا“، زارون نے نام گول کرتے بس مختصر سا جواب دیا۔

”ہم کام تو اچھا کیا ہے پر تھوڑی احتیاط کیا کرو ایسے لوگوں کے منہ لگانا مطلب خطرے کو دعوت دینا ہوتا ہے“، احمد صاحب نے شاباش دینے کے ساتھ نصیحت کی تو زارون نے اثبات میں سر

ہلا کیا۔

”جی ابو میں آگے سے احتیاط کروں گا“،

”ہاں، بیل کے منہ میں خود ہی ہاتھ ڈال کے کہہ رہے ہو کہ ابو میں آگے سے احتیاط کروں گا کہ وہ مجھے نہ کاٹے اور کیا ضرورت تھی لڑنے کی، تم لوگ پولیس کو کال کر دیتے وہ خود ہی دیکھ لیتے ان لوگوں کو“، عابدہ بیگم جو تب سے خاموش تھیں انہوں نے احمد صاحب کو اتنی نرمی سے زارون کو نصیحت کرتے دیکھ کر غصہ کرنا لازمی سمجھا۔ ”امی کچھ نہیں ہوتا اور جب تک ہم لوگ پولیس کو کال کرتے وہ لڑکی کو اٹھا کر لے جا چکے ہوتے اور کسی کمزور کا ساتھ دینا بھی ایک عبادت ہے۔ وہ لڑکی بالکل معصوم تھی پتا نہیں کس مجبوری کے تحت گھر سے باہر نکل کر اُس ریسٹورنٹ میں جا ب

کر رہی تھی،“،زارون نے ماں کی بات سنتے ہی انہیں سمجھاتے اُن کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں بس تم باپ بیٹا تو بس ہر وقت مجھے ہی درس دینا میں توبات کہہ کر پھنس جاتی ہوں“، اُسے مزید کسی بات کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر عابدہ بیگم نے ناراضی سے کہتے کہ پڑے میں رکھے تو زارون نے اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے چہرہ نیچے کیا۔

”اب یہ ہنسنا بند کرو اور میری ارحم سے بات کرو اُپتا نہیں میرے بچارے بچے کے کتنی چوٹ لگی ہو گی“، پڑے اُٹھاتے عابدہ بیگم نے فکر مندی سے کہتے اندر کا رخ کیا۔ ”ہوننہ میں تو سوتیلا ہوں جیسے، چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا اور اپنے بیٹے کی چوٹ کی فکر پڑ گئی“، منہ ہی منہ میں بڑ بڑاتے اُس نے احمد صاحب کو اپنے موبائل پر کسی سے بات کرتا دیکھ کر خود بھی اُٹھ کر اندر کا رخ کیا۔

-----

”اسلام علیکم کیسی ہو؟“، رابعہ نے کال ریسیو ہوتے ہی پوچھا۔

”و علیکم السلام میں ٹھیک ہوں تم کیسی ہو اور منگنی کی کیا ڈیٹ فائل ہوئی؟“، نور نے سلام کا جواب دیتے ہی سوال کیا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں اور 22 جنوری فائل ہوتی ہے مطلب اس اتوار کو“، رابعہ نے نور کی بے صبری پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مبارک ہو تمہیں، اللہ پاک تمہیں اور ارحام بھائی کو ہمیشہ خوش رکھے آمین“، نور نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے دعا دی۔

”آمین شکر یہ اور سُناو کیا کر رہی ہو اور آنٹی انفل کیسے ہیں؟

”ہاں اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہیں اور میں بس سونے کی تیاری میں ہوں“، نور نے ہاتھ میں پکڑی بک بند کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا رحم بتارہا تھا کہ زارون نے تمہارے پاؤں پر کھدیا تھا آج اور تمہیں کافی چوٹ لگی ہے؟“، رابعہ نے اپنے فون کرنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں یار زیادہ نہیں لگی۔ وزن آنے سے گوشت پھٹ گیا ہے ڈاکٹر کو دکھایا ہے اس نے میڈیسین وغیرہ دی ہیں اب تو کافی بہتر ہے۔ درد بھی پہلے سے کم ہے پر ارحام بھائی کو کیسے پتا چلا؟“، نور نے تفصیل بتاتے حیرانگی کا اظہار کرتے سوال کیا۔

”ہونہ بتانا کس نے تھا؟ ظاہر سی بات ہے زارون نے، ہی بتایا ہو گا کیونکہ جب تک یہ ایک دوسرے کو ساری باتیں بتانہیں دیتے انہیں سکون نہیں آتا“، رابعہ نے مذاق اڑاتے نور کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اچھا ॥ سمجھ گئی۔ ویسے ارحم بھائی تو آج کافی خوش ہوں گے“، نور نے شرارت سے پوچھا۔  
 ”ہاں کچھ زیادہ ہی خوش ہے اس لیے آنکھ سو جھا کے بیٹھا ہے“، رابعہ نے بڑھاتے ہوئے کہا۔  
 ”مطلوب، آنکھ کو کیا ہوا؟ کیوں سو جھی ہے؟“، نور نے رابعہ کی بات سنتے ہی سوال کیا۔  
 ”ارحم بتارہا تھا کے اُس کا اور زارون کا کسی سے جھگڑا ہو گیا تھا بس تھوڑی ہاتھا پائی بھی ہوئی اور زارون نے غصے سے اُن کو مارنے کی بجائے ارحم کی آنکھ پر ہی مکامار دیا“، رابعہ نے اپنی بہن سے چائے کا کپ پکڑتے ہوئے نور کو بتایا جسے پہلے ہی زارون پر کافی غصہ تھا۔

”یہ جلاڈ تو ویسے ہی کہیں جاتے ہوئے اپنی آنکھیں اور عقل دونوں گھر رکھ کے جاتا ہے۔ پتا نہیں کس فولاد سے بنتا ہے پہلے میرا پاؤں توڑ دیا اب ارحم بھائی کی آنکھ، مجھے تو لگتا ہے اس نے جان بوجھ کر ہم سے ٹرپ والے دن کا بدله لینے کے لیے یہ سب کیا ہے“، رابعہ کی بات سنتے ہی نور نے اپنا دل ہلکا کرنے کے لیے زارون کو کوسا۔

”بس کرو یار مجھے پتازارون کا کوئی قصور نہیں ہونا یہ ساری کارستائی ارحم کی اپنی ہو گی جس کا ذمہ دار وہ اب زارون کو ٹھہر ا رہا ہے باقی رہی بات تمہاری تو مجھے یقین ہے کہ زارون بدلتے لینے کے لیے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچا سکتا“، رابعہ نے اعتماد کے ساتھ اُس کی سائیڈلی تونور نے دوسری جانب منہ بسوار۔

”بس کرو تو بہ ہے رابعہ تم تو اُس جlad کی تعریف میں پوری کتاب لکھنے بیٹھ گئی ہوا اور یہ تم نے میری عیادات کے لیے فون کیا ہے یا میرے سامنے میرے دشمن کی خوبیاں بیان کرنے کے لیے؟“ ماتھے پر بل ڈالتے نور نے خنگی کا اظہار کیا۔

”اچھانا تمہاری عیادات کے لیے فون کیا ہے بس اب زیادہ غصہ نہ کرو اور یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ شانپنگ پہ چلو گی؟“

”یار کیا ہو گیا یہاں میں واشر و م تک چل کر جانے سے تنگ ہوں اور تمہیں شانپنگ پہ جانے کی پڑی ہے“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے اپنی آنکھیں سکیڑیں۔

”یار میں کوئی بھی جانے کا بول رہی ہوں جو اتنا تپ رہی ہو۔ آج بدھ ہے اور ہفتے کو جائیں گے۔ ان شاء اللہ جب تک تمہارا پاؤں بھی ٹھیک ہو جائے گا“، اپنے ارادے کے بارے میں تفصیل سے آگاہ کرتے کرتے رابعہ نے مزید دو چار باتیں کرنے کے بعد اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرتے کال

کاٹ دی۔ ”آفف سارے ہی بد تمیز میری، ہی زندگی میں آنے تھے“، موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے نور نے زارون کی تعریف کے بارے میں سوچتے خود کلامی کی اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

---

”جمال؟ جمال کہاں ہو یار؟ کھانے کے لیے کچھ دے دو بہت بھوک لگی ہے“، ارحم نے پچن میں آتے ہی اپنے ملازم سے کہا جو کھانا بنانے میں ہی مصروف تھا۔

”جی ارحم بھائی بس کھانا ہی لگانے لگا ہوں“، اُس کی طرف پلٹتھے ہی وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔

”کیا ہوا؟؟؟“ اُسے چچہ ہاتھ میں پکڑے با غور اپنا جائزہ لیتے دیکھ ارحم نے ابر واچکائی۔

”یہ آپ کو کیا ہوا ہے؟“ اُس کی آنکھ کی جانب اشارہ کرتے جمال نے اُس کے سخت تیور دیکھ کر خود کو مسکرانے سے روکا۔

”کچھ نہیں یار زارون کا دماغ خراب ہو گیا تھا بس اور تم میرے چہرے کی تحقیق کرنے کی بجائے کھانے پر دھیان دو جو جل رہا ہے“، اُسے آنکھیں دکھاتے ارحم نے چولہے پر رکھے سالن کی جانب اُسے متوجہ کروایا جو نیچے لگ چکا تھا۔ ”ہائے اللہ یہ کیا ہوا“، جمال نے جلدی سے چولہا بند کرتے

---

چمچہ چلاتے شکر ادا کیا کہ سالن زیادہ نیچے نہیں لگا تھا۔ ”انسان دوسروں کا مذاق بنائے ناتاؤس کے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں ہوتا اس لیے کہتے ہیں کہ دوسروں کے کام میں ٹانگ اڑانے سے اچھا ہے انسان اپنے کام سے کام رکھے“، اُس کے سر پر چیت رسید کرتے ارحم نے سلیپ پر رکھا گلاس اٹھایا۔

”اچھا جب کھانا لگ جائے تو مجھے آواز دے دینا میں باہر لاوٹج میں بیٹھا ہوں“، فرنچ سے جوس کی بوتل نکالتے ارحم نے اُسے اپنے کام میں مصروف دیکھ کر کھا اور کچن سے باہر نکلا جہاں آئمہ بیگم اپنی کسی پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہو کر اپنے کمرے سے نکلیں۔

”یہ تمہاری آنکھ پر کیا ہوا ہے؟“ اُس کی جانب دیکھتے ہی انہوں نے فکر مندی سے پوچھا جو انہیں اگنور کرتے ہوئے سامنے موجود صوف پر بیٹھتے ہی وی آن کر چکا تھا۔

”ارحم میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟“ اُسے یوں جواب دیے بغیر ہی لاوٹج میں جاتا دیکھ کر آئمہ بیگم نے اُس کے پیچے ہی لاوٹج میں آتے اپنی بات دوہرائی۔

”کچھ نہیں ہوا معمولی سی چوٹ ہے اس لیے آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے“، تلخی سے کہتے اُس نے ریموت سے ٹی وی کی آواز تیز کی۔

”کبھی کسی بات کا جواب نہیں سے بھی دے دیا کرو ہر بات ایسے تلنخ انداز میں کرنا ضروری ہوتی ہے کیا؟“ اُس کے رویے پر بُرا مناتے آئمہ بیگم نے اُسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

”جی بہت ضروری ہے اور آپ کو پتا ہے میرا یہ خاص رویہ بس آپ کے اور ہاشم صاحب کے لیے ہے کیونکہ آپ دونوں ہی اس کے حق دار ہیں جن کے لیے اپنی اکلوتی اولاد کے لیے تو کبھی وقت نہیں ہوا پرد کھاوے کے لیے لاوارث اور یتیم بچوں کے لیے بہت وقت ہے“، ریموت سامنے دیوار پر مارتے اُس نے غصے سے چلاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”ارحم کیا بد تمیزی ہے یہ، میں ماں ہوں تمہاری اور ماں سے ایسے بات کرتے ہیں؟“ اپنے پاؤں کے قریب پڑے ریموت کے سیل دیکھتے آئمہ بیگم نے اُس سے بھی اوپنجی آواز میں چلاتے ہوئے اُسے اپنی اہمیت کے بارے میں جتنا ضروری سمجھا۔

”اوو و تو آپ کو یاد ہے کے آپ میری ماں ہیں؟ مجھے تو لگا تھا کہ اپنی بزنس مینٹگ اور پارٹیز میں مصروف ہو کے یہ بھی بھول گئی ہوں گی کے آپ کا کوئی پیٹا بھی ہے“، ایک بار پھر سے طنز کرتے اُس نے پر سکون انداز میں گلاس میں جوس ڈالا۔

”کیا ہو گیا ہے ارحم تمہیں؟ کیوں دن بدن بد تمیز اور بد لحاظ ہوتے جا رہے ہو؟ اور کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں؟ ہر آسائش دے رکھی ہے ہم نے تمہیں پھر بھی تمہارا دماغ خراب رہے تو یہ تو سیدھی سیدھی ناشکری ہے“، اُس کے سکون پر مزید بھڑکتے آئمہ بیگم نے اُسے احساس دلا یا۔

”کمی؟ ہاں ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ، کوئی کمی نہیں ہے مجھے۔ پہننے کے لیے قیمتی سے قیمتی لباس ہے۔ کھانے کے لیے ہر قسم کا کھانا ہے۔ باتیں کرنے کے لیے یہ اوپنجی اوپنجی دیواریں ہیں اور اپنا دکھ کم کرنے کے لیے آپ کی دی ہوئی بیش بہادولت ہے اور پیار کرنے اور خیال رکھنے کے لیے یہ ملازم جسے پیدا ہونے سے لے کر آج تک میں نے آپ لوگوں سے زیادہ اپنے قریب پایا ہے“، ارحم نے ہارے ہوئے انداز میں اُن کی بجائے اپنی قسم پر طذکرتے اپنی بات کو جاری رکھا تو آئمہ بیگم نے بیٹی کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں شکست کے نشان واضح تھے۔

”اور سچ کہتی ہیں آپ۔ دنیا کی ہر آسائش ہے میرے پاس محرومیاں اور تنہایوں سمیت...“، ارحم نے بات مکمل کرتے ہی ہاتھ میں کپڑا گلاس زور سے زمین پہ مارا جو کرچی کرچی ہوتے زمین پر بکھر تے آئمہ بیگم کو خوف میں بتلا کر گیا۔

”ارحم بھائی، ارحم بھائی کھانا تو کھا لیں“، جمال جو کچن میں کھڑا ان کے درمیان ہونے والی تمام باتیں سُن چکا تھا اس نے اُسے گھر سے باہر جاتا دیکھ کر آواز لگائی جو اُس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر بیرونی دروازے سے باہر نکل چکا تھا۔

”تم جاؤ، خود ہی جب دماغ ٹھیک ہو گا تو کھا لے گا“، جمال کو سوالیہ نظر وہ سے اپنی جانب دیکھتا پا کر آئمہ بیگم نے نظریں ملائے بغیر کہا اور وہیں صوفے پر بیٹھتے ارحم کی باتوں پر غور کرنے لگیں۔

-----

”زاورن یار کہاں ہو تم؟“، کچھ دیر سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد جب اُس کا غصہ کچھ کم ہوا تو اس نے زارون کو کال ملائی۔

”چاند پہ ہوں، تم بھی آجاؤ یہاں ایک ایلین کی کمی ہو گئی ہے“، اپنی تھہ شدہ شر ٹس بیڈ سے اٹھا کر الماری میں رکھتے زارون نے ہمیشہ کی طرح اُس کی سیدھی بات کا اللٹا جواب دیا۔

”بکواس نہ کرو اور سیدھی طرح سے بتاؤ کہاں ہو تم؟“، ارحم نے موڑ کا ٹنے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا تو زارون کو اُس کے لبھ سے کسی گڑ بڑ کا احساس ہوا اس لیے اب کی بار اُس نے سیدھی طرح جواب دیا۔

"یار گھر میں ہوں۔ میں نے کہاں جانا ہے پر تم اتنے سب سخیدہ کیوں ہو؟ سب خیریت ہے نا؟" شر ٹس الماری میں رکھ کر دروازہ بند کرتے زارون نے فکر مندی سے پوچھا۔

"ہاں خیر ہی ہے..."، ارحم نے تھکے ہوئے انداز میں جواب دیتے لمبی سانس لے کر خود کو پر سکون کیا۔

"لگ نہیں رہا کہ خیر ہے کیونکہ تمہاری آواز بھی مجھے کچھ بو جھل سی لگ رہی ہے۔ رابعہ نے کچھ کہا ہے؟ یا پھر انکل یا آنٹی سے لڑائی ہوئی ہے؟" زارون نے اُس کی بات سنتے بے یقینی سے اندازہ لگایا۔

"نہیں یار کچھ نہیں ہوا۔ آنٹی کو کہو میرے لیے کھانا بنادیں۔ میں بس دس منٹ میں تمہارے گھر آ رہا ہوں۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا اور اب بھوک سے جان نکل رہی ہے" سکنل پر گاڑی روکتے ارحم نے بات بدلتے حکم دیا۔

"صبح سے کیوں کچھ نہیں کھایا؟ اور کہاں ہو تم اس وقت؟" زارون نے اب کی بار پریشانی سے پوچھا۔

”دوپہر ایک بجے سے سڑکوں کی خاک چھان رہا ہوں اور اپنے سے بد نصیب کسی شخص کو تلاش کر رہا ہوں جو مال باپ کے ہوتے ہوئے بھی خود کو بتیم سمجھتا ہو“، ارحم نے اذیت بھری مسکراہٹ ہو نڈوں پر سجا تے ہوئے اپنے اندر موجود لشکش کو کم کرنے کی کوشش کی۔

”کیا ہو گیا ہے یار کیوں ایسی باتیں کر رہے ہو کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“  
”کسی نے کچھ نہیں کہا اور میں تمہارے گھر آ رہا ہوں پھر بات کرتے ہیں تم کھاناریڈی رکھو“

”ٹھیک ہے جلدی آ جاؤ۔ مجھے بہت ٹینشن ہو رہی ہے“

”آ رہا ہوں بس“، ارحم نے کہتے ہوئے فون بند کیا اور گاڑی کو سگنل سے نکالتے ہوئے زاورن کے گھر کی سمت میں موڑ دیا تو دوسرا طرف زاورن نے کچھ سوچتے ہوئے ٹوی آف کیا اور کمرے سے باہر آیا اب اُس کارخ عابدہ بیگم کے کمرے کی طرف تھا۔

”امی کیا کر رہی ہیں آپ؟“ دروازہ کھلا دیکھ کروہ بغیر اجازت، ہی کمرے میں داخل ہوا۔  
”کچھ نہیں بیٹا۔ ویسے ہی موبائل پر میسجد دیکھ رہی تھی۔ تم بتاؤ کوئی کام ہے کیا؟“ عابدہ بیگم نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے زاورن سے پوچھا۔

”جی امی وہ ارحام آرہا ہے آپ پلیز اس کے لیے کچھ کھانے کو بنادیں گی“، زارون نے اپنے آنے کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا۔

”کھانا تو بنا ہوا ہے بس گرم کرنا پڑے گا اور کب تک آنا ہے ارحام نے؟“ عابدہ بیگم نے اٹھتے ہوئے زارون سے پوچھا اور کچن کی طرف بڑھیں۔

”بس پانچ دس منٹ میں پہنچ جائے گا“، زارون نے بھی ماں کے ساتھ کچن میں آتے ہوئے جواب دیا۔

”اچھا زارون تم سلااد بنالو میں کھانا گرم کرتی ہوں“، عابدہ بیگم نے سبزیاں زارون کے سامنے رکھتے ہوئے کھاتاؤس نے منہ بسوار۔

”امی کیا ہے؟ آپ نے تو مجھے لڑکی ہی سمجھا ہوا ہے زارون سلااد بنالو زارون گھر کی صفائی میں میرا ہاتھ بٹا د وزارون یہ آکو چھیل دو اففف ابھی ارحام نے مجھے یہ کام کرتے دیکھ لیانا تو ساری دنیا میں مجھے نشر کر دے گا“، زارون نے کھیرا کاٹتے تیوری چڑھائی۔

”ہاں کوئی نہیں تم اتنے سے کام کرنے سے بدنام ہونے لگے اس لیے چپ کر کے سلااد بناؤ، ارحام پہنچنے والا ہو گا“، عابدہ بیگم نے بیٹی کے شکوئے سنتے تسلی دی۔

”شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر“، ارحم کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی زارون نے جلدی سے ہاتھ چلاتے کہا تو عابدہ بیگم نے پلٹ کر اسے گھورا۔

”زارون ایسے نہیں کہتے اور میں نے کتنی بار تمہیں منع کیا ہے کہ کسی کو شیطان سے تشبیہ مت دیا کرو“، اس کی مذاق میں کہی گئی بات پر عابدہ بیگم نے ٹوکا تو زارون نے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”ٹھیک ہے دوبارہ نہیں کہوں گا“، ارحم کی آواز پر اس نے کچن سے آواز لگاتے وہیں آنے کا بولا جس نے وہاں داخل ہوتے ہی ان دونوں کو سلام کرتے عابدہ بیگم کے سامنے سرجھ کایا۔

”وعلیکم السلام پیٹا یہ تمہاری آنکھ کی کیا حالت بنی ہوئی ہے؟ زارون تو کہہ رہا تھا معمولی سی چوٹ ہے“، عابدہ بیگم نے ارحم کے سر پر ہاتھ پھیرتے فکر مندی کا اظہار کیا تو ارحم نے کرسی پیچھے کر کے بیٹھتے اپنی سسلی دی۔

”ٹھیک ہوں آنٹی میں، آپ پر پیشان نا ہوں اور اس بد تمیز سے پوچھیں ذرا اس نے جان بوجھ کے مجھے مارا تھا“، پلٹ سے کھیرا اٹھا کر منہ میں ڈالتے ارحم نے چہرے پر مسکراہٹ سجائے حتی الامکان اپنے لبج کو ہموار رکھا۔

”زارون ارحم سچ کہہ رہا ہے کیا؟“، عابدہ بیگم نے اس کی بات سنتے ہی زارون سے تصدیق چاہی جو ارحم کے مسکراتے چہرے پر کچھ کھو جنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”امی آپ بھی کس کی باتوں پر یقین کر رہی ہیں۔ سارے جہاں کا جھوٹا ہے یہ“، سر جھکتے زارون نے اُس کی بات کی تردید کی۔

”ہاں تم نے تو سچ بولنے میں پی اتیج ڈی کی ہوئی ہے نا؟“ حساب برابر کرتے ارحم نے پلیٹ اپنی جانب کھسکائی۔

”اچھا تم دونوں اب لڑنا بند کرو اور ارحم تم کھانا کھاؤ“، عابدہ بیگم نے کھانا ٹیبل پر لگاتے پلیٹ اُس کے سامنے رکھی۔

”آنٹی کیا بنایا ہے آج آپ نے؟“ کھیر امنہ میں رکھتے ارحم نے منہ میں پانی بھرتے سوال کیا۔ ”کریلے گوشت، واہ آنٹی آج تو مزہ آئے گا کھانا کھانے کا“، ارحم نے زارون کو دیکھتے ہوئے کہا جو کریلوں کی طرف دیکھ کے عجیب شکل میں بنارہا تھا۔

”ہاں تمہیں تو زہر کھانے کا پہلے بھی بہت مزہ آتا ہے“، اُس کی تعریف پر بد مزہ ہوتے زارون نے مزید کھیرے کاٹ کر سلااد والی پلیٹ میں رکھے۔

”ہاں اور کیا میں میٹھا ہی اتنا ہوں کہ زہر بھی کھالوں تب بی کوئی اثر نہیں ہوتا اور تم نے یہ لڑکیوں والے کام کب سے کرنے شروع کیے ہیں؟“ اب کی بار ارحم نے اُس کے ہاتھ میں موجود چھری دیکھ کے سوال کیا۔

”جب سے تم میرے دوست بنے ہو۔ میری امی نے مجھے لڑکیوں والے کام سکھانے شروع کر دیے ہیں کیونکہ ہفتے میں دس دفعہ تو ہماری طرف کھانا کھاتے ہو اور امی کب تک تمہاری فرمائشیں پوری کریں گی اس لیے مجھے سکھا رہی ہیں تاکہ تمہاری کوئی فرمائش ردنہ ہو“، زارون نے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جو ان کی باتوں پر مسکراتے ہوئے چائے کا پانی چوٹھے پر رکھ رہی تھیں۔

”اچھا تو پھر کس حد تک گھرداری سیکھ لی ہے تم نے لڑکی؟“، ارحم نے کھانے کے ساتھ انصاف کرتے زارون کی اتنی لمبی وضاحت پر مسکراتے ہوئے سوال کیا جواب کوئی جواب دیے بغیر اس کی پھیکی مسکراہٹ کو دیکھتے ہوئے انتظار کر رہا تھا کہ کب وہ کھانا ختم کرے اور اُسے اپنی پریشانی کی وجہ بتائے۔۔۔

”کیا ہوا تھا؟ فون پہ ایسی فضول باتیں کیوں کر رہے تھے؟ کسی نے کچھ کہا ہے یا کسی سے لڑائی کر کے آئے ہو؟ آئی انکل سے کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“، زارون نے عابدہ بیگم کے کچن سے نکلتے ہی ارحام پر سوالوں کی بارش کی۔

”نہیں یار کچھ نہیں ہوا بس چھوڑو تم ان باتوں کو اور بتاؤ مجھے شانپنگ کب کروار ہے ہو؟ اتوار کو میری منگنی ہے اور تم ہو کہ کسی بات کی فکر ہی نہیں انسان جھوٹے منہ ہی پوچھ لیتا ہے کہ ارحام تمہیں کچھ چاہیے تو چلو میں لے دیتا ہوں پر نہیں یہاں میری جاسوسی سے فرصت ملے تو تم کچھ اور سوچو“، ارحام نے بڑی مہارت سے بات بدلتے ہوئے شکوہ کیا۔

”اوکے یار اب عورتوں کی طرح طعنے تونہ دو اور ابھی بہت دن پڑے ہیں اس لیے زیادہ پریشان مت ہو، جو چاہیے ہو اے دوں گا ویسے بھی میرے مہینے کی آدھی سے زیادہ پاکٹ منی پہلے بھی تمہارے کھانے پینے اور کپڑوں پہ ہی خرچ ہوتی ہے“، اُس کے بات بدلتے ہی زارون سمجھ چکا تھا کہ وہ ابھی اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا اسی لیے زیادہ زور دینے کی بجائے اُس نے ارحام کو باتوں میں لگایا تاکہ اُس کا دھیان بٹ سکے۔

”ایک سینئڈ میں نے تمہیں ایک ضروری بات بتانی تھی بلکہ سمجھانی تھی“، زارون کو اشارے سے روکتے ارحام نے کرسی اُس کے قریب کی۔

”ہاں بتاؤ، میرا مطلب سمجھاؤ“، اُس کی اس قدر رازداری پر زارون نے سنجیدگی سے اُس کی جانب دیکھا۔

” بتانا یہ تھا کہ تمہیں میری ملنگنی پر ڈانس کرنا ہے اس لیے آج سے ہی تیاری شروع کر دو کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تمہارا بندروں جیسا ڈانس دیکھ کر میرے سرال والوں کے سامنے میری ناک کٹ جائے“، زارون کی سنجیدگی پر محفوظ ہوتے ارحم نے ایک نیاشوشہ چھوڑا۔

”میں کس خوشی میں ڈانس کروں گا وہ بھی تمہاری ملنگنی پہ؟“ اُس کی اچانک فرماش پر بوکھلاتے ہوئے زارون نے سوال کیا۔

” پیاریہ کیسا بے تکاس سوال ہے ظاہر سی بات ہے تم میرے اکلوتے دوست ہو اور تم میری ملنگنی پر ڈانس نہیں کرو گے تو کیا کوئی باہر سے آکر کرے گا؟ اور ہاں مہربانی کر کہ تم بھی اپنے لیے کوئی اچھا سا سوٹ بنوایں گے میری ملنگنی پر بڑے بڑے بنس میں کی پیاری پیاری یہیں یا بھی آئیں گی ہو سکتا ہے اُن میں سے کوئی تجھ جیسے لنگور کو پسند کر لے“، ارحم نے اُسے ٹی شرت اور ٹراؤز اور میں بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھا دیکھ کر نصیحت کی۔

” ٹھیک ہے میں شروعی بنوالوں گا اور ساتھ کھسے اور سحر اکا انتظام بھی کر لوں گا اور اگر اس سے بھی بات نہ بنی تو ایک تختی پر ضرورت برائے رشتہ کے الفاظ قلم بند کرواتے اپنے گلے میں لٹکالوں گا

ہو سکتا ہے کسی کو ترس آجائے، اُس کی نصیحت پر لعنت بھیجتے زارون نے لفظوں کو چباتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا اور یہ تختی والا آئینڈ یا تو بیسٹ ہے بس ساتھ تھوڑا میک اپ بھی کر لینا آئے ہائے کمال ہی لگو گے“، زارون کی بات سننے ہی ارحم کی شیطانی حس بیدار ہو چکی تھی۔

”بالکل اور کمال تو میں تب لگوں گا جب تمہیں لہنگا اور جو توں کا ہار پہنا کے گدھے پہ بٹھا کر اپنے ساتھ تمہارے سسرال لے کر جاؤں گا ویسے کتنی نایاب اینٹری ہو گی نا تمہاری؟“، اُس کے انداز میں بات کرتے زارون نے حساب برابر کیا جس کا اثر لیے بغیر ہی ارحم نے سنجیدگی سے اُس کے مشورے پر غور کیا۔

”آنینڈ یا بُر انہیں ہے پر میری ایک شرط ہے“، پر سوچ انداز میں کہتے اُس نے سوالیہ نظرؤں سے زارون کی طرف دیکھا۔

”کیسی شرط؟“، ابرو اٹھاتے زارون کو کسی طور بھی اُس سے کسی اچھی شرط کی امید نہیں تھی۔

”یہی کہ میرے ڈرائیور تم بنو گے کیونکہ وہ کیا ہے ناکہ میں لہنگا پہن کے گدھے کو ڈرائیو نہیں کر سکوں گا اس لیے مجبوری میں مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت پڑے گی“، ارحم نے سنجیدگی سے کہتے زارون کو مسکرانے پر مجبور کیا جو اپنے جاں میں خود ہی پھنس چکا تھا۔

”دفع ہو میں کیوں بنوں گا تمہارے جیسے گدھے کا ڈار یور اور ہاں باتوں میں تم سے کوئی نہیں جیت سکتا“، خالی کپ اٹھا کر سینک میں رکھتے زارون نے قل کھولا۔

”ہاں یہ تو ہے کسی چیز میں کوئی مجھ سے جیت نہیں سکتا بد قسمی میں بھی نہیں“، زارون کی بات کی تائید کرتے ارحم کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوئی۔

”أَفْفُ پھر سے تم فضول باتیں کرنے لگ گئے ہو؟ اور کہاں سے بد قسمت ہو تم؟ میرے جیسا اتنا اچھا اور معصوم دوست دیا ہے اللہ نے تمہیں اور ابھی بھی تم خود کو بد قسمت کہہ رہے ہو؟“ زارون نے اُس کے مزاج میں آتی تلخی کو محسوس کر کے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔ ”ہاں ٹھیک کہہ رہے ہو۔ بس یہی ایک رشتہ ہے جس میں، میں ساری دنیا سے زیادہ خوش نصیب ہوں اور اگر تم نہ ہوتے تو شائد اس ماہی سی کے اندر ہیروں میں ڈوب کر میں خود کو کب کا ختم کر چکا ہوتا“، اُس کا ہاتھ تھامنے ارحم نے اُس کی بات کا اعتراف کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے واپس اُس کے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں کچھ نہیں ہوا، چھوڑو تم اس بات کو“، اپنی آنکھ کے نم کنارے کو صاف کرتے ارحم نے اُسے پھر سے ٹالنے کی کوشش کی۔

”ہم، مجھے لگتا ہے اگر تم بتا دو گے تو اندر کی تکلیف کچھ کم ہو جائے گی“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے زارون نے اُسے بولنے پر اگسایا۔

”آنٹی نے کچھ کہا ہے نا؟“

”ہاں...“، ضبط کے مارے سرخ ہوتے چہرے کو جھکاتے ہوئے اُس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

”کیا کہا ہے؟“ اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے زارون نے سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا۔  
”کچھ زیادہ نہیں بس کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے مجھے سب کچھ دیا ہے زندگی کی تمام سہولتیں دیں اور مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہے تو پھر میں کیوں اُن سے احترام سے پیش نہیں آتا“، ارحم نے ہارے ہوئے انداز میں کہتے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”زارون وہ مجھے پیسوں پہ چلنے والا کھلونا سمجھتی ہیں جس کو صرف دولت کی ضرورت ہے انہیں یہ کیوں سمجھ نہیں آتی میں ایک سانس لینے والا انسان ہوں مجھے اُن کی توجہ اُن کے پیار کی بھی ضرورت ہے مجھے اپنے آپ میں اور یتیم خانے میں موجود بچوں میں کوئی فرق نہیں لگتا کیونکہ اُن کو بھی لوگ پیسہ دیتے ہیں زندگی کی ہر سہولت دینے کی کوشش کرتے ہیں پر کوئی ماں باپ کا پیار نہیں دے سکتا دنیا میں کوئی بھی اُن کی وہ ایک کمی پوری نہیں کر سکتا اور نہ ہی اُن کی زندگی کا وہ خلاء

پُر کر سکتا ہے پر میں تو ماں باپ کے زندہ ہوتے ہوئے بھی اُن بچوں کی زندگیوں جیسا، ہی خلاء اپنی زندگی میں محسوس کرتا ہوں۔ میں تھک چکا ہوں، بس ہو چکی ہے میری، میں کوشش کرتا ہوں کہ میں اُن سے بد تمیزی نہ کروں پر جب وہ میرے شکوئے شکایات پر اپنے احسان جتنا شروع کر دیتی ہیں تو مجھے غصہ آ جاتا ہے میں برداشت نہیں کر پاتا اور ناچاہتے ہوئے بھی میں اُن سے بد لحاظ ہو جاتا ہوں جس کی بعد میں مجھے خود بھی تکلیف ہوتی ہے، لمبی سانس لیتے اُس نے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کرتے اپنی بات مکمل کی۔

”یہ تمہارا فرض ہے کہ وہ تمہیں جو بھی بولیں پر تم اُن سے نرمی کرو اور عزت سے پیش آؤ اور میں نے کتنی بار کہا ہے کہ جب بھی وہ کچھ کہیں تو خاموش ہو جایا کروتا کہ بعد میں پچھتا وانہ ہو“، زارون نے ہمیشہ کی طرح اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہم، چلو باہر چلتے ہیں۔ میرا دم گھٹ رہا ہے“، اُس کی بات سنتے ارحم نے کھڑے ہوتے ہوئے کرسی پیچھے کی جانب کی۔

”ٹھیک ہے چلو پر جانا کہاں ہے؟“ اُس کی کیفیت کو سمجھتے زارون نے مزید کوئی نصیحت کرنے سے خود کو باز رکھتے سوال کیا۔

”کہیں سکون والی جگہ چلتے ہیں“، اُس کی بات سنتے ہی ارحم نے جواب دیا اور کچن سے نکل گیا تو زارون بھی اُس کی تقلید کرتے ہوئے عابدہ بیگم کو باہر جانے کا بتاتے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا۔

”یہ کہاں لے آئے ہو تم مجھے؟“ زارون نے گاڑی سے باہر نظر آتے اُس کریم پارلر کو دیکھتے تنے ہوئے تاثرات کے ساتھ سوال کیا۔

”آنکھوں کی جگہ بُن فٹ کروئیں ہیں کیا؟ جو اتنا بڑا آنس کریم پارلر لکھا نظر نہیں آرہا“، گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکلتے ارحم نے آگے بڑھ کر اُس کی طرف کا بھی دروازہ کھولا۔

”نظر تو آرہا ہے پر سمجھ نہیں“، لفظوں کو چباتے زارون نے اُسے ایک گھوری سے نوازا جواب مسکر ا رہا تھا۔

”تم نے تو کہا تھا کہ کسی سکون والی جگہ پر جانا ہے تو کیا یہ سکون والی جگہ ہے؟“  
”ہاں تو اس سے زیادہ سکون والی جگہ کون سی ہو گی جہاں ٹھنڈی ٹھنڈی آنس کریم کے ساتھ ساتھ تم جیسی محبوبہ کا ساتھ ہو“، بائیں آنکھ دباتے ارحم نے اپنی ازی ڈھنڈائی برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا تو زارون نے چند ہی پلوں میں اُس کے بدلتے رویے کے بارے میں حیرت سے سوچا۔

”تم تو پریشان تھے نا؟ اور میرے گھر میں تمہارا دم گھٹ رہا تھا؟“، الجھی ہوئی نظروں سے اُس کی جانب دیکھتے زارون سے اُس کا چند ہی منٹوں میں بد لئے والا رویہ ہضم نہیں ہوا۔

”تو اس جگہ پہ کون سے کیڑے پڑے ہیں جو میں یہاں بیٹھ کر تمہیں اپنی پریشانی نہیں بتا سکتا یا یہاں کسی کو اپنی ٹیشن بتانا منوع ہے جو تم اتنے حیران ہو کر مجھ سے ایسے بے تکے سوال پوچھ رہے ہو؟“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر کی جانب لے جاتے ارحمنے اُس کے بار بار پوچھنے جانے والے سوالوں سے تنگ آتے کہا۔

”منوع نہیں ہے پر اس مہنگے ترین اُس کریم پار لرآنے کی کوئی خاص وجہ؟“، زارون کو اپنی جیب کی حالت کچھ خطرے میں محسوس ہوئی تب ہی اُس نے اندر جانے سے پہلے تمام بات واضح کرنا ضروری سمجھا۔

”یاروہ کیا ہے نا کہ پریشانی میں مجھے بھوک بہت لگتی ہے جس کی وجہ سے میرابی پی ہائی ہو جاتا ہے۔، شو گرو ہو جاتی ہے، بس اندر اک آگ سی لگ جاتی جسے بجھانے کے لیے یا تو کسی ٹھنڈی چیز کی ضرورت پڑتی یا پھر ڈاکٹر کی اور میں نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے تمہیں ہسپتا لوں میں خوار ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کی مہنگی فیس سے بچالیا، دیکھو تو مجھے کتنا خیال ہے تمہارا اور ایک تم ہو

کہ قدر ہی نہیں اس نایاب ہیرے کی، اپنی جانب اشارہ کرتے ارحم نے دروازہ کھولتے اُسے بھی اپنے ساتھ اندر دھکیلا۔

”شرم کر جاؤ یا رچار روٹیاں اور ایک کپ چائے کا پینے کے بعد بھی تمہیں بھوک لگی ہے تو تم سچ میں انسانوں کی فہرست سے باہر کی کوئی مخلوق ہو“، اُس کے سامنے کر سی پر بیٹھتے زارون نے اُسے شرم دلانی چاہی۔

”وہ تو بس میں نے آنٹی کا دل رکھنے کے لیے اُن کا کھانا چیک کیا تھا“، سر کے نیچے دونوں ہاتھ ٹکاتے ارحم نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”وہ صرف چیک کیا تھا؟ مطلب تم بس کھانا چیک کرنے میں چار روٹیاں کھا گئے؟ جان معدے میں کوئی پلانٹ فٹ کروالیا ہے کیا؟“، زارون نے اُس کی بات سنتے ہی تیوری چڑھائی۔

”نہیں جانی پلانٹ فٹ نہیں کروایا بس تیرے یار کے معدے میں طاقت ہی اتنی ہے کہ لکڑ، پتھر سب ہضم ہو جاتا ہے اور تم وہاں بیٹھے کیا میری روٹیاں گن رہے تھے جو تب سے چار چار روٹیوں کا کہتے طعنے مار رہے ہو“، اپنی تعریف کرتے ارحم نے اُسے مشکوک نظر وہ سے دیکھتے آنکھیں سُکیریں۔

”نہیں، میں کیوں گنے لگا میں نے تو بس اندازہ لگایا کہ تم دکھ کم کرنے کے لیے کس حد تک کھاتے ہو“، اُس کی بات پر گڑ بڑاتے ہوئے زارون نے وضاحت دی تو ارحم نے اُسے گھورتے ہوئے ٹیبل پر پڑا مینو کا رڈاٹھا یا۔

”اپنے اندازے مجھ پر ضائع کرنے کی بجائے اپنی حالت پر دھیان دو اور شرم سے ڈوب مر واتنے ہینڈ سم لڑکے کے ساتھ اس طرح بھکاریوں کے حلیے میں باہر آکر اُس کی بے عزتی کروادی“، ارحم نے ویٹر کواشارے سے بلاتے زارون سے کہا جوا بھی تک رات والے ٹراوُز رشرٹ میں ملبوس تھا۔

”ہینڈ سم لڑکا اور تم؟ ہاہاہا بس کرو اور ہاں میں اس حلیے میں بھی شہزادہ لگ رہا ہوں“، بالوں میں ہاتھ پھیر کر ان کو سیٹ کرتے زارون نے ذرا بھی بے عزتی محسوس نہیں کی۔ ”خوش فہمی کا کوئی علاج نہیں“، ویٹر کو آرڈر لکھواتے ارحم نے حساب برابر کیا تو زارون نے نفی میں سر ہلا یا۔

”تم کبھی نہیں سدھ سکتے“

”تم بھی نہیں اور کیا تم یہ ہر وقت میری جاسوسی کرتے رہتے ہو، کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ آنٹی نے کچھ کہا ہے؟ ہوننہ مجھے تم دوست کم اور بیوی زیادہ لگتے ہو جو دن کے چوبیں گھنٹے میری ہر

حرکات پر نظر رکھے سوال پہ سوال کرتے رہتے ہو۔ ویسے یہ تمہیں پتا کیسے چل جاتا ہے کہ میرا موڈ خراب ہے؟، آس کریم آتے ہی ارحم نے اُس سے انصاف کرتے زارون کو باتوں میں لگایا۔

”تمہاری یہ رونی صورت دیکھ کر جو خصوصاً اُسی وقت بنتی ہے جب تمہاری کسی نے رکھ کر بے عزتی کی ہوا اور تم نے اُسے بے شرمی سے نظر انداز کرنے کی بجائے محسوس کر لی ہو“، زارون نے دوسری بار اُس کا اپنے کپ کی جانب بڑھتا ہاتھ دیکھ کر اُس پہ ہاتھ مارتے پیچھے کیا۔

”ہونہ بس کرو اب اتنا بھی بے شرم نہیں ہوں کہ کوئی میری بے عزتی کرتا رہے اور میں آگے سے مسکراتا رہوں“، زبردستی ایک اور چمچے اُس کے کپ سے بھرتے ارحم نے منہ بسورا۔

”ہاں اتنے بھی نہیں ہوا اور یہ کیا تم میری ساری آس کریم کھا گئے۔ ارحم شرم کرو اپنا کپ نظر نہیں آرہا کیا تمہیں“، زارون نے کپ کی طرف دیکھتے اُسے ٹوکا جواب تیزی سے اپنا کپ ختم کرنے میں مصروف تھا۔

”شرم تمہیں کرنی چاہیے مجھ معموم پر اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے بس دو چمچے چیک کرنے کے لیے لیے تھے میں نے اور کہہ رہے ہو پورا کپ ختم کر دیا“، دو مزید چمچے بھر کر اپنے منہ میں ڈالتے ارحم نے ویٹر کو ایک اور آس کریم اور بل لانے کا کہا۔

”رہنے دو مجھے نہیں کھانی“، آدھے سے زیادہ خالی ہوئے کپ کو دیکھتے زارون نے انکار کرتے اُس میں سے ہی چمچہ بھر کے منہ میں رکھا۔

”اپنے لیے منگوائی ہے تمہارے لیے نہیں“، زارون کے انکار پر اُسے شرمندہ کرتے وہ ویٹر کی جانب متوجہ ہوا۔

”سری یہ آپ کی آنس کریم اور یہ بل“، ٹیبل پر دونوں چیزیں رکھتے اُس نے مودب انداز میں کہا۔  
”یہ لو...“، آئسکریم اپنے آگے کرتے ارحم نے بل زارون کے سامنے کھسکھایا تو اُس نے اپنی جیب کو ہاتھ لگاتے ہی کھانسنا شروع کر دیا۔

”کیا ہوا؟ لگتا ہے آئسکریم گلے کو لگ گئی“، اٹھ کر اُس کی پشت کو سہلا تے ارحم نے فکرمندی کا اظہار کیا۔

”آئسکریم نہیں بلکہ تیری بات گلے کو لگی ہے“، منہ کے آگے ہاتھ رکھتے زارون نے ویٹر کی وجہ سے آہستگی سے کہا۔

”کیا مطلب؟“، نیچے جھکتے ارحم نے ناسمجھی سے پوچھا۔ ”مطلوب کہ میرے پاس پسی نہیں ہیں والٹ تو گھر ہے میرا“، ویسے ہی منہ پہ ہاتھ رکھتے زارون نے اُس کے کان کے قریب سرگوشی کی

تو اُس نے نظر اٹھا کر سامنے کھڑے ویٹر کو دیکھا جو انہیں آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کرتا دیکھے رہا تھا۔

”مطلوب تم والٹ نہیں لائے؟“  
”نہیں...“، زارون نے لنفی میں سر ہلا کیا۔

”بھاڑ میں جاؤ اور ڈوب مرو، شرم نہیں آتی خالی ہاتھ دوست کے ساتھ آتے ہوئے وہ بھی ایسا دوست جو صحیح سے بھوکا تھا“، اُس کی کمر پر ایک مکار سید کرتے ارحم ویٹر کی جانب دیکھ کر مسکرا یا جو اب ماتھے پر بل ڈالے کھڑا تھا۔

”سراینی پر ابلم؟“  
”نو، نو پر ابلم آپ جائیں ہم بل پے کرتے ہیں“، زارون نے اپنی کمر سہلاتے اُسے کھا جو اثبات میں سر ہلاتے وہاں سے چلا گیا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ اور مجھے کیا پتا تھا کہ تم سکون کی خاطر اس آسکریم پارلر میں آگھسو گے اگر پتا ہوتا تو والٹ ساتھ لاتا“، ویٹر کے جاتے ہی زارون نے اُسے ڈپٹا۔

”پتا ہونا چاہیے تھا کہ دوست گھر سے لڑ کر بے سہارا اور بے آسرا ہو کر آ رہا ہے۔ وہ تو سیل خوش قسمتی سے میری جیب میں ہی تھا جس سے میں نے تمہیں فون کر لیا ورنہ تو سارا دن بھوکا ہی

رہتا، اُس کی بات سنتے ہی ارحم نے چہرے پر افسردگی سجائتے ٹیبل پر پڑی آئی اسکریم کو دیکھا جو ان کی باتوں میں پکھل چکی تھی۔

”بکواس نہ کرو اور یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے،“ زارون نے چھ سو دس روپے کابل دیکھتے اُسے مزید ڈرامے کرنے سے روکا۔

”کرنا کیا ہے یہاں سے بھاگ جاتے ہیں یا پھر تھوڑے برتن دھو دیتے ہیں،“ ارحم نے افسردگی سے مشورہ دیا تو زارون نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”لعنت ہے تم پہ اور تمہارے مشورے پہ اور مو باکل ہے تمہارے پاس؟، لفظوں کو چباتے زارون نے اچانک دماغ میں آنے والے خیال پر سوال کیا۔

”ہاں ہے...“

”تو پھر جمال کو کال کر کے اُسے کہو تمہارا والٹ دے جائے میرے گھر میں توامی ہی ہیں،“ زارون نے فوراً سے مسئلے کا حل نکالا۔

”بیلنس نہیں ہے۔ میں نے ایڈوانس منگوا کر تمہیں کال کی تھی،“ اُس کی بات سنتے ہی ارحم نے بے نیازی سے جواب دیا جسے سنتے ہی زارون کو خود پہ غصہ آیا جو بغیر سوچے سمجھے ہی ارحم کے غم میں شریک ہونے کے لیے اُس کے ساتھ آگیا تھا۔

”اففف اب کیا کریں؟“ پریشانی سے ادھر ادھر دیکھتے زارون نے یہ آئندیا بھی فیل ہونے پر افسردگی سے سوچا۔

”مجھے کیا پتا اور تم اور کھالوں تنے مہنگے آئسکریم پار لر میں آئس کریم“، ارحم نے سارا الزام اُس پر ڈالتے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”میں کھالوں؟ اور یہاں تم مجھے لائے ہو میں نہیں“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے ہونقوں کی طرح منہ کھولا۔

”بس کرو میں لا یا تھا پر مجھے کیا پتا تھا کہ تم خالی ہاتھ منہ اٹھائے میرے ساتھ آگئے ہو“، جیب سے موبائل نکال کر ٹیبل پر رکھتے ارحم نے اپنی جیبوں کی تلاشی لیتے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”بس کرو اور زیادہ بکواس نہ کرو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر نہر میں پھینک دوں گا“، زارون نے اُس کی باتوں سے ٹنگ آتے دھمکی دی۔

”مجھے نہر میں پھینکنے سے بہتر ہے کہ تم یہ سوچو کہ پیسوں کا انتظام کھاں سے کرنا ہے ورنہ یہ لوگ ہمیں ان سب لوگوں کے سامنے ذلیل کریں گے“، اپنی بائیں جیب کو ٹھوٹلتے ارحم نے دوسرے ٹیبلز پر بیٹھے لوگوں کی جانب اشارہ کیا۔

”سوق لیا“

”کیا؟“

”یہی کہ منت کر لیتے ہیں ان کی یا برتن دھو دیتے ہیں“، زارون نے اپنی طرف سے ایک بہتر حل نکالا۔

”ہونہ لعنت ہے تیری سوچ پہ“، اُس کی ترکیب پہ بد مزہ ہوتے ارحم نے ماتھے پہ بل ڈالے۔  
”ٹھیک ہے پھر تم خود ہی سوچ لو“

”خالی پیٹ مجھ سے کچھ نہیں سوچا جاتا نہ کچھ سمجھ آتی ہے پر پھر بھی میرے پاس ایک حل ہے“، زارون کی بات سنتے ہی ارحم نے مسکین سی صورت بنائی۔

”کیا؟“، زارون نے بے زاری سے پوچھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ارحم کبھی کوئی سیدھی بات نہیں کر سکتا۔

”ہم کچھ دیر منہ چھپا کر سکنل پر بھیک مانگ لیتے ہیں“، ”ٹھیک ہے تم مانگ آؤ میں یہی بیٹھا ہوں کیونکہ ہم دونوں کو تو یہ جانے نہیں دیں گے“، اُس کی ترکیب پر غصے سے لال ہوتے زارون نے دانت پسیے تو ارحم نے ویٹر کو آواز دی۔

”اب اسے کیوں بُلا...؟“، زارون کے الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے جب ارحم نے جیب سے ایک ہزار کانٹ نکال کر بل والی ڈائیری میں رکھا۔

”میں تمہارا گلاد بادوں گا“، زارون نے اُس کی چالاکی سمجھتے ہی ٹیبل پر پڑا آس کریم کا کپ اٹھایا تو ارحم نے اُس کا رادہ بھنا پتے ہی کرسی سے اٹھتے باہر کی جانب دوڑ لگائی۔

”زارون میری بات سنو“، دوڑتے ہوئے اُس نے کچھ بتانے کی کوشش کی پر اُس سے پہلے ہی زارون نے پگھلی ہوئی چاکلیٹ سے بھرا کپ اُس کی طرف اچھا لاجو بروقت سائیڈ پر ہونے پر پیچھے سے آتی لڑکی کے چہرے پہ جا گرا۔

”کیا ہوا؟“، زارون کو ساکت کھڑا دیکھ کر ارحم نے سوالیہ نظر وں سے پوچھا تو اُس نے پیچھے کی جانب اشارہ کیا۔ ”سوری سستر“، پیچھے کھڑی لڑکی پر نظر پڑتے ہی ارحم نے اپنی ہنسی دباتے معذرت کی جس کے چہرے اور بالوں سے چاکلیٹ ٹپک رہی تھی۔

”میں بتاتی ہوں تمہیں سوری کے بچے“، غصے سے چینتے اُس لڑکی نے اپنے جوتے کی جانب ہاتھ برٹھایا تو ان دونوں نے خطرے کے پیش نظر کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر باہر کی جانب دوڑ لگائی۔

-----

”اُفف یار تم نے تو آج مر واہی دینا تھا“، ارحم نے ڈرائیوںگ کرتے اپنا پسینہ صاف کیا جو تیز بھاگنے کی وجہ سے بار بار آ رہا تھا۔

”ہاں اب سارا ملبہ مجھ پہ ڈال دو“، زارون نے اے سی کی سپید بڑھاتے ہوئے اپنی سانس بحال کی۔

”قصور ہی تمہارا تھا۔ جب مجھے نیچے ہوتا دیکھے چکے تھے تو پھر کیوں گرائی تھی آنس کریم“، لڑکی کے جو تے کو یاد کرتے ارحم نے جھر جھری لی۔

”ہوننہ مجھے کیا پتا تھا کہ عین وقت پر تمہارا دماغ کام کر جائے گا جو بچارہ سالوں سے استعمال نہ ہونے کی وجہ سے ناکارہ ہو چکا ہے“، زارون نے صاف لفظوں میں ارحم کی بے عزتی کی۔

”بکواس نہ کرو اتنا بھی ناکارہ نہیں ہے میرا دماغ اور ویسے بھی میں اسے تمہاری طرح فضول باتوں میں ضائع نہیں کرتا“، اس کی بات کو محسوس کیے بغیر ارحم نے فخر سے گردن اکڑائی۔

”ہاں اچھی بات ہے کیا بھی نہ کرو، پہلے ہی تھوڑا سا ہے اور اگروہ بھی فضول باتوں میں ضائع ہو گیا تو پچھے صرف یہ کھوپڑی رہ جائے گی“، اس کے سر پر چیت لگاتے زارون نے اپنی بات مکمل کی۔

”ہوننہ بس کرو میری کھوپڑی بھی نایاب ہے ایسی کھوپڑیاں صدیوں بعد بنتی ہیں۔ ویسے یاد مجھ سے ایک بہت بڑی غلطی ہو گئی“، ارحم نے زارون کی بات سننے ہی کہا۔

”کیا غلطی ہوئی ہے؟“

”یہی کہ تمہیں دوچار جوتے پڑھی جانے دیتا تاکہ تمہاری عقل ٹھکانے آجائی جو بار بار مجھے بے عزت کرنے کے بہانے ڈھونڈتی ہے“، موڑ کا ٹنے ارحمنے تیوری چڑھائی۔

”ہاں مجھے پڑتے اور تمہیں تو جیسے وہ بخش دیتی نا“، زارون جو اُس سے کسی اور بات کی توقع کر رہا تھا اُس کے منہ سے جو توں کا سنتے بد مزہ ہوا۔

”ہاہاہاویسے یار مزہ بہت آیا اُس لڑکی کی شکل دیکھی تھی تو بے سارے میک اپ پر تم نے آئسکریم پھیر دی وہ بھی چاکلیٹ والی“، بات کرتے اُس نے ہاتھ آگے کیا تو زارون نے بھی مسکراتے ہوئے اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔

”ہاں یہ تو ہے اور یہ تم اب کہاں لے کر جا رہے ہو مجھے؟“، زارون نے کسی اور راستے پر اُسے گاڑی ڈالتا دیکھ کر سوال کیا۔

”مار کیٹ شاپنگ کرنے“، والٹ گاڑی کے ڈیش بورڈ سے نکلتے زارون کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ارحمنے ایک بار پھر سے اُسے بھڑکایا۔

”شرم کر لو اور میں بھولوں گا نہیں جتنا تم نے آج مجھے ذلیل کیا ہے“، اُس کے ہاتھ سے والٹ جھپٹتے زارون نے بل والی بات یاد آتے ہی اُسے گھورا۔

”ہاہاہایہ بھی خوش قسمتی ہے کہ والٹ کل کاڈیش بورڈ میں ہی پڑا ہے اور جیب میں ایک ہزار میں نے جمال کو دینے کے لیے رکھا تھا“، اُس کے ہاتھ سے والٹ لیتے ارحمنے وضاحت دی۔

”اچھا بس مجھے گھر چھوڑ دو، مارکیٹ کل جائیں گے ابھی امی گھر میں اکیلی ہیں ابو نے بھی آج نہیں آنا تو وہ پریشان ہوں گی“، شام ہوتی دیکھ کر زارون نے ارحمنے کہا جس نے اُس کی بات سنتے ہی اثبات میں سر ہلاتے گاڑی پیچھے کی جانب رسیورس کی۔

-----

”رابعہ مجھ سے اب اور نہیں چلا جائے گا“، نور جو آج یونیورسٹی کی بجائے اُس کے ساتھ شاپنگ کرنے کے لیے مال آئی تھی اُس نے کچھ دیر چلنے کے بعد وہاں سائیڈ پر لگی کر سیوں میں سے ایک پر بیٹھتے کہا۔

”کیوں کیا ہوا؟ کیا پاؤں میں درد ہے“  
 ”نہیں میرے دماغ میں درد ہے کیونکہ تم نے ساری مارکیٹ چار گھنٹے لگا کے گھومی ہے اور پھر بھی تمہیں ایک چیز بھی پسند نہیں آئی۔ مجھے تو ارحمنے کیسے تمہارے ساتھ گزارا کریں گے“، ایک ہی سانس میں بولتے نور نے افسوس سے نفی میں سر ہلا�ا۔

”اچھا یا بس اب کوئی اچھی چیز خریدنے کے لیے محنت تو کرنی پڑتی ہے نا اور مجھے تو اپنے سب سے اہم دن کے لیے ڈریں لینا ہے وہ بھی سب سے بیسٹ تو ظاہم تو گے گا، ہی۔ تمہیں بتتا ہے ارحام کے پاپا کافی بڑے بنس میں ہیں اور ان کی جان پہچان اونچے اونچے لوگوں کے ساتھ ہے اور آسمہ آنٹی؟ تم انہیں دیکھ لونا تو کبھی مانو، ہی نہ کے وہ ارحام کی امی ہیں“

”کیوں وہ کیا بھی ہیں ابھی؟“ اُس کی بات غور سے سنتے نور نے فٹ سے سوال کیا۔

”أفف نور، وہ بچی نہیں ہیں اور میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے خود کو اتنا فٹ رکھا ہوا کہ ابھی تک ہماری طرح ینگ لگتی ہیں اور ان کا لباس، جیولری سب اتنا پیار اور مہنگا ہوتا ہے کہ انسان بس دیکھتا ہی رہ جاتا ہے“، اُس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے رابعہ نے حسرت سے کہا۔

”تو ان سب باتوں کا تمہارے ڈریں سے کیا تعلق؟“ نور کو ابھی بھی اُس کی بات سمجھ نہیں آئی تھی تب ہی اُس نے اپنی بات دھرائی۔

”تعلق یہ ہے کہ میں چاہتی ہوں کہ میرا لباس اور جیولری اُتنی مہنگی نہ بھی ہو پر ان کے معیار کے مطابق تو ہوتا کہ مجھے یا میرے والدین کو کسی کے سامنے شرمندگی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور مجھے اندازہ ہے کہ وہ لوگ میلگنی کو بھی شادی کے فنکشن سے کم نہیں سمجھیں گے“، رابعہ نے کھل کر اُسے اپنی پریشانی سے آگاہ کیا تو نور نے اُس سفید رنگت اور خوبصورت نقوش والی لڑکی کو دیکھا جو

کچھ بھی پہن لیتی تو اس پے پیار اللہ تھا پر آج خود کو کسی کے معیار پے لانے کی خاطر اسے مہنگی سے مہنگی اور خوبصورت چیزیں بھی اپنے اوپر بڑی لگ رہی تھیں۔ اُففف یہ پیسہ بھی انسان کو احساس کمتری کا شکار کر دیتا ہے رابعہ کی بات سننے ہی نور نے سوچا۔

”کیا ہوا؟ کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟“ اُسے گم صم اپنے خیالوں میں کھو یاد کیجھ کر رابعہ نے اُس کی آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔

”کچھ بھی نہیں۔ چلو چلتے ہیں پر اب پلیز کچھ پسند کر لینا“، کرسی سے اٹھتے نور نے کچھ کہہ کر اُس کا دل بُرا کرنے کی بجائے بات بدی۔

”ہاں ہاں پکا اب پسند کر لوں گی“، رابعہ نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر اُس کے ساتھ مار کیٹ کے دائیں جانب بڑھی جہاں ایک مشہور بر انڈ کے آٹ فٹ دور سے ہی دیکھنے والے کو اپنی خوبصورتی اور قیمت کا پتہ دے رہے تھی۔

”ماشاء اللہ بہت پیارا ہے یہ ڈر لیں“، رابعہ نے پچ کلر کے لہنگے پر نظر پڑتے ہی تعریف کی جس پر مختلف کلر سے کیا گیا نفس کام اور جگہ جگہ لگے قیمتی اسٹوں اُس کی خوبصورتی کامنہ بولتا ثبوت تھے۔

”ہاں یار سچ میں بہت پیارا ہے“، نور نے بھی لہنگے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے رابعہ کی پسند کو سراہا۔

”تو ٹھیک ہے یہی لے لیتے ہیں کلر بھی اچھا ہے اور آج کل کے فیشن کے مطابق بھی ہے“، رابعہ نے اُس ڈر لیس کو فائل کرتے ہوئے دکان دار کو اُس کی پیکنگ کا کہا اور نور نے شکر ادا کیا کہ پانچ گھنٹے خوار ہونے کے بعد آخر کار اُس کو ڈر لیس پسند آہی گیا۔

”بس اب اس کے ساتھ میچنگ جوتے اور جیولری خریدنی ہے پر پہلے کچھ کھا لیتے ہیں بہت بھوک گلی ہے“، رابعہ نے ڈر لیس کی پیمنٹ کرتے ہوئے کہا۔

”نهیں یار کھانے کو رہنے دو بس ڈر لیس کے ساتھ کی چیزیں مکمل کر لو پہلے ہی کافی ٹائم ہو گیا ہے“، نور نے ہاتھ پہ بند ھی گھٹری پر شام کے چھ بجتے دیکھ کر پریشانی سے کہا کیونکہ اُسے ظہیر صاحب کے آنے سے پہلے گھر پہنچنا تھا۔ ”ہونہ کھانے میں کون سا بہت ٹائم لگے گا بس جلدی سے کچھ ہلاکا پھلا کا کھا لیتے ہیں اور تم آنٹی کو کال کر کے بتا دو تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور تم بھی بے فکر رہو میں خود ہی تمہیں گھر چھوڑ دوں گی“، رابعہ نے اُسے اپنے ساتھ ہی کافی شاپ کی جانب لے جاتے تسلی دی۔

”اچھا ٹھیک ہے پر ہاتھ تو چھوڑو پھر ہی میں کال کروں گی“، نور نے اُس کی بات سنتے اپنے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا جوا بھی تک رابعہ کے ہاتھ میں تھا۔

”تم کال کر کہ بتاؤ میں آرڈر دے کر آتی ہوں“، اُس کا ہاتھ چھوڑتے رابعہ نے کہا اور کاؤنٹر کی جانب بڑھی۔

”السلام علیکم ماما“، دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی نور نے سلام کیا۔

”و علیکم السلام نور بیٹا کہاں رہ گئی ہو تم؟“ تین دیر لگادی میں نے کہا بھی تھا کہ ٹائم سے آجانا، نائلہ بیگم نے چولہا بند کرتے اُس کی آواز سننے ہی یاد ہانی کروائی۔

”ماما بس ابھی شاپنگ ہی کر رہے ہیں رابعہ کو کچھ پسند ہی نہیں آرہا تھا اور آپ پر پیشان نہ ہوں۔ میں بس تھوڑی دیر تک آجائوں گی اور رضا کیڈمی سے واپس آگیا ہے؟“ نور نے ماں کو تسلی دیتے سوال کیا۔

”ہاں وہ ابھی ابھی آیا ہے“، نائلہ بیگم نے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بتایا۔

”ٹھیک ہے بس آپ اُسے کہہ دیں کہ مجھے لینے مت آئے رابعہ خود ہی مجھے گھر چھوڑ دے گی اور آپ بھی پریشان مت ہوئے گا میں بابا کہ آنے سے پہلے گھر آجائوں گی“، نور نے ایک بار پھر سے انہیں تسلی دی اور اللہ حافظ کہتے کال کاٹ دی۔

” بتا دیا؟“ ٹرے ٹیبل پر رکھتے رابعہ نے اُسے کان سے موبائل ہٹا تا دیکھ کر سوال کیا۔

”ہاں بتادیا ہے پر اب جلدی کرو مجھے بابا کے آنے سے پہلے گھر پہنچنا ہے“، نور نے بر گراٹھاتے اُسے بھی کھانے کا کہا جو اُس کی بات سنتے خود بھی اپنا بر گراٹھاتے کھانے میں مصروف ہو گئی۔

---

کچھ دیر میں شاپنگ مکمل کرتے رابعہ نے نور کو اُس کے گھر چھوڑا تو اُس نے رابعہ کو اندر آنے کی دعوت دی جسے بخوبی قبول کرتے وہ اُس کے ساتھ گھر کے اندر داخل ہوئی جہاں اُن کا پہلا سامنا نائلہ بیگم سے ہوا۔

”السلام علیکم آنٹی کیسی ہیں آپ؟“، نور کے تعارف پر اُن کے سامنے سرجھاتے رابعہ نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔ ”اللہ کا شکر میں ٹھیک ہوں، آپ کیسی ہیں؟ اور شاپنگ ٹھیک سے ہو گئی آپ کی؟“، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے نائلہ بیگم نے نرمی سے پوچھا۔

”جی آنٹی میں ٹھیک ہوں اور شاپنگ بھی اچھے سے ہو گئی“، رابعہ نے نور کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا جو اُسے لاونج میں بٹھا کر خود کچن میں چلی گئی تھی۔

”اور امی ٹھیک ہیں، گھر میں سب ٹھیک ہیں؟“

”جی آنٹی سب ٹھیک ہیں اور نور یہ کیا ہے یا میں تو بس آنٹی سے ملنے آئی تھی“، رابعہ نے نور کو جوس کا گلاس تھامے دیکھ کر ٹوکا۔

”ایک جوس کے گلاس سے نہیں تم موٹی ہونے لگیں اس لیے چپ کر کے پی لو اور ہاں مجھے مسلسل چھ سات گھنٹے خوار کرنے کے بعد بھی تمہاری شاپنگ ٹھیک نہ ہوتی تو یہی گلاس میں نے تمہارے سر میں دے مارنا تھا“، نور نے گلاس اُسے تھماتے دھمکی دی تو نائلہ بیگم نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”گھر آئے مہمان سے ایسے بات کرتے ہیں؟ اور یہ خالی جوس کیوں لائی ہو؟ کھانا لگاؤ کھانے کا وقت ہے“، اُسے ڈپٹنے نائلہ بیگم نے حکم دیا۔

”نہیں آنٹی میں بس یہ جوس ہی پیوں گی، کھانا کسی اور دن کھالوں گی پہلے ہی کافی ٹائم ہو چکا ہے“، رابعہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا کھانا تیار ہے بس ابھی نور لگا دے گی زیادہ ٹائم نہیں لگے گا“، نائلہ بیگم نے اُس کی بات سنتے اصرار کیا۔

”نہیں آنٹی بس آپ کی چاہت کا بہت شکر یہ آپ نے کہا میں نے کھالیا، ان شاء اللہ کسی اور وقت آؤں گی تو ضرور کھا کر جاؤں گی“، جو س ختم کرتے رابعہ نے طریقے سے انہیں منع کیا اور دوبارہ پھر آنے کا کہہ کے اُن سے اجازت طلب کی اور ان کو اپنی ملنگی کا انویشن دیا۔

”آنٹی پلیز آپ لوگ ضرور آئیے گا میں آپ سب کا انتظار کروں گی“، کارڈ تھما تے رابعہ نے نرمی سے کہا۔

”جی بیٹا ہم ضرور آئیں گے اور اللہ پاک آپ کو بہت سی خوشیاں دے ماشاء اللہ بہت اچھی تربیت کی ہے آپ کے والدین نے آپ کی“، اُس کا گال تھکلتے نائلہ بیگم نے تعریف کی۔

”شکر یہ آپ بھی بہت اچھی ہیں اسی لیے میں بھی آپ کو اچھی لگی“، رابعہ نے ان کی تعریف پر مسکراتے ہوئے پر خلوص لمحے میں کہا۔

”مطلوب میں اچھی نہیں ہوں؟“، ان دونوں کو ایک دوسرے کی تعریف کرتا دیکھ کر نور جو ان دونوں کی اتنی مہذب باتوں میں خاموش کھڑی سُن رہی تھی اُس نے رابعہ کی بات سنتے فٹ سے سوال کیا۔

”نہیں، تم اچھی نہیں ہو بس آنٹی اور میں اپچھے ہیں، کیوں آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟“ نور کی بات سنتے رابعہ نے اُسے چڑانے کے لیے شرات سے کہتے نائلہ بیگم سے تصدیق چاہی جو مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئیں۔

”ہاں میں ہی بُری ہوں“، نور نے منہ پھلاتے اُن دونوں کو مسکراتا دیکھ کر شکایت کی تو رابعہ نے آگے بڑھتے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔

”ہم نے یہ کب کہا کہ تم بُری ہو ہم تو یہ کہہ رہے تھے کہ تم اچھی نہیں بلکہ بہت اچھی ہو“، اُس کا منہ بنادیکھ رابعہ نے اپنی بات کی وضاحت کی تو نور کے چہرے پر مسکراہٹ بکھری۔

”ہاں مجھے پتا تھا میں اچھی ہوں اور پیاری بھی ابھی صبح ہی مجھے بابا نے بتایا تھا“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے موڈ ٹھیک کرتے مزید اپنی دو چار تعریفیں کیں جس پر مسکراتے ہوئے رابعہ نے اثبات میں سر ہلا یا اور اُن دونوں کو اللہ حافظ کہہ کے باہر کی جانب بڑھی۔

”اما پلیز چائے بنادیں میں بہت تھک گئی ہوں“، رابعہ کے جاتے ہی نور نے ٹوی آن کرتے ماں سے فرما لش کی جو اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

”بنادوں گی پر پہلے کھانا کھالو تمہارے بابا بھی بس آنے والے ہوں گے اور میں جب تک نماز پڑھ لوں بہت ٹائم ہو گیا ہے“، نائلہ بیگم نے کہتے ہوئے کلاک کی طرف دیکھا۔

”ٹھیک ہے“، اُن کی بات پر سر ہلاتے اُس نے اپنی توجہ ٹوی کی جانب مرکوز کی۔

”آپ کیا ہے؟ جب سے آپ آئیں ہیں چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھایا ہوا ہے۔ ساری نیند خراب کر دی میری“، اپنے کمرے سے باہر آتے رضانے ریموٹ اُس کے ہاتھ سے جھپٹتے ٹوی بند کیا۔

”تم گھر میں تھے؟ مجھے لگا شائد کہیں باہر گئے ہو جو ابھی تک نازل نہیں ہوئے“، اُس کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھتے نور نے آنکھیں سُکریں اور ریموٹ واپس جھپٹتے ٹوی آن کیا۔

”میں گھر میں ہی تھا اور اب سے تقریباً تیس منٹ پہلے پر سکون نیند سور ہاتھا مگر پھر اک دم سے آپ کا نزول ہوا اور میری نیند کے ساتھ ساتھ سکون بھی بر باد ہو گیا۔ ویسے یہ آپ ٹوی پہ کار ٹوں دیکھ کر بجلی ہی ضائع کرتی ہیں اس سے اچھا ہے کہ شیشہ دیکھ لیا کریں“، اُسے اپنی جانب متوجہ نہ پا کر رضانے ایک مفید مشورہ دیا۔

”کیا مطلب؟“، اسکرین سے نظریں ہٹاتے نور نے ناممکنی سے سوال کیا۔

”مطلوب یہ کہ آپ بھی کسی کارٹون سے کم نہیں ہیں بالکل ڈرمی ہی لگتی ہیں“، جواب دیتے وہ اٹھ کر فٹ سے دوسرے صوف پر جا بیٹھا۔

”اگر میں ڈرمی ہوں تو تم بھی میرے بھائی ہونے کے ناتے ڈوری ہوں ہوئے نا اس لیے زیادہ بد تہیزی کرنے کی بجائے اپنے گریبان میں جھانکو“، پاس پڑا کشن اٹھا کر اُس کی طرف اچھاتے نور نے حساب برابر کیا۔

”آپ کیا مصیبت ہے۔ آپ شادی کیوں نہیں کر لیتیں“، اپنے سر پر لگنے والے کشن کو واپس صوف پر رکھتے رضانے بے زاری سے فرمائش کی۔

”نہیں کرنی مجھے شادی اور تمہیں میری شادی سے کیا فائدہ ہو گا جو ہر وقت مجھے یہی مشورہ دیتے رہتے ہو“

”میرا تو پرانے بانڈ نکل آنا اور آپ صرف فائدے کی بات کر رہی ہیں“، واپس اُس کے قریب آتے رضانے رازداری سے اُسے کان اپنے قریب لانے کا اشارہ کرتے کہا۔

”وہ کیسے؟“، پلکیں جھپکاتے نور نے دلچسپی سے سوال کیا۔ ”وہ اس طرح کے آپ کی شادی ہو جائے گی تو سارے گھر کے ساتھ ساتھ ماما بابا پہ بھی صرف میرا قبضہ ہو گا اور ہاں آپ سے اور آپ کی مار سے بھی میری جان چھوٹ جائے گی اور ابھی جو پیزا، بر گر، چاکلیٹ مجھے آدمی آپ کو

دینی پڑتی ہے وہ بھی ساری میں خود کھاؤں گا۔ ہر طرف بس میرا، ہی راج ہو گا،، اک خواب کی سی کیفیت میں اپنے سارے فائدے گنواتے اُس نے نور کو حیران کیا۔

”تم سچ میں ہر چیز پر قبضہ کر لو گے؟“ اُس کی بات غور سے سنتے نور کو تھوڑا دکھا ہوا۔

”ہاں جی بالکل، شہزادہ محترم ایک ظالم چڑیل کے قبضے سے اپنی سلطنت کو آزاد کروانے کے بعد خود اُس پر راج کریں گے،“ رعد دار آواز میں نور کو مزید جلاتے رضا نے اوپھی آواز میں کہا۔

”یہ چڑیل کس کو کہا تم نے؟ اور ہاں شکل دیکھی ہے اپنی؟ آئے بڑے شہزادہ محترم،“ اُس کی بات سُن کر چڑنے کی بجائے نور نے ایک زوردار تھپٹا اُس کے کندھے پر مارا۔

”آپ کو کہا ہے چڑیل کیونکہ آپ کے علاوہ میری زندگی میں ابھی تک کوئی دوسرا چڑیل نہیں آئی اور شہزادوں کو اپنی شکل دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ انہیں ان کی کنیزیں دیکھتی ہیں وہ بھی آپ جیسی غریب،“ شاہانہ انداز میں کہتے اُس نے صوفے کی بیک سے ٹیک لگاتے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی تو نور نے کنیز کے نام پر غصے سے سرخ ہوتے اُس کے بال پکڑے۔

”میں تمہیں نو کرانی نظر آتی ہوں؟“

”نظر نہیں آتیں بلکہ آپ ہیں وہ بھی بد تیز والی جو میرے جیسے خوبصورت شہزادے کی قدر نہیں کرتیں“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے رضا انے اعتماد کے ساتھ گردن اکڑائی تو نور نے کشن اٹھاتے اُس کے سر پہ دے مارا۔

”میں تمہیں بتاتی ہوں کہ کتنی قدر ہے تمہاری“، صوفے سے کشن اٹھا کر اُسے مارتے نور نے غصے سے چیختنے ہوئے ایک ہاتھ سے اُس کے بال پکڑے جو اپنے بچاؤ کے لیے اُسے پیچھے صوفے کی جانب دھکیلتے خود بھی زمین پر پڑا کشن اٹھا کر اُس کا مقابلہ کرنے لگا۔

”میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی“، رضا نے نور کے بال کھینچے تو اُس نے غصے کے مارے اوپنجی آواز میں نائلہ بیگم کو آواز دیتے رضا کے ہاتھ سے اپنے بال چھڑوانے کی کوشش کرتے اُس کے بال بھی پکڑ لیے جواب جنگ کو آخری حد تک لڑنے کے موڑ میں تھا پر ایک گرج دار آواز پر وہ دونوں ہی ہوش میں آئے۔

”کیا ہو رہا ہے یہ سب؟“، ظہیر صاحب نے اُن دونوں کو آپس میں گھقتم گھتنا ہوتے دیکھ کر گرج دار آواز میں پوچھا جو جلدی سے ایک دوسرے کے بال چھوڑے کھڑے ہو چکے تھے۔ ”میں پوچھ رہا ہوں کیا ہو رہا ہے یہ سب؟“، زمین پر پڑے کُشنز کو ایک نظر دیکھتے انہوں نے اُن دونوں کے سر پر پہنچنے پھر سے استفسار کیا جو اپنی اپنی جگہ ساکت ہو چکے تھے۔

”کیا ہوا اب؟ کانوں میں سیسیہ ڈال لیا ہے یا زبان کو قفل لگ گیا جو میری بات سمجھ نہیں آرہی آپ لوگوں کو“، ان کی خاموشی پر مزید تپتے ظہیر صاحب نے آنکھیں دکھائیں۔

”و۔۔۔ہ ب۔۔۔ ب۔۔۔ و۔۔۔ہ“، ان کے غصے سے خالف ہوتے نور نے ہکلاتے ہوئے کچھ بولنے کی کوشش کی پر ناکام رہی۔

”کیا ہوا؟“، ظہیر صاحب کی غصے بھری آواز سنتے نائلہ بیگم سلام پھیر کے باہر آئیں اور ان دونوں کو سرجھکائے کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگیں تو ظہیر صاحب نے انہیں اشارے سے خاموش رہنے کا کہا۔

”میں نے پوچھا ہے کچھ آپ دونوں سے“، انہیں چپ کرواتے ظہیر صاحب نے ہاتھ اپنی کمر پر باندھتے نور اور رضا کو دیکھا جو نظریں جھکائے کھڑے تھے۔

”وہ بابا، نور آپی نے پہلے...“، رضا نے تھوک نگتے اپنے بچاؤ کے لیے آواز اٹھائی جو ظہیر صاحب کی گھوری پروہیں گلے میں اٹک گئی۔

”ہوا کیا ہے؟“، ان دونوں کی اتریں صورتیں دیکھ کر نائلہ بیگم نے آگے بڑھتے مداخلت کی۔

”ہونا کیا ہے۔ میں آیا تو دونوں ایک دوسرے کے بال پکڑے لڑنے میں مصروف تھے اور دیکھ نہیں رہیں کہ لاونج کی کیا حالت کی ہوئی ہے“، ادھر ادھر بکھریں چیزوں کی جانب اشارہ کرتے ظہیر صاحب نے نائلہ بیگم کو معاملے سے آگاہ کیا۔

”اچھا بس جانے دیں بچے ہیں“، انہیں غصے میں دیکھ کر نائلہ بیگم نے بات رفع کرنے کی کوشش کی۔

”بچے ہیں یہ؟ اتنے بڑے ہو گئے ہیں اور آپ ان کی غلطی پر سمجھانے کی بجائے انہیں بچے کہہ کر مزید شدے رہی ہیں“، ان کی بات سنتے ہی ظہیر صاحب نے ٹوکا اور ان دونوں کی جانب دیکھا جو

سر جھکائے ایسے کھڑے تھے جیسے ان سامعصوم کبھی پیدا ہی نہیں ہوا۔

”اچھا میں سمجھادوں گی آپ زیادہ غصہ نہ کریں بی پی ہائی ہو جائے گا اور تم دونوں سوری بولو اپنے بابا سے“، ان کا غصہ ٹھنڈا کرتے نائلہ بیگم نے نور اور رضا سے کہا جنہوں نے ماں کی بات سنتے ہی جلدی سے سوری بولا۔

”مکان پکڑ لو اور جب تک میں نہ کہوں چھوڑ نے نہیں“، اپنا حصتی فیصلہ سناتے وہ ان دونوں کو کانوں کی طرف ہاتھ لے جاتا دیکھ کر غصے سے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے کی جانب بڑھے۔

”تمہاری وجہ سے ہوا ہے یہ سب“، ظہیر صاحب کے کمرے میں جاتے ہی نور نے پھر سے رضا کو ایک تھپڑ مارا۔

”آپ نے مارا تھا پہلے، میں نے نہیں جو مجھ مخصوص کو الزام دے رہی ہیں“، کان چھوڑتے اُس نے آگے سر کرتے ظہیر صاحب کے اندر جانے کا یقین کرتے پھر سے نور کے بال کھینچے جو پوری طرح سے بکھرے ہوئے تھے۔

”بابارضا پھر سے میرے بال کھینچ رہا ہے“، نور نے اوپنچی آواز میں آواز لگانا چاہی پر اُس سے پہلے ہی رضا نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے اُسے خاموش کروایا۔

”پلیز معاف کر دیں“، جلدی سے کان پکڑتے رضا نے اُسے معافی مانگی جو نائلہ بیگم کی گھوری کی تیز نظر پر پہلے ہی خاموش ہو چکی تھی۔

”تم دونوں بازا جاؤ اور سکون سے کھڑے رہو نہیں تو اور ڈانٹ پڑے گی“، نائلہ بیگم نے کھانا لگاتے اُن دونوں کو آپس میں پھر سے بحث کرتا دیکھ کر آہستہ آواز میں سمجھایا۔ ”ما اس نے مجھے چھیڑا ہے“، نور نے ساری بات رضا پہ ڈالتے ہوئے پھر سے کان پکڑ لیے۔ رضا جو اپنی صفائی میں کچھ کہنے ہی والا تھا ظہیر صاحب کو دیکھتے خاموشی سے کان پکڑ کے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

”کھانا کھاؤ آ کے اور میں دوبارہ ایسے لڑتا ہوانہ دیکھوں تم دونوں کو“، ظہیر صاحب نے اُن کو خاموشی سے کان پکڑے سر جھکائے کھڑا دیکھ کر تنبیہ کی تو وہ جی بابا کہتے ہوئے کھانے کے لیے ٹیبل کی جانب بڑھے۔

”اتنی دیر کہاں لگا کر آئے ہو؟ اور اپنا موبائل ساتھ کیوں نہیں لے کر گئے تھے؟“ عابدہ بیگم نے اُسے لاونچ میں داخل ہوتے دیکھ کر فلکر منڈی سے پوچھا۔

”وہ امی بس میں بھول گیا تھا اور میں ارحم کے ساتھ ہی تھا،“ اُن کے قریب آتے زارون نے جواب دیا اور اُن کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

”اتنی بار کہا ہے تمہیں کہ جہاں بھی جانا ہوتا ہے موبائل یاد سے لے کر جایا کروتا کہ اگر دیر بھی ہو جائے تو انسان گھروالوں کو بتا سکے،“ اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے عابدہ بیگم نے نصیحت کی۔

”جی ٹھیک ہے آئندہ سے احتیاط کروں گا اور یہ ابو نے تو صحیح بتایا تھا کہ وہ آج ضروری میٹنگ کے سلسلے میں لا ہو رجائیں گے پھر گھر کیوں آگئے مطلب میٹنگ کینسل ہو گئی ہے کیا؟“ احمد صاحب کی گاڑی باہر گیرا ج میں کھڑی دیکھ کر زارون نے سر اٹھاتے سوال کیا۔

”ہاں میٹنگ کینسل ہو گئی تھی اسی لیے وہ چار بجے ہی گھر آگئے تھے،“ عابدہ بیگم نے اُس کی بات کا جواب دیتے پچھے دیکھا جہاں معاذ انہیں مزید کچھ کہنے سے روک رہا تھا۔

”پرابو تو کہہ رہے تھے بہت ضروری میٹنگ ہے پھر کینسل کیوں کی؟“ ماں کی بات سننے، ہی زارون نے پریشانی سے پوچھا۔

”میرے آنے کی خوش میں مائی سویٹ برادر“، پچھے سے اُس کی آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے معاذ نے اُس کے کان کے قریب ہوتے کہا تو زارون نے جلدی سے اُس کے ہاتھ ہٹاتے اپنے پچھے کھڑے معاذ کو بے یقین سے دیکھا۔

”تم؟ تم کیسے آئے؟ مطلب کب آئے؟ اور مجھے آنے کے بارے میں بتایا کیوں نہیں؟“ صوف سے اُٹھتے زارون نے خوشی کے مارے ایک ساتھ ہی کئی سوال کر ڈالے۔

”بتا دیتا تو تمہاری یہ خوشی کیسے دیکھتا“، اُس کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر معاذ نے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھے۔

”ہونہ مطلب چوری چھپے آکر ہمیں سر پر انزدیا ہے“، اُس کے گلے لگتے زارون نے تصدیق چاہی۔

”ہاں بس کچھ ایسا ہی سمجھ لو“، اُس سے الگ ہو کر معاذ نے پھر سے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا جو آج سے دو سال پہلے تک بالکل بے رونق سا ہو گیا تھا۔

”سر پر اُن بہت اچھا تھا اگر تم بتا کر آتے تو کم از کم میں تمہیں لینے ہی آ جاتا“، اُس کے ساتھ صوفے پر بیٹھتے زارون نے شکوہ کیا۔

”ٹھیک ہے آگے سے بتا کر آؤں گا تاکہ تمہیں بھی میری خدمت کا موقع مل سکے، اور سناؤ کہاں سے آوارہ گردی کر کے آ رہے ہو؟“

”کہیں سے بھی نہیں بس ارحام کے ساتھ باہر گیا تھا وہیں ٹائم لگ گیا پر اگر تمہارے آنے کا پتا ہوتا تو وقت پر آ جاتا“، اُس کی بات کا جواب دیتے زارون کو اپنے دیر سے گھر آنے پر ملاں ہوا۔

”اچھا خیر ہے۔ میں کون سا کہیں بھاگا جا رہا ہوں، ابھی دو مہینے تک یہی ہوں تمہارے پاس“، اُس کی شرمندگی کم کرتے معاذ نے تسلی دی اور عابدہ بیگم کی جانب متوجہ ہوا جو اُس سے کھانا لگانے کا پوچھ رہی تھیں۔

”جی امی لگادیں مجھے بہت بھوک لگی ہے۔ بس زارون کے آنے کا ہی انتظار کر رہا تھا“، معاذ نے اُن کی بات سننے کہا۔ ”ٹھیک ہے، میں ابھی لگاتی ہوں تم اٹھو اپنے ابو کو آواز دو اور زارون تم ذرا میرے ساتھ کچن میں آؤ“، اُسے وہاں سے کھسکنے کے لیے تیار دیکھ کر عابدہ بیگم نے آواز لگائی۔

”اُفف امی میں لڑکی ہوں کیا؟ جو آپ ہر وقت مجھ سے کچن کے کام کرواتی رہتی ہیں“، معاذ کو آنکھیں دکھاتے زارون نے اُن کے پچھے ہی کچن میں داخل ہوتے منہ بسورے شکایت کی۔

”فکر نہ کرو تم اتنا سا کام کرنے سے لڑکی نہیں بننے لگے اس لیے چپ کر کے میری مدد کرو۔ میں بھی صحیح سے گلی ہوں بس ہو گئی ہے میری کام کر کر کہ پر یہاں تو سب کو بس اپنی اپنی پڑی ہے“، اُس کی شکایت پر اپنے ہی شکوئے سناتے عابدہ بیگم نے چولہا جلا یا تو زارون نے دوسری طرف پارہ ہائی دیکھ کر خاموشی اختیار کی اور ٹیبل پر برتن لگانے لگا۔

---

”اٹھ جاویار میں تمہارے لیے اتنی دور سے آیا ہوں اور تمہیں یہاں سونے سے ہی فرصت نہیں“، معاذ نے کہتے ساتھ ہی زارون کے اوپر سے کمبل کھینچا جورات کھانا کھانے کے بعد اُس سے باتیں کرتے کرتے اُسی کے کمرے میں ہی سو گیا تھا۔

”کیا مصیبت ہے سونے دونا“، نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہتے زارون نے تکیہ اٹھا کر اپنے چہرے پر رکھا۔

”دن کے بارہ نجح چکے ہیں اور ابھی بھی تمہیں سونے کی پڑی ہے۔ کچھ شرم کرلو“، تکیہ کھینچتے معاذ نے ایک بار پھر سے اُسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

”افففف یار کیا مسئلہ ہے رات دو بجے تک تم نے مجھے اپنی باتوں کے چکر میں جگائے رکھا اور اب صح ہی صح پھر سے میرے سر پہ کھڑے ہو کر لیکھ رہے گئے ہو،“، جس بھلا کر آنکھیں کھولتے زارون نے ایک ناراض نظر اُس پہ ڈالی جو ہاتھ میں تکیہ پکڑے کھڑا تھا۔

”ہونہ بس کرو پتا ہے مجھے جو تم نے دو بجے تک باتیں کی مجھ سے، توبہ گیا رہ بجے ہی منه کھولے سو گئے تھے،“، ہاتھ میں پکڑا شاپر اُس کی نظروں کے سامنے لہراتے معاذ نے اُس کی کھنچائی کی۔

”یہ کیا ہے؟“ اُس کے ہاتھ سے شاپر لیتے زارون نے نظروں میں اشتیاق لیے سوال کیا اور اٹھ کر بیٹھا۔

”گفت ہے تمہارے لیے، رات کو سامان نہیں کھولا تھا اس لیے دے نہیں پایا،“، تفصیل بتاتے وہ تکیہ بیٹھ پر رکھتے ہوئے اُس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”کیا گفت ہے؟“، شاپر سے ڈبہ نکال کر اُسے دینیں بائیں سے دیکھتے اُس نے پوچھا تو معاذ نے لاپرواں سے کندھے اچکائے۔

”پتا نہیں خود دیکھ لو،“

”ہائے اللہ گھٹری وہ بھی برانڈ ڈاپریہ پرفیو م افف میری پسند کا“، ڈبے کو کھولتے ہی اُس میں موجود گھٹری کو ایک نظر دیکھتے زارون نے جلدی سے پرفیو م کی بوتل کا ڈھنکن کھولتے اُس کی خوشبو اپنے ہاتھ پہ لگا کر چیک کی۔

”بہت پیاری خوشبو ہے“، تعریف کرنے کے ساتھ ہی اُس نے پرفیو م اپنے اوپر سپرے کیا تو معاذ نے قہقہہ لگایا۔

”یار کپڑے تو تبدیل کر لیتے“، اُسے اس قدر پرجوش دیکھ کر معاذ نے مشورہ دیا۔  
”خیر ہے“، گھٹری اپنے بازو پہ لگا کر دیکھتے وہ جلدی سے بستر سے نکلا اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو گیا۔

”بہت اچھی لگ رہی ہے“، شیشے میں ایک دوپوز مار کر دیکھتے زارون نے تعریف کی۔

”ہاں تمہارے ہاتھ پہ زیادہ اچھی لگ رہی ہے ویسے اتنی اچھی نہیں تھی“، اٹھ کر اُس کے قریب آتے معاذ نے اُس کا ہاتھ کپڑہ کر دیکھا۔

”ہوننہ، گھٹری زیادہ اچھی ہے اس لیے اچھی لگ رہی ہے اور اتنے مہنگے گفت لانے کی کیا ضرورت تھی تم کچھ ستابھی لے آتے تو مجھے اچھا لگتا“، اُسے اُنار کر ڈبے میں واپس رکھتے زارون نے اُس کی قیمت کا اندازہ لگاتے کہا۔

”تحفے مہنگے یا سستے نہیں ہوتے، تحفے تو چاہت کی طرح ہیں جو ہم چیزوں کی صورت اپنوں کو دیتے ہیں اور تمہاری خوشی کے آگے ان کی قیمت کچھ بھی نہیں ہے اس لیے دوبارہ ایسی فضول بات نہ کرنا“، اُسے ڈپٹے معاذ نے پر فیوم بھی اٹھا کر ڈبے میں رکھا تو زارون نے مسکراتے ہوئے اُسے گلے لگایا۔

”شکر یہ آہینیدہ نہیں کروں گا میں ایسی بات کیونکہ یہ سب میرا حق ہے اور میں اسے تحفہ نہیں بلکہ حق سمجھ کر تم سے وصول کروں گا آخر تم مجھ سے دوسال بڑے ہو اور بڑے ہونے کے ناتے تمہاری ذمہ داری ہے کہ چھوٹے بھائی کو ایسے گفت دیتے رہو“، اُسے خفاد کیجھ کر زارون نے ایک لمبی تمہید باندھی۔

”جوتے کھالو گفت کی جگہ“

”وہ بھی کھالوں گا پر اپنی بیوی سے“، باعثیں آنکھ دباتے زارون نے شرارت سے کھاتو معاذ نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلا�ا۔

”شرم کرو بیوی کے آنے سے پہلے ہی مرید بن گئے ہو بعد میں پتا نہیں کیا کرو گے“، ڈبہ شاپر میں ڈال کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے معاذ نے اُس کے آنے والے مستقبل پر افسوس کیا۔

”میرے بھی شرم کرنے کے دن دور ہیں کیونکہ امی آپ کے لیے لڑکی تلاش کر رہی ہیں اس لیے آپ اپنی خیر منائیں“، اُسے ایک ضروری اطلاع دیتے زارون نے پھر سے کمبل اپنے اوپر تانا۔ ”کیا مطلب؟ میرے لیے کیوں لڑکی تلاش کر رہی ہیں؟“، کمبل واپس کھینچتے معاذ نے سوالیہ نظر وں سے اُسے دیکھا۔

”لڑکی کیوں ڈھونڈی جاتی ہے؟ ظاہر سی بات ہے آپ کی شادی کروانے کے لیے ڈھونڈ رہی ہیں“، اُس کی عقل پر ماتم کرتے زارون نے وضاحت کی۔

”پر میرا بھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں“

”کیوں؟“

”بس ابھی میں ٹھیک سے اپنی زندگی میں سیٹل ہونا چاہتا ہوں پھر اس بارے میں کچھ سوچوں گا“، نظریں چُراتے معاذ اُس کے قریب سے اٹھ کر بالوں میں برش پھیرنے لگا۔

”توبہ چار سال سے تم سیٹ ہی ہو رہے ہو اور میں بتا رہا ہوں اس بارامی تمہاری ایک بھی چلنے نہیں دیں گی اس لیے شرافت سے اُن کی بات مان لینا“، اُسے مشورہ دیتے زارون نے کمبل پھر سے چہرے پر لیا تو معاذ نے اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”اب اسے کیا ہوا؟“ دوسری طرف خاموشی محسوس کرتے زارون نے کمبل پھرے سے ہٹا کے کمرے میں چاروں طرف متلاشی نظروں سے دیکھا جواب خالی تھا۔

---

”نور پیٹا اتوار کو کتنے بجے جانا ہے رابعہ کی طرف؟“ نائلہ بیگم نے اُسے لیپ ٹاپ میں گلن دیکھ کر سوال کیا۔

”amarat nobj کا فنگشن ہے،“ اُس نے مختصر سا جواب دے کے اپنی نظریں پھر سے اسکرین پر جائیں جہاں وہ اپنی کل والی پریزنسیشن بنانے میں مصروف تھی۔

”اچھا تمہارے بابا سے میں نے پوچھ لیا تھا وہ کہہ رہے تھے کہ تم لوگ رضا کے ساتھ چلے جانا ان کو کچھ کام ہے وہ نہیں جائیں گے،“ نائلہ بیگم نے دھلے ہوئے کپڑوں کو سمیٹتے ہوئے نور کو آگاہ کیا جو رضا کے ساتھ جانے کا سنتے ہی ایک دم سے چونکی۔

”ماما مجھے نہیں جانا اُس بندر کے ساتھ آپ بابا کو کہیں وہ ساتھ چلیں،“ لیپ ٹاپ سائیڈ پر کرتے اُس نے ماں کے سر ہوتے ضد کی۔

”تمہارے بابا کو کام ہے وہ نہیں جاسکتے اور رات والی ڈانٹ بھول گئی ہو کیا؟ جو پھر سے اُسے بندر کہہ رہی ہو“، نائلہ بیگم نے اُس کی بات سنتے ہی یاد دہانی کروائی۔

”وہ ہے، ہی بندر تو بندر ہی کہوں گی نا، بھوکا کہیں کامیری ساری چاکلیٹ کھا گیا“، نور نے ماں کی ڈانٹ کا اثر لیے بغیر رضاپر اپنا غصہ اُتارا جو اُس کے حصے کی چاکلیٹ ہڑپ کر کے صبح سے ہی کہیں روپوش تھا۔

”اچھا بس کروا ب اور چائے بناؤ میرے لیے اگر اٹھ ہی گئی ہو تو“، نائلہ بیگم نے صوفے پر بیٹھتے اُس سے کہا جواب چاکلیٹ کا دکھ بھولے اپنے اٹھنے پر پچھتا رہی تھی۔

”ما آپ اتنی چائے نہ پیا کریں“، کچھ سوچتے ہوئے اُس نے ماں کو مشورہ دیا۔  
”کیوں؟“

”کیونکہ زیادہ چائے پینے سے رنگ کالا ہو جاتا ہے“، اُن کے ساتھ ہی صوفے پر بیٹھتے اُس نے مزید دو چار نقصانات گنوائے۔

”اچھا، توجہ تم پیتی ہو تب رنگ کالا نہیں ہوتا؟“، اُس کی ساری چالاکیاں سمجھتے ہوئے نائلہ بیگم نے اُس کا کان پکڑا۔

”میں تو پیدائشی گوری ہوں نا اس لیے چائے پینے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا“، ماں کے ہاتھ سے اپنا کان چھڑ رواتے قدرے بے نیاری سے جواب دیا گیا۔

”تو ماں کیا پیدائشی کالی تھی؟ جو چائے پینے سے مزید ہو جائے گی؟“ اس کے جواب پر حیرت سے آنکھیں پھیلاتے نائلہ بیگم نے استفسار کیا۔

”مجھے کیا پتا میں کون ساتب پیدا ہوئی تھی؟“ لاپرواں سے کندھے اچکاتے نور نے لا عملی کاظہار کرتے پلکیں جھپکائیں۔

”فففففف ف تم سے سر کھپانے سے اچھا ہے میں خود ہی چائے بنالوں“، نائلہ بیگم نے تنگ آتے اٹھ کر باہر کارخ کیا تو نور نے جان چھوٹنے پر شکر ادا کرتے آواز لگائی۔

”ماں اپیز میرے لیے بھی ایک کپ بنادیجیے گا سر میں بہت درد ہے“، واپس لیپ ٹاپ لے کر بیٹھتے اس نے سر پہ ہاتھ رکھا تو نائلہ بیگم نے اُسے ایک گھوری سے نوازا اور اُس کی ڈرامے بازی پر نفی میں سر ہلاتے کچن میں داخل ہوئیں۔

-----

معاز کے رویے کو سوچتے زارون کو کچھ گڑ بڑ محسوس ہوئی جس کو اپناو ہم سمجھ کر انور کرتے اُس نے مزید سونے کا رادہ ترک کیا اور کمفرٹر ہٹاتے اُس کے کمرے سے نکلتے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

”افف شٹ شکر ہے جلا نہیں“، کمرے میں داخل ہوتے ہی موبائل کو چارج پہ لگادیکھ کر اُس نے جلدی سے قدم آگے بڑھاتے چار جر کو سوچ سے نکالا جورات سے لگے ہونے کی وجہ سے گرم ہو چکا تھا۔

”یہ معاز بھی ناگلے بندے کی کوئی بات نہیں مانتا۔ رات کو میں نے کہا بھی تھا کہ مجھے اپنے کمرے میں جا کر سونے دو پر نہیں اپنی ضد پوری کر کے ہی سانس لیا“، موبائل آن کرتے جو شائد اور چارج کی وجہ سے خود ہی آف ہو چکا تھا اُس نے خود کلامی کی۔

”اب سے صحیح کیا مصیبت آن پڑی ہے“، موبائل آن کرتے ہی اسکرین پر ارحام کی بیس کے قریب کا لزدیکھ کر زارون نے سوچا اور کال بیک کرتے موبائل کان سے لگالیا۔ ”کہاں تھے تم اور موبائل کس صندوق میں بند کر کے رکھا تھا؟“ دوسری بیل پر کال ریسیو کرتے ارحام نے سلام دعا کیے بغیر ہی خلگی سے پوچھا۔

”یار میں دوسرے کمرے میں تھا اور موبائل کمرے میں چار جنگ پہ لگا تھا اس لیے میں نے تمہاری کالز نہیں دیکھیں“، الماری کھولتے زارون نے مختصر الفاظ میں کال ریسیونہ کرنے کی وجہ بتائی۔

”ہوننہ بس کرو پتا مجھے جو موبائل کمرے میں تھا اور تم دوسرے کمرے میں کیا کر رہے تھے؟“ تیوری چڑھاتے ارحم نے بے یقینی برقرار رکھتے ایک اور سوال کیا۔

”یار وہ معاز آیا ہے رات اُس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے اُس کے کمرے میں ہی سو گیا تھا اور تم کیا یہ شکی بیویوں کی طرح میری تحقیق کرنے میں لگے ہو۔ سید ہے سید ہے بتاؤ کیوں فون کیا تھا؟“ جمعہ کی مناسبت سے شلوار قمیض نکال کر بیڈ پر رکھتے زارون نے اُس کے سوال جواب سے تنگ آتے بے زاری سے مدعے کی بات پر آتے پوچھا۔

”مطلوب اب تمہیں میرا باتیں کرنے بھی بُرا لگنے لگا ہے؟ ہم ٹھیک ہے میں دوبارہ تم سے کوئی سوال نہیں پوچھوں گا اور کال اس لیے کی تھی کہ شام کو اگر تم فری ہو تو میرے ساتھ مار کیٹ چلنَا“، اُس کی بات کا بُرا مناتے ارحم نے منہ سچھلا یا۔

”ہاں فری ہوں میں نے کونسا ہل چلانا۔“

”اچھا ٹھیک ہے بس شام کو تیار رہنا میں پانچ بجے تک تمہیں گھر سے پک کر لوں گا“، اپنی سنجیدگی برقرار رکھتے ارحم نے باتِ مکمل کی اور دوسری طرف جواب سنے بغیر ہی کال کاٹ دی۔

”توبہ، اللہ نے ایک ہی دوست دیا وہ بھی ڈرامے باز“، دوسری طرف کال منقطع ہونے پر موبائل کان سے ہٹاتے زارون نے اُس کی سکرین کو گھورا اور سر جھکلتے اپنے کپڑے اٹھاتے واش روم میں جا گھسانا کہ نماز سے پہلے پہلے تیار ہو کر نیچے جا سکے۔

-----

”مراد، میری جان میر اشیر“، گاڑی سے اُتر کر اُسے اپنی جانب آتا دیکھ کر حیدر شاہ نے خوشی سے اپنے بازو واکیا۔

”بابا سائیس کیسے ہیں آپ؟“، ان کے گلے لگتے مراد شاہ نے موڈب انداز میں سوال کیا۔

”اللہ کا بڑا کرم ہے“، اُسے خود سے الگ کرتے حیدر شاہ نے اُس کے کندھے پر تھکنی دیتے اپنے ساتھ والی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آج پورے دو ہفتے بعد تمہاری صورت دیکھنے کو ملی ہے۔ کہاں مصروف تھے؟“

”کہیں نہیں بابا سائیس بس دوستوں یاروں کے ساتھ مری کی جانب نکل گیا تھا تاکہ غصہ تھوڑا کم ہو سکے“، ٹانگ پہ ٹانگ چڑھاتے مراد شاہ نے ذو معنی الفاظ میں اپنی باتِ مکمل کی۔

”ہاہاہا بس یہی ایک بات ہے جو ہمیں تم اپنی باقی اولاد کی نسبت زیادہ عزیز ہو بالکل ہمارے جیسا غصہ ہے تم میں، وہی بد لے کی عادت“، اپنی موچھوں کو تاؤ دیتے حیدر شاہ نے فخر سے گردن اکڑائی۔

”جی ایسا ہی ہے اور اس بار بس آپ نے روک دیا اور نہ وہ دونوں لڑکے ابھی تک جہنم واصل ہو چکے ہوتے“، دانت پیس کر کہتے مراد شاہ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کیا۔

”روکا اس لیے کہ ہاشم سے ہمارے پرانے تعلقات ہیں اور اس کی پہنچ ہم سے کہیں اوپر تک ہے تب ہی تو ہماری کوشش کے باوجود بھی تمہاری ضمانت نہیں ہوئی پر جیسے ہی ہمیں خبر ملی کہ وہ لڑکا ہاشم کا یہاں تھا ہم نے فوراً نے اس سے رابطہ کیا جس پر نہ صرف اس نے شرمندگی کا اظہار کیا بلکہ اسی وقت تمہاری ضمانت بھی کروادی اور تم یہ مت سمجھنا کہ تمہارا بابا پا اتنی آسانی سے اس کی اور اس کے بیٹے کی غلطی کو فراموش کر دے گا“، اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے حیدر شاہ نے اس کے تینے ہوئے تاثرات کو نارمل کرنے کی کوشش کی۔

”تمہاری بے عزتی کا بدلہ تو میں اُن سے لے کر رہوں گا پر اپنے طریقے سے کیونکہ یہ شکار ایسا نہیں ہے جن پر سامنے سے وار کیا جاسکے“، پر سوچ انداز میں کہتے اُنہوں نے مراد شاہ کو مطمئن کیا جو پچھلے دو ہفتوں سے اُنہی کے کہنے پر شہر سے باہر تھا۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ بہتر سمجھیں پر بابا سمیں میں اُن لڑکوں کو مزید برداشت نہیں کر سکتا اس لیے آپ کو جو کرنا ہے ذرا جلدی کریں“، آنچھوں میں سرخی لیے اُس نے ایک بار پھر سے اپنے جبڑوں کو مضبوطی سے بند کیا۔

”ہاں بس تم فکرنہ کرو اور کل تیار رہنا ہا شم نے ہمیں اپنے برخوردار کی منتگشی پہ ڈالیا ہے۔“  
”پر بابا سمیں...“

”میں نے کہانا میں ہر کام اپنے طریقے سے کروں گا تو بس تم زیادہ پریشانی مت لو اور ڈیرے پہ جاؤ ہم نے تمہارا غصہ دور کرنے کے لیے کچھ انتظامات کیے ہیں“، چہرے پر مکروہ مسکراہٹ سجاتے حیدر شاہ نے ایک بار پھر سے اپنی موچھوں کو تاؤ دیا تو مراد شاہ کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”شکریہ بابا سمیں“، اُن کا ہاتھ تھام کر اُس پر بو سہ دیتے مراد شاہ نے نہال ہوتے کہا اور انہیں شام کو ملاقات کا کہتے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

-----  
ٹھیک پانچ بجے ارجمنے گھر کے باہر ہارن دیا تو زارون نے معاذ کو کچھ دیر میں آنے کا بتاتے اپنا موبائل اور والٹ لیتے باہر کا رخ کیا۔

”السلام عليكم“، گاڑی میں بیٹھتے ہی زارون نے سلام کیا جس پر سر ہلاتے ارحم نے خاموشی برقرار رکھتے گاڑی کو ریورس کرتے سڑک پہ ڈالا۔

”کیا ہوا؟ ایسے چپ چپ کیوں ہو؟“ کچھ منٹ گزرنے کے بعد بھی دوسری طرف خاموشی دیکھ کر زارون نے حیرت سے پوچھا جس کا جواب دینے کی بجائے ارحم نے ایک ناراض نظر اس پہ ڈالتے میوزک سسٹم آن کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ کچھ بتانا پسند کرو گے؟“ اُسے پھر سے خاموشی سے ڈرائیونگ میں مشغول ہوتا دیکھ کر زارون نے بے زاری سے سوال کیا۔ ”ارحم کیا مسئلہ ہے یار؟ صحیح والی بات سے ناراض ہو؟“ سسٹم آف کرتے زارون نے اُس کی طرف سے ابھی بھی کوئی جواب نہ پا کر جھنجھلاتے ہوئے اندازہ لگایا۔

”مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کسی سے ناراض ہونے کی اور ہاں تمہاری دوستی کی ضرورت صرف مجھے ہے اس لیے تم جب چاہو جیسے چاہو مجھ پر رعب ڈال سکتے ہو کیونکہ تمہیں پتا کہ مجھ مسکین نے پھر مصیبت کے وقت تمہارے پاس ہی آنا“، چہرے پر افسردگی سجائے ارحم نے لاپرواٹی سے کندھے اچکائے۔ ”أفف بس کرو یاراب تم اتنے بھی مسکین نہیں اور ایسی فضول باتیں نہ کیا کرو“

کہ تمہیں میری ضرورت ہے مجھے نہیں،“، اُس کی بات کا بُرا مناتے زارون نے ونڈو سے باہر دیکھا۔

”ہاں تو میں نے اتنے پیار سے شکوہ کیا ہے زارون تم کال کیوں نہیں اٹھا رہے تھے اور تم نے آگ سے مجھے ڈانٹ دیا،“، ٹران لیتے ارحم نے تیوری چڑھاتے اُسے اُس کی غلطی کا احساس دلانا چاہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے سوری میری ہی غلطی ہے اور پیزی یہ لڑکیوں کی طرح ری ایکٹ مت کیا کرو کہ پیار سے شکوہ کیا،“، اُس کی نقل اُتارتے زارون نے مزید بات بڑھانے کی بجائے خود ہی معذرت کرتے بات ختم کرنے کی کوشش کی۔

”سوری؟ معاف کرتی ہے میری جوتی وہ بھی تم جیسے بد تمیز شخص کو جس کونہ تو میری پرداہ ہے نہ ہی میری ناراضگی کی اور ہاں ایک شرط پہ معافی ملے گی،“، ابر واچکا تے ارحم نے احسان جتنا والے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کوئی شرط؟“، چھٹی حس سے کسی خطرے کی بو محسوس کرتے زارون نے پوچھا تو ارحم کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

”یہی کہ تم مجھے دوبارہ ڈانٹو گے نہیں اور آج کی میری ساری شاپنگ کا بل تم ہی پے کرو گے،“، پر سکون لبھ میں کہتے وہ ایک بار پھر سے زارون کو اگ لگا چکا تھا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری نارا ضنگی اور ہاں میرا باپ کوئی بینک کامالک نہیں جو میں آئے دن  
تمہارے فضول خرچ پورے کرتا پھروں“

”تو ٹھیک ہے نکلو میری گاڑی سے“، اُس کی بات سنتے ہی سڑک کے پیچ گاڑی روکتے ارجمنے اپنا  
فیصلہ سنایا تو زارون نے باہر تیز برستی بارش کو دیکھا جو بن ٹلائے مہماں کی طرح کبھی ہلکی ہو جاتی تو  
کبھی تیز۔

”اُترو سوچ کیا رہے ہو؟“ پیچھے سے ہارن کی آواز پر ارجمنے سنجیدگی برقرار رکھتے کہا تو زارون نے  
پلٹ کر اُسے ایک گھوری سے نوازا اور بارش کی پرواکیے بناء ہی دروازہ کھولا جو ارجمنے فٹ سے  
دوسری طرف سے لاک کر دیا۔ ”دروازہ کھولو“

”نہیں کھولتا“، اُسے مکمل طور پر غصے میں بھرا دیکھ کر ارجمنے ہٹ دھرمی قائم رکھتے جواب دیا  
اور پیچھے مسلسل ہوتے ہارن سے تنگ آتے گاڑی آگے بڑھائی۔

”میں نے کھاد روازہ کھولوا اور روکو گاڑی مجھے نہیں جانا کہیں بھی تمہارے ساتھ“، اب کی بار  
زارون نے غصے سے کہتے سٹئر نگ پر ہاتھ رکھتے اُسے دوسری جانب موڑا جو ارجمنے سنبھالتے  
سنبحالتے سائیڈ پر کھڑی گاڑی کے اندر جا لگی۔

”بھگتواب“، اُسے بے یقینی سے لمبی لمبی سانس لیتا دیکھ کر زارون نے دوسری طرف سے ان لاک کرتے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور دوسری گاڑی کے مالک کو گاڑی سے نکلتا دیکھ کر ارحام کو ہر کا بکا چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلا۔

”ہاں جی بر خوردار نکلو باہر اور اگر گاڑی چلانا نہیں آتی تو سڑکوں پہ لے کر کیوں نکلتے ہو؟“، ایک لگ بھگ پچاس سال کے آدمی کو اپنی کھڑکی کے قریب جھکتا دیکھ کر وہ ہوش میں آیا اور زیر لب زارون کو صلاواتوں سے نوازتے باہر نکلا۔ ”سر آئی ایم سوسوری وہ میں ایک بلی کے بچے کو بچاتے بچاتے آپ کی گاڑی کو دیکھ نہیں پایا“، ارحام نے گاڑی کی بیک سائیڈ کا حشرد دیکھ کر فوراً سے معذرت کی۔

”بہت اچھے بلی کے بچے کو بچاتے بچاتے انسان کے بچے کو بے شک اوپر پہنچا دیتے اور میں تم جیسے لڑکوں کے یہ بہانے اچھے سے سمجھتا ہوں شabaش جلدی سے تیس ہزار نکالو“، ارحام کا گریبان پکڑتے اُس آدمی نے ہاکا سا جھنجھوڑا تو پاس کھڑے دوسرے لوگ بھی اُن کی جانب متوجہ ہو گئے۔

”سر پلیز میری بات سنیں یہ میری گاڑی نہیں ہے میں تو ڈرائیور ہوں اتنے پیسے کہاں سے دوں گا“، زارون سے اس بات کا بدلہ لینے کا ارادا کرتے ارحام نے رونی شکل بنائی۔ ”شکل سے ڈرائیور لگ تو نہیں رہے“، بے یقینی سے اُس کی طرف دیکھتے اُس آدمی نے مشکوک انداز میں کہا۔

”بس انکل کیا کریں دنیا ہے، ہی اتنی ظالم اچھی شکل والوں کے پاس پیسہ نہیں اور بُری شکل والوں کے پاس یہ بڑی بڑی گاڑیاں“، اُن کی گاڑی کی جانب اشارہ کرتے ارجمنے اپنی، ہی دھن میں آہ بھری۔

”اوے میں تمہیں بُری شکل والا لگتا ہوں کپڑوں کو ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری“، اُس کی بات سنتے ہی اُس آدمی نے کانوں تک سرخ ہوتے پاس کھڑے لوگوں کو اشارہ کیا تو ان کا ارادہ سمجھتے ہی ارجمنے گاڑی وہیں چھوڑ کر سڑک کے دوسری جانب دوڑ لگادی۔

”کہاں سے آوارہ گردی کر کے آ رہے ہو؟“، اُسے دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف جاتا دیکھ کر نائلہ بیگم نے عین اُس کے سر پہ چھپا مارا ”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ما۔۔۔ وہ۔۔۔“ میں ابراہیم کے ساتھ تھا، تھوک نگلتے رضانے کوئی بہانہ سمجھائی نہ دینے پر جلدی سے ابراہیم کا نام لیا۔

”ابراہیم تو تھوڑی دیر پہلے ہی تمہارا پوچھ کے گیا ہے، تم کون سے ابراہیم کے ساتھ تھے؟“، اپنی کمر پر ہاتھ رکھتے انہوں نے فوراً ہی اُس کی چوری کپڑی جس پر گڑ بڑاتے ہوئے اُس نے ابراہیم کی بعد میں خبر لینے کا سوچا۔

”وہ ماما میں پہلے ابراہیم کے ساتھ ہی تھا پھر راستے میں مجھے اپنا ایک کلاس فیلو مل گیا میں اُس کے ساتھ نوٹس بنانے چلا گیا تھا“، سر کھجاتے رضا نے ایک نیا بہانہ بناتے سامنے سے آتی نور کو دیکھ کر زیر لب استغفار پڑھا۔

”اما جھوٹ بول رہا ہے اور اگر نوٹس بنانے کئے تھے تو کہاں ہیں نوٹس دکھاؤ“، اُس کی بی بنائی ترکیب پر پانی پھیرتے نور نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

”وہ نوٹس تو میں وہیں چھوڑ آیا۔ صحیح میرا کلاس فیلو لے آئے گا“، اُن دونوں کو باری باری دیکھتے رضا نے ایک مقعول سی وضاحت دی۔

”اما جھوٹ بول رہا ہے یہ ابھی جب ابراہیم آیا تھا اُس نے مجھے بتایا کہ یہ اپنی کسی کلاس فیلو کے چکر میں ہے اور آج کل جہاں جہاں وہ جاتی ہے یہ اُس کے پیچھے ہی ہوتا ہے“، دونوں بازوں باندھتے نور نے اپنی آنکھوں کو سکریٹرے اُس کاراز فاش کیا۔

”خدا کا خوف کریں نور آپی، کیوں ایک مظلوم پر بے بنیاد الزام لگا رہی ہیں اور وہ ابراہیم؟ وہ جھوٹ بول رہا ہے“، نور کی بات کا جواب دیتے اُس نے اپنا رخ نائلہ بیگم کی جانب کیا۔

”ماما سچ میں، میں نے آج تک آپ کی بیٹی کے علاوہ کسی لڑکی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی کا پیچھا کیا ہے“، بہار دی سے اپنے کردار کی صفائی دیتے رضا نے نائلہ بیگم کی طرف دیکھا جو ابھی تک اُسے گھور رہی تھیں۔

”بس کرو یہ ڈرامہ اور خبردار اگر دوبارہ اتنی دیر تک گھر سے باہر رہے تو میں تمہاری شکایت تمہارے بابا سے کر دوں گی“، نور کو مزید کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر نائلہ بیگم نے رضا کا کان پکڑتے اُسے تنہیہ کی اور چوہنے پر رکھے سالن کا یاد آتے ہی جلدی سے کچن کی جانب بڑھیں۔

”میری چاکلیٹ نکالو“، نائلہ بیگم کے جاتے ہی نور نے رضا کا راستہ روکا جو جان بخشی پر خوشی خوشی اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

”کوئی نسی چاکلیٹ؟ اور آپ کی تھیں تو آپ کے پاس ہو نگی نا“، لا علمی سے کندھے اچکاتے وہ صاف ہی مکرا۔

”میری ہی تھیں جو تم نے صحیح کمرے سے چڑا لیں اور اپنی اُس کا لیکلوٹی گرل فرینڈ کو دے دیں اور ہاں اس بار تو تم یہ جذباتی ڈرامہ کر کے ماما کے ہاتھوں سے بچ نکلے پر یہ یاد رکھنا کہ جب تک تمہاری سچائی ماما کے سامنے نہیں آ جاتی میں سکون سے نہیں بیٹھوں گی اور اپنی ساری چاکلیٹس تم سے نکلا“

کے ہی دم لوں گی، اُس کے بال کھینچتے نور نے دھمکی دی اور اُسے کراہتا چھوڑ کر اپنے موبائل کی بیل سنتے کمرے کی جانب بڑھی۔

”اللہ پوچھئے آپ کو نور آپی توبہ کتنی زور سے میرے بال کھینچے ہیں“، اونچی آواز میں دہائی دیتے رضا نے باہر ظہیر صاحب کی گاڑی کا ہارن سنتے کسی اور وقت بدله لینے کا سوچتے گیٹ کھولنے کے لیے باہر کا رخ کیا۔

-----

ڈیرے پر پہنچتے ہی صیغرے نے اُسے ایک نئی لڑکی کا بتایا جو کل ہی حیدر شاہ نے زمینوں کے ایک فیصلہ میں ایک کاشت کار کی پانچ لاکھ کی قرض کی ادائیگی اور اُس کے دو بیٹوں کی جان بخشی کے عوض خریدی تھی۔

”سامنے تقریباً پندرہ سال کے لگ بھگ ہے اور حسین تو ایسی ہے کہ آپ دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے“، اُس کے ساتھ ہی ڈیرے کے اندر ونی حصے کی جانب بڑھتے صیغرے نے لچاتے ہوئے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہاہاہا، بس فکر نہ کرو میں آج رات گزرنے کے بعد اُسے تجھے سونپ دوں گا پھر جی آیا تو کوٹھے پہ بیچنا یا اپنے استعمال کے لیے رکھ لینا“، کمرے کے سامنے رکتے مراد شاہ نے صیغرے کی تعریف کا مطلب اچھے سے سمجھتے تسلی دی تو وہ خوشی سے نہال ہوتے اپنے دانتوں کی نمائش کرنے لگا۔

”شکر یہ سائیں“، ادب سے ہاتھ ماتھے تک لے جاتے صیغرے نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

”بس یہاں سے سب کو فارغ کرو اور دھیان رکھنا اب اس طرف کوئی نہ آئے حکم صادر کرتے اُس نے دروازے کا ناب گھما یا اور اندر داخل ہوا جہاں ایک لڑکی گھٹنوں پہ سر رکھے نیچے زمین پر بیٹھی رورہی تھی۔

”کیا ہوا؟ بے بی رو کیوں رہی ہو؟“ اُس کے سامنے پاؤں پر وزن ڈال کر بیٹھتے مراد شاہ نے قدرے تفکر سے پوچھا تو کسی مرد کی آواز پر سدرہ نے فوراً سے خود میں سیمیٹتے سر اٹھایا۔

”کیا ہوا؟“ چہرے سے ٹپکتی معصومیت، سرخ و سپید رنگ پر بڑی بڑی سبز آنکھیں ایک پل کو مراد شاہ کو اندر تک ہلا گئیں تھیں۔

”سامیں مجھ سے دور رہیں“، مراد شاہ کے بارے میں سُنے قصوں پر خوف کے سائے ایک دم سے اُس کے چہرے پر لہرائے۔

”ہاہاہا دور؟ وہ بھی تم سے؟ نہ میری جان نہ“، اُس کی آواز پر ہوش میں آتے مراد شاہ نے ایک قہقہہ لگایا اور اُسے بازوں سے تھامتے خود بھی کھڑا ہوا۔

”تیرے باپ نے تجھے بیچا ہے وہ بھی پورے پانچ لاکھ کے عوض اور تم کہہ رہی ہو میں اتنی قیمت ادا کرنے کے بعد تم سے دور رہوں ہاہاہا“، اُس کے جبڑے کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں دبو پھٹے مراد شاہ نے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجائی۔

”سامنے مجھے معاف کر دیں اللہ کا واسطہ مجھے جانے دیں“، اُس کے چہرے سے خوف کھاتے سدرہ نے ہاتھ جوڑے۔

”جانے دوں گا ویسے بھی مراد شاہ کسی بھی لڑکی کے ساتھ ایک یادوارا توں سے زیادہ نہیں گزارتا۔ وہ کیا ہے نادل بھر جاتا ہے میرا“، اُسے پچھے بیڈ پر دھکا دیتے اُس نے انگڑائی می تو سدرہ نے آنے والے وقت کا سوچتے خوف سے زرد پڑتے چہرے کے ساتھ اُسے دیکھا اور دل ہی دل میں اپنے رب سے اپنی موت کی دعا کی۔

”آپ کو اللہ کا واسطہ سامنے، میرے ماں باپ مجبور تھے“، اُسے اپنے اوپر جھکتا دیکھ کر اُس نے احتجاج کیا۔

”تو میں بھی اب مجبور ہو گیا ہوں ویسے مجھے جیرانگی ہے اب تک تیرے ماں باپ نے تجھے کہاں چھپا کر رکھا تھا جو تم مجھے اب تک نظر نہیں سمجھیں“، اُس کے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ کی پورے سے صاف کرتے وہ ایک بار بھر سے اُس کی بے بسی پر مسکرا یا تو سدرہ نے پورا زور لگاتے اُسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔

”کیونکہ میرے ماں باپ جانتے تھے کہ تم جیسے درندے اس گاؤں میں آباد ہیں جسے نہ تو کوئی قانون پوچھتا ہے اور نہ ہی کوئی حکومت پر مراد شاہ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے آج تم کسی بے بس سے فائدہ اٹھا رہے ہو تو کل کو سکون تمہیں بھی نہیں ملے گا“، اُسے مزید اپنے اوپر حاوی ہوتا دیکھ کر سدرہ نے چیختے ہوئے بد دعا دی اور خود کو اُس کے آزاد کروانے کی کوشش کی جو اُس کی بات سنتے مزید وحشی بن چکا تھا۔

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور تم ہوتی کون ہوا تینی بات کرنے والی“، ایک جھٹکے سے اُس کا گلا کپڑ کر دباتے مراد شاہ نے تینے ہوئے تاثرات سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا جو کہیں سے بھی اُسے گاؤں کی معصوم لڑکی نہیں لگ رہی تھی جو اُس کی ایک پھنسن کار پر چپ کر جاتی۔

”میں کروں گی بکواس اور لعنت بھجتی ہوں میں تم پہ تمہارے باپ پہ“، اُس کے چہرے پر تھوکتے سدرہ جو مراد شاہ کی ظلم اور زیادتی سے بچپن سے ہی واقف تھی اُس نے انعام کی پرواکیے بغیر بے خوفی سے کہا۔

”تمہاری اتنی جراءت“، اُس کے گلے پر مزید گرفت مضبوط کرتے مراد شاہ نے اپنا چہرہ صاف کرتے ایک زوردار تھپڑا اُس کے گال پہ جڑا اور کسی وحشی درندے کی طرح اُس پہ جھپٹا جو چیختے چلاتے ہوئے اپنے ماں باپ کو پکارتی آخری حد تک خود کو اُس جانور سے آزاد کروانے کی کوشش کرتی رہ گئی۔

-----

کچھ دور بھاگتے جب ارجمند کو یقین ہوا کہ وہ لوگ اب اُس کا پیچھا نہیں کر رہے تو وہ سانس لینے کے لیے وہیں فٹ پاتھ پہ بیٹھ گیا۔

”تو بہ، پتا نہیں لوگ اتنا نیز کیسے بھاگ لیتے ہیں“، ہانپتے ہوئے اُس نے اپنی سانس کو ہمورا کرنے کی کوشش کی۔ ”زارون میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں جو تم نے آج میرے ساتھ کیا ہے ناکوئی

دشمن بھی اپنے دشمن کے ساتھ نہیں کرتا، خود کلامی کرتے اُس نے اپنے بھیگے ہوئے کپڑوں کو دیکھا۔ ”پتا نہیں کس منہوس کی شکل دیکھی تھی میں نے صبح صحیح،“ منه میں بڑ بڑا تے ارحم نے اپنی پینٹ پر لگی مٹی کو ہاتھ سے صاف کیا اور بیل کی آواز سنتے ہی اپنی جیکٹ کی جیب کو ٹوٹوا۔

”شکر ہے..“، جیکٹ کی اندر والی جیب سے موبائل برآمد ہوتے ہی اُس نے باہر نکالتے اسکرین کی طرف دیکھا جہاں زارون کالنگ لکھا آرہا تھا۔

”بولواب کیا مسئلہ ہے؟ اور بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری دوستی حد ہوتی ہے کوئی دوست اپنے دوست کے ساتھ ایسا کرتا ہے کیا؟“ کال ریسیو کرتے ہی ارحم نے اُس سے کھری کھری سنائی۔

”بھاڑ میں بعد میں جاؤں گا بھی تم بتاؤ اس وقت کہاں ہو؟“، گاڑی ڈرائیور کرتے ساتھ اُس نے سڑک کے آس پاس نظر درڈائی۔

”جہاں بھی ہوں تمہیں اس سے مطلب،“ ناراضگی برقرار رکھتے اُس نے پاس سے گزرتی گاڑی کو حیرت سے دیکھا۔ ”مطلب ہے نا، تمہاری گاڑی آزاد کرو کے لایا ہوں وہ بھی پورے تیس ہزار ادا کر کے،“ یوڑن لے کر گاڑی اُس کے قریب لا کر روکتے زارون نے مسکراتے ہوئے اُس کی حالت کو دیکھا جو ابھی تک کان سے فون لگائے کھڑا اُس سے حیرت سے گھور رہا تھا۔

”یا تم ظاہم نکال کہ اپنے دماغ کا علاج کیوں نہیں کروالیتے؟“ دروازہ کھول کر بیٹھتے ارحم نے غصے سے موبائل ڈیش بورڈ پر پھینکا۔

”مجھ سے زیادہ ضرورت تمہیں ہے اس لیے پہلے میں تمہارا علاج کرواؤ گا اور پھر اپنا“، پر سکون لبھ میں کہتے زارون نے گاڑی کا رخ مار کیٹ کی بجائے ارحم کے گھر کی جانب کیا۔ ”بات مت کرو مجھ سے بلکہ منہ مت لگو میرے اس وقت“، اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ارحم نے ٹشوں کا لئے اپنا چہرہ صاف کیا۔

”ٹھیک ہے نہیں لگ رہا ویسے بھی تم جیسے بندر کے منہ لگ کہ مجھے کیا ملنا“، لاپرواٹی سے کندھے اچکاتے زارون نے قہقہہ لگاتے اپنی ہی بات کامزہ لیا۔

”زیادہ ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے اور میں گھر نہیں جاؤں گا“، ہاتھ سینے پر باندھتے ارحم نے اپنا فیصلہ سنایا۔

”گھر نہیں جاؤ گے تو کل پھر یہ امید نہ رکھنا کہ ہاشم صاحب تمہاری منگنی میں شریک ہوں گے“، زارون نے اُسے آنے والے حالات سے آگاہ کرتے سمجھانا چاہا۔

”تونہ ہوں شریک، پہلے بڑی انہیں میری پرواہ ہے“، نظریں ملائے بغیر ارحم نے خود کو لاپرواٹاہر کرنے کی کوشش کی۔ ”اگر انہیں پرواہ نہیں تو تم بڑی کرتے ہو اور تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے

اگر وہ تم پر توجہ نہیں دیتے تو تم بھی کچھ کم نہیں ہو، اسپیڈ آہستہ کرتے زارون نے اُسے باور کروا یا۔

”پتا نہیں یا رب میرا دل نہیں ہے۔ تم چھوڑو یہ سب اور بتاؤ تمہیں میری گاڑی کیسے ملی مطلب تم تو وہاں سے بھاگ گئے تھے نا؟“ ہر بار کی طرح ارحم نے پھر سے اس ٹاپک کو جان بوجھ کر انگور کرتے تجسس سے پوچھا۔

”بھاگا تھا پر پھر سوچا ایویں تمہیں جوتے ہی نہ پڑ جائیں اس لیے واپس لوٹ آیا،“ مختصر ساجواب دیتے زارون نے گاڑی کو بریک لگائی۔

”اب تم گھر کیسے جاؤ گے؟“ ارحم نے ایک نظر باہر دیکھتے سوال کیا۔

”ظاہر سی بات ہے تمہاری گاڑی لے کر جاؤں گا۔“

”اچھا ٹھیک ہے لے جاؤ، ویسے بھی اس کو ٹھیک بھی تم ہی کرواؤ گے کیونکہ یہ سب تمہاری غلطی کی وجہ سے ہوا ہے،“ ارحم نے باہر نکلتے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”ہوننہ بس کرو میری کوئی غلطی نہیں تھی بد تیزی پہلے تم نے شروع کی تھی اور جو میں نے اُس انکل کو تیس ہزار دیے اُس کا کیا،“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے صدمے سے پوچھا۔

”جانم وہ سب بھی تمہاری وجہ سے ہوا اس لیے بھگتواب“، اُس کے بال بگاڑتے ارحمنے اپنا موبائل اٹھایا اور دروازہ کھولتے باہر نکل گیا۔

”ارحم، ارحم یا مری بات تو سنو..“، زارون نے پیچھے سے اُسے مخاطب کرتے وضاحت دینی چاہی پر اُس سے پہلے ہی وہ گیٹ ناک کرتے اندر ردا خل ہوا۔

”افف آج کادن ہی برا تھا۔ پتا نہیں مجھے بھی کیا ضرورت پڑی تھی اس بد تمیز کے ساتھ آنے کی“، منہ ہی منہ میں بڑھاتے زارون نے اپنی غلطی پر خود کو کوسا اور گاڑی کو گھر کی طرف موڑ دیا۔

-----  
کچھ دیر اُس معصوم کو اپنی حوس کا نشانہ بنانے کے بعد مراد شاہ نے اپنی تند لیل کا بدلہ لینے کے لیے اُسے کمرے سے باہر نکالا اور تمام ملازموں کے سامنے لاتے صیغرے کو ایک تیز دار چاقوانے کا حکم دیا۔

”سامنے مجھے معاف کر دیں“، سدرہ نے اُس کی بات سنتے ہی اپنی حالت اور کپڑوں کی پرواکیے بناء خوفزدہ ہوتے مراد شاہ کے پاؤں کپڑے جس کا غصہ کسی طور کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

”کہاں مر گئے ہو جلدی لاو“، اُسے ٹھوکر مار کر پیچھے کرتے مراد شاہ نے گرفتے ہوئے صیرے کو آواز لگائی جو کانپتے ہاتھوں کے ساتھ زبان پر قفل ڈالے چاقو لا کر اُس کے ہاتھ میں تھما چکا تھا۔

”سامنے نہیں، سامیں آپ کو خدا کا واسطہ مجھے معاف کر دیں“، چاقو پر نظر پڑتے ہی سدرہ کے حواس اڑپکے تھے اُس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے مراد شاہ کی منت کی جس کی آنکھوں میں بد لے کا خون اُتر چکا تھا۔

”بچا خدا کا واسطہ مجھے بچا لیں...“، سامنے کھڑے ملازموں کے آگے ہاتھ جوڑتے سدرہ نے التجاء کی پر وہ اُس معصوم بچی کی پکار پر خاموش تماشا یوں کی طرح کھڑے رہے۔

”ہاہاہا بس اتنی سی طاقت تھی تم میں؟ اور وہ کیا کہہ رہی تھی تم کہ میں اور میرا بابا پ ناظم ہیں؟ ہمیں کوئی نہیں پوچھتا“، چاقو اُس کی آنکھ کے قریب رکھتے مراد شاہ نے اُس کے الفاظ دوہرائے تو سدرہ نے خوف کے مارے نفی میں سر ہلا یا اور اُس کے ساتھ ہی ایک دالخوش چھاؤس کے منہ سے برآمد ہوئی۔

”سامنے...“، درد کی شدت سے تڑپتے اُس کے الفاظ اندر ہی کہیں دم توڑ گئے اور خون ایک قطار کی صورت اُس کے گال سے بہہ نکلا۔

”ہاہاہا بولونا چپ کیوں ہو؟“ اُسے زمین پر تڑپتا دیکھ کر مراد شاہ کے دل کو تھوڑی تسکین ملی۔

”سامنے معاف کر دیں بھی ہے“، سدرہ کے جسم سے نظریں چراتے جو نیم برہنہ حالت میں پڑی درد سے بلکہ رہی تھی، شرافت (چوکیدار) نے آواز اٹھائی تو مراد شاہ نے پلٹ کر اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

”صغیرے پہلے اس ہمدرد کا پتہ صاف کرو جسے دیکھ کر بھی سمجھ نہیں آئی کہ مراد شاہ کے سامنے زبان کھولنے والے کا کیا حال ہوتا ہے“، لفظوں کو چباتے اُس نے اشارہ کیا تو ایک فائر کی آواز ہوا میں گوئی اور ساتھ ہی شرافت کی زبان سمیت سانسیں بھی تھم گئیں۔

”اور کسی کو کچھ کہنا ہے؟“، ماتھے پر بل ڈالتے مراد شاہ نے سوالیہ نظروں سے وہاں کھڑے باقی ملازوں کو دیکھا جنہوں نے خوف کے مارے فوراً ہی نفی میں سر ہلا دیا۔ ”ٹھیک ہے صغیرے اسے اٹھاؤ اور نیچے تہہ خانے میں پھینک دو اور چاہو تو تم میں سے جس کا دل کرے اس کے ساتھ اپنی رات حسین بناسکتا ہے“، چاقو وہیں پھینکتے مراد شاہ نے ایک شیطانی مسکراہٹ لبوں میں سجائی اور جیب سے سکریٹ نکالتے باہر کی جانب بڑھا۔

-----

”نور یا رکھاں رہ گئی ہو تم؟“، رابعہ نے اپنے پاؤں پر نیل پینٹ لگاتے موبائل کان اور کندھے کے درمیان دبایا۔

”ہاں بس نکل ہی رہوں“، جلدی جلدی اپنے کپڑے اور جیولری بیگ میں رکھتے اُس نے دوسری طرف تسلی دی۔

”کب نکل رہی ہو؟ صبح گیارہ بجے سے تم پہی بات کہہ رہی ہو اور اب شام کے چار بجے چکے ہیں اور ابھی تک تمہارا کوئی نام و نشان نہیں“، نیل پینٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے رابعہ نے کلاک کی طرف دیکھتے شکوہ کیا۔

”ہاں بس آرہی ہوں۔ وہ رضا کا کوئی ٹیسٹ تھا تو وہ ابھی ابھی کانج سے واپس آیا ہے۔ بابا بھی کام کے سلسلے میں لا ہو رکنے ہیں اسی وجہ سے دیر ہو گئی“، کمرے سے باہر نکلتے نور نے اُسے تفصیل سے آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے بس پلیز اب مزید دیر مت کرنا اور جلدی آجائو“، حدیہ کو اشارے سے روکتے جو الماری سے اُس کے کپڑے نکال رہی تھی رابعہ نے نور کو ہدایت دی۔

”ہاں بس آؤ ہے گھنٹے میں پہنچ جاؤں گی“، عجلت میں جواب دیتے اُس نے کال کا ٹنے موبائل بیگ میں رکھا۔

”رضا کہاں رہ گئے ہو؟، جلدی آجائو پہلے ہی تمہاری وجہ سے میں اتنا لیٹ ہو چکی ہوں“، اُس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹاتے نور نے آواز لگائی۔

”آپ بس پانچ منٹ“، اندر سے جواب دیتے رضا نے برش اٹھاتے بالوں میں پھیرا۔

”پچھلے ایک گھنٹے سے تم پانچ منٹ کا کہہ کر مجھے اتنا لیٹ کرو اچکے ہو اور اگراب تم پانچ منٹ میں باہر نہ نکلے تو میں جوتا لے کر اندر آجائوں گی“، اُسے دھمکی دیتے نور نے ایک بار پھر سے دروازے پر ہاتھ مارا۔

”نور کیا ہو گیا ہے بیٹھ جاؤ سکون سے۔ پہلے تم نے اُسے کھانا کھانے نہیں دیا اب کپڑے تو تبدیل کر لینے دو“، کمرے سے نکلتے نائلہ بیگم نے اُس کی کلاس لی۔

”ہاں بس آپ ہر وقت مجھے ہی ڈالٹتی رہا کریں اپنے بیٹے کو کبھی کچھ نہیں کہتیں“، نائلہ بیگم کی ڈانٹ پر منہ پھلاتے نور نے شکایت کی۔

”وہ میرا بیٹا ہے تو تم بھی میری ہی بیٹی ہو اور نور تم ہمارے ساتھ ہی تیار ہو کر جاتیں اتنی جلدی وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟“، اجازت دینے کے باوجود بھی نائلہ بیگم کا دل مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”اما میں تو آپ لوگوں کے ساتھ ہی جانا چاہتی تھی مگر رابعہ نے اتنا اصرار کیا کہ مجھے منع کرنا مناسب نہیں لگا پر آپ فکر نہ کریں میں اپنا خیال رکھوں گی“، ان کی فکر مندی پر تسلی دیتے نور نے ایک بار پھر سے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

”آگیا ہوں آپی، کیا ہے سکون سے تیار بھی نہیں ہونے دیتیں“، گاڑی کی چابی اٹھاتے رضانے جھنجھلاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

”فنگشن رات کو ہے ابھی نہیں، اس لیے رات کو جتنا دل ہو تیار ہو جانا پر ابھی چلو میں نے رابعہ کو آدھے گھنٹے کا کہا تھا پر مجھے لگتا وہ بھی بیہیں گزر جانا“، منه میں بڑ بڑاتے نور نے مزید وقت ضائع کیے بناء نائلہ بیگم کو طامم سے پہنچنے کی تاکید کر کے اللہ حافظ کہا اور باہر کی جانب بڑھی جہاں رضا پہلے ہی گاڑی استارٹ کر چکا تھا۔

-----

”سفید کرتا؟ یہ سوٹ تم میری مغلنی پہننے کے لیے لائے ہو یا جنازے پہ“، زارون کے لائے ہوئے کرتے کو دیکھتے ارجمنے بھنوں اچکائیں۔

”کیوں اچھا نہیں ہے؟“، زارون جو اس کو سر پر اُزدینے کے چکر میں تھا ایک دم ہی افسردہ ہوا۔

”اچھا ہے پر کسی کے جنازے پہننے کے لیے“، اُسے بیڈ پر رکھتے ارحم نے صاف گوئی سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ ”میں اتنے پیار سے لا یا ہوں اور تم ہو کہ میرے منہ پر ہی میری بے عزتی کیے جا رہے ہو“، دونوں بازوں سینے پر باندھتے زارون نے شکوہ کیا۔

”تو اور کیا کروں؟ یار میں نے تمہاری آس میں کوئی اور سوت بھی نہیں لیا اور تم ہو کہ یہ بیوہ کا سفید لباس اٹھالائے میرے لیے۔ حد ہے ویسے“، اپنی الماری سے کچھ تلاش کرتے ارحم نے ایک بار پھر سے اُسے شرمندہ کیا۔

”بس کرو اتنا بھی بُرًا نہیں لگ رہا جتنا تم سمجھ رہے اور ساتھ واسکٹ بھی تو لا یا ہوں وہ ڈارک ٹکر کی ہے اس کے ساتھ اچھی لگے گی“، ڈارک بلو ٹکر کی واسکٹ نکال کر اُس کی نظروں کے سامنے لہراتے زارون نے اپنا دفاع کیا۔

”تو یہ بات تم نے پہلے کیوں نہیں بتائی“، واسکٹ اُس کے ہاتھ سے جھپٹتے ارحم نے شیشے کے سامنے جاتے اُسے اپنے ساتھ لگاتے چیک کیا۔

”ویسے اس کے ساتھ اچھا لگے گا وائٹ ڈریس اور عامِ دنوں کی نسبت تھوڑا مختلف بھی ہو جائے گا“، اپنے آپ کو شیشے میں دیکھتے ارحم نے زارون کی رائے طلب کی جو پیچھے کھڑا اُسے ہی گھور رہا تھا۔

”اچھا لگے گا تو تمہارے لیے لا یا ہوں نا ویسے کون سامیر ادمان خراب تھا جو تم پر اتنے پسے خرچ کرتا“، آخری بات منہ میں بڑھتا تھا زارون نے مسکرا کر اُسے دیکھا جو شیشے میں سے ہی اُسے آنکھیں دکھارتا تھا۔

”ٹھیک ہے بس پھر یہ فائل ہو گیarat کو میں یہی پہنھوں گا اور تم؟ تم کیا پہنھوں گے؟ نہیں پلیز یہ مت کہنا کہ اس جیسا ایک تم نے اپنے لیے بھی لیا ہے“، اُس کی مسکراہٹ سے اندازہ لگاتے ارحم نے خطرے کے پیش نظر نفی میں سر ہلا کیا۔

”لیا ہے پرواں کا کلر چینج ہے اس لیے تم پریشان نہ ہو کوئی مجھے لڑکا سمجھ کر لڑکی کو انگوٹھی پہنانے کا نہیں کہے گا“، دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھ کر صوفے کی بیک سے ٹیک لگاتے قدرے بے نیازی سے زارون نے اُسے مطمئن کیا جو اُس کی بات سنتے ہی سامنے پڑا برش اٹھا کر اُس کی جانب سچینک چکا تھا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور خبردار اگر دوبارہ تم نے مجھ جیسے کپڑے پہن کر محفل میں تمام لڑکیوں کو اپنی جانب متوجہ کروانے کی کوشش کی تو، حد ہے مجھے پتا تم جان بوجھ کر مجھ جیسا لباس پہننے ہوتا کہ سب مجھے چھوڑ کر تمہیں دیکھیں“، منہ پھلا کر اُس کے ساتھ ہی صوف پر بیٹھتے ارحم نے لڑکیوں کی طرح جیلس ہوتے شکوہ کیا۔

”ہونہ بس کرواب میں اتنا بھی اچھا نہیں اور ہی بات کپڑوں کی تو میں کچھ اور پہن لیتا ہوں پر ایک مسئلہ ہے؟“ اُس کامنہ بناد کیجھ کر زارون نے بات ادھوری چھوڑی۔ ”کیا مسئلہ؟“ ارحم نے خوشی خوشی سوال کیا۔

”یہی کہ میں جو بھی پہن لوں پھر بھی تم سے اچھا ہی لگوں گا،“ پر سکون انداز میں اپنی بات کمکل کرتے اُس نے ارحم کی طرف دیکھا جو اسے مصنوعی گھوری سے نوازتے اپنے گلے سے لگا چکا تھا۔

”کیا ہوا؟“ اُسے اس قدر جذباتی ہوتا دیکھ کر زارون نے حیرت سے پوچھا۔

”کچھ نہیں بس ایسے ہی، آنکھوں میں آئی نمی کو چھپاتے ارحم نے نظریں ملائے بغیر ہی نفی میں سر ہلا یا۔“ کچھ کھایا تم نے؟ افف مجھے تو یاد ہی نہیں رہا کہ تم سے چائے کا پوچھ لوں، خود ہی اپنے سوال کا جواب دیتے اُس نے وہاں سے اٹھنا چاہا۔

”کیا ہوا؟“ اُس کا ہاتھ تھامتے زارون نے پھر سے اپنا سوال دھرا یا۔

”کچھ بھی نہیں ہوا اور تم کیا یہ شکی بیویوں کی طرح ایک بات کو لے کر میرے پیچے پڑ جاتے ہو۔ دل کر رہا تھا تمہیں گلے لگانے کا تو بس لگالیا،“ کندھے اچکاتے اُسے نے خود کو لا تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے چلو اٹھو کچھ کھاتے ہیں اور یہ انکل آنٹی کھاں ہیں جب سے آیا ہوں نظر نہیں آئے“، زارون نے مزید زور دینے کی بجائے بات بدلتے سوال کیا۔

”یہی کہیں ہوں گے اپنے کمرے میں۔ چھوڑو تم انہیں اور بتاؤ کیا کھاؤ گے؟ کھانا منگواؤں یا چائے؟“ صوفے سے اٹھتے ارحم نے اس موضوع پر مزید کوئی بات کر کہ اپنا موڈ خراب کرنے کی بجائے زارون سے پوچھا۔

”پہلے کھانا پھر چائے۔“

”ٹھیک ہے میں بول کے آتا ہوں“، اُس کی بات سننے ارحم نے اثبات میں سر ہلا اور کمرے سے باہر نکلتے کچن کی جانب بڑھا۔

فلمیشن کا انتظام ہاشم صاحب نے اپنی شان اور اسٹیلیش کے مطابق بہت بڑے پیمانے پر کیا تھا۔ سارے لان کو بہت خوبصورتی کے ساتھ مختلف لائس اور پھولوں سے سجا یا گیا تھا۔ عورتوں اور مردوں کا سارا انتظام ایک ہی جگہ پر تھا۔ ”واہ بھی آج تو ہاشم صاحب نے کمال کر دیا“، لان میں داخل ہوتے ہی چاروں اطراف میں دیکھتے ارحم نے تو سفی نظروں سے سراہا۔

”شرم کرو کم از کم آج کے دن کوئی بد مزگی پیدا مت کرنا“، اُس کے ہاشم صاحب کہنے پر زارون نے اُسے ایک گھوری سے نوازا۔

”ہونہ بدمزگی میں نہیں بلکہ تمہارے پیارے انگل آنٹی پیدا کرتے ہیں“، پاس سے گزرتی ایک عورت کو ناگواری سے دیکھتے جس نے نامناسب سالباس پہننا تھا اُس نے بھنویں اچکائیں۔

”بس کرو کوئی اور بات کرو یہ رابعہ کے گھروالے کب تک پہنچے گے؟“ اپنی گھڑی میں ٹائم دیکھتے زارون نے اُس کا دماغ پھر سے خراب ہوتا دیکھ کر سوال کیا۔

”پتا نہیں کہا تو نوبجے کا تھا مگر یہ بڑے لوگ اور لڑکیوں کی تیاری۔ میرے خیال سے گیارہ تو بجا ہی دیں گے“، اندازہ لگاتے اُس نے ارحم کی بات کا جواب دیا اور آئندہ بیگم کی جانب متوجہ ہوا جو اپنی ایک دوست کو لیے اُن کی طرف ہی آرہی تھیں۔

”ہیلو کیسے ہوا رحم بیٹا؟“ اُس کے قریب آتے اُس عورت نے اپنے مخصوص بناؤٹی لبھے میں خوش دلی سے پوچھا۔

”جی اللہ کا کرم ہے آپ کیسی ہیں؟“، زارون کے آنکھیں نکالنے پر کوئی فضول جواب دینے کی بجائے اُس نے مرودت مسکراتے ہوئے اُن کا حال پوچھا جن کا گھر اگلا بار بار اُسے الجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔

”میں بھی ٹھیک ہوں ماشاء اللہ کافی گڈ لو گنگ لگ رہے ہو۔ بہت بہت مبارک ہو منگنی کی“، اپنے شولڈر کٹ بال پیچھے کی جانب کرتے اُس نے پر اعتماد لجھ میں کہا۔ ”شکر یہ...“، مختصر ساجواب دیتے وہ ان سے ایکسکیووز کرتا کچھ فاصلہ پر کھڑے زارون کے پاس آگیا کیونکہ اُس عورت کو مزید برداشت کرنے کی ہمت اُس میں نہیں تھی۔

”توبہ ان آنٹیوں کو شرم نہیں آتی“، آتے ہی کانوں کو ہاتھ لگاتے ارحم نے تبصرہ کیا۔

”آن کو شرم دلانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے اس لیے جو جیسا ہے اُس کے حال پر چھوڑ دو اور آج کا وقت اچھا بنا ناچاہتے ہو تو مہربانی کر کہ آنٹیوں اور انکلوں میں غلطیاں نکالنے سے بہتر ہے سب سے اچھے اخلاق سے ملو“، ایک بار پھر سے اُسے یکھر دیتے زارون نے ویٹر کو آواز دی۔

”بس کرو یار کبھی کبھی تو مجھے تم دوست سے زیادہ دادی اماں لگتے ہو جو مجھے سمجھنا نے کا کوئی بھی موقع اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتی اور یہ ہم کیا پہلے ہی تیار ہو کر یہاں آکر کھڑے ہو گئے ہیں چلو والپس میرے کمرے میں چلتے ہیں“، ویٹر کو جانے کا اشارہ کرتے اُس نے زارون کو اپنے ساتھ اندر کی جانب گھسیٹا۔

”حدیہ پلیز اور مت لگاؤ قسم سے میں نے کبھی اتنا میک اپ نہیں کیا“، اُسے مزید بلش آن لگاتا دیکھ کر نور نے منع کیا۔ ”کچھ نہیں ہوتا آپی اور میں نے کون سا اتنا زیادہ میک اپ کیا ہے“، حدیہ نے اُس کا ہاتھ ہٹاتے برش پھیرا۔

”پھر بھی یار پلیز نہ کرو مجھے نہیں پسند“، نور نے جھنجھلاتے ہوئے اُسے روکا اور سامنے پڑا ٹشوٹھا کر اپنی گال پر پھیرنے لگی۔

”نور کیا ہے یارا تھی پیاری تو لوگ رہی ہوا ب پلیز یہ ٹشو پھیر پھیر کر میک اپ خراب مت کرو“، رابعہ جو خاموشی سے بیٹھی پار لروالی سے لپسٹک لگوار ہی تھی اُس نے اُس لڑکی کو دو منٹ روکنے کا اشارہ کرتے اُسے ٹوکا اور ساتھ ہی اُس کے ہاتھ سے ٹشو جھپٹا۔

”ٹھیک ہے میں کچھ نہیں کرتی پر پلیز تم اپنی بہن کو سمجھاؤ کہ مجھے مزید چڑیل نہ بنائے“، اُس کے قریب جھکتے نور نے آہستہ سے سر گوشی کی۔

”ہاہاہا شرم کروا یک توکب سے تمہیں تیار کرنے میں لگی ہے اور اوپر سے تم اُسے ایسا کہہ رہی ہو“، آنکھیں نکالتے رابعہ نے پچھے کھڑی حدیہ کو دیکھا جو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سُن چکی تھی۔

”ٹھیک ہے نور آپی اب آپ اپنے بال وغیرہ خود ہی سیٹ کر لیں۔ میں بھی جا کر اب تیار ہوتی ہوں کافی ٹام ہو گیا ہے“، اُس کی بات کا بر امناتے حدیہ نے مقبول سا بہانہ بنایا۔ ”سوری یار میں نے ایسے بات نہیں کی تھی۔“، نور نے جلدی سے اُس کا ہاتھ پکڑتے وضاحت دی۔

”اُس اکے میں نے غصے نہیں کہا“، ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اُسے تسلی دیتے وہ رابعہ کو آنکھیں دکھانانہ بھولی۔ ”ٹھیک ہے پھر تم تیار ہو جاؤ میں خود ہی اپنے بال سیٹ کر لوں گی ویسے بھی میں نے حجاب ہی کرنا تو زیادہ مسئلہ نہیں ہو گا“، برش اٹھا کر اپنے بالوں میں پھیرتے اُس نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کیا۔

”حجاب؟ تم حجاب کر کہ جاؤ گی؟“، رابعہ سیمت حدیہ نے بھی اُسے حیرت سے دیکھا۔ ”ہاں کیوں کیا ہوا؟ حجاب کرنا جرم ہے کیا؟“، نا سمجھی سے اُن کی جانب دیکھتے نور نے سوال کیا۔ ”نہیں، جرم تو نہیں پر... اچھا خیر چھوڑ جو تمہارا دل کرتا ہے کرلو۔“، بات ادھوری چھوڑتے رابعہ نے حدیہ کو آنکھ کے اشارے سے چپ رہنے کا کہتے نور کو مطمئن کیا جو اُس کی بات سنتے ہی اپنے کام میں لگ چکی تھی۔

-----

”معاذ بیٹا تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے؟“ کمرے میں داخل ہوتے عابدہ بیگم نے اُسے لیپ ٹاپ پہ مصروف دیکھ کر سوال کیا۔

”کیوں؟ کہیں جانا تھا کیا؟“ جان بوجھ کر لا علمی کا اظہار کرتے اُس نے تفکر سے پوچھا۔  
”مطلوب تم بھول گئے۔ حد ہے بیٹا میں نے دو پھر کو تمہیں بتایا تو تھا کہ آج ارحام کی منگنی ہے اور ہم سب کو بلایا ہے“، عابدہ بیگم نے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”آفف میں بھول گیا۔ سوری امی“، کہتے ساتھ ہی اُس نے کلاک کی طرف دیکھا۔

”اب تو ٹائم بھی کافی ہو گیا ہے آپ پلیز ابو کے ساتھ چلی جائیں میرا دل نہیں ہے“، بہانہ بناتے اُس نے اپنی نظریں لیپ ٹاپ پر مرکوز کیں۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے جیسی تمہاری مرضی پر چلتے تو ارحام کو اچھا لگتا“، اُس کے انکار پر عابدہ بیگم نے تھوڑا اصرار کیا۔

”امی میرا سچ میں دل نہیں ہے اور ویسے بھی سارا دن دوستوں کے ساتھ گھوم پھر کے بس ہو گئی ہے۔ آپ پلیز میری طرف سے ارحام سے معدرت کر لیجیے گا“، معاذ نے معقول ساجواب دیتے عابدہ بیگم کو مطمئن کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر تم کھانا گرم کر کہ کھالینا۔ ہم لوگ جلدی واپس آجائیں گے“، مزید زور دینے کی بجائے عابدہ بیگم نے اُس کی بات سمجھتے ہوئے ہدایت دی اور احمد صاحب کی آواز پر معاذ کو ایک بار پھر سے اپنا خیال رکھنے کا کہہ کے باہر کی جانب بڑھیں۔

”اُفف محبت بھی کیا عجیب چیز ہے کبھی غلط وقت پر صحیح انسان سے ہو جاتی ہے تو کبھی صحیح وقت پر غلط انسان سے اور وقت تو صحیح تھا مگر تم سے ہی کیوں؟“ عابدہ بیگم کے جاتے ہی معاذ نے لیپ طاپ بند کرتے اذیت سے اپنی آنکھیں بند کیں اور آج سے کچھ عرصے پہلے کامنڈر اُس کی آنکھوں کے پر دوں پہ پھر سے تازہ ہوا جب زارون کے ضد کرنے پر وہ اُس کے ساتھ یونیورسٹی ایک فنگشن میں گیا تو وہاں ارحم کے ساتھ ساتھ اُس کی ملاقات رابعہ سے ہوئی جس کا تعارف ارحم نے اپنی کزن کے طور پر کروایا جس کی مسکراہٹ اور سادگی ایک نظر میں ہی معاذ کے دل میں گھر کر گئی۔ اُس نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کو اس نظر سے نہیں دیکھا تھا مگر رابعہ کو دیکھتے ہی اُس کے دل نے ایک خوبصورت احساس کو محسوس کیا جو زارون کے منہ سے ارحم اور رابعہ کی آپس میں پسندیدگی کا سنتے ہی کہیں کونے میں ایک کسک کی مانند دفن ہو چکا تھا پر اُس احساس کو ختم کرنے کے بعد بھی معاذ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ رابعہ کو کسی اور کا ہوتا دیکھ سکے۔

”پتا نہیں یہ دل بھی کیوں لا حاصل کو اتنا پرکشش سمجھتا ہے کہ اُس کے علاوہ کچھ اور سوچتا ہی نہیں“، اپنے سر کو جھکتے سوچوں سے پیچھا چھڑوانے کے لیے اُس نے ایک گہری سانس لی اور واپس لیپ ٹاپ کھول کر میلز چیک کرنے لگا بے شک کچھ دیر کے لیے ہی سہی پر اپنا دھیان بٹا سکے۔

-----

”ہائے اللہ کتنا پیار اور بڑا گھر ہے ارحام بھائی کا“، گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی نور نے حیرت سے چاروں اطراف میں دیکھا۔ ”امیر لوگوں کے گھر ایسے ہی ہوتے ہیں“، اُس کی حیرت پر مسکراتے حدیہ نے وضاحت دی۔

”ہاں ہوتے تو ہیں پر یہ تو بالکل ٹوٹی میں دکھائے جانے والے گھروں جیسا ہے“، اُس کی بات کی تائید کرتے نور نے ایک بار پھر سے تعریف کی اور آگے بڑھ گئی۔

”آپی کیا کر رہی ہیں چلیں اندر“، اُسے ہاتھ لگا کر پھولوں کو چیک کرتا دیکھ کر حدیہ نے سامنے سے آتی لڑکی کو مسکرا کر دیکھا جو نور کی حرکت پر اُسے حقیر نظر وں سے دیکھ کر ظزیرہ مسکرائی۔

”سوری وہ بس میں دیکھ رہی تھی کہ اصلی ہیں یا تقلیٰ، اپنی خفگی چھپانے کے لیے اُس نے جلدی سے ہاتھ پیچھے کیا اور اُس کے ساتھ ہی اندر کی جانب بڑھی جہاں داخل ہوتے ہی اُس کی آنکھیں اور منہ کھل چکے تھے۔

”یہ سب نے کیسے کپڑے پہنے ہیں؟ امیر ہو کہ لوگ ایسے کپڑے پہننا شروع کر دیتے ہیں کیا؟“ پاس کھڑی اڑکی کو غور سے دیکھتے ہوئے نور نے حدیہ کے قریب ہو کے سر گوشی کی تو اُس نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے آنکھیں نکالیں۔ ”سوری بس میرے منہ سے نکل گیا“، اُس کا اشارہ سمجھتے نور نے جلدی سے معدرات کی توحیدیہ نے سگھ کا سانس لیا۔

”ویسے تم اگر مجھے پہلے بتا دیتیں کہ سب ایسے کپڑے پہن کے آئیں گے تو میں یہاں آنے سے پہلے دونفل صلوٰۃ توبہ کے پڑھ لیتی“، نظروں میں معصومیت لیے اُس نے کچھ فاصلہ پر کھڑی عورتوں کا جائزہ لیتے تبصرہ کیا۔

”ونفل کیوں؟“ اُس کی بات کا مفہوم سمجھنہ آنے پر حدیہ نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔ ”میری ماما کہتی ہیں عورتوں کا عورتوں کو ایسے بے حیائی والے کپڑوں میں دیکھنا بھی گناہ ہے اس لیے مجھے پتا ہوتا تو میں پہلے ہی اللہ سے معافی مانگ لیتی“، پلکیں جھپکاتے نور نے حدیہ کو شرمندہ کیا

جو خود بھی شارت شرط کے ساتھ تنگ کیپری اور دوپٹے کو لاکٹ کی طرح گلے میں ڈالے کھڑی تھی۔

"توبہ نور آپی کیوں شرمندہ کر رہی ہیں اور پلیز ایسے نہ دیکھیں ورنہ آپ کو ان آنٹیوں کا نہیں پتا ایک بار لٹرنا شروع ہو گئیں تو چپ نہیں کریں گی" ، اپنی سکنی چھپاتے اُس نے نور کو اپنے ساتھ اسٹیچ کی جانب لے جاتے تنبہ کی۔

"ہونہ اب میں نے ایسا کیا کہہ دیا جو یہ مجھ سے لڑیں گی اور ہاں یہ تم مجھے کہاں لے کر جا رہی ہو؟" ، اُس کے ساتھ کھنچتے نور نے ایک سینکڑ کر سوال کیا۔

"رابعہ آپی کے پاس۔ وہ دیکھیں کب سے ہمیں بُلارہی ہیں" ، حدیہ نے اُس کی توجہ اسٹیچ کی جانب کرواتے بتایا تو نور نے سر ہلاتے اُس کے ساتھ ہی قدم آگے بڑھائے۔

"وَيَكْمِ وَيَكْمِ، مَا شاء اللَّهُ بِهِتْ لَمْبَى عَمْرٍ هِيَ آپَ كَيْ - هُمْ لَوْگُ ابْجَھِي آپَ كَاهِي ذَكَرَ كَرَرَ هِيَ تَحْتَهُ" ، آفاق صاحب نے حیدر شاہ کو دیکھتے ہی اپنے بازو داکرتے پر جوشی کا مظاہرہ کیا۔

”کیسے ہیں آپ؟ اور بہت بہت مبارک ہو“، آفاق صاحب سے ملتے ہی حیدر شاہ نے پاس کھڑے ہاشم صاحب سے بغل غیر ہوتے ہوئے کہا۔

”خیر مبارک، میں ٹھیک ہوں اور ایک بار پھر سے اپنی غلطی کے لیے شرمند ہوں یقین جانیں اگر مجھے تھوڑا سا بھی اندازہ ہوتا کہ مراد آپ کا پیٹا ہے تو میں کبھی بھی آپ کو پریشان نہ کرتا“، ہاشم صاحب نے ایک بار پھر سے اُن سے معدرت کی۔

”کوئی بات نہیں اور یہ بار بار معدرت کر کہ آپ ہمیں شرمندہ مت کریں“، اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے حیدر شاہ نے سُلیْح کی جانب دیکھا جہاں ایک خوش شکل سالڑ کا بیٹھا کچھ لڑکیوں سے باٹیں کر رہا تھا۔

”ماشاء اللہ بہو تو چن کہ تلاش کی ہے آپ نے“، رابعہ پر نظر پڑتے ہی حیدر شاہ نے تعریف کی۔

”ہم نے نہیں بلکہ بیٹے نے خود ہی پسند کی ہے“، مسکراتے ہوئے ہاشم صاحب نے آفاق صاحب کی جانب دیکھا جواب سلیم کے صاحب کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ ”پھر تو یہ اور بھی اچھی بات ہے۔ زندگی بچوں نے گزارنی اور ہم والدین ایسے ہی اپنی مرضی مسلط کر کہ بُرے بن جاتے ہیں“، بات کو مذاق کارنگ دیتے حیدر شاہ نے سلیم صاحب سے اُن کا حال احوال

دریافت کیا جو ہاشم صاحب کے دوست ہونے کے ساتھ ساتھ حیدر شاہ سے بھی بخوبی واقف تھے۔

”السلام علیکم“، وہ لوگ اپنی ہی باتوں میں مصروف تھے جب مراد شاہ نے ان کے قریب آتے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام واه بھئی مراد بھئی آیا ہے“، سلیم صاحب نے اُسے دیکھتے ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

”ہاں بس میں نے سوچا کیوں نااج اپنے ساتھ ساتھ ہاشم کے تمام دوستوں سے بھی اپنے برخوردار کا تعارف کروادیا جائے بس اسی لیے ساتھ لے آیا“، اُسے ہاشم صاحب سے ملتا دیکھ کر حیدر شاہ نے وضاحت دی۔

”بہت اچھا کیا چلو اس بہانے ہم نے بھی مراد کی شکل دیکھی“، ان کی بات پر سر ہلاتے آفاق صاحب نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

”اور سناؤ بیٹا کیسے ہو؟ اور آج کل کیا مصروفیات ہیں؟“، ہاشم صاحب نے ویٹر کو آواز دیتے مراد شاہ سے پوچھا جس نے اس وقت نظریں جھکاتے خود کو ایک معزز روبروپ میں ڈھلا ہوا تھا۔

”کچھ نہیں انکل، پڑھائی مکمل ہو گئی ہے میری اب بس باباسائیں کے ساتھ ہی ہوتا ہوں“، ان کی بات کا جواب دیتے اُس نے پاس سے گزرتے لڑکے کو دیکھتے ہی ناگورائی سے ماتھے پر بل ڈالے۔

”آپ لوگ کچھ لیں نا“، ویٹر کوڈش لیے کھڑا دیکھ کر ہاشم صاحب نے میز بانی کے فرائض انجام دیے۔

”جی جی لے رہا ہوں“، ڈش سے جوس کا گلاس اٹھاتے اُس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا تو زارون نے پلٹ کر واپس اُس شخص کو بے یقینی سے دیکھا جس کے پاس سے ابھی ابھی وہ گزر کے آیا تھا۔

”یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟“، ہاشم صاحب کو ان سب کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر زارون نے خود کلامی کی اور تجسس کے ہاتھوں مجبوراً پنے سوال کے جواب کے لیے ارحم کی جانب بڑھا جو نور کو اُس کے میک اپ کرنے پر تنگ کر رہا تھا۔

”ارحم بھائی آپ بہت بڑے ہیں اور رابعہ نے بھی تو میک اپ کیا ہے آپ نے اُسے تو ایک بار بھی چڑیل نہیں کہا“، اب کی بار نور نے غصہ کرتے منہ پھلا یا۔

”ہوننہ اس کو چڑیل کہا تو میں نے پھنس جانا اس لیے تمہیں کہہ کر ہی گزارا کر رہا ہوں“، راز داری سے کہتے ارحم نے آنکھ بچا کر پیچھے رابعہ کی جانب دیکھا جو ان دونوں کی ہی طرف متوجہ تھی۔

”ارحم میری بات سنو ذرا“، اس سے پہلے کے رابعہ کوئی جواب دیتی زارون نے وہاں پہنچتے مداخلت کی۔

”ہاں کہو؟“، وہیں بیٹھے بیٹھے وہ اُس کی جانب متوجہ ہوا۔ ”یہاں نہیں، اُٹھو میرے ساتھ آؤ“، اُس کا ہاتھ تھامتے زارون نے ایک نظر ساتھ صوفے پر بیٹھی نور پر ڈالی جس نے اُس کے آتے ہی اُسے اگنور کرنے کے لیے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

”یار کیا ہوا ہے؟“ اُس کے ساتھ بیچ آتے ارحم نے جھنجھلاتے ہوئے پوچھا۔

”یہ مراد شاہ کو کس نے بلا یا ہے؟“، نظروں سے دوسری جانب اشارہ کرتے زارون نے بغیر کوئی تمہید باندھے مدعے کی بات پر آتے سوال کیا۔

”کون مراد شاہ؟“، اُس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ارحم کی زبان کو بریک لگی۔

”اس کو یہاں کس نے بلایا؟“، جواب کی بجائے ارحم نے الٹا سوال پوچھتے غصے سے آگے بڑھنا چاہا۔

”یا رہ بات پہ ایک دم جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی اور مجھے لگ رہا ہے انگل نے انہیں دعوت دی ہے وہ دیکھو اس کا باپ بھی ساتھ ہے“، حیدر شاہ جسے زارون نے ایک دوبار اخبار میں دیکھا تھا اُس کی جانب اشارہ کرتے اُس نے ارحم کو اُس طرف جانے سے روکا۔

”پرہاشم صاحب کا ان سے کیا تعلق؟“، جیل والی بات کو سوچتے ارحم نے سوالیہ نظرؤں سے زارون کو دیکھا جو لا علمی سے اپنے کندھے اچکا چکا تھا۔

”میں جا کر دیکھتا ہوں“، اُس سے بازو چھڑ رواتے ارحم نے دو قدم بڑھائے۔

”یار دفع کرو ہمیں اُس سے کیا لینا دینا اور میں نے تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم جا کر لڑنے لگ جاؤ“، اُس کے سامنے آتے زارون نے بات سننچالنے کی کوشش کی۔

”جو بھی ہو میں اسے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا کیسے اُس دن یہ اُس لڑکی کو چھیڑ رہا تھا“، ماتھے پر بل ڈالتے ارحم نے زارون کی غیرت جگانے کے لیے اُس دن کا واقعہ یاد دلایا۔

”جانتا ہوں پر اس وقت یہاں سب کے سامنے بات کرنا یا کچھ کہنا مناسب نہیں ہے اس لیے تم اپنا غصہ ٹھنڈا کرو اور جاؤ واپس اسٹیچ پر سب لوگ رسم کے لیے تمہارا انتظار کر رہے ہیں“، آئمہ بیگم کی آواز پر زارون نے اُسے پر سکون کیا۔

”مگر وہ...“

”میں نے کہا ناجاؤ اور اُسے میں دیکھ لوں گا“، اُس کی بات درمیان سے کاٹتے زارون نے تسلی دی تو ارحم نے اثبات میں سر ہلا کیا اور ایک گہری سانس لیتے واپس استیح کی جانب بڑھ گیا۔

---

ارحم نے رابعہ کو انگوٹھی پہنائی تو سب نے تالیاں بجا کر انہیں مبارک باد دی۔

”بہت بہت مبارک ہو“، آئمہ بیگم نے رابعہ کی پیشانی پر بوسہ دیتے ان دونوں کی نظر اُتاری تو ریحانہ بیگم نے بھی آگے بڑھتے رابعہ کی ماں ہونے کے ناتے ارحم کے سر پہ ہاتھ رکھتے انہیں ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دی۔

”آفف اتنا نامم ہو گیا ہے اور یہ ماما اور رضا پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں“، اپنے مو باکل سے رضا کا نمبر ڈائل کرتے نور نے خود کلامی کی اور شور کی وجہ سے باہر کی جانب بڑھی۔ ”پتا نہیں کیا مسئلہ ہے“، مسلسل بیل جانے کے باوجود بھی دوسری طرف کوئی جواب موصول نہ ہونے پر نور نے فکر مندی سے سوچا اور شور کی وجہ سے لان سے مزید تھوڑا دور جا کے دوبارہ سے رضا کا نمبر ڈائل کیا۔

---

”رضائھالو فون، پتا نہیں کہاں مصروف ہے“، بیل جانے کے بعد پھر سے کسی نے کال ریسیون کی تو نور نے گھر کے نمبر پر ٹرانی کیا۔

”اما پلیز اٹھا لیں“، پیچھے سے آتے شخص کو ایک نظر دیکھتے اُس نے منہ میں بڑبڑاتے نائلہ بیگم کا نمبر ڈائل کیا جو بند تھا۔

”اُفف ایک تو ابھی تک آئے نہیں اوپر سے کال بھی ریسیو نہیں کر رہے“، موبائل کان سے ہٹاتے نور نے اُس شخص کو وہیں جسے موبائل پر گفتگو کے ساتھ ساتھ اپنا تفصیلی جائزہ لیتے دیکھ کر کوفت سے سوچا اور واپس پلٹ کر اندر کی جانب بڑھنے لگی جب اُس شخص نے فوراً سے کال بند کرتے اُس کے سامنے آکے اُس کا راستہ روکا۔

”کیا مسئلہ ہے آپ کو؟“، اُس کی حرکت پر اگ بگولہ ہوتے نور نے اپنے اور اُس کے درمیان فاصلہ قائم کرنے کے لیے دو قدم پیچھے کی جانب اٹھائے۔

”پہلے تو کوئی نہیں تھا پر لگتا ہے اب تمہیں دیکھ کر ہو چکا ہے“، پھر سے اُسے سرتاپاؤں دیکھتے مراد شاہ نے خباشت سے اپنے ہونٹوں پہ ہاتھ پھیرا۔

”میرا راستہ چھوڑیں پلیز..“، اُس کی فضول حرکت پر گھبراٹے نور نے قدرے دیران جگہ ہونے کے باعث اُس سے مزید الجھانا مناسب نہیں سمجھا اسی لیے اُس کی سائیڈ سے نکلنے کی کوشش کی۔

”نه، ابھی نہیں... ابھی تو میں نے جی بھر کر تمہیں دیکھا بھی نہیں اور تم ہو کہ بھاگنے کی کر رہی ہو“، بازو اُس کے سامنے کر کے اُس کا راستہ روکتے مراد شاہ نے اُس کے ہاتھ میں بجتا موبائل چھین کر نیچے پھینکا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرا موبائل چھینکنے کی؟ میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔ بد تمزیز، جنگلی انسان“، صدمے سے نیچے زمین پر ٹوٹے ہوئے موبائل کو دیکھتے اُس نے غم و غصے کے ملے جلے تاثرات سے تھپٹ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ ”واہ، غصہ... ہاہاہاویسے مجھے حسین لڑکیاں تو پسند ہی ہیں اگر خزرے والی اور بہادر ہوں تو مراد شاہ کا دل آجاتا ہے ایسی دلرباپ“، ایک ہاتھ سے اُس کا ہاتھ پکڑتے دوسرے ہاتھ سے اُس نے نور کے چہرے کو چھوا۔

”میں تمہاری جان لے لوں گی چھوڑو مجھے“، آس پاس کسی کو مدد کی نظر سے تلاش کرتے اُس نے اپنا چہرہ پیچھے کیا۔ ”ہاہاہا، جان تو تم لے ہی چکی ہو“، پلیک گلر کے اس کارف میں لپٹے اُس کے شفاف اور خوبصورت چہرے کو دیکھتے جو غصے کے باعث سرخ ہو چکا تھا مراد شاہ نے اک آہ بھری۔

”پلیز بھائی مجھے چھوڑ دیں کیوں آپ مجھے تنگ کر رہے ہیں؟“، اُس کی سخت گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑوانے کی کوشش کرتے نور نے ہر طرف سنایا کیا کہ کسی بڑے خطرے کے پیش نظر اُس کی منت کی جواب چہرے پر اپنے شیطانی ارادوں کی چمک لیے مسکرا رہا تھا۔

”بھائی؟ ہاہاہا بھائی ہو گا تیر اگھر میں۔ میں تو کچھ ہی دیر میں تیر ایار بننے والا ہوں“، اُسے اپنے قریب کرتے مراد شاہ نے اُس پہ جھکنے کی کوشش کی تو نور نے پورے زور سے اپنے سے دور ہٹایا جو کسی چٹان کی مانند کھڑا تھا۔ ”کون ہے وہاں؟“ زارون جوار حم کا موبائل لینے کے لیے گھر کی اندر جا رہا تھا نور کی پشت کو دیکھتے اُسے پکارتا ہوا اُس جانب آیا۔ مراد شاہ نے اُس کی آواز سننے ہی ہوش میں آتے بھاگنے کی کی۔

کون ہے؟ نور تم یہاں کیا کر رہی ہے اور یہ؟ یہ کون تھا؟“ اندھیرے کی وجہ سے مراد شاہ کی شکل زارون کو ٹھیک سے نظر نہیں آئی تب ہی اُس نے قریب آتے نور سے پوچھا جوا بھی تک سہی ہوئی نظروں سے اُس سائیڈ پے دیکھ رہی تھی جہاں ابھی ابھی مراد شاہ گیا تھا۔

”ک۔۔ چھ نہیں اور۔۔ کوئی۔۔ نہ۔۔ ل تھا۔۔ کو۔۔ ن ت۔۔ ھا“، ٹوٹے الفاظ میں اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے اُس نے چہرے پہ آیا پسینہ صاف کیا۔

”ٹھیک ہے مجھے کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی اور تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو سب خیریت ہے نا؟“ اُس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے زارون کو کچھ گڑ بڑ محسوس ہوئی ”نہیں۔۔ ہا۔۔ ل خیریت ہے“، اپنا موبائل نیچے سے اٹھاتے نور کو اُس شخص کی حرکت بتاتے تھوڑی شرمندگی ہوئی تب ہی بات کو ٹھال گئی۔

”یہ موبائل کو کیا ہوا؟ تمہارا ہے؟“ ٹوٹے ہوئے موبائل کو دیکھتے زارون نے ناچاہتے ہوئے پھر سے سوال کیا۔

”آپ کو کیا مسئلہ ہے؟ میرا ہے یا کسی کا بھی آپ جائیں اپنا کام کریں“، موبائل کو آن کرنے کی کوشش کرتے نور نے اُس کی تحقیق سے تنگ آتے کہا اور اپنی آنکھوں میں آنے والی نمی کو صاف کیا۔

”ٹھیک ہے سوری میں نے ویسے ہی پوچھ لیا“، معدرت کرتے وہ پلٹاپر پھر رک گیا۔

”یہاں اکیلے کھڑا ہونا مناسب نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ اندر چلی جاؤ“، اُسے مشورہ دیتے زارون نے اندر کی جانب قدم بڑھائے۔

”سنیں۔۔۔“، اُسے سچ میں جاتا دیکھ کر نور نے پیچھے سے آواز دی۔

”جی فرمائیے؟“

”وہ پلیز اپنا موبائل دے دیں مجھے اپنے بھائی کو کال کرنی ہے“، ڈر کے مارے اندر جانے کی ہمت نہ ہونے پر نور نے اُس سے مدد مانگی تو زارون نے مزید کوئی بات پوچھے بغیر اپنی جیب سے موبائل نکال کر اُس کے سامنے کیا۔ ”شکر یہ...“، لرزتے ہاتھوں سے موبائل پکڑتے نور نے رضا کا نمبر یاد کیا۔

”تم بات کر لو سکون سے جب فری ہو جائے موبائل تو مجھے دے دینا“، اُسے کچھ سوچتا دیکھ کر زارون نے نرمی سے کہا اور واپسی کے لیے پلٹا۔

”نہیں پلیز...“، فٹ سے اُس کے سامنے آتے نور نے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا نہیں؟“

”پلیز آپ نہ جائیں مجھے ڈرگ رہا ہے اور اندر بہت شور ہے مجھ سے بات نہیں ہو گی“، اپنی مجبوری بتاتے آنسو بے اختیار ہی آنکھوں کے بند توڑتے گالوں پہ بہہ نکلے۔

”اچھا ٹھیک ہے میں بھیں ہوں تم بات کرلو“، اُس کے چہرے سے نظریں چراتے جو بار بار اُسے اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا زارون نے تسلی دی تو نور نے جلدی سے اپنے ہاتھ کی پشت سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ظہیر صاحب کا نمبر ملایا جو اُسے یاد تھا۔

-----  
”یہ تم میرے قریب بیٹھ کر مجھے دیکھنے کے بجائے ادھر ادھر کسے دیکھ رہی ہو؟“، ارحم نے اُسے متلاشی نظروں سے لان کے چاروں اور دیکھتے پا کر اپنے اگنور ہونے پر منہ بسوار۔

”ہوننہ تم میں ایسی کیا خاص بات ہے جو میں تمہیں دیکھوں؟ میں نور کو تلاش کر رہی تھی کافی دیر سے مجھے نظر نہیں آئی“، اُس کی خوش فہمی دور کرتے رابعہ نے حدیہ کو اشارے سے بُلاتے طفر کیا۔

”شرم کرو میرے منہ پہ ہی میری بے عزتی کر دی اور بہت سی خاص باتیں ہیں مجھ میں اگر تم غور کرو تو“، معنی خیزی سے کہتے ارحم نے اپنی بائیں آنکھ دبائی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری خاص باتیں اور پلیز یہاں سب کے درمیان بیٹھ کر ایسی فضول حرکتوں سے پر ہیز کرو“، اپنی جھینپ مٹانے کے لیے رابعہ نے اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتے اُسے تنبعہ کی۔

”نهیں کروں گا پر ہیز جاؤ جو کرنا ہے کرو“، اُس کا ہاتھ تھامنے ارحم نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا تو رابعہ نے سرخ ہوتے چہرے سے اُسے گھورا۔

”ارحم پلیز بد تمیزی نہ کرو“، حدیہ کو سٹج کی جانب آتا دیکھ کر رابعہ نے ایک نظر باقی مہمانوں کی طرف دیکھا جو سب اپنی اپنی باتوں کے ساتھ ساتھ کھانے پینے میں مصروف تھے۔

”ایک شرط پہ“، اُس کے کان کے قریب جھکتے ارحم نے آہستگی سے سر گوشی کی۔

”کیا؟“ فوراً سے اپنا چہرہ پیچھے کرتے رابعہ نے تیوری چڑھائی۔

”یہی کہ تم کچھ دیر میرے ساتھ بਾہر چلوگی۔ مطلب آسکر یم کھانے“، اُس کی نظر وہ میں غصہ دیکھ کر ارحم نے جلدی سے اپنی بات کی وضاحت دی۔

”اچھا ٹھیک ہے“، اثبات میں سر ہلاتے اُس نے جلدی سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے کھینچا۔

”جی آپی؟“ حدیہ نے اُس کے قریب آتے سوال کیا۔

”نور، نور کہاں ہے؟“ اپنی بو کھلا ہٹ پر قابو پاتے رابعہ نے ارحم کی جانب دیکھنے سے غرض بردا جس کے چہرے پر ایک دلکش سی مسکراہٹ بکھر چکی تھی۔

”پتا نہیں مجھے تو اپنے بھائی کو کال کرنے کا بتا کر گئی تھیں“، رابعہ کی بات پر پلٹ کر لان میں ایک نظر دوڑاتے حدیہ نے لاعلمی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اچھا تم دیکھو اسے جا کر۔ کال کرنے کئی تھی تو اب تک آجانا چاہیے تھا“، فکر مندی سے کہتے وہ دوسری جانب متوجہ ہوئی جہاں ہاشم صاحب اپنے کچھ دوستوں کو لیے استھن پر آئے تھے۔

”ٹھیک ہے میں دیکھتی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں“، اُسے تسلی دیتے وہ پچھلی جانب سے اُتر کر نور کو دیکھنے کے لیے باہر نکل گئی۔

”آئیں آئیں حیدر صاحب ان سے ملیں یہ ہے ہماری ہونے والی بہورابعہ اور بیٹا یہ میرے دوست ہیں حیدر شاہ“، ہاشم صاحب نے اُن کے قریب آتے تعارف کروایا۔

”السلام عليكم انکل“، چہرے پر مسکراہٹ سجائے احترام سے اس نے سلام کیا۔

”وعلیکم السلام، خوش رہو بیٹا“، اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے انہوں نے رابعہ کے سر پر رکھنا چاہا مگر اس سے پہلے ہی ارحم جو حیدر شاہ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو چکا تھا اس نے انہیں ایسا کرنے سے روکا۔

”دوسروں کی عز توں کا سر عام جنازہ نکالنے والوں کو یہ بات نیب نہیں دیتی کہ وہ کسی کی بہن، بیٹی یا بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کے اُسے خوش رہنے کی دعا دیں“، ان کا ہاتھ جھٹکتے ارحم نے دانت پیستے اپنی بات مکمل کی۔

”ارحم کیا بد تمیزی ہے یہ“، ہاشم صاحب کو بالکل بھی اُس سے ایسی بد تمیزی کی امید نہیں تھی تب ہی آگے بڑھتے انہوں نے مداخلت کی پر حیدر شاہ کے اشارہ کرنے پر رک گئے۔

”الگتا ہے ہمارے بیٹے کا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا“، اُس کی بات کا بُرا منانے کی بجائے حیدر شاہ نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے چہرے پر مسکراہٹ سجائی۔

”میر آپ سے کوئی ایسارتہ نہیں کہ میں غصہ کروں“، لا تعلقی بر تے ارحم نے ضبط سے اپنی مٹھیاں بھینخی۔

”رشتے بنانے سے بنتے ہیں اور رہی غصے کی بات تو مراد شاہ کی طرف سے ہم تم سے معافی مانگتے ہیں وہ تو بس دوستوں کے ساتھ مل کر شغل میلا کر رہا تھا“، ارحم کی خاموشی پر حیدر شاہ نے خود رہی معدرت کی۔

”شغل کرنے کے لیے اُسے دنیا کی اور کوئی مخلوق نہیں ملی جو وہ کسی کی مجبور بہن بیٹی کو سر عام ذلیل کر کہ اپنے دل کو تسلیم دے رہا تھا اور وہ بھی اس زور پہ کہ اُس کا باپ یعنی آپ، ایک بڑی شخصیت ہیں اور آپ کو مجھ سے معدرت کرنے کی بجائے اپنے بیٹے کو سمجھانا چاہیے تاکہ وہ دوبارہ ایسی حرکت کر کہ آپ کو دوسروں کے سامنے شرمندہ نہ کرے“، ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں میں بے خوف لیے اُس نے حیدر شاہ کو مشورہ دیا جن کی مسکراہٹ ارحم کی جراءت پر کہیں ہوا ہو چکی تھی۔

”ارحم اب تم فضول بول رہے ہو“، ہاشم صاحب نے حیدر شاہ کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے مداخلت کی۔

”میں فضول بول رہا یہ آپ کو نظر آگیا پران کے بیٹے کی فضول حرکت آپ کو نظر نہیں آئی جو آپ نے پھر سے انہیں اپنے فیملی فنگشن پر مدعا کر لیا تاکہ یہ یہاں آکر اپنے ساتھ ساتھ ہماری عزت کو

بھی نیلام کر سکیں،“ در شنگی سے کہتے ارحم نے ایک تر چھی نظر حیدر شاہ پہ ڈالی جن کی برداشت اب جواب دے چکی تھی تب ہی وہ غصے سے استیحش سے نیچے اترے۔

”حیدر بات سنو میری، حیدر پلیز رکو“، آفاق صاحب نے اُن کی پیچھے جاتے اُنہیں روکنے کی کوشش کی تو ہاشم صاحب بھی ارحم کو گھورتے بعد میں اُس کی خبر لینے کا ارادا کرتے اُن کے پیچھے ہی لان کی دوسری جانب بڑھے۔

” یہ کیا کیا؟ حد ہے، ارحم تم کیوں انکل کو ہر دفعہ ناراض کر دیتے ہو“، اُن سب کے جاتے ہی رابعہ نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”پلیزاب تم میرا دماغ خراب مت کرو۔ میں نے جو کیا ٹھیک کیا اور یہ زارون کہاں ہے؟ کب سے میرا موبائل لینے گیا ہے ابھی تک آیا نہیں“، بات بدلتے ارحم نے آئندہ بیگم کو بھی ہاشم صاحب کے پیچھے جاتا دیکھ کر سر جھکلتے اپنا غصہ کم کرنے کے لیے ایک گھر انسانس لیا۔

-----

”بابا سائیں کیا ہوا؟ آپ اتنے غصے میں کہاں جا رہے ہیں؟“ مراد شاہ جو زارون کی وجہ سے وہیں اندھیرے میں چھپا کھڑا تھا اب اُس کی پشت اُس لڑکی کی جانب تھی۔ موقع ملتے ہی دوسرے لان کی جانب بڑھا جہاں سے حیدر شاہ تیزی سے باہر نکلے تھے۔

”گھر چلو...“ اس کی بات کا جواب دیے بغیر حیدر شاہ نے حکم دیا۔

”پر بابا سائیں ہوا کیا ہے؟“ ان کو اس قدر غصے میں دیکھ کر مراد شاہ نے ڈرتے ہوئے پوچھا۔

”مراد میں نے کہا نا گھر چلو“، اپنی چادر ٹھیک کرتے انہوں نے رکتے ہوئے اُسے تنہہ کی جواب کوئی بھی سوال و جواب کیے بغیر ان کے پیچھے گیٹ کی جانب بڑھا۔

”حیدر پلیز رکو میری بات سنو“، آفاق صاحب کے ساتھ ساتھ ہاشم صاحب نے بھی ان کے پیچھے آتے انہیں پکارا۔

”اب بات سننے کے لیے رہ کیا گیا ہے؟ آپ کے بیٹے نے ہماری جتنی عزت افزائی کی ہے بہت ہے“، ہاشم صاحب نے آگے بڑھتے ان کا بازو تھامے روکا تو حیدر شاہ نے اپنی آواز پنجی رکھتے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

”پلیز حیدر ارحام تو بچہ ہے اُس کے منہ میں جو آیا اُس نے بول دیا اور مجھے یقین ہے کہ اُسے تمہارے اور مراد کے بارے میں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے ورنہ وہ کبھی بھی کسی سے بد تمیزی نہیں کرتا“، آفاق صاحب نے ارحام کی طرف داری کرتے حیدر شاہ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”غلط فہمی؟ ہونہ آفاق صاحب اگر ارحام بچہ ہے تو مراد بھی ابھی نا سمجھ ہے اور اس عمر میں ایسی چھوٹی مولیٰ نادانی ہو جاتی مگر اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ میں یا میرا بیٹا دوسروں کی عزتیں لوٹتے

پھرتے ہیں،“، حیدر شاہ نے ایک طنز بھری نظر ہاشم صاحب پر ڈالتے آفاق صاحب کو جواب دیا اور مزید کوئی بات سے بغیر مراد شاہ کو اشارے سے گاڑی اسٹارٹ کرنے کا کہا جو معاملے کو سمجھنے کی کوشش میں تھا۔

”حیدر پلیز میری بات سنو، ارحم کے رویے کی میں تم سے معدرت کرتا ہوں“، ہاشم صاحب نے پھر سے انہیں منانے کی ناکام کوشش کی۔

”آپ کی معدرت سر آنکھوں پر مگر اب ہمارا یہاں رکنا ناممکن ہے اس لیے آپ بے فکر ہو کر اپنے باقی مہمانوں کو دیکھیں۔ ہم ان شاء اللہ جلد ہی آپ سے ملاقات کریں گے“، ہاشم صاحب کو شرمندگی سے نکالتے حیدر شاہ نے ناچاہتے ہوئے بھی انہیں تسلی دی اور مراد شاہ کو گاڑی باہر نکالنے کا اشارہ کیا۔

”ارحم نے بالکل بھی اچھا نہیں کیا، حیدر شاہ سے دشمنی کا مطلب تم سمجھتے ہونا؟“، ان کی گاڑی نظروں سے او جھل ہوئی تو آفاق صاحب نے افسردگی سے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”جانتا ہوں مگر ارحم نے کوئی غلط بات بھی نہیں کی میں نے فضول میں اس شخص کو یہاں آنے کی دعوت دے دی“، ہاشم صاحب نے اپنے فیصلہ پر چھتنا تے آئندہ بیگم کی جانب دیکھا جو ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کرتے پریشان کھڑی ان کی تمام باتیں سُن چکی تھیں۔

”ہم یہ تو تمہیں پہلے سوچنا چاہیے تھا اس طرح کے کردار کے مالک انسان کو اپنے گھر میں بلاانا اور اپنی فیملی سے ملا ناسید ہا سید ہا اپنے آپ کو داؤ پہ لگانے کے مترا داف ہے“، ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے آفاق صاحب نے انہیں آنے والے وقت کے لیے محتاط رہنے کا کہا۔

”اس مسئلے کو بعد میں دیکھیں گے ابھی اندر چلو سب مہمان انتظار کر رہے ہوں گے“، آفاق صاحب کی بات پر غور کرتے ہاشم صاحب نے آئمہ بیگم کو تسلی دی اور اپنے ساتھ لیے اندر کی جانب بڑھے۔

”پتا نہیں کہاں ہیں سب کوئی بھی میرا فون نہیں اٹھا رہا“، ظہیر صاحب کے نمبر پر بار بار ڈرائی کرتے رہنے کے بعد نور نے تھک ہار کر موبائل زارون کی طرف بڑھایا۔

”کہیں مصروف ہونگے۔ تم گھر کے نمبر پر یا اپنی ماما کے نمبر پہ کال کر کہ پوچھ لو“، اُسے پریشان دیکھ کر زارون نے مشورہ دیا۔

”کر کہ دیکھ چکی ہوں پر کوئی رسیو نہیں کر رہا“، پریشانی سے آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو پلکیں جھپکا کر باہر آنے سے روکتے نور نے بتایا۔

”اچھا کوئی بات نہیں تم پریشان نہ ہوا اور اندر چلو“، بار بار اُس کی خوبصورت آنکھوں کو نم ہوتا دیکھ کر زارون نے اپنے دل کی دھڑکن کو بے ترتیب ہونے سے روکا۔

”نہیں، مجھے اندر نہیں جانا“، اُس کی بات سنتے ہی اُس شخص کا چہرہ پھر سے نور کی نظروں کے سامنے آیا۔ ”کیوں، کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ اُسے ایک دم سے خوف زدہ ہوتے دیکھ کر زارون کو کچھ غیر معمولی سا احساس ہوا۔

”نہیں۔۔۔ کچھ۔۔۔ نہیں ہوا۔۔۔ وہ بس رش کی وجہ سے میرا دل گھبر ا رہا تھا“، اپنے چہرے پر واضح ہونے والے خوف کو گھبر اہٹ کا نام دیتے نور نے بات کو ٹالا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں اندر جا کر رابعہ کو بھیجتا ہوں“، ارحم کامو بائل کمرے میں تھاتب ہی زارون نے کال کرنے کی بجائے خود جانے کا بتاتے قدم دوسرے لان کی جانب بڑھائے جہاں فنگشن کا سارا انتظام کیا گیا تھا۔

”نہیں.... پلیز زار آپ مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر مت جائیں“، اُسے جاتا دیکھ کر نور نے اندھیرے سے خوف کھاتے نامحسوس طریقے سے اُس کا ہاتھ تھاما۔

”کیا مسئلہ ہے نور؟ نہ تم مجھے جانے دے رہی ہو اور نہ ہی خود جانے کے لیے تیار ہو۔ دیکھو میں اس طرح تمہارے ساتھ اکیلا کھڑا نہیں ہو سکتا“، جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑواتے زارون نے اپنی سسکی

چھپانے کے لیے تھوڑا غصہ دکھایا۔ ”کیوں کھڑے نہیں ہو سکتے؟ پہلی بات کہ میں آپ کو کھا نہیں جاؤں گی اور دوسرا کہ اگر آپ کو جانا ہے تو جائیں پر اس طرح مجھ سے زور سے بات نہ کریں“، اُس کے غصے پر آنسوؤں نے بے بسی سے آنکھوں کے بند توڑے تو نور نے جلدی سے انہیں صاف کرتے گیٹ کی جانب قدم بڑھائے۔

”کہاں جا رہی ہواب؟ میرا یہ مطلب نہیں تھا“، اُس کے پیچھے آتے زارون نے وضاحت دی۔

”آپ کا جو بھی مطلب ہو مجھے اُس سے کوئی مطلب نہیں اور سوری کہ میں نے آپ کو اتنی دیر اپنی وجہ سے تکلیف دی۔ جائیں آپ اندر میں کسی اور سے مدد لے لوں گی“، بے رخی سے کہتے نور نے اپنے لہجے کو ہموار کھنے کی کوشش کی جو آنسوؤں کو ضبط کرنے کی وجہ سے رندھ چکا تھا۔ ”ہم میں یہی ہوں اور یہ لو ایک بار پھر سے کال کر کہ دیکھ لو“، زارون نے اپنا موبائل پھر سے اُس کی جانب بڑھایا۔

”مجھے نہیں کرنا سنبھال کر رکھیں آپ اپنا موبائل“، ایک غصے بھری نظر گھوری کی صورت اُسے نوازتے نور نے اپنی اکٹ برقرار رکھی۔

”نور پلیز تنگ مت کرو اور گھر کال کر لو یا جو بھی مسئلہ ہے مجھے بتاؤ میں حل کر دوں گا“، اب کی بار جھنجھلاتے زارون نے بے زاری سے کہا۔

”میں نے کہا نا آپ جائیں تو پلیز میری جان چھوڑ دیں اور میں اپنی مدد خود کر سکتی ہوں“، اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے نور نے اوپنچی آواز میں چلاتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو صاف کیا جو زارون کے غصے کرنے پر تیزی سے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

”نور آپی آپ یہاں ہیں اور میں کب سے آپ کو اندر ڈھونڈ رہی تھی“، حدیہ نے پیچھے سے آتے اُسے پھولے ہوئے سانس کے ساتھ پکارا۔

”کیا ہوا؟ آپ رو کیوں رہی ہیں؟“ اُس کے پلٹنے پر اُس کا آنسوؤں سے ترچہ دیکھ کر حدیہ نے فکر مندی سے پوچھتے ایک نظر زارون کی طرف دیکھا جو غصے سے لب بھینچ وہاں سے جا چکا تھا۔

”آپی کیا ہوا ہے بولیں؟ کیوں رورہی ہیں آپ؟“ دوسری طرف خاموشی پر حدیہ نے پھر سے اپنا سوال دھرا یا تو نور نے اپنے لب کا ٹتے آنسو کو بہانے سے روکتے لفی میں سر ہلا یا۔

”کچھ نہیں بس مجھے گھر جانا ہے پلیز تم رابعہ سے کہو مجھے گھر چھوڑ دے“، اُس کا ہاتھ تھامتے نور نے با مشکل اپنی بات مکمل کی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں بولتی ہوں پر پلیز آپ رونا تو بند کریں، زارون نے کچھ کہا ہے؟“ اُسے تسلی دیتے حدیہ نے اندازہ لگایا۔

”نہیں، بس میرا دل گھبرا رہا ہے تم رابعہ سے کہو کہ مجھے گھر چھوڑ آئے“، نفی میں سر ہلاتے نور نے پھر سے اصرار کیا۔۔

”اچھا بس آپ پریشان نہ ہوں اور اندر آئیں میرے ساتھ“، اُس کا ہاتھ تھامتے حدیہ نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں بس مجھے اندر نہیں جانا تم کال کرو رابعہ کو“، اُس کے ہاتھ میں موبائل دیکھ کر نور نے اپنا ہاتھ کھینچتے منع کیا۔

”ٹھیک ہے میں کرتی ہوں“، اُس کے عجیب رویے پر کچھ سوچتے ہوئے حدیہ نے سر ہلایا اور رابعہ کو کال ملانے لگی پر اُس سے پہلے ہی رابعہ اور ارحم لان سے نکلنے اُن کی جانب بڑھے۔

”نور کیا ہوا؟“، ارحم نے قریب آتے اُس کے رندھے ہوئے چہرے کو دیکھتے فکر مندی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں ارحم بھائی پلیز مجھے گھر جانا ہے“، نفی میں سر ہلاتے پھر سے اُس نے اپنی بات دھرائی۔

”ہوا کیا ہے؟“، زارون نے ہمیں آکر بتایا ہم تو پریشان ہی ہو گئے۔ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“، رابعہ نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے پوچھا۔

”نہیں، کچھ نہیں کہا بس میرا موبائل گر گیا اور گھر سے کوئی کال بھی ریسیو نہیں کر رہا اس لیے مجھے گھبراہٹ ہو رہی ہے“، اپنے رونے کی معقول وجہ بتاتے نور نے ان تینوں کی جانب دیکھا جو چہرے پر پریشانی لیے اُسے ہی دیکھ رہے تھے۔

”اچھا بس پریشان نہ ہوا اور چلو میں چھوڑ دیتا ہوں“، رابعہ کو بھی چلنے کا اشارہ کرتے ارحم نے نور کو تسلی دی اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔

”چھپکلی، چڑیل، بد تمیز پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو“، ارحم اور رابعہ کو نور کے بارے میں بتانے کے بعد زارون نے زیر لب اُسے بُرا بھلا کہا۔

”زارون کہاں تھے تم؟ تمہارے ابو کب سے جانے کا بول رہے ہیں“، عابدہ بیگم نے اُسے بڑھاتا دیکھ کر پوچھا۔

”جی یہی تھا۔ کیا ہوا؟ اتنی جلدی کیوں جانا ہے؟ آپ نے کھانا کھایا؟“، ایک ہی سانس میں کئی سوال پوچھتے زارون نے اپنی گھٹری پر ٹائم دیکھا تورات کا ایک نج چکا تھا۔

”ہاں کھالیا ہے بس تم چلو معاذ بھی گھر میں انتظار کر رہا ہو گا“، اُس کی بات کا جواب دیتے عابدہ بیگم نے مسز گیلانی کو اشارے سے سلام کیا جو ان کو دیکھتے ہی قریب آچکی تھیں۔

”کیسی ہیں آپ اور یہ زارون ہے نا؟“، حال احوال کے بعد انہوں نے اُس کی جانب متوجہ ہوتے اندازہ لگایا۔

”جی زارون ہی ہے۔“

”ماشاء اللہ کافی بڑا اور ہند سم ہو گیا ہے“، اُن کے دیکھتے ہی زارون نے بھی مر و اسلام کیا تو مسز گیلانی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے تھکی دی۔

”بس بچوں کو بڑا ہونے میں کون سی دیر لگتی ہے۔ آپ سنائیں؟ گیلانی بھائی کیسے ہیں اور فائدہ؟“

”جی سب ٹھیک ہیں۔ فائدہ ساتھ ہی آئی ہے میرے“، اپنی بیٹی کو آواز دیتے انہوں نے خوش دلی سے بتایا تو زارون نے عابدہ بیگم کو احمد صاحب کو دیکھنے کا بولا اور فائدہ کے اُن کی جانب آنے سے پہلے پہلے مسز گیلانی سے معدرت کرتے وہاں سے چلتا بنا۔

-----

”نور پلیز چپ کر جاؤ اور یہ دیکھو ہم بس پہنچ گئے ہیں“، باہر اُس کے گھر کی طرف اشارہ کرتے رابعہ نے اُسے چپ کر واپس جو سارے راستے روتے ہوئے آئی تھی۔

”ماما...“، اُن کی گاڑی کے ساتھ ہی ظہیر صاحب کی گاڑی بھی گھر کے دروازے پر رکی تو نور نے ارحم کے بریک لگاتے ہی جلدی سے دروازہ کھولتے باہر نکلنے کی کی۔

”ماما کیا ہوا؟ آپ ٹھیک ہیں نا؟“، پچھلے دروازے سے نائلہ بیگم کو باہر آتا دیکھ کر نور نے فکر مندی سے پوچھا۔

”رضاء، کیا ہوا رضا کو؟ یہ چوت کیسے لگی؟ مجھے لگ ہی رہا تھا کہ ضرور کوئی مسئلہ ہے تب ہی آپ لوگ میرا فون نہیں اٹھا رہے ہیں، اپنے کزن کے سہارے رضا کو گاڑی سے باہر آتا دیکھ کر نور نے آگے بڑھتے اُس کے بازو پہ لگی چوت کو دیکھا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ ٹھیک ہے رضا اور تم کس کے ساتھ آئی ہو“، نائلہ بیگم نے اُس کی سو جبھی ہوئی آنکھوں اور سرخ چہرے کو دیکھتے تسلی دی۔

”السلام علیکم آنٹی، کیا ہوا رضا کو؟“، رابعہ نے بھی اُس کے پیچھے آتے فکر مندی سے پوچھا۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ، بَسْ تَحْوِرًا يُنْكِحُهُ هُنَّ نُورٌ كُوْتَهَارِي طَرْفَ حَچُورَ كَآيَا توَانِي دُو سَتُو سَاتَهُ كَهْلِيْنَهُ“  
چلا گیا اور واپسی پر بائیک سے گر گیا مگر اللہ کا شکر ہے اُس نے زیادہ پریشانی سے بچالیا، اُسے تفصیل بتاتے انہوں نے اُس کے پیچھے کھڑے لڑکے کو دیکھا۔

”آنٹی یہ ارحم ہے“، اُن کی سوالیہ نظروں کو پڑھتے رابعہ نے تعارف کروایا تو ارحم نے آگے بڑھتے انہیں سلام کیا۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ جِيتَهُ رَهُو بِيَثَا“، اُس کے کندھے پر تھکی دیتے نائلہ بیگم نے دعا دی تو ارحم رضا کا پوچھنے کے لیے اُس کی جانب بڑھا۔

”بہت معدرت بیٹا آپ کو ہماری وجہ سے تکلیف اٹھانی پڑی“، ارحم کورضا اور نور کے ساتھ مصروف دیکھ کر نائلہ بیگم نے رابعہ سے معدرت کی۔

”کوئی بات نہیں آنٹی آپ پریشان نہ ہوں“، انہیں تسلی دیتے رابعہ نے ارحم سے چلنے کا پوچھا۔  
”ہاں بس چلو۔“

”رک جاتے بیٹا اور تم لوگ تو اندر بھی نہیں آئے“، اپنی پریشانی میں نائلہ بیگم کو ہوش ہی نہیں رہا کہ وہ باہر ہی کھڑی اُن سے باتیں کر رہی ہیں۔

”کوئی بات نہیں آنٹی ہم کل چکر لگا لیں گے آپ بس اپنا اور رضا کا خیال رکھیے گا“، اُن کی بات سننے رباعہ نے طریقے سے منع کیا۔

”اور میری بہن کا بھی... توبہ بہت روتنی ہے۔ ویسے آنٹی کون سا پلانٹ فٹ کروایا ہے آپ نے اس کی آنکھوں میں“، رباعہ کی آخری بات سننے ارحمنے شر رات سے نور کو چھپڑا جوا بھی بھی رضا کا معاشرہ کرتے رہے تھی۔

”پتا نہیں یہ بات تو آج تک ہمیں بھی معلوم نہیں ہوئی“، اُس کی بات پر مسکراتے نائلہ بیگم نے لا علمی کا اظہار کیا تو رباعہ سیمت ارحمنے بھی مسکرانے لگا۔

”ٹھیک ہے آنٹی اللہ حافظ“، رباعہ نے اُن کے ساتھ ساتھ نور کو بھی بائے بولا جو ان کو فراموش کیے بس رضا کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔

-----

”بابا سائیں آپ نے مجھے ادھر یہ سب کیوں نہیں بتایا“، حیدر شاہ کی پوری بات سننے کے بعد مراد شاہ نے غصے سے پا گل ہوتے دیوار میں ہاتھ مارا۔

”تمہارے اسی غصے اور جذباتی پن کی وجہ سے میں نے تم سے وہاں بات نہیں کی کیونکہ میں جانتا تھا کہ تم اپنی طبیعت کی تیزی کی وجہ سے سارا بنا بنا یا کام خراب کر دو گے اور تم کیا سمجھتے ہو کہ تمہارے باپ نے کوئی کچی گولیاں کھیلی ہیں؟ نہیں مراد شاہ نہیں... میں نے جو کچھ کیا بہت سوچ سمجھ کر کیا“، اپنی سوچ پر قہقہہ لگاتے حیدر شاہ نے ارحم کے چہرے کو تصور میں لاتے جبڑے سمجھنے پہنچے۔

”میں کبھی اپنی بے عزتی کو اتنی جلدی نظر انداز نہیں کرتا مگر جو کرتا ہوں سوچ سمجھ کر کرتا ہوں تاکہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی کا نشان تک بھی کسی کونہ ملے اور وہ کل کا لڑکا بڑی بھڑکیں مار رہا تھا نا؟ اب تم دیکھنا کہ حیدر شاہ اُس کا کیا انجام کرتا ہے پہلے تو بس اُس نے تم سے ٹکری لختی مگر اب اُس کا سامنا مجھ سے ہوا ہے“، کرسی سے اٹھ کر مراد شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے حیدر شاہ نے انتقام کی آگ میں جلتے اپنی آنکھوں کو زور سے بند کیا۔

”بابا سائیں اب میں مزید اُس لڑکے کو زندہ نہیں چھوڑ سکتا اور مجھے اپنی پروانہیں مگر اُس نے جو آپ کے ساتھ کیا میں جلد از جلد اسے ایسا سبق سکھاؤں گا کہ اُس کی سات نسلیں یاد رکھیں گی“، اُن کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے مراد شاہ نے دانت پیسے۔

”ہاہا سبق کا انتظام ہم تم سے پہلے ہی کر چکے ہیں“، اس لیے تم یہ سب چھوڑ و اور کل رات کی ایک بڑی پارٹی کے لیے تیار ہو جاؤ جس کے بعد ہم نے تمہارے لیے ایک نئے چہرے کا بھی انتظام کر رکھا ہے“، اپنی سوچ کے پردوں پر رابعہ کا عکس بناتے انہوں نے مراد شاہ کو مسکرا کر دیکھا۔ ”شکر یہ بابا سائیں“، ان کا ہاتھ احترام سے چوم کر اپنی آنکھوں پہ لگاتے مراد شاہ نے انہیں آرام کرنے کا کہا اور اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

---

”نور آپی بس کریں اور پلیز جا کر منہ دھولیں اب تو مجھے آپ کی طرف دیکھ کر خوف آنے لگ گیا ہے“، اپنے دل پر ہاتھ رکھتے رضا نے سانس روکے اُس کے چہرے پر بکھرے کا جل کو دیکھ کر جھر جھری لی۔

”نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہی رہوں گی تمہارے پاس“، اپنے آنسو صاف کرتے اُس نے بے دھیانی میں کا جل کو مزید اپنے گال پہ پھیلاتے رضا کا ہاتھ تھامے ضد کی۔

”ٹھیک ہے، کہیں مت جائیں پر پلیز اپنا چہرہ دھولیں اس سے پہلے کہ آپ کی ڈراؤنی شکل دیکھ کر مجھے ہارٹ اٹیک آئے“، اُس کی افسردہ صورت دیکھ کر رضا نے با مشکل اپنی ہنسی کنٹرول کی۔

---

”تم ہو، ہی بد تمیز یہاں میں تمہارے غم میں رورو کر پا گل ہو رہی ہوں اور تمہیں میرا مذاق اڑانے کی پڑی ہے۔ جاؤ میں بات ہی نہیں کر رہی تم سے“، اُس کے زخمی بازو پر ہاتھ مارتے نور نے اپنی خفگی کا اظہار کیا اور غصے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

”ہونہے بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے“، منه میں بڑ بڑاتے اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی شیشے کی جانب دیکھا۔

”ہائے یہ میرے چہرے کو کیا ہوا؟“ منه کھولے شیشے کے قریب آگر خود کو غور سے دیکھتے اُس نے واش روم کی جانب دوڑ لگائی۔

”رضاء ہے، ہی بد تمیز انسان کسی کو بتا، ہی دیتا ہے کہ اُس کے چہرے پہ کچھ لگا ہوا ہے پر نہیں بس ہر وقت دوسروں کا مذاق اڑانے کی پڑی رہتی ہے“، ٹل کھولتے صابن سے اچھی طرح اپنے چہرے کو رگڑ رگڑ کر صاف کرتے اُس نے اپنی غلطی ماننے کی بجائے رضا کو کو ساجو تب سے اُسے اتنی بار منه دھونے کا بول چکا تھا۔

”پتا نہیں کیا لگا دیا ہے میری آنکھوں میں اُس بد تمیز حدیہ نے“، منه دھونے کے باوجود بھی کا جل کو آنکھوں کے نیچے لگا دیکھ کر اُس نے بے زاری سے خود کلامی کی اور کمرے میں آتے ٹشو سے اُسے صاف کیا۔

”ہائے اللہ میں زار کے سامنے بھی اسی حالت میں روتی رہی ہوں کیا؟“، اچانک سے دماغ میں اُبھرتے خیال کو سوچتے نور نے ایک پل کے لیے خود کو اسی حالت میں زارون کے سامنے تصور کیا۔

”نہیں، اُس وقت نہیں پھیلا ہو گا“، اپنی سوچ کی نفی کرتے اُس نے اپنے دل کو تسلی دی اور سر سے اسکارف اُتار کے الماری میں رکھتے اپنے پاؤچ میں رکھے موبائل کو نکالا۔ ”محوس، بد تمیز، جاہل کہیں کا“، مراد شاہ کا یاد آتے ہی اُس کے ماتھے پر بل پڑے۔

”میں یونیورسٹی جاتے ہی ارحم بھائی کو اُس شخص کے بارے میں بتاؤں گی“، ایک افسوس بھری نظر اپنے موبائل کی ٹوٹی ہوئی اسکرین پر ڈالتے اُس نے پختہ ارادہ کیا اور منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر جمالی روکتے اپنی سست طبیعت کے سبب کپڑے تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کرتے کمفرٹر اوڑھتے سونے کے لیے لیٹ گئی۔

”معاذ کیا ہے یار؟ کل سے تم کمرے میں کیوں بند ہو؟“ دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوتے زارون نے اُسے موبائل میں مصروف دیکھ کر سوال کیا۔

”میں بند نہیں ہوں بلکہ کل سے تم لاپتا ہو“، اُس کی بات سنتے ہی موبائل سائیڈ پر رکھتے اُس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔

”مطلوب میرے لاپتا ہونے کا غصہ ہے؟“ اندازہ لگاتے زارون نے پاس رکھی چیز اٹھا کر بیڈ کے قریب کی۔

”نہیں یار غصہ کیوں ہونا، بس ویسے ہی دل نہیں کر رہا تھا۔ شائد موسم تبدیل ہو رہا ہے اسلیے طبیعت میں عجیب اداسی سے چھاگئی ہے“، اپنی بات کی وضاحت کرتے معاذ نے اُس سے نظریں چڑائیں۔

”ہاہا بس کرو، جانتا ہوں میں تمہیں۔ اور یہ اداسیاں موسم میں نہیں بلکہ انسان کے اپنے اندر ہوتی ہیں جنہیں وہ ان موسموں کی تبدیلی کا نام دیتے خود کو ہر الزام سے بری قرار دے دیتا ہے“، اُس کی سرخ آنکھوں میں جھانکتے زارون نے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

”ہم بات تو ٹھیک ہے تمہاری پری یہ اتنی عقل مندانہ باتیں تم نے سیکھی کہاں سے؟“ اپنی چوری کپڑے جانے پر ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائتے معاذ نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”بس یہ وقت سب کچھ سیکھا دیتا ہے خاص کر عاشقوں کی آنکھوں کو پڑھنا“، معنی خیزی سے کہتے اُس نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہارے فلسفے۔ اور شرم کرو بڑے بھائی سے ایسی فضول باتیں کرتے ہیں کیا؟" بات کوٹا لئے کے لیے معاذن کُشن اٹھا کر اُس کے سر پہ مارا۔

"چلو کہیں باہر چلتے ہیں تھوڑی آؤ نگ بھی ہو جائے گی اور ساتھ تمہارا دل بھی بہل جائے گا جو پتا نہیں کس کے غم میں سوگ منار ہا ہے" ، شرارت سے کہتے زارون نے اپنی بائیں آنکھ دبائی۔

"تم نہیں سدھر سکتے۔ امیٹھیک کہتی ہیں ار حم بچارے کا تو نام ہی بد نام ہے اصل فساد کی جڑ تو تم ہو" ، اُسے مزید باتیں کرنے کا موقع فراہم کیے بغیر معاذن بیڈ سے اٹھتے برش اٹھا کر اپنے بالوں میں پھیرا۔

"ہاں بس کبھی غور نہیں کیا" ، سر خم کرتے زارون نے اپنی تعریف پر عاجزی کا مظاہرہ کیا۔

"بس کرو ڈرامے اور چلو تم مجھے کہیں باہر لے کر جانے والے تھے نا؟" ، اُسے واپس بیٹھنے کا رادہ رکھتے دیکھ کر معاذنے یاد دہانی کروائی۔

"ہاں چلو میں توہر وقت ہی ڈرائیور بننے کے لیے تیار رہتا ہوں" ، اُس کی بات پر حامی بھرتے زارون نے خوشدلی سے اپنی خدمات پیش کیں تو معاذنے آگے بڑھتے اپنا موبائل اٹھانے کے ساتھ ساتھ اُسے بھی باہر کی جانب دھکیلا۔

”کیا کر رہے ہو تم لوگ تین دن سے؟ ایک کام کا بولا تھا وہ بھی معمولی سا پر تم کمبوں سے وہ بھی نہیں ہوا“، حیدر شاہ نے اپنے دو فادار ملازموں پر برستے غصے سے اپنی منٹھیوں کو بھینچا۔

”معدرت سائیں پر ہم لوگ اُس دن سے ہی کو شش کر رہے ہیں مگر وہ لڑکی نہ تو یونیورسٹی آرہی ہے اور نہ ہیں کہیں گھر سے باہر نکلی ہے جو ہم اُسے اٹھا کر آپ کی خدمت میں پیش کر سکتے“، اکرام نے سر جھکائے اپنی آواز کو حتی الامکان پیچی رکھتے حیدر شاہ کو انتظار کی وجہ بتائی۔

”تو گھر سے اٹھا لو جو کرنا ہے کرو مگر اگلے چوبیس گھنٹوں میں وہ لڑکی مجھے میرے ڈیرے پر چاہیے“، اُس کی وضاحت پر تیوری چڑھاتے حیدر شاہ نے گرج دار آواز میں حکم دیا۔

”جی سائیں جیسا آپ کا حکم“، اُن کا غصہ دیکھ کر اُن دونوں نے یک زبان ہوتے جواب دیا اور سلام کرتے باہر کی جانب بڑھے۔

”سائیں کیا ہوا ہے؟ کیوں اتنا غصہ کر رہے تھے آپ؟“، بشری خاتون نے لاوٹھ سے آتی آوازوں کا سلسلہ تھنے پر وہاں داخل ہوتے فلر مندی سے پوچھا۔

”میں نے کتنی بار کہا ہے کہ میرے معاملوں میں ٹانگ مت اڑایا کرو پھر کیوں یہ سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیتی ہو؟“، طیش سے اٹھ کر ایک زوردار تھپڑاں کے چہرے پر رسید کرتے حیدر شاہ نے انہیں بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

”معاف کر دیں سائیں غلطی ہو گئی“، آنکھوں میں نبی لیے بشری خاتون نے تذلیل کی شدت سے اپنی پلکیں جھکاتے معذرت کی۔

”ٹھیک ہے دفع ہو جاؤ میری نظروں سے دور چلی جاؤ“، جھٹکے سے ان کے بال چھوڑتے حیدر شاہ نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے اپنے غصے کو ضبط کیا تو بشری خاتون نے سر پر دو پٹھے ٹھیک کیا اور چہرے پر ہلکی سے مسکراہٹ سجائی تاکہ کوئی ملازم انہیں دیکھ کر حیدر شاہ کے رویے کا اندازہ نہ لگا سکیں۔

”پتا نہیں کہاں سے اٹھ کر آ جاتی ہے میرا خون جلانے“، ان کے لاونچ سے نکلتے ہی حیدر شاہ نے اپنی کرسی سنبھالتے خود کلامی کی اور موبائل سے ڈرائیور کا نمبر ڈائل کرتے اُسے اگلے دس منٹ میں گاڑی تیار کرنے کہتے کمرے کی جانب بڑھے تاکہ وقت پر تیار ہو کر پنچاپت کے ایک فیصلہ کے لیے جا سکیں۔

-----

”کہاں مصروف تھیں تم؟“ دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی ارحم نے جھٹ سے سوال کیا۔  
”مطلوب کہاں مصروف تھی؟ نور کے ساتھ بات کر رہی تھی“، اُس کے سوال پر رابعہ نے  
بُرا مناتے وضاحت دی۔

”ہوننہ نور سے تو بڑی باتیں کرتی ہو کبھی نور کے بھائی کا بھی حال پوچھ لیا کرو تمہاری اک نظر  
کے انتظار میں بیٹھا بیٹھا بوڑھا ہو گیا ہے“، اُس کی غصہ بھری آواز پر مسکراتے ارحم نے نظروں میں  
شرارت لیے چھپرا۔

”تو ہو جاؤ بوڑھے اور میں نے کتنی دفعہ تمہیں کہا ہے کہ بات سوچ سمجھ کر کیا کرو“، حدیہ کو  
چائے کا خالی کپ تھما تے رابعہ نے اُس کی بات پر تیوری چڑھائی۔

”شرم کرو لڑکی کوئی اپنے ہونے والی مجازی خدا سے ایسے بات کرتا ہے کیا؟ اور اب میں نے ایسا کیا  
کہہ دیا جو تمہیں اتنی تپ چڑھی ہے“، بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھتے ارحم نے نامسنجھی سے اُس  
کی بلا وجہ غصہ کرنے کی وجہ پوچھی۔

”پہلی بات کہ تم میرے ہونے والے مجازی خدا ہوا بھی ہوئے نہیں اور دوسری بات یہ کون سا  
طریقہ ہے بات کرنے کا کہ تم کہاں مصروف تھیں؟ حد ہے میں کون سے اپنے ماموں کے بیٹے

ساتھ باقیں کر رہی تھی جو تم نے مجھ پہ شک کیا،“، کمرے میں داخل ہوتے رابعہ نے اُسے کے رویے پر اُسے شرمندہ کرنے کی کوشش کی۔

”تو کیا پوچھتا؟ تم بتا دواور رہی بات شک کی توجان ممن میں نے تم پہ شک نہیں کیا بلکہ فکر میں پوچھا کیونکہ پچھلے ایک گھنٹے سے تمہارا موبائل لگاتار مصروف تھا،“، ایک بھرپور انگڑائی لیتے ارحام نے شرمندہ ہونے کی بجائے رابعہ کو اُس کی غلطی کا احساس دلا یا۔

”بس کرو میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں اور میرا نمبر مصروف تھا تو تم حدیہ کے نمبر پہ فون کر کہ پوچھ لیتے پر نہیں تم نے بار بار میرے نمبر پہ کال کی کیونکہ تمہیں مجھ پہ شک تھا،“، اپنی خفگی برقرار رکھتے رابعہ نے پھر سے شکوہ کیا۔

”اچھا میری اماں سوری دوبارہ اگر تمہارا نمبر مصروف ہو تو میں حدیہ کے نمبر پہ کر کہ پوچھ لوں گا اور اب پلیز اپنا موڈ خراب نہ کرو اور بتاؤ آج کا کیا پرو گرام ہے؟ یونیورسٹی جانا ہے یا پھر سے چھٹی کا ارادا ہے؟“، تکیہ اپنے بازوں میں دبائے ارحام نے مطلب کی بات پر آتے سوال کیا۔

”نهیں، آج نہیں جانا کل اسپورٹس ڈے ہے تو کل ہی چلیں گے نور بھی یہی بات کر رہی تھی کہ کلاس تو ہونی نہیں اس لیے ہمارے جانے کا کیا فائدہ،“، رابعہ نے تفصیل کے ساتھ اُسے ساری بات بتائی۔

”اچھا چلو ٹھیک ہے پھر کل ہی چلیں گے اور آنٹی، انکل کیسے ہیں؟“ اُس کی بات سنتے ارجمند جس کا پہلے ہی آج چھٹی کا ارادہ تھا اُس نے اپنے بستر میں واپس لیٹتے گھروالوں کے حال احوال کے بارے میں پوچھا اور کچھ دیر مزید بتائیں کرنے کے بعد کال کاٹ کر پھر سے سونے کی نیت سے آنکھیں بند کرتے لیٹ گیا۔

---

”اماں کیا ہوا ہے تجھے؟ کیوں ہر وقت رو رو کر پورے گھر میں نخوست پھیلاتی رہتی ہے؟“ مراد شاہ جو حیدر شاہ کو دیکھنے اُن کے کمرے میں آیا تھا اُس نے بشری خاتون کو رو تاد کیچھ کر بھنویں اچکائیں۔ ”کچھ نہیں بیٹا وہ بس سر میں درد تھا،“ اپنی ہی اولاد کو سہی ہوئی نظر وہ سے دیکھتے اُنہوں نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

”سر میں درد ہے تو کوئی گولی کھالو یہ ہر وقت جاہل عورتوں کی طرح رونا ضروری ہوتا ہے کیا؟ اور یہ تیری بیٹی کہاں ہے؟ دو تین دن سے مجھے نظر نہیں آئی،“ اپنے سے چھوٹی فاطمہ کے بارے میں دریافت کرتے اُس نے اپنی موچھوں کو تاؤ دیا۔

---

”وہ تمہاری خالہ کی طرف گئی ہے۔ خیر سے نعمان کی شادی طے کر دی ہے تو ساری لڑکیاں مل کر اُس کی تیاری میں لگی تھیں اسی لیے تیری خالہ فاطمہ کو بھی اپنے ساتھ لے گئیں“، ڈرتے ڈرتے انہوں نے تفصیل سے اُسے ساری بات سے آگاہ کیا۔

”بابا سائیں سے پوچھ کے بھیجا ہے؟“ ماتھے پر بل ڈالتے اُس نے سوالیہ نظر وہ سے اپنی ماں کو دیکھا جو اُس کے سامنے نظریں جھکائے کھڑی تھیں۔

”نه۔ نہ۔ میں پر۔۔۔ میں سائیں کو بتانے ہی والی تھی مگر وہ جلدی میں پنچاپت کے لیے نفل گئے“، اُس کے رد عمل کا سوچتے ہی بشری خاتون کی زبان لرزی۔

”میں نے کتنی بار تجھے کہا ہے کہ یوں اُسے کسی کے ساتھ نہ بھیجا کر مگر تجھ میں اثر نام کی کوئی چیز نہیں... بابا سائیں بالکل ٹھیک کہتے ہیں تو جاہل ہونے کے ساتھ ساتھ ڈھیٹ بھی ہے۔ پتا ہے آج کل باہر کے کیا حالات ہیں؟ لوگ بھوکے بھیڑیوں کی طرح تاک لگائے بیٹھے ہیں اور اماں میں بتا رہا ہوں اگر تیری یا تیری بیٹی کی وجہ سے میرے یا بابا سائیں کی عزت پہ کوئی حرف آیا تو میں تم دونوں کو یہاں زندہ گاڑھ دوں گا“، غصے سے چلاتے مراد شاہ نے انگلی اٹھاتے انہیں تنبیہ کی اور لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا تو بشری یگم نے اُس کی بات پر غور کرتے خالی نظر وہ سے اُس کی پشت کو دیکھا جو ان کی سگنی اولاد تھا ان کا لخت جگر جسے حیدر شاہ نے اپنی ہی طرح جانور بنادیا تھا۔

”یا اللہ میرے بیٹے کے دل میں رحم پیدا کر، میں نے شوہر کے ظلم کو تو چپ کر کہ برداشت کر لیا پر بیٹے کے اس طرح کے رویے کو سہنے کی طاقت اب مجھ میں نہیں، رحم کر میرے مالک میرے جگر گوشے کو جابر بنے سے بچا لے“، دکھ سے اپنی بوڑھی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کرتے بشری خاتون نے ہاتھ اٹھاتے دعا کی اور اس سے پہلے کے مراد شاہ خود فاطمہ کو لینے پہنچتا انہوں نے الماری سے اپنی چادر نکال کر اوڑھتے باہر کا رخ کیا۔

-----

”آپ یہ صحیح ہی صحیح اتنا بن سنور کر کھاں جا رہی ہیں؟“ اُسے سفید کلر کی فراک اور ٹروز ار میں ملبوس ریڈ کلر کے اس کارف کے ساتھ حجاب کرتا دیکھ کر رضا کو بے چینی ہوئی۔

”یونیورسٹی جا رہی ہوں، آج ہمارا اسپورٹس ڈے ہے نا اس لیے میں نے اور رابعہ نے ایک جیسے کپڑے پہننے کا فیصلہ کیا ہے“، دیکھو تو کیسی لگ رہی ہوں میں؟“ گول چکر لیتے نور نے اُس سے اُس کی رائے پوچھی۔

”قسم سے سچ پوچھیں تو بالکل بدروج لگ رہی ہیں“، بیڈ پر بیٹھتے بے اختیاری میں اُس کی زبان سے پھسلا جسے فوراً ہی اُس نے اپنے دانتوں تلے دبایا۔

”مطلوب؟“ اپنی کمرپہ ہاتھ رکھتے نور نے تصدیق چاہی۔ ”مطلوب بہت پیاری لگ رہی ہیں ماشاء اللہ، اللہ پاک میری بہن کو بُری نظر سے بچائے“، فٹ سے بات بدلتے رضانے اُسے ڈریسر سے برش اٹھتا دیکھ کر باہر کی جانب دوڑ لگائی۔

”پتا نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے“، زور سے برش بیڈ پر پھینکتے اُس نے پاؤں پٹختے بیڈ سے اپنا دوپٹہ اٹھایا اور ظہیر صاحب کی آواز پر جلدی سے بیگ لیتے باہر کی جانب بڑھی۔

”نور جلدی کرو بیٹا میں پہلے ہی تمہاری وجہ سے کافی لیٹ ہو چکا ہوں“، ہاتھ پہ بندھی گھڑی پر گیارہ بجتے دیکھ کر ظہیر صاحب نے اُس کے کمرے کے سامنے رکتے آواز لگائی۔ ”جی بابا بس آگئی ہوں“، دوپٹہ ٹھیک کرتے وہ اپنا موبائل لینے کے لیے واپس کمرے کی جانب پلٹی جو کل ہی ظہیر صاحب نے اُسے لے کر دیا تھا۔

”ظہیر پلیز شام کو آتے ہوئے گھر کا سامان یاد سے لے آئیے گا“، نائلہ بیگم نے لست اُن کی جانب بڑھاتے یاد دہانی کروائی۔

”ٹھیک ہے بس آپ مجھے ایک بار کال کر کہ یاد کرو اد بیکے گا اور رضا کو کہیے گا شام کو میرے آنے تک تیار رہے میں نے ڈاکٹر کا ٹائم لیا ہے“، انہیں بتاتے ظہیر صاحب نے نور کے آنے پر باہر کا رخ کیا۔

”اما میں آج لیٹ ہو جاؤں گی۔ شام پانچ بجے تک آؤں گی اس لیے پیز آپ پریشان مت ہوئے گا اور واپسی پہ میں رابعہ کہ ساتھ آؤں گی اس لیے ہو سکتا ہے تھوڑی مزید دیر ہو جائے“، انہیں پہلے ہی ہربات کی طرف سے مطمئن کرتے نور نے گاڑی کا ہارن سنتے ان کے گال پر بو سہ دیا اور ایک بار پھر سے فکر مند نہ ہونے کا بولتے باہر نکل گئی جہاں ظہیر صاحب اُس کے ہی انتظار میں تھے۔

---

”ارحم کہاں جا رہے ہو تم؟“، ہاشم صاحب نے اُسے انگلی پر گاڑی کی چابی گھماتے باہر کی جانب جاتا دیکھ کر روکا

”یونیورسٹی جا رہا ہوں“، اُن کی طرف دیکھے بغیر ہی مختصر سا جواب دیتے وہ آگے بڑھا۔ ”ٹھیک ہے میرے گارڈز تمہارے ساتھ جائیں گے۔ اب سے تم جہاں جہاں جاؤ گے یہ تمہارے ساتھ رہیں گے“، اخبار کو تھہ کر کہ ٹیبل پر رکھتے انہوں نے اٹھ کر اُس کے قریب آتے اپنا فیصلہ سنایا۔

---

”پہلی بات کے میں کوئی بچہ نہیں ہوں جو ان گارڈز کی پوری فونج اپنے ساتھ لیے پھر وہ اور دوسری بات کہ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں اس لیے آپ کو میرے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں“، تنخی سے کہتے ارحم نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ضرورت ہو یا نہ ہو پر اب میں تمہاری یہ من مانیاں مزید برداشت نہیں کروں گا۔ اُس دن تم میرے روکنے کے باوجود بھی حیدر شاہ سے بد تیزی کر کہ ایک غلطی کر چکے ہو مگر اب میں تمہیں یوں اکیلا چھوڑ کر دوسری غلطی نہیں کرنے دے سکتا۔ تمہیں ذرا سا بھی احساس ہے کہ حیدر شاہ کے بندے تمہاری تاک لگائے بیٹھے ہیں کہ کب تم گھر سے نکلو اور کب وہ تمہیں اپنی گولی کا نشانہ بناؤ کر حیدر شاہ کی بے عزتی کا بدلہ لیں“، اُسے دبے لفظوں میں آنے والے وقت کے سنگین نتائج سے باخبر کرتے ہاشم صاحب نے ہوشیار رہنے کا کہا۔

”بے فکر ہیں میں اپنا خیال رکھوں گا اور یوں میری پرواکر کے مجھے خوش فہمی میں مبتلا نہ کریں“، طنزیہ مسکراتے ارحم نے ان کی مزید کوئی بات سنے بغیر باہر کا رخ کیا۔

”یہ لڑکا کبھی میری بات نہیں سنتا“، اُس کی باتوں سے زیچ ہوتے ہاشم صاحب نے اپنے لب کاٹے اور کچھ سوچتے ہوئے موبائل اٹھا کر اپنے گارڈز کو کال کرنے لگے تاکہ انہیں ارحم پر نظر رکھنے کا بول سکیں۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی نور کا پہلا سامنا زارون سے ہوا جو پارکنگ میں اپنی گاڑی کھڑی کرتے گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا۔

”زار...“، اُسے خاموشی سے اپنے قریب سے گزر کر آگے بڑھتا دیکھ کر نور نے آواز دی۔

”جی؟“، اپنے ہی دھیان میں چلتے زارون نے سر اٹھا کر دوسرا سری جانب دیکھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“، چہرے پر دھیمی سی مسکراہٹ سجائے نور نے اُس کے قریب آتے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“، اُس کے مسکراتے چہرے کو حیرت سے دیکھتے زارون نے مختصر ساجواب دیا اور سائیڈ سے نکل کر آگے بڑھنا چاہا کیونکہ وہ صبح ہی صبح اُس کے ساتھ بحث کر کہ اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”وہ مجھے سوری کہنا تھا آپ سے...“، اُس کے ساتھ ہی الٹے قدم اٹھاتے نور نے سامنے آتے راستہ روکا۔

”سوری کس بات کے لیے؟“، تیوری چڑھاتے زارون نے وضاحت مانگی۔

”وہ اُس رات میں نے آپ سے بد تمیزی کی اُس کے لیے حالانکہ میں بالکل بھی بد تمیز نہیں ہوں۔“

وہ دراصل کوئی میرافون نہیں اٹھا رہا تھا اور پر سے اُس بد تمیزانسان نے مجھے ڈرایا اور ساتھ میرا

مو بائل بھی توڑا....، اپنی ہی دھن میں بولتے اُسے پتا، ہی نہ چلا کب اُس کے منہ سے مراد شاہ کی حرکت کے بارے میں نکل گیا۔

”کس نے مو بائل توڑا تمہارا؟“، باقی بات کو نظر انداز کرتے زارون نے اُس کی ادھوری چھوڑی جانے والی بات کو پکڑتے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا جواب دانتوں تلے زبان دبائے کھڑی نفی میں سر ہلا گئی۔

”نہیں مجھے نہیں پتا وہ کون تھا بلکہ کوئی تھا، نہیں“، لا عملی سے کندھے اچکاتے اُس نے انجان بنانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے اور مجھے کسی بات کا غصہ نہیں“، اُسے بات کو گول کرتا دیکھ کر زارون نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔ ”تحینک یوز ار آپ بہت اچھے ہیں پر مجھے لگتا ہے اب آپ کو بھی مجھ سے سوری کہنا چاہیے۔“، اُس کی بات پر کھلکھلاتے نور نے اپنے دونوں ہاتھ باندھتے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ”میں کیوں سوری کہوں؟ مطلب میں نے تو کوئی غلطی نہیں کی“، ایک نظر اُس کے شفاف چہرے کو دیکھتے زارون نے جھٹ سے نظریں پھیریں۔

”آپ نے مجھے ڈانٹا تھا وہ بھی اتنی زور سے، پہلے کبھی کسی نے مجھے ایسے نہیں ڈانٹا ایک تو میں پہلے ہی پریشان تھی مجھے ڈر بھی لگ رہا تھا اور پر سے آپ نے مجھے ڈانٹا اور آنکھیں بھی نکالیں“، اُسے اپنی طرف گھورتا دیکھ کر نور نے شکایت کی۔

”ٹھیک ہے سوری میں دوبارہ تمہیں نہیں ڈانٹوں گا اور نہ ہی آنکھیں نکال کر دیکھوں گا“، اُس کی بات پر اپنی مسکراہٹ چھپاتے زارون نے معذرت کی۔

”اُس او کے پر یہ میں آخری بار معاف کر رہی ہوں اگر آپ نے دوبارہ مجھ سے زور سے بات کی تو میں کبھی آپ سے بات نہیں کروں گی“، فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے نور نے ساتھ ہی اُسے وارن کیا جس پر زارون نے بس سر ہلا کر اُس کی بات کی تائید کی۔

”بس اب جائیں، تو بہ صحیح ہی آپ کی شکل دیکھ لی ہے پتا نہیں اب میرا دن کیسا گزرے گا“، اُسے جانے کا راستہ دیتے نور نے خود کلامی کی تو زارون نے رک کر پھر سے اُسے گھورا اور کچھ بھی کہے بغیر سر جھکلتے آگے بڑھ گیا۔

”ہائے اللہ پتا نہیں کیوں میری زبان اس شخص کو دیکھ کر اتنی کڑوی ہو جاتی ہے“، اُس کے پیچھے اپنے گراونڈ کی جانب بڑھتے نور نے اپنی بے اختیاری پر خود کو کوسا۔

-----

”کہاں رہ گئے تھے؟ میں کب سے یہاں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں“، زارون نے ارحم کو دیکھتے ہی اُس کے قریب جاتے استفسار کیا۔

”بس یار آتے ہوئے ہاشم صاحب نے روک لیا اس لیے تھوڑی سی دیر ہو گئی“، اُس کے ساتھ ہی گراونڈ میں داخل ہوتے ارحم نے ایک نظر وہاں چلتے کر کٹ پیچ پہ ڈالی۔

”کیوں؟ خیریت تھی؟“، کوئی خالی کر سی ڈھونڈنے کے لیے نظر دوڑاتے زارون نے سرسری سے اندازہ میں سوال کیا۔

”ہاں خیریت ہی تھی بس انہیں لگتا ہے حیدر شاہ جیسے بزدل انسان نے مجھے مارنے کے لیے اپنے بندوں کو میرے پیچھے لگایا ہوا ہے، اسی لیے اپنے پورے پندرہ منٹ انہوں نے مجھے سمجھانے میں ضائع کر دیے“، دھوپ کی وجہ سے اپنے گلاسز دوبارہ سے آنکھوں پہ لگاتے ارحم نے بد گمانی سے سر جھٹکا۔

”تو اس میں غلط کیا ہے؟ انکل بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں جو کچھ تم نے اُس دن مجھے بتایا، مجھے بھی ڈر ہے کہ کہیں وہ لوگ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں، اس لیے پلیز تھوڑا خیال رکھو“، اُس کی بات کو سنجیدگی سے سنتے زارون نے تاکید کی۔

”بس کرو یار میں کوئی لڑکی نہیں ہوں جو خیال رکھوں یا ڈرؤں اور وہ بھی اُس حیدر شاہ جیسے بزدل انسان سے جسے صرف اپنے سے کم تراور کمزور انسان کو ڈرانا آتا ہے“، اُس کی بات کا کوئی بھی اثر لیے بغیر ارحم نے کچھ ہی دور پیٹھی رابعہ اور نور پر نظر پڑتے ہی اُن کی جانب قدم بڑھائے۔

”اب کہاں جا رہے ہو؟“ اُس کے ڈھیٹ پن کو دیکھتے زارون نے بھی مزید کوئی نصیحت کرنے سے گریز کرتے آواز لگائی۔ ”نور اور رابعہ کے پاس جا رہا ہوں تاکہ اُن کے ساتھ انجوائے کر سکوں“، پلٹ کر دیکھتے ارحم نے مختصر جواب دیا۔

”تو میں کس کے ساتھ انجوائے کروں گا؟“، دونوں ہاتھ کمرپہ رکھتے اُس نے بھنویں اچکائیں تو ارحم کے آگے بڑھتے قدموں کو بریک لگی۔

”ایک شرط پہ میں تمہارے ساتھ رہوں گا“، واپس اُس کے قریب آتے ارحم نے مطالبه کیا۔ ”کیا؟“

”یہی کہ تم یہ دادی اماں کی طرح مجھے سمجھاؤ گے نہیں اور جو جو میں کھانے کو بولوں گا وہ مجھے لا کر دو گے“، اپنی ڈیمانڈ بتاتے ارحم نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے لا دوں گا اور اب چلو سارا میچ تمہاری فضول بکواس میں گزر گیا ہے“، ایک کھلاڑی کو آٹھ ہوتے دیکھ کر زارون نے اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ گھسیٹا۔

”توبہ میرا تو چیخ چیخ کر منہ درد کرنے لگ گیا ہے“، نور نے کہتے ہوئے اپنے جبڑوں کو دبایا۔

”ہاں میری توبس ہو گئی ہے۔ دفع کرو ان کھیلوں کو چلو کچھ کھاتے ہیں“، اُس کی بات کی تائید کرتے رابعہ نے اپنا بیگ اٹھایا۔

”گول گپے کھاتے ہیں“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے جلدی سے للچاتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے گول گپے ہی کھالیں گے ابھی تم یہاں سے اٹھو تو سہی“، اُسے کرسی پہ جماد کیھ کر رابعہ نے جھنجھلاتے ہوئے پچھے دیکھا جہاں سب لوگ اپنی کرسیوں پہ کھڑے گراونڈ میں چلتے مجھ کو دیکھ رہے تھے۔

”ہائے اللہ میں پھنس گئی ہوں“، اُس کے ساتھ ہی کچھ دور جاتے نور نے رش میں پھنسنے دوہائی دی۔

”تو کس نے کھا تھا یہاں سے گزرو“، رابعہ جو اُسے دوسری طرف سے آنے کا کہہ رہی تھی اُس نے ہاتھ پکڑ کر اُسے وہاں سے نکالا۔

”توبہ میرا تو سانس ہی بند ہو گیا تھا“، رش سے نکلتے ہی نور نے تیز تیز سانس لیتے خود کو پر سکون کیا اور رابعہ کا ہاتھ پکڑ کے ہی گراہنڈ سے باہر نکلی جہاں کھانے پینے کی چیزوں کے مختلف اسٹال لے تھے۔

”کیا کھاؤ گی؟“، ایک بر گروالے کے اسٹال پر رکتے رابعہ نے اُس سے پوچھا جس کا دھیان اپنے سے کچھ فاصلہ پر کھڑے ایک کپل کی جانب تھا جو بڑے پیار سے ایک دوسرے کو گول گپھ کھلانے میں مصروف تھے۔

”نور کیا ہوا؟ کہاں گم ہو گئیں؟“، اُسے منہ کھولے کسی اور جانب متوجہ دیکھ کر رابعہ نے کندھ سے پکڑ کر ہلا کیا۔

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ کیا کہہ رہی تھیں تم“، اُن سے نظریں ہٹاتے اُس نے جلدی سے پوچھا۔

”کہہ نہیں رہی بلکہ پوچھ رہی ہوں کہ کیا کھانا ہے؟“، اُسے پھر سے ناگواری سے دوسری جانب دیکھتا پا کر رابعہ نے بولنے کے ساتھ ہی پیچھے پلٹ کر دیکھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“، نظروں کے سامنے چکلی بجاتے رابعہ نے آنکھوں میں شرارت لیے سوال کیا۔

”کچھ نہیں وہ بس میں سوچ رہی تھی کہ رضا نے تو کبھی مجھے اتنے پیار سے گول گپے نہیں کھلانے بلکہ اُس نے تو کبھی کھلانے ہی نہیں ہمیشہ مجھے ہی اپنے پیسوں سے کھلانے پڑتے“، افسر دگی سے کہتے نور نے اک آہ بھری تواریخ نے اُس کی معصومیت پہ قہقہہ لگایا۔

”کیا ہوا؟ تم ہنس کیوں رہی ہو؟“ اپنی اتنی سنبھیدہ بات پہ اُسے ہستاد یکھ کر نور کو کچھ شرمندگی محسوس ہوئی۔ ”کچھ نہیں“، اپنی ہنسی کنٹول کرتے تواریخ نے نفی میں سر ہلا یا پر ایک سینئڈ بعد ہی پھر سے ہنسنے لگی۔

”کیا ہوا ہے؟ حد ہے میں نے کون سالطیفہ سُنادیا ہے جو تم ایسے ہنس رہی ہو“، اُس کی حرکت پر منہ پھلاتے نور نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے اپنا اسکارف ٹھیک کرتے شکوہ کیا۔

”اچھا اچھا سوری یار تم نے بات ہی ایسی کی کہ مجھے ہنسی اگئی اور میری جان اس طرح کا پیار بھائی نہیں کرتے“، اُس کا مود خراب ہوتا دیکھ کر تواریخ نے سیر کیس ہوتے اُس کا بازو تھاما اور بر گر والے کو دو بر گر بنانے کا کہتے وہاں لگی کر سیوں کی جانب بڑھ گئی۔

”مطلوب؟“ نارا ضلگی سے اپنا بازو چھڑواتے نور نے نام سمجھی سے اُسے دیکھا۔

”مطلوب یہ کہ وہ دونوں بھائی نہیں تھے“، کرسی پیچھے کر کہ بیٹھتے تواریخ نے معنی خیزی سے بتایا۔

”تو کیا تھے؟“

”اُفف میری اماں چپ کر جاؤ پتا نہیں کون سی دنیا سے اٹھ کر آئی ہوتی،“ اُس کے سوال پر اپنا سر پکڑتے رابعہ نے اُس کی عقل پر افسوس کیا۔

”اچھا سمجھ گئی، ہر بینڈ والف ہوں گے ضرور،“ اُس کے جھنجھلانے پر نور نے پر سوچ انداز میں کہا۔  
 ”ہاں ایسا ہی ہے بس پلیز تم اپنے نازک دماغ پر زیادہ زور مت دو اور کھانا شروع کرو،“ بر گر کی جانب اشارہ کرتے جو ابھی وہ آدمی ٹیبل پر رکھ کر گیا تھا رابعہ نے اپنی جان چھڑ دائی تو نور نے خاموشی کے ساتھ بر گر اٹھایا اور کھانے لگی۔

”رضا کیا گند پھیلا یا ہوا ہے تم نے اپنے کمرے میں،“ نائلہ بیگم نے گھر کی صفائی سے فارغ ہو کے اُس کے کمرے میں آتے ہی وہاں کا حشر دیکھ کر اپنا سر پکڑا۔

”وہ ماں میں اپنے کپڑے نکال رہا تھا تو یہ سارے بھی گر گئے،“ پریشانی سے زمین بوس ہوئے کپڑوں کی جانب اشارہ کرتے اُس نے اپنے بے گناہ ہونے کی دلیل پیش کی۔

”کتنی بار کہا ہے کہ کپڑوں کو سلیقے سے رکھا کرو پر تمہیں کون سا اثر ہوتا ہے،“ اُسے سائیڈ پپ کرتے نائلہ بیگم نے تمام کپڑے اٹھا کر بیڈ پپ رکھتے اُس کی کلاس لیتے اپنی بات جاری رکھی۔

”اب میرے پاس ٹائم بھی نہیں ہے انہیں تھہ کرنے کا“، اپنی کمرپہ ایک ہاتھ رکھتے انہوں نے کلاک کی جانب دیکھتے خود کلامی کی۔

”کیوں کیا ہوا؟ کہیں جانا ہے آپ نے؟“ ان کی بات سنتے رضا نے سامنے پڑی اپنی وائٹ شرٹ کو دیکھ کر نکالا جسے وہ کب سے ڈھونڈتے کپڑوں کا یہ حال کر چکا تھا۔

”نہیں، تمہاری خالہ کی فیملی آرہی ہے ان کے لیے کھانا بنانا ہے۔ وہ رات یہی رکیں گے“، کپڑوں کو واپس اُسی طرح الماری میں رکھتے نائلہ بیگم نے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا جو خالہ کا نام سنتے ہی سن ہو چکا تھا۔

”کون سی خالہ؟ مطلب خالہ نبیلہ یا خالہ عائشہ؟“

”نبیلہ آرہی ہے۔ عائشہ بچاری نے کہاں سے اتنی جلدی فیصل آباد سے یہاں آ جانا“، الماری بند کرتے انہوں نے اُس کے کمرے سے دوسری بکھری چیزوں کو سیمٹا۔

”اچھا پر آکیوں رہی ہیں؟ پہلے تو انہیں کبھی ہماری یاد نہیں آئی؟“ رضا نے اپنی پنڈتی والی خالہ کے آنے کا سنتے ہی منہ بسورا۔

”تمہارا پوچھنے آرہی ہیں اُس دن عدیل نے جا کر انہیں بتایا تھا مگر ان کی اپنی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں اس لیے آیا نہیں سکیں“، اُسے تفصیل بتاتے نائلہ بیگم نے اُس کی شرط تبدیل کرنے میں مدد کی۔

”مطلوب میری چوت خوش قسمت ثابت ہوئی جس کا سنتہ ہی آپ کی امیر کبیر بہن خود تشریف لا رہی ہیں“، طنزیہ مسکراتے رضانے نائلہ بیگم کی جانب سوالیہ نظر وں سے دیکھا۔

”ایسے نہیں کہتے، اُن کی طبیعت خراب رہتی ہے اسی لیے وہ زیادہ کہیں آتی جاتی نہیں ورنہ تو وہ ہمارا بہت خیال کرتیں ہیں۔ اُس دن دیکھا تھا ناکیسے فوراً سے عدیل کو بھیج دیا تھا“، نائلہ بیگم نے اُس کی بد گمانی کو دور کرنے کے لیے یاد دہانی کروائی۔

”جی یاد ہے...“، اُن کا دل رکھنے کے لیے رضانے نبیلہ بیگم کے بارے میں مزید کوئی تلخ بات کرنے سے خود کو روکا اور نائلہ بیگم کے ساتھ ہی باہر آگیا تاکہ انہیں ضرورت کی چیزیں لا کر دے سکے۔

-----

”تم لوگ یہاں بیٹھ کر دوسروں کی چغلیاں کر رہی ہو اور ہم وہاں پورے گراونڈ میں تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو گئے ہیں“، ارحم نے ان دونوں کے قریب آتے اپنی جانب متوجہ کیا جو کھانے پینے کے بعد اندر جانے کی بجائے وہیں بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں تھیں۔

”ہم کسی کی چغلیاں نہیں کر رہیں اور تم ہمیں کیوں ڈھونڈ رہے تھے؟“، بھنویں اچکاتے رابعہ نے اُسے دیکھا۔

”ویسے ہی میں زارون کی جلی کٹی باتیں سُن کر تھک گیا تھا اس لیے سوچا کہ چلو تم لوگوں کی کچھ کھٹی میٹھی باتیں سُن کر اپنے دل کو پر سکون کر لوں“، ان کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھتے ارحم نے مسکین سی صورت بنائی۔

”تمہارے ساتھ رہ کر کوئی بھی انسان میٹھی باتیں نہیں کر سکتا اس لیے زارون کو الزام مت دو“، رابعہ نے صح سے اُس کے انگور کرنے پر کڑھتے ہوئے کہا۔

”ہونہے بس کروا ایک تم ہی ہو جسے میری شکل پسند نہیں باقی تو دنیا کی سب لڑکیاں میری ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستی ہیں۔ کیوں نور ایسا ہی ہے نا؟“، ارحم نے اپنے ساتھ اُسے بھی گھسیٹا جو موبائل میں سردیے بیٹھی تھی۔ ”جی، جی ایسا ہی ہے“، بات سننے بغیر ہی اُس نے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”تم میری طرف ہو یا اس کی طرف؟“ اُس کے جواب پر رابعہ نے فٹ سے آنکھیں نکالیں۔

”کچھ غلط کہہ دیا میں نے؟“ پلکیں جھپکاتے اُس نے پریشانی سے استفسار کیا۔

”نہیں بہت اچھا کہا ہے اور رہوا پنے اس بھائی کے ساتھ ہی اب“، غصے سے اُن دونوں کے پیچ میں سے اُڑھتے رابعہ نے قدم واپس گراونڈ کی جانب بڑھائے۔

”اسے کیا ہوا؟“ اُس کے رویے پر فکر مندی سے مڑ کر اُس کی پشت کو دیکھتے نور کے ساتھ ساتھ ارحم نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔

”لگتا ہے ناراض ہو گئی ہے“، نور کی جانب دیکھتے ارحم نے تصدیق چاہی۔

”پتا نہیں ابھی تو بالکل ٹھیک تھی“، لاعلمی سے کندھے اچکاتے نور نے بھی اپنا بیگ اٹھایا۔

”اب تم کہاں جا رہی ہو؟“ اُسے بھی اٹھتا دیکھ کر ارحم نے سوال کیا۔

”رابعہ کے پاس۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اُسے“، اپنا موبائل بیگ میں رکھتے اُس نے ارحم کو جواب دیا اور دوسرا جانب چل پڑی۔

”أفف ایک تو یہ لڑکیاں میری سمجھ سے باہر ہیں“، اُن دونوں کے جاتے ارحم نے خالی پیچ کو گھورتے خود کلامی کی اور گھر جانے کا ارادا کرتے زارون کو میسج ٹائپ کر کہ بتانے لگا جو باقی کلاس فیلوز کے ساتھ بیٹھا بھی تک گراونڈ میں چلتا پانچواں کرکٹ پیچ دیکھ رہا تھا۔

”بابا سائیں یہ آج آپ کو اچانک کوئٹہ جانے کا خیال کہاں سے آگیا؟ سب خیریت ہے نا؟“ گاڑی ڈرائیور کرتے مراد شاہ نے کب سے اپنے دماغ میں چلتے سوال کو زبان پر لاتے پوچھا۔ ”ہم خیریت ہے بس ایک ضروری کام ہے اسی سلسلہ میں جا رہے ہیں،“ اپنے موبائل سے نظر ہٹاتے حیدر شاہ نے اُسے بند کرتے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھا۔

”کوئی کام بابا نہیں،“ نظریں سڑک پہ جمائے مراد شاہ کی زبان پر پھر سے کھلکھلی ہوئی۔ ”کام کی نوعیت کا تو تمہیں اندازہ ہے ہی مگر اس بار پولیس کی ناکابندی کی وجہ سے کافی مشکلات ہو رہی ہیں اور ہمارے دو ذمہ دار بندوں کو بھی پولیس نے شک کی بنیاد پر اپنی ہر است میں لے لیا ہے جس کی وجہ سے مجھے خود جانا پڑ رہا ہے تاکہ آج رات بیرون ملک ہونے والی لڑکیوں کی اسمگنگ میں کوئی مسئلہ درپیش نہ آئے،“ حیدر شاہ نے تفصیل کے ساتھ اُسے ساتھ لانے کی وجہ بتائی جو مراد شاہ چاہ کر بھی پوچھ نہیں پایا تھا۔

”ٹھیک سمجھ گیا بس آپ پر یشان نہ ہوں سب اچھے سے ہو جائے گا،“ اُن کی بات سنتے مراد شاہ نے تسلی دی اور اپنی پوری توجہ ڈرائیور نگ کی طرف مرکوز کر لی۔

-----

زارون کو بتانے کے بعد وہ یونیورسٹی سے نکلا اور ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اُس کے موبائل پر حدیہ کی کال آنے لگی۔

”یہ سالی صاحبہ کو آج میری یاد کیسے آگئی؟“، اُس کا نام دیکھتے ہی مسکراتے ہوئے ارحم نے کال ریسیو کی۔

”ز ہے نصیب، ہونے والی سالی صاحبہ آج آپ کو میری یاد کیسے آگئی؟“، چھکتے ہوئے ارحم نے اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی چھیڑا۔

”ارحم بھائی پلیز میری رابعہ آپی سے بات کروادیں“، دوسری طرف حدیہ کی روتوی ہوئی آواز اُبھری۔

”کیا ہوا؟ تم روکیوں رہی ہو؟“، فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ارحم نے گاڑی کو بریک لگائی۔

”وہ امی کی طبیعت اچانک سے خراب ہو گئی ہے میں اور ابو انہیں ہسپتال لے کر آئے ہیں۔ میں نے کئی بار رابعہ آپی کو کال کی پراؤں کا نمبر بند ہے پلیز آپ انہیں بتا دیں۔ ڈائیور بھی کب کا انہیں لینے گیا ہوا ہے“، ہچکیوں کے درمیان اپنی بات مکمل کرتے حدیہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ”اچھا تم

پریشان نہ ہو میں خود رابعہ کو لے کر آتا ہوں، اُسے تسلی دیتے ارحم نے گاڑی یونیورسٹی کی جانب ریورس کی۔

”بس پلیز جلدی آجائیں“، اُسے ہسپتال کا نام بتاتے حدیہ نے تاکید کی اور ظفر صاحب کی آواز پر ان کی جانب بڑھ گئی۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی نور اور رابعہ اُسے گیٹ پر ہی مل گئیں تھیں۔

”تمہارا موبائل کیوں بند ہے؟“، گاڑی سے اُتر کر ان کے قریب آتے ارحم نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ سوال کیا۔

”تمہیں کیا مسئلہ ہے میرا موبائل بند ہو یا نہیں“، اپنے ہی غصے میں رابعہ نے جواب دیا اور آگے بڑھ گئی۔

”میرے ساتھ چلو“، اس کا ہاتھ تھامتے ارحم نے کوئی بھی مزید بات سنے اور کہے بغیر اس نے قدم گاڑی کی جانب بڑھایا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ چھوڑو مجھے“، اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے کھینچتے رابعہ نے نور کے سامنے ایسی حرکت پر ارحم کو گھور کر دیکھا۔

”پلیز یار ضد نہ کرو آنٹی کی طبیعت کچھ خراب ہے تو حدیہ کی کال آئی تھی...“

”کیا ہوا می کو؟ کہاں ہیں وہ؟“ اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی رابعہ نے تیج میں ٹوکا۔

”کچھ نہیں بس تم چلو“، اُس کا ہاتھ تھامتے وہ پھر سے آگے بڑھا۔

”پر نور؟ نور نے میرے ساتھ جانا تھا“، رابعہ نے اُسے دیکھتے ہی ارحم کو بتایا۔

”اچھا تم بیٹھو میں تمہارے ڈرائیور کو چھوڑنے کا کہہ دیتا ہوں“، گاڑی کا دروازہ کھولتے ارحم نے متلاشی نظروں سے رابعہ کی گاڑی کو دیکھا جو کچھ فاصلہ پہ کھڑی تھی۔

”نور آؤ میرے ساتھ“، اُس کی جانب بڑھتے ارحم نے اُسے کہا جوا بھی رابعہ کی امی کا سنتے ہی پریشان ہو گئی تھی۔

”یہ تمہیں گھر چھوڑ دے گا“، ڈرائیور کو راستہ سمجھاتے ارحم نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا۔

”نہیں میں اکیلی نہیں جاؤں گی اور آپ رابعہ کو لے کر جائیں میں بابا کو کال کر دیتی ہوں وہ مجھے لینے آجائیں گے“، نور نے ڈرائیور کو دیکھتے ہی منع کیا۔

”نور پلیز چلی جاؤ کچھ نہیں ہوتا“، ارحم نے اُس کے انکار کی وجہ سمجھتے نرمی سے سمجھایا۔

”نہیں، ماماڑا نٹے گی اگر انہیں پتا چلا کہ میں اکیلی آئی ہوں“، پھر سے انکار کرتے اُس نے دروازہ بند کرتے اپنا موبائل نکالا تو ارحم جو پہلے ہی پریشان تھا اُس نے پلٹ کر رابعہ کو دیکھا جو اپنا موبائل آن کیے کسی سے بات کرتے رہ رہی تھی۔

”اچھا پھر تم اندر چلی جاؤ اور گھر میں کسی کو کال کر کہ بلا لو۔ میں زارون کو کال کر دیتا ہوں وہ جب تک تمہارے پاس رک جائے گا“، ارحم نے فوراً سے مسئلے کا حل نکالا تو نور نے کچھ سوچتے ہوئے ڈھلتی ہوئی شام کو دیکھا۔

”نہیں میں چلی جاؤں گی آپ پلیز زار سے کہہ دیں وہ میرے ساتھ چلیں“، اندھیرے سے خوف کھاتے نور نے حامی بھری تو ارحم نے اُس کی بات سنتے مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے زارون کو کال ملائی۔

”ہاں یار کہاں ہو؟“ سید ہمی مطلب کی بات پر آتے ارحم نے پوچھا۔  
 ”گھر جا رہا ہوں“، اپنی گاڑی اسٹارٹ کرتے زارون نے جواب دیا۔  
 ”گیٹ کے پاس آؤ فوراً“، اُسے حکم دیتے ارحم نے کال کاٹی تو زارون نے پریشانی سے گاڑی وہیں چھوڑی اور گیٹ کی جانب آیا۔

”کیا ہوا تم ٹھیک ہونا؟“، اُسے دیکھتے ہی زارون کی جان میں جان آئی تب ہی اُس کے قریب آتے اُس نے پوچھا۔

”ہاں رابعہ کی امی کی طبیعت خراب ہے میں اُسے لے کر جا رہا ہوں تم پلیز نور کو گھر چھوڑ دو“، جلدی سے اپنا مسئلہ بتاتے ارحمنے اپنی گاڑی کی جانب جاتے اُسے اسٹارٹ کرتے سڑک پر ڈالا۔

”چلو...“، اُس کے جاتے ہی زارون نے نور سے کہا۔

”کہاں؟“

”گھر نہیں جانا؟“، اُس کے بے تکے سوال پر زارون نے پوچھا۔ ”جانا ہے پر آپ کے ساتھ نہیں ڈرائیور کے ساتھ“، رابعہ کی گاڑی کی جانب اشارہ کرتے نور نے اُس کے سر پر ایک اور بم پھوڑا۔ ”مطلوب؟ اگر اس کے ساتھ جانا تھا تو مجھے کیوں بلا�ا؟“

”اس لیے تاکہ آپ ساتھ جائیں کیونکہ مجھے اکیلے ڈرائیور کے ساتھ جاتے ڈرگلتا ہے“، دروازہ کھولتے نور نے وجہ بتائی۔ ”تو میرے پاس گاڑی ہے میں چھوڑ دیتا ہوں“، اُس کی بات سنتے زارون نے پیش کی۔

”نہیں، میں آپ کے ساتھ اکیلے نہیں جاؤں گی“، جلدی سے جواب دیتے نور نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”کیوں اب اس میں کیا ہے؟“، زارون کو اُس کی فلسفیانہ باتوں کی سمجھ نہیں آئی تو پوچھا۔

”کیونکہ مجھے آپ سے بھی ڈر لگتا ہے اب پلیزا گر آپ کے سوال وجواب ختم ہو گئے ہوں تو چلیں؟“، سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھتے نور نے پوچھا تو زارون نے ایک گھری سانس لی اور آگے والا دروازہ کھولتے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا جو کب سے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔

---

”آج یہ لڑکی ہمارے ہاتھ سے نہیں بچے گی بہت خوار کیا ہے اس نے“، اکرام نے اپنے بندے سے بات کرتے ہی دانت پیستے اپنے ساتھی سے کہا جو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے بیٹھا تھا۔ ”ہاں بس سائیں کو خبر کر دینی تھی کہ اُن کی امانت اگلے ایک گھنٹے میں اُن تک پہنچ جائے گی“، اُس کی بات سننے ہی شیرے نے مشورہ دیا۔

”نہیں ابھی نہیں، ابھی ذرا اُس بلبل کو ہاتھ آ لینے دو پھر سائیں کو بتادیں گے“، اکرام نے کسی خدشے کے تحت پر سوچ انداز میں اُس کی بات کی تردید کی۔

”ٹھیک ہے بس تم سہیل سے رابطے میں رہوتا کہ گاڑی کا پتا چلتا رہے“، اُس کی بات صحیح تھی شیرے نے اثبات میں سر ہلا کیا اور گاڑی کو ایک سائیڈ پلے گاتے سکریٹ سلگائی۔

---

”کیا ہوا امی کو؟“، ہسپتال پہنچتے ہی رابعہ نے حدیہ کے بتائے ہوئے کمرے کی جانب بڑھتے اُسے سامنے ہی کھڑا پا کر سوال کیا۔

”شوگراور بی پی ایک دم سے ہائی ہو گیا تھا پر اب ٹھیک ہیں آپ پریشان نہ ہوں“، اُس کے ساتھ ساتھ ارحام کو بھی اپنے قریب آتا دیکھ کر حدیہ نے تسلی دی۔

”صحح تو بالکل ٹھیک تھیں پھر ایک دم سے کیا ہوا؟ ابو کہاں ہیں؟“، اُس کی بات سنتے ہی رابعہ نے اپنے آنسو صاف کیے۔

”ابو میڈیسین لینے گئے ہیں۔ پلیز آپ پریشان نہ ہوں امی اب ٹھیک ہیں“، اُسے فکر مند دیکھ کر حدیہ نے مطمئن کرنے کی کوشش کی اور ارحام کی جانب متوجہ ہوئی جو اُس سے ریجحانہ بیگم کو کمرے میں شفت کرنے کا پوچھ رہا تھا۔

”جی بس ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ کچھ دیر میں شفت کر دیں گے“، اُسے جواب دیتے حدیہ نے اپنے آنسو صاف کیے جو رابعہ کو رو تاد دیکھ کر خود بخود نکل آئے تھے۔

”اچھا بس تم دونوں پریشان نہ ہوا اور رابعہ یار تم تور و نابند کرو دیکھو حدیہ تمہیں دیکھ کر پریشان ہو رہی ہے“، ارحم نے اُسے چپ کرواتے حدیہ کے سر پہ ہاتھ رکھا تو وہ ارحم کے ساتھ لگے ہچکیوں میں رونے لگی۔

”حدیہ میری گڑیا پلیز خود کو سنبھالو آنٹی ٹھیک ہو جائیں گی اور تم لوگ ایسا کرو گی تو انکل مزید پریشان ہوں گے“، اُس کو دلا سہ دیتے ارحم نے خود سے الگ کیا۔

”مجھے پتا ہوتا میں صحیح یونیورسٹی جاتی ہی نہیں، پتا نہیں میں نے کیوں اتنی لاپرواہی کی“، اپنا موبائل بند کرنے پر خود کو کوستہ رابعہ نے اٹھ کر حدیہ کو اپنے ساتھ لگایا۔ ”اچھا بس جو ہوتا اچھے کے لیے ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ آنٹی کو جو اتنی سی تکلیف آئی اُس کی وجہ سے اللہ پاک نے انہیں کسی بڑی مصیبت سے بچایا ہو۔ اس لیے اب خود کو الزام دینے یارو نے کی بجائے اُن کے لیے دعا کرو کہ اللہ پاک اُن کو صحت دے“، اُس کی مایوسی پر نرمی سے سمجھاتے ارحم نے اپنے قدم ظفر صاحب کی جانب بڑھائے جو ہاتھ میں میڈیسین لیے اُدھر ہی آرہے تھے۔

”یہ نور کہاں ہے؟ جب سے میں آئی ہوں نظر نہیں آئی“، نبیلہ بیگم نے چائے وغیرہ پینے کے بعد کلاک کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ یونیورسٹی گئی ہے اُس کا آج سپورٹس ڈے تھا سی لیے لیٹ ہو گئی ہے“، بتانے کے ساتھ انہوں نے اُس کے اب تک نہ آنے کی وضاحت پیش کی۔

”لیٹ؟ چھ نج چکے ہیں۔ میرے خیال سے لڑکیوں کا اتنی دیر باہر رہنا مناسب نہیں“، ایک نظر صحن میں چھائے ہوئے اندھیرے کو دیکھتے نبیلہ بیگم نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔

”جی بس پہلے تو کبھی لیٹ نہیں ہوئی۔ پتا نہیں آج کیوں اتنا وقت کر دیا“، اُن کی بات پر خود بھی پریشان ہوتے ناکلہ بیگم نے جواب دیا اور رضا کو آواز لگائی جو عدیل کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔

”رضاز رافون کر کہ نور سے پوچھو کب تک آئے گی“، اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے ناکلہ بیگم نے کہا۔

”جی ماما، ابھی دس منٹ پہلے ہی میری بات ہوئی تھی آپی آرہی ہیں آپ پریشان نہ ہوں“، اُنہیں مطمئن کرتے وہ واپس عدیل کی جانب متوجہ ہوا۔

”تحوڑا دھیان رکھا کرو لڑکی ذات ہے یوں راتوں کو گھر آنا کوئی اچھا چال چلن نہیں ہے“، رضا کی بات سنتے ہی نبیلہ بیگم نے اپنے ہاتھ میں پہنے سونے کے گنگن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ناگواری سے مشورہ دیا۔

”باجی کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ میری نور ایسی نہیں ہے اور وہ تو کبھی بھی کہیں نہیں جاتی آپ کو پتا ہی ہے ظہیر کا، اس معااملے میں کتنے سخت ہیں وہ پر اب ہم بچوں کو قید کر کہ بھی نہیں رکھ سکتے پڑھائی کے ساتھ ساتھ دوسرا سرگرمیوں میں حصہ لینا بھی ضروری ہے“، ان کی بات کا برا مناتے نائلہ بیگم نے کپ اٹھا کر ٹرے میں رکھے۔

”ہاں بس دھیان رکھنا دوسرا سرگرمیوں میں حصہ لیتے لیتے کہیں اور ہی نہ نکل جائے ویسے بھی آج کل کی لڑکیاں توبہ توبہ پڑھائی کے نام پر ماں باپ کی آنکھوں میں دھول جھوٹکتے معلوم نہیں کیا کچھ کرتی پھیرتی ہیں“، نبیلہ بیگم نے عدیل کے رشتے پر انکار کرنے والی بات کا غصہ نکالتے نائلہ بیگم پر مزید طنز کیا جو ان کی ایسی باتوں کی وجہ اچھے سے جانتی اور سمجھتی تھیں تب ہی خاموشی سے ٹرے اٹھاتے کچن کی جانب چلی گئیں۔

-----  
”کتنا مامِ لگے گا؟“ گاڑی کو پچھلے دس منٹ سے ایک ہی جگہ پر کے دیکھ کر نور نے زارون کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

”پتا نہیں، مجھے کون سا تمہارے گھر کے ایڈر لیس کا الہام ہوا جو بتاسکوں کہ کتنا تامن لگے گا“، سڑک پر گرے ہوئے درخت کو دیکھتے زارون نے آکتائے ہوئے لبھے میں جواب دیا اور خود بھی گاڑی سے نکلتے ڈرائیور کی مدد کرنے لگا جو پہلے سے ہی دوآدمیوں کی مدد سے اُسے ہٹانے کی کوشش میں لگا تھا۔

”یہ تو بہت بھاری ہے اتنی آسانی سے سائیڈ پر نہیں ہو گا“، کچھ دیر کوشش کرنے کے بعد ان میں سے ایک آدمی نے ہمارانتہ ہوئے باقی سب کو مزید کوشش کرنے سے روکا۔ ”صاحب ہم دوسرے راستے سے چلیں؟“ ڈرائیور نے اُس آدمی کی بات سنتے ہی زارون سے پوچھا۔

”نہیں دوسرے راستے سے اس وقت جاناٹھیک نہیں، تم روکو زرا...“، کچھ سوچتے ہوئے زارون نے موسم کے تیور خراب دیکھ کر اپنا رخ گاڑی کی جانب کیا جہاں نور بے چینی سے بیٹھی اُنہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

”کیا ہوا؟“ اُس کے قریب آتے ہی نور نے فٹ سے پوچھا۔

”کچھ نہیں، درخت بہت بھاری ہے نہیں ہو رہا سائیڈ پر اور موسم بھی خراب ہو رہا ہے۔ گھر کہاں پہ ہے تمہارا؟ مطلب کوئی ایڈر لیس وغیرہ معلوم ہے؟“ گاڑی کے شیشے کے پاس جھکتے زارون نے

ڈارائیور سے پوچھنے کی بجائے اُس سے سوال کیا تو نور نے اثبات میں سر ہلاتے انکاٹ کر اُسے اپنے گھر کی لوکیشن سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہم مطلب ڈرائیور ٹھیک کہہ رہا تھا، اُس کا لونی میں جانے کے لیے تو یہ دو ہی راستے ہیں“، اُس کی بات سننے زارون نے خود کلامی کرتے ڈرائیور کو آواز لگائی اور نور کو گاڑی سے اُترنے کا کہا۔

”آپ گاڑی لے جائیں میں خود ہی چھوڑ دوں گا“، دوسرے راستے سے جانا کسی خطرے سے خالی نہیں تھاتب ہی زارون نے فیصلہ کرتے اُس سے کہا۔

”نہیں میں آپ کے ساتھ اکیلے کہیں نہیں جاؤں گی“، اُس کی بات سننے ہی نور نے جھٹ سے جواب دیا اور واپس گاڑی میں جا بیٹھی۔

”نور پلیز ضد نہ کرو دوسرے راستہ خطرناک ہے ہم اس وقت وہاں سے نہیں جاسکتے اور یہ درخت یہاں سے صحیح تک نہیں ہٹے گا اس لیے ہم اسے پیدل ہی پار کرتے آگے جا کر کوئی گاڑی وغیرہ دیکھ لیں گے“، زارون نے اُس کے انکار پر سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں، مجھے آپ کے ساتھ اکیلے کہیں نہیں جانا“، نفی میں سر ہلاتے اُس نے اپنے موبائل کو دیکھا جو بیٹری لو ہونے کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔

”ٹھیک ہے، چلیں آپ دوسرے راستے سے ہی...“ اُس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈالتے زارون نے غصے سے ڈار ٹیور کو کہا جو سر ہلاتے گاڑی اسٹارٹ کرتے پیچھے کی جانب روئورس کرنے لگا۔ ”سامنے آپ کا کام ہو گیا ہے“، اُن کی گاڑی کو دوسری سمت جاتا دیکھ کر سہیل نے موبائل سے نمبر ڈائل کرتے دوسری جانب اطلاع دی۔

”شabaش..! بس تم گاڑی کا پیچھا کرتے رہوتا کہ یہ کام آج ہی پورا ہو سکے“، دوسری طرف چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ لیے اکرام نے اُسے ہدایت دی تو سہیل نے ”جی اچھا“ کہتے موبائل بند کرتے جیب میں رکھا اور اپنی بائیک سیدھی کرتے اپنے ساتھی کو آواز لگائی جو ابھی بھی درخت کو دھکا دے رہا تھا۔

”امی، زارون کہاں ہے؟ ابھی تک آیا نہیں کیا واپس؟“، معاز نے کچن میں جھانکتے عابدہ بیگم سے پوچھا جو نسرین کے ساتھ مل کر رات کے کھانے کی تیاری میں لگی تھیں۔

”نہیں، ابھی تو نہیں آیا، کہہ رہا تھا چھ سات بجے تک آؤں گا“، عابدہ بیگم نے زارون کی بتائی ہوئی بات دوہرائی۔

”اچھا ٹھیک ہے اور ابوآگئے ہیں؟“ ان کا جواب سننے اُس نے ایک اور سوال کیا۔

”ہاں، کمرے میں ہیں“، نسرین کو چاولوں کو دم دینے کا کہتے انہوں نے معاذ کی بات کا جواب دیا جو سر ہلاتے احمد صاحب کو دیکھنے اُن کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”آجاو...“، دروازے پر دستک کی آواز سننے احمد صاحب نے ٹی وی کی آواز آہستہ کی۔

”معاذ آؤ بیٹا“، اُسے دیکھتے ہی احمد صاحب نے خوشی سے اشارہ کیا۔

”کیسے ہو؟ اور کیسار ہا آج کادن؟“، اپنے پاس بٹھاتے ہی احمد صاحب نے سوال وجواب کا سلسلہ شروع کیا۔

”جی ٹھیک ہوں اور دن بھی اچھا رہا۔ یا سر آگیا تھا بس اُس کے ساتھ گھر چلا گیا۔ کب سے اُس کی امی ملنے کا کہہ رہی تھیں؟“، اُن کی بات کا جواب دیتے معاذ نے پوری تفصیل بتائی۔

”اچھا کیا اور زارون نہیں آیا کیا بھی تک؟“، اپنی عینک اُتار کر سانیدھ پر رکھتے انہوں نے اُس کی غیر موجودگی پر استفسار کیا۔

”نہیں ابھی نہیں آیا، امی بتارہی تھیں کہ لیٹ آئے گا اور ابو مجھے آپ سے بات کرنی تھی“، اُن کو جواب دیتے معاذ نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”ہاں کہو کیا بات ہے؟“ سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھتے احمد صاحب نے اجازت دی۔

”وہ ابو میں سوچ رہا تھا اگلے ہفتے کی سیٹ کنفرم کروالوں“، اپنی بات کے لیے تمہید باندھتے معاذ نے دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے عابدہ بیگم اندر داخل ہوئیں۔

”سیٹ کیوں؟ ابھی تو تمہاری ایک مہینے کی چھٹی باقی ہے نا“، ایک نظر عابدہ بیگم پر ڈالتے احمد صاحب نے وجہ پوچھی۔

”جی مگر مجھے فلیٹ تبدیل کرنا ہے اور میرے ویزے کا بھی کچھ مسئلہ آرہا تھا جو مجھے چھٹیوں سے پہلے پہلے حل کروانا ہے اسی لیے سوچ رہا ہوں ٹائم سے جا کر یہ سب کام ختم کروالوں“، معاذ نے معقول سے وضاحت دیتے اصل بات گول کی۔

”نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے اتنی جلدی جانے کی ابھی تو میں نے جی بھر کے تمہیں دیکھا بھی نہیں اور تم جانے کی باتیں کرنے لگ گئے ہو“، احمد صاحب کے بجائے عابدہ بیگم نے اُس کی بات پر جذباتی ہوتے منع کیا۔

”امی میراجنا ضروری ہے۔ ویزہ کا مسئلہ حل نہ ہوا تو کمپنی والے مجھے جاب سے نکال دیں گے اور شفٹنگ میں بھی کافی وقت لگتا ہے۔ پہلے تو میں جاؤں گا کوئی اچھا فلیٹ ڈھونڈوں گا جو کمپنی کے پاس ہو اور پھر سامان وغیرہ سیٹ کرنے میں بھی وقت لگ جانا اور میں اپنی جاب کے درمیان یہ سب کام نہیں کر سکتا“، ان کے منع کرنے پر معاذ نے لمبی چوڑی تفصیل بتاتے انہیں اپنی مجبوری سمجھانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہیں مناسب لگتا ہے تم کرو اور عابدہ پلیز بچوں کو ٹوک کر ان کا دل خراب مت کیا کریں۔ یہ لوگ ہم سے ہر تین، چار مہینے بعد ملنے آجاتے ہیں یہی بہت ہے“، عابدہ بیگم کو مزید کچھ کہنے کے لیے منه کھولتا دیکھ کر احمد صاحب نے ٹوکا حالانکہ ان کا اپنا بھی دل تھا کہ معاذ ابھی کچھ دن رک جائے۔

”ایسی بات نہیں ہے ابو اور میں آپ کو بتا نہیں رہا اجازت مانگ رہا ہوں اگر آپ کہیں گے تو میں نہیں جاؤں گا“، ان کا ہاتھ تھامتے معاذ نے ہمیشہ کی طرح ان کا مان رکھا۔

”تو میں بھی اجازت ہی دے رہا ہوں اور تم پر یشان نہ ہوں تمہاری ماں تو تم لوگ سال بھی رہ لو تب بھی تمہارے جانے کے نام پر ایسے ہی گلے شکوے شروع کر دیتی ہے“، اُس کی بات پر مسکراتے ہوئے احمد صاحب نے اُسے مطمئن کیا جواب اٹھ کر عابدہ بیگم کو منانے لگا تھا۔

”یہ ہم کہاں آگئے ہیں؟“ گاڑی کو پہاڑی راستے پر موجود ایک ہی سڑک پر دوڑتے دیکھ کر نور نے  
ینچے گہرے جنگلات اور کھائیوں پر نظر پڑتے ہی تھوک نگلا۔

”وہیں جہاں تمہاری خواہش تھی،“ اُس کے سوال پر پلٹ کر اُسے کھاجانے والی نظروں سے  
گھورتے زارون نے ایک نظر باہر ہوتی ہلکی ہلکی بارش کو دیکھا۔

”میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ مجھے موت کے کنویں میں لے چلیں،“ اُس کی گھوری کا اثر لیے بغیر  
نور نے آگے سے منہ بچلاتے سارا الزام اُس کے سر ڈالا جس کی نظریں اب سامنے کھڑے دو  
آدمیوں پر تھیں جو اپنی گاڑی سائیڈ پر لگائے ہاتھ سے گاڑی روکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔

”گاڑی مت روکیے گا،“ ڈرائیور کو فتار آہستہ کرتا دیکھ کر زارون نے ہیڈ لائٹ کی روشنی میں اُن  
میں سے ایک آدمی کے ہاتھ میں گن دیکھ چلاتے ہوئے اُسے بریک لگانے سے روکا۔

”پر صاحب...“ اُن دونوں کو بالکل گاڑی کے سامنے کھڑا دیکھ کر ڈرائیور نے اپنی بات ادھوری  
چھوڑی تو نور نے بھی آنکھوں میں خوف لیے زارون کو دیکھا جو ڈرائیور کو گاڑی روکنے سے منع کر رہا

تھا جس نے انہیں وہیں گاڑی کے سامنے جما کھڑا دیکھ کر زارون کے روکنے کے باوجود بھی بریک لگادی تھی۔

”نکلو باہر...“ گاڑی رکتے ہی اکرم نے پستول شیشے پر رکھتے انہیں شیشہ نیچے کرنے کا اشارہ کیا تو نور نے دبی سی آواز میں چیختے آنکھوں میں خوف لیے زارون کو دیکھا جو شیشہ نیچے کرنے کی بجائے ڈرائیور کو گاڑی سٹارٹ کرنے کا اشارہ کر چکا تھا۔

”ایسا سوچنا بھی مت...“ مزید انتظار کرنے کی بجائے اکرم نے ڈرائیور کے ہاتھ چابی کی جانب بڑھاتے دیکھ کر فائر کیا جو ڈرائیور کے ہاتھ سیمیت سانسیں بھی خاموش کروا چکا تھا۔

”زار...“، فائر کی آواز پر ایک دم سے چیختے نور نے آنکھیں بند کرتے اُس کی شرط کو اپنی مٹھی میں دبو چا۔

”تم لوگوں کو جو کچھ چاہیے لے لو پر پلیز ایسا مت کرو“، ان کی دہشت پر تحمل سے شیشہ نیچے کرتے زارون نے اپنے حواس قائم رکھتے نور کے ہاتھ کو تھاما جو ڈرائیور کے ماتھے سے نکلتے خون کو دیکھ کر ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

”ہمیں وہ لڑکی چاہیے اور اگر تم نے بھی ہمارے کام میں کوئی چوں چوال کی تو ہم تمہارا بھی وہی حال کریں گے جو اس ڈرائیور کا کیا ہے“، دروازہ کھولتے زارون کو گریبان سے پکڑ کر باہر نکالتے اُس آدمی نے اپنے ساتھی نور کو نکالنے کا اشارہ کیا۔

”پلیز میں تمہیں کہہ رہا ہوں ناتم لوگوں کو جتنے پسیے چاہیے میں دے دوں گا۔ گاڑی چاہیے بے شک لے لو پر لڑکی کو چھوڑ دو“، شیرے نے اُسے گاڑی سے باہر نکالا تو زارون نے پوری ہوشیاری کے ساتھ انہیں اپنی جانب متوجہ کیا جو چہرے پر نقاب چڑھائے ہوئے اُس کی بات سننے آنکھوں میں مسکراتے۔

”ہمیں جو چاہیے تھا مل گیا ب تم بھی چھٹی کرو“، اُس کی بات پر قہقہہ مارتے اکرم نے جیسے ہی اپنا پستول والا ہاتھ زارون کے سر پہ مارنا چاہا اُس نے پوری طاقت سے اپنی جان کی پرواکیے بناء اُسے ایسا کرنے سے روکتے پیچھے کی جانب دھکیلا تو وہ دو قدم پیچھے ہٹتا سڑک سے نیچے تھوڑی گہری جگہ پہ جا گرا۔

”تمہاری یہ جراءت...“، شیرے نے نور کو چھوڑتے زارون پر ایک فائر کیا اور اکرم کو بچانے کے لیے جلدی سے نیچے کی جانب بڑھا۔

”نور بھا گو---“، اُس کے جاتے ہی زارون نے گاڑی میں پڑے ڈرائیور کو دیکھا جس کو اگروہ نکالنے لگتا تو وہ دونوں پھر سے وہاں پہنچ جاتے تب ہی اُس نے نور کا ہاتھ تھامتے سڑک سے اُترتے نیچے کی جانب دوڑ لگائی جہاں درختوں کے علاوہ کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔

”پلیز جلدی بھا گو“، اپنے پیچھے ہی قدموں کی آواز سنتے زارون نے اُس کا ہاتھ مزید مضبوطی سے تھاماً اور کچھ ہی سوچے سمجھے بغیر اپنے ساتھ کھینچتے گھنے جنگل میں کہیں گم ہو گیا۔

”کہاں گئے؟“ اکرم نے بھاگتے ہوئے اندر ہیرے کی وجہ سے ہاتھ میں پکڑی طارچ کو چاروں اطراف مارتے اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کی۔

”پتا نہیں مجھے تو کہیں نظر نہیں آرہے“، اُس کے قریب آتے شیرے نے بھی چاروں اطراف نظر دوڑائی۔

”بہت چالاک تھا لڑکا پر یہ نہیں پتا کہ اس جنگل میں کچھس گئے تو واپس نہیں نکل پائیں گے“، دانت پیستے اکرم نے شکار ہاتھ سے جانے پر ایک پتھر کو ٹھوکر مارتے نیچے دھکیلا۔

”اب کیا کرنا ہے آگے جانا ہے یا نہیں؟“، اُس کی بات سنتے شیرے نے بھی لمبی سانسیں لیتے خود کو پر سکون کیا۔ ”نہیں، پاگل ہو کیا“، واپس پلٹتے اُس نے اُس کی عقل پر ماتم کیا۔

سات پر سوئی جاتے ہی نائلہ بیگم کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور پر نبیلہ بیگم کے وقفے و قفے سے کیے جانے والے طنز انہیں مزید پریشان کر چکے تھے۔

”ظہیر آپ جائیں جا کر دیکھیں نورا بھی تک نہیں آئی“، انہیں کمرے میں بلاتے نائلہ بیگم نے پریشانی سے رونا شروع کر دیا۔

”کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ رضانے بتایا تو ہے کہ وہ آرہی ہے۔“

”کہاں آرہی ہے؟ پچھلے ایک گھنٹے سے آپ لوگ یہی بات کر کہ مجھے تسلی دے رہے ہیں۔ میں نے آپ سے کہا ہے ناجائز آپ جا کر دیکھیں اب تو اس کا نمبر بھی بند جا رہا ہے“، اپنی آواز پنجی رکھتے نائلہ بیگم نے ظہیر صاحب پر غصہ کیا جواب خود بھی کلاک پر سات بجتے دیکھ کر فکر مند ہو چکے تھے۔

”اچھا میں دیکھتا ہوں۔ تم اُس کی دوست کے نمبر پر کال کر کہ پوچھو ہو سکتا ہے بیڑی وغیرہ لو ہونے کی وجہ سے اُس کا نمبر بند ہو گیا ہو“، انہیں تسلی دیتے ظہیر صاحب نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی۔

”میرے پاس نمبر نہیں ہے اُس کا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی پر رضا کو اُس کے گھر کا پتہ معلوم ہے آپ رضا کو ساتھ لے جائیں“، ان کی بات سنتے ہی نائلہ بیگم نے خود کو سنبھالا۔

”نہیں رہنے دو میں ابھی یونیورسٹی تودیکھ آؤ اور ہو سکتا ہے بارش کی وجہ سے دیر ہو گئی ہو۔ بس تم پریشان نہ ہو“، انہیں دلاسہ دیتے ظہیر صاحب کمرے سے نکلتے باہر کی جانب بڑھے۔

”بابا کہاں گئے ہیں؟ اور یہ نور آپی نے آج کچھ زیادہ دیر نہیں کر دی؟“، انہیں باہر کی جانب جاتا دیکھ کر رضا نے کمرے میں آتے نائلہ بیگم سے سوال کیا جن کا دل کسی انجان خطرے کے پیش نظر گھبرا رہا تھا۔

”پتا نہیں بس اللہ پاک میری بیٹی کی حفاظت کرنا“، آنسو پیتے انہوں نے دعا کی تو رضانے آگے بڑھتے انہیں سہارا دیا۔

”آجائیں گی آپ پریشان نہ ہوں۔ خالہ کی تو پہلے ہی زبان اتنی لمبی ہے آپ نے ایسا کیا تو انہیں بتیں کرنا کامزید موقع مل جائے گا“، اپنی آواز پنجی رکھتے رضا نے انہیں سمجھایا جو بیٹی کی فکر میں ہلکاں ہو رہی تھیں۔

”تم جاؤ باہر ان کے پاس بیٹھو میں آتی ہوں“، دوپٹے سے آنسو صاف کرتے انہوں نے رضا سے کہا تو نبیلہ بیگم اُس کے جانے سے پہلے ہی کمرے میں آئیں۔

”ناملہ مجھے نماز پڑھنی ہے پلیز تھوڑا پانی گرم کر دتا کہ میں وضو کر سکوں“، اُن کی روئی روتی آنکھوں کو دیکھتے نبیلہ بیگم نے خود کو کچھ کہنے سے باز رکھتے حکم دیا۔

”جی باجی پانی گرم، ہی ہے آپ کر لیں وضو“، اپنے لبھ کو ہموار رکھتے ناٹلہ بیگم نے زبردستی کی مسکر اہٹ چھرے پہ سجائی۔

"تم لوگوں نے گیز رکب لگوا�ا؟" ان کی بات سنتے ہی نبیلہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”بس ابھی کچھ دن پہلے ہی لگوایا ہے آپ وضو کر لیں میں کھانا لگاتی ہوں“، انہیں جواب دیتے ناکلہ بیگم نے رضا کو ساتھ لیے باہر کارخ کیا تو نبیلہ بیگم نے اُن کے روپے پر بھنویں اچکائیں۔

”توبہ بیٹی ابھی تک گھر نہیں آئی اور ماں ہے کہ شرمند ہونے کی بجائے ایسے اکٹر ہی جیسے کوئی معمولی سی بات ہو“، خود کلامی کرتے انہوں نے سر جھٹکا اور واش روم میں جا گھسیں۔

اپنے ہاتھ میں نمی محسوس کرتے نور نے زارون کی جانب دیکھا جو اس ساتھ لیے ایک گھنے درخت کے پچھے چھپا اُن لوگوں کے جانے کے انتظار میں تھا۔

”آہ... نیچے کچھ ہے“، اپنے پاؤں میں کسی چیز کو رینگتا ہوا محسوس کرتے نور نے خوف سے چیختے ہوئے اُس کے کندھے کو تھامتے اُس کے شوز پر اپنے پاؤں رکھے جو جلدی سے اُسکے منہ پہ ہاتھ رکھ چکا تھا۔

”چپ کیا کر رہی ہو“، اپنے مزید قریب کرتے زارون نے اُس کے کان کے پاس جاتے آہستہ آواز میں تنبیہ کی۔

”میرے پاؤں پہ کچھ چڑھ رہا تھا“، خوف سے آنسوؤں کا گولہ گلے میں اٹکا تو نور نے بھرائی ہوئی آواز میں اُسے چیختے کی وجہ بتائی۔

”اچھا بس یہاں کھڑی رہو خاموشی سے“، قدموں کی آواز دور ہوتے ختم ہوئی تو زارون نے اُسے خود سے الگ کرتے نیچے کھڑا کیا۔

”نہیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے“، واپس اُس کے قریب آتے نور نے اُس کے شوز پر اپنے پاؤں رکھتے خوف سے چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو دیکھ کر جھر جھری لی۔

”اچھا بس چپ رہو“، با مشکل اپنے بازو کو حرکت دیتے زارون نے اُسے تھاما اور دوسرا ہاتھ سے جیب سے موبائل نکالتے اُس کی ٹارچ آن کی۔

”خو...ن....“، روشنی اُس کی سفید شرٹ پر پڑی تو نور نے بے یقینی سے زرد پڑتے اُس کی جانب دیکھا جو اپنی تکلیف کو فراموش کیے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دیکھ رہا تھا۔

”پلیز اب رونامت میں ٹھیک ہوں“، سوسو کی آواز پر مارچ کی روشنی اُس کے چہرے پہ ڈالتے زارون نے چھنجھلاتے ہوئے کہا اور اُسے خود سے الگ کرتے تھوڑا آگے بڑھتے ان لوگوں کے وہاں سے چلے جانے کی تسلی کی۔

”آپ کو گولی لگی ہے؟“ اُس کے پیچھے ہی قدم بڑھاتے نور نے اپنے آنسو صاف کرتے خدشہ کے تحت پوچھا۔

”نهیں، گولی نہیں لگی بھاگتے ہوئے شامد کوئی چیز لگ گئی ہے۔ بس تم پریشان نہ ہو اور میرے ساتھ ساتھ رہو“، اس کی گھبراہٹ پر جھوٹ بولتے زارون نے ایک طرف جاتے وہاں سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو نور نے بھی تسلی ہونے پر خاموشی سے اُس کے پیچھے پیچھے قدم اٹھائے جو کچھ دور جاتے رک گیا تھا۔

”مجھے الگ رہا کہ ہم پیچھے جانے کی بجائے مزید آگے آگئے ہیں“، چاروں طرف درخت اور جانوروں کی آواز پر پریشان ہوتے زارون نے اندازہ لگایا اور موبائل اور نیچے کرتے سکنل لانے کی کوشش کی۔

”زار پلیز مجھے یہاں نہیں رہنا“، گیدڑ کی آواز سنتے ہی نور نے خوف کھاتے اُس کی شرط کو تھاما۔

”ہاں مجھے بڑا شوق ہے نا یہاں رہنے کا۔ حد ہے یار میں پہلے ہی پریشان ہوں اور پر سے تم بار بار آکر مجھ سے چمٹ جاتی ہو۔ کیا تم دور رہ کہ بات نہیں کر سکتیں“، اپنے چکراتے ہوئے سر کو سنبھالتے زارون نے غصے سے اُسے ڈالٹا جس کی وجہ سے وہ اس مصیبت میں پھنس چکا تھا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے“، اُس کے ڈالٹنے پر نور نے ایک کمزور سی وضاحت دیتے پھر پچھ ماری۔

”اب کیا ہوا؟؟؟“

”وہ وہاں کچھ ہے....“، کسی جانور کا گمان ہوتے ہی نور نے لرزتی ہوئی زبان سے کہا اور دوسرا جانب اشارہ کیا تو زارون نے لمبی سانس لیتے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کی پر بازو سے بہتے مسلسل خون کے سبب وہ چاہا کر بھی خود کو کھڑا نہیں رکھ پا رہا تھا تھا جلد از جلد وہاں سے باہر نکلنے کے لیے اُس نے مزید وقت ضائع کرنے کی بجائے نور کا ہاتھ تھاما اور اللہ کا نام لیتے اندازے سے دوسرا جانب بڑھنے لگا جہاں سے ہلکی ہلکی روشنی کسی انسان کے ہونے کا گمان دے رہی تھی۔

”زارون کیا ہوا؟ زارون پلیز اٹھیں“، کچھ دور جاتے ہی اُس کی ہمت جواب دے گئی تب ہی نور کا ہاتھ چھوڑتے اُس نے ایک درخت کا سہارا لیتے اپنے سر کو جھٹکا مگر مسلسل نکالنے خون اور

برداشت سے باہر ہوتی درد کی شدت کی وجہ سے وہ اپنے حواس مزید فائم نہیں رکھ سکا اور وہیں  
درخت کے ساتھ لگے نیچے بیٹھتا چلا گیا.....

”کچھ پتا چلا؟ کہاں ہے نور؟ آپ اکیلے واپس کیوں آئے ہیں؟“، گاڑی کا ہارن سنتے ہی نائلہ بیگم  
جلدی سے سب کام چھوڑ کے گیٹ کی جانب بڑھیں۔

”بابا کیا ہوا؟ کہاں ہیں آپی؟“ انہیں خاموش دیکھ کر رضا نے بھی آگے بڑھتے استفسار کیا تو ظہیر  
صاحب کا سر مزید جھک گیا۔

”کیا ہوا ہے ظہیر کہاں ہے میری بیٹی؟ آپ اُسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟“، اب کی بار نائلہ بیگم  
نے کسی کی بھی پرواکیے بناء چلاتے ہوئے ان کا گریبان تھاما۔

”نائلہ پلیز خود کو سن بھالو۔ میں یونیورسٹی گیا تھا پر وہاں کوئی بھی اسٹوڈنٹ نہیں تھا۔ چو کیدار کے  
مطابق یونیورسٹی سات بجے کے قریب پوری طرح سے خالی ہو چکی تھی“، ان کی حالت غیر ہوتی  
دیکھ کر ظہیر صاحب نے ان کا ہاتھ تھامتے تحمل سے تفصیل بتاتے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”یہاں سے جاتے ہوئے راستے میں ایک درخت گرا ہوا پڑا تھا جسے میرے جانے سے کچھ منٹ  
پہلے ہی لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت سڑک سے ہٹایا تھا ہو سکتا ہے راستہ بند ہونے کی وجہ سے

وہ اپنی سہیلی کے ساتھ اُس کے گھر چلی گئی ہو۔“ پوری بات بتاتے ظہیر صاحب نے اپنے خدشے کا اظہار کیا تو نائلہ بیگم کی چلانے کی آواز سننے نبیلہ بیگم اور عدیل بھی کھانا چھوڑتے باہر آگئے۔

”کیا ہوا خالو؟ نور ملی نہیں کیا؟“ عدیل نے نائلہ بیگم کی بات سننے ہی ظہیر صاحب سے پوچھا جنہوں نے زبان کی بجائے بس نفی میں سر ہلا دیا۔

”اچھا آپ پریشان نہ ہوں اور نور کو کال کر کہ پوچھ لیں ناکہ وہ کہاں ہے؟“ عدیل جوماں کی زبانی نور کے ابھی تک گھرنہ آنے کے بارے میں سُن چکا تھا اُس نے ظہیر صاحب کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے تسلی دی۔

”موباکل بند ہے آپی کا، میں کافی بار ٹرائی کر چکا ہوں“، ایک بار پھر سے اُس کا نمبر ملاتے رضاۓ بتایا۔

”تو کسی سہیلی کو فون کر کہ پوچھ لو“، نبیلہ بیگم نے آگے بڑھتے بات میں حصہ لیا۔

”نمبر نہیں ہے میرے پاس پر گھر کا پتا ہے۔ چلیں ابو ہم رابعہ آپی کی طرف چلتے ہیں“، اُن کی بات کا جواب دیتے رضاۓ ظہیر صاحب سے کہا جو نائلہ بیگم کو چپ کروانے کے ساتھ ساتھ خود بھی اپنے دل کو مضبوط کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔

”نہیں خالو کو رہنے دو۔ ہم دونوں چلتے ہیں“، ظہیر صاحب کو پریشان دیکھ کر عدیل نے مداخلت کی اور رضا کو ساتھ لیے رابعہ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

---

”معاذ، زارون کو فون کر کہ پوچھو کہ وہ کہاں ہے؟ رات کے نوچ گئے ہیں اور اُس کا بھی تک کوئی اتا پتا نہیں اور سے موسم بھی اتنا خراب ہے“، عابدہ بیگم نے اپنے موبائل میں کریڈٹ نہ ہونے کی وجہ سے معاذ کے کمرے میں آتے اُس سے کہا جو اپنے لیپ ٹاپ پر کسی سے ویڈیو کال پر بات کرنے میں مصروف تھا۔

”میں تم سے کچھ دیر میں بات کرتا ہوں“، دوسری طرف موجود لڑکے کو کہتے اُس نے کال بند کی اور عابدہ بیگم کی جانب متوجہ ہوا۔

”زارون آیا نہیں ہے ابھی تک؟“، ان سے پوچھتے معاذ نے اُس کا نمبر ڈائل کیا جو بند تھا۔  
”نمبر بند ہے...“، موبائل کان سے ہٹاتے اُس نے دوسری بار ٹرائی کیا۔

”بند ہے...“، موبائل ٹیبل پر رکھتے معاذ نے عابدہ بیگم کا ہاتھ تھاما جو کسی بھی وقت رو دینے کو تھیں۔

---

”آپ پریشان نہ ہوں دوستوں کے ساتھ ہو گا، آجائے گا بھی“، انہیں اپنے ساتھ بیڈ پہ بٹھاتے معاذ نے تسلی دی۔

”میرا دل بہت گھبرا رہا ہے تم ارحام کو کال کر کہ پوچھو کہ کہاں ہے زارون؟ پہلے تو کبھی اُس نے اتنی دیر نہیں کی“، اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے عابدہ بیگم نے فکر مندی سے کہا۔

”میں پوچھتا ہوں پر پلیز آپ پریشان نہ ہوں“، اپنا موبائل اٹھاتے معاذ نے انہیں مطمئن کیا اور انہیں ساتھ لیے احمد صاحب کے پاس آیا جو تھکاوٹ کی وجہ سے کھانا کھاتے ہی سو گئے تھے۔

”بیٹھیں آپ ادھر۔ میں ابو کے موبائل سے نمبر دیکھ کر کال کرتا ہوں“، انہیں صوفی پر بٹھاتے معاذ نے احمد صاحب کا موبائل اٹھاتے ارحام کا نمبر نکالتے ڈائل کیا۔

”السلام علیکم انکل! کیسے ہیں آپ؟ اور آج میری یاد کیسے آگئی آپ کو؟“، دوسری طرف ریحانہ بیگم کو پر سکون نیند سوتا دیکھ کر ارحام نے رابعہ کو دو منٹ میں آنے کا اشارہ کیا اور کمرے سے باہر آگیا۔

”و علیکم السلام، معاذ بات کر رہا ہوں۔“

”اوو و سوری مجھے لگا انکل ہیں۔ خیریت ہے آپ نے مجھ مسکین کو کیسے یاد کر لیا آج“، اُس کے تعارف پر مسکراتے ارحام نے کاریڈور میں لگی ریلنگ پر ہاتھ پھیرا۔

”زارون تمہارے ساتھ ہے؟“ اُس کی بات کا جواب دینے کے بجائے معاذ نے سید حامد عے کی بات پر آتے سوال کیا۔ ”نہیں، میں تو ہسپتال میں ہوں۔ رابعہ کی امی کی طبیعت خراب ہے اُن کے ساتھ اور زارون تو تقریباً چھ بجے کے قریب یونیورسٹی سے نکل گیا تھا“، اُس کی بات پر اک دم سے ہاتھ روکتے ارحم نے پوری تفصیل بتائی۔

”ابھی تک گھر نہیں آیا اور فون بھی بند ہے“، دوسری طرف معاذ نے عابدہ بیگم کو اپنی جانب متوجہ دیکھ کر کمرے سے باہر نکلتے ارحم کو بتایا۔

”نہیں وہ تو اُسی وقت نکل گیا تھا بلکہ وہ نور کو چھوڑنے گیا تھا۔ رابعہ کی دوست ہے اُس کے ابواسے لینے نہیں آئے تو اُس نے رابعہ کے ساتھ گھر جانا تھا پر رابعہ کی امی کی طبیعت خراب ہو گئی تو میں اُسے اپنے ساتھ لے آیا اور زارون کو نور کو چھوڑنے کا کہہ دیا پر اُس کا گھر تو تقریباً میں منٹ کی ڈرائیور ہے اس لحاظ سے تو اُسے کب کا گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اچھا آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھتا ہوں“، دوسری طرف پوری بات بتاتے ارحم نے تسلی دی اور کال بند کرتے واپس کمرے میں آگیا۔

”اپنے ڈرائیور کو کال کر کہ پوچھو کے کہاں ہے؟“، کمرے میں آتے ہی ارحم نے رابعہ سے کہا جو بیٹھی اوںگ رہی تھی۔ ”کیوں کیا ہوا؟ ڈرائیور کو کیوں کال کرنی ہے؟“، اُس کی بے تکی سی بات پر بھنویں اچکاتے رابعہ نے منہ پہ ہاتھ رکھتے اپنی جمائی روکی۔

”معاذ کی کال تھی کہہ رہا تھا کہ زارون ابھی تک گھر نہیں آیا“، خود ہی اُس کا موبائل اٹھاتے ارحم نے اُس کی جانب بڑھایا تو رابعہ نے سنجیدہ ہوتے اپنے ڈرائیور کا نمبر ڈائل کیا جو بند تھا۔

”نمبر بند ہے..“، کرسی سے اٹھتے اُس نے ارحم کو بتایا جس نے موبائل اُس کے ہاتھ سے لیتے نمبر ری ڈائل کیا۔

”نور سے پوچھو..“، موبائل واپس اُس کی جانب بڑھاتے ارحم کو صحیح معنوں میں فکر ہوئی۔

”اس کا بھی نمبر بند ہے“، موبائل کان سے ہٹاتے رابعہ کے اپنے دل کو گھبراہٹ ہوئی۔

”اللہ کرے سب ٹھیک ہو“، دوبارہ سے نور کا نمبر ڈائل کرتے رابعہ نے دعا کی تو ارحم نے کچھ سوچتے ہوئے باہر کا رخ کیا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“، اُس کے پیچے آتے رابعہ نے پوچھا۔

”تم انکل کو کال کر کہ بلالو میں زارون کی طرف جا رہا ہوں۔ پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے“، جواب دیتے وہ موبائل سے کسی کا نمبر ڈائل کرتے سیڑھیوں کی جانب بڑھاتا تو رابعہ نے واپس کمرے میں آتے ظفر صاحب کو کال ملائی جو حدیہ کو گھر چھوڑنے کئے تھے۔

---

”زار پلیز آنکھیں کھولیں..“، اُسے درخت کا سہارا لیے نیچے بیٹھتا دیکھ کر نور نے اُس کے قریب آتے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر اُس سے پہلے ہی وہ نیچے زمین پہ گر گیا۔ ”زار، خدا کے لیے اٹھ جائیں“، اُس کی حالت دیکھ کر نور نے جلدی سے اُس کا سراپنی گود میں رکھا۔

”زار پلیز ایسا نہ کریں۔ دیکھیں مجھے ڈرگ رہا پلیز آنکھیں کھولیں“، موبائل اٹھا کر روشنی اُس کے چہرے پہ ڈالتے جو بالکل زرد پڑ چکا تھا نور نے آنکھوں میں آنسوؤں بھرتے اپنے چاروں طرف نظر دوڑائی جہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

”زار آنکھیں کھولیں، اٹھ جائیں پلیز“، بھرائی ہوئی آواز میں اُس کے چہرے کو تھپتھپاتے نور نے اُسے ہوش دلانے کی کوشش کی جو بالکل بے سدھ تھا۔

”زار..“ کسی کے قدموں کی آہٹ پر دھلتے ہوئے دل کے ساتھ اُس نے خوف زدہ نظر وہن سے ایک طرف سے آتی ہلکی روشنی کو دیکھا اور اُس کے ساتھ ہی کسی انسان کے حلیبہ کو نمودار ہوتا دیکھ کر زور سے چلائی۔

”کون؟ کون ہے وہاں؟“ کسی لڑکی کے چیخنے کی آواز پر ہدایت بابا نے اپنی لاٹھیں کارخ اُس جانب کیا تو نور کے رہے سہے ہواں بھی جواب دے گئے۔

”بیٹا کیا ہوا؟ اور تم یہاں اکیلی کیوں بیٹھی ہو؟“ اُس کی جانب آتے ہدایت بابا نے پریشانی سے استفسار کیا تو نور نے سکتے کی سی حالت میں بیٹھے نفی میں سر ہلایا۔

”بہوت، زار بہوت....“ پتھر ای ہوئی آنکھوں سے ہدایت بابا کو دیکھتے اُس نے زیر لب چلاتے زاروں کے سینے پہ ہاتھ رکھتے اُسے اٹھانے کی کوشش کی۔

”بیٹا میں انسان ہوں۔ ڈر و موت اور بتاؤ مجھے کیا مسئلہ ہے؟“ نیچے پڑے لڑکے کی خون آکو دہ شرط کی جانب دیکھتے ہدایت بابا نے نور کو تسلی دیتے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھنا چاہا پر وہ کرنٹ کھا کر پیچھے ہٹی۔

”بھ۔۔۔ وہ...“ خوف سے آنکھیں پھیلاتے اُس نے پھر سے وہی لفظ دوہرا یا اور اپنے ہوش حواس سے بیگانہ ہوتے وہیں گرگئی۔

”کیا ہوا؟ کیا کہا ارحام نے کہاں ہے زارون؟ اُس کے ساتھ ہے ناجھے پتا تھا وہ ارحام کے ساتھ ہی ہو گاتب ہی گھر کی طرف سے اتنی لاپروائی بر ت کر بیٹھا ہے، اُسے واپس کمرے میں آتا دیکھ کر عابدہ بیگم نے اپنی خوش فہمی کی تصدیق چاہی۔

”جی اُسی کے ساتھ ہے آپ پریشان نہ ہوں کچھ دیر میں آجائے گا، اپنے چہرے کے تاثرات کو نارمل رکھتے معاذ نے عابدہ بیگم کو تسلی دی۔

”کیا ہوا ہے؟ معاذ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“ ان کی آوازوں پر احمد صاحب کی آنکھ کھولی تو انہوں نے معاذ کو اپنے کمرے میں دیکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں ابو وہ بس زارون ابھی تک نہیں آیا اس لیے امی پریشان ہو رہی تھیں،“ انہیں اٹھتا دیکھ کر معاذ نے اپنی موجودگی کی وجہ بتائی۔

”کیوں، کہاں ہے زارون؟“ چہرے پر پریشانی کے آثار سجائے احمد صاحب نے معاذ کی طرف دیکھا۔

”ارحم کے ساتھ ہے بس آرہا ہے آپ پریشان نہ ہوں اور سو جائیں“، معاذ کی بجائے عابدہ بیگم نے فٹ سے جواب دیتے انہیں مطمئن کیا تو معاذ نے نفی میں سر ہلاتے بات کی تردید کی اور اشارے سے خاموش رہنے کا کہتے عابدہ بیگم کو ان کی میڈیسن نکال کر دینے لگا۔

”آپ میڈیسن کھائیں اور سو جائیں پہلے ہی شام سے آپ کابی پی ہائی ہے مزید جاتی رہیں تو اور ہو

جائے گا“، گلاس میں پانی ڈالتے معاذ نے ان کے انکار کے باوجود بھی انہیں میڈیسن کھلادیں۔

”بس لیٹ جائیں اب آپ، میں خود ہی زارون کو دیکھ لوں گا“، احمد صاحب کو اشارے سے ان کے

پاس رہنے کا کہتے معاذ ان کا موبائل لیے کمرے سے باہر آیا اور ارحم کا نمبر اپنے موبائل میں سیو

کرتے اُسے کال ملانے لگا۔

-----

”میں نے کتنا سمجھایا تھا تمہیں کہ لڑکی کو قابو میں کر کہ رکھنا یہ ناہو کہ شہر آتے ہی ہاتھ سے نکل جائے پر نہیں تمہیں تو اپنی بہن کی باتیں بُری لگتی ہیں اب دیکھو کیا ہوا“، عدیل اور رضا کے جاتے ہی نبیلہ بیگم نے نائلہ بیگم کو سہارا دیا اور کمرے میں لے آئیں۔

”پلیز بآجی ایسی باتیں نہ کریں۔ میری نور ایسی نہیں ہے وہ تو بہت معصوم ہے خدا کے لیے کچھ بھی جانے بغیر اُس کے کردار پر کچھ رمت اچھا لیں“، اُن کے سامنے ہاتھ جوڑتے نائلہ بیگم نے ترپ کر اپنے آنسو صاف کیے۔

”ٹھیک ہے بھئی آج کل تو بھلائی کا زمانہ ہی نہیں“، اُن کے چلانے پر خاموشی اختیار کرتے نبیلہ بیگم نے کندھے اچکاتے لاپرواٹی کا اظہار کیا۔

”کیا بنا کچھ پتا چلا؟“، ظہیر صاحب کو کمرے میں آتا دیکھ کر نائلہ بیگم نے اُن کے قریب آتے سوال کیا۔

”نہیں، اُس کی دوست کی امی کی طبیعت خراب ہے۔ وہ سب تو ہسپتال میں ہیں۔ گھر میں بس چوکیدار تھا“، ماتھے پر بل ڈالتے ظہیر صاحب نے نائلہ بیگم کو بتایا جنہوں نے بے یقینی سے اپنے منہ میں ہاتھ رکھا۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا میری بیٹی کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ رضا کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی“، نفی میں سر ہلاتے انہوں نے ظہیر صاحب کی نظر وہ میں اب فکر کی جگہ بد گمانی دیکھ کر وضاحت دی۔

”رضابا کل ٹھیک کہہ رہا ہے اور یقین کر لو کہ وہ ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر جا چکی ہے،“ اپنا سر پکڑ کر صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ظہیر صاحب کو لگا کہ نور نے اُن سے جھوٹ بولا کہ وہ اپنی دوست کے ساتھ واپس آجائے گی۔

”نہیں ظہیر خدا کے لیے اپنی بیٹی کے بارے میں ایسے الفاظ منہ سے مت نکالیں، بے شک انسان اپنی اولاد کی پاکیزگی کی قسم نہیں دے سکتا پر میری نور نہیں وہ بہت معصوم ہے وہ ایسا نہیں کر سکتی اپ لوگوں کو ضرور کوئی غلط فہمی ہو گی،“ آنکھوں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑتے نائلہ بیگم نے اُن کے قدموں میں بیٹھتے صفائی دی۔

”وہ ایسا کر چکی ہے اگر اس نے اپنی سہیلی ساتھ آنا تھا تو کہاں ہے سہیلی؟ اور کہاں ہے نور؟ اُسے یونیورسٹی سے زمین کھائی یا آسمان نگل گیا؟ وہ ہماری عزت کو خاک میں ملا کر جا چکی ہے،“ اُن کی حالت میں ترس کھانے کی بجائے ظہیر صاحب نے چیختے ہوئے اُن کی وضاحتوں کو رد کیا۔

”میں بھی کب سے نائلہ کو یہی سمجھا رہی کہ یونیورسٹی سے کہاں جا سکتی ہے؟ موبائل بھی بند ہے چلو موبائل بند بھی ہو تو انسان کسی سے لے کر کال کر لیتا ہے اور اب یہ نئی بات کہ سہیلی کی امی بیمار ہیں۔ وہ ہسپتال میں ہے۔ حد ہے بھئی، توبہ توبہ کیا زمانہ آگیا ہے،“ کانوں کو ہاتھ لگاتے نبیلہ

بیگم نے ظہیر صاحب کے شک پر یقین کی مہر ثبت کی جو ان کی بات سنتے ہی شرم سے پانی پانی ہو چکے تھے۔

”ظہیر، ظہیر میری بات سنیں“، غصے سے اٹھ کر کمرے سے باہر جاتا دیکھ کر نائلہ بیگم نے ان کے پیچھے جاتے آواز دی جو دوسرے کمرے میں جا کر خود کو بند کر چکے تھے۔

”ظہیر دروازہ کھولیں پلیز، یقین کریں میری نور ایسا نہیں کر سکتی۔ میرا دل کہہ رہا کہ وہ کبھی ہمیں دھوکا نہیں دے سکتی“، دروازے پر ہاتھ مارتے نائلہ بیگم نے اپنی بیٹی کے کرادار کی گواہی دی اور دروازے کے ساتھ ہی لگتے یونچے زمین پر بیٹھ کر سکنے لگیں۔

”سن بھالو خود کو اور آؤ میرے ساتھ وہاں اوپر بیٹھو“، موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے نبیلہ بیگم نے خود کو مزید کچھ کہنے سے باز رکھتے نائلہ بیگم کو سن بھالا جو بیٹی پہ لگے اتنے بڑے الزام پر سُن ہو چکی تھیں۔

”کہاں ہے زارون؟ اور تم نے اندر مجھے چپ رہنے کا کیوں کہا، کیا ہوا ہے سب ٹھیک ہے نا؟“ عابدہ بیگم کے سوتے ہی احمد صاحب نے کمرے سے نکلتے معاذ سے پوچھا جو باہر لان میں کھڑا کسی کے انتظار میں تھا۔

”وہ ابوزارون پتا نہیں کہاں ہے۔ ارحم سے میری بات ہوئی ہے وہ بتا رہا تھا کہ وہ رابعہ کی دوست کو چھوڑنے گیا تھا تو قریب چھبے کے قریب۔ رابعہ کی امی کی طبیعت خراب ہے تو وہ ہسپتال تھیں ارحم اُسے لے کے ہسپتال چلا گیا اور زارون کو رابعہ کی دوست کو چھوڑنے کا کہہ دیا اور اب گیارہ بننے والے ہیں اور ابھی تک اُس کا کوئی پتا نہیں“، معاذ نے مختصر الفاظ میں احمد صاحب کو ساری بات بتائی۔

”کہاں جاسکتا ہے؟ کسی اور دوست سے پوچھ لیتے“، اُس کی بات سننے ہی فکر مندی سے احمد صاحب نے مشورہ دیا اور ارحم کی گاڑی کا ہارن سننے اُس کی جانب متوجہ ہوئے جو گاڑی گیٹ سے اندر لا چکا تھا۔

”زارون گھر آیا ہے یا نہیں؟“ گاڑی سے اُترتے ہی ارحم نے معاذ کے قریب آتے پوچھا۔ ”نہیں..“، نفی میں سر ہلاتے معاذ نے احمد صاحب کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

”کہاں جاسکتا ہے؟ گاڑی تو یونیورسٹی میں ہی کھڑی ہے اُس کی میں ابھی دیکھ کے آیا ہوں“، پرسوچ انداز میں کہتے ارحم نے معاذ کی جانب دیکھا جو خود بھی لا علم تھا۔

”تم انکل آنٹی کو سنبھالو میں دیکھتا ہوں راستے میں کہیں ہو سکتا ہے گاڑی خراب ہو گئی ہو“، اُنہیں تسلی دیتے ارحم نے واپس اپنی گاڑی کا رخ کیا اور معاذ نے اُسے پیچھے سے آواز لگاتے روکا۔

”میں بھی ساتھ جاؤں گا“، احمد صاحب کو اپنا خیال رکھنے کا کہتے وہ اُس کے قریب آیا۔  
 ”نہیں تم آئیں، انکل ساتھ رہو۔ جو بھی معاملہ ہوا تمہیں انفارم کر دوں گا اور پریشان نہ ہو یقیناً  
 گاڑی وغیرہ کا کوئی مسئلہ ہو گیا ہو گا“، اُسے مطمئن کرتے ارحم نے گاڑی میں بیٹھتے اُسے گیٹ سے  
 نکلا اور سڑک پر ڈالتے نور کے گھر کے راستے کی طرف روانہ ہوا تاکہ وہاں جا کر زارون کو دیکھ  
 سکے۔

نور کی آنکھ کھلی تو اُس نے خود کا ایک انجان جگہ پر دیکھ کے جلدی سے اٹھنے کی کوشش کی۔  
 ”اما، بابا کہاں ہیں آپ پلیز مجھے بچالیں، آنکھوں میں خوف لیے خود کو ایک بھوت کے قبضے میں  
 سوچ کر، ہی اُس کے اوسان خطا ہونے لگے۔

”زار، کہاں ہیں آپ؟“ زارون کے بارے میں یاد آتے ہی اُس نے اندھیرے کی وجہ سے اپنے  
 ارد گرد ہاتھ مارتے اُسے تلاش کرنا چاہا۔

”زار، پلیز اٹھیں“، بلکی روشنی میں اپنے سے کچھ دور لیئے زارون کو دیکھتے نور کی جان میں جان  
 آئی۔

”زار پلیز آنکھیں کھولیں دیکھیں کسی بھوت نے ہمیں پکڑ لیا ہے“، اُس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر تمہارے کو شش کرتے نور نے اپنے آنسو صاف کیے جو خوف کے مارے خود ہی اُس کے گالوں پر بہہ نکلے تھے۔

”بیٹا اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اُسے سونے دواور تم بھی پریشان نہ ہو، اللہ اپنے کرم سے تمہارے شوہر کو جلد ہی ٹھیک کر دے گا“، نور کی آواز پر ہدایت بابا نے اپنی جھونپڑی میں آتے اُسے تسلی دی جس کی آنکھیں اُس شخص کو دیکھ کر پھر سے سرد پڑنے لگیں۔

”بھوت“، زارون کے سینے پر ہاتھ رکھے ہی نور نے اُس کے لمبے بالوں کے سبب گھبراتے ہوئے دبی سی چیخ ماری۔

”بیٹا میں انسان ہوں کوئی بھوت نہیں اس لیے ڈرومٹ اور بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ تم لوگ یہاں اس گھنے جنگل میں رات کے اس پھرے کیا کر رہے تھے؟ یقیناً تم لوگوں کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا ہے“، زارون کے بازو پہ لگی گولی کا سوچتے ہدایت بابا نے اندازہ لگایا ”ج۔۔ ج۔۔ ج۔۔“، خوف زدہ نظرؤں سے تھوک لگتے اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

”گھبراو نہیں، سکون سے بیٹھو اور مجھے بتاؤ کہ کیا ہوا تھا تاکہ میں تم لوگوں کی کچھ مدد کر سکوں۔“ ویسے گولی صرف چھو کر گزری ہے اس لیے تمہارے شوہر کی جان خطرے سے باہر ہے بس لگتا

ہے خون بہہ جانے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا، اُس کے نام لینے اور باتوں سے اُن کے رشتے کا اندازہ لگاتے ہدایت بابا نور کے سرپہ ہاتھ رکھا جسے اب اُن کے انسان ہونے کا کچھ کچھ یقین ہو چکا تھا۔

”شو۔۔۔ ہر۔۔۔ شوہر۔۔۔“ لفظ پر اگلتے نور نے زارون کے چہرے کی جانب دیکھا جوا بھی تک زرد تھا۔

”کیوں کیا یہ تمہارا شوہر نہیں ہے؟“  
”جی شوہر ہی ہے“، ہدایت بابا کی بات پر نور کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیا جواب دے تب ہی پہلے نفی میں سر ہلاتے اُس نے جلدی سے ہاں میں سر ہلا�ا۔

”اللہ پاک جوڑی سلامت رکھے۔ مجھے تو دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا تھا“، اُس کے سرپہ ہاتھ رکھتے ہدایت بابا نے اپنے اندازے کے ٹھیک ہونے پر مسکراہٹ چھپائی اور باہر کسی آدمی کی آواز پر نور کو آرام کرنے کا کہتے باہر کی جانب بڑھے۔

-----

”رضا پنے بابا کو سمجھا وہ کہ نور ایسی نہیں ہے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکتی یقیناً وہ کسی مصیبت میں ہے تب ہی ابھی تک گھر نہیں آئی۔ خدا کے لیے اپنے بابا سے کہو کہ میری بیٹی کو ڈھونڈ دیں۔ پتا نہیں میری پچ بچاری کس حال میں ہو گی“، روتے ہوئے انہوں نے رضا کے سامنے التجاء کی جو ابھی ابھی عدیل کے ساتھ گھر آیا تھا۔

”کیا ہوا بابا کو اور کیا سمجھاؤں میں؟“، ان کی طرف نا سمجھی سے دیکھتے رضانے ماں کو سہارا دیتے اپنے ساتھ لگایا جو رو رو کر ہلاکاں ہو چکی تھیں۔

”یہی کہ نور کسی لڑکے ساتھ بھاگی نہیں اور ظہیر جو کچھ سوق کے بیٹھا ہے سب غلط ہے“، نائلہ بیگم کی بجائے نبیلہ بیگم نے اُس کی مشکل آسان کی۔

”خالہ پلیز سوچ سمجھ کر بات کریں نور آپی ایسی نہیں ہیں اور ماں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ضرور وہ کسی مصیبت میں ہیں“، ہاتھ اٹھا کر نبیلہ بیگم کو مزید کچھ بولنے سے روکتے رضانے ماں کی سائیڈ لی۔

”ٹھیک ہے تو پھر وہ کہہ کہ گئی تھی ناکہ اپنی دوست کے ساتھ واپس آجائوں گی تو کہاں ہے دوست؟ تم تو خود پوچھ کے آئے ہو ناکہ اُس کی امی بیمار ہیں اور وہ ہسپتال میں ہے تو پھر نور کہاں ہے؟ موبائل اُس کا بند ہے، خبر اُس کی کوئی نہیں اور تم کہہ رہے میں خاموش ہو جاؤں؟ نہ پیٹا جی

نہ، خالہ کے منہ پہ تو تالا لگادو گے پر ان دنیا والوں کے منہ کیسے بند کرو گے جو تمہاری بہن کے رات بھر باہر رہنے کے بارے میں نہ صرف سوال کرے گی بلکہ خود سے جواب بھی اخذ کرتے ایسی ایسی باتیں بنائے گی کہ تمہاری سوچ ہے،“ رضا کے یقین کی پختگی دیکھ کر نبیلہ بیگم نے اُسے بھڑکانے کی کوشش کی جو پہلے ہی نور کی وجہ سے کافی پریشان تھا اور اب ظہیر صاحب کی غلط فہمی کا سُن کر مزید ہو چکا تھا۔

”کسی اور نے کیا بات کرنی ہے خالہ وہ توبت بات کریں گے جب ان کو خبر ہو گی اس لیے معذرت کے ساتھ اگر آپ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتیں تو ایسے میری بہن پہ کچھ بھی مت اچھا لیں،“ کوئی بھی لحاظ کیے بغیر رضانے ان کو کھری کھری سنائی۔

”امی پلیز بس کریں کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ دیکھیں خالہ پہلے ہی پریشان ہیں،“ رضا کے جواب پر آگ بگولہ ہوتے نبیلہ بیگم نے کچھ بولنا چاہا مگر عدیل نے درمیان میں آتے انہیں ایسا کرنے سے روکا۔ ”گھر چلو میں یہاں مزید نہیں رک سکتی،“ بیٹی کے اشارے پر خاموش ہوتے نبیلہ بیگم اپنا بیگ اٹھانے کے لیے کمرے کی جانب بڑھنے لگیں تو عدیل نے ہاتھ پکڑ کر انہیں روکا۔

”پلیز امی رضا بچہ ہے اور آپ دیکھ رہیں ہیں ناپہلے ہی اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں اوپر سے یہ پریشانی، مہربانی کر کہ خالہ کو سنبھالیں یہ وقت غصہ کرنے کا نہیں ہے،“ آہستگی سے انہیں سمجھاتے عدیل

نے نائلہ بیگم کی جانب دیکھا جو پاگلوں کی طرح رضا کے سامنے ہاتھ جوڑتے اُس کو ظہیر صاحب کو سمجھانے کا کہہ رہی تھیں جو پچھلے دو گھنٹوں سے خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھے تھے۔

---

”بیٹا تم بھی لیٹ جاؤ اور آرام کرو، اب جو بھی ہونا ہے صحیح ہی ہو گا“، ہدایت بابا نے جھونپڑی میں واپس آتے نور کو اُسی حالت میں بیٹھاد کیکھ کر سمجھایا۔

”نهیں، مجھے نہیں لیٹنا پلیز انکل آپ کچھ کریں اور زارون مطلب میرے شوہر کو ہوش میں لے آئیں، ہمارے گھروالے پریشان ہو رہے ہوں گے“، نور جوتب سے بیٹھی ظہیر صاحب اور نائلہ بیگم کے بارے میں سوچ رہی تھی اُس نے ہدایت بابا کی بات سننے ہی التجاء کی۔

”ہاں وہ میں یہی بتانے والا تھا کہ وہ جو ابھی آدمی آیا تھا نا، وہ تھوڑی بہت ڈاکٹری جانتا ہے اور اُسی نے تمہارے شوہر کا اعلان کیا ہے ابھی بھی وہ تم لوگوں کے بارے میں ہی پوچھنے آیا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ کچھ دیر میں بیٹا جی کو ہوش آجائے گا اس لیے تم پریشان نہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، ایک برتن میں دودھ ڈال کر باہر جلتی آگ پر رکھتے ہدایت بابا نے اُسے تسلی دی۔

”نور۔۔۔ نور“، بند آنکھوں سے، ہی اُس کا نام پکارتے زارون نے اپنا ہاتھ ہلانا چاہا تو نور نے اُس کی آواز پر جلدی سے اپنا رخ اُس کی جانب کیا۔

”زار آپ ٹھیک ہیں نا؟“ اُس کے قریب ہو کے نور نے خوشی سے اُس کے چہرے کو تھاما۔

”نور، ت۔۔۔ مٹھ۔۔۔ یک ہو“، درد کی شدت کو برداشت کرتے زارون نے کسی انجان لمس پہ آنکھیں کھولیں جو ابھی تک بھاری تھیں۔

”میں ٹھیک ہوں، آپ ٹھیک ہیں؟ زیادہ درد تو نہیں ہو رہا؟“ اُس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ کر نور نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا جو خود کو ایک انجان جگہ پر پا کر ابھی تک ساکت نظر وں سے چھت گھور رہا تھا۔

”کہاں ہیں ہم؟“ اپنے چہرے پر رکھا اُس کا ہاتھ تھامتے زارون کو لگا کہ وہ ان لوگوں کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔

”پتا نہیں...“، اُس کی بات سنتے نور نے جلدی سے اپنا ہاتھ کھینچتے لا علمی کا اظہار کیا۔

”کیا مطلب پتا نہیں؟ کہاں ہیں ہم؟ کیا ان لوگوں نے ہمیں پکڑ لیا ہے؟“ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتے زارون نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”نہیں اُن لوگوں نے نہیں کپڑا۔ کوئی انکل ہمیں اپنے گھر لائیں ہیں“، نور نے کہنے کے ساتھ ہی ہدایت بابا کی جانب دیکھا جو نور کے لیے کپ میں گرم دودھ ڈال کر جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ ”ماشاء اللہ، یہاں تو ہمارے برخوردار بھی اٹھ چکے ہیں“، نور کے قریب دودھ کا کپ رکھتے انہوں نے زارون کے سر پہ ہاتھ رکھا جو حیرت سے اُس درویش شخص کو دیکھ رہا تھا۔ ”کون ہیں آپ؟“ بے ہوش ہونے سے پہلے زارون کو ہلکی روشنی کو دیکھتے کچھ فاصلہ پہ کسی آبادی کا گمان ہوا تھا مگر حالت خراب ہونے کے بعد کیا ہوا وہ یہاں کیسے پہنچے اس بات کو جاننے کا تجسس اُس کے دل کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں بھی در آیا تھا۔

”میرا نام ہدایت ہے سب مجھے ہدایت بابا کے نام سے جانتے ہیں اور تم لوگ اس وقت ہمارے چھوٹے سے گاؤں میں ہو“، بات کے آغاز کے لیے تمہید باندھتے انہوں نے زارون کی بیٹھنے میں مدد کی۔

”میں دوسرے گاؤں میں اپنے کچھ رشتے داروں سے مل کر واپس آرہا تھا جب تمہاری بیوی کے رونے کی آواز سنی اور بس پھر تمہاری بیوی نے تو مجھے دیکھتے ہی بھوت سمجھ لیا اور بے ہوش ہو گئی“، نور کی حرکت کے بارے میں بتاتے انہوں نے اپنی مسکراہٹ چھپائی اور زارون کی جانب دیکھا جو بس ایک لفظ پہ اٹک چکا تھا۔

”بیوی...؟“ نور کی طرف دیکھتے اُس نے بولنا چاہا مگر اُس کے اشارہ کرنے پر خاموش ہو گیا۔

”میں نے جب تمہاری بیوی کو بھی بے ہوش دیکھا تو گاؤں میں واپس آکر مدد مانگی اور تم لوگوں کو یہاں اپنی جھونپڑی میں لے آیا۔ بس یوں سمجھ لو کہ اللہ بڑا رحیم ہے اُس نے تم لوگوں کی حفاظت کرنی تھی تو اسباب خود بخود ہی پیدا ہو گئے، دونوں ہاتھ اٹھاتے خدا کی کرنی پر ہدایت بابا نے ایک گھری سانس لی۔

”بہت شکر یہ آپ کا آپ نے ہماری جان بچائی۔ میں پوری زندگی آپ کا مشکور رہوں گا“، ہدایت بابا کی پوری بات سننے کے بعد زارون نے تشکر انہے انداز میں اُن کی مدد پر اُن کا شکر یہ ادا کیا جو عاجزی سے سب اللہ کا کیے کہہ کر زارون سے کھانے کا پوچھنے لگے۔

”نهیں بس آپ ہمیں یہاں سے باہر کارستہ بتادیں۔ گھروالے ہماری غیر موجودگی پر پریشان ہو رہے ہوں گے،“ نور کی طرف دیکھتے زارون کو اپنے سے زیادہ اُس کی فکر ہوتی جس کے گھروالوں کے لیے گزار تاہر پل قیامت کے متراffد ہو گا۔

”ابھی؟ ابھی تورات کے دونوں حصے ہیں اور اس وقت یہاں جنگلوں سے ہو کر سڑک کی جانب جانا کسی خطرے سے خالی نہیں اور پیٹا تمہاری طبیعت بھی ابھی ناساز ہے میرا نہیں خیال کے تم اتنی دور تک چل کے جاسکو گے،“ اُس کی بات سنتے ہدایت بابا نے مشورہ دیا۔

”آپ میری فکر نہ کریں میں چل لوں گا بس آپ کسی طرح صحیح ہونے سے پہلے ہمیں یہاں سے نکال دیں“، نور کی طرف دیکھتے زارون نے اصرار کیا۔

”بیٹا جی آپ میری بات نہیں سمجھ رہے...“ زارون کی بات پر ہدایت بابا نے تشویش سے کہا۔

”میرا بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت جنگل میں سے جانا مطلب اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا ہے اور میں آپ کو ایک مصیبت سے نکال کر دوسرا میں نہیں پھنسا سکتا اس لیے صحیح ہونے کو انتظار کریں جیسے ہی ہلکی روشنی ہو گئی میں آپ لوگوں کو یہاں سے لے چلوں گا“، اپنی بات تفصیل سے سمجھاتے ہدایت بابا نے زارون کی طرف دیکھا جس کی نظر وہ میں ابھی بھی کشمکش تھی۔

”پریشان نہ ہو اور اللہ پر بھروسہ رکھو“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہدایت بابا نے تسلی دی تو زارون نے بے بسی سے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”میں دودھ لے کر آتا ہوں“، اُس کے رضامند ہوتے ہی ہدایت بابا نے نور کو دودھ پینے کا کہا جو ابھی تک ویسے ہی بیٹھی ان کی باتیں سُن رہی تھی۔

”مجھے گھر جانا ہے“، ہدایت بابا کے جھونپڑی سے نکلتے ہی نور نے کپ واپس رکھا جو اُس نے بس بابا کی تسلی کے لیے اٹھایا تھا۔

”میں بھی یہی چاہتا تھا کہ صح کے اجائے سے پہلے تمہیں گھر پہنچا دوں مگر سب حالات تمہارے سامنے ہیں“، اُس کی بات سنتے زارون نے پلٹ کر اُس کی جانب دیکھا۔

”اما با بابا پریشان ہو رہے ہوں گے اور رضا نے تور روکراپنا براحال کر لیا ہو گا، پلیز زار آپ انگل سے کہیں ناکہ کسی طرح ہمیں یہاں سے نکال دیں“، نور نے التجائیہ نظروں سے اُسے دیکھا جس کے دل میں اٹھتے وسو سے نور کی سمجھ سے باہر تھے۔

”مجھے اپنی پروانہیں ہے پر میں تمہاری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا اور بابا کی بات ٹھیک ہے اس وقت جنگل سے جانا مناسب نہیں پہلے ہی پتا نہیں کون سی نیکی کام آئی کہ ہم اس جانور کا لقمہ بننے سے بچ گئے“، نظریں چڑاتے زارون نے ناچاہتے ہوئے بھی وضاحت دی۔

”اچھا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں پھر صح چلے جائیں گے بس مجھے ماما بابا کی فکر تھی کہ وہ پریشان ہو رہے ہوں گے“، جانوروں کا سنتے ہی نور نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی تو زارون نے دل میں اللہ کو پکارا۔

”یا اللہ مجھے اپنی فکر نہیں پر اس معصوم کی حفاظت کرنا جو یہ سمجھ ہی نہیں پار ہی کہ جان چلی جائے تو اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی اپنوں کے شکلی اور خود غرض راویوں سے ہوتی ہے۔ یا اللہ آپ تو رحمان ہیں، اپنے حبیب کے صدقے اس معصوم پر رحم کریں جو یہ نہیں جانتی کہ ماں باپ بیٹی کے

رات بھر گھر سے غائب رہنے پر صرف پریشان ہی نہیں ہوتے بلکہ ایسی باتوں پر عزتوں کے جنازے نکل جاتے ہیں اور پھر ان کی آڑ میں یہ بھی سمجھ نہیں آتا کہ بیٹی قصور وار تھی بھی یا نہیں....، واپس نظر وں کا رخ اُس کی جانب کرتے زارون نے مسکرانے کی کوشش کی پر ناکام رہا۔

”کیا ہواز یادہ درد ہو رہا ہے؟“ اُس کے چہرے پر افیت دیکھ کر نور نے اندازہ لگا تو زارون نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”نہیں، تم یہ دودھ پیو اور لیٹ جاؤ میں پاس ہی ہوں“، دوسرے ہاتھ سے کپ اٹھا کر اُس کی جانب بڑھاتے زارون نے ناچاہتے ہوئے بھی اُس کے لبوں سے لگا دیا۔

”میں پی لیتی ہوں“، اُس کی حرکت اور نظر وں سے جھینپتے نور نے جلدی سے کپ تھاما اور ایک ہی سانس میں سارا دودھ ختم کرتے لحاف اُٹھے دوسری طرف سائیڈ لے کر لیٹ گئی۔

-----

سرٹکوں پر خوار ہونے اور کچھ لوگوں سے پوچھ کچھ کرنے کے بعد بھی جبار حم کے ہاتھ کوئی سراغ نہ لگا تو اُس نے تین بجے کے قریب تھک ہار کر نور کے گھر کا رخ کیا تاکہ اُس سے زارون کے متعلق پوچھ سکے۔

”ارحم بھائی آپ یہاں؟ اس وقت؟“ گیٹ کھولتے ہی رضا نے اُسے اپنے سامنے دیکھ کر تعجب سے استفسار کیا۔

”ہاں، وہ مجھے نور سے کچھ بات کرنی تھی پلیز اُسے بلا دو“، اُس کے پیچے ہی نائلہ بیگم کو گیٹ پر آتا دیکھ کر ارحم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”کیا پوچھنا ہے؟ اور کون ہوتا ہے؟“ گیٹ پر گھنٹی کی آواز سن کر ظہیر صاحب نے بھی اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے اُن کے پیچے ہی آتے سوال کیا۔

”بابا یہ ارحم بھائی ہیں رابعہ آپی کے میگنیٹر“، انہیں دیکھتے ہی رضا نے جلدی سے اُس کا تعارف کروا یا۔

”میں نے تم سے نہیں پوچھا جس سے پوچھا ہے اُس کی زبان ہے وہ خود جواب دے سکتا ہے“، ایک لڑکے کو نور کے بارے میں دریافت کرتے دیکھ کر ظہیر صاحب کی غیرت نے انہیں پھر سے جھنجھوڑا۔

”انکل میں ارحم ہوں، رابعہ میری کزن ہے اور نور کی دوست۔ وہ دراصل رابعہ کی امی کی طبیعت خراب تھی تو مجھے ایمیر جنسی میں رابعہ کو اپنے ساتھ ہسپتال لے جانا پڑا۔ نور رابعہ کے ڈرائیور کے ساتھ اکیلی نہیں آ رہی تھی تو میں نے اپنے دوست زارون کو نور کو چھوڑنے کا کہہ دیا مگر زارون

غائب ہے اور اُس کا موبائل بھی بند جا رہا ہے اور میں اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوں تاکہ نور سے اُس کے متعلق پوچھ سکوں، پلیز کیا آپ نور کو بلا سکتے ہیں؟“ پوری بات بتاتے ارحام کو ظہیر صاحب کا رویہ کچھ ٹھیک نہیں لگا۔

”لوسُن لو، اب تو یقین ہو گیا ناکہ میں تب سے سچ کہہ رہی تھی کہ لڑکی کسی مصیبت میں نہیں ہے بلکہ گھر سے بھاگ گئی ہے“، کسی لڑکے کے ساتھ نور کا ہونا جہاں ظہیر صاحب اور نائلہ بیگم کے لیے ناقابل یقین تھا وہیں نبیلہ بیگم کے شک کو چنتگی ملتے ہی انہیں مزید باتیں بنانے کا موقع مل گیا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ اور نور کہاں ہے؟ کیا وہ بھی گھر نہیں آئی؟“ نبیلہ بیگم کی بات سے اندازہ لگاتے ارحام نے سوالیہ نظر وہ سے رضا کی جانب دیکھا۔

”نہیں، آپ تو یونیورسٹی سے گھر آئی، ہی نہیں ہم لوگ رابعہ آپی کے گھر گئے تھے ان کے چوکیدار نے کہا کہ وہ لوگ ہسپتال میں ہیں“، ایک نظر ظہیر صاحب کی جانب دیکھتے جو ضبط سے اپنی مٹھیاں بند کرتے والیں اندر جا چکے تھے رضا نے ارحام کو پوری تفصیل سے آگاہ کیا جو نور کی غیر موجودگی کا سُن کر مزید پریشان ہو چکا تھا۔

”پلیز بیٹا میری بیٹی کو تلاش کرو۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہوگی“، ارحم کے سامنے ہاتھ جوڑتے نائلہ بیگم نے فریاد کی۔

”آپ پریشان نہ ہوں وہ ٹھیک ہوگی اور زارون میرا دوست ہے میں اُسے اچھے سے جانتا ہوں وہ کبھی بھی نور کو نقصان نہیں پہنچا سکتا“، ان کے ہاتھ تھامتے ارحم نے تسلی دی تو نائلہ بیگم کے دل کو کچھ ڈھار س ملی۔

”اس سے زیادہ کیا نقصان پہنچائے گا؟ لڑکی رات بھر سے غائب ہے وہ بھی ایک لڑکے ساتھ، توبہ توبہ اللہ معاف کرے پتا نہیں ایسی اولاد پیدا ہوتے ہی مر کیوں نہیں جاتی“، اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے نبیلہ بیگم نے واویلا کیا تو ارحم نے انہیں گھور کر دیکھا۔

”آنٹی پلیز آپ جو بھی ہیں خدا کے لیے خاموش ہو جائیں اور کسی بے گناہ پہ ایسی فضول تہمت لگانے سے پہلے سوچ لیں کہ کل یہ سب کچھ آپ پہ بھی گزر سکتا ہے“، نبیلہ بیگم کی بات پر غصے سے اپنے جڑ پر بھینختے ارحم نے نائلہ بیگم کی حالت دیکھ کر تنبیہ کی۔

”بس بس زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں، میں تم جیسے لڑکوں کو اچھے سے جانتی ہوں جو پہلے تو اپنے دوستوں کا ساتھ دے کر لڑکیوں کو بھاگا دیتے پھر ان کے ہی گھر آ کر اچھا بننے کی ایکٹنگ کرتے تاکہ شک تم لوگوں پہ نہ جائے اور میں کوئی تہمت نہیں لگا رہی جو ہے سب کے سامنے ہے“، کندھے

اچکاتے انہوں نے اپنی غلطی ماننے کی بجائے ارحم کوسائیں جو رضا کے اشارے پر ضبط کرتے اُسے باہر آنے کا کہتے گیٹ سے نکل گیا۔

---

لیٹے لیٹے نور کی آنکھ لگ گئی تو زارون نے ایک نظر اُس کے پر سکون چہرے کو دیکھا جو صبح کے انجمام سے غافل بے خبر سورہی تھی۔

”بابا آپ نے کہیں میرا موبائل دیکھا؟ مطلب جب آپ ہمیں یہاں لے کر آئے تو کہیں نظر آیا ہو آپ کو؟“ ان کو جھونپڑی میں داخل ہوتا دیکھ کر زارون نے ایک آس بھری نظر ان پہ ڈالی۔

”موباہل دیکھا تھا مگر مجھے لگتا ہے کہیں راستے میں گر گیا کیونکہ اُس کے بعد تو میں نے اُسے نہیں دیکھا“، جائے نماز اٹھاتے ہدایت بابا نے پر سوچ انداز میں اُسے آگاہ کیا۔ ”اچھا ٹھیک ہے کوئی بات نہیں“، اک آخری امید نے بھی دم توڑا تو زارون نے سب کچھ اللہ پہ چھوڑ دیا۔

”تمہیں کسی سے بات کرنی ہے تو میں ساتھ والے نو فل کا لادیتا ہوں مگر موسم خراب ہونے کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ بات نہ ہو پائے“، اُسے پریشان دیکھ کر ہدایت بابا نے پیشکش کی۔

”نہیں کوئی بات نہیں آپ نماز پڑھ لیں ویسے بھی صحیح ہونے والی ہے“، رات کے اس پہر اُس بوڑھے شخص کو اپنی وجہ سے مزید تکلیف دینا زارون کو مناسب نہیں لگاتا ہی انکار کرتے اُس نے اُن کے باہر نکلتے ہی اپنا الحاف بھی اُتار کر نور کے اوپر دیا جو سردی کی وجہ سے سمٹ کر لیٹھی تھی۔

”پتا نہیں کیوں پر میرا دل بہت گھبر ا رہا ہے۔ دل کر رہا ہے وقت واپس چلا جائے اور میں کبھی بھی تمہیں اس راستے پر نہ لے کر آؤں جہاں میں نے تمہاری جان تو بچالی مگر شائد ہمیشہ کے لیے تمہیں دنیا کی نظروں میں بدنام کر دیا۔ نور میں ایسا نہیں چاہتا تھا مجھے پتا ہے تم معصوم ہو تمہیں دنیا کی سمجھ نہیں تب ہی تم اتنی پر سکون نیند سور ہی کیونکہ تمہیں یقین ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہارا اعتبار کریں گے اور میں چاہتا ہوں ایسا ہی ہو وہ کبھی تم سے بد گمان نہ ہوں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو؟ نہیں میں اُنہیں یقین دلاؤں گا وہ مان جائیں گے۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا“، اپنی ہی بات کو رد کرتے زارون نے نظر بھر کر اُس لڑکی کو دیکھا جو چند ہی پل میں اُس کے دل میں گھر کر گئی تھی اُس کی فکر اُسے بے چین کر رہی تھی وہ چاہ کر بھی نہ تو اُسے اکیلا چھوڑ سکا تھا اور نہ ہی اب چھوڑنا چاہتا تھا۔

”میں تمہارا ساتھ دونگا کچھ بھی ہو جائے، میں تمہیں اکیلا نہیں چھوڑوں گا“، بے اختیاری میں اُس کے چہرے پر آئے بالوں کو سائیڈ پپ کرتے زارون نے دل کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی اُس کے گال پر ہاتھ پھیرتے اُس کی نرمی کو محسوس کیا۔

”محبت احساس کے بغیر نامکمل ہے اور حبہ کو احساس ہی تو نہیں تھا نہ میرے دل کا نہ میرے جذبات کا تب ہی تو اُس نے مجھے رد کر کے اپنے والدین کو چنا اور پتا ہے کیوں؟“ اُس کی بند آنکھوں کو دیکھتے وہ یوں اُس سے مخاطب ہوا جیسے وہ اُسے سُن رہی ہو۔

”کیونکہ بیٹیاں ماں باپ کی لاج پر اپناسب کچھ قربان کر دیتی ہیں۔ بہت بڑے دل ہوتے ہیں بیٹیوں کے۔ وہ ماں باپ کے انکار پر اپنے جذبات، احساسات، خوشیاں، ماردیتی ہیں اور اُس انسان کی محبت کو بھی جس کے ساتھ کے خواب اُس نے سالہا سال سے دیکھے ہوتے ہیں پر والدین کا سر نہیں جھکنے دیتیں مگر بد لے میں کیا ملتا ہے اُن کو؟ ایک چھوٹی سی بات پہ شک؟ انا کی آڑ میں اذیتیں، کوئی بھی بیٹیوں کے دل میں نہیں جھانکتا کہ اُن پہ کیا گزر رہی سب اپنے اپنے فیصلے سناتے اور شائد صح تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہو“، دل میں اٹھتے خدشوں کو زبان تک لاتے زارون نے دل سے اُسے چہرے پہ قائم سکون برقرار رہنے کی خواہش کی اور ایک گھری سانس لیتے اپنی نظریں اُس کے چہرے سے ہٹاتے پچھے دیور اکے ساتھ ٹیک لگائی اور صح ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

نور کی غیر موجودگی کا سنتے ہی ارحم نے رضا سے اُس کا نمبر لینے کے بعد مزید وقت ضائع کیے بغیر گھر کا رخ کیا تا کہ اس معاملے میں ہاشم صاحب کی مدد لے سکے۔

”اُفف کس کو آفت آگئی اتنی صحیح“، ہاشم صاحب جو کچھ دیر پہلے ہی ایک پارٹی سے واپس آگر سوئے تھے انہوں نے کمرے کے دروازے پر دستک کی آواز سن کر ناگواری سے کلاک کی جانب دیکھا جہاں صحیح کے پانچ نج رہے تھے۔ ”ارحم تم اس وقت؟ کیا ہوا ہے سب خیریت ہے نا؟“ اپنے گاؤں کی ڈوریاں بند کرتے انہوں نے دروازہ کھولتے ہی سامنے کھڑے ارحم کو دیکھ کر فکر مندی کے ساتھ ساتھ حیرت کا اظہار کیا۔

”جی وہ مجھے کام تھا آپ سے“، ایک نظر آئمہ بیگم پر ڈالتے جو ارحم کی آواز پر اٹھ چکی تھیں اُس نے ہاشم صاحب سے کہا۔

”ہاں کہو؟“ جماں روکتے انہوں نے اجازت دی اور دروازہ بند کرتے باہر آئے۔

”وہ آپ کے دوست ہیں ناجوڑی آئی جی ہیں“، بات کے لیے تمہید باندھتے ارحم نے وضاحت دی۔ ”ہاں ہے کیوں کیا ہوا اُسے؟“ اس وقت ان کے ذکر پر ہاشم صاحب نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”زارون رات سے غائب ہے اور اُس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔“ تفصیل میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا پلیزا بھی آپ اپنے دوست کو کال کریں اور اُسے زارون کو تلاش کرنے کا کہیں“، موبائل پر آتی معاذ کی کال کو دیکھتے ارحم نے مدد کی بات پر آتے اپنا مسئلہ بتایا۔

”کہاں غائب ہے اور لڑکی بھی ساتھ؟ یہ کیا بات ہوئی؟“، اُس کی بات پر ہاشم صاحب نے خود کو کسی ناگوار بات کرنے سے باز رکھتے بھنویں اچکائیں۔

”اس بات کی وضاحت میں آپ کو بعد میں دے دوں گا ابھی پلیز آپ میرا یہ کام کر دیں۔ مجھے زارون اور نور ہر حال میں ٹھیک چاہیے ہیں۔ آج تک میں نے آپ سے کچھ نہیں مانگا نہ کہا پر آج مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے ہو سکے تو میری بات کامان رکھ لیجیے گا،“ انہیں کشمکش میں دلکش کر ارحام نے اپنی بات مکمل کی اور کال رسیو کرتے بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔

”پتا نہیں کیا کرتا پھرتا ہے یہ لڑکا،“ کمرے میں واپس آتے ہاشم صاحب نے آئندہ بیکم کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے (جو ان سے ارحم کے آنے کی وجہ پوچھنا چاہتی تھیں) اپنا موبائل اٹھاتے ڈی آئی جی کا نمبر ڈائل کیا تاکہ انہیں مدد کا کہہ سکیں۔

صحح ہوتے ہی زارون نے نور کو جگایا اور ہدایت بابا کے ساتھ جنگل سے ہوتے ہوئے باہر سڑک کی جانب بڑھے۔ تقریباً ایک گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد وہ سڑک پر پہنچے تو نور نے وہیں بیٹھتے اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کی۔

”بہت شکر یہ آپ کا، میں زندگی بھر آپ کا مشکور ہوں گا“، ہدایت بابا کے ساتھ ہاتھ ملاتے زارون نے اُن کا شکر یہ ادا کیا۔

”کوئی بات نہیں انسان ہی انسان کے کام آتا ہے اور یوں بار بار شکر یہ کہہ کر میری نیکی کو رائیگاں مت کرو“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہدایت بابا نے کچھ فاصلہ پر لوگوں کو اکٹھا دیکھ کر زارون کو رکنے کا کہتے اُس جانب قدم بڑھائے۔

”نور اٹھ جاؤ“، ہدایت بابا کے جاتے ہی زارون نے اُسے وہیں جماد دیکھ کر کہا۔

”مجھ سے نہیں چلا جاتا اور...“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے ہتھیار ڈالے۔

”اٹھ جاؤ پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے اب ہم مزید دیر نہیں کر سکتے“، ہدایت بابا کو واپس اپنے قریب آتا دیکھ کر زارون اُس سے کہتے ساتھ ہی اُن کی جانب متوجہ ہوا۔

”کیا ہوا سب خیریت ہے؟“

”نہیں، پہاڑی کے دوسری جانب سے کسی بندے کی لاش ملی ہے اور ساتھ ایک گاڑی بھی“، تیز تیز سانس لیتے انہوں نے زارون کو بتایا۔

”گاڑی؟ وہ ہماری گاڑی ہے اور لاش ڈرائیور کی ہو گی“، اُن کی بات سنتے ہی زارون نے اُن کے ساتھ ہی قدم اُس جانب بڑھائے جہاں کچھ آدمی کھڑے تھے۔

”وہی ہے...“، ان کو سائیڈ پر کر کہ زارون نے آگے جاتے تصدیق کی۔

”گاڑی کہاں ہے؟“ اس کی بات سنتے ہی ہدایت بابا نے ان میں سے ایک آدمی سے پوچھا جو ان کی پہچان کا تھا۔

”گاڑی تو وہیں ہے، ہم تو بس اس آدمی کو ہی لائے تاکہ پولیس چوکی تک پہنچا سکیں،“ انہیں جگہ کے بارے میں بتاتے اس آدمی نے تفصیل بتائی تو ہدایت بابا نے زارون کو وہاں سے نکالا۔

”چلو میرے ساتھ“، نور کو آواز لگاتے انہوں نے زارون کو اپنے پیچھے آنے کا کہا جو اس ڈرائیور کو دیکھ کر افسر دہ ہو چکا تھا۔

”بابا کہاں جا رہے ہیں ہم؟“ ان کے پیچھے چلتے زارون نے استفسار کیا تو ہدایت بابا نے دوسری جانب اشارہ کیا۔

”وہاں تم لوگوں کی گاڑی کھڑی ہے بس تم لوگ اپنی گاڑی میں بیٹھو اور گھر جاؤ، اس جگہ پر مزید رکنا تم لوگوں کے لیے مناسب نہیں“، تیز قدم اٹھاتے ہدایت بابا نے زارون کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”پر میں ایسے اُن کی لاش کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا پہلے ہی ہماری وجہ سے اُن کی جان گئی اور اب میں اُن کی لاش کو یہی چھوڑ کر مزید خود غرضی نہیں برت سکتا“، اُن کی بات سنتے ہی زارون نے اپنے قدم روکے۔

”بیٹا یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ میں نہیں جانتا کون کم بخت تم لوگوں کے پیچھے پڑا ہے مگر جو بھی ہے وہ دوبارہ بھی یہاں آسکتا ہے اس لیے جتنی جلدی ہو سکتا ہے تم لوگ یہاں سے نکل جاؤ اور رہی بات لاش کی تو ہم لوگ اُسے پولیس چوکی تک پہنچادیں گے“، ہدایت بابا نے اُسے تسلی دی اور اپنے ساتھ لیے گاڑی تک آئے جورات چھوڑی گئی حالت میں، ہی وہاں موجود تھی۔

”بس اپنا خیال رکھنا“، نور کے سر پہ ہاتھ رکھتے انہوں نے زارون کوتا کید کی جواہیک بار پھر سے اُن کا شکر یہ ادا کرتے چاہی تلاش کرنے لگا جو اُسے نیچے ہی سڑک پر ہی پڑی مل گئی تھی۔

-----

”ماما پلیز خود کو سنبھالیں“، صبح کی کرنوں کے ساتھ ہی نائلہ بیگم کی حالت مزید بگڑی تو رضا نے ارحام کو پھر سے کال ملائی۔

”ارحم بھائی کچھ پتا چلا؟“، گلاس میں پانی ڈالتے اُس نے دوسری طرف کا لریسیو ہوتے ہی سوال کیا۔

”نہیں یا رکچھ پتا نہیں چلا، مگر تم پریشان نہ ہو پولیس تلاش کر رہی ہے۔ میں بھی رات سے لگا ہوں ان شاء اللہ وہ دونوں جلد مل جائیں گے“، ایک نظر اپنے ساتھ بیٹھے معاذ کو دیکھتے ارحم نے تسلی دی۔

”بس پلیز جیسے ہی کوئی خبر ملے مجھے بتائیے گا“، اُسے تاکید کرتے رضا نے کال بند کی اور کمرے میں آیا جہاں نائلہ بیگم جائے نماز پر بیٹھی اللہ کے سامنے گڑ گڑارہی تھیں۔ ”ماما پلیز تھوڑا پانی پی لیں“، گلاس اُن کے لبوں سے لگاتے رضا نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی۔

”نہیں مجھے نہیں پینا پانی، مجھے میری بیٹی چاہیے۔ میری نور..“، گلاس کو ہاتھ مارتے نائلہ بیگم زور سے چلا نئیں تو رضا کی آنکھیں بھی نہ ہو گئیں۔

”پلیز ماما ایسا نہ کریں ورنہ میری ہمت بھی جواب دے جائے گی“، باپ کی طرف سے رات سے بر قی جانے والی بے رخی کو سوچتے رضا نے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔

”بند کرو یہ ڈرامے اور اٹھ کر تد فین کا انتظام کرو“، گلاس کے ٹوٹنے کی آواز سنتے ظہیر صاحب نے کمرے میں آتے اُن دونوں پر گر جتے ہوئے زمین پر پڑے کاچ کے ٹکڑوں کو دیکھا۔

”بابا پلیز ایسی باتیں مت کریں۔ ارحم بھائی کو شش کر رہے ہیں آپی جلد ہی مل جائیں گی“، ان کی بات سن کرتظر پتے ہوئے رضانے انہیں امید دلائی۔

”مل بھی گئی تو میں اُس بد کردار کو کبھی بھی اپنے گھر میں قدم نہیں رکھنے دوں گا اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں اُس کی بدنامی کو موت کارنگ دے کر میری رہی سہی عزت کو بچالو اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو میں خود کو پھانسی لگالوں گا“، اٹل لمحے میں کہتے ظہیر صاحب نے اپنا فیصلہ سنا یا اور ان دونوں کو بے جان بیٹھا چھوڑ کرے سے نکل گئے۔

”رضا اپنے بابا کو کہو، ایسا مت کریں۔ میں مر جاؤں گی“، ان کے جاتے ہی نائلہ بیگم نے ساکت ہوتی نظروں سے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے جو ظہیر صاحب کے ذہن کی اس قدر پستی دیکھ کر شرمندگی سے نظریں جھکا گیا تھا۔

زخم سے نکلتے خون کی پرواہ کیے بغیر زارون نے نور کے بتائے ہوئے راستوں پہ گاڑی چلاتے آنے والے وقت کے لیے اپنے آپ کو مضبوط کیا۔

”رُک جائیں زاریہ دیکھیں میراگھر“، اُسے اپنے ہی دھیان میں ڈرایو کرتا دیکھ کرنور نے خوشی سے باہر کی جانب اشارہ کیا تو زارون نے ہوش میں آتے بریک لگائی۔

”نور میری بات سنو...“، اُسے دروازہ کھول کر باہر نکلتا دیکھ کر اُس نے آواز دی۔

”جی کیا ہوا؟“، اپنا ہاتھ روکتے اُس نے پلٹ کر زارون کی جانب دیکھا۔

”پلیز اپنا خیال رکھنا اور گھروں کو سب سچ سچ بتادینا۔ میں یہیں ہوں اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے بلا لینا“، اُس کے چہرے کی چمک دیکھ کر زارون نے اپنے دل میں اٹھنے والے خدشات کے پیش نظر اُسے نصیحت کی۔ ”نہیں آپ جائیں آپ کے گھروں لے بھی پریشان ہوں گے۔ میں خود ہی بتادوں گی سب کو۔ میرے بابا بہت اچھے ہیں جب انہیں پتا چلے گا کہ ان گندے آدمیوں نے مجھے ڈرایا تو دیکھیے گا کیسے ان کی پٹائی کرتے ہیں“، اُس کی بات کو سُن کر نور نے ایک عزم کے ساتھ کہا اور گاڑی سے نکل کے گیٹ کے پاس جاتے بیل پہ ہاتھ رکھا تو زارون نے بھی گاڑی ایک سائیڈ پہ لگائی اور باہر نکل آیا۔

”زار میں نے آپ سے کہانا کہ آپ جائیں میں خود ہی بتادوں گی“، اُسے اپنے قریب آتا دیکھ کر نور نے ایک بار پھر سے اُسے اپنی جانب سے مطمئن کیا۔

”نہیں، میں تمہارے گھروالوں کو سب بتا کر تمہیں اُن کے حوالے کر کہ جاؤں گا“، سنجیدگی سے کہتے زارون نے گیٹ کھلنے کی آواز پر پلٹ کر دیکھا۔

”خالہ آپ کب آئیں؟“ سامنے کھڑی خاتون کے گلے لگتے نور نے چہکتے ہوئے پوچھا جو اسے دیکھ کر ہکابا سی کھڑی رہ گئیں۔

”اما کہاں ہیں؟ مجھے پتا وہ بہت پریشان ہوں گی“، اُن سے الگ ہوتے نور نے اپنی ہی دھن میں بولتے نائلہ بیگم کو آواز دی۔

”نور میری جان“، اس کی آواز پر رضا کے ساتھ ساتھ نائلہ بیگم بھی حیران و پریشان سی کمرے سے باہر آئیں اور بازو پھیلاتے اُسے گلے لگانا چاہا مگر ظہیر صاحب کو دیکھتے ہی رک گئیں جو ان دونوں کے درمیان آکھڑے ہوئے تھے۔

”بابا..“ آگے بڑھتے نور نے اُن کے سینے پہ سر رکھتے رو نا شروع کر دیا۔

”بابا وہ آدمی بہت بُرے تھے اُنہوں نے اُس ڈرائیور انکل کو مار دیا اور زار کو بھی گولی ماری۔ وہ مجھے لے جانا چاہتے تھے مگر زار نے مجھے بچایا۔ وہ مجھے وہاں جنگل میں لے گئے۔ مجھے بہت ڈر لگا تھا میں نے آپ کو، ماما کو اتنا یاد کیا۔ مجھے پتا تھا آپ سب میری وجہ سے پریشان ہوں گے پر...“، بات

ادھوری چھوڑتے اُس نے اُن کے سینے سے سر اٹھاتے دوپٹے سے اپنی ناک صاف کی اور واپس بولنے لگی۔

”پر زار بے ہوش ہو گئے اُن کو گولی لگی تھی نا اس لیے اور پھر مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ میں کیا کروں میں نے اللہ سے دعا کی تب ہی ایک انکل نے ہماری مدد کی وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے تھے“، بولتے بولتے نور نے ایک نظر ان سب کے خاموش چہروں پہ ڈالی اور ظہیر صاحب سے الگ ہوتے نا ملہ بیگم کی جانب بڑھی جو جہاں نور کو دیکھ خوش تھیں وہیں ظہیر صاحب کے چہرے کے سرد تاثرات کو دیکھ کر خوف زدہ بھی۔

”ما آپ روئیں مت دیکھیں میں اب آگئی ہوں نا اور ٹھیک بھی ہوں“، اُن کی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو ہاتھ سے صاف کرتے نور نے اُنہیں تسلی دی جو اسے اپنے ساتھ لگاتے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں تھیں۔

”ما پلیز نہ روئیں پھر مجھے بھی رونا آجائے گا“، اُن کے ساتھ لگے نور نے اپنی آنسوؤں کو آنکھوں کے بند توڑنے سے روکا اور رضا کا ہاتھ تھامتے اُسے اپنے قریب کیا جس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف در آیا تھا۔

”بابا پلیز، ایسا مت کریں“، ظہیر صاحب کو جیب سے گن نکالتا دیکھ کر جہاں رضا نے نور کا ہاتھ چھوڑتے انہیں سنبھالا وہیں نائلہ بیگم سے الگ ہوتے نور نے پلت کر ان کی جانب دیکھا جو رضا کو دھکا دے کر صوفے پہ گراتے گن کا رخ نور کی جانب کر چکے تھے۔

”میری عزت کا جنازہ نکالنے اور ساری رات کسی غیر مرد کے ساتھ باہر رہنے کے بعد تم نے سوچا بھی کیسے کہ میں تمہیں معاف کر دوں گا؟ میں ان بے غیرت باپوں میں سے نہیں جو بیٹی کی غلطی پر پردہ ڈالتے ہے شرم بن جائیں“، دانت پیستے ظہیر صاحب نے فائر کیا جو زارون کے بروقت وہاں آنے سے نور کی بجائے اوپر ہوا میں چلتے چھت کے پار ہو گیا۔

”انکل پلیز میری بات سنئیں، ایسے کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر بیٹی کو سزا سُنادینا کہاں کا انصاف ہے؟“، اپنے زخم کی پرواہ کیے بناء زارون نے پوری طاقت لگاتے ان کے ہاتھ سے گن جھپٹی۔

”تم ہوتے کون ہو مجھے یہ سبق پڑھنے والے اور تمہاری جراءت کیسے ہوئی ہمارے گھر کے معاملے میں بولنے کی“، اس کو گریبان سے پکڑتے ظہیر صاحب نے غصے کے سبب چیختنے ہوئے اُسے چھنچھوڑا۔

”پلیز میری بات تحمل سے سُن لیں۔ میں زارون ہوں اور میں ہی نور کے ساتھ تھا،“ انہیں تیش میں دیکھ کر زارون نے حتی الامکان اپنے اعصاب کو نارمل رکھتے تعارف کروا یا جس پر ظہیر صاحب مزید آگ بگولہ ہو چکے تھے۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی میرے گھر میں قدم رکھنے کی،“ اُس کی گردان کو اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لیتے ظہیر صاحب کی آنکھوں میں خون اُتر چکا تھا۔

”بابا چھوڑیں کیا کر رہے ہیں آپ،“ رضا کے ساتھ ساتھ عدیل (جو ابھی ابھی گھر آیا تھا) نے بھی آگے بڑھتے زارون کو ان کی گرفت سے آزاد کیا۔

”میں ان دونوں کو جان سے مار دوں گا۔ میری عزت کو نیلام کرتے میرے ہی سامنے کھڑے ہو کر جھوٹی کہانیاں سنارہے ہیں۔ نور تم مر کیوں نہیں گئیں ایسا کام کرنے سے پہلے؟ کیا کمی تھی میری تربیت میں جو تم نے ایسا قدم اٹھایا؟“ نبیلہ بیگم کی باتوں اور رابعہ کے گھرنہ ہونے کی بات نے ظہیر صاحب کے دماغ پہ ایسا پر دہڑالا کے انہیں صحیح اور غلط کی پہچان تک بھول گئی۔

”با۔۔۔ بامی۔۔۔ س۔۔۔ چ بو۔۔۔ ل ر۔۔۔ ہی ہوں،“ ان کے منہ سے اپنے بارے میں ایسی باتیں سُن کر نور کی آواز اُس کے گلے میں ہی کہیں دب گئی تھی۔

”انکل پلیز آپ سکون سے میری بات سُن لیں آپ کی ساری غلط فہمی دور ہو جائے گی“، زارون نے پھر سے آگے بڑھتے انہیں صفائی دینا چاہی۔

”مجھے کچھ نہیں سننا“، ہاتھ اٹھاتے ظہیر صاحب نے اُسے آگے بڑھنے سے روکا۔

”نور بے گناہ ہے اور یہ جیسی پاکیزہ گھر سے گئی تھی ویسے ہی لوٹی ہے اس لیے اس پہ نہ صحیح اپنی تربیت پہ ہی یقین رکھیں کہ آپ کی بیٹی آپ کا سر کبھی نہیں جھکا سکتی“، اُن کے روکنے کے باوجود بھی زارون نے آگے بڑھتے انہیں سمجھنا چاہا۔

”پاکیزہ...؟ یہیں کافی طرح نازک ہوتی ہیں اور اُن کی عزت کافی سے بھی زیادہ نازک اور بیٹی چند بیل دیر سے آئے تو لوگ تب باتیں بنانے سے باز نہیں آتے اور یہاں تو پوری رات باہر گزاری ہے وہ بھی ایک مرد....“، نفرت سے اُس کی جانب دیکھتے ظہیر صاحب نے اپنی بات ادھوری چھوڑی جو نور کے اعصاب پر کسی ہتھوڑے کی مانند لگی تھی۔

”میں نے آپ سے کہانا کہ آپ کی بیٹی بے قصور ہے سب کچھ ایک پلان کے تحت اُس کے ساتھ ہوا اگر میں اُن لوگوں سے اسے نہ بچاتا تو بتا نہیں اس کے ساتھ اب تک کیا کچھ ہو چکا ہوتا اور ہی بات پوری رات کی تو مجھے احساس ہے آپ کی تکلیف کا۔ بیٹی کا یوں غائب ہو جاناماں باپ کے دل میں کئی خدشات پیدا کر دیتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اُن کو صفائی کا ایک موقع بھی نہ دیا جائے اور

اپنی عزت اور غیرت کے نام پر ان کے بے قصور ہونے پر بھی ان کو سزا مندی جائے۔ پیزا نکل آپ جیسا ثبوت جیسی قسم چاہتے ہیں میں اٹھانے کے لیے تیار ہوں مگر نور کو سزا مند دیں اور ٹھنڈا دماغ سے میری بات سنیں آپ کو خود ہی سمجھ آجائے گی اس سارے معاملے میں آپ کی بیٹی کا کوئی قصور نہیں ہے،” ظہیر صاحب کو خاموش دیکھ کر زارون نے اپنی بات جاری رکھی۔

”آپ چاہیں تو میرے ساتھ چلیں میں آپ کو ڈرائیور کی لاش دیکھا سکتا ہوں اور ان لوگوں سے بھی ملو سکتا ہوں جسنوں نے ہماری مدد کی،“ سرخ ہوتی پڑی کو ایک نظر دیکھتے زارون نے اپنے درد کی پروادی کیے بناء ہر بات دلیل کے ساتھ ظہیر صاحب کے سامنے رکھی۔

”مجھے کچھ نہیں جاننا بس میں آج کے بعد اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا اور نہ ہی تمہاری، اس لیے اسے ساتھ لو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ،“ اپنا فیصلہ سناتے انہوں نے ایک سخت نظر نور پر ڈالی جو بے یقینی کی سی کیفیت میں آنکھوں میں آنسو لیے کھڑی تھی۔

”بابا، میں نے کچھ نہیں کیا اور آپ مجھے مار دیں مگر میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی،“ ان کو جاتا دیکھ کر نور نے ان کے سامنے آتے راستہ روکا۔

”دل تو یہی تھا کہ مار کہ یہی زندہ دفن کر دوں مگر جان سے پیاری اولاد کو موت دینا اتنا بھی آسان نہیں ہوتا اس لیے خدا کے لیے یہاں سے چلی جاؤ اور اگر ہماری زراسی بھی پرواد ہے تو کبھی لوٹ

کرمت آنا، اُس کا چہرہ اپنے ہاتھ میں لے کر زور سے دباتے ظہیر صاحب نے نفرت سے کہتے اُسے جھٹکا تو نور کی تمام تر ہمتیں جواب دے گئیں۔ ”ٹھیک ہے اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو پلیزا پنے سامنے اپنی بیٹی کا نکاح میرے ساتھ پڑھواں دیں تاکہ دل نہ صحیح پر آپ کا ضمیر ہی مطمئن ہو کہ آپ کی بیٹی ایک پاکیزہ رشتے میں میرے ساتھ بندھی ہے اور ہو سکتا ہے کل کو آپ کی سوچ سے انا اور غیرت کا پردہ ہے تو آپ کو سب صاف دیکھائی دینے لگے تب جا کر آپ کو احساس ہو کہ بیٹیاں اتنی بھی بے اعتبار نہیں ہوتی کہ ان کی ایک غلطی کے بد لے ان کو اپنی ذات سے اور گھر سے بے دخل کر دیا جائے، اُنہیں کمرے کی جانب جاتا دیکھ کر زارون نے آگے بڑھتے روکا۔ ”نکاح؟ واہ بھی تم لوگ نکاح کے بغیر ہی ساری رات ایک دوسرے کے ساتھ گزار آئے ہو؟“ منه پہ ہاتھ رکھتے نبیلہ بیگم نے حیرت سے ظہیر صاحب کے غصے کو مزید ہوادی۔

”خالہ بس کریں آپ کو شرم آئی چاہیے ایسی فضول بات کرتے ہوئے اور اگر آپ ہمارا ساتھ نہیں دے سکتیں تو ہمارے زخموں پہ نمک چھڑ کنے کا کام بھی مت کریں،“ ان کی بات سننے رضا کی برداشت جواب دے گئی اس لیے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر اُس نے نبیلہ بیگم کو چپ کروا یا۔

”زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے بہن نے پہلے کم بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے جو تم بھی اپنی بد لحاظی دیکھا کر ماں باپ کو مزید شرمندہ کر رہے ہو اور رہی بات شرم کی تو بیٹا جی شرم تمہاری بہن کو آئی چاہیے جس نے اب تک پتا نہیں کس کس کے ساتھ منہ کالا....“

”بس باجی اس کے آگے اور کچھ مت کہیے گا ورنہ میں بھول جاؤں گی کہ آپ مجھ سے بڑی ہیں“، انہیں ترخ کر بولتے دیکھ کر نائلہ بیگم نے اب کی بار ظہیر صاحب کی زبان پر لگے تالے کو وجہ سے خود ہی ہمت کرتے نبیلہ بیگم کا بازو پکڑا اور انہیں وہاں سے باہر نکال دیا۔

”آج کے بعد میر آپ سے کوئی رشتہ نہیں آپ میرے لیے مر گئیں اور میں آپ کے لیے اس لیے دوبارہ پلٹ کر یہاں آنے کی کوشش مت کریں گا“، ہاتھ جوڑتے نائلہ بیگم نے ان کی بڑھتی تھتوں سے تنگ آتے کہا اور عدیل کے باہر نکلتے ہیں دروازہ بند کر کے اندر آگئیں جہاں ظہیر صاحب زارون کو اگلے ایک گھنٹے میں نکاح کا کہہ کے کمرے میں جا چکے تھے۔

-----

”ماما پلیز بابا کو سمجھائیں میرے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں نے سچ میں کچھ نہیں کیا۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ میں آپ لوگوں کے بغیر کیسے رہوں گی۔ میں مر جاؤں گی پلیز خدا کے لیے ایسا مت کریں“، نائلہ بیگم کے پاؤں پڑتے نور نے انہیں اپنی بے گناہی کا یقین دلانا چاہا۔

”مجھے پتا ہے میری جان کہ تم نے کچھ نہیں کیا مگر یہ دنیا اب نہ تو ہمیں چین سے رہنے دے گی اور نہ ہی تمہیں اس لیے جو فیصلہ ہو چکا ہے اُسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر مان لو“، اُسے نیچے سے اٹھا کر اپنے سینے سے لگاتے نائلہ بیگم نے سمجھایا اور اپنے ساتھ لیے کمرے میں چل گئیں۔

”مجھے کال کرنی ہے پلیز اپنا مو باکل دے دو“، ان دونوں کے اندر جاتے ہی زارون نے پاس کھڑے رضا سے کہا۔

”یہ لیں، آپ ٹھیک ہیں نا؟“، اُس کی پٹی سے نکل کر ہاتھ پہ بہتے خون کو دیکھتے رضانے ہمدردی سے پوچھا۔

”جی ٹھیک ہوں“، جواب دیتے زارون نے احمد صاحب کا نمبر ڈائل کیا جو دوسرا بیل پہ ریسیو ہوا۔

”السلام علیکم ابو میں زارون بات کر رہا ہوں“، دوسرا نمبر ہونے کی وجہ سے زارون نے سلام کے ساتھ اپنا تعارف کروا یا۔

”زارون بیٹا کہاں ہو تم؟ ٹھیک ہونا؟ رات سے ہم لوگ تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پا گل ہو گئے ہیں۔ یہ نمبر کس کا ہے؟ کہاں سے بات کر رہے ہو تم؟“ اُس کی آواز سنتے ہی احمد صاحب نے بے چینی سے ایک ساتھ کئی سوال پوچھے۔

”میں ٹھیک ہوں اور آپ کو ایک ایڈر لیں سینڈ کر رہا ہوں پلیز آپ معاذ کو ساتھ لے کر یہاں آ جائیں“، اُن کے سوالوں کا جواب کسی اور وقت پر چھوڑتے زارون نے مدعے کی بات پر آتے کہا۔ ”اچھا ٹھیک ہے تم سینڈ کرو ہم آتے ہیں“، سامنے سے معاذ کے ساتھ ساتھ ارحم کو بھی بیر و نی دروازہ عبور کرتے دیکھ کر احمد صاحب نے زارون کو جلدی ایڈر لیں سینڈ کرنے کا کہتے کال کاٹ دی۔

”کیا ہوا کس کافون تھا؟“ احمد صاحب کی آخری بات سنتے معاذ نے اُن کے قریب آتے پوچھا۔ ”زارون کا تھا، کہہ رہا ہے ایک ایڈر لیں سینڈ کر رہا ہوں آپ معاذ کو لے کرو ہاں آ جائیں“، جواب دیتے احمد صاحب نے زارون سے ہونے والی بات کے متعلق اُن دونوں کو اگاہ کیا جو رات سے شہر کا کونا کونا چھان کرنا امید ہو کر لوٹتے تھے۔

”کہاں ہے زارون وہ ٹھیک ہے نا اور نور؟“ اُن کی بات سنتے ہی ارحم نے بے چینی سے استفسار کیا۔

”ہاں ٹھیک ہے یہ دیکھو اگیا مسج“، موبائل کی بیپ پر مسج اوپن کرتے احمد صاحب نے دیکھا۔  
 ”یہ تو نور کے گھر کا ایڈر میں ہے“، اسکرین کی جانب دیکھتے ہی ارحم نے موبائل احمد صاحب کے  
 ہاتھ سے لیتے مسج کو ایک بار پھر سے پڑھا۔

”نور وہی لڑ کی جو زارون کے ساتھ تھی؟“، معاذ نے بھی مسج دیکھتے ارحم سے تصدیق چاہی جس  
 نے سر ہلاتے باہر کا رخ کیا۔

”اللہ خیر کرے بس سب ٹھیک ہو“، عابدہ بیگم (جورات سے سکون آور دوائی کے زیر اثر سورہ ہی  
 تھیں) کو کمرے سے باہر آتا دیکھ کر احمد صاحب نے ایک کام کا بتاتے معاذ اور ارحم کے پیچھے ہی باہر  
 کی جانب قدم بڑھائے۔

-----

اُن تینوں کے وہاں پہنچتے ہی زارون نے اُنہیں تمام حالات سے آگاہ کیا تو احمد صاحب نے بیٹی کے  
 فیصلے پر فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے ارحم اور معاذ کو نکاح کا انتظام کرنے کا کہا۔ ”ہم بس آدھے گھنٹے  
 میں سب انتظام کر کہ آتے ہیں۔ آپ زارون کے ساتھ یہی روکیں“، موقع کی نازکت کو سمجھتے

ار حم نے احمد صاحب کو وہیں رکنے کا کہہ کے معاذ کو ساتھ لیا اور نکاح کے انتظامات کرنے چلے گئے۔

”تم ٹھیک ہونا؟ چلو جب تک ار حم اور معاذ واپس آتے ہیں میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہوں“، اُس کی سرخ پٹی کو دیکھتے احمد صاحب نے اصرار کیا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں آپ پریشان نہ ہوں“، انہیں صوفے پر بیٹھنے کا کہتے زارون نے تسلی دی اور رضا کی جانب متوجہ ہوا جو نور کو دیکھنے کمرے میں گیا تھا۔

”السلام علیکم“، لاونچ میں آتے اُس نے احمد صاحب کو دیکھتے ہی سلام کیا۔

”ابو یہ رضا ہے نور کا بھائی اور رضا یہ میرے ابو ہیں“، ان دونوں کا تعارف کرواتے زارون نے رضا کے دیے گئے ٹشو سے اپنا ہاتھ صاف کیا۔

”میں ماما کو بتا کر آتا ہوں۔ آپ لوگ بیٹھیں“، ٹشو کا ڈبہ زارون کے پاس ہی رکھتے وہ واپس کمرے کی جانب بڑھا۔

”ابو آپ کو میرے فیصلہ سے کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“، اُس کے جاتے زارون نے احمد صاحب کی جانب متوجہ ہوتے ان کی مرضی معلوم کی۔

”نہیں، اعتراض مجھے تمہارے فیصلہ پہ نہیں ہے بلکہ وقت پر ہے جس نے ایسے حالات پیدا کیے کہ ایک باپ کو اپنی بیٹی سے بدگمان کر دیا۔ تمہارا فیصلہ بالکل ٹھیک ہے کیونکہ آج تم اُس بچی کو بے سہارا چھوڑ دیتے جس پر تمہارے نام کی تہمت لگی ہے تو شاید خود کو بھی کبھی معاف نہیں کر پاتے اس لیے پر سکون رہوا گر تمہارا دل اس فیصلہ پر مطمئن ہے تو نہ تو مجھے کوئی اعتراض ہے اور نہ ہی کسی اور کو ہو گا“، سلیحہ ہوئے الفاظ میں زارون کو تسلی دیتے احمد صاحب نے اپنی طرف سے بے فکر کیا۔

”میں مطمئن ہوں کیونکہ ایسے حالات کا اندازہ مجھے پہلے سے ہی تھا۔ اس میں نور کے ابو کا بھی کوئی قصور نہیں اُن کا غصہ اور رد عمل ٹھیک ہے کوئی بھی باپ جتنا بھی مضبوط ہو پر بیٹی کے اس طرح غائب ہونے پر کچھ وقت کے لیے ڈگما جاتا ہے اور مجھے بھی یہی لگ رہا کہ انکل کا یہ غصہ وقتو ہے وہ بہت جلد اس بات کو سمجھ جائیں گے کہ نور غلط نہیں ہے پر ابو نور کے لیے یہ وقت بہت مشکل ہے اور اگر میں بھی اُس کا ساتھ چھوڑ دیتا تو شاید وہ زندگی میں کبھی سر اٹھا کر چلنہ پاتی، بس مجھے اچھا نہیں لگا کہ میری وجہ سے اُسے کوئی تکلیف پہنچے اور آپ اُسے دیکھیں گے نا تو یقین ہی نہیں کریں گے اس قدر معصوم انسان پر بھی کوئی شک کر سکتا ہے“، نور کے کردار کی گواہی دیتے زارون نے احمد صاحب کے دل کو مزید صاف کیا۔

”ہم جانتا ہوں یہیں معموم ہی ہوتیں اور تم پریشان نہ ہو جب تک میں ہوں تمہیں یا نور کو کوئی کچھ نہیں کہے گا“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے مسکراتے ہوئے اُس کے خدشوں کو دور کیا۔

”مجھے امی کی طرف سے ڈر ہے تھوڑا“، انہیں اپنی وضاحتوں کی وجہ بتاتے زارون نے دماغ میں چلتی بات کو بیان کیا۔

”کچھ نہیں کہتی امی تمہاری، میں نے کہانا میں سب کو جواب دے لوں گا بس تم اپنے فیصلے پر مطمئن رہو“، رضا کے ساتھ ایک عورت کو آتا دیکھ کر احمد صاحب نے اپنی بات ادھوری چھوڑی اور زارون کے تعارف کروانے پر نائلہ بیگم کو تسلی دینے لگے جو کل سے بیٹی کی فکر اور ظہیر صاحب کے رویے کی وجہ سے رورو کر نہ ڈھال ہو چکی تھیں۔

-----

نکاح خواں نے نکاح پڑھایا تو ظہیر صاحب نے کسی سے بھی ملے بغیر وہاں سے اٹھ کر جانا چاہا مگر احمد صاحب نے انہیں ہاتھ پکڑتے روکا۔

”بیٹی کو سر پہ ہاتھ پھیر کر رخصت کریں گے تو اس کا دل پر سکون رہے گا۔ بے شک بعد میں آپ اُس سے کبھی نہ ملیں پر اس وقت اُس سے یہ ملال مت دیجیے کہ آپ اُسے اپنے گھر سے اور دل سے

بے اعتبار کر کہ بھیج رہے ہیں،“، بہت نرمی سے احمد صاحب نے ظہیر صاحب کو سمجھایا جو ان کا ہاتھ جھکلتے غصے سے لمبے ڈگ بھرتے وہاں سے جا پکے تھے۔ یہ ”انکل کا دماغ لگتا کچھ زیادہ ہی خراب ہے“، ظہیر صاحب کی حرکت پر ارحم کی زبان پر کھجلی ہوئی۔

”شرم کرو...“، معاف نے رضا کی موجودگی دیکھتے ہوئے اُسے کہنی مارتے آنکھیں دکھائیں جو حالت اس قدر سنجیدہ ہونے کے باوجود بھی خود کو روک نہیں پایا تھا۔

”شرم ہی کر رہا، نہیں تو جیسی تمہارے بھائی کی کرتوتیں ہیں دل کر رہا یہی کھڑے کھڑے قتل کر دوں اس کا۔ تو بہ کتنا تیز ہے میری ہی بہن پر نظر رکھی اور مجھے خبر تک نہیں ہونے دی“، دانت پسیتے ارحم نے آخری بات اپنے منہ میں بڑھا دی۔

”بس کرو زیادہ جلنا بھی صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا“، اُس کے چہرے کے زاویوں کو دیکھتے ہی زارون نے اُس کے اندر چلتے خیالات کا اندازہ لگایا۔

”بس ہی کر رہا وہ بھی انکل کی وجہ سے ورنہ جو گیم تم نے میرے ساتھ کھیلی ہے ساری زندگی معاف نہیں کروں گا“، بغل گیر ہوتے ارحم نے اُس کے کان کے قریب سر گوشی کی تو زارون کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”میں نے کوئی گیم نہیں کھیلی یہ سب اللہ کا فیصلہ تھا“، اُس کی بات کامفہوم سمجھتے زارون نے قدرے تحمل سے جواب دیا اور نائلہ بیگم کی جانب متوجہ ہوا جو نور کو لے کر لاونج میں آئیں تھیں۔

”بھائی صاحب پلیز میری بیٹی کا خیال رکھیے گا“، شوہر کے ہاتھوں بے بسی کی انتہا پر جاتے نائلہ بیگم نے بیٹی کو انجان لوگوں کے حوالے کیا۔

”آپ فکرنا کریں ہم نور کا اپنی بیٹیوں کی طرح خیال رکھیں گے اور آپ کا جب دل ہو آپ اس سے مل سکتی ہیں ہماری طرف سے کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں ہے“، نور کے سر پہ ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے نائلہ بیگم کو دلاسہ دیا جو بیٹی کو بالکل خاموش دیکھ کر کافی پریشان تھیں۔

”اپنا خیال رکھنا“، اُسے اپنے ساتھ لگاتے نائلہ بیگم نے اپنے آنسوؤں کو روکا جو جگر کے ٹکڑے کو اس طرح کسی غیر لوگوں کے ہاتھوں سونپتے اندر تک کانپ چکی تھیں۔

”زارون، نور کو لے کر باہر آجائو“، احمد صاحب نے اُسے خاموش کھڑاد دیکھ کر کہا اور رضا کے ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھے جو بہن کو اس طرح منٹوں میں پرایا ہوتا دیکھ کر رونے لگا تھا۔

”آنٹی پلیز آپ اپنا خیال رکھیے گا اور انکل کو سمجھانے کی کوشش کریے گا“، نائلہ بیگم کو روتا دیکھ کر زارون نے اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے کہا۔

”ہم تم بھی میری بیٹی کا خیال رکھنا“، اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر جس میں ماں کو روتا دیکھ کے بھی ایک آنسو نہیں نکلا تھا نائلہ بیگم نے زارون سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے نور کا ہاتھ تھا میں اُسے ساتھ لیے باہر کی جانب بڑھا جہاں احمد صاحب اُنہی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

”آپ پلیز اپنا خیال رکھیے گا اور بابا کی فکر مت کریے گا وہ کچھ دنوں میں خود آپ سے ملنے آجیں گے“، اُسے اپنے ساتھ لگاتے رضانے تسلی دی تو نور کی آنکھوں میں نرمی آئی اور آنسو خود بخود رخساروں پہ بہہ نکلے۔

”تم بھی اپنا خیال رکھنا“، ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رکڑتے با مشکل اُس نے اپنی بات مکمل کی اور اُس سے نظریں ملائے بغیر گاڑی میں جا بیٹھی۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا تم بس آئی انکل کا خیال رکھنا اور ابو کا نمبر ہے ناتھماڑے پاس کوئی بھی مسئلہ ہو اُس پہ کال کر لینا۔ میں نور کو بھی جلد ہی موبائل لے دوں گا“، اُس سے ملتے زارون نے اُسے تاکید کی اور اللہ حافظ کہہ کہ گاڑی کی جانب بڑھ گیا۔

-----

”تم لوگوں کا دماغ درست ہے؟ کیوں تم نے اُس آدمی کو مارا؟“، حیدر شاہ جن کی واپسی ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہوئی تھی انہیں نے اکرم کے منہ سے رات کے واقعہ کی پوری تفصیل سنتے ہی گرتے ہوئے اُن دونوں کی خبری۔

”سامنے حالات ہی ایسے تھے کہ ہم لوگوں کو کچھ سمجھ نہیں آیا“، اُن کے غصے پر آہستہ آواز میں اکرم نے صفائی دی۔

”حالات جیسے بھی تھے ایسے کسی بندے کو مار کر تم لوگوں نے بہت بڑی بے وقوفی کی ہے اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو شہر سے فرار ہو جاؤ“، اُس کی صفائی پر اپنے غصے کو ٹھنڈا کرتے حیدر شاہ نے کچھ سوچتے ہوئے تاکید کی۔ ”جی سامنے، جیسا آپ کا حکم“، سرخم کرتے اکرم نے اُن کے غصے سے خالق ہوتے شیرے کو وہاں سے نکلنے کا اشارہ کیا۔

”پتا نہیں کہاں سے اٹھ کر آ جاتے ہیں ایسے لوکے پڑھے“، اُن کے جاتے ہی حیدر شاہ نے شکار ہاتھ سے نکلنے پر بلبلاتے ہوئے خود کلامی کی۔

”کیا ہوا بابا سامنے میں اتنے غصے میں کیوں ہیں؟“، انہیں بے چینی سے ادھر ادھر ٹھلاٹا دیکھ کر مراد شاہ نے قریب آتے استفسار کیا۔

”پریشان نہ ہوں تو اور کیا کروں؟ ان گلموں کو ایک کام کہا تھا پر وہ بھی سب الٹا کر دیا“، ہاتھوں کو پشت پہ باندھتے حیدر شاہ نے لان میں پڑی کرسی سنہبالتے مراد شاہ کو اکرم کے کارنامے کے متعلق آگاہ کیا۔

”آپ پریشان نہ ہوں، میں سب دیکھ لوں گا اور کسی کو خبر نہیں ہو گی کہ یہ ہمارے بندوں کا کام ہے باقی رہی بات پولیس کی تو اس کی بھی آپ فکر نہ کریں میں خود ہی ڈی ایس پی سے بات کر لوں گا پہلے بھی وہ ہمارے بڑے کام کر چکا ہے اور یہ تو بس معمولی سی بات ہے“، کرسی اُن کے قریب کرتے مراد شاہ نے انہیں مطمئن کیا۔

”جانتا ہوں کہ یہ بات معمولی ہے پر ہاشم معمولی بندہ نہیں ہے اُسے پہلے ہی ہم پہ شک ہے۔ ہماری مخبری پہ کئی بندے لگا رکھے ہیں اور بیٹے کی حفاظت کے لیے بھی گارڈز کا انتظام کیا ہوا ہے ایسے حالات میں یہ واقعہ وہ بالکل بھی فرماش نہیں کرے گا۔ تمہیں معلوم ہے ناکہ الیکشن سرپرہ ہیں۔ اس وقت کسی بھی قسم کا کوئی بھی نقصان ہماری سال بھر کی محنت پہ پانی پھیر دے گا“، مراد کے جذباتی اقدامات کے بارے میں سوچتے حیدر شاہ نے اُسے سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کا کہا۔

”جی آپ فکر نہ کریں اس معاملے سے آپ کے الیکشن پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔ ہاشم صاحب اور ان کے بیٹے کو تواب میں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے“، اُن کے خدشات پہ تسلی

دیتے مراد شاہ نے اپنے دل میں سوچا اور حیدر شاہ کو اپنے پشاور کے جلسے کی تیاریوں کے بارے میں بتانے لگا۔

---

معاذ کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی عابدہ بیگم نسرین کو کام سمجھاتے کچن سے باہر آئیں۔

”یہ کون ہے؟“، احمد صاحب کے ساتھ ایک لڑکی کو دیکھ کر عابدہ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

” بتاتا ہوں پہلے جو س لے کر آؤ“، نور کی زرد پڑتی رنگت کو دیکھتے ہوئے احمد صاحب نے اُسے صوف پر بٹھاتے عابدہ بیگم سے کہا جو ویسے ہی چہرے پر کشمکش لیے کچن میں چلی گئیں۔

” بیٹا آپ ٹھیک ہو؟“ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے مخاطب کیا تو نور نے زبان کی بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

” بس پریشان نہ ہو، زارون انہی کچھ دیر میں آجائے گا“، ٹرے سے گلاس اٹھا کے اُس کی جانب بڑھاتے ہوئے احمد صاحب نے اُسے دلا سہ دیا۔

” کون ہے یہ؟ اور زارون کہاں ہے؟“ احمد صاحب کی فکر اور زارون کا نام عابدہ بیگم کو شک میں ڈال گیا۔

---

”وہ ڈاکٹر کے پاس گیا ہے اور یہ ہماری بہو ہے زارون کی بیوی“، احمد صاحب نے جتنے سکون سے نور کا تعارف کروا یا عابدہ بیگم نے اُتنی ہی حیرت سے پہلے اُنہیں اور پھر سرجھ کائے ٹیڈھی اُس لڑکی کو دیکھا۔

”بہو؟“ ٹرے ٹبل پر رکھتے اُنہوں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں بہو، دیکھو پیاری ہے نا؟ مجھے تو بہت پیاری لگی“، اُن کے چہرے سے اُن کے اندر کی کیفیت کا اندازہ لگاتے احمد صاحب نے بات کو بدلنے کی کوشش کی۔

”زارون کہاں ہے؟“ اُن کی بات کا اثر لیے بغیر عابدہ بیگم نے سخت تاثرات لیے پھر سے زارون کے بارے میں پوچھا۔

” بتایا تو ہے ڈاکٹر پاس گیا ہے“، نور کو جو سپینے کا کہتے احمد صاحب نے ویسے ہی پر سکون لجھے میں جواب دیا۔

”آپ ذرا اندر آئیں مجھے بات کرنی ہے“، ایک سخت نظر نور پر ڈالتے عابدہ بیگم نے کمرے میں جاتے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا۔

”بیٹا آپ پی کیوں نہیں رہیں۔ دیکھو کیسے رنگ زرد پڑ رہا ہے چلو تھوڑا سا پی لو پھر میں تمہیں تمہارے کمرے میں چھوڑ آتا ہوں“، بیوی کے رویے کی پروایت بناء احمد صاحب نے شفقت

بھرے انداز میں نور سے کہا جواب اُس دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی جہاں سے ابھی ابھی عابدہ بیگم اندر گئی تھیں۔

”انکل مجھے نہیں پینا پلیز آپ مجھے کمرے کا بتا دیں“، آنکھوں میں نمی لیے نور نے گلاس واپس ٹیبل پر کھاتا واحمد صاحب نے مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور نسرین کو آواز دیتے نور کو زارون کے کمرے میں چھوڑنے کا کہا جس نے بس حیرت سے اُسے دیکھنے پر ہی اکتفا کیا اور خاموشی سے اُسے ساتھ لیے سڑھیاں چڑھتے اوپر کی جانب بڑھی۔

---

”کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ وہ لوگ کون تھے اور انہوں نے تم لوگوں پر اٹیک کیوں کیا؟“ پڑی وغیرہ کروانے کے بعد واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھتے ارحم نے کافی دیر سے دماغ میں چلتے سوال کو زبان تک لاتے پوچھا۔

”نهیں، مجھے کوئی اندازہ نہیں اور ویسے بھی ان لوگوں نے چہرے پر نقاب پہنے تھے“، نفی میں سر ہلاتے زارون نے لا علمی کا اظہار کیا۔

”ہم اچھا، بس تم اب اپنا خیال رکھنا اور احتیاط سے کام لینا تاکہ دوبارہ اس طرح کا کوئی مسئلہ نہ بنے“، اُسے نصیحت کرتے وہ معاذ کی جانب متوجہ ہوا جو تب سے خاموشی سے گاڑی ڈرائیور کر رہا تھا۔

”آنٹی ٹھیک ہیں؟“

”ہاں ٹھیک ہیں میں نے رات کو نیند کی میڈ لیسن دے دی تھی اس لیے انہیں زارون کے نہ آنے کی خبر نہیں ہوئی“، اُس کو جواب دیتے معاذ نے گاڑی کو گھر کے راستے پہ موڑا۔ ”ویسے مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ کوئی تم پہ اٹیک کیوں کرے گا؟ مطلب تمہارے ساتھ کسی کی کیا دشمنی؟“، معاذ کا جواب سُن کر ارحم نے اپنے دماغ کی کشمکش کو کم کرنے کے لیے پھر سے اُسی بات پہ آتے زارون سے سوال کیا جواب سیٹ کی بیک سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

”مجھے نہیں وہ لوگ نور کو نقصان پہنچنا چاہتے تھے اور میں نے بتایا مجھے سمجھ نہیں آئی کہ کیا ہوا، بس پتا نہیں اللہ پاک نے کیسے ہمت دی کہ میں اپنی اور نور کی جان بچانے میں کامیاب رہا مگر....“، کچھ کہتے کہتے اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے گھری سانس لی۔

”کیا مگر؟“، پچھے کی جانب پلت کر ارحم نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”مگر مجھے لگتا کہ جان بچانے کے چکر میں، میں نے نور سے اُس کا سب کچھ چھین لیا۔ نہ میں اُسے جنگل کی طرف لے کر جاتا اور نہ ہمیں رات وہاں گزارنی پڑتی“، اپنے دل میں ملال محسوس کرتے زارون نے افسردگی سے کہا۔

”یہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تم نے تو اپنی طرف سے اُس کی جان اور عزت دونوں کی حفاظت کی مگر شاید اُس کے ماں باپ کو اپنی تربیت پہ یقین نہیں تھا جو یوں کسی بھی بات کی تصدیق کیے بغیر انہوں نے بیٹی کو بے اعتبار کر کہ انجان لوگوں کے حوالے کر دیا۔ ویسے مجھے ایسے لوگوں کی سمجھ نہیں آتی کہ کیوں بیٹیوں ہی کی دفعہ انہیں اپنی عزت اور غیرت کی فکر لاحق ہو جاتی ہے حالانکہ یہی عزت اور غیرت تو بیٹیوں کی دفعہ بھی جاگنی چاہی مگر بیٹیوں کو توہر چیز کی اجازت ہے وہ لڑ کے ہیں اس لیے سب کچھ کر سکتے اور بیٹیوں کی بے گناہی پہ بھی انہیں اتنی بڑی بڑی سزا نہیں سُنا دیتے، حد ہے بیٹی سے وضاحت تو مانگتے، اُسے سنتے اور غور کرتے کہ آیا کہ واقعی اُس کا قصور ہے بھی یا نہیں“، ارحم جو پہلے ہی ظہیر صاحب کی حرکتوں پہ بھرا پڑا تھا زارون کی بات سُن کر مزید تپ گیا۔

”ہاں رو یہ تو مجھے بھی عجیب ہی لگا نور کے ابو کا پر شاید غلط وہ بھی نہیں تھے۔ بیٹی رات بھر گھر سے باہر رہے تو شک نہ بھی ہوتا بھی شیطان بہت سے وسو سے دل میں ڈال دیتا اس لیے اس سارے

معاملے میں اُن کا بھی کوئی قصور نہیں کیونکہ وقت اور حالات ایسے تھے کہ کسی کے دماغ پر پردہ ڈال دیتے...“

”پھر بھی اتنا بھی کیا پردہ کہ انسان غلط درست میں فرق ہی نہ کر سکے اور کسی بے گناہ کو اُس کے نہ کر دے گناہ کی اتنی بڑی سزا سنادے اور مجھے نہیں لگتا کہ نور کہ ساتھ کچھ اچھا ہوا۔ ابھی تو وہ بچی ہے۔ تھرڈ ائیر کی سٹوڈنٹ انیس، بیس سال کے لگ بھگ اور سچ پوچھو تو مجھے اُس کا چہرہ دیکھ کر زرا بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح چالاک ہوشیار ہے۔ مجھے تو وہ بالکل معصوم سی لگی جو خاموشی سے ماں باپ سے کوئی بھی شکوہ کیے بغیر اُن کا ہر ظلم سے گئی اور یہ ظلم نہیں بلکہ بہت بڑا امتحان ہے۔ ایک تو ساری زندگی کے لیے ماں باپ سے نہ ملنے کا دکھ اوپر سے لوگوں کی باتیں، پتا نہیں اللہ ایسے لوگوں کو یہی دیتا ہی کیوں ہے جو ان کی قدر نہیں کر سکتے“، ارحم کی بات درمیان سے کاٹتے معاذ نے اپنا غصہ اُتارا۔

”ایسا ہی ہے پر اب کیا کیا جا سکتا ہے جو کچھ ہوانہ تو وہ میرے اختیار میں تھا اور نہ نور کے مگر آئندہ آنے والی زندگی ہمارے اختیار میں ہے اس لیے میں کوشش کروں گا کہ جو تکلیف نور کو اپنے ماں باپ سے میری وجہ سے ملی اُس کا زالہ کر سکوں“، اُن دونوں کی باتیں سُننے زارون نے کہنے کے

ساتھ ساتھ اپنے آپ سے عہد کیا اور ارحام کی جانب متوجہ ہوا جو اُس سے اب رابعہ کے ڈرائیور کی لاش کے متعلق پوچھ رہا تھا۔

---

”کہاں سے اٹھا کر لائیں ہیں آپ اس لڑکی کو؟“، احمد صاحب کے کمرے میں داخل ہوتے ہی عابدہ بیگم نے بھڑکتے ہوئے سوال کیا۔

”عابدہ پلیز سوچ سمجھ کر بات کرو اب وہ تمہاری بھوئے ہے“، دروازہ بند کر کہ اُن کے قریب آتے احمد صاحب نے اُن کا ہاتھ تھامنا چاہا۔

”کیا سوچ سمجھ کر بات کروں؟ ایک انجان لڑکی کو میرے سر پہ لا کر آپ مجھے بتا رہے کہ یہ تمہاری بھوئے ہے زارون کی بیوی۔ میرے بیٹے کی بیوی، جو ایک بن بلاۓ مہمان کی طرح کہیں سے آپکی وہ بھی مجھ سے پوچھے اور بتائے بغیر۔ میں اُس لڑکی کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی اس لیے پلیز آپ اُسے جہاں سے بھی لائیں ہیں وہیں چھوڑ سکتیں“، اُن کا ہاتھ جھٹکتے عابدہ بیگم غصے سے اُن پہ برسیں۔

”تم پلیز یہاں بیٹھو اور تسلی سے میری بات سنو“، احمد صاحب نے اُن کا غصہ دیکھ کر سختی کرنے کی  
بجائے نرمی سے سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں، مجھے کچھ نہیں سُننا بس میں نے کہانا کہ میں اس لڑکی کو اپنے گھر میں برداشت نہیں کر سکتی  
تو بس آپ اسے یہاں سے نکالیں۔

”عبدہ پلیز میں نے کہانا کہ ایک بار میری بات سن لو پھر تم جو بھی کہو گی ویسا ہی ہو گا“، اُنہیں  
قابل کرنے کی کوشش کرتے احمد صاحب نے زبردستی پکڑ کر انہیں اپنے ساتھ صوفے پہ بیٹھایا۔

”مجھے کچھ نہیں سُننا جب آپ لوگوں کی زندگی میں میری کوئی اہمیت نہیں تو کیا ضرورت پڑی ہے  
مجھے وضاحتیں دینے کی۔ جائیں جو دل کرتا ہے کریں۔ میرے بیٹے کی زندگی کا اتنا اہم فیصلہ آپ  
نے میری مرضی اور موجودگی کے بغیر ہی کر لیا کیوں احمد کیوں کیا آپ نے ایسا؟ آپ کو نہیں معلوم  
تھا کہ زارون کے لیے میرے دل میں کتنے ارمان تھے“، دکھ سے کہتے اُن کی زبان لڑکھڑائی۔

”سب جانتا ہوں پر حالات ایسے تھے کہ میں آپ کو بتا نہیں پایا بلکہ مجھے خود وہاں جا کر پتا چلا کہ  
معاملہ اس حد تک خراب ہے“، اُن کی ناراضگی کو اُن کا حق سمجھتے احمد صاحب نے اُنہیں سارے  
معاملے سے آگاہ کیا۔

”انتا کچھ ہو گیا اور آپ مجھے اب بتارہے ہیں؟ زارون کہاں ہے وہ ٹھیک ہے نا؟“ زارون کو گولی لگنے کا سن کر، ہی عابدہ بیگم کا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ چکا تھا۔

”ہاں وہ ٹھیک ہے تم اُس کی فکر نہ کرو اور پلیز جا کر نور کو سہارا دو وہ کافی پریشان ہے اور ڈری ہوئی ہے،“ ان کا موڈ ٹھیک ہوتا دیکھ کر احمد صاحب نے حکم دینے کی بجائے درخواست کی۔

”نہیں میں نہیں جاؤں گی، میں کیسے اُس لڑکی کو سہارا دے سکتی ہوں جیسے ابھی تک میں نے قبول بھی نہیں کیا،“ ان کی بات پر فوراً سے کھڑے ہوتے عابدہ بیگم نے انا کے ہاتھوں مجبور نفی میں سر ہلا یا۔

”بیٹی سمجھ کر، کیونکہ اس وقت اُسے سہارے کی ضرورت ہے کسی ایسے سہارے کی جو اُس کے کھوئے ہوئے اعتبار کو واپس لاسکے بالکل تمہاری طرح یاد ہے نا؟ جب آپ کے امی ابو نے ہماری پسند پر اختلاف کرتے آپ کو میرے ساتھ رخصت کرنے کے بعد ہر رشتہ ختم کر دیا تھا تو کیسے میری امی نے آپ کو سنبھالا تھا بس وقت پھر سے خود کو دوہرا رہا ہے سمجھیں کے اللہ پاک نے آپ کو موقع دیا ہے کہ آپ میری ماں کا قرض اُتار سکیں۔ پلیز عابدہ اپنی انا کو سامنے رکھ کر نہ سوچیں بلکہ اپنی اُس وقت کی تکلیف کو محسوس کریں جب آپ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے ماں باپ کی فکر میں مجھ سے چھپ چھپ کر روئی تھیں حالانکہ آپ کے والدین نے خود اپنے ہاتھوں سے آپ کو رخصت

کیا تھا آپ پہ ان کی طرف سے کوئی تھمت نہیں لگی تھی پھر بھی آپ ان کی جدائی پر اندر تک ٹوٹ گئیں تھیں اور نور وہ تو آپ سے بڑا دکھ لے کر یہاں آئی ہے اور مجھے پتا ہے آپ سے بہتر اسے کوئی نہیں سن بھال سکتا، ان کا ہاتھ تھامتے احمد صاحب نے پچھلے دنوں کی یادوں کو دوہرایا تو عابدہ بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

”تمم میں دیکھتی ہوں“، اثبات میں سر ہلاتے کچھ بھولی ہوئی یادوں نے دماغ کا احاطہ کیا تو ان کا خول خود بخود ان کے دل سے اُتر گیا اور وہ خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل کر سڑھیاں چڑھتے زارون کے کمرے کی جانب بڑھیں جہاں ابھی کچھ دیر پہلے ہی نسرین نور کو چھوڑ کر گئی تھی۔

دروازہ کھلنے کی آواز پر نور نے رونے کی وجہ سے اپنے بھاری ہوتے سر کو اٹھا کر دوسرا جانب دیکھا جہاں عابدہ بیگم ایک نظر اسے دیکھ کر آہستہ قدم اٹھاتے اُس کے قریب اپنکی تھیں۔

”آنٹی پلیز مجھے کچھ مت کہیے گا میں جان بوجھ کر یہاں نہیں آئی“، ان کی نظروں سے گھبراتے نور نے اپنی صفائی دی اور جلدی میں صوفے سے اٹھی۔

”جانتی ہوں اور تم پر یشان نہ ہو، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی“، اُس کے چہرے پہ خوف سے ہوا بیاں اُڑی دیکھ کر عابدہ بیگم نے نرمی سے سمجھاتے اُسے واپس اپنے ساتھ صوفے پہ بیٹھا یا تو نور کو کچھ ڈھار س ملی۔

”آپ زار کی ماما ہیں؟“، اُن کی عمر اور غصے سے نور کو بھی لگا۔

”زار؟؟“

”میرا مطلب زارون کی“، اُن کے نام بھجھی سے پوچھنے پر نور نے وضاحت کی۔

”ہاں میں زارون کی ماما ہوں اور اب سے تمہاری بھی“، اُس کے گال پر نرمی سے ہاتھ پھیرتے عابدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں، میری کوئی ماما نہیں نہ کوئی بابا، سب بُرے ہیں“، اُن کی بات سننے ہی نور نے آنکھوں میں ہاتھ رکھتے اپنے آنسوؤں کو بہانے سے روکا۔

”کوئی رشتہ بُر انہیں ہوتا، بس بعض دفعہ وقت اور حالات بُرے ہو جاتے ہیں اور انسان کو اپنی زد میں لے کر ایسے فیصلے کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں جن میں نہ تو ہمارا کوئی اختیار ہوتا اور نہ ہی فیصلہ سُنانے والے کا، اس لیے جو کچھ بھی ہو اُس میں اپنے والدین کو قصور وار ٹھہر کر اپنے دل میں اُن کے لیے مزید بد گمانی پیدا نہ کرو، ہو سکتا ہے وہ اپنی جگہ ٹھیک ہوں“، اُس کی آنکھیں صاف کرتے

عبدہ بیگم نے بہت پیار اور نرمی سے اُس کے دل پہ چھائی افسر دگی دور کرنے کی کوشش کی تو نور نے سہارا ملتے ہی ان کے گلے لگتے رونا شروع کر دیا۔

”آنٹی میں بُری نہیں ہوں، سچ میں مجھے خود نہیں پتا تھا کہ وہ لوگ کون تھے اور آپ میرا یقین کریں میں بھاگی نہیں تھی مجھے تو زارون پسند ہی نہیں ہیں۔ وہ مجھے ہر وقت ڈانتے ہیں آپ بتائیں میں بھلا ان کے ساتھ کیوں جاؤں گی۔ وہ تو مجھے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو راستہ میں وہ آدمی آگئے اور بابا نے سمجھ لیا کہ میں نے انہیں دھوکا دیا ان سے جھوٹ بول کے گئی۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا، آپ دیکھیں مجھے کیا آپ کو لگتا ہے کہ میں ایسی لڑکی ہوں؟“، اپنوں کے کھونے کا دکھ اور بے اعتباری اس قدر دماغ پہ حاوی تھی کہ نور نے اپنے کردار کی صفائی دیتے ہوئے یہ بھی نہیں سوچا کہ وہ پہلی بار عبدہ بیگم سے مل رہی ہے۔

”نہیں، تم تو بہت پیاری ہو معصوم سی بالکل میری بیٹی جیسی اور تمہارے بابا کو کوئی غلط فہمی ہوتی ہو گی اسی لیے انہوں نے تھوڑا غصہ کیا“۔

”تھوڑا؟ انہوں نے مجھ پہ گولی چلائی، آنٹی وہ گولی مجھے لگ جاتی میں مر جاتی پر بابا میرے ساتھ ایسا نہ کرتے۔ میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں بہت زیادہ“، ان سے الگ ہوتے وہ بولتے بولتے چپ ہوتی کیونکہ اُس کے الفاظ کے ساتھ اُس کے کمزور اعصاب بھی اُس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

”بیٹا آنکھیں کھولو، احمد، احمد جلدی آئیں اوپر“، اُسے بے سدھ دیکھ کر عابدہ بیگم نے اُس کا سر صوفے کے ساتھ لگایا اور احمد صاحب کو آواز دی جو معاذ کی گاڑی کا ہارن سنتے ہی زارون کو دیکھنے کمرے سے باہر آئے تھے جلدی سے اوپر کی جانب بڑھے۔

”کیا ہوا؟“، کمرے میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پریشانی سے پوچھا اور ساتھ رہی نور کو دیکھا جو ہوش و خرد سے بیگانہ صوفے پہ پڑی تھی۔

”پتا نہیں مجھے، آپ دیکھیں مجھے لگ رہا ہے بے ہوش ہو گئی ہے“، پچھے ہٹتے عابدہ بیگم نے احمد صاحب سے کہا اور نسرین کو پانی لانے کے لیے آواز لگائی تو زارون کے ساتھ ساتھ معاذ اور احمد بھی اُن کی آواز پر اوپر کی جانب بڑھے۔

”کمزوری کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی ہے شاید۔ معاذ تم ڈاکٹر کو فون کرو“، نسرین کے ہاتھ سے گلاس پکڑتے احمد صاحب نے کچھ چھینٹے اُس کے چہرے پہ ڈالے جو بالکل بے خبر تھی۔

”ابوسائید پہ ہوں، میں لیستا ہوں“، اُس کے بازو کی وجہ سے احمد صاحب نے خود ہی ہمت کی تو زارون نے اُنہیں منع کرتے نور کو اٹھا کر بیڈ پہ لیٹاتے کمفر ٹراؤس کے اوپر ڈالا۔

”تم ٹھیک ہو؟“، اُس کے زخم کی وجہ سے احمد صاحب نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”جی ٹھیک ہوں آپ نور کو دیکھیں“، اپنی جانب سے تسلی دیتے زارون نے تیز ٹھیکی درد کی ٹیس کو برداشت کرتے معاذ کو دوبارہ سے ڈاکٹر کو کال کرنے کا کہا۔

---

”ماما پلیز خود کو سن بھالیں آپ ایسا کریں گی تو میرا کیا ہو گا“، نائلہ بیگم جو پچھلے تین گھنٹوں سے رورو کر اپنا بُرا حال کر چکی تھیں رضانے انہیں چپ کروانے کی کوشش کی۔

”کیا سن بھالوں میں خود کو۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو اس طرح بے شہار کر کہ گھر سے بے دخل کر دیا۔ نہ جانے کون لوگ ہیں؟ کیسے ہیں؟ میری بیٹی ساتھ کیسا سلوک کریں گے؟“ اپنا سر پکڑتے نائلہ بیگم نے دل میں اٹھتے خدشات کو زبان تک لاتے رضا کے سامنے بیان کیا۔

”اچھے ہوں گے آپ کے پریشان ہونے اور رونے سے وقت واپس نہیں آ جانا اس لیے پلیز خود کو سن بھالیں اور دعا کریں کہ اللہ پاک آپی کو خوش رکھے“، انہیں سہارا دے کر اپنے کمرے میں لے جاتے رضانے مطمئن کیا۔

---

”اللہ کرے ایسا ہی ہو پر جوز خم اسے یہاں سے لگا وہ بہت گھرا ہے جس کے لیے میں ظہیر صاحب کو کبھی معاف نہیں کروں گی“، بیڈ پر بیٹھتے نائلہ بیگم نے دوپٹے سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔

”ماما پلیز ایسی باتیں مت کریں اور یہ لیں کچھ کھالیں آپ نے کل سے کچھ نہیں کھایا“، ٹپل پر سے ٹرے اٹھا کے ان کے سامنے رکھتے رضانے خود ہی نوالہ بنائے کر ان کے منه کے قریب کیا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے انہوں نے انکار کیا۔

”نہیں بھی بھوک تو تھوڑا کھالیں۔ طبیعت پہلے ہی ٹھیک نہیں آپ کی، اب بھوکے رہ رہ کر اور خراب ہو جانی اس لیے پلیز منہ کھولیں“، ان کے انکار پر اصرار کرتے رضانے نوالہ ان کے منه میں ڈال جسے بمشکل نگتے نائلہ بیگم نے دوسرا نوالہ بنائے کر رضا کے منه کی جانب بڑھایا۔

”تم نے بھی کل سے کچھ نہیں کھایا“، اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے بیٹے کا ایک ہی دن میں مر جھایا ہوا چہرہ دیکھ کر نائلہ بیگم نے خود کو سنبھالا۔

”میں کھالوں گا پر پہلے آپ کھائیں“، ان کے ہاتھ سے ایک نوالہ کھاتے رضانے تسلی دی اور نائلہ بیگم کو کھانے کا کہتے ان کے کمرے سے میڈیسین لینے چلا گیا تاکہ وہ دے کر انہیں کچھ دیر کے لیے سُلا سکے۔

ڈاکٹر نے آتے ہی کچھ ضروری ٹریمینٹ دی تو نور کو ہوش آگیا مگر کل سے کچھ نہ کھانے اور ٹینشن کی وجہ سے اُس کا بی پی کافی حد تک لو ہو چکا تھا تب ہی ڈاکٹر نے میڈیسین دینے کے ساتھ ساتھ اُسے آرام کرنے کا مشورہ دیتے کچھ کھانے پینے کی ہدایات لیں اور احمد صاحب سے اجازت طلب کرتے معاذ کے ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھے۔

”نسرین جاؤ جو س لے کر آؤ اور ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی لانا“، ڈاکٹر کے جاتے ہی احمد صاحب نے نسرین سے کہا جو اثبات میں سرہلاتے کمرے سے نکل گئی۔

”ابو آپ لوگ جائیں ریسٹ کریں، میں دیکھ لوں گا“، صح سے انہیں اپنے ساتھ لگادیکھ کر زارون نے مدخلت کی۔ ”نہیں، کوئی بات نہیں ہم ٹھیک ہیں“، اُسے تسلی دیتے وہ اُس کے اور ارحم کے پاس ہی صوفے پر بیٹھ گئے۔

”مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ آنٹی پلیز آپ لوگ مجھے میرے گھر چھوڑ آئیں“، نور جو کافی دیر سے خاموش سب کی باتیں سُن رہی تھی اُس نے آنکھوں میں نمی بھرتے عابدہ بیگم کا ہاتھ تھاما۔

”ٹھیک ہے لے جائیں گے بس تم پریشان نہ ہو اور اٹھو پہلے کچھ کھالو“، سہارا دے کر اُس کی پشت بیڈ کی بیک ساتھ لگاتے انہوں نے بات بدلتی۔

”کب لے کر جائیں گے؟ پلیز مجھے ابھی جانا ہے۔ مجھے یہاں نہیں رہنا“، انجان لوگوں اور ماحول میں خود کو بے ضرر سامحسوس کرتے نور نے پھر سے اصرار کیا تو ارحام صوفے سے اٹھ کر اُس کے قریب آیا۔

”کیوں پریشان ہو رہی ہو؟ دیکھو میں ہوں نا یہاں زارون بھی ہے اگر کہتی ہو تو رابعہ کو بھی بلا لیتے ہیں“، اُسے بہلانے کے لیے ارحام نے اُسے اپنی جانب متوجہ کروا دیا۔

”نہیں مجھے کوئی نہیں چاہیے مجھے بس ماما بابا کے پاس جانا ہے پلیز ارحام بھائی آپ مجھے لے جائیں۔ میں بابا کو سمجھاؤں گی دیکھیے گا وہ فوراً آمان جائیں گے“، اُس کی بات پہ دھیان دیے بغیر نور نے اُس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو بھی یقین دلا دیا۔

”ہاں پتا ہے مجھے پر ابھی تمہاری طبیعت خراب ہے نا اس حالت میں تمہیں میں کیسے کہیں لے جا سکتا ہوں اس لیے پہلے کچھ کھاؤ جب طبیعت ٹھیک ہو جائے گی تو میں تمہیں گھر لے جاؤں گا“، کسی بچے کی مانند اُسے سمجھاتے ارحام نے دل میں افسردگی کے باوجود بھی چہرے پہ مسکراہٹ سجائی۔

”پر امس کریں کہ آپ مجھے گھر لے کر جائیں گے“، اُس کی بات پہ بے یقینی کا اظہار کرتے نور نے تصدیق چاہی۔

”ہاں پر امس لے جاؤں گا پر پہلے تم یہ کھاؤ اور ساتھ میڈیسین بھی“، نسرین کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ارجمند نے عابدہ بیگم کی جانب بڑھائی۔

”ٹھیک ہے میں کھالوں گی پر پلیز آپ کہیں مت جائیے گا“، ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتے نور نے ٹرے اپنے سامنے کی اور دل ناچاہنے کے باوجود بھی کھانے لگی تاکہ جلدی سے میڈیسین لے کر ارجمند کے ساتھ گھر جاسکے۔

ظہیر صاحب رات دو بجے کے قریب گھر لوٹے تو ہر طرف سنایا کیا کہ آہستہ قدم اٹھاتے اپنے کمرے کی جانب بڑھے جہاں رضا نائلہ بیگم کے سونے کا یقین ہوتے ہی ان پر کمفر ٹراٹھار ہاتھا۔ ”بابا آپ کے لیے کھانا لاوں؟“، انہیں کمرے میں داخل ہوتا کیا کہ رضا نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے“، اپنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھنے کے بعد انہیں نے اپنے چہرے کے تاثرات کو سخت کرتے جواب دیا۔

”چائے بنادیتا ہوں پھر“، اُن کا جواب سنتے ہی رضا نے خود کلامی کی۔

”مجھے کسی چیز کی طلب نہیں ہے۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو“، اُسے ایک گھوری سے نوازتے ظہیر صاحب نے اپنی جیکٹ اُتار کر الماری میں لٹکائی تورضا نے نائلہ بیگم کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے مزید کوئی سوال و جواب کیے بغیر اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”کتنے پیار سے رکھا تھا میں نے تمہیں، کتنے نازوں سے تمہاری پرورش کی۔ یقین، محبت، سکون کیا تھا جو میں نے تمہیں نہیں دیا تو پھر کیوں؟ کیوں تم نے اپنے بابا کا سر شرم سے جھکاتے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ تمہارے بابا کا کیا ہو گا؟ کیوں تم نے میری عزت کو خاک میں ملا�ا؟“، کمرے میں لگی اپنی اور نور کی تصور کے سامنے کھڑے ہوتے ظہیر صاحب نے آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کیا۔ ”اگر کوئی نہیں تھا تو تم مجھے کال کر دیتیں میں تمہیں لے آتا۔ کیوں تم نے اتنی لاپرواٹی کی؟ جانتا ہوں کہ تم غلط نہیں تھیں پر حالات تو غلط تھے نا؟ تمہارا کسی غیر مرد کے ساتھ پوری رات باہر رہنا مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میری غیرت نے گوارا نہیں کیا کہ میں تمہاری غلطی معاف کر سکوں۔ نور میری جان تمہیں اتنی سمجھ تو تھی نا کہ کسی لڑکے ساتھ یوں گھر نہیں آنا پھر کیوں تم نے نادانی کی؟ کیوں تم نے اپنے بابا کو سب کی نظروں میں گردادیا؟“ اُس کے مسکراتے چہرے پر

ہاتھ پھیرتے ظہیر صاحب نے اپنی آنکھوں کو بند کرتے آنسوؤں کو باہر نکلنے سے روکا اور نائلہ بیگم کے کروٹ لینے پر جلدی سے وہاں ہٹتے واش روم میں چلے گئے۔

---

”کوئی نیامال آیا ہے یا سب پرانا ہی ہے؟“ سگریٹ کا کش لیتے مراد شاہ نے شیرے سے پوچھا۔  
”جی جی سائیں میں نے کل ہی آپ کے کہنے پر ایک لڑکی کا انتظام کر دیا تھا“، احترام سے نظریں جھکائے اُس نے مراد شاہ کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”لڑکی نہ شیرے نہ، اب کسی عام لڑکی کی طلب نہیں ہے اب تو کسی خاص کا انتظام کرو۔ کوئی ایسا جس کی قربت تیرے سائیں کو اندر تک سرشار کر دے“، بات کرتے مراد شاہ کے تصور میں ایک چہرہ اُبھر اجو کافی دنوں سے دن رات اُس کے حواسوں پر حاوی تھا۔

”خاص؟ سائیں آپ کو کوئی پسند ہے تو حکم کریں؟“ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ بکھرتی دیکھ کر شیرے نے اندازہ لگایا۔

”پسند نہیں بلکہ بہت پسند ہے اور یہ دل اب اُس سے زیادہ دیر دوری برداشت نہیں کر سکتا، اس لیے جتنی جلدی ہو سکتا ہے اُسے ڈھونڈو“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے مراد شاہ نے سنجیدہ ہوتے حال دل بیان کرتے تنبیہ کی۔

”جیسا نئیں جیسا آپ کا حکم، آپ بس اُس کی تصویر دیکھادیں اور کوئی اتا پتہ بتا دیں تاکہ ڈھونڈنے میں آسانی رہے“، شیرے کو معلوم تھا کہ مراد شاہ کی نظروں میں جو چیز آجائے وہ زیادہ دیر اُس چیز کا انتظار نہیں کرتا۔ ”یہی تو مسئلہ ہے نہ تو میرے پاس اُس کی کوئی تصویر ہے نہ ہی کوئی پتہ بس اُس کا خوبصورت چہرہ تیرے سائیں کے دل کو اپنے قبضے میں کر گیا ہے۔ اُس کی معصومیت واللہ مراد شاہ نے کبھی اتنا حسن ایک ساتھ کسی لڑکی میں نہیں دیکھا“، آنکھیں بند کرتے نور کے چہرے کو سوچتے مراد شاہ نے سکریٹ کا ایک اور کش لیا۔

”تو پھر سائیں اب کیا ہو گا؟“ اُس کی بات سنتے شیرے نے بے چینی سے استفسار کیا۔

”ہونا کیا ہے؟ میں اُسے دنیا کہ ہر کونے میں ڈھونڈوں گا کیونکہ جب تک میں نے اُس کے حسن کو نہ سراہا مجھے سکون نہیں ملے گا“، چہرے پر مکروہ مسکراہٹ سجا تے مراد شاہ نے سکریٹ کو نیچے پھینکتے اپنے جوتے سے مسلما اور نئے شکار سے اپنی پیاس بجھانے کے لیے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

-----

میڈیسین کھانے کے پچھے دیر بعد نور سوگئی تو ارحام نے صح آنے کا کہتے گھر کارخ کیا کیونکہ ہاشم

صاحب بار بار اُسے کال کر رہے تھے

”زارون تم بھی اب آرام کرو کافی وقت ہو چکا ہے“، کلاک پر چار بجتے دیکھ کر احمد صاحب نے اُسے کہا اور عابدہ بیگم کو ساتھ لیے کمرے سے چلے گئے۔

”اُفف پتا نہیں یہ بازو کب ٹھیک ہو گا“، اُن کے جاتے ہی زارون نے دروازہ بند کیا اور جھنجھلاتے ہوئے ڈاکٹر کی دی ہوتی پین کلر کھانے لگا۔

”اب میں کھاں سوؤں؟“ نور کو بیڈ پر سکون سے سوتا دیکھ کر اُس نے خود کلامی کی اور پریشانی سے صوفے کی جانب دیکھا جو سنگل ہونے کی وجہ سے سونے کے قابل توہر گز بھی نہ تھا۔

”ادھر ہی لیٹ جاتا ہوں اس نے کو نساپورے بیڈ پر سو جانا“، سائیڈ لیمپ آن کرتے زارون نے لائسٹ آف کی اور آکر بیڈ پر نور کے قریب لیٹ گیا جواب اُس کی طرف سائیڈ لے کر لیٹی تھی۔

”انسان کیا سوچتا ہے اور کیا ہو جاتا ہے۔ کل تک میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ تم جیسی بد تمیز لڑکی کو کبھی اپنی زندگی میں شامل کروں گا بلکہ سوچنا تو دور کی بات میرے دماغ میں تو کبھی خیال بھی

نہیں آیا پر آج دیکھو اللہ پاک نے کس طرح ہمیں ایک کیا، اُس کی طرف ساید لے کر لئئے اک پل کے لیے زارون اُس کے خوابیدہ چہرے سے نظریں ہٹانا بھول چکا تھا۔

”جب میں نے تم سے نکاح کا ارادہ کیا تھا تو مجھے لگا تھا میں یہ سب ہمدردی میں کر رہا مگر اب لگ رہا ہے وہ احساس جو میں کل رات سے تمہارے لیے محسوس کر رہا وہ صرف ہمدردی نہیں تھی“، اُس کے بھورے بالوں کی چند لٹوں کو چہرے سے ہٹاتے جو بے خبری میں سونے کی وجہ سے پوری طرح بکھر چکے تھے۔

”محبت؟ اس احساس کو میں محبت تو نہیں کہہ سکتا کیونکہ محبت کے لمس سے میں اچھے سے واقف ہوں البتہ اپنے اس احساس کو میں پسند ضرور کہوں گا۔ ہو سکتا ہے یہ پسند ان قریب محبت میں بدل جائے پر نہیں، میں کیسے محبت کر سکتا ہوں؟ میں تو محبت کر کر کہ اُسے کھو چکا ہوں اور جو چیز ایک بار کھو جائے وہ بار بار نہیں ملتی“، حبہ کا خیال آتے ہی زارون نے فوراً سے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا۔

”ما۔۔ ما پلیز مجھے بچالیں۔۔ پلیز با۔۔ با کو بتائیں میں ایسی نہیں ہوں“، اپنی سوچوں میں گم وہ نور کی آواز پہ چونکا جو شاید خواب میں ڈرگئی تھی۔

”سو جاؤ سکون سے میں پاس ہوں“، اُس کے بازو پہ ہلکے ہاتھ سے تھکلی دیتے زارون نے اپنے ہونے کا یقین دلا یا تو کسی کے پاس ہونے کے احساس پر وہ پھر سے پر سکون ہوتے اُس کا ہاتھ تھام گئی۔

”اُفف یہ لڑکی بھی نا، رات کو سوتے ہوئے بھی مجھے سکون نہیں لینے دے گی“، اُس کی حرکت پر سوچوں کو جھکلتے زارون نے آہ بھری اور آنکھیں بند کرتے سونے کی کوشش کرنے لگا۔

-----

”نکاح نور اور زارون کا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے“، ارحم نے گھرو اپس آکے رابعہ کو کال کرتے تمام بات بتائی تو اُس نے بے یقین سے پوچھا۔

”میں پاگل نہیں ہوا، میری جان تم شاید نیند میں ہو جو تمہیں میری اتنی لمبی تقریر کی سمجھ نہیں آئی“، اُس کے سوال پر پچھتاب کھاتے ارحم نے دانت پسیے۔

”زیادہ شوخ بننے کی ضرورت نہیں اور ٹھیک سے بتاؤ سب، کیا سچ میں نور اور زارون کا نکاح ہو گیا ہے؟“، اُس کی بات کا بُرا مناتے رابعہ نے پھر سے تصدیق چاہی تو ارحم نے منه پہ ہاتھ رکھتے جمائی کو روکا۔

”یار مجھے بتا دیتی میں تمہیں نکاح نامے کی تصویر بنائے کر سینڈ کر دیتا، پہلے میں رات سے اُن کے پچھے ذلیل ہو رہا اور اب تم پچھلے دس منٹ سے ایک ہی بات ہزار بار پوچھ چکی ہو۔ حد ہے جب میں نے تمہیں پوری تفصیل بتائی ہے تو کیوں نہیں یقین آرہا تمہیں“، نیند سے بند ہوتی آنکھوں کو کھولتے ارحم نے اب کی بار چڑتے ہوئے کہا تو دوسرا ہی جانب رابعہ نے جواب دینے کی بجائے غصے سے کال کاٹ دی۔

”ہیلو کہاں گئیں؟“، موبائل کان سے ہٹاتے ارحم نے اسکرین کی جانب دیکھا اور پھر سے کال ملائی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری تفصیل اور دوبارہ مجھے فون کرنے کی ضرورت نہیں ہے“، کال ریسیو کرتے رابعہ نے غصے سے چلاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی اور پھر سے کال کاٹ دی۔

”توبہ ہے ان لڑکیوں سے، ایک تو خود بات کی جلدی سمجھ نہیں آتی الٹا ہم مسکینوں کو الزام دیتے ہم پہ ہی غصہ کرتی ہیں“، موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ارحم نے رابعہ کے رویے کو سنجیدہ لینے کی بجائے تکیہ سیدھا کیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

-----

”امی یہ آپ نے صحیح ہی صحیح کیا شور ڈالا ہوا ہے“، معاذ جو ابھی جا گنگ کر کے واپس آیا تھا اُس نے کچن میں بر تنوں کی آواز سُن کے اپنا رخ اُس جانب کیا۔

”کیسا شور؟ میں تو ناشتہ بنار ہی ہوں“، مصروف سے انداز میں جواب دیتے انہوں نے سینڈوچ کو میکر میں رکھا۔ ”ناشستہ؟ کوئی مہمان آرہا ہے کیا جو اتنی ساری چیزیں بنار ہی ہیں؟“ فرتیج سے جو س نکال کر گلاس میں ڈالتے معاذ نے ایک نظر سلیپ پہ بکھری چیزوں کو دیکھا۔

”نہیں، باہر سے تو کوئی نہیں آرہا البتہ شاید تم بھول رہے کہ کل سے ہمارے گھر میں ایک نع فرد کا اضافہ ہوا ہے بس یہ سب اُسی کے لیے بنار ہی ہوں“، اُسے یاد دہانی کرواتے انہوں نے نسرین کو ٹیبل صاف کر کے بر تن لگانے کا کہا۔

”اچھا اچھا مطلب یہ سارا انتظام میری بھا بھی کے لیے ہو رہا ہے، ویسے امی آپ کچھ زیادہ ہی اچھی ساس بننے کی کوشش نہیں کر رہیں؟ میرا مطلب پاکستانی ساس میں تو پہلے دن سے ہی بہو کو کھینچ کے رکھنے کے اصول پر قائل ہو تیں اور آپ ہیں کہ بہو کے لیے اتنا اہتمام کر رہی ہیں وہ بھی اپنے ہاتھوں سے“، اُن کی اس قدر محبت معاذ سے ہضم نہیں ہوتی تب ہی اُس نے شکنی انداز میں سوال کیا۔

”بس کرو پہلے بڑے میں نے اپنی دوسری بہوؤں پہ ظلم کے پھاڑڈھائے جو اس بچاری کے لیے ناشستہ بننے پر تم اتنا پریشان ہو رہے ہو اور ہاں نہ تو میری ساس نے مجھ پہ سختی کی نہ میں کروں گی کیونکہ میں اچھے سے جانتی ہوں کہ ان اور نفر تین دل میں رکھنے سے انسان اپنے آپ کو ہی تکلیف دیتا ہے اس لیے جو بھی ہوا اس میں نہ ہی اُس بچی کا کوئی قصور ہے نہ زارون کا تو کیوں میں بلا وجہ ہی منہ پھلانے پھروں“، سینڈوچ نکال کر پلیٹ میں رکھتے احمد صاحب کے سمجھانے اور نور کو دیکھنے اور سننے کے بعد تمام شکوئے گلے ختم ہو چکے تھے تب ہی عابدہ بیگم نے دل سے نور کو قبول کرتے اُس کی اپنے گھر میں پہلی صبح کی تیاری اپنے ہاتھوں سے کرنے کا ارادہ کیا۔

”آپ بہت اچھی ہیں امی۔ آپ کی جگہ کوئی اور عورت ہوتی کبھی بھی یہ سب برداشت نہ کرتی پر مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بات کو سمجھا اور نور کو اپنے دل میں بہت جلد جگہ دے دی بس آپ اب دیکھیے گا جیسے آپ نے اُس کامان رکھا وہ آپ کو اس سے دو گنا کر کے لوٹائے گی“، اُن کے کندھے پہ تھوڑی ٹکاتے معاذ کو اپنی ماں کے رویے پہ بہت خوشی ہوئی۔

”اچھا اچھا بس یہ مکھن لگنا بند کرو اور جا کر فریش ہو جاؤ ناشستہ ٹھنڈا ہو جائے گا“، اُس کی تعریفوں پر مسکراتے ہوئے عابدہ بیگم نے ٹوکا اور اُسے کمرے میں بھیجتے خود چولہے پہ چائے کا پانی چڑھانے لگیں۔

اپنے بازو پہ کسی چیز کا وزن محسوس کرتے زارون نے آنکھیں کھول کر سر اٹھایا تو نور کو اپنے بازو پہ سر رکھے سکون سے سوتا دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ٹھہڑک گیا۔ ”افف اب یہ کیا مصیبت ہے؟“ ماتھے پہ بل ڈالتے زارون نے اُس کا سر ہٹانے کی کوشش کی تو وہ مزید اُس کے قریب ہوتے اُس کے سینے سے چہرہ لگائی۔

”نور، اٹھو، سید ہی ہو کر لیتیو،“ آہستہ آواز میں اُسے پکارتے زارون نے اُسٹنکے بالوں پہ غور کیا جو پچھے بیڈ پہ بکھرے تھے۔

”نور اٹھ جاؤ،“ تھوڑا پچھے ہٹتے زارون نے اُسے جگانا چاہا جو ہلاکا سا کسمکار پھر سے سوچکی تھی۔ ”ابھی تو سکون سے سوئی ہے پر اگر اس نے خود کو میرے اتنے قریب دیکھ لیا تو میری خیر نہیں،“ دل میں سوچتے زارون نے اُس کے چہرے کو دیکھا جو روئے کی وجہ سے ابھی تک سرخ تھا۔

”آپ میرے قریب کیوں آئے؟“ اپنے چہرے پر کسی کی نظرؤں کی تیش محسوس کرتے نور نے آنکھیں کھولیں تو خود کو زارون کے اتنا قریب دیکھ کر وہ جلدی سے پیچھے ہٹی اور انجان نظرؤں سے کمرے کو دیکھتے چلائی۔

”میں نہیں میڈم تم خود آئی تھیں“، اُس کے چلانے پہ ایک دم سے ہوش میں آتے زارون نے اُس کی بات درست کی جو جلدی سے اپنا دوپٹہ زارون کے نیچے سے کھینچ کے اپنے اوپر اوڑھ چکی تھی۔

”میں؟ دماغ ٹھیک ہے آپ کا میں کیوں آپ جیسے کھڑوس انسان کے قریب آؤں گی اور زار میں آپ کو بتارہی ہوں بے شک میں نے آپ سے نکاح کر لیا پر میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں اس لیے پلیز مجھ سے دور رہیے گا“، اپنے اور اُس کے درمیان مزید فاصلہ قائم کرتے نور نے صاف لفظوں میں اُسے تنبعہ کی۔

”نکاح کوئی مذاق نہیں ہے جو تم اتنی آسانی سے یہ سب کہہ رہی کہ ہمارا کوئی رشتہ نہیں اور رہی بات تمہارے قریب آنے کی تو مجھے بھی کوئی شوق نہیں چڑھا تمہارے پاس آنے کا اگر تم نے مجبوری میں نکاح کیا تو میری بھی کوئی خوشی شامل نہیں تھی“، اُسے باور کرواتے زارون نے اُس کی اکڑ نکالنے کے لیے احسان جتا یا۔

”ہم تو نہ کرتے نکاح مجھے مر جانے دیتے کیوں روکا آپ نے بابا کو“، اُس کا راستہ روکتے نور نے زارون کے الفاظ پر بے یقینی سے ٹوٹے ہوئے دل سے سوال کیا۔

”وہ اس لیے کہ تم پہ میری وجہ سے تھمت گئی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ کل کو قیامت کے دن مجھے اللہ کے سامنے شرمندگی ہوا سی لیے تم سے نکاح کی بات کی“، دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے زارون نے وضاحت دی تو نور نے اپنی نم آنکھوں کو چھپاتے رخ پھیرا۔

”تمم ٹھیک ہے آپ فکر نہ کریں میں آپ کے راستے میں کبھی نہیں آؤں گی۔ آپ نے مجھے سہارا دیا شکریہ، بس کچھ اور دن برداشت کر لیں تاکہ میں اپنا کہیں رہنے کا انتظام کر لوں پھر بے شک مجھے طلاق دے دیجیے گا“، اُس کی بات پر دل برداشتہ ہوتے اُس نے اپنی بات مکمل کی اور سرجھ کائے صوفے پہ بیٹھ کر رونے لگی تو زارون نے طلاق کے لفظ پہ ضبط سے اپنی مٹھیوں کو بند کیا اور اُسے اُس کے حال پہ چھوڑتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

-----

”تم اکیلے کیوں آئے ہو؟ نور کو ساتھ لے کر نیچے آتے“، اُسے سڑھیاں اُترتے دیکھ کر عابدہ بیگم نے ٹوکا۔

”کیوں اُس کو سڑھیاں اُترنا نہیں آتیں یا وہ بچی ہے جو میں اُسے ساتھ لے کر آتا؟“، نور کی بات کا غصہ ماں پہ اُتارتے زارون نے جھنجھلاتے ہوئے کہا اور کرسی پیچھے کرتے بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟ لڑکے آئے ہو“، اُس کے رویے پر حیران ہوتے عابدہ بیگم نے اپنا کام چھوڑ کے اُس کے قریب آکے استفسار کیا۔ ”نہیں، میں کیوں لڑوں گا، بس بازو میں درد ہے اس لیے شاید غصہ آگیا“، ان کے پوچھنے پر جلدی سے بات بدلتے زارون نے نظریں چراکیں۔

”دیکھو بیٹا میں جانتی ہوں جو کچھ بھی ہوا وہ نور کے ساتھ ساتھ تمہارے لیے بھی نیا ہے اگر وہ اس رشتے کو قبول نہیں کر پا رہی تو تمہاری سائیڈ سے بھی حالات مختلف نہیں پر یہ جو کچھ بھی ہوا اس میں نہ تمہارا کوئی قصور ہے نہ اُس بچی کا، تمہیں تو پھر حوصلہ ہے کہ تمہارے ماں باپ تمہارے ساتھ ہیں پر اُس کے تو تمام راستے بند ہو گئے اور اب تمہارے علاوہ اُسے کسی کا سہارا نہیں اس لیے لڑنے جھگڑنے کی بجائے اُسے اپنے ہونے کا یقین دلا دتا کہ وہ جلد از جلد تم سے منوس ہو جائے“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھے عابدہ بیگم نے بے حد نرمی سے سمجھایا۔

”میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ اگر میں نے اُسے اپنا نام دیا ہے تو اُسے وہ مان اور پیار بھی دوں جس کی وہ حق دار ہے پر وہ شاید ایسا نہیں چاہتی“، ان کی بات سنتے زارون نے سچائی بیان کی۔

”وہ جیسا بھی چاہے مگر تمہارا فرض ہے کہ اس مشکل وقت میں جب اُس کا یقین، مان، بھروسہ سب ٹوٹ چکا ہے تم اُسے سنبھالو اور مجھے یقین ہے وہ بھی بہت جلد منبھل جائے گی اس لیے غصہ کرنے کی بجائے نرمی سے کام لوتا کہ اُس کا یقین جو رشتہوں سے ٹوٹ چکا ہے پھر سے بحال ہو جائے“، اُسے اعتماد دیتے عابدہ بیگم نے اُس کی پیشانی پر بوسہ دیا۔

”ٹھیک ہے پر امی آپ اُسے نہیں جانتی وہ شکل سے ہی معصوم ہے بس باقی تو پوری چڑیلیں ہے“، ماں کی بات سمجھتے زارون نے نور کے بارے میں اُنہیں آگاہ کیا۔

”اچھا بس، بیوی ہے تمہاری اور بیوی کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے“، اُسے آنکھیں دکھاتے عابدہ بیگم نے نسرین کے کچن میں آنے پر اُسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”لبی جی میں نے سب کچھ ٹیبل پہ لگادیا ہے“، اُنہیں اطلاع دیتے نسرین نے کچھ اور رکھنے کے بارے میں پوچھا۔ ”نہیں، بس تم جاؤ اور چھوٹی بی بی کو بلا کر لاؤ“، خود چائے کے لیے کپڑے میں رکھتے اُنہوں نے کہا تو وہ سر ہلاتے کچن سے نکل گئی۔

صحح ہوتے ہی ظہیر صاحب کچھ بھی کھائے پیے بغیر گھر سے نکل گئے تو نائلہ بیگم نے بھی بیٹی کے غم میں اُن کی پرواکیے بغیر اپنا اور رضا کا ناشتہ بنانے لگیں۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ اور بابا پھر سے ناشتہ کیے بغیر چلے گئے؟“، کچن میں آتے رضانے ٹیبل صاف دیکھ کر استفسار کیا۔

”خود ہی کر لیں گے باہر سے تم اُن کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کیا کل زارون نے تمہیں اپنا نمبر دیا تھا؟“، بریڈ ٹو سٹر سے نکال کر نائلہ بیگم نے صحح سے دماغ میں چلتی بے چینی کو کم کرنے کے لیے پوچھا۔

”جی دیا تھا، بات کرنی ہے آپی سے؟“، انہیں بتاتے رضانے سوال کیا۔

”ہاں کرواد و پتا نہیں دل بہت پریشان ہو رہا ہے“، اُس کی بات سنتے نائلہ بیگم کو کچھ حوصلہ ہوا۔ ”میں موبائل لے کر آتا ہوں“، اثبات میں سر ہلاتے رضانے کہا اور کچن سے نکل گیا۔

”یہ لیں بات کریں“، دو منٹ بعد وہ واپس آیا تو اُس نے موبائل نائلہ بیگم کی جانب بڑھایا۔ ”کوئی اٹھا نہیں رہا“، کچھ دیر بیل جانے کے بعد فون بند ہوا تو نائلہ بیگم نے کان سے ہٹاتے رضا کو بتایا اور نمبر پھر سے ری ڈائل کرنے لگیں۔

”تمہیں یقین ہے ناکہ یہی نمبر ہے؟“ دوسری بار بھی مایوس ہوتے نائلہ بیگم نے رضا سے تصدیق چاہی۔

”جی، یہی نمبر ہے کل زارون بھائی نے مجھے خود دیا تھا اور آپ پریشان نہ ہوں ہو سکتا ہے وہ کہیں مصروف ہوں“، ان کے چہرے پر ہوا یاں اڑی دیکھ کر رضا نے حوصلہ دیا اور موبائل لیتے انہیں کرسی پہ بیٹھا یا۔

”پتا نہیں کس حال میں ہو گی میری بیٹی“، اک بار پھر سے وسوسوں نے دماغ کا احاطہ کیا تو نائلہ بیگم نے پریشانی سے خود کلامی کی۔

”ماما میں کہہ رہا ہوں ناکہ آپی ٹھیک ہوں گی تو آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟“، چوہہ پر رکھی چائے میں ابال آتا دیکھ کر رضا نے چوہہ بند کرتے نائلہ بیگم کو تسلی دی۔

”بس ایک بار میری بات ہو جائے، ایک بار میں اپنی بیٹی کی آواز سن لوں تو میرے دل کو تسلی ہو جائے گی“، اس کا ہاتھ تھامتے نائلہ بیگم نے فکر مندی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ہو جائے گی بات میں پھر سے کال کرتا ہوں تھوڑی دیر میں۔ دیکھیے گا سب کچھ ٹھیک ہو گا اور ایک بار میری بھائی سے بات ہو جائے میں آپ کو خود ملوانے لے جاؤں گا آپی سے۔“، بس اب آپ پریشان نہ ہوں اور اٹھیں ناشستہ بنائیں مجھے بہت بھوک لگی ہے“، انہیں پھر سے نور کی فکر میں

ہلکاں ہوتا دیکھ کر رضا نے اُن کا دھیان بٹایا تو نائلہ بیگم نے اثبات میں سر ہلاتے دل میں نور کے ٹھیک ہونے کی دعا کی اور اٹھ کر رضا کے لیے ناشتہ بنانے لگیں جو ان کے کام میں لگتے ہی پھر سے زارون کے نمبر پہ کال کرنے لگا تھا۔

---

”بیٹا یہ لو، یہ بھی کھاؤ میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے“، سینڈوچ اُس کی پلیٹ میں رکھتے عابدہ بیگم نے اُسے ٹھیک سے ناشتہ کرنے کا کہا۔

”بس آنٹی میں نے کھالیا ہے“، انہیں منع کرتے نور نے جوس کا سپ لیا۔

”کیا کھایا ہے؟ ایک بریڈ وہ بھی مشکل سے اور یہ آنٹی آنٹی کیا لگار کھا ہے؟ اگر میں زارون کی امی ہوں تو تمہاری بھی امی ہوں اس لیے دوبارہ مجھے آنٹی مت کہنا“، اپنے اور اُس کے درمیان رشتتوں کے ناموں کی بنیاد مضبوط کرتے عابدہ بیگم نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھا تو ماں کے لفظ پہ نور کی آنکھیں نم ہونے لگیں جسے سرجھاتے اُس نے سب سے چھپایا۔

”بس بس امی کیا آپ بھا بھی پہ اپنا ہی حق جمائے جا رہی ہیں۔ بھئی ہمیں بھی تو زارون کے بڑے بھائی ہونے کا موقع ملنا چاہیے یا نہیں“، نور کو افسر دہ ہوتا دیکھ کر معاف نے مداخلت کی۔

”بھا بھی میں معاذ ہوں زارون کا بڑا بھائی اور اب سے آپ کا بھی“، اپنا تعارف کرواتے معاذ نے اپنایت سے کہا تو نور نے پلکیں اٹھاتے اُس لڑکے کو دیکھا جو کل سے اُن کے ساتھ تھا۔

”کیا ہوا اپنے نہیں آیا کیا میں آپ کو؟“ اُسے اپنی طرف دیکھتا پا کر معاذ نے نظروں میں شرارت لیے پوچھا۔

”نهی۔۔۔ اچھے ہیں آپ“، جلدی سے نفی میں سر ہلاتے بھائی کے لفظ پہ ہی اُس کی آواز بھرائی۔

”کیا ہوا بیٹا؟ دیکھو ایسے پریشان ہو کر تم اپنی طبیعت مزید خراب کر لوگی“، اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے احمد صاحب جو تب سے خاموش نے اُنہوں نے اُسے تسلی دی جوانجاں رشتتوں اور چہروں سے گھبرا کر رونے لگی تھی۔

”مجھے اپنے گھر جانا ہے پلیزا نکل مجھے چھوڑائیں“، اُن کے شفقت بھرے لمحے پر نور نے التجائیہ نظروں سے اُن کی جانب آس سے دیکھا۔

”گھر؟ پیٹا اب یہی تمہارا گھر ہے اور رہی تمہاری اپنے امی ابو سے ملنے کی بات تو ہماری طرف سے کوئی روک ٹوک نہیں تمہارا جب دل چاہے تم زارون کے ساتھ جا کر مل سکتی ہو“، اُس کی بات کی درستگی کرتے احمد صاحب نے اُس کا دل رکھنے کے لیے اجازت دی۔

”نہیں مجھے زار کے ساتھ نہیں جانا آپ پلیز مجھے لے جائیں۔ مجھے پتا ہے میرے بابا بہت اچھے ہیں وہ صرف وقتی طور پر مجھ پر غصہ کر رہے تھے“، پھر سے وہی ضد کرتے نور نے انہیں ظہیر صاحب کے اچھے ہونے کی دلیل دی۔

”ہاں ہم جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھے ہیں پر یہاں بھی وہ تم سے تھوڑے ناراض ہیں اور اس لیے تمہارا وہاں جانا مناسب نہیں مگر میں وعدہ کرتا ہوں کچھ دنوں تک میں خود تمہیں ان سے ملوانے لے کر جاؤں گا“، چند لفظوں میں اُسے تسلی دیتے احمد صاحب نے بات کو ٹالا تو نور نے ناراضگی لفظ پر غور کرتے خاموشی اختیار کرتے عابدہ بیگم کی جانب دیکھا۔

”بیٹانا شستہ کرو پھر ہم معاذ کے ساتھ بازار چلتے ہیں تاکہ تمہاری شاپنگ وغیرہ کر لیں“، اُس کے میلے کپڑوں کو دیکھتے عابدہ بیگم نے وہاں چھائی اداسی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

”پر میرے پاس تو پیسے نہیں ہیں“، ان کی بات سنتے نور نے ٹشو سے اپنی ناک صاف کرتے معصومیت سے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”تو کیا ہوا میرے پاس تو ہیں نا اور معاذ کے پاس بھی، تمہیں جو چاہیے ہوا ہم لے دیں گے“، اُس کی معصومیت پر مسکراتے ہوئے عابدہ بیگم نے تسلی دی تو نور نے سر ہلاتے اپنا چہرہ صاف کیا اور زارون کی طرف دیکھتے گلاں میں بچا جو س ختم کرنے لگی جوتب سے خاموش بیٹھانا شستہ کر رہا تھا۔

دو پھر دو بجے کے قریب ارحم کی آنکھ کھلی تو اس نے رات رابعہ کی نارا ضگی کا سوچتے اُسے کال ملائی۔

”جی فرمائیں کیوں زحمت کی ہے؟“ دو چار بار کال ڈسکنٹ کرنے کے بعد جب دوسری طرف ڈھیٹ پن برقرار رہا تو رابعہ نے گھری سانس لیتے کال رسیو کی۔

”وہ بس صحیح ایک خوبصورت اور میٹھی آواز سننے کا دل تھا اس لیے سوچا تمہیں کال کر کہ تمہاری آواز سن لوں“، اُس کے غصے کی پرواکیے بناء ارحم نے ایک جذبے کے تحت گھمبیر لبھے میں اپنے احساسات کا اظہار کیا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری خواہشات۔ رات کو میری ہی آواز تھی جس سے تنگ آکر تم نے مجھے ڈانٹا تھا“، اپنی نارا ضگی برقرار رکھتے رابعہ نے شکوہ کیا۔

”اچھا نامیری جان سوری میں بس تھا کہا ہوا تھا اس لیے شاید تم سے بد تمیزی کر گیا ورنہ میری کہاں اتنی مجال کے میں تمہیں کچھ کہوں“، معدرت کرتے ارحم نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی تو رابعہ کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔

”ہو، ہی بد تمیز تم اور ایسے معافی نہیں ملے گی“، نخرے سے کہتے اُس نے اپنی بات کو ادھورہ چھوڑا۔

”تو کیسے ملے گی؟ بتاؤ مجھے تمہاری ہر سزا منظور ہے“، کھلے دل سے کہتے اُس نے ایک بھرپور انگڑائی لی۔ ”مجھے نور سے ملنا ہے ابھی اور تم مجھے ملوانے لے کر جاؤ گے زارون کے گھر“، اپنی شرط بتاتے اُس نے حدیہ کو دو منٹ میں آنے کا اشارہ کیا جو تیسری بار ریحانہ بیگم کا پیغام لے کر آئی تھی۔

”منظور ہے، تم تیار ہو میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں“، حامی بھرتے ارحم نے کمفرٹر ہٹا یا تو دوسرا طرف رابعہ نے خوشی سے جلدی آنے کا کہتے کال کاٹ دی۔

”ہوننہ اپنا مطلب پورا ہوا تو تم کون اور میں کون“، اُس کے کال کا ٹنے پر کڑھتے ہوئے ارحم نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کر فریش ہونے چلا گیا۔

-----

مراد شاہ اور حیدر شاہ کے پشاور ایک جلسے میں شرکت کرنے کے لیے جاتے ہی فاطمہ نے ماں سے ایک سیہیلی کے گھر جانے کی ضد کی تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

”خاموشی سے گھر بیٹھو، اپنے باپ اور بھائی کا پتا ہے نا؟ اگر انہیں زرائی بھی بھنک پڑ گئی تو وہ تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی جان سے مار دیں گے“، کپڑوں کو تہہ لگا کر الماری میں رکھتے بشری خاتون نے اسے انجمام سے آگاہ کیا۔

”اماں جانے دیں نا، پہلے بھائی اور بابا سنیں کم ہیں جو آپ بھی میرے آنے جانے پر روک ٹوک کرنے لگ گئی ہیں“، منہ پھلاتے اُس نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو بیٹی کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر بشری خاتون نے چاروں ناچار اجازت دے دی۔

”چلی جاؤ پر اپنے بابا سنیں کے آنے سے پہلے گھر آجانا“، ”ٹھیک ہے آجاوں گی بس آپ پریشان نہ ہوں“، اُن کی بات پر مسکراتے فاطمہ نے خوشی سے اُن کے گلے لگتے شکریہ ادا کیا اور اپنی چادر اوڑھتے باہر کی جانب بڑھی۔

”چلیں؟“ باہر آتے ہی رشیدہ کو ایک کونے میں اپنے انتظار میں کھڑا دیکھ کر فاطمہ نے کہا تو اُس نے سر ہلاتے چادر سے اپنا چہرے چھپایا اور گاؤں کے اُس راستے پر چلنے لگی جو قدرے ویران تھا۔

”مجھے تو لگا کہ آج بڑی بی بی تمہیں اجازت نہیں دیں گی“، اوپنجی پنجی پنگڈیوں پر چلتے رشیدہ نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”ایسے ہی اجازت نہیں دیں گی۔ میری رو نے والی صورت دیکھ کر تو اماں کا دل ویسے ہی پکھل جاتا اور آج تو صورت کیا اگر وہ اجازت نہ دیتیں تو میں رو بھی پڑتی“، آنکھوں میں شرارت لیے فاطمہ نے اُس کا ہاتھ تھامتے کچی نہر کو پار کیا جو لمبائی میں زیادہ اور چوڑائی میں کم تھی۔

”ہاں ہاں جانتی ہوں۔ محبوب سے ملنے کے لیے تو جان کی بازی لگادے یہ تو بس ایک اجازت تھی“، اُس کی بات پر مسکراتے رشیدہ نے اُسے چھیڑا۔

”بس بس زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں اور آہستہ بولو کسی نے سُن لیا تو میری شامت آجائے گی“، آس پاس دیکھتے فاطمہ نے اُسے خبردار کیا جو ہو نؤں پہ ہاتھ رکھے چپ رہنے کا اشارہ کرتے آگے قبرستان کے ساتھ موجود کچی سڑک کی جانب بڑھی جہاں سے گزر کر انہیں ملک ذیشان کی بتائی ہوئی جگہ تک پہنچنا تھا۔

-----

ناشته وغیرہ کرنے کے بعد عابدہ بیگم نے نور کو ساتھ لیے مارکیٹ کارخ کیا جہاں سے اُس کی ضرورت کی ہر چیز لینے کے بعد وہ دونوں گھر پہنچی تو ارحام کے ساتھ ساتھ رابعہ کو بھی اپنا منتظر پایا۔ ”رابعہ تم کب آئیں؟“، شاپر وہیں صوفے پر رکھتے کسی اپنے کے احساس پر نور نے خوشی اُسے گلے لگایا۔

”بس ابھی آئی ہوں“، اُس کی بات کا جواب دیتے رابعہ نے عابدہ بیگم کو سلام کیا۔  
”السلام علیکم آنٹی“۔

”و علیکم السلام کیسی ہو بیٹا؟ امی ابو کیسے ہیں؟“، اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے عابدہ بیگم نے اُسے بیٹھنے کا کہتے خوشدلی سے پوچھا۔

”جی سب ٹھیک ہیں“، انہیں جواب دیتے رابعہ نے نور کو بھی اپنے قریب بیٹھایا۔  
”اچھا نور تم رابعہ کو اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ میں تم لوگوں کے لیے جو سبھ جو اتی ہوں“، ارح  
کے حال احوال کے بعد عابدہ بیگم نے اُس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا جو پہلے ہی رابعہ سے تہائی  
میں بات کرنا چاہا رہی تھی۔

”آوا اور چلتے ہیں“، ایک نظر زارون کو دیکھتے جوار حم کے ساتھ باتوں میں مشغول تھا اُس نے رابعہ  
سے کہا اور اپنے ساتھ لیے اوپر کمرے میں آگئی۔

”کیا ہوا یار ایسے رو کیوں رہی ہوں؟“، کمرے میں آتے ہی نور کی تمام ہمتیں جواب دے گئیں۔  
رابعہ کے گلے لگتے ہی زار و قطار رونے لگی۔

”نور پلیز خود کو سن بھالو، کیوں ایسے رو رو خود کو ہلاکان کر رہی ہو؟“، اپنے ساتھ لیے صوفے پہ  
بیٹھتے رابعہ نے اُس کا چہرہ صاف کیا۔

”روؤں نہیں تو اور کیا کروں؟ تمہیں پتا ہے بابا نے میرے ساتھ کیا کیا؟“ اُسے لگا کہ رابعہ ہر بات سے انجان ہے تب ہی سو سو کرتے اُس نے سوالیہ نظرؤں سے اُسے دیکھا۔

”جانتی ہوں سب بس تم اُس بارے میں سوچ کر خود کو پریشان نہ کرو اور غلطی میری تھی۔ میں تمہیں اکیلا چھوڑ کر گئی۔ نہ امی کی طبیعت خراب ہوتی نہ میں تمہیں زارون ساتھ جانے کا کہتی اور نہ ہی تمہارے ساتھ یہ سب ہوتا“، شرمندگی سے سر جھکاتے رابعہ نے خود کو قصور وار ٹھہرا�ا۔

”غلطی تمہاری نہیں بلکہ میری تھی جو میں نے بابا کو کال کرنے کی بجائے زارون کے ساتھ جانے کی حامی بھری“، ہاتھ کی پشت سے آنکھیں صاف کرتے نور نے اعتراف کیا۔

”اچھا بس تم اب رونا بند کرو اور شکر کرو کہ زارون کی فیملی نے تمہیں قبول کر لیا۔ ورنہ تو آج کل ایسے حالات ہیں کہ لوگ اپنی پسند کی ہوئی بہوؤں کو قبول نہیں کرتے“، اُس کے ہاتھ پر نرمی سے دباوڈلتے رابعہ نے سمجھایا۔

”ہاں زارون کی ماما بہت اچھی ہیں اور انکل بھی پر بابا نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا اُنہیں میری بات سننی چاہی تھی۔ انہوں نے تو مجھ سے وضاحت تک نہیں مانگی، میں ان کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ بُرے ہیں وہ“، اپنے دل کو لا کھ سمجھانے کے باوجود بھی آنسو تو اتر سے بہہ نکلے تو نور نے رابعہ سے کہنے کے ساتھ ساتھ اپنے دل میں ارداد کیا۔ ”ایسے نہیں کہتے اور یار ماں باپ بھی

کوئی چھوڑنے کی چیز ہیں۔ دل میں لاکھ شکوے صحیح پر جب کوئی اپنا سامنے آتا ہے تو انسان خود کو کنٹرول نہیں کر سکتا اور تم دیکھنا انکل کو اپنی غلطی کا بہت جلد احساس ہو جائے گا، اُسے سمجھاتے رابعہ نے تسلی دی۔

”م نہیں احساس ہو یا نہ ہو مگر میں کبھی بھی انہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤ گی“، نفی میں سر ہلاتے نور نے دو پٹے سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا اور دروازے کی جانب متوجہ ہوئی جہاں نسرین ہاتھ میں جو س لیے اُس سے اندر آنے کی اجازت مانگ رہی تھی۔

”جی آجائیں“، نور کی بجائے رابعہ نے اُس سے کہا تو وہ ٹرے ٹیبل پر رکھتے واپس چلی گئی۔ ”رابعہ پلیز تم میرا کہیں رہنے کا انتظام کر دو مطلب کسی ہائل وغیرہ میں“، اُس کے جاتے ہی نور نے خود کو سنبھالتے درخواست کی۔

”مطلب؟ یا ری یہ تمہارا ہی گھر ہے زارون کے ساتھ تمہارا کوئی معمولی رشتہ نہیں جو تم یوں پا گلوں جیسی باتیں کر رہی ہو“، اُس کی بات سنتے ہی رابعہ نے کرنٹ کھاتے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ کے نیچے سے کھینچا۔

”بس مجھے یہاں نہیں رہنا اور یہ رشتہ مجبوری کی بنیاد پر بنتا ہے جو جب چاہے ختم ہو سکتا ہے، اس لیے پلیز تم ارحم بھائی سے کہہ کے میرا کوئی انتظام کر دو“۔

”یا ر تم بالکل پاگل ہو گئی ہو۔ اتنا پیار کرنے والے لوگ ہیں اور بے شک یہ رشتہ مجبوری میں بنایا پر آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ نور میری جان زارون بہت اچھا ہے وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا بس تم کوئی بھی ایسا ویسا قدم نہ اٹھنا جس سے بعد میں تمہیں پچھتا ناپڑے اور اب یہی تمہارا گھر ہے خود کو ان لوگوں میں ایڈ جسٹ کرنے کی کوشش کرو“، نرمی سے اُس کی اہمیت بتاتے رابعہ نے سمجھایا تو نور نے ناچاہتے ہوئے بھی خاموشی اختیار کی۔

”پلیز میری باتوں کا براامت منانا۔ میں یہ سب تمہاری بہتری کے لیے کہہ رہی ہوں“، اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے رابعہ نے اُس کی خاموشی پہ وضاحت دی تو نور نے سر ہلا�ا۔

”دیکھو نور آج کل جو حالات ہیں اس میں اکیلی لڑکی کا کسی ہاٹل میں رہنا آسان نہیں۔ میری جان تم نہیں جانتی یہ دنیا بہت ظالم ہے۔ جگہ جگہ درندے شکار کی تلاش میں منہ کھولے کھڑے ہیں اور تم تو ابھی ایک مصیبت سے نکلی ہو۔ میرے خیال سے یہ سب باتیں اور سوچ تمہیں کسی نئی مصیبت میں نہ پھنسادیں اس لیے مرد بے شک عورت کو دل سے قبول نہ کرے مگر اُس کا سہارا اور حوصلہ ہی عورت کے لیے ایک گھنی چھاؤں ہوتا ہے جس میں رہ کر عورت ہمیشہ محفوظ رہتی ہے۔ دیکھو یار ہم صرف دوست نہیں ہے بلکہ بہنوں سارہ شستہ ہے ہمارا اور میں نے آج تک کبھی تمہیں غلط مشورہ نہیں دیا اور ابھی بھی میں تم سے جو کچھ کہہ رہی ہوں اگر تم اُس پہ عمل کرو گی تو

ساری زندگی سکون میں رہو گی، اُس کی نظر وہ میں کشمش دیکھ کر رابعہ نے کھلے الفاظ میں اُسے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں دوبارہ ایسی کوئی بات نہیں کروں گی“، اُس کی باتوں پہ غور کرتے نور نے دوپٹے سے اپنی ناک صاف کی۔

”مگر گرل، بس کوشش کرو کہ اپنے اور زارون کے رشتے کو مضبوط کرو اور مجھے یقین ہے اگر تم پہل کرو گی تو زارون کبھی بھی تمہیں مایوس نہیں کرے گا“، ڈھکے چھپے الفاظ میں آنکھوں میں شرارت لیے اُس نے نور نے کہا۔

”مطلوب کون سی پہل؟“ نا سمجھی سے اُس کی طرف دیکھتے نور نے معصومیت سے پوچھا تو رابعہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”کوئی نہیں میری اماں تم بس چپ کر کہ جو س پیو“، گلاس اٹھا کر اُسے تمہاتے رابعہ نے اپنی مسکراہٹ چھپائی تو نور نے اُس کی بات کو فراموش کرتے اُسے بھی جو س پینے کا کہا۔

-----  
”یار اتنا تامِ لگا دیا تم نے۔ میں کب سے یہاں کھڑا تمہارا انتظار کر رہا ہوں“، دو لڑکیوں کو اپنے قریب آتا دیکھ کر ملک ذیشان نے اُن کی جانب آتے بے زاری کا اظہار کیا۔

”بس بس اتنی بھی دیر نہیں ہوئی“، چار دسے اپنا چہرہ چھپائے فاطمہ نے رشیدہ کو وہیں رہنے کا اشارہ کرتے ذیشان کو آنکھیں دکھائیں۔

”ہاں زیادہ نہیں، بس دو گھنٹے ہوئے ہیں“، اُس کے گھورنے پر برامنا تے ذیشان نے ایک بھرپور نظر اُس کے سراپے پہ ڈالی جو مکمل طور پہ چار دسے میں چھپی تھی۔

”اب یہیں کھڑے رہ کر اعتراض کرنے کا ارادہ ہے یا بیٹھنے کا بھی کہو گے؟“ اُس کی نظروں سے گھبرا تے فاطمہ نے بات بدلتی تو ذیشان نے مسکراتے ہوئے دوسری جانب بنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں میں یہاں اکیلے میں نہیں جاؤں گی“، ذیشان نے رشیدہ کے قدم اٹھانے پر اُسے وہیں رہنے کا کہا تو فاطمہ نے جلدی سے انکار کیا۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ اور میں ہوں نا ساتھ تم کون سا اکیلی ہو؟“ اُس کی بات کا برامنا تے ذیشان نے رعب دار لمحے میں کہتے اُس کا ہاتھ تھاما۔

”ذیشان میں نے تمہیں ایسی حرکتیں کرنے سے منع کیا تھانا؟ اور جو بات کرنی ہے یہیں کرلو میں اندر نہیں جاؤں گی“، اُس کے چہرے پہ بکھرتی عجیب و حشت کو دیکھ کر فاطمہ نے اپنے اور اُس کے درمیان دو قدم کا فاصلہ قائم کیا۔

”بات تو میں اندر جا کر ہی کروں گا اور رہی بات ایسی حرکتوں کی تو میری جان لگتا ہے تم نے باہر کی دنیا نہیں دیکھی جو اس طرح اپنے بوائے فرینڈ کے چھونے پہ اعتراض کر رہی ہو پر اگر تمہیں اچھا نہیں لگتا تو میں اب تمہیں ہاتھ نہیں لگتا مگر اندر تو چلو مجھے تم سے کوئی ضروری بات کرنی ہے،“ ذیشان جو کافی دنوں سے فاطمہ سے اکیلے ملنے پہ بضد تھاؤں نے ہاتھ آئے موقع کو اپنی سختی سے گنو انا مناسب نہیں سمجھا۔

”اچھا ٹھیک ہے پر میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی،“ اُس کی ناراضگی کے ڈر سے فاطمہ نے حامی بھری اور رشیدہ کو پانچ منٹ میں آنے کا اشارہ کرتے اُس کے ساتھ کمرے کی جانب بڑھی جہاں داخل ہوتے ہی ذیشان نے دروازہ بند کیا۔

-----

”تم نے دروازہ لاک کیوں کیا؟ ذیشان دروازہ کھولو مجھے گھر جانا ہے،“ اُس کے دروازہ بند کرتے ہی فاطمہ کو احساس ہوا کہ وہ اُس کے ساتھ وہاں اندر آ کر ایک سنگین غلطی کر چکی ہے۔  
”اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو میں نے تمہیں ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں،“ آنکھوں میں حوس لیے ذیشان نے مسکراتے ہوئے اپنے اور اُس کے نیچے قائم دو قدم کا فاصلہ طے کیا۔

”دیکھوڈیشان مجھے جانے دو، اماں پر دیشان ہو رہی ہوں گی“، اُس کے قریب آتے ہی فاطمہ نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور اپنی چادر کو مضبوطی سے پکڑتے دروازے کی جانب بڑھی تو دیشان نے اُس کا ہاتھ تھامے اُسے روکا۔

”میں نے کتنی بار کہا ہے کہ یوں میرا ہاتھ نہ پکڑا کر“، اُس کا ہاتھ جھکتے اب کی بار فاطمہ نے غصے سے چلاتے ہوئے اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھتے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”کیوں نہ پکڑوں ہاتھ؟ تیرا بھائی لوگوں کی عزتوں کو داغ دار کر کہ انہیں زندہ اپنے کتوں کے آگے ڈال دیتا ہے اور میں تیرا ہاتھ بھی نہ پکڑوں۔ واہ جی واہ بھائی جلا دا اور بہن پارسا“، ایک دم سے اُس کی چادر اُس کے سر سے کھینچتے دیشان نے اُسے پوری قوت سے اٹھا کر بیڈ پہنچا۔

”نہیں، مراد سائیں ایسے نہیں ہیں۔ تم جھوٹ بول رہے ہو“، نفی میں سر ہلاتے فاطمہ نے بے یقینی سے کہتے اٹھنے کی کوشش کی۔

”ہاہاہا، میں جھوٹ بولوں گا؟ میں؟ جس کی اپنی بہن کو تیرے مراد سائیں نے اپنی حوس کا نشانہ بنا کر اپنے ملازموں کے سامنے پیش کر دیا۔ پورے تین دن...“، اُس کے اوپر جھکتے دیشان نے اذیت سے اپنی آنکھوں کو بند کرتے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

”پورے تین دن وہ لوگ میری بہن کے ساتھ ظلم کرتے رہے اور اُس کے بے جان ہوتے ہی اُس کی لاش کھیتوں میں پھینک دی اور تم چاہتی ہو میں تمہیں جانے دوں؟“ اس کی گردن کوزور سے دبوچے ذیشان نے اپنی پیشانی کی رگوں کو مزید سخت کرتے اپنے جڑے بھینچتے ہوئے کہا۔

”تم کیا کر رہو، خدا کا واسطہ مجھے جانے دو“، اُس کا ہاتھ اپنی گردن سے ہٹاتے فاطمہ نے اُسے اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔

”بکواس بند کرو اور یہ جانے کا خیال دل سے نکال دو کیونکہ تمہارا انجمام میری بہن سے بھی کہیں زیادہ بھیانک ہو گا“، قہقهہ لگاتے اُس نے فاطمہ کے ہاتھ پاؤں مارنے پر اُس کے دونوں بازوں کو اپنی گرفت میں لیتے اُس کی چادر سے باندھ دیا۔

”ذیشان تمہیں اللہ کا واسطہ مجھے جانے دو۔ مراد سائیں کے کیسے گئے گناہ میں میرا کیا قصور؟ تمہیں تمہاری بہن کی قسم مجھے جانے دو“، اپنی گردن پر اُس کی سانسوں کی تپش محسوس کرتے فاطمہ نے ترپتے ہوئے خود کو اُس کے شیطانی ارادوں سے بچانے کی کوشش کی جو بہن کا نام سننے ایک دم سے ہوش میں آتے فاطمہ کی گردن پہ دباو کم کر چکا تھا۔

”خدا کے لیے مجھے جانے د۔، کیوں تم ایک طاقتور کا بدله مجھ کمزور سے لے رہے ہو؟ ایسا مت کرو۔ کیوں تم بھی مراد سائیں کی طرح ایک عورت کی عزت کو پامال کر کہ یہ سمجھ رہے ہو کہ تم

اپنی بہن کا بدلہ لے لو گے؟ یہ کوئی مكافات عمل نہیں ہے کہ جس نے جو کیا اُس کے ساتھ وہی کر کہ اُسے سبق سیکھایا جائے بلکہ یہ ظلم ہے۔ میں بھی کسی کی بہن، بیٹی ہوں۔ جیسے تمہاری بہن کا قصور نہیں تھامیرا بھی نہیں ہے۔ اس لیے تم ظالم کو ختم کرو کیونکہ ظلم ظالم کو ختم کرنے سے ختم ہوتا ہے مجھ سے یہ سب کر کہ تمہیں کچھ حاصل نہیں ہو گا، اُس کی گرفت نرم پڑتے ہی فاطمہ نے آنسو بھاتے گڑ گڑاتے ہوئے کہا۔

”ہاہاہا مجھے بہت کچھ حاصل ہو گا جب تمہارا بھائی وہی درد، وہی اذیت محسوس کرے گا جو میں نے محسوس کی تو میرا انتقام پورا ہو جائے گا، اُس کے جبڑوں کو مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں دبوچ ذیشان نے ایک زوردار تھپڑا اُس کے چہرے پہ مارا۔

”کچھ محسوس نہیں ہو گا انہیں، کوئی اذیت کوئی تکلیف کچھ بھی محسوس نہیں ہو گا وہ تمہاری طرح نرم دل نہیں ہیں جو بہن کی موت کو دل پلے کر بدلہ لینے نکل پڑیں۔ وہ تو پتھر دل ہیں انہوں نے میرے زندہ ہونے پہ کبھی میرا احساس نہیں کیا تو میرے بے آبر و ہونے پہ کیا کریں گے، بس میری اماں مر جائے گی۔ خدا کے لیے اپنی بہن پہ ظلم کا بدلہ اُسی کے جیسی کمزور سے نہ لو، اُس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر فاطمہ نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

”تو مر جائے پر میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ پورا ایک سال میں نے اس دن کا انتظار کیا ہے اور تم چاہ رہی ہو میں تمہاری باتوں سے متاثر ہو کر تمہیں جانے دوں؟ نہیں، ہر گز بھی نہیں“، اس کی باتوں کے بہر کا وے میں آنے کی بجائے ذیشان نے اپنی کارروائی پر عمل کیا تو اپنی توہین پر فاطمہ کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس نے چلاتے ہوئے خود کا بچاؤ کرنے کی کوشش کی اور رشیدہ کو آوازیں لگانے لگی جسے ملک ذیشان کا بندہ پہلے ہی وہاں سے ہٹا چکا تھا۔ ”ذیشان میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔ چھوڑو مجھے اس کی بڑھتی ہوئی پیش رفت سے گھبرا کر فاطمہ نے چیخنے کی کوشش کی پر اس سے پہلے ہی ذیشان نے اس کی چار دکا ایک سر اس کے منہ میں ٹھونستے اس کی چیخوں اور فریادوں کا گلا گھونٹ دیا۔

”یہ کیا کر رہے ہو تم؟ ہٹو اس کے اوپر سے“، فاطمہ کی کوششوں نے دم توڑا تو اچانک ہی کسی نے دروازہ توڑ کر اندر آتے ذیشان کو اس کے اوپر سے ہٹایا جو اسے جانوروں کی طرح نوچنے کی کوشش میں تھا۔

”دماغ درست ہے تمہارا؟ کیا کر رہے تھے یہ تم؟“ ایک کے بعد ایک ٹھپڑذیشان کے چہرے پہ جڑتے ملک شہزاد نے اُسے پیچھے کی جانب دھکا دیا جو انتقام کی آگ میں اس قدر بھٹک چکا تھا کہ فوری طور پر ان کے تاثر پر کوئی رد عمل نہ دے سکا۔

”اُنھوپیٹا،“ اپنے پیچھے آتے ملازموں کو باہر جانے کا اشارہ کرتے ملک شہزاد نے فاطمہ کے منہ سے چادر کا سرا انکالا اور اُس کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے نظریں چراتے اُس کے ہاتھ کھول کے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُن کے ملازم نے انہیں ذیشان کے ارد اوں کے بارے میں بروقت آگاہ کر دیا۔

”بابا سائیں آپ نہیں جانتے کہ یہ کون ہے۔ یہ مراد شاہ کی بہن ہے ہمارے دشمن کی عزت،“ ہوش و حواس قائم ہوتے ہی ذیشان نے باپ کے آگے صفائی پیش کی جو فاطمہ کو بھٹھاتے اُس کو چادر اوڑھا چکے تھے۔

”عزت بے شک دشمن کی ہو یادوست کی عزت، عزت ہوتی ہے اور کیا کر رہے تھے تم اس کے ساتھ؟ شرم نہیں آئی تمہیں ایک لڑکی کی عزت پہ ہاتھ ڈالتے ہوئے؟ ڈوب کر مر جانے کا مقام ہے تمہارا،“ اُس کے گریبان کو پکڑتے ملک شہزاد نے اُسے جنجنھوڑا تو ذیشان نے زندگی میں پہلی بار باپ کو اس قدر رغصے میں دیکھ کر نظریں جھکا لیں۔

”تمہیں مراد شاہ سے نفرت تھی نا؟ کیونکہ اُس نے تمہاری بہن کو بے آبر و کیا تو پھر آج تم اپنے آپ سے بھی نفرت کا ایک باب کھول لو کیونکہ تم بھی آج وہی کچھ کرنے جا رہے تھے جس کی بنیاد پر تمہیں مراد شاہ سے نفرت تھی“، بیٹے کی حرکت پر اُس کی غلطی کا احساس دلاتے ملک صاحب نے ایک نظر فاطمہ کو دیکھا جو گھنٹوں میں سرچھپائے رورہی تھی۔

”مراد شاہ کی غلطی میں اس معصوم کا کیا قصور؟ تم خود کو مرد کہتے ہو تو لعنت ہے تمہارے مرد ہونے پر جسے یہ تک نہیں معلوم کہ عزتوں کے بد لے عزتوں کا جنازہ نکالنے سے انتقام پورے نہیں ہوتے بلکہ تمہاری بہن جیسے ہی مردہ وجود بنتے ہیں۔ بتاؤ مجھے کیسے تمہارے ضمیر نے تمہیں یہ سب کرنے کی اجازت دی؟ کون سی کمی رہ گئی تھی میری تربیت میں جو تم نے انسان سے جانور بننے میں ایک پل کے لیے میرے بارے میں نہیں سوچا“، اپنا سر ہاتھوں میں تھامے ملک صاحب نے دکھ کی کیفیت میں ذیشان کے منہ پر ایک اور تھپڑ رسید کیا جواب بے یقینی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔

”بابا سماں یہ سب مكافات عمل ہے جو اس کے بھائی نے میری بہن کے ساتھ کیا۔ اس کے ساتھ بھی وہی ہونا چاہیے تاکہ مراد شاہ کو پتا چلے کہ عزت نیلام ہونے کی اذیت کیا ہوتی ہے“، اپنی ہٹ دھرمی برقرار رکھتے ذیشان نے باپ کے خوف کو ایک سائیڈ پر رکھتے دلیری کا مظاہرہ کیا۔

”کون سا مكافات عمل؟ مكافات عمل یہ نہیں کہتا کہ ظالم کو چھوڑ کر کسی مظلوم کو سزادے دو اور نہ

ہی مکافات عمل یہ کہتا ہے کہ اپنی بہن کا بدلہ دشمن کی بہن کی عزت کو نیلام کر کے لوگروہ تمہاری بہن تھی تو یہ بھی کسی کی بہن، بیٹی ہے اور میں یہ ہرگز برداشت نہیں کروں گا کہ تم جیسا جانور مکافات عمل کی آڑ میں کسی اور بیٹی کی زندگی بر باد کرے“، اپنی جیب سے گن نکال کر ذیشان کی جانب کرتے ملک شہزادے اُس کے الفاظ کا گلا گھوٹا۔

”بابا سائیں کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپ اس دشمن کی بیٹی کے لیے اپنے بیٹے کو مارنا چاہتے ہیں؟“ ان کے ہاتھوں کی جانب دیکھتے ذیشان نے دکھ سے اپنی غلطی ماننے کی بجائے ملک صاحب کو شرمندہ کرنا چاہا۔

”میں مجبور ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میر ایڈم اور ادا شاہ کی طرح بنے اور آج میں نے اگر تمہاری غلطی کو معاف کر دیا تو یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہو گی“، اپنی آنکھیں بند کرتے ملک صاحب نے ذیشان کو اپنی صفائی میں مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر فائر کیا جو سیدھا اُس کے سر کے آر پار ہو گیا۔

”سائیں یہ کیا کیا آپ نے؟“ ذیشان کو بے سدھ زمین پر پڑا دیکھ کر فاطمہ نے خوف سے چیختے دونوں ہاتھ اپنے منہ پر رکھے۔

”اچھا کیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا بیٹا دوبارہ سے کسی کی بیٹی کی عزت پہ ہاتھ ڈالے“، تھکے ہوئے وجود کے ساتھ کرسی پہ ڈھیر ہوتے ملک شہزاد نے فاطمہ کو اشارے سے وہاں سے جانے کا کہا جو ابھی تک خوف کے زیراثر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ذیشان کے سر سے خون نکلتا دیکھ رہی تھی۔

”جاویہاں سے اس سے پہلے کہ کوئی تمہیں بیہاں دیکھے“، کمزور بوڑھی آنکھوں سے نکلتے آنسو ان کے داڑھی میں جذب ہونے لگے تو ملک شہزاد نے گرجتے ہوئے فاطمہ کو وہاں سے جانے کا کہا جو فوراً ہی اپنی چادر سر پہ ڈالے وہاں سے نکل گئی۔

”سامنیں یہ کیا کیا آپ نے؟“ فاطمہ کے وہاں سے جاتے ہی ملک شہزاد کے وفادار ملازم نے اندر آتے ذیشان کو بے سُدھ زمین پہ لیٹا دیکھ کر جلدی سے اُس کی جانب بڑھتے اُس کی سانسوں کو چیک کیا جو رک چکی تھیں۔

”سامنیں میں نے اس لیے تو آپ کو نہیں بتایا تھا کہ آپ چھوٹے سامنیں کو جان سے مار دیں“، اُس کی آنکھوں کو بند کرتے غلام رسول نے دکھ سے شکوہ کیا۔

”جانتا ہوں، اگر گھوڑا بے لگام ہو جائے تو اسے کھلا چھوڑنا یو قوñ ہے اور ذیشان کی آنکھوں میں جو بغاؤت مجھے نظر آئی وہ آنے والے وقت میں بہت خطرناک ثابت ہو سکتی تھی“، اس کی حرکت سے زیادہ مجھے اُس کی بے خوفی نے حیران کیا بس اسی لیے میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کی جان لے لی۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اسے قتل کر دیا غلام رسول.... کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے انتقام کی آگ میں بے لگام ہوتے جذبات کی نظر کسی کی بہن بیٹی ہو۔ میں نے اپنے بیٹے کو مار دیا۔ میں نے اُس کی بغاؤت اور گناہ کے ڈر سے اسے مار دیا۔ اُس بچی کو اُس حالت میں دیکھ کر مجھے اپنی ماہم یاد آگئی بس مجھ سے برادر شت نہیں ہوا ایسا لگا کہ پھر سے وقت اپنے آپ کو دوہر ا رہا ہے پھر سے ایک مراد شاہ جنم لینے والا ہے“، پاگلوں کی طرح چلاتے ملک شہزاد نے اٹھ کر ذیشان کا سر اپنی گود میں رکھا تو ایک باپ کی تکلیف پر غلام رسول کی آنکھیں بھی نہ ہو گئیں۔

”ماش میں آپ کو چھوٹے ملک کی حرکت کے بارے میں نہ بتاتا تو یہ سب نہ ہوتا“، ان کے کندھے پہاڑھر کھتے غلام رسول کو اپنی مخبری پہ افسوس ہوا جو اُس نے ذیشان کے بھلے کے لیے کی تھی۔

”نہیں، تمہارا کوئی قصور نہیں اور جس کا قصور تھا اسے سزا مل چکی ہے“، دوبارہ اُس کا سرز میں پہ رکھتے ملک صاحب نے اپنی گپت اتارتے ایک آخری نظر اپنے لخت جگر پہ ڈالی اور غلام رسول کے روکنے کے باوجود بھی کمرے سے باہر نکل گئے۔

---

رابعہ لوگوں کے جاتے ہی زارون نے کمرے میں آتے اپنا موبائل چیک کیا جو صحیح سے کمرے میں موجود تھا۔

”یہ کس کا نمبر ہے؟“، ایک انجان نمبر سے لا تعداد کا لزد یکھ کر زارون نے کال بیک کی اور نور کی جانب دیکھنے لگا جو عابدہ بیگم کے دلائے ہوئے کپڑوں میں سے ایک سوت پہن کرواش روم سے باہر آئی تھی۔

”السلام علیکم زارون بھائی، میں رضا بول رہا ہوں نور آپی کا بھائی“، زارون کی کال دیکھ کر رضانے اُس کے فون بند کرنے کے ڈر سے جلدی سے اپنا تعارف کروا یا۔

”و علیکم السلام کیسے ہو؟ اور سوری وہار حم آیا تھا تو میں صحیح سے نیچے ہی ہوں۔ موبائل کمرے میں تھا اس لیے مجھے پتا نہیں چلا“، اُس کے تعارف پر زارون نے خود ہی ساری تفصیل بتادی۔

---

”اچھا کوئی بات نہیں وہ بس ماما پریشان تھیں۔ آپ سے بات کرنے کا کہہ رہی تھیں اس لیے میں نے آپ کو زحمت دی“، اُس کے بتانے پر رضا نے نرمی کے ساتھ اُس سے معذرت کی۔

”اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔ تم جب چاہو مجھے کال کر سکتے ہو اور یہ لوکر لونور سے بات“، اُس کی بات پر مسکراتے زارون نے موبائل نور کی جانب بڑھایا۔

”رضاء ہے تم سے بات کرنا چاہتا ہے“، اُس کے سوالیہ نظروں سے دیکھنے پر زارون نے بتایا تو نور نے جھٹ سے فون پکڑتے کان سے لگایا۔

”رضاء کیسے ہو تم؟ ماما کیسی ہیں؟ اور بابا؟“، اُس کی آواز سنتے ہی نور کی آواز بھرائی۔

”سب ٹھیک ہیں آپ کیسی ہیں؟“، اُس کی بات کو جواب دیتے رضا نے پوچھا اور موبائل لے کر نائلہ بیگم کے کمرے میں آگیا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں“، کسی اپنے کے ہونے کا احساس ہوتے ہی ایک بار پھر سے آنسوؤں نے آنکھوں کے بند توڑے تو نور نے زارون کی موجودگی پر اپنا رخ پھیرا۔

”پلیز آپ روئیں مت اور یہ لیں ماما سے بات کریں“، نائلہ بیگم کے سلام پھیرتے ہی رضا نے موبائل ان کی جانب بڑھایا۔

”نور میری جان میری بیٹی، کیسی ہو تم؟“ رضا کے بتانے پر نائلہ بیگم نے جلدی سے موبائل پکڑتے ترڑپ کر پوچھا۔

”میں ٹھی۔۔۔ ک ہو۔۔۔ آ۔۔۔ پ ٹھی۔۔۔ ک ہیں نا؟“ ماں کی آواز پر ناچاہتے ہوئے بھی نور کا دل بھر آیا۔

”میں ٹھیک ہوں میری جان، تم ٹھیک ہو؟ زارون کے گھروالے کیسے ہیں؟ اچھے ہیں نا سب؟“ جائے نماز اکٹھا کرتے نائلہ بیگم نے فکر مندی سے پوچھا۔

”جی سب اچھے ہیں۔ با۔۔۔ باکھا۔۔۔ ل ہیں؟ ابھی بھی۔۔۔ مجھ سے نارا۔۔۔ ض ہیں کیا؟“ زارون کے کمرے سے جاتے ہی نور نے اپنے لرزتے ہوئے وجود کو سنبھالتے صوفے پر بیٹھتے سوال کیا۔

”نہیں نارا ض اور اگر ہیں بھی تو بہت جلد ان کی ساری نارا ضنگی ختم ہو جائے گی بس تم اپنا خیال رکھنا۔ مجھے لگتا ہے زارون بہت اچھا ہے نور وہ تمہارا بہت خیال رکھے گا بس اب وہی تمہارا اگھر ہے اس لیے وہاں کے ہر فرد کو اپنا سمجھ کر اپنی زندگی میں خوش رہنے کی کوشش کرو“، اُس کی ہچکیاں سنتے نائلہ بیگم سے برداشت نہیں ہوا تب ہی اپنی بات مکمل کرتے اُنہوں نے موبائل رضا کی جانب بڑھا دیا۔

”آپی پلیز چپ کر جائیں کیوں رورہی ہیں؟ بس آپ پریشان نہ ہوں میں کل ہی آپ سے ملنے آؤں گا“، دوسری طرف اُس کے رونے کی آواز سنتے رضا نے تسلی دی اور مزید کچھ بتیں کرنے کے بعد پھر کال کرنے کا کہتے فون بند کیا تو نور نے موبائل صوفے پر رکھتے آنسو کے ذریعے اپنے اندر کاسارا غبار باہر نکالا۔

-----  
گھر میں داخل ہوتے ہی حیدر شاہ کی گاڑی پورچ میں کھڑی دیکھ کر فاطمہ کارہا سہا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔

”بابا سمیں نے تو کل آنا تھا۔ یہ ابھی کیسے آگئے“، لان میں چاروں اطراف نظر دوڑاتے اُس نے اپنے چہرے کو مزید چار دسے چھپایا اور ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ گھر کے بیرونی جانب بڑھی تاکہ سب کی نظروں سے بچ کر اپنے کمرے میں جاسکے مگر شاید آج اُس کی زندگی کا بدترین دن تھا کہ

بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی مراد شاہ نے اُسے دیکھ لیا۔

”کہاں سے آ رہی ہو تم؟“ اُسے چوری چھپے گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر مراد شاہ نے اُس کے سر پہ پہنچتے گر جتے ہوئے پوچھا۔

”وہ سائیں، وہ میں اپن۔۔۔ی سہیلی کی طرف۔۔۔گئی تھی“، چادر کو مزید اپنے گرد لیپٹے فاطمہ نے چہرے سے بھی چادر ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

”کون سی سہیلی؟ میں نے کتنی بار تم سے کہا ہے کہ مجھے تمہارا یوں باہر جانا پسند نہیں تو پھر کیوں اثر نہیں ہوتا تمہیں“، اُس کے جواب پر آگ بگولہ ہوتے مراد شاہ نے اُسے بالوں کو اپنے ہاتھ کی مضبوط گرفت میں لیا۔

”سائیں معاف کر دیں میں دوبارہ نہیں جاؤں گی“، اپنی چادر کو سنبھالنے درد کی شدت سے فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو نکلے تو مراد کی آواز سُن بشری خاتون بھی وہاں آگئیں۔

”مراد کیا کر رہے ہو؟ چھوڑ و بہن کو“، فاطمہ کے ہاتھ مراد کی مٹھی میں دیکھ کر بشری خاتون نے آگے بڑھتے مداخلت کی تو مراد شاہ نے غصے سے ماں کو پیچھے کی جانب دھکا دیا۔

”اماں تم ہمارے نقچ میں نہ آؤ تو ہی اچھا ہے، کتنی بار میں نے تمہیں سمجھایا ہے پرنہ تجھے اثر ہوتا ہے نہ ہی تیری بیٹی کو اور مراد شاہ بار بار اپنی بات دوہرانے کا عادی نہیں ہے“، ایک حقارت بھری نظر زمین پر پڑی ماں کو دیکھتے مراد شاہ نے فاطمہ کو ویسے ہی بالوں سے پکڑے اوپر کا رخ کیا تو بشری خاتون بیٹی کے انجمام سے فکر مندر جلدی سے اٹھتے مراد کو رکنے کا کہتے اُن کے پیچھے ہی اوپر کی جانب بڑھیں۔

زارون اپنے کمرے میں واپس آیا تو نور کو صوفے پہ بیٹھا دیکھا اُس کے قریب آگیا۔

”کیا ہوا؟ اب کیوں رو رہی ہو؟“ صبح کی اُس کی بد تیزی کو فراموش کرتے زارون نے دوستانہ انداز میں اُسے مخاطب کیا جو اُس کی آواز پر سر اٹھاتے اُسے دیکھنے لگی۔

”کیا ہوا؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ اُس کے سرخ چہرے کو دیکھ کر زارون نے استفسار کیا تو نور نے لنگی میں سر ہلا کیا۔ ”کسی نے کچھ نہیں۔۔۔ کہا۔ میرے سر میں درد ہے“، بہانہ بناتے نور نے ٹالنا چاہا۔

”تولا و میں دبادیتا ہوں“، زارون نے کہنے کے ساتھ ہی عمل کے طور پر اُس کی پیشانی پہ ہاتھ رکھا جو بخار کی حدت سے تپ رہی تھی۔

”تمہیں تو بخار ہے۔ مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ ہاتھ ہٹاتے زارون نے فکر مندی کا اظہار کیا تو اُس کی بات سننے نور کی آنکھوں سے پھر سے آنسو نکلنے لگے۔

”ٹھیک ہوں میں آپ میری فکر نہ کریں“، دو پٹے سے آنکھیں صاف کرتے رابعہ کے سمجھانے کا اثر تھا جو اُس نے اب کی بار زارون سے نرمی سے بات کی۔

”نہیں ٹھیک کہاں ہوا تباخا رہے میں ڈاکٹر کو کال کرتا ہوں“، کہنے کے ساتھ ہی زارون نے اپنا موبائل اٹھایا تو نور نے اُسے منع کیا۔

”زار میں ٹھیک ہوں، آپ پریشان نہ ہوں بس سر میں درد ہے سوؤں گی تو ٹھیک ہو جائے گا“، نرمی سے اُسے پکارتے نور نے موبائل اُس کے ہاتھ سے لیا۔

”اچھا ٹھیک ہے، تم لیٹو میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں“۔

”میں نے رابعہ کے ساتھ کافی کچھ کھالیا تھا اب مجھے بھوک نہیں ہے“، اُس کی بات کو درمیان سے کاٹنے نور نے خاموشی سے اٹھ کر بیڈ کارخ کیا اور کمفرٹ روڑھتے لیٹ گئی تو زارون نے بھی مزید کچھ کہنے کی بجائے لائے آف کی اور کمرے سے نکل کر کچھ وقت معاذ کے ساتھ گزرانے کے لیے اُس کے کمرے کی جانب بڑھا جس کی پرسوں کی فلاٹ کنفرم ہو چکی تھی۔

-----

”مراد کیا کر رہے ہو خدا کے لیے اُسے چھوڑ دو“، اُسے ویسے ہی بالوں سے پکڑے وہ اوپر موجود کچن میں داخل ہوا تو بشری خاتون نے خوف سے کانپتے ہوئے اُسے روکنے کی کوشش کی۔

”اماں میں نے پہلے بھی تجھ سے کہا ہے کہ میرے معاملے میں دخل نہ دیا کرو تو کیوں ہر کام میں طانگ اڑانے کے لیے آٹپتی ہو؟“ فاطمہ کے بالوں کو اکدم سے چھوڑتے مراد شاہ نے اُسے زمین پہ پھینکا۔

”بیٹا خدا کے لیے آخری بار معاف کر دو۔ میں دوبارہ تمہاری اجازت کے بغیر اسے کہیں نہیں بھیجوں گی“، اُسے وہاں کسی چیز کی تلاش میں نظریں دوڑاتا دیکھ کر بشری خاتون نے ہاتھ جوڑے اور فاطمہ کو اٹھانے کے لیے اُس کی جانب بڑھیں۔

”اماں میں کہہ رہا ہوں ناکہ یہاں سے چلی جاؤ تو مہربانی کر کہ دفع ہو جاؤ“، ٹوکری سے بڑے سائز کی چھری نکالتے مراد شاہ نے وحشیوں کی طرح ماں کو دھکا دیا جو اُس کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر پورے دل سے کانپ کر رہ گئیں۔

”اب بتا دو بارہ میری غیر موجودگی میں کہیں جائے گی؟“ اُس کے بالوں کو پھر سے اپنی مٹھی میں بھرتے مراد شاہ نے آنکھوں میں سرخی لیے اُس کی گردن کو غور سے دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟ کیسے ہیں یہ نشان؟“ اُس کی چادر ہٹاتے جیسے ہی اُس کی نظر فاطمہ کے پھٹے کپڑوں پہ گئی مراد شاہ کا پارہ مزید ہائی ہو گیا۔

”کہاں سے منہ کالا کروا کہ آرہی ہے؟ بول کس نے کیا ہے یہ سب؟“، چھری اُسکنی گردان پر رکھتے مراد شاہ کی آنکھوں میں خون اُترا۔

”اُسی نے جس کی بہن کو قونے بے آبرو کیا تھا“، مراد شاہ کے غصے سے گھبرائے بغیر فاطمہ نے بے خوف ہوتے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے جواب دیا۔

”تیری یہ جراءت کہ تو مجھے آنکھیں دکھائے“، اُس کی بات پر غصے سے پاگل ہوتے مراد شاہ نے چھری کی نوک فاطمہ کی آنکھ میں ماری تو پوری حوالی اُس کی چیزوں سے گونج اُٹھی۔

”مراد چھوڑ دے میری بیٹی کو ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گی“، بیٹی کو تڑپتا دیکھ کر بشری خاتون جو مراد کی حرکت پر سکتے میں جا چکی تھیں انہوں نے ہمت کرتے وہاں پڑی دوسری چھری اُٹھائی۔

”کیا ہو رہا ہے یہ سب اور تمہاری جراءت کیسے ہوئی میرے بیٹے پہ حملہ کرنے کی؟“، فاطمہ کے چیخنے اور شور کی آواز پر حیدر شاہ نے اوپر کارخ کیا جہاں بشری خاتون ہاتھ میں چھری لیے مراد شاہ کو مارنے کے لیے آگے بڑھ رہی تھیں۔ ”جراءت کیسے ہوئی تمہاری یہ سب کرنے کی؟“، فاطمہ کے چلانے کی پرواکیے بغیر حیدر شاہ نے بشری خاتون کے ہاتھ سے چھری پکڑتے اُن پر تھپڑوں کی بارش کر دی۔

”سامیں میری بیٹی کو بچا لیں۔ خدا کا واسطہ مراد کو سمجھائیں“، اپنے اوپر ہونے والے تشدید کی پروا کیے بناء بشری خاتون نے فاطمہ کے لیے فریاد کی جس کی دوسری آنکھ کو بھی مراد شاہ اپنے غصے کا نشانہ بننا چاکا تھا۔

تمام ملازم نیچے کھڑے بشری خاتون کی فریادیں اور فاطمہ کی چینوں کی آواز سُن رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اوپر جا کر ان ماں بیٹی کی مدد کر سکے۔

-----

”زارون تم یہاں؟“ ہاتھ میں کپڑی ڈائری کو اُس کی نظر سے بچا کر دراز میں رکھتے معاذ نے حیرت کا اظہار کیا۔

”کیوں میں یہاں نہیں آسکتا؟ یا میرے تمہارے کمرے میں آنے پہ پابندی ہے؟“ اُس کی حیرت پہ بُرا مانتے زارون نے اُس کے قریب آتے جواب کی بجائے اُٹا سوال کیا۔

”نہیں، کوئی پابندی نہیں۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا“، بات کوٹا لتے معاذ نے کمفرٹر سائیڈ پر کر کے اُس کے بیٹھنے کی جگہ بنائی۔

”اچھا مجھے لگا شاید اس وقت میری آمد تمہیں اچھی نہیں لگی“، آنکھوں میں شرارت لیے زارون نے اُسے چھیڑا۔ ”ہوننہ مجھے اچھی لگے یانہ مگر اب تم بیوی والے ہو اور ہو سکتا ہے تمہارا اس وقت اُسے اکیلا چھوڑ کر میرے پاس آنے اُسے پسند نہ آئے“، اُس کی بات پہ مسکراتے معاذنے الٹا اُس کی کی ٹانگ کھینچی۔

”بس بس اب اتنی بھی بات نہیں اور بیوی میرے کمرے پہ رہنے پہ میری پروانہیں کرتی تو باہر جانے پہ کیا کہے گی“، کندھے اچکاتے زارون نے کل سے اپنے اوپر ہونے ظلم کو مظلومیت سے بیان کیا۔

”بیوی کو تم طائم دو تو وہ تمہاری پروا کرے گی اور دیکھو زارون تمہارا نکاح جن بھی حالات میں ہوا ہواب نور تمہاری ذمہ داری ہے اور جب تک تم اُسے وہ مان اور یقین نہیں دو گے جس کی وہ حق دار ہے تب تک وہ تمہاری طرف سے لا پرواہی رہے گی“، اُس کی بات پر اُسے سمجھاتے معاذنے سائیڈ ٹبل پہ پڑا اپنا موبائل چارج پہ لگایا۔

”ہوننہ یہ سب مجھے ہی کیوں سمجھا رہے ہیں کوئی اُس چڑیل کو کچھ نہیں کہتا جو میری نرمی سے کی جانے والی بات کا جواب بھی کاٹ کھانے والے انداز میں دیتی ہے اور پلیز اس وقت ایسی باتیں کر کہ میرا موڑ خراب مت کرو میں پہلے ہی پریشان ہوں“۔

”کیوں پریشان ہو؟ سب خیریت ہے نا؟“ اُس کی بات مکمل ہوتے ہی معاذ نے فکرمندی سے استفسار کیا۔

”خیریت... ہاں خیریت ہی ہے بس وہ میں تم سے اپنے اسلام آباد والے پلاٹ کے متعلق بات کرنے آیا تھا،“ زارون نے اپنے آنے کا مقصد بتایا معاذ بھی موبائل کی سکرین سے نظریں ہٹاتے اُس کی جانب متوجہ ہو گیا جواب اُسے اُس پلاٹ کی زمین بخبر پڑنے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

-----

فاطمہ کی چیخ دپکار کے ساتھ ہی اُس کی سانسوں نے دم توڑا تو مراد شاہ نے حقارت سے ایک نظر اُسے دیکھتے زمین پہ تھوکا اور کچن سے باہر نکلتے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ”سامنے میری بیٹی کو بچالیں دیکھیں کتنا خون نکل رہا ہے،“ مراد شاہ کے جاتے ہی حیدر شاہ کے ہاتھوں کا سلسلہ بھی تھم گیا تو بشری خاتون نے جلدی سے فاطمہ کی جانب بڑھتے حیدر شاہ سے اتجاء کی جوان کی بات کی پرواکیے بنائے نیچے کی جانب بڑھے۔

”فاطمہ میری جان، تم گھبراو نہیں میں ابھی تمہیں ہسپتال لے جاؤں گی“، اُس کے بے سدھ وجود کو اپنے سینے سے لگاتے بشری خاتون نے روتے ہوئے پاگلوں کی طرح اُس کے چہرے کو دیوانہ وار چوما۔

”بی بی جی کیا ہوا؟ سائیں اتنے غصے میں۔ استغفار، یہ... فاطمہ... بی بی..“ اُس کی آنکھوں سے نکتے خون پر بد حواس ہوتے سارہ جو حیدر شاہ کے نیچے جاتے ہی ان دونوں کو دیکھنے آئی تھی، فاطمہ کی پھٹی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اُس کے الفاظ اُس کے منہ میں ہی رہ گئے اور اتنے خوفناک منظر کو دیکھ کر وہ چیختے ہوئے نیچے کی جانب بڑھی۔

”فاطمہ میری طرف دیکھو، کیا ہوا میری بیٹی کو؟ مجھ سے ناراض ہو کیا؟“ اُس کے چہرے سے خوف کھانے کی بجائے بشری خاتون جن کا فاطمہ کی حالت دیکھ کر رذہنی توازن بگڑ چکا تھا انہوں نے بہت پیار سے اُس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے اپنے دوپٹے سے اُس کی آنکھوں سے نکلتے خون کو صاف کیا۔

”نہ شور کرو، چپ ہو جاؤ سب۔ دیکھ نہیں رہے کہ میری بیٹی سور ہی ہے“، سارہ کے نیچے جا کر بتانے پر گھر کے باقی ملازم اور پر آئے تو بشری خاتون نے اپنے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے انہیں خاموش رہنے کا کہا۔

”بی بی آپ چھوڑیں میں دیکھتا ہوں“، ان سب ملازموں کو پیچھے کرتے سلمان (جو تھوڑی بہت ڈاکٹری جانتا تھا) حیدر شاہ کے کہنے پر فاطمہ کی موت کی تصدیق کرنے آیا۔ ”کیا ہوا میری بیٹی کو؟ مجھے پتا ہے یہ ٹھیک ہے۔ دیکھنا تم سب یہ ابھی اٹھ جائے گی بس تم لوگ شور نہ کرو“، سلمان نے نبض دیکھتے ہی نفی میں سر ہلا یا تو بشری خاتون نے قہقهہ لگاتے اُسے پیچھے کی جانب دھکا دیتے فاطمہ کو پھر سے اپنے ساتھ لگایا۔

”کیا ہوا؟“ اس کے وہاں سے اٹھتے ہی ایک ملازمہ نے فکر مندی سے استفسار کیا تو سلمان میں نفی میں سر ہلاتے فاطمہ کی موت کا بتایا جس پر سب ہی ہکابکا باپ اور بھائی کے ظلم پر استغفار کرتے بشری خاتون کو سنبھالنے لگے جو کبھی قہقہے لگاتے اور کبھی زور سے روتے ہوئے فاطمہ کو اپنے اندر چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

-----  
کچھ دیر معاذ سے باتیں کرنے بعد زارون اپنے کمرے میں واپس آیا تو نور بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔

”تم ابھی تک سوئی نہیں؟“ کمرے میں آتے ہی اُسے یوں بیٹھاد کیکھ کر زارون نے سوال کیا۔

”نیند نہیں آرہی۔ سر میں بہت درد ہو رہا ہے“، اُس کے پوچھنے پر نور نے سچائی سے کام لیتے بتایا تو زارون دروازہ بند کر کے اُس کے قریب آگیا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا ڈاکٹر کو چیک کروالو۔ دیکھانا اب بخار اور تیز ہو گیا ہے“، اُس کے قریب آتے زارون نے اُس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا جو پہلے سے ہی زیادہ گرم تھی۔

”مجھے نہیں پسند ڈاکٹر، صح بھی اُس بد تمیز انکل نے بلا وجہ ہی میرے انجیکشن لگادیا اور اب پھر اُس نے مجھے انجیکشن لگادینا ہے“، نور نے ڈاکٹر کو نہ دکھانے کی وجہ معمومیت سے بتائی تو زارون نے چہرہ نیچے کرتے اپنی مسکراہٹ کو چھپایا۔

”مطلوب تمہیں انجیکشن سے ڈر لگتا ہے؟“، دراز میں موجود ایک ڈبہ سے تھر ما میٹر نکالتے زارون نے اُس سے استفسار کیا۔

”نہیں، میں کون سا پچھی ہوں جو انجیکشن سے ڈروں۔ وہ تو مجھے اُس ڈاکٹر کی شکل پسند نہیں آئی اس لیے کہہ رہی ہوں“، خود کو بہادر ثابت کرتے نور نے منہ کھولا تو زارون نے اُس کی زبان کے نیچے تھر ما میٹر کھا۔

”ٹھیک ہے صحیح میں تمہیں کسی اچھی شکل والے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا“، اُس کی بات پر مسکراتے زارون نے اُس کے آنکھیں دیکھانے پہ ہونٹوں میں ہاتھ رکھ کے مسکراہٹ چھپائی اور کچھ سینڈز بعد تھر میسٹر اُس کے منہ سے نکالتے ٹھر پچھر چیک کیا جو 102 کے قریب تھا۔

”بخار تو کافی ہے اور مائم بھی بہت ہو چکا ہے“، کلاک پر گیارہ بجتے دیکھ کر زارون نے اپنے بازو کی وجہ سے کچھ سوچتے ہوئے خود کلامی کی۔

تو کیا ہوا صحیح تک ٹھیک ہو جائے گا آپ پریشان نہ ہوں“، اُس کی فکر مندی پر نور نے تسلی دی تو زارون نے ایک نظر اُس کے سرخ ہوتے چہرے پر ڈالتے ڈبے سے بخار کی میڈیسین نکالی۔

”یہ لویہ کھالو“، گلاس میں پانی ڈالتے گولیاں زارون نے اُس کی جانب بڑھائیں جسے دیکھتے ہی نور کے چہرے کے تاثرات بدلتے۔

”یہ سب کھانی ہیں؟“، اُس کے ہاتھ پر رکھی تین گولیاں دیکھ کر نور نے سوال کیا تو زارون نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اتنی ساری ہیں۔ میں کیسے کھاؤں گی؟“، اُس پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر کیے بغیر نور نے سوچا۔

”کچھ نہیں ہوتا ایک ایک کر کہ کھالو“، اُسے سوچ میں گم دیکھ کر زارون نے کہنے کے ساتھ ہی ایک گولی نکال کر اُس کے منہ کی جانب بڑھائی جسے بُرا سامنہ بناتے نور نے منہ میں رکھنے کے ساتھ ہی پورا گلاس پانی کا پیتے بکشکل نگلا۔

”بس مجھے اور نہیں کھانی“، زارون نے دوسری گولی اُس کے منہ کی جانب بڑھائی تو نور نے ہاتھ کھڑے کرتے انکار کیا۔

”کچھ نہیں ہوتا۔ شاباش منہ کھولو“، اُس کے نہ نہ کرنے پہ بھی زارون نے دونوں گولیاں ایک ساتھ اُس کے منہ میں رکھ دیں جنہیں نگتے ہی نور نے غصے سے زارون کی جانب دیکھا جو اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ”زیادہ ہنسنے کی ضرورت نہیں ہے اور بُرے ہیں آپ“، گلاس میں اور پانی ڈالتے نور نے بھنویں اچکائیں تو زارون نے جلدی سے اپنے لب سکیڑے مسکراہٹ کو دبایا۔

”توبہ کتنی کڑوی تھیں“، آدھا گلاس مزید پانی کا پیتے نور نے پھر سے بُرا سامنہ بنایا تو زارون نے اُس کی حالت دیکھ کر اٹھ کر دوسری جانب جاتے سائیڈ ٹیبل کی دراز کھولی جس میں اُس نے معاذ کی لائی ہوئیں چاکلیٹس رکھیں تھیں۔

”یہ لویہ کھالو“، ایک چاکلیٹ اُس کی جانب بڑھاتے زارون نے دوسری چاکلیٹ اپنے لیے نکالی۔

”چاکلیٹ؟ آپ نے کہاں سے لی؟“ چاکلیٹ پکڑتے ہی نور نے فٹ سے سوال کیا۔

”معاذ لا یا تھا“، مختصر سا جواب دیتے زارون نے اپنے بازو کی وجہ سے چاکلیٹ کھولنے کے لیے منہ کا استعمال کیا۔

”رضا بھی مجھے لا کر دیتا تھا۔ مجھے چاکلیٹس بہت پسند ہیں“، اُس کی بات سننے ہی نور کو پچھلی یادوں نے پھر سے ستایا۔

”مجھے بھی پسند ہیں اور تم پریشان نہ ہو تم جتنی چاکلیٹس کہو گی میں تمہیں لادیا کروں گا“، اُس کے چہرے کی افسردگی دیکھ کر زارون نے بہت پیار سے تسلی دی تو نور نے ناچاہتے ہوئے بھی اُسے ایک اداس سی مسکراہٹ پاس کی اور خاموشی سے چاکلیٹ کھولتے کھانے لگی۔

-----

اُن کے نکاح کو پورا ہفتہ گزر چکا تھا۔ معاز سعودیہ عرب والپس جا چکا تھا اور زارون کا زخم بھی کافی حد تک بھر گیا تھا تب ہی اُس نے آج یونیورسٹی جانے کا رادہ کیا تو نور کو بھی تیار ہونے کا کہہ دیا جو زیادہ نہ سہی مگر کچھ حد تک زارون سے اٹھ جکی تھی۔

”یونیورسٹی آپ کے ساتھ؟ نہیں میں نہیں جاؤں گی“،

اُس کی بات سنتے ہی اُس نے صاف انکار کیا۔

”کیوں نہیں جانا؟ اور تمہیں یونیورسٹی جانے پہ مسئلہ ہے یا میرے ساتھ جانے پہ؟“ الماری سے اپنے کپڑے نکالتے زارون نے اُس کے انکار کی وجہ پوچھی۔

”آپ کے ساتھ جانے پہ مسئلہ ہے۔ بس مجھے نہیں جانا“، سچائی سے جواب دیتے نور نے بیڈ کی چادر ٹھیک کی۔

”یاراب یہ کیا ضد ہے اور میرے ساتھ جانے میں کیسا مسئلہ؟ نکاح ہوا ہے ہمارا شرعی اور قانونی طور پر ہم ایک دوسرے کے ساتھ کہیں بھی جاسکتے ہیں“، اُس کی انکار کی وجہ جانتے ہی زارون نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”جانقی ہوں پرمجھے نہیں جانا۔ سب مجھے آپ کے ساتھ دیکھیں گے تو پتا نہیں کیا کیا باتیں کریں گے“، اُس سے نظریں ملائے بغیر نور نے اپنی سوچ کو اُس پہ عیاں کیا۔ ”افف میری اماں کوئی کون ہوتا ہے ہم پہ بات کرنے والا اور اگر کوئی کچھ کہے گا تو بتا دینا کہ ہماری شادی ہو گئی ہے“، اُس کی فضول کی پریشانیوں پہ سر کپڑتے زارون نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”ہاں تاکہ سب یہ کہیں کہ ان کا کب سے چکر چل رہا تھا“، زارون کی بات سنتے ہی نور نے اپنی بڑی آنکھوں کو مزید کھولتے اُس کی بات کو رد کیا۔

”اُفف ٹھیک ہے نہ جاؤ۔ تم ہو ہی بد تیز“، اُس کی وضاحتوں پر غصہ کرتے زارون نے اپنے کپڑے لیتے واش روم کا رخ کیا تو اُس کے بد تیز کہنے پر نور نے ہو نقوں کی طرح منہ کھولا۔

”آپ خود ہوں گے بد تیز۔ دیکھیے گا میں آپ کی شکایت بابا سے لگاؤں گی“، اوپنجی آواز میں اُسے دھمکی دیتے اُس نے پیر پختہ ٹھیک کیے کمفرٹ را اور چادر کو پھر سے خراب کیا اور کمرے سے نکلتے نیچے کی جانب بڑھی جہاں عابدہ بیگم کچن میں موجود ناشتے کی تیاری میں مصروف تھیں۔

-----

فاطمہ کی موت کے صدمے نے بشری خاتون کا ذہنی توازن بگڑا دیا تھا۔ وہ ملازمہ کے ہاتھوں سے نکلتے کبھی حولی سے باہر کی جانب بھاگتیں تو کبھی وہیں اپنے کمرے میں بیٹھ کر قہقہے لگانے یا رونے لگ جاتیں۔

”بابا سائیں آپ اماں کا کچھ کرتے کیوں نہیں؟ انہیں یا تو زہر دے کر ایک ہی بار ختم کر دیں یا پھر کسی پا گل خانے میں داخل کروادیں“، بشری خاتون کے کمرے سے آتی شور کی آوازیں سنتے مراد شاہ نے حیدر شاہ کے کمرے میں آکے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”ہاں میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اسے کسی پاگل خانے میں جمع کروادوں۔ سارا دن شور کر کہ دماغ کھا جاتی ہے“، نظروں میں خمارت لیے حیدر شاہ نے بیٹے کی بات کی تائید کی۔

”ہاں بس مہربانی کر کہ جو کرنا ہے جلدی کریں میں اس کو اور اس گھر میں برداشت نہیں کر سکتا“، اُن کی بات سنتے ہی مراد شاہ نے سارہ کو آواز لگائی جو بشری خاتون کے ساتھ اُن کے کمرے میں موجود تھی۔

”جی سائیں حکم کریں“، مراد شاہ کی آواز پر جلدی سے کمرے سے نکلتے اُس نے سرجھ کایا۔ ”کتنی بار تجھ سے کہا ہے کہ اماں کو دورہ پڑتے ہی ڈاکٹر کا بتایا ہوا نجیکشناً وقت پہ لگا دیا کر پر لگتا ہے تجھے میری بات کی سمجھ نہیں آتی“، اُس پر گرتے مراد شاہ نے ایک زوردار تھپڑاً اُس کے چہرے پہ جڑا۔

”جی سائیں، دوبارہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا“، اپنے گال پہ ہاتھ رکھتے سارہ نے جلدی سے ہاتھ جوڑے تو مراد شاہ نے اشارے سے اُسے وہاں سے دفع کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ میں آج کل محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے غصے میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہو چکا ہے“، سارہ کے جاتے ہی حیدر شاہ نے اپنی کرسی سنبھالتے مراد شاہ کو بھی بیٹھنے کا کہا۔

”نہیں بابا سائیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس اس کم بخت کی موت کے بعد لوگوں کو جواب دے دے کر میری طبیعت میں کچھ ناسازی سی آگئی ہے۔ کل سے ہی جسم ٹوٹ رہا ہے ایسے جیسے تھکاٹ کی وجہ سے بخار ہو گیا ہو“، چہرے پہ مسکراہٹ سجا تے مراد شاہ نے حیدر شاہ کی بات سنتے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

”لوگوں کی فکر نہ کرو کچھ دن باتیں کر کہ خود ہی خاموش ہو جائیں گے اور رہی بات تھکاٹ کی تو کچھ دنوں کے لیے شہر چلے جاؤ۔ وہاں کسی اچھے سے ڈاکٹر کو چیک کرو اکے کچھ دن اپنے دوستوں کے ساتھ شغل میلہ کرنا خود ہی طبیعت سیٹ ہو جائے گی“، حقے کا کش لیتے حیدر شاہ نے اُسے مشورہ دیا۔

”جی میں بھی یہی سوچ رہا تھا پر ایکشن سرپہ ہیں آپ اکیلے کیسے یہ سب سن بھالیں گے“، اپنی فکر کا ظہار کرتے مراد شاہ نے جانے کی خواہش کو بیان کی۔

”میری فکر نہ کرو میں یہاں یہ سب دیکھ لوں گا تم بس جانے کی تیاری کرو“، اپنی طرف سے اُسے مطمئن کرتے حیدر شاہ نے اُس کی دلی مراد پوری کی۔

”شکر یہ بابا سائیں میں بس ابھی دوستوں کو تیاری کرنے کا کہہ کے آتا ہوں“، اُن کا ہاتھ تھام کر بوسہ دیتے مراد شاہ نے خوشی سے کھلتے ہوئے کہا اور اندر کی جانب بڑھا۔

”بس میری جان من کچھ دن اور... پھر تمہیں میرا ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا“، کمرے میں آتے ہی موبائل اٹھاتے مراد شاہ نے آنکھیں بند کرتے نور کے چہرے کو سوچتے ہوئے خود کلامی کی اور اپنے شہر کے ایک دوست کا نمبر ملاتے اُسے اپنے آنے کے متعلق بتانے لگا۔

-----

جو ان بیٹی کی موت نے شکلیہ بیگم کے ہوش و حواس اڑدیے تھے وہ اُس دن سے ہی سکتے کی حالت میں ہسپتال میں تھیں۔ ڈاکٹر انہیں ہوش میں لانے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور یہ اُن کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ آج پورے دس دن بعد شکلیہ بیگم نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟“ ڈاکٹر نے ملک صاحب کو خوشخبری سنائی تو وہ جلدی سے کمرے میں آتے اُن سے مخاطب ہوئے جنہوں نے اُنہیں دیکھتے ہی نفرت سے اپنی نظروں کا رخ دوسرا جانب کیا۔

”کیا ہوا؟ ناراض ہو مجھ سے؟“ ان کے چہرے پہ ناگواری دیکھتے ملک صاحب نے غصے کی بجائے نرمی سے استفسار کیا۔

”ہونہ کیسی ناراضگی؟ نہ ملک صاحب نہ، مجھ جیسی کمزور بے بس عورت کی یہ مجال کہ میں آپ سے خفا ہو سکوں؟ میں نہیں خفابس میری ایک درخواست ہے“، طنز کرتے شکلیہ بیگم نے اپنی بوڑھی آنکھوں کو اپنی چار دسے صاف کیا۔

”کیا؟“ ان کے غصے کو ان کا حق سمجھتے ملک صاحب نے ان کے چہرے کی جانب دیکھا جس پہ چند ہی دنوں میں بڑھا پا عیاں ہونے لگا تھا۔

”یہی کہ جس طرح آپ نے میرے بیٹے کو گولی ماری مجھے بھی مار دیں۔ میں اس افیت میں مزید زندہ نہیں رہ سکتی جو آپ نے مجھے دی ہے۔ پہلے میری معصوم بیٹی آپ کے دشمنوں کی نذر ہو گئی ہے اور اب آپ نے میرے بیٹے کو بھی اپنی وحشت کا نشانہ بنادیا۔ کیوں؟ کیوں کیا آپ نے ایسا؟ ہاتھ نہیں کا پنے آپ کے؟ دل نہیں ڈرا؟ اس طرح اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کو مارتے ہوئے؟“ ہاتھ میں لگی ڈرپ کی پرواکیے بناء شکلیہ بیگم نے دکھ میں آگر نقابت کے باوجود بھی ملک صاحب کا گریبان کپڑتے ان سے اپنی مامتناک اس طرح روندھنے پہ سوال کیا۔

”میں تمہارے ہر سوال کا جواب دے دوں گا پر ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے سکون سے لیٹ جاؤ“، بات بدلتے ملک صاحب نے انہیں سنبھالنے کی کوشش کی جواب ان کا گربیان چھوڑے اپنے چہرے کو نوجہ رہی تھیں۔

”نہیں لیٹنا مجھے، بس مجھے جواب چاہیے کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیوں مار امیرے لال کو؟ کون سی ایسی غلطی ہو گئی تھی میرے بیٹے سے جو آپ کو اتنا بڑا قدم اٹھانا پڑا؟“ ان کے ہاتھ جھٹکتے شکلیہ بیگم نے چلاتے ہوئے اپنی ہاتھ میں گلی ڈرپ کی سوئی کھینچی۔

”شکلیہ کیا کر رہی ہو؟ کیوں خود کو تکلیف دے رہی ہو؟“ ان کا ہاتھ پکڑتے ملک صاحب نے ٹیبل سے روئی اٹھا کر ان کے ہاتھ پر رکھی جو عمر ڈھلنے کی وجہ سے جھریوں سے بھرا تھا۔

”نہیں ہوتی تکلیف مجھے۔ جو تکلیف آپ مجھے دے چکے ہیں اُس کے آگے یہ کچھ بھی نہیں ہے“، ملک صاحب بتائیں مجھے کیوں کیا آپ نے ایسا؟ کیوں مار آپ نے اپنی اولاد کو؟“ بے بسی اور دکھ سے آنکھوں سے آنسو روایا ہونے لگے تو شکلیہ بیگم کو اپنی دل کی رفتار بھی آہستہ ہوتی محسوس ہوئی۔

”شکلیہ کیا ہوا؟ خود کو سنبھالو، ڈاکٹر صاحب، نرس؟ کوئی مدد کرے؟“، انہیں واپس اُسی حالت میں جاتا دیکھ کر ملک صاحب چلائے تو نرس جو کمرے میں داخل ہو رہی تھی جلدی سے اُن کی جانب بڑھی۔

”آپ پلیز سائیڈ پر ہو جائیں“، شکلیہ بیگم کے چہرے کو زرد پڑتا دیکھ کر نرس نے ملک صاحب کو پیچھے کیا اور خود آسیجن ماسک اُن کے منہ پر لگانے لگی جن کی سانسیں بے ترتیب ہو کر اکھڑنے لگیں تھیں۔

”بابا سائیں حوصلہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو ماں جلد ٹھیک ہو جائیں گی“، منیب جو ملک شہزاد کا بڑا بیٹا تھا اور کچھ دیر پہلے ہی آرام کی غرض سے گھر گیا تھا اُس نے کال پر شکلیہ بیگم کی طبیعت کا سنا تو فوراً سے واپس ہسپتال آگیا۔

”کچھ ٹھیک نہیں ہو گا منیب۔ تمہاری ماں کی حالت بہت خراب ہے اور یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے“، تھکی ہوئی نگاہوں سے اُس کی جانب دیکھتے ملک صاحب نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے دیوار کو تھاما۔

آپ پر ڈیشان نہ ہوں اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا اور آپ کی وجہ سے کچھ نہیں ہوا اس لیے خود کو الزام دے کر اپنے دل پہ بوجھنہ ڈالیں، انہیں سہارا دے کر اپنے ساتھ بیٹھا تے منیب نے انہیں ملاں سے نکالا۔

”تیری ماں مجھ سے سوال کر رہی تھی کہ میں نے ذیشان کو کیوں مارا؟ اور یہ سوال کرنا اُس کا حق تھا۔ مگر منیب میں اُسے جواب نہیں دے پایا مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں اُسے سچائی بتا پاتا، نفی میں سر ہلاتے ملک صاحب نے بے بسی سے اپنی بوڑھی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو صاف کیا۔

”بابا سنیں کیا ہوا ہے؟ پتا نہیں ذیشان کی موت کے بعد سے ہی مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں۔ سب خیریت ہے نا؟ کیونکہ جتنا میں آپ کو سمجھتا ہوں مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ آپ نے ذیشان کو بس ایک لڑکی کی عزت پہ ہاتھ ڈالنے پہ گولی مار دی۔ ادھر دیکھیں اور بتائیں مجھے کہ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات تھی جو آپ کو ذیشان کو کیوں قتل کرنے پر مجبور کر گئی؟“ ان کا چہرہ اپنی جانب کرتے منیب نے کتنے دنوں سے اپنے دماغ میں چلتے سوال کو زبان تک لاتے استفسار کیا۔

”سوچا تھا کہ بیٹے کی موت کا لزام تو اپنے سر لے لیا ہے مگر اُس کی موت کی وجہ کسی کو نہیں بتاؤں گا پر منیب میں اس راز کو مزید اپنے اندر نہیں چھپا سکتا۔ میرے بوڑھے وجود میں اتنی طاقت نہیں کہ میں اس اذیت کو برداشت کر سکوں“، اُس کا ہاتھ تھامتے ملک صاحب نے اپنے کندھے پر موجود کپڑے سے اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔

”بابا سائیں آپ بتائیں مجھے جو بھی بات ہے کھل کے کریں“، ان کی باتوں سے منیب کو اندازہ ہو چکا تھا کہ ذیشان کی موت کی پیچھے کوئی معمولی وجہ نہیں تھی تب ہی ملک صاحب اُسے بتاتے ہوئے بھی اس قدر ہچکچا رہے تھے۔

”ذیشان کا قتل میں نے اُس لڑکی کی وجہ سے نہیں کیا۔ وہ تو بس بہانہ بنی اصل وجہ وہ نہیں تھی“، بات کا آغاز کرتے ملک صاحب نے اپنا سر جھکایا۔

”تو کیا وجہ تھی؟“ بولیں بابا سائیں کیا مسئلہ تھا جو آپ اتنا بڑا قدم اٹھانے پر مجبور ہو گئے؟“، ان کو رکتا دیکھ کر منیب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے انہیں بولنے پر اکسا یاتا کہ اُس سے اپنا درد بانٹتے اپنے اندر موجود بے چینی کو کچھ کم کر سکیں۔

”ذیشان شہر میں پڑھائی کرنے کے ساتھ ساتھ بہت سے جرام میں ملوث ہو چکا تھا۔ بُرے دوستوں کی صحبت نے اُسے اس قدر گراد یا تھا کہ وہ چھوٹے بچوں اور لڑکیوں کی سملگنگ کرنے لگا تھا۔“

”سمگلنگ؟ نہیں بابا سمیں آپ کو کوئی غلط فہمی ہو گی ہمارا ذیشان ایسا نہیں تھا،“ اُن کی بات سننے ہی منیب نے بے یقینی کی سی کیفیت میں اُن کی بات ماننے سے انکار کیا۔

”پہلے مجھے بھی یہی لگا تھا پر پچھلے دو ہفتوں سے میں نے شک کی بناء پر کچھ بندے ذیشان کے پچھے لگا رکھے تھے جنہوں نے اس بات کی تصدیق ثبوتوں کے ساتھ کی اور اُس کے چند منٹ بعد ہی غلام رسول نے مجھے فون پر بتایا کہ ذیشان ڈیرے پر کسی لڑکی کو لا یا ہے،“ اُس کی بے یقینی پر اپنے موبائل میں موجود تصویریں اور ویڈیو ملک صاحب نے منیب کی نظرؤں کے سامنے کیں جسے دیکھتے ہی اُس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

”بابا سمیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے یہ ذیشان نہیں ہے،“ دو معصوم بچوں کو گولی مارنے والے کی شکل دیکھتے ہی منیب نے سفید پڑتے رنگ کے ساتھ موبائل بند کیا۔

”ایسا ہی تھامیر انہوں پہلے ہی یہ سب دیکھ کر کھول رہا تھا اور پر سے ذیشان کو شر مناک حالت میں ایک لڑکی کے ساتھ زبردستی کرتے دیکھ کر مجھے سمجھ نہیں آئی“، اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ملک صاحب نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”بابا سائیں خود کو سنبھالیں۔ اور آپ نے یہ سب مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ کیوں آپ اتنی بڑی بات اپنے دل میں رکھے خود کو تکلیف دیتے رہے؟“ ذیشان کی حرکتیں جہاں منیب کے لیے ناقابلِ تھیں وہیں ملک صاحب کی باتوں کو رد کرنا بھی اُس کے بس میں نہیں تھا جسنوں نے ہمیشہ ذیشان کے پڑھے لکھے ہوئے پر اُسے ایک ان پڑھ جاہل انسان ہونے کا طعنہ دیا تھا آج وہی بابا اُسی ان پڑھ کے سامنے اپنے پڑھے لکھے بیٹھے کی جرام کی داستان سناتے گڑ گڑاتے ہوئے روپڑا تھا۔

”بابا سائیں خود کو سنبھالیں۔ بے شک ذیشان نے آپ کا دل دکھایا پر اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے اس لیے اُس کے گناہوں کو یاد کرنا یاد وہرانا اچھی بات نہیں۔ آپ بس اُس کے لیے دعا کریں کہ اللہ پاک اُسے اپنی رحمت کے سبب بخش دے“، ملک صاحب کو یوں بے بس دیکھ کر منیب کی اپنی آنکھیں بھی بھرا سکیں تھیں تب ہی اُن کو اپنے حصار میں لیتے اُس نے تسلی دی۔

”بیٹا مجھے معاف کر دینا مجھے پتا ہے میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے“، اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ملک صاحب کو آج اُس کے وجود سے نفرت محسوس نہیں ہوئی جسے ساری زندگی وہ پا گل اور ان پڑھ کہتے بے کار ہونے کا طعنہ دیتے آئے تھے۔

”کوئی بات نہیں با بسا میں مجھے آپ کی کبھی کوئی بات بُری نہیں لگی اس لیے آپ بس خود کو سنبھالیں اور ذیشان نے جو کچھ بھی کیا اُس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ نے تواب بھی ایک اچھے باپ ہونے کا ثبوت دیا اور اپنے ہاتھوں سے اُسے ختم کرتے پتا نہیں کتنے لوگوں اور خاندانوں سے مزید اجر نے سے بچالیا“، ان کے چہرے کو اپنے رومال سے صاف کرتے منیب نے اُنہیں اُس ملال سے نکلنے کی کوشش کی جسے اُس نے لوگوں کے سامنے بہت سمجھداری کے ساتھ ایک نامعلوم شخص کی طرف سے حملہ کا کہتے بات کو لوگوں کے ساتھ ساتھ پولیس سے بھی دبایا تھا۔

”بس تم اپنی ماں کا خیال رکھنا اور زندگی میں کبھی اُس کو اس بات کی بھنک نہ پڑنے دینا“، اُس سے وعدہ لیتے ملک صاحب نے نصیحت کی تو منیب نے اثبات میں سر ہلاتے ڈاکٹر کے باہر آنے پہ اپنارخ اُس کی جانب کیا جو اُسے شکلیہ بیگم کو ہارت اٹیک کا معمولی جھٹکا لگنے کے متعلق بتانے لگا تھا۔

”خوش آمدید، اس بار تو تمہیں ہماری یاد بڑے دنوں بعد آئی“، سکندر نے مراد شاہ کو دیکھتے ہی اُس سے بغل گیر ہوتے شکوہ کیا۔

”بس بس، یاد تو مجھے روز آتی پر یوں ایکشن کے دنوں میں با بساں میں کو اکیلے چھوڑ کر شہر آنامیرے لیے ناممکن تھا اس لیے اس بار آنے میں زرادیر ہو گئی“، اُس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھتے مراد شاہ نے معذرت خواہ لجھے میں اپنے نہ آنے کی وجہ بتائی۔

”اچھا کوئی بات نہیں۔ میں تمہاری مجبوری سمجھتا ہوں“، اُس کی معذرت پر مسکراتے سکندر نے اُسے مطمئن کرتے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنے ملازم کو آواز دینے لگا۔

”دو کپ اچھی سی چائے اور ساتھ کچھ کھانے کو لاو“، اُس کے آتے ہی سکندر نے حکم دیا تو ملازم سر ہلاتے باہر کی جانب بڑھا۔

”تمہاری بہن کا سنا بہت افسوس ہوا۔ کیسے ہو ایہ سب؟ وہ پہلے بھی بیمار تھی کیا؟“ ملازم کے جاتے ہی سکندر نے فاطمہ کی موت پر افسوس کا اظہار کیا۔

”ہاں بس کافی وقت سے بیمار تھی۔ علاج چل رہا تھا مگر اک دم، ہی اٹیک آیا اور بس...“، مراد شاہ جو پچھلے کچھ دنوں سے حیدر شاہ کے کہنے پہ یہی کہانی سب کو سنا رہا تھا اُس نے سکندر کے پوچھنے پہ بھی وہی بات دوہرائی۔ ”اچھا، پہلے تو تم نے اُس کی طبیعت خرابی کا کبھی ذکر نہیں کیا“، اُس کی

بات سنتے سکندر جو شاہ حوبی کے ایک خاص ملازم (جو اُس کے بھی کئی کام کرتا تھا) کی زبانی فاطمہ کی موت کی سچائی جان چکا تھا اُس نے مراد شاہ کے جھوٹ بولنے پر اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

”یہ بھی کوئی بتانے والی بات تھی؟ اور ہم اپنی عورتوں کا ذکر مردوں کے سامنے نہیں کرتے اس لیے تمہیں بھی زیادہ تحقیق میں پڑنے کی ضرورت نہیں“، اُس کے سوال وجواب سے تنگ آتے مراد شاہ نے تھوڑا غصہ دکھایا تو سکندر نے خاموشی اختیار کی۔

”شاہ صاحب ہم کون ہوتے ہی آپ سے کسی بات کی تحقیق کرنے والے وہ تو بس ایسے ہی ہم آپ کے دکھ میں شریک ہونے کی کوشش کر رہے تھے“، اُس کے بگڑتے تیور دیکھ کر سکندر نے فٹ سے بات بدلتے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”بہت اچھے سے سمجھتا ہوں تمہارے دکھ میں شریک ہونے کا مقصد پر تم جانتے ہو کہ مراد شاہ اپنے اندر کے راز کسی کو نہیں بتاتا چاہے وہ شخص میرے کتنا بھی قریب کیوں نہ ہو بس اس لیے مجھے کرید کر اپنی طاقت آزمائی مت کرو“، اپنی موچھوں کو تاؤ دیتے مراد شاہ نے تکبر سے گردان اکڑائی تو سکندر نے اُس کے اس قدر صحیح اندازے پہ مسکراتے اپنی سسکی چھپانے کے لیے ملازم کو آواز لگائی جو چائے لانے میں کافی وقت لگا چکا تھا۔

”آؤ بیٹا اندر آؤ“، نور نے دروازے پہ دستک دی تو عابدہ بیگم نے اُسے دیکھتے ہی خوشدلی سے اجازت دی۔

”ماما آپ نے بلا یا تھا؟“ وہ جو نسرین کے بتانے پر عابدہ بیگم کے کمرے میں آئی تھی اُس نے اندر داخل ہوتے استفسار کیا۔

”ہاں بلا یا ہے ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو“، اپنی ٹالکیں سمجھتے عابدہ بیگم نے اُسے اپنے پاس بیٹھایا۔ ”جی، کیا ہوا؟ کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟“ ان کے یوں اس طرح پاس بیٹھانے پہ نور نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں اور پریشان کیوں ہو رہی ہو۔ سکون سے بیٹھو میں نے بس پڑھائی کے سلسلے میں تم سے بات کرنی تھی“، اُس کے چہرے پر ہوا یاں اڑی دیکھ کر عابدہ بیگم نے اپنے بلاں کی وجہ بتائی۔

”جی کریں“، نور جو یہ سمجھ رہی تھی کہ عابدہ بیگم اُسے دو پھر کا سالن خراب کرنے پہ ڈالنے والی ہیں ان کی بات سنتے ایک دم سے مطمئن ہوئی۔

”زارون بتارہاتھا کہ تم اُس کے ساتھ یونیورسٹی جانا نہیں چاہتیں؟“، بات کا آغاز کرتے عابدہ بیگم نے تصدیق چاہی۔

”ج۔ جی نہیں ماما ایسی بات نہیں ہے۔ وہ۔۔۔ بس اب میر آگے پڑھنے کا دل نہیں ہے“، اُسے زارون سے اس بات کی توقع نہیں تھی تب ہی ہڑ بڑاتے ہوئے نور نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

”کیوں نہیں کرتا دل؟ اور اگر دل نہیں بھی کرتا تب بھی کل تم زارون کے ساتھ یونیورسٹی جاؤ گی یہ میرا اور تمہارے بابا کا مشترکہ فیصلہ ہے اس لیے انکار کرنے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ ہمیں تمہارا منع کرنا بُرا بھی لگ سکتا ہے“، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے عابدہ بیگم نے مصنوعی دھمکی دی تو نور نے بے بسی سے انہیں دیکھا۔

”میں انکار نہیں کر رہی پر زار کے ساتھ جاتے مجھے عجیب لگتا ہے۔ مطلب مجھے لوگوں سے خوف آتا ہے پتا نہیں وہ ہمیں ساتھ دیکھ کر کیا سمجھیں اور کس قسم کی باتیں کریں؟“، ان کی بات کامان رکھتے نور نے اپنی ہچکچا ہٹ مٹا تے انہیں اصل بات بتائی۔

”کیوں خوف آتا ہے؟ اور لوگ کون ہوتے ہیں تم دونوں پر کوئی بات کرنے والے؟ دیکھو پیٹا تم نے کوئی گناہ نہیں کیا جو یوں لوگوں سے ڈر رہی ہو۔ تمہارا اور زارون کا نکاح ہوا ہے اور تم دونوں

میں ایک جائز رشتہ ہے جس میں تم لوگ کہیں بھی ساتھ جانے کا حق رکھتے ہو اور سچ پوچھونا تو مجھے تم سے ایسی بات کی توقع بالکل بھی نہیں تھی۔ مجھے تو یہ لگا کہ زارون جھوٹ بول رہا ہے تب ہی میں نے تم سے پوچھا، ”اُس کی خاموشی پر سمجھاتے عابدہ بیگم نے اُسے اُس کی غلط سوچ کا احساس دلایا۔

”سوری ماما میں دوبارہ ایسی بات نہیں کروں گی اور کل سے یونیورسٹی بھی جاؤں گی پلیز آپ مجھ سے ناراض نہ ہو،“ اُنہیں غصے میں دیکھ کر نور نے جلدی سے اُن کے ہاتھ تھامے۔

”میں ناراض نہیں ہوں مگر آج کے بعد اگر تم نے ایسی کوئی بات کی تو میں سچ میں تم سے خفا ہو جاؤں گی،“ عابدہ بیگم جانتی تھی کہ اس معاملے میں نرمی نور کے انکار کو مزید پختہ کر دے گی تب ہی انہوں نے کچھ دیر کے لیے اپنے لبھ کو سخت کرنا ضروری سمجھا۔

”پر امس میں دوبارہ ایسی بات نہیں کروں گی،“ اُن کے ہاتھ پہ بوسہ دیتے نور نے یقین دلایا تو عابدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اُسے مزید سمجھایا تاکہ وہ اپنے آپ کو مضبوط کرتے ان فضول باتوں کو اپنے دماغ سے نکال دے۔

-----

”یاریہ کیا فضول حرکت ہے؟“ ارحم نے زارون کے قریب آتے ہی ایک زوردار تیز اُس کی کمر میں رسید کیا تو اُس کی حرکت پہ لوگوں کی وجہ سے خود کو پیچنے سے روکتے زارون نے دبی آواز میں غراتے ہوئے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”جان حرکت نہیں بلکہ تمہاری اُس حرکت کا بدلہ ہے جو تم دودن سے مجھے اگنور کر کہ کر رہے ہو،“ اُس کے غصے کی پرواکیے بغیر ہی آرام سے کر سی پیچھے کھس کا کر بیٹھتے ارحم نے اُس کی جانب دیکھا جوا بھی تک اپنی کمر سہلاتے اُسے گھور رہا تھا۔

”بس بس میں اگنور نہیں کر رہا میں تو دودن سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں کہ کب نواب صاحب کا موڈھیک ہوا اور کب ملاقات کا موقع ملے،“ اُس کی بات پر پچھلے دودنوں سے ارحم کی جانب سے ہوئی لڑائی کے بارے میں یاد دلاتے زارون نے خود کو بری الزام ٹھہرا یا۔

”جانتا میں جو تم انتظار کر رہے تھے۔ تم نے تو شکر ادا کیا ہونا کہ مجھ سے جان چھوٹی،“ منه بسورتے ارحم نے ہاتھ اٹھاتے اُسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”پتا نہیں یا تم ہر دفعہ میرے دل کی بات کیسے جان لیتے ہو؟ کوئی نجومی و جومی تو نہیں ہو؟“ راز داری سے آگے ٹیبل پہ جھکتے زارون نے باسیں آنکھ دبائی تو ارحم نے چمچہ اٹھا کر اُس کی جانب اچھالا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم۔ حد ہے یارا لگے بندے کی منہ پہ ہی بے عزتی کر دیتے ہو“، اُس کے بروقت پیچھے ہٹنے کی وجہ سے چچ پیچھے زمین پہ جا گرا تو ارحمنے غصے سے بلبلاتے نیچے سے اپنا پاؤں اُس کی طانگ پہ مارا۔

”اُفف یار تم نے یہاں مجھے ہڈیاں تڑوانے کے لیے بلا یا تھا کیا؟“ اپنی طانگ سہلاتے زارون نے چہرے پہ مظلومیت طاری کی تو ارحمنے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ویٹر کو آواز لگاتے کھانے کا آرڈر دیا۔

ایک گھنٹہ عابدہ بیگم کی نصیحتیں سننے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تو اُسے زارون کی حرکت پہ بے شمار غصہ آیا جس نے فٹ سے اُس کی شکایت اپنی امی کو لگادی تھی۔

”پتا نہیں خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ آجais آج گھر ایسی طبیعت صاف کروں گی کہ ساری زندگی یاد رکھیں گے“، غصے سے بڑھاتے نور نے اُسے کوسا جو شام سے ہی کہیں غائب تھا۔

”مجھے پتا ہے زار نے یہ سب جان بوجھ کے ماں کو بتایا تاکہ وہ مجھے ڈانتیں۔ ٹھیک ہے ایسے تو ایسے ہی صحیح میں بھی اب سے ہر بات کی شکایت ماما سے لگاؤں گی“، دل میں ارادہ کرتے نور نے واش روم کا رخ کیا تاکہ وضو کر کہ عشاء کی نماز پڑھ سکے۔

وہ وضو کر کہ باہر نکلی تو عابدہ بیگم کو اپنے کمرے میں پا کر ایک دم سے پریشان ہوئی۔

”ماما آپ یہاں؟ سب خیریت ہے نا؟“ نور کو لگا کہ وہ پھر سے اُسے کسی بات پر ڈالنے آئیں ہیں تب ہی فکر مند ہوتے اُس نے استفسار کیا۔

”ہاں خیریت ہے وہ میں اور تمہارے بابا کچھ دیر کے لیے احسان بھائی (زارون کے ماموں) کی طرف جا رہے ہیں۔ ان کی کچھ طبیعت خراب ہے۔ میں نے زارون کو کال کر دی ہے وہ کچھ دیر میں آجائے گا تم بس اپنا خیال رکھنا اور پریشان نہ ہونا باہر چو کیدار موجود ہے“، اُسے تفصیل سے آگاہ کرتے عابدہ بیگم نے تسلی دی۔

”کیا ہو اماموں کو؟“ نور جس کی دودن پہلے ہی احسان صاحب سے ملاقات ہوئی تھی، ان کی طبیعت خرابی کا سُن کر پوچھنے لگی۔

”ان کو پہلے سے ہی ہارت کا مسئلہ ہے۔ تقریباً دو مہینے پہلے ہی بائی پاس ہوا تھا۔ بھی بھی بس اُسی وجہ سے طبیعت خراب ہوئی ہے۔ تم پریشان نہ ہونا زارون تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا“، احمد صاحب

کی آواز پر جلدی سے اُسے احسان صاحب کی طبیعت خرابی کی وجہ بتاتے عابدہ بیگم نے نیچے کا رخ کیا تو نور بھی فکر مندی سے اُن کے ساتھ ہی نیچے آگئی جہاں احمد صاحب بیرونی دروازے سے باہر نکلتے اُنہیں بھی باہر آنے کا کہہ چکے تھے۔

---

”پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں“، اُن دونوں کے جاتے ہی نور نے دروازہ اچھے سے بند کیا اور اوپر جانے کی بجائے نیچے ہی بیٹھ کر زارون کا انتظار کرنے لگی جو آدھے گھنٹہ گزرنے کے بعد بھی گھر نہیں پہنچا تھا۔

”مال کر کہ پوچھتی ہوں“، خود کلامی کرتے وہ ابھی اٹھ کر فون کے پاس پہنچی تھی کہ کسی نے بیرونی دروازے پر دستک دی۔

”لگتا ہے آگئے ہیں“، پلٹ کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھتے اُس نے پوچھے بغیر ہی دروازہ کھولا تو سامنے زارون کو دیکھ کے اُس کی جان میں جان آئی۔

”کہاں رہ گئے تھے آپ؟ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی“، دروازہ ویسے ہی کھلا چھوڑ کر اُس نے اندر کی جانب بڑھتے سوال کیا۔

---

”میں گاڑی میں آیا ہوں کسی ہوائی جہاز میں نہیں اور تمہاری اطلاع کے لیے بتاؤں کہ گاڑی میں ایک گھنٹے کا سفر تیز رفتاری میں طے کرنے پر بھی آدھا گھنٹہ لگ جاتا ہے“، دروازہ لاک کرتے اُس کے پیچھے آتے زارون نے پوری تفصیل بتائی۔

”بس بس پتا مجھے جو آپ تیز رفتاری میں آئے۔ آپ نے تو جان بوجھ کے دیر کی ہو گی تاکہ اکیلے میں ڈر کے مارے میں مر جاؤں اور آپ کی جان چھوٹ جائے“، اُس کی بات پر رک کر جواب دیتے نور نے عابدہ بیگم کی باتوں کا غصہ نکالا۔

”ہوننہہ میری اتنی اچھی قسمت کہاں“، منه میں بڑ بڑاتے زارون نے مسکرا کر اُس کی جانب دیکھا جو اُسے ایک گھوری سے نوازتے اوپر جا چکی تھی۔

”پتا نہیں مجھے اس طرح کا تحفہ دے کر اللہ پاک نے کس گناہ کی سزا دی ہے“، اُس کے جاتے ہی زارون نے نیچے کی تمام غیر ضروری لامٹس آف کیس اور اپنے کمرے میں آگیا جہاں اب نور نماز پڑھنے میں مصروف تھی۔

”یا اللہ اس نماز کے صدقے اس لڑکی کو عقل دے کہ جب شوہر گھر آئے تو اُس سے چائے پانی کا بھی پوچھ لیتے ہیں پر نہیں میدم کو تو بس بتیں سُنان آتی ہیں“، اُسے سجدے میں جاتا دیکھ کر زارون نے خود کلامی کی اور الماری سے اپنے کپڑے نکالتے واش روم میں گھس گیا۔

-----

وہ نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تو زارون چائے کے دو کپ لے کر کمرے میں داخل ہوا۔

”میرا چائے پینا کا دل تھا تو سوچا تمہارے لیے بھی بنالوں“، ایک کپ اُس کی جانب بڑھاتے اُس نے اپنی اس قدر عنایت پہ وضاحت دی۔

”شکر یہ پر میں اس وقت چائے نہیں پیتی“، دو پڑھ کھول کر لیتے نور نے انکار کیا تو اُس کے سفید جھوٹ پر ہو نقوں کی طرح منہ کھو لے زارون نے اپنی آنکھیں سکریڑیں۔

”ابھی کل ہی میں نے تمہیں اس وقت چائے پیتے دیکھا تھا اور اگر میرے ہاتھ کی بنی نہیں پینی تھی تو سیدھا سیدھا انکار کر دیتیں ایسے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟“ دونوں کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے زارون نے اپنی محنت پر پانی پھرنے پر تھوڑی افسردگی سے کہا۔

”میں اتنی بے مرود نہیں ہوں کہ کسی کے خلوص پر اُس کے منہ پہ ہی انکار کرتے اُس کا دل توڑ دوں اور رہی بات جھوٹ کی تو میں نے بس جھوٹ بولا آپ کی طرح جا کر شکایت ماما کو نہیں

لگائی، اُس کی بات پر بھڑکتے نور نے غصہ دکھایا تو زارون کو اُس کے اکھڑے ہوئے رویے کی وجہ سمجھ آئی۔

”شکایت؟ میں نے کب شکایت لگائی تمہاری؟“ اُس کے الزام پر ان جان بننے زارون نے وضاحت چاہی تو نور نے جواب دینے کی بجائے اپنا رخ بالکلونی کی جانب کیا۔

”نور میں کچھ پوچھ رہا ہوں، کیا ہوا ہے؟ کون سی شکایت لگائی ہے میں نے تمہاری امی سے؟“ اُس کے پیچھے ہی باہر آتے زارون نے اُسے بازو سے پکڑتے اُس کا رخ اپنی جانب کیا۔ ”مجھے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں، کتنی بار کہا ہے کہ مجھ سے دور رہ کے بات کیا کریں،“ اُس کا ہاتھ جھکلتے نور نے مزید غصہ دکھایا تو اُس کی حرکت اور بات پر زارون نے اپنے غصے کو ضبط کرتے دو قدم پیچھے ہٹتے فاصلہ قائم کیا۔

” بتاؤ کیا بات ہے؟“ نور نے اپنا رخ پھر سے دوسری جانب کیا تو زارون نے نرمی سے استفسار کیا۔ ”کچھ نہیں بس اس وقت میرا بات کرنے کا موڑ نہیں ہے اس لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیں،“ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے اُس کے سر سے دوپٹہ کھسا کیا تو نور نے اُسے سنبھالتے بے رخی سے اس وقت زارون کی اپنے پاس موجودگی پہ ناگواری ظاہر کی۔

”اوے کے جب دل ہو ابات کرنے کا تو بتا دینا کہ کیا مسئلہ ہے“، زارون جو پہلے ہی اُس کی ایک بات کے زیر اثر اپنے غصے کو کنٹول کیے کھڑا تھا ایک بار پھر سے اُس کے کڑوے لبجھ پہ لب کا ٹتے اندر چلا گیا۔

”نہیں بتاؤں گی ماما سے مجھے ڈانٹ پڑوائی نا۔ میں بھی ایسے ہی جلا جلا کے بد لہ لوں گی“، زارون کے جاتے ہی نور نے اپنی سگندلی کی پرواکیے بناء خود کلامی کی اور وہاں موجود چیز پر بیٹھتے آسمان پہ چمکتے چاند اور ستاروں کو دیکھنے لگی جنہیں دیکھنا اسے بچپن سے ہی پسند تھا۔

ڈاکٹر نے احسان صاحب سے ملنے کی اجازت دی تو احمد صاحب کے ساتھ ساتھ عابدہ اور شائستہ بیگم بھی اندر کمرے کی جانب بڑھیں جہاں ابھی کچھ دیر پہلے ہی انہیں شفت کیا گیا تھا۔

”کیسا محسوس کر رہے ہو اب؟“ احمد صاحب جور شنتہ داری ہونے کے ساتھ ساتھ احسان صاحب کے اچھے دوست تھے انہوں نے قریب جاتے نرمی سے پوچھا۔

”ٹھیک ہوں“، سانس میں دشواری کی وجہ سے آسیجن ماسک ابھی تک لگا تھا تب ہی احسان صاحب نے سر ہلاتے احمد صاحب کی بات کا جواب دیا اور تکلیف کی وجہ سے دو آنسو ٹوٹ کر ان کی آنکھوں سے نکلے۔

”بس پریشان نہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، ہاتھ آگے بڑھاتے احمد صاحب نے ان کی آنکھیں صاف کیں اور نرس کے کہنے پر خاموش ہو گئے جو انہیں زیادہ باتیں کرنے سے منع کر رہی تھی۔

”شائستہ پلیز خود کو سنبھالو تم ایسا کرو گی تو بچوں کو کون سنبھالے گا“، ان کے رونے پر انہیں تسلی دیتے احمد صاحب نے عابدہ بیگم کو اشارہ سے انہیں باہر لے جانا کا کہا۔

”بھا بھی چلیں میرے ساتھ“، ان کا ہاتھ تھامتے عابدہ بیگم نے اُنہیں ساتھ لیے اپنارخ باہر کی جانب کیا تو احمد صاحب بھی نرس کو پانچ منٹ کے لیے احسان صاحب کا خیال رکھنے کا بولتے باہر آئے۔

”شائستہ کیا کر رہی ہو، پلیز خود کو سنبھالو۔ احسان کی طبیعت پہلے ہی خراب ہے اور اگر تم ایسے اُس کے سامنے جا کر روؤگی تو وہ مزید ٹینشن لے گا“، ان کے سر پر ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے سمجھایا تو

شاکستہ بیگم نے اثبات میں سر ہلاتے خود کو سن بھالنے کی کوشش کی پر احسان صاحب کی حالت دیکھ کر انہیں صبر نہیں آرہا تھا۔

”بھا بھی دیکھیں عادل بھی آپ کی طرف دیکھ کر پریشان ہے۔ پلیز خود کو سن بھالیں اور اٹھیں آپ کچھ دیر کے لیے عادل کے ساتھ گھر جا کر آرام کر لیں تب تک میں اور احمد یہاں احسان بھائی کے پاس رکتے ہیں“، عابدہ بیگم جو اپنے بھائی کی حالت دیکھ کر خود بھی کافی پریشان تھیں انہوں نے شاکستہ بیگم کی حالت دیکھ کر انہیں گھر جانے کا مشورہ دیا۔

”نهیں، میں کہیں نہیں جاؤ گی البتہ تمہیں گھر جانا ہے تو تم چلی جاؤ پر میں اپنے شوہر کو اس حالت میں کسی غیر کے سہارے چھوڑ کر گھر نہیں جا سکتی“، ان کے مشورے کا الٹا مطلب لیتے شاکستہ بیگم نے اپنے کندھے پہ موجود ان کا ہاتھ ہٹایا تو احمد صاحب نے نفی میں سر ہلاتے عابدہ بیگم کو چپ رہنے کا اشارہ کیا جو ان کی بات سنتے مزید کچھ بولنے والی تھیں۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ کو بہتر لگتا ہے کر لیں“، ان کے رویے پر ناگواری کے باوجود بھی عابدہ بیگم نے تحمل سے جواب دیا اور عادل کو اپنے ساتھ لگاتے سمجھانے لگیں جو ماں کو ہمت ہارتادیکھ کر خود بھی فکر مند ہو چکا تھا۔

-----

تقریباً ایک بجے کے قریب زارون کی آنکھ موبائل پہ ہونے والی بیل پہ کھلی تو احسان صاحب کا ذہن میں آتے ہی اُس نے جلدی سے اپنا موبائل اٹھایا۔

”اُفف یہ کمپنی والے بھی منہوس ہیں۔ یہ بھی نہیں دیکھتے کہ رات کے کس پھر کاں کر رہے ہیں“، اسکرین پر کمپنی کا نمبر دیکھ کر زارون کی جان آئی اور موبائل والپس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے اُس نے دوسری جانب کروٹ لی تو نور کو بیڈ پہ نہ پا کر اُس نے فکر مندی سے سر اٹھاتے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔

”اُفف اس لڑکی کا میں کیا کروں۔ حد ہے اتنی لاپرواہ ہے کہ کسی دوسرے کا کیا اپنا بھی خیال نہیں رکھتی“، بالکلونی کے کھلے دروازے کو دیکھ کر زارون نے کمفرٹر ہٹایا اور اپنے شک کو دور کرنے کے لیے اٹھ کر باہر آگیا جہاں نور اپنے دوپٹے کوار گرد لپیٹے کر سی کی بیک سے سرٹکائے سکون سے نیند کے مزے لوٹ رہی تھی۔

”جتنی اکٹھ مجھے دکھائی نادل ہے کہ یہیں سردی میں سویا رہنے دوں پر کیا کروں بیمار ہو گئی تو تب بھی مصیبت میرے ہی گلے پڑنی“، اپنی کمر پہ ہاتھ رکھتے زارون نے خود کلامی کی اور اُسے اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔ ”نہیں، میں ہاتھ نہیں لگاؤں گا“، اُس کی ہاتھ نہ لگانے والی بات دماغ میں آتے ہی زارون نے اپنے بڑھے ہوئے ہاتھ پیچھے کیے اور اُسے آواز دی۔

”نور اٹھو اندر جا کر لیٹو“، سیدھے کھڑے ہوتے زارون نے اُسے دو تین بار آواز دی پر دوسرا طرف کوئی اثر نہ دیکھ کر وہ کچھ سوچتے ہوئے واپس اندر گیا اور کچھ سیکنڈ بعد ہاتھ میں موبائل کپڑے باہر آیا اور اُس پہ ایک منٹ بعد کالارم سیٹ کرتے والیوم اونچا کر کہ اُسے نور کے کان کے قریب کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ ایک زوردار آواز اپنے کانوں میں پڑتے نور نے ہٹ بڑاتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو زارون نے موبائل پچھے کرتے اُسے بند کیا۔

”ہوا کچھ نہیں، بس اس لیے جگایا کہ باہر سردی ہے اُٹھ کے کمرے میں لیٹ جاؤ“، اُس کے چہرے پہ خوف سے ہوا یا اُڑی دیکھ کر زارون نے اپنی مسکراہٹ دباتے بڑے تحمل سے کہا تو نور نے تیز تیز سانس لیتے خود کو پر سکون کیا۔

”یہ کسی کو جگانے کا طریقہ ہے؟“ خود کو نارمل کرتے جب نور کو زارون کی حرکت کی سمجھ آئی تو اُس نے اُٹھ کر اُس کے سامنے کھڑے ہوتے غصے سے پوچھا۔

”نهیں، میں تو تمہیں پیار سے جگانا چاہتا تھا مگر تمہاری ہی خواہش تھی کہ میں تمہیں ہاتھ نہ لگاؤں اس لیے جو طریقہ مجھے سمجھ آیا میں نے آزمایا“، اُس کی آنکھوں میں دیکھتے بڑے ہی تحمل سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتے زارون نے اپنا رخ کمرے کی جانب کیا تو نور نے ہونقوں کی طرح منہ کھو لے

اُس کی پشت کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور اپنادوپٹہ سنبھالتے اُس کے پچھے ہی اندر داخل ہوئی۔

”آپ خود کو سمجھتے ہیں کیا ہیں؟ کوئی بہت بڑے ہیر وہیں جو اس طرح کی حرکتوں سے مجھے متاثر کر کے اپنی جانب متوجہ کر لیں گے“، اُس کے سامنے آگر اُس کا راستہ روک کے نور نے غصے سے چلاتے ہوئے بے بُسی سے رونا شروع کر دیا۔

”بُرے ہیں آپ، نہیں اچھے لگتے آپ مجھے“، وہ اُس کی حرکت پر سچ میں ڈرگئی تھی اور سے کچی نیند میں اٹھنے کی وجہ سے چڑتے ہوئے اُس نے اپنا غصہ زارون پہ نکالا جس نے اُس کی کہی ہوئی بات پر ہی عمل کرتے ایسا کیا تھا۔

”یہ بات مجھے کافی بار بتاچکی ہوا اور میں سمجھ بھی چکا اس لیے بار بار بتا کر اپنی انرجی ضائع مت کیا کرو“، ڈبے سے ٹشوں کا لتے اُس کی جانب بڑھاتے زارون کو اُس کی معصومیت پہ ڈھیروں پیار آیا جو اپنے دوپٹے سے ہی اپنی آنکھیں صاف کرتے جا کر صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔ ”اچھا نابس کرو اب میرا مقصد تمہیں ڈرانا نہیں تھا۔ وہ بس مجھے یہی طریقہ بہتر لگاتو میں نے...“، زارون نے وضاحت دینا چاہی۔

”مجھ سے بات مت کریں اور دیکھیے گا میں بھی ماما سے صحیح آپ کی شکایت لگاؤں گی“، اُس کی بات کو درمیان سے کاٹتے نور نے اُس کے ہاتھ سے ٹشو جھپٹتے اپنی ناک صاف کی۔

”اچھا ناسوری، یہ دیکھو میں نے اپنے کان پکڑ لیے ہیں“، دونوں ہاتھوں سے اپنے کان پکڑے وہ اُس کے سامنے زمین پر بیٹھا تو نور روتے روتے مسکرائی۔

”نہیں کروں گی معاف“، چہرہ نیچے کر کہ اپنی مسکراہٹ چھپاتے اُس نے نفی میں سر ہلایا۔

”پلیز سوری“، ویسے ہی کان پکڑے اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے زارون نے چہرے پہ مظلومیت طاری کی۔

”ٹھیک ہے معاف کر دوں گی پر میری ایک شرط ہے“، دل پہ چھایا خوف دور ہوا تو نور کو ہاتھ آیا موقع گناہ مناسب نہیں لگا۔

”مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے“، اُسے روتا دیکھ کر زارون کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تب ہی ازالہ کے طور پر اُس نے سر خم کرتے اُس کی ہر بات ماننے کا ارادہ کیا۔

”وہ آپ کی دراز میں جو بیس چالکلیس پڑی ہیں نا وہ ساری مجھے چاہیے۔ نور (جو ہر روز اُس کی سائیڈ کی دراز کھول کر وہاں رکھی چالکلیس کو گنتی اور زارون کے ڈر سے بس انہیں دیکھ کر ہی اپنادل

خوش کر لیتی تھی) نے اُس کی بات سنتے اپنی شرط بتائی تو زارون نے حیرت سے اُسے دیکھا جو چاکلیٹس کے ساتھ ساتھ اُس کی تعداد کے بارے میں بھی جانتی تھی۔

”یہ لوسری تمہاری ہیں“، اُس کی چوری پکڑے جانے پر بھی کوئی بات کر کہ اُس کو شرمندہ کرنے کی بجائے زارون نے اُٹھ کر دراز میں رکھی ساری چاکلیٹس لا کر اُس کی گود میں رکھ دیں۔ جنہیں بے یقینی سے دیکھتے نور کے چہرے پر چمک آگئی۔

”یہ مت سمجھیے گا کہ میں آپ کی چاکلیٹس پہ نظر کھ کے بیٹھی تھی تب ہی میں نے آپ سے یہ مانگیں“، اُسے مسکراتا دیکھ کر نور نے اپنے جذبات کو قابو کرتے تنبیہ کی۔

”یہ میں نے اس لیے لیتا کہ دوبارہ آپ کو یوں مجھے ڈراتے یاد رہے کہ میں سزا کے بغیر کسی کو معاف نہیں کرتی“، ایک ادا سے کہتے اُس نے دوسری طرف خاموشی پہ خود ہی وضاحت دی تو اُس کی بات سنتے زارون نے زور سے قہقهہ لگایا۔

”بُرے ہیں آپ“، اُسے یوں ہستاد کیجھ کر نور کو ایک نئے سرے سے تپ چڑھی تب ہی اُسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر اُس نے ساری چاکلیٹس اپنی طرف کے دراز میں رکھیں اور اپنی سائیڈ پہ لیٹتے دوبارہ سے سونے کی کوشش کرنے لگی تو زارون نے پھر سے اُس کا موڑ خراب ہوتا دیکھ کر بمشکل اپنی ہنسی

کو کنڑوں کیا اور اٹھ کر بالکونی کا دروازہ بند کرتے لائٹ آف کی اور اپنی سائیڈ پر آگر خاموشی سے لیت گیا۔

---

”کہاں جانے کی تیاری ہو رہی ہے جناب؟“ دروازے پر دستک دے کر سکندر را جازت ملنے پر اندر داخل ہوا تو مراد کو صحیح ہی صحیح کہیں جانے کو تیار دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”بس ایک کام ہے اسی سلسلے میں جارہا ہوں“، ڈریسر سے پر فیوم اٹھا کر اپنے اوپر اسپرے کرتے مراد شاہ نے کام کی نو عیت اور تفصیل بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

”کیسا کام؟ اور اکیلے جارہے ہو کیا؟“ تجسس کے ہاتھوں مجبور سکندر نے پھر سے سوال کیا تو مراد شاہ کے بالوں میں برش کرتے ہاتھ رکے۔

”جو کام میں اکیلے کر سکتا ہوں اُس کے لیے میں کسی اور کا ساتھ ضروری نہیں سمجھتا اور رہی بات کام کی تو مجھے نہیں لگتا کہ اس بارے میں تمہارا جاننا اہم ہے“، نظروں میں تنبیہہ لیے مراد شاہ نے اُسے مزید کچھ پوچھنے سے باز رہنے کا اشارہ دیا۔

”اُفف، تم اور تمہاری فلسفے میری سمجھ سے بالاتر ہیں اس لیے میری توبہ جو میں تم سے کوئی سوال پوچھوں“، اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے سکندر نے اس وقت مراد کے منہ لگ کر اپنا دن بر باد کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”کافی عقل مند ہو گئے ہو“، والپس شیشے میں خود کو دیکھتے مراد شاہ نے اُس کے جواب پر مسکراتے ہوئے طنز کیا۔

”جی بس آپ کی قربتوں کا اثر ہے“، دل میں ناگواری کے باوجود بھی چہرے پر مسکراہٹ سجائتے سکندر نے سارا کریڈٹ اُسے دیا جو اپنی تعریف پر کالر کو پیچھے گراتے اُس کے قریب آیا۔ ”دعا کرنا جس کام سے جارہا ہوں وہ مل جائے ورنہ آج تجھے میرا دل بہلانے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑے گی“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے مراد شاہ نے حال دل بیان کیا تو سکندر نے پوری آنکھیں کھولے بے یقینی سے اُس کی جانب دیکھا۔

”مطلوب تُوسی لڑکی کی تلاش میں ہے؟“، اُس کی بات سے اندازہ لگاتے سکندر کو بات مکمل کرتے مشکل ہوئی کیونکہ آج تک مراد شاہ نے کبھی خود کسی لڑکی کا پیچھا نہیں کیا تھا۔

”لڑکی نہیں، پری کہو معصوم پری میرے خوابوں کی رانی۔ بس ایک بار مل جائے پھر ملاؤں گا تمہیں بھی“، چہرے پر خباثت لیے مراد شاہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھری تو سکندر نے دانت نکالتے

اُسے اُس لڑکی کے جلد مل جانے کی تسلی دی اور ناشستہ لگنے کا بتاتے اُس کے انکار کے باوجود بھی اصرار کرتے اُسے اپنے ساتھ لیے باہر آگیا۔

---

”یہ کیا کر رہی ہو؟“ کچن میں داخل ہوتے ہر جگہ بکھری چیزوں کو دیکھ کر زارون نے اُس کی جانب دیکھا جو آدھا آٹھا سلیپ پہ اور آدھا اپنے چہرے پہ لگائے پریشان سی بیلن پہ کچھ عجیب ہی شکل کا نقشہ بیل رہی تھی۔

”ناشتہ بنار ہی ہوں۔ نظر کمزور ہے یا جان کر میرا مذاق اڑانے کی کوشش کر رہے ہیں؟“، زارون کے اس بے تکے سوال پر وہ جو عابدہ بیگم کے نہ ہونے کی وجہ سے پہلے ہی مصیبت میں پھنسنی تھی مزید روہانی ہوتے اُسے کاٹ کھانے کو دوڑی۔

”نهیں میں کیوں مذاق اڑاؤں گا میں تو بس تصدیق کر رہا تھا“، ز میں پہ پڑے انڈوں کے چھلکوں سے ہٹ کر گزرتے زارون نے اپنی کم بختمی آنے سے پہلے ہی بات بنائی۔

”تو ہو گئی تصدیق یا بھی مزید کچھ باقی ہے؟“، زارون کی باتوں کا جواب دینے کے چکروں میں چائے اُبل کر چولہے میں گری تو نور نے بیلن چھوڑتے جلدی سے چولہا بند کیا۔ ”ہائے اللہ اب یہ

---

بھی ساری بر باد ہو گئی ہے،“ ایک نظر چو لہے سے ہو کر سلیپ سے نیچے زمین پہ جاتی چائے کو دیکھتے نور کو اپنی بد قسمتی پر ہوتے ہوئے بیلن پر پڑا پڑھانے کی کوشش کی توجہ بھی ساتھ پہنچنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا۔

”مجھ سے نہیں بتا کچھ“، آٹے کو اکٹھا کر کہ باول میں رکھتے اُس نے غصے سے توے کے نیچے جلتا چو لہا بند کیا اور سر پکڑتے زارون کے سامنے موجود کر سی پر بیٹھتے رونے لگی۔

”اگر پر اٹھا نہیں بنانا آتا تو کیا ضرورت تھی اتنا ہلاکاں ہونے کی۔ ویسے بھی میں ہر روز پر اٹھا نہیں کھاتا کبھی کبھار بریڈ اور بسکٹ وغیرہ سے بھی ناشستہ کر لیتا ہوں“، زارون کو لگا کہ نور اُس کے لیے صحیح اتنی محنت کر رہی ہے تب ہی ہمدردی میں گلاس میں پانی ڈال کر اُس کی جانب بڑھاتے اُس نے تسلی دی۔

”میں آپ کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پر اٹھا بنارہی تھی کیونکہ مجھے صحیح دوسرا چیزوں سے ناشستہ کرنے کی عادت نہیں ہے“، اُس کی خوش فہمی پہ پانی پھیرتے نور نے دو پٹے سے اپنے آنسو صاف کیے تو زارون کو اُس کی اس قدر صاف گوئی کچھ خاص پسند نہیں آئی۔

”اچھا تو ٹھیک ہے پھر لگی رہو۔ ان شاء اللہ دوپہر تک پر اٹھانے سہی پر دنیا کے کسی ملک کا کوئی نایاب نقشہ بنانے میں ضرور کامیاب ہو جاؤ گی“، اپنی بے عزتی کا بد لہ لیتے زارون نے اُس کا مذاق اُڑایا تو نور نے ٹیبل پہ پڑا گلاس اٹھا کر پانی اُس کی طرف اچھالا۔

”کیا بد تمیزی ہے یہ؟“ زارون جو بات کرنے کے بعد خود ہی مسکراتے اپنی بات کا مزہ لے رہا تھا ایک دم سے بوکھلاتے اُس کے اوپر بر سا۔

”میں کچھ کروں یا کہوں تو وہ بد تمیزی اور خود آپ کچھ بھی بولتے رہیں اُس کی پروانہیں“، اُس کے غصے سے گھبرا نے کی بجائے نور نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے دلیری کا مظاہرہ کیا تو زارون نے احمد صاحب کی گاڑی کا ہارن سنتے اس بات کا بد لہ کسی اور وقت پہ چھوڑتے اُن دونوں کے اندر آنے سے پہلے تیز قدم اٹھاتے اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

”ہونہمہ بڑے آئے مجھے ڈرانے والے“، اُسے اس طرح وہاں سے جاتا دیکھ کر نور نے پیچھے سے منہ چڑایا اور عابدہ بیگم کی آواز سنتے جلدی سے کچن سمیٹنے لگی۔

-----

”بaba جگہ میں ہیں؟“ ان کی گاڑی باہر صحن میں کھڑی دیکھ کر رضانے نائلہ بیگم سے پوچھا جو اس کے لیے ٹیبل پہ ناشستہ لگانے میں مصروف تھیں۔

”ہاں گھر ہی ہیں۔ رات سے ان کی کچھ طبیعت خراب تھی اسی لیے میں نے کہا کہ آج چھٹی کر کہ گھر میں آرام کر لیں،“ اُسے تفصیل بتاتے وہ چائے لینے کچن میں چلی گئیں۔

”کیا ہوا طبیعت کو؟ زیادہ خراب تھی تو مجھے بتا دیتیں میں ڈاکٹر کے پاس لے جاتا،“ ان کی بات پر فکر مندی کا اظہار کرتے رضانے کر سی پچھپے کی۔

”نہیں، اتنی بھی خراب نہیں اور کل واپسی پہ آتے ہوئے چیک کرو اکر آئے تھے بس بی پی تھوڑا ہائی تھا،“ چائے اُس کے کپ میں نکالتے نائلہ بیگم نے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا تو وہ خاموشی سے اپنے ناشستہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”آپ کی نور آپی سے بات ہوئی تھی دوبارہ؟“ نہیں اپنے قریب ہی کر سی پچھپے کر کے بیٹھتا دیکھ کر رضانے استفسار کیا۔

”نہیں میری بات نہیں ہوئی دوبارہ۔ کیوں کیا ہوا؟ سب خیریت ہے نا؟“ پلیٹ اپنے سامنے کرتے نائلہ بیگم نے ایک دم سے پریشان ہوتے اپنا ہاتھ روکا۔

”جی سب خیریت ہے۔ میں نے تو ویسے ہی پوچھا تھا۔

بابا نے ناشتہ کر لیا ہے کیا؟“ بات بدلتے رضا نے اُن کا دھیان بٹایا تاکہ اب وہ نور کو لے کر پھر سے پریشان نہ ہو جائیں جو اُس دن کے بعد سے رضا سے بھی بات نہیں کر رہی تھی۔

”ہاں صحیح ہی کروادیا تھا۔ تم بھی جلدی ناشتہ کرو سب کچھ ٹھنڈا ہو جائے گا“، جواب دیتے اُنہوں نے پر اٹھان کال کر اُس کی پلیٹ میں رکھا تو وہ خاموشی سے سر جھکائے کھانے لگا۔

”یہ کیا صحیح سے گھر میں ہنگامہ مچایا ہوا ہے تم لوگوں نے؟“ بشری خاتون کی چینوں پر کمرے سے باہر آتے حیدر شاہ نے سائرہ کو آواز دی جو کافی دیر سے اُنہیں سنبھالنے کی کوشش میں لگی تھی۔

”سامنے وہ بی بی جی باہر جانے کی ضد کر رہی ہیں۔ میں نے بہت سمجھایا ہے پر وہ کوئی بھی بات سننے کے لیے تیار نہیں“، حیدر شاہ کے غصے کو دیکھ کر سائرہ نے نظریں جھکائے فوراً سے بشری خاتون کے چینخے کی وجہ بتائی۔ ”میں نے کتنی بار کہا ہے کہ اس کے چینخے چلانے پر اس کی باتیں سننے یا ماننے کی بجائے سیلمان کو بلا کر بے ہو شی کا انجکشن لگوادیا کرو پر تمہیں اثر ہوتا نا... جاؤ فوراً جا کر سیلمان کو بلاو“، اُسے حکم دیتے حیدر شاہ خود اُس کمرے کی جانب بڑھے جہاں بشری خاتون کو رکھا تھا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ ایک بار میری کہی بات سمجھ میں نہیں آتی کیا؟“، کمرے میں داخل ہوتے حیدر شاہ نے اُن کے چلا کر دور ہونے پر اُن کے پاؤں میں پڑیں زنجیروں کو دیکھا جو کھلی تھیں۔

”یہ کس نے کھولیں؟“، اپنے پیچھے ہی سارہ کو اندر داخل ہوتا دیکھ کر حیدر شاہ نے بشری خاتون کو چھوڑتے اپنا رخ اُس کی جانب کیا۔

و۔۔ہ سائیں۔۔بی بی جی کے۔۔پاؤں پر زخم بن گئے تھے۔ میں نے دوائی لگانی تھی اس لیے یہ زنجیریں...“۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟ میرے حکم کے بغیر یہ سب کرنے کی“، اُسے بالوں سے پکڑتے حیدر شاہ نے خونخوار نظروں سے دیکھتے ایک تھپڑا اُس کے چہرے پر رسید کرتے اُسے پیچھے کی جانب دھکا دیا اور پھر سے مارنے کے لیے اُس کی جانب بڑھا۔

”سائیں معاف کر دیں۔ غلطی ہو گئی میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گی“، اُنہیں اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر سارہ نے گڑ گڑاتے ہوئے اٹھ کر حیدر شاہ کے پاؤں پکڑے۔

”یہ تمہاری پہلی اور آخری غلطی ہے جسے میں نے معاف کیا۔ آئندہ تم نے اس پاگل کے ساتھ کوئی ہمدردی دکھائی یا اُس کے بارے میں سوچا بھی تو میں تمہیں یہی زندہ زمین میں گاڑھ دوں گا“، اپنی

جیب میں موجود موبائل کے بھتے حیدر شاہ نے اُسے ٹانگ مارتے پچھے کیا اور باہر کی جانب بڑھے جہاں اُس کے کچھ خاص ملنے والے کچھ ہی دیر میں آنے والے تھے۔

---

”تم آج پھر یونیورسٹی نہیں گئیں؟“، کچن میں بر تنوں کی آواز پر عابدہ بیگم اپنے کمرے کی جانب جانے کی بجائے اُس طرف آئیں جہاں نور جلدی جلدی ہاتھ چلاتے چیزوں کو اپنے ٹھکانے پر رکھنے میں مصروف تھی۔

”و۔۔ہ ما مازار بتار ہے تھے کہ آج یونیورسٹی میں سائنس ڈپارٹمنٹ کے اسٹوڈنٹس کی سڑائیک ہے اس لیے باقی اسٹوڈنٹس کو چھٹی ہے۔ زار بھی کمرے میں ہیں وہ بھی نہیں گئے“، عابدہ بیگم کے استفسار کرنے پر نور نے انہیں نہ جانے کی وجہ تفصیل سے بتائی۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم دونوں نے ناشتہ کر لیا؟“، اُس کی بات سُن کر مطمئن ہوتے عابدہ بیگم نے اگلا سوال پوچھا۔

”نہیں ابھی نہیں کیا“، نفی میں سر ہلاتے نور کو اپنے کمے پن پر شرمندگی ہوئی۔

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ زارون کو بھی ہلا لو میں تم لو گوں کانا شتہ بنائیں کریں آرام کروں گی“، اپنا بیگ وہاں موجود ٹیبل پر رکھتے عابدہ بیگم نے اُس سے کہا جو سر ہلاتے کچن سے باہر نکل گئی پر وہاں سے نکلتے ہی اُسے احساس ہوا کہ بھوک اور جلدی کے چکر میں وہ احسان صاحب کی طبیعت کا پوچھنا بھول گئی ہے تب ہی واپس پلٹتے وہ اندر آئی۔ ”ماما ماموں کی طبیعت اب کیسی ہے؟ گھر آگئے ہیں وہ؟“ عابدہ بیگم کو سلیپ صاف کرنے میں مصروف دیکھ کر اُس نے مخاطب کیا۔

”طبیعت بہتر ہے پر ابھی ڈاکٹر زنے ڈسچارج نہیں کیا“، ہاتھ روکے عابدہ بیگم نے نور کے اس طرح پلٹ کر پوچھنے پر نرمی سے بتایا۔

”اچھا، اللہ پاک انہیں صحت دے اور وہ جلدی سے گھر آجائیں تو میں بھی انہیں دیکھنے جاؤں گی“، رشتہوں کی اہمیت کو سمجھتے نور نے کہا تو عابدہ بیگم اپنا کام چھوڑ کر اُس کے قریب آئیں۔ ”آمین، بس تم دعا کرتی رہنا اور میں تمہیں خود اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی احسان بھائی کے گھر“، اُس کے گال پر ہاتھ پھیرتے عابدہ بیگم نے اُس کے مان کو برقرار رکھا۔

”ماما آپ بہت اچھی ہیں“، اُن کے پیار پر مسکراتے نور نے تعریف کی۔

”اچھا بس بس اب زیادہ مکھن مت لگاؤ اور جاؤ زارون کو بلاو“، مصنوعی گھوری سے نوازتے عابدہ بیگم نے اُسے یاد دہانی کروائی تو وہ سر ہلاتے باہر نکلتے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

”مامبلا، ہی ہیں آپ کو“، اپنے دھیان میں کمرے میں داخل ہوتے سامنے ہی زارون کوشٹ پہنتا دیکھ کر نور نے جلدی سے رخ موڑتے اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں پر کھے۔

”شرم نہیں آتی آپ کو؟ حد ہے کوئی ایسے روم میں کپڑے تبدیل کرتا ہے کیا؟“ شرم سے سرخ ہوتے چہرے کی ساتھ اُسی پوزیشن میں کھڑے نور نے اپنی غلطی ماننے کی بجائے اُسے الزام دیا جو اپنی ٹی شرٹ ڈھونڈنے کے چکر میں پہلے ہی دس منٹ ضائع کر چکا تھا۔

”میرا کمرہ ہے۔ میں اس میں جو اور جیسا چاہوں گا وہی کروں گا“، اُس کی پانی گرانے والی بد تمیزی کے بعد زارون نے بھی کوئی لحاظ رکھے بغیر جواب دیا۔

”آپ ہیں، ہی بُرے ساتھ بے شرم بھی“، اُس کے جواب پر کڑھتے نور نے تھوڑا سارخ پھیرے پیچھے دیکھا۔

”ہاں میں ہوں بے شرم پر تم سے کم ہی ہوں“، اُس کے قریب آتے زارون نے اپنی بے عزتی کا بد لہ چکایا تو نور نے منہ کھولے اُس کی جانب دیکھا۔

”میں بے شرم ہوں؟“، اُس کی بات کا الٹا مطلب لیتے نور نے ہکلاتے ہوئے تصدیق چاہی۔

”ہاں تم ہو، جسے یہ تک نہیں پتا کہ شوہر کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔ پہلے تو زبان ہی لمبی تھی اب توہا تھ بھی لمبے ہو گئے ہیں تمہارے“، اُس کے چہرے پہ بکھرتی شرمندگی کو دیکھے بغیر ہی زارون نے اُسے کھڑی کھڑی سنائی تو اُس کے سخت رویے اور الفاظ کی شدت سے مقابل کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

”سوری، میں دوبارہ آپ کے ساتھ بد تمیزی نہیں کروں گی“، آنسوؤں کو اندر اتارتے نور نے نظریں جھکاتے بمشکل معدرت کی اور نیچے جانے کی بجائے واش روم کی جانب بڑھی لگی تاکہ وہاں جا کر رو سکے۔

”کیا ہوا؟ میں مذاق کر رہا تھا“، اُس کے الفاظ کی لرزش سے اندازہ لگاتے زارون نے اُس کا ہاتھ تھاما۔

”مذاق؟ آج تو بے شرم کھا پر ہو سکتا ہے کل کو بد کردار بھی کہہ دیں اس لیے میں آج کے بعد آپ سے کوئی بد تمیزی نہیں کروں گی جیسا آپ چاہیں گے، بولیں گے سب ویسا ہی ہو گا“، اپنے ہاتھ سے اُس کا ہاتھ ہٹاتے نور نے اپنی بات مکمل کی اور زارون کے چہرے پہ اُس کا اثر دیکھے بغیر ہی اُسے گم صم کھڑا چھوڑ کر واش روم میں جا گھسی۔

”نور کہاں ہے؟ میں نے اُسے تمہیں لینا بھیجا تھا اٹاواہ خود ہی کمرے میں آکر بیٹھ گئی ہے“، ناشتہ بنانے کے بعد کچھ منٹ اُن دونوں کے آنے کا انتظار کرتے عابدہ بیگم خود سیڑھیاں چڑھتے اُن کے کمرے میں آئیں۔

”ہم بس آئی رہے تھے“، نور کی بات سننے کے بعد زارون جو اپنا سر پکڑے بیٹھا اُس کے دماغ میں بھری فضول اور بے تکلی باتوں کے متعلق سوچ رہا تھا دروازے پر دستک کی آواز پر ایک دم سے ہوش میں آیا۔

”اچھا جلدی آجائو۔ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے“، اُس کے چہرے سے کسی غیر معمولی بات کا اندازہ لگاتے عابدہ بیگم نے اُن دونوں کا معاملہ ہونے کی وجہ سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔

”جی بس آتا ہوں نور کو لے کر“، انہیں تسلی دیتے زارون نے واش روم کی جانب بڑھا پر اُس سے پہلے ہی نور عابدہ بیگم کی آواز سُننے اچھی طرح اپنا چہرہ دھو کے دروازہ کھولتے ہوئے باہر آئی۔

”سوری مامادہ میر ادل خراب ہو رہا تھا تو میں زار کو آپ کا پیغام دیے بغیر ہی واش روم میں چلی گئی“، باہر نکلتے ہی عابدہ بیگم کو وضاحت دیتے اُس نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”اچھا کوئی بات نہیں۔ آجائونا شستہ ٹھنڈا ہو رہا ہے“، اُس کے رونے کی وجہ سے سرخ چہرے کو دیکھتے عابدہ بیگم نے ایک نظر زارون کی طرف دیکھا جو نور کے آتے ہی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

”بaba کمرے میں ہیں تو میں انہیں بھی بلا لوں؟“، زارون کے جاتے ہی نور کو بات سننے والا مشکل لگ گیا۔ تب ہی بہانہ بناتے اُس نے وہاں سے جانا چاہا۔

”نہیں تمہارے بابا مجھے چھوڑ کر واپس ہسپتال چلے گئے تھے۔ کیا ہوا ہے؟“ زارون نے کچھ کہا ہے کیا؟“ اُس کی بات کا جواب دیتے عابدہ بیگم نے نظریں اُس کے چہرے پہ مرکوز رکھتے پوچھا۔ ”نہ۔۔۔ یہ۔۔۔ زار۔۔۔ مجھے کیوں کچھ کہیں گے؟“، انجان بنتے اُس نے جلدی سے نفی میں سر ہلاتے مسکرانا چاہا۔

”تو پھر تم روئی کیوں؟ کوئی تو بات ہوئی ہے ناجو زارون بھی ایسے چپ چپ ہے“، عابدہ بیگم نے فکر مندی ظاہر کرتے اُسے کریدنے کی کوشش کی۔

”ماما سچ میں کچھ نہیں ہوا اور زار کو کب سے بھوک لگی تھی شاید اسی لیے ناشستہ کا سنتے خاموشی سے چلے گئے ہیں۔ آجیں آپ، ہم بھی نیچے چل کر ناشستہ کرتے ہیں“، بات بدلتے نور نے ان کا دھیان بٹایا اور اپنے ساتھ لیے کچن میں آگئی جہاں زارون خاموشی سے سرجھ کائے ناشستہ کر رہا تھا۔

”ماموں کی طبیعت کیسی ہے اب؟“ ان کے بیٹھتے ہی زارون نے بات کا آغاز کیا تو عابدہ بیگم کو کچھ تسلی ہوئی۔

”ہاں بہتر ہیں اب اور تمہارا پوچھ رہے تھے،“ اُس کی بات کا جواب دیتے عابدہ بیگم نے بتایا۔

”بس ناشستہ کر کہ جاؤں گا۔ رات میں نورا کیلی تھی اس لیے میں آنہیں پایا،“ پڑاٹھا کھاتے زارون نے اُس کی جانب دیکھا جو اُس سے نظریں ملائے بغیر اُس کے کپ میں چائے نکال رہی تھی۔

”ہاں بس تمہارے ابو بھی عادل کے اکیلے ہونے کی وجہ سے مجھے چھوڑ کر پھر سے چلے گئے تھے۔ اب تم ناشستہ کر کہ چلے جانا تاکہ وہ بھی گھر آکر کچھ دیر آرام کر لیں،“ احمد صاحب کے لیے پریشان ہوتے عابدہ بیگم نے اُسے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے چائے کے سپ لیتے ان نے شاستہ بیگم کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگا تھا۔

ارحم کے گھر کے باہر گاڑی میں بیٹھے وہ کافی دیر سے آنے جانے والوں پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ شاید اُس لڑکی کے بارے میں کوئی سراغ مل جائے پر صحیح سے شام ہونے کو تھی مگر ابھی تک اُسے کچھ بھی ایسا نظر نہیں آیا جس کو لے کر وہ کوئی پیش قدمی کرتا۔

”اُف مراد اس طرح انتظار کرنے سے کچھ نہیں ہونا۔ کوئی ترکیب سوچ“، خود سے بات کرتے اُس نے اسٹرینگ پہ ہاتھ مارا اور موبائل کی جانب متوجہ ہوا جہاں ابھی ابھی اُسے ایک ویدیو ریسیو ہوئی تھی۔

”ویدیو، ہاں ویدیو اگر مجھے اُس دن کے فنگشن کی ویدیو مل جائے تو میں اُس لڑکی تک آسانی سے پہنچ سکتا ہوں“، موبائل کی اسکرین دیکھتے ایک دم سے اُس کے دماغ میں خیال آیا تو اُس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے مارکیٹ کی جانب بڑھائی جہاں ایک مشہور فنگشن پلانر آر گنازشن موجود تھی جنہوں نے ارحم کی ملنگی کا فنگشن ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ ویدیو بناتے کچھ سیاسی پارٹی کے لوگوں سے بھی گفتگو کی تھی اور یہی وجہ تھی کہ ان کا نام ابھی تک مراد شاہ کو یاد تھا۔

”السلام علیکم“، گاڑی پارک کرنے کے بعد ان کی شاپ میں داخل ہوتے مراد شاہ نے کاؤنٹر پر بیٹھے لڑکے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

”وعلیکم السلام، سر آپ کو کس طرح کی مدد چاہیے؟“، اُس کے سلام کا جواب دیتے اُس لڑکے کو لگا کہ وہ کسی فنگشن کی پلانگ کے سلسلے میں آیا ہے۔

”مجھے آپ کے ہیڈ سے ملنا ہے“، رعب دار انداز میں کہتے مراد شاہ نے اپنی موچھوں کو تاؤ دیا تو اس لڑکے نے اثبات میں سر ہلاتے اُسے سامنے بیٹھ کر چند منٹ ویٹ کا کہاتا کہ اپنے باس سے ملاقات کا پوچھ سکے۔

”سر پلیز آپ بیٹھیں میں بتاتا ہوں“، سامنے موجود صوفے کی جانب اشارہ کرتے وہ فون کر یڈل سے اٹھا کر دوسری جانب کال ملانے لگا۔

”سر آپ سے کوئی سر ملنا چاہتے ہیں“، کال رسیو ہوتے ہی لڑکے نے دوسری جانب بتایا۔ ”اچھا ٹھیک ہے بھج دو“، مصروف سے انداز میں جواب آیا تو لڑکے نے مراد شاہ کو کمرے کا بتاتے جانے کا کہہ دیا۔

”جی سر میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟“، مراد شاہ نے بناء اجازت کے اندر قدم رکھا تو اس شخص نے اُسے بیٹھنے کا کہتے آنے کا مقصد پوچھا۔

”ہاشم صاحب، ہاشم گروپ آف انڈسٹریز کے مالک اُن کے بیٹے کی منگنی کا فنگشن آپ لوگوں نے ترتیب دیا تھا؟“، تصدیق کے لیے مراد شاہ نے پورا تعارف دیا۔

”جی، جی ہماری آر گنائزیشن نے ہی ارتخیز کیا تھا“، فخر سے بتاتے اُس شخص نے مزید چند مشہور لوگوں کے نام لیتے اُن کے فنگشنز کی ارتخیز کا بتایا۔

”ہم مجھے اس فنگشن کی ویڈیو چاہیے تھی۔ مل سکتی ہے کیا؟“، جیب سے پسل نکال کر اُس کے سامنے ٹیبل پر رکھتے مراد شاہ نے مقابل کی جانب سے ہاں کے علاوہ کسی جواب کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

”سر ہم ایسے کسی کی پرائیویٹ ویڈیو ز نہیں دیتے اور ہاشم صاحب کے ساتھ تو ہمارے پرانے تعلقات ہیں“، ایک نظر پسل کو دیکھتے اس شخص نے ڈرنے کی بجائے بے خوفی سے جواب دیا۔

”مجھ لگ رہا ہے تمہیں میری بات کی سمجھ نہیں آئی“، پسل اٹھا کر کسی سے اٹھتے مراد شاہ جو پہلے ہی اُس کے جواب کے متعلق جانتا تھا اُس نے غصے سے نال اُس کی کنپٹی پر رکھی۔

”سر پلیز آپ یہ غلط کر رہے ہیں۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں نا، ہم ایسے کسی کی پرائیویٹی لیک نہیں کرتے“، مراد شاہ کے غصے کو دیکھ کر اُس شخص نے ہلکی سے مزاحمت کی۔

”میں نے کہا ناجھے وہ ویڈیو چاہیے تو بس اب میں تمہاری زبان سے کوئی بکواس نہ سنو۔ نکالو ویڈیو“، اُس کا گریبان پکڑ کر دھونس جماتے مراد شاہ نے دھاڑتے ہوئے اُسے جھنچھوڑا تو اُس نے اپنی جان خطرے میں دیکھ کر اثبات میں سر ہلاتے فون اٹھایا۔

”آپ بیٹھیں میں منگو اتا ہوں“، تیز سانس لیتے اُس نے ڈرتے ڈرتے مراد شاہ سے کہا جوا بھی تک اُس کی کنپٹی پہ پسل رکھے کھڑا تھا۔

”جلدی کرو میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے“، اُس کی کسی ہوشیاری کے سبب وہیں کھڑے رہتے مراد شاہ نے حکم دیا تو وہ شخص دوسری طرف کا لریسیو ہونے پر ارحام کی ملنگی کی ویڈیو کی کاپی اپنے کمرے میں لانے کا کہنے لگا۔

زارون کے ہسپتال جاتے ہی نور نے عابدہ بیگم کے کہنے کے مطابق نسرین کے ساتھ مل کر سارے گھر کی صفائی کروائی اور تھک ہار کر کمرے میں آتے نہاد ہو کر کچھ دیر آرام کی غرض سے لیٹی تو لیٹے لیتے اُس کی آنکھ لگ گئی جو شام سات بجے کے قریب عابدہ بیگم کے جگانے پہ کھلی۔

”نور بیٹا کیا ہوا ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے؟“ نرمی سے ہاتھ اُس کے بالوں میں پھیرتے عابدہ بیگم نے پوچھا تو وہ ہوش میں آتے جلدی سے اٹھ کر بیٹھی۔

”سوری ما مجھے وقت کا پتا ہی نہیں چلا“، اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنبھالتے نور نے کلاک پہ سات بجتے دیکھ کر شرمندگی کا اظہار کیا۔

”کوئی بات نہیں پیٹا بس تم اتنی دیر سے سوئی ہوئی تھیں تو مجھے پریشانی ہو رہی تھی کہ طبیعت ٹھیک ہوا سی لیے جگایا ہے“، اُسے شرمندہ دیکھ کر عابدہ بیگم نے وضاحت دی اور کھانے کے لیے نچے آنے کا کہتے ہوئے کمرے سے چلی گئیں۔

”أفف بہت طامہ ہو گیا ہے“، دوپٹہ لیتے اُس نے بیڈ سے اٹھتے ڈریسر پر رکھا کچھ رُٹھا کراپنے بالوں کو اُس میں قید کیا اور باہر کی جانب بڑھنے لگی تو زارون کو کمرے کی جانب آتا دیکھ کر رک گئی۔

”آپ کب واپس آئے؟“، صبح والی لڑائی کے متعلق بھولتے نور نے نارمل انداز میں پوچھا تو زارون نے ایک خاموش نظر اُس پہ ڈالی اور جواب دیے بغیر ہی ایک سائیڈ سے گزرتے کمرے میں چلا گیا۔

”کیا ہوا ہے؟ بول کیوں نہیں رہے؟“، اُس کی خاموشی پر فکر مندی پر واپس کمرے میں آتے اُس نے استفسار کیا تو تب ہی زارون نے کوئی جواب دیے بغیر خاموشی سے اپنا موبائل چارج پہ لگا کے الماری سے اپنی ٹراؤزر، شرت نکالی۔

”کیا ہوا گونگے ہو گئے ہیں کیا؟ یا پھر میری بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے؟“، اُس کی حرکت پر غصے سے اُس کے سامنے آتے نور نے سوال کیا تو زارون نے گہری سانس لیتے اُس کی آنکھوں کو دیکھا جو زیادہ سونے کی وجہ سے سو جھ چکی تھیں۔

”ابھی آیا ہوں“، اُس کے طنز پر مختصر سا جواب دیتے وہ اُس کی الگی بات کا انتظار کرنے لگا۔

”کیا ہوا ہے نراض ہیں کیا مجھ سے؟“ اُس کی اس قدر سنجیدگی پر نور کو صحیح والی اپنی بات یاد آئی تو اُس نے اپنے شک کو دور کرنے کے لیے تصدیق چاہی۔

”نہیں مجھے کیا ضرورت ہے تم سے نراض ہونے کی اور میرا رشتہ ہی کیا ہے تم سے جو میں نراض ہوں۔ بس اک نکاح ہی ہوا ہے ناوہ تو تمہارے مطابق کوئی معنی نہیں رکھتا اس لیے میرے نراض ہونے کا کوئی جواز نہیں بنتا“، کندھے اچکاتے زارون نے پہلی بار بے اعتنائی بر قی تو نور کو اپنے الفاظ پر شرمندگی ہوئی۔

”اچھا ناسوری دوبارہ نہیں کہوں گی ایسے“، اُس کا موڈ خراب دیکھ کر نور نے جلدی سے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور دو قدم دوسری جانب ہوتے پھر سے اُس کا راستہ روکا۔

”نه تگ کرو میں پہلے ہی بہت تھکا ہوا ہوں“، اُس کے چہرے سے نظریں چراتے زارون نے تنبیہ کی اور دوسری جانب ہوتے آگے بڑھنا چاہا تو نور فوراً سے اُس کے سامنے آئی۔

”پہلے موڈ ٹھیک کریں اپنا“، اپنی شرط بتاتے اُس نے ضد کی۔

”میرا موڈ ٹھیک ہے۔ تم جاؤ نیچے اور جا کر کھانا لگاؤ مجھے بھوک لگی ہے“، اُسے وہیں جماد دیکھ کر زارون نے بات کو ٹالنے کی کوشش کی۔

”نہیں پہلے آپ اپنا غصہ ختم کریں پھر میں یہاں سے جاؤں گی“، اُس کے چہرے کی سختی سے اُس کے ابھی تک ناراض ہونے کا اندازہ لگاتے نور نے اپنی ضد برقرار رکھی تو زارون کو ہارمان نے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

”اچھا بابا ٹھیک ہے میرا موڈ۔ جاؤ اب“، لمبی سانس لیتے زارون نے اُسے دونوں بازوں سے تھامنے پیچھے کیا اور فریش ہونے کے لیے واش روم میں بند ہو گیا۔

”ہوننہ ہیں ہی کھڑوس۔ ایک پہلے ہی شکل بُری ہے اوپر سے غصہ کر کے مزید بُری کر لیتے“، اُس کے یوں جانے پر بُر امان نے نور نے خود کلامی کی اور منہ پہ ہاتھ رکھ کر جمائی روکتے کمرے سے نکلتے نیچے آگئی جہاں عابدہ بیگم ٹیبل پہ کھانا لگا رہیں تھیں۔

-----

اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے مراد شاہ کے قدم زمین پہ نہیں ٹک رہے تھے وہ خوشی سے نہال سکندر ہاؤس پہنچا تو وہاں پر سکندر کی غیر موجودگی نے اُسے بد مزہ کر دیا۔

”اے بھی ابھی باہر جانا تھا“، ایک ملازم کی زبانی اُس کے شام سے ہی کہیں کام کے سلسلے میں باہر جانے کا سنتے مراد شاہ نے خود کلامی کی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھا جہاں وہ کچھ دن سے قیام پذیر تھا۔

”چل میری محبوبہ آخر کار تیری تصویر تو میرے ہاتھ آئی“، بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں لیٹتے اُس نے موبائل سے نور کی تصویر نکالتے دیکھی جو اُس نے ویدیو سے ہی لی تھی۔

”افف پوری قیامت ہے تو تو“، تصویر کو زوم کر کر دیکھتے مراد شاہ نے اُس کی چمکتی آنکھوں کو دیکھا اور ایک بھر پور نظر اُس کے سراپے پہ ڈالتے ٹھنڈی آہ بھری۔

”بس اب زیادہ دیر نہیں اب بہت جلد تو میرے پاس ہو گی، اپنے مراد کے پاس“، موبائل کو اپنے سینے سے لگاتے مراد شاہ نے ایک بھر پور قہقهہ مارتے اپنی آج کی جیت پر خود کو داد دی اور دروازے پر دستک کی آواز آنے پر اٹھا کر بیٹھا۔ ”آجائیں“، موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے اُس نے آواز لگائی تو ملازم کھانے کی ٹرالی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

”صاحب جی چھوٹے صاحب کہہ رہے تھے انہیں کچھ دیر ہو جائے گی تو آپ کھانا کھا لیجیے گا“، اُسے سکندر کا پیغام دیتے نیاز نے ٹیبل پر کھانا لگان اشر و ع کیا تو مراد نے بھوک کے احساس سے کچھ کہنے کی بجائے ہاتھ دھونے اور ملازم کو جانے کا اشارہ کرتے رغبت سے کھانا کھانے لگا۔

اگلے دن یونیورسٹی میں اُسے زارون کی گاڑی سے اُتر تاد کیجھ کر بہت سی نگاہوں نے بے یقینی سے  
اُنہیں دیکھا۔

”جب کلاس ختم ہو جائیں تو مجھے متوجہ کر کہ بتا دینا“، کسی کی بھی پرواکیے بناء زارون نے گاڑی لاک  
کر کے اُس کی طرف آتے تاکید کی تو نور نے زبان کی بجائے سر ہلانے پر اکتفا کرتے نظریں جھکائے  
اپنا رخ ڈپارٹمنٹ کی جانب کیا۔ ”نور یہ تم زارون کے ساتھ کیوں آئی ہو؟“ شماں لہ جو اُس کی کلاس  
فیلو ہونے کے ساتھ ساتھ زارون سے بھی واقف تھی اُس نے اُس کے پیچھے ہی ڈپارٹمنٹ میں  
داخل ہوتے اُسے مخاطب کیا۔

”کیوں تمہیں کوئی اعتراض ہے؟ اور میں جس کے ساتھ مرضی اُوں تمہیں کیا مسئلہ ہے؟“ اُس  
کے سوال پر اُسے اچھے سے جھاڑتے نور نے مزید کسی سوال سے بچنے کے لیے رابعہ کو آواز دی جو  
کلاس کے باہر کھڑی اُسی کا انتظار کر رہی تھی۔

”خوش آمدید بے وفالوگوں“، اُس پر نظر پڑتے ہی رابعہ نے خوش دلی سے بھاگ کر اُس کے  
قریب آتے اُسے گلے لگایا۔

"میں بے وفا نہیں ہوں" ، اُس سے الگ ہوتے نور نے اُس کی بات کی تردید کرتے اپنے موڈ کو بحال کرنے کی کوشش کی۔ "تو اور کیا ہو؟ اکیلے اکیلے شادی کر لی وہ بھی زارون جیسے ہینڈ سم بندے کے ساتھ اور کہہ رہی ہو کہ میں بے وفا نہیں۔ ویسے نور اپنے سویٹ ہبی کے ساتھ یونیورسٹی آئی ہو نا آج؟" اپنی بات کی وضاحت دیتے رابعہ نے اُسے چھیڑا۔ "ہاں انہیں کے ساتھ آئی ہوں اور تمہیں اتنے سویٹ لگتے ہیں ناتوتھم لے لو" ، آنکھوں میں خفگی لیے اُس نے کلاس کا رخ کیا۔

"ہائے اللہ لڑکی عقل کو ہاتھ مارو، اور شوہر تمہارا انسان ہے کوئی چیز نہیں جو تم اتنی آسانی سے مجھے لینے کی پیشکش کر رہی ہو" ، اُس کی عقل پر ماتم کرتے رابعہ نے اُس کے پیچھے ہی کلاس میں داخل ہوتے اپنا بیگ ساتھ والی چیز پر رکھا۔

"انسان؟ انسان نہیں بلکہ جلاد ہیں پورے، ہر وقت مجھے ڈاٹنٹر ہتے کھڑوس کہیں کے" ، اُس کی بات پر اپنی غلطی ماننے کی بجائے نور نے الٹا اُس پہ چڑھائی کی تو رابعہ نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے اُسے چپ کروایا۔

"یار کیا کر رہی ہو؟" کلاس میں بیٹھی دوسری لڑکیوں کو نور کی اوپنجی آواز پر اپنی جانب متوجہ ہوتے دیکھ کر رابعہ نے دبی آواز میں اُسے باقی سب کی جانب اشارہ کرتے آواز نیچی رکھنے کی تاکید کی۔

"اوہ سوری میرا دھیان نہیں رہا،" اُس کا ہاتھ ہٹاتے نور نے آہستہ آواز میں معذرت کی اور رابعہ کو زارون کی برا بیاں گنو ان لگی تاکہ وہ دوبارہ اُس کی سائیڈنے لے۔

---

"نائلہ یہاں آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے،" ظہیر صاحب جن کی طبیعت کچھ دنوں سے ناساز تھی انہوں نے نائلہ بیگم کو گھر کے دوسروں کاموں میں مصروف دیکھ کر پکارا۔

"جی؟" کام چھوڑ کر اُن کے قریب بیٹھتے انہوں نے سوالیہ نظر وہ سے ظہیر صاحب کو دیکھا جو نور والے واقعے کے بعد بہت کمزور ہو گئے تھے۔

"تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟" اُن کا ہاتھ تھانتے ظہیر صاحب نے بہت مان سے پوچھا۔  
"نہیں میں کیوں ناراض ہوں گی آپ سے؟" اپنے چہرے سے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر نائلہ بیگم نے اُن کی بات کی تردید کی جو دوسری طرف سے جواب سنتے مسکرانے لگے تھے۔ "مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے خفا ہوا اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ میں نے نہ صرف تمہاری اولاد کو تم سے دور کیا بلکہ اپنے رویے اور بالوں سے تمہیں بہت تکلیف پہنچائی ہے، اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے انہوں نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”مجھے میری غلطی کا احساس ہو گیا ہے اس لیے ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا“، ان کا ہاتھ نرمی سے سہلاتے ظہیر صاحب جو کافی دنوں سے انہیں نیند میں نور کا نام پکارتے اور پھر رات رات بھر بے چین رہتا دیکھ رہے تھے اپنے رویے پر شرمندہ ہوتے ہوئے کہنے لگے۔

”میں آپ سے خفانہیں ہوں پر شائد میری ممتاکی توہین کر کے آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ کو نور پہ یقین نہیں تھا؟ اُس بیٹی پہ جس نے آج تک آپ کی اجازت کے بغیر گھر سے قدم نہیں نکالا۔ آپ نے کہا دن ہے تو وہ دن مان لیتی آپ کہتے رات ہے تو وہ آنکھیں بند کر کہ یقین کر لیتی۔ ظہیر بتائیں مجھے کیا آپ کو لگتا ہے نور ایسا کر سکتی ہے؟ وہ آپ کی عزت پہ حرفاً نے دے سکتی تھی کیا؟“، ان کا ہاتھ پکڑتے نائلہ بیگم نے بڑی شدت کے ساتھ ان کی زبان سے اپنی بات کی نفی چاہی۔

”مجھے اُس کے بارے میں کوئی بات نہیں کرنی۔ پلیز تم بھی دوبارہ اُس کا ذکر میرے سامنے مت کرنا“، اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے نکالتے ظہیر صاحب جو صرف نائلہ بیگم کی ناراضگی دور کرنا چاہتے تھے پر نور کو ابھی تک انہوں نے معاف نہیں کیا تھا اسی لیے اُس کی سایہ لینے پر ایک دم سے کرخت ہوتے چہرے پہ سختی لے آئے۔

”ہم ٹھیک ہے جس دن آپ اپنی بیٹی کی پاکیزگی کا یقین کر لیں گے سمجھیے گا آپ نے میری ممتا کو قرار دے دیا“، ہاتھ سے آنسو رکھتے نائلہ بیگم نے اپنی بات مکمل کی اور مزید کوئی بات کیے بغیر اٹھ کروالپس اپنے کاموں میں لگ گئیں۔

---

”واہ جی واہ آج تو بڑے بڑے لوگ یونیورسٹی آئے ہیں“، کلاسز لینے کے بعد ارحام زارون کے ساتھ باہر آیا تو وہاں نور کو رابعہ کے ساتھ کھڑا دیکھ کر مسکراایا۔  
 ”کیا میں زیادہ بڑی لگ رہی ہوں؟“، ارحام کی بات پہ کنفیوژن ہوتے نور نے سوالیہ نظر وہاں سے اُسے دیکھا تو اُس نے افسردگی سے سر ساتھ کھڑے زارون کے کندھے پہنچایا۔  
 ”یاریہ تمہاری بیوی کو تو تمہارے جیسے عقل مند بندے کے ساتھ رہ کر بھی کوئی فرق نہیں پڑا“، گھری سانس لیتے ارحام نے زارون کے کان کے قریب ہوتے سر گوشی کی جو اُسے ایک گھوری سے نوارتے اپنے کندھے سے اُس کا سر جھٹک چکا تھا۔

”اُسے تو ابھی چند دن ہوئے ہیں پر تمہیں تو پورے پانچ سال ہو گئے ہیں اور جان من اگر تمہارا دماغ خراب ہے نا تو تمہاری بہن بھی موٹی عقل کی مالک ہے جسے نہ تو میری قربت سے کوئی فرق پڑنا اور نہ ہی میرے سمجھانے سے“، منہ ب سورے زارون نے الٹار حم کی ٹانگ کھینچی۔

”بس بس زیادہ میرے سر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تو ویسے ہی تمہیں عقل مند کہا تھا پر تم تو سریس ہی ہو گئے“، اپنی بے عزتی کا بدله لیتے وہ رابعہ کی جانب بڑھا جو نور کوار حم کی بات کا مطلب سمجھا رہی تھی۔

”میں سوچ رہا تھا کہ تم لوگوں کی شادی کی خوشی میں ایک اچھی دعوت دے دوں پر تمہارے کے شوہر کے مزاج دعوت کی جگہ جوتے کھانے والے ہو رہے ہیں اس لیے پروگرام کینسل“، زارون سے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لیے ارحام نے ان دونوں کے قریب آتے کہا۔

”تو مار لیں جوتے، آپ کو منع کس نے کیا ہے؟“، ارحام کی بات سنتے نور نے خوشدنی سے اجازت دی تو زارون نے بھنویں اچکاتے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”یار شرم کرو اور دوبارہ ایسے نہیں کہنا۔ زارون اب تمہارا شوہر ہے اور ارحام تم زر امیرے ساتھ آؤ“، اُس کا ہاتھ پکڑتے رابعہ نے اُسے اپنے ساتھ کھینچا جو مزید کوئی بد تمیزی کرنے والا تھا۔

”چلیں گھر یا جو تے پڑوا کر جاؤ گی؟“ ان دونوں کے سائیڈ پہ جاتے ہی زارون نے اُسے دیکھتے طنز کیا۔

”آکی مرضی ہے،“ کندھے اچکاتے اُس نے فیصلہ زارون پہ چھوڑا تو اُس نے ایک کھاجانے والی نظر اُس پہ ڈالی اور ارحام کو آواز دے کر اپنے گھر جانے کا بتاتے پارکنگ کی جانب بڑھا تو نور نے بھی رابعہ کو ہاتھ ہلاتے جلدی سے اُس کے پیچھے ہی باہر کا رخ کیا کہ کہیں غصے میں آگروہ اُسے وہیں نہ چھوڑ جائے۔

گاؤں سے واپسی پر مراد شاہ نے حولی جانے کے بجائے اپنارخ ڈیرے کی جانب کیا تاکہ اپنے کچھ

بندوں کو اُس لڑکی کو ڈھونڈنے پہ لگاسکے جس نے اُس کا سکون بر باد کر کے رکھ دیا تھا۔

”سلام چھوٹے سائیں،“ صیغرے نے اُس کی گاڑی گیٹ سے اندر آتے دیکھی تو مالی کو جلدی ہاتھ چلانے کا کہتے دوڑ کر اُس کے قریب آیا۔

”شکور کو میرے پاس بھیجو،“ سلام کا جواب دینے کی بجائے حکم صادر کرتے وہ اندر کی جانب بڑھ گیا تو صیغرے نے اپنا سامنہ لیے ساتھ بنے کو ارٹر کا رخ کیا۔

”سلام سائیں“، کچھ منٹ بعد شکور نے دروازے پر دستک دیتے اندر سے اجازت ملنے پر کمرے میں قدم رکھا جہاں مراد شاہ سگریٹ کے کش لینے میں مصروف تھا۔

”آؤ شکور، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا“، اُسے دیکھتے ہی سگریٹ ایش ٹرے میں مسلطے مراد شاہ نے اپنا موبائل اٹھایا۔

”یہ تصویر دیکھو“، موبائل سے نور کی تصویر نکال کر اُس کی جانب بڑھاتے مراد شاہ نے حکم دیا تو شکور نے اسکرین پر نظر آتی لڑکی کو دیکھا۔

”مجھے یہ لڑکی دودن کے اندر اندر یہاں چاہیے۔ کہاں اور کیسے یہ میں نہیں جانتا پر دنیا کہ جس بھی کونے میں تلاش کرنا پڑے کرو جتنے بندے لگانے پڑیں لگاؤ مگر مجھے تمہاری جانب سے کوئی مایوس کن خبر نہیں چاہیے“، موبائل واپس اپنی جانب کرتے مراد شاہ نے سخت لفظوں میں اُسے تاکید کی۔

”جی سائیں آپ کا حکم سر آنکھوں پہ، اگر اگر آپ شہر کا نام بتا دیتے اور یہ تصویر مجھے دے دیتے تو آپ کا کام جلد ہو جاتا“، نظریں جھکائے شکور نے درخواست کی تو مراد شاہ نے اُسے کچھ ضروری معلومات سے آگاہ کرتے نور کی تصویر اُس کے موبائل پہ سینڈ کی۔

”جی سائنسیں ٹھیک ہے۔ آپ کا کام ہو جائے گا“، اُس کی ساری بات غور سے سننے کے بعد شکور نے تسلی دی اور اُس سے اجازت لیتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”تیار ہو جاؤ میری بلبل۔ اب ہماری قربت کے دن قریب آچکے ہیں“، اُس کے جاتے ہی مراد شاہ نے پھر سے سگریٹ سلاگائی اور زیر لب مسکراتے وہیں بیٹھ کر آنے والے وقت کا سوچتے پر سکون ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

یونیورسٹی سے واپسی پر عابدہ بیگم کی ہدایت کے مطابق زارون نے گاڑی ہسپتال کے سامنے روکی تو نور نے ایک نظر باہر نظر آتی عمارت کو دیکھتے اُسے مخاطب کیا جو سارے راستے اپنی ناراضگی کے اظہار کے لیے خاموشی برقرار رکھے ہوئے تھا۔

”ہم ہسپتال کیوں آئے ہیں؟“، نظروں میں الجھن لیے نور نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”تمہارے دماغ کا علاج کروانے“، جواب دیتے اُس نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا۔

”اپنا بھی کرو ایجیے گا کیونکہ مجھ سے زیادہ ضرورت آپ کو ہے“، اُس کے الٹے جواب پر بُر امانت نور نے دانت پیسے اور گاڑی سے باہر نکلتے اُس کے ساتھ ہی اندر کی جانب بڑھی۔

”السلام عليكم مماني کیسی ہیں آپ؟“ کاریڈور میں موجود ایک کمرے میں داخل ہوتے زارون نے شاستہ بیگم سے پوچھا۔

”وعلیکم السلام اللہ کا شکر ہے میں ٹھیک ہوں“، اُس کے ساتھ موجود لڑکی کو باغور دیکھتے انہوں نے زارون کے کندھے پر تھکنی دی۔

”مماني یہ نور ہے میری والف اور نور یہ شاستہ مماني ہیں“، اُن دونوں کا تعارف کرواتے زارون نے اُسے اُن کی جانب متوجہ کروا یا جس کی نظریں بیڈ پہ سوئے احسان صاحب پہ ٹکلی تھیں۔

”السلام عليکم“، اُس کے تعارف پر ہوش میں آتے اُس نے شاستہ بیگم کو سلام کیا اور اُن سے ملنے کے لیے آگے بڑھی تو انہوں نے جلدی سے ہاتھ اٹھاتے اُسے روکا۔

”پیز میں کسی سے گلے نہیں ملتی“، نظروں میں نفرت لیے شاستہ بیگم جوابی بیٹی کی شادی زارون سے کروانا چاہتی تھیں مگر اُس کے یوں اچانک نکاح کا سنتے اُن کے سارے ارمانوں پہ پانی پھر گیاتب ہی نور کونا گواری سے دیکھتے انہوں نے اپنے قریب آنے سے منع کیا۔

”اُس اکے“، اُن کی بات پر ناپسندیدگی کے باوجود بھی ہاتھ نیچے کرتے وہ دو قدم پیچھے ہوئی تو زارون کو شاستہ بیگم کا رو یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔

”عادل کہاں ہے؟ اور ماموں کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ موقع کی مناسبت دیکھتے زارون کو کچھ کہنا اچھا نہیں لگاتے، ہی بات بدلتے اُس نے سوال کیا۔

”ہاں اب بہتر ہیں ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر چیک کر کہ گئے ہیں اور عادل گھر گیا ہے کھانا لینے“، اُس کی بات کا جواب دیتے ہوئے بھی اُن کی نظریں سر جھکائے کھڑی نور پہ ٹکی تھیں۔

”ابوامی نہیں آئے تھے کیا؟“ اُن کی غیر موجودگی پہ اُس نے استفسار کیا۔

”آئے تھے پر کچھ دیر رک کے چلے گئے۔ احمد بھائی کو کچھ کام تھا اور تمہاری ماں کے پاس تو ہمارے لیے ویسے بھی ٹائم نہیں ہے۔ دو منٹ ٹکتی اور گھر جانے کی پڑ جاتی“، ناک چڑھاتے اُنہوں نے عابدہ بیگم کی شکایت لگائی۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ بس امی کا بی پی ہائی رہتا اس لیے زیادہ دیر رک نہیں پاتیں“، ماں کی جانب سے وضاحت دیتے اُس نے نور کو بیٹھنے کا کہا جوتب سے کھڑی خاموشی سے اُن کی باتیں سُن رہی تھیں۔

”بس بس زیادہ ماں کا چمچے بننے کی ضرورت نہیں اور بی پی تو میرا بھی ہائی رہتا پر شوہر کی خاطر ایک سیکنڈ کے لیے بھی گھر جا کر نہیں دیکھا اور یہاں بہنیں بھائیوں کے لیے جان دے دیتی ہیں مگر

بھی تمہاری ماں کا تو حساب ہی الٹا ہے، کندھے اچکاتے انہوں نے جاہل عورتوں کی طرح کانوں کو ہاتھ لگاتے طرز کیا تو زارون نے گھری سانس لیتے ان کے چہرے کو دیکھا۔

”امی آپ کے لیے جان بھی دے دیں تب بھی آپ کے رویے میں کوئی فرق نہیں آنا اسلیے پلیز ایسی باتیں کر کہ میرا منہ مت کھلوائیں“، غصے کے باوجود بھی زارون نے آواز پیچی رکھتے شاستہ بیگم کو آئینہ دیکھایا جو ہمیشہ سے ہی عابدہ بیگم کے خلاف تھیں پر احسان صاحب کے ڈرنے ان کی زبان پہ تالا لگا کھاتھا۔

”تو کھول لوز بان، منع کس نے کیا ہے ویسے بھی تو تم کافی بڑے بڑے کارنامے سرانجام دے چکے ہو“، صوفی پہ بیٹھی نور کی جانب اشارہ کرتے شاستہ بیگم نے اپنے اندر کی بھڑاس باہر نکالی۔

”پلیز ممانتی اب آپ اپنی حد سے باہر ہو رہی ہیں“، ان کی باتوں کے زیر اثر نور کی آنکھوں میں نہ آئی تو زارون نے اب کی بار کوئی بھی لحاظ کیے بغیر انہیں تنبیہ کی۔ ”حد؟ حد تو تمہاری ماں نے کراس کی تھی اور اب تم بیوی بھی ویسے ہی لے آئے گھر سے بھاگی ہوئی“، بھنوں اس کی اچکاتے انہوں نے اک آخری وار کیا تو زارون کا ضبط جواب دے گیا تب ہی اُس نے غصے سے شاستہ بیگم کی جانب قدم بڑھائے تو نور نے جلدی سے درمیان میں آتے مداخلت کی۔

”زار گھر چلیں“، اُس کے سامنے آتے اُس نے زارون کا ہاتھ تھاما۔

”اس بات کے لیے میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گا“، انگلی اٹھا کر اُن کو تنبیہ کرتے اُس نے نور کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھتے اُسے ساتھ لیے باہر کا رخ کیا۔

”اُفف سکون مل گیا مجھے آج“، اُن دونوں کے جاتے ہی صوفے پر بیٹھتے شاستہ بیگم نے مسکراتے ہوئے پچھے ٹیک لگاتے آنکھیں موند لیں۔

-----

”زار پلیز آہستہ چلانیں“، اُس کی ریش ڈرائیونگ کو دیکھتے نور نے اپنارونا دھونا بھولتے اُس سے کہا جو غصے میں سڑک کی اوپنجی پنجی جگہوں کی پرواکیے بناء گاڑی کو فل اسپیڈ پہ چلا رہا تھا۔

”زار، پلیز دیکھیں ایکسیڈنٹ ہو جائے گا پلیز اسپیڈ کم کر لیں“، اُس کے بازو پہ اپنا ہاتھ رکھتے نور نے اُسے ہلاتے اپنی جانب متوجہ کیا تو زارون نے ہوش میں آتے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتے اسپیڈ آہستہ کی۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اپنی ممانی کا غصہ میری جان لے کر نکلیں گے کیا؟“ اسپیڈ آہستہ ہوتے ہی نور کی جان میں جان آئی اور اُس نے خفگی سے زارون کو گھورتے ہوئے طنز کیا۔ ”تو تم نے زندہ رہ کہ بھی کیا کرنا؟ ممحج سے لڑنا ہی ہے نا اس لیے بہتر ہے کہ ٹائم سے اوپر پہنچ جاؤ کیونکہ مجھ میں

اتنی ہمت نہیں کہ مزید تنبیہیں برداشت کروں، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے اپنی توجہ سڑک پہ مرکوز کرتے اُس کے غصے کو مزید ہوادی۔

”ہائے اللہ میں کیوں اوپر جاؤ؟ میں نے ابھی زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے؟ اور اللہ پاک میرے جیسے معصوم لوگوں کو اتنی جلدی اوپر نہیں بلا تے“، خود کی بات کر کہ خود ہی جواب دیتے اُس نے اپنے دل کو تسلی دی۔

”بس بس معصوم لوگ اللہ پاک کو زیادہ پسند ہوتے اسی لیے وہ ان کو جلدی ہی اوپر بلا لیتے“، اُس کی باتوں سے زارون کا مودبحال ہوا تو اُس نے نور کو چھیڑا جو اُس کی باتیں سُن کر مزید پریشان ہو گئی تھی۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟“ آنکھوں میں نمی لیے نور نے اپنی موت کا سوچتے جھر جھری لی۔

”ہاں تو میں تم سے کیوں جھوٹ بولوں گا“، آنکھوں میں شرات لیے اُس نے نور کو باتوں میں الجھایاتا کہ وہ شائستہ بیگم کی باتوں کی متعلق بھول جائے۔

”مطلوب میں جلدی مر جاؤ گی؟“ چہرے پہ خوف لیے اُس نے دوسری طرف سے تصدیق چاہی تو زارون نے اپنی مسکراہٹ دباتے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ میں نے جلدی مر جانا ہے تب ہی میرے ساتھ یہ سب ہو رہا۔ پہلے آپ جیسا جلا دا انسان میری زندگی میں آیا پھر وہ لوگ اور اب آپ کی ممانتی۔ کیسے باتیں سنائی انہوں نے مجھے، آنسو بے اختیار ہو کر آنکھوں سے نکلے تو نور نے اُسے ہاتھ سے رگڑتے اپنے ساتھ ہونے والے ظلموں کے بارے میں زارون کو بتایا۔

"ممانتی تو ہیں ہی ایسی۔ وہ ہمیشہ ہی سب کا دل دکھاتیں ہیں اس لیے تم اُن کی باتوں کی ٹیکشنا نہ لوا اور بتاؤ آئسکریم کھاؤ گی؟" گاڑی ایک سائیڈ پر روکتے زارون نے اُس سے پوچھا جواب پھر سے رونے میں مصروف ہو چکی تھی۔

"مجھے نہیں کھانی۔ مجھے گھر جانا ہے"، روندھی ہوئی آواز میں اُس نے جلدی سے نفی میں سر ہلا یا تو زارون نے لمبی سانس لیتے ایک نظر اُس آنسوؤں کی مشین کو دیکھا اور گاڑی اسٹارٹ کرتے گھر کی جانب بڑھائی۔

-----  
"ارحم ادھر آؤ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے"، وہ یونیورسٹی سے گھر پہنچا توہا شم صاحب نے اُسے اپنے کمرے کی جانب جانا دیکھ کر پکارا۔

"جی کہیے؟" ان کو اس وقت گھر پر دیکھ کے ارحم کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا تو اس نے کوئی کڑوی بات کرنے کی بجائے پیچھے پلت کر قدم ان کی جانب بڑھائے۔

"یہاں بیٹھو،" خود صوفے پر بیٹھتے ہاشم صاحب نے اُسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"جی کیا ہوا ہے؟ سب خیریت ہے نا؟" ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر ارحم نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

"ہاں خیریت ہی ہے۔ تمہیں اُس آر گنائزیشن کا یاد ہے جس نے تمہاری ملنگنی کا فنگشن ارتیخ کیا تھا؟" اُس کی یاد ہانی کے لیے ساتھ وضاحت دیتے ہاشم صاحب نے بات کے آغاز کے لیے تمہید باندھی۔

"جی یاد ہے،" ان کی بات سنتے ارحم نے اثبات میں سر ہلاتے بتایا۔

"اُس آر گنائزیشن کے اوپر کی ابھی کچھ دیر پہلے ہی مجھے کال آئی تھی۔ وہ بتار ہاتھا کہ کسی شخص نے آج اُس کے آفس آکر گن پوائنٹ پر اُس دن کی ویڈیو نکلوائی اور اُس میں سے چند لوگوں کی تصویریں بن کر لے گیا، اپنی پریشانی بیان کرتے ہاشم صاحب کے ماتھے پہ پسینہ آنے لگا۔

”تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟ مطلب آپ کو لگ رہا ہے کہ یہ کام آپ کے کسی دشمن کا ہے؟“ تصویروں کا سنتے ارحام کو ان کی بات میں کوئی وزن محسوس نہیں ہوا تب ہی اندازہ لگاتے اُس نے سوالیہ نظر وہ سے ان کی طرف دیکھا۔

”ہاں، مجھے یہ کام کسی دشمن کا ہی لگ رہا۔ کسی ایسے دشمن کا جسے اُس ویڈیو میں کسی کی تلاش تھی وہ لڑکا بھی یہی بتا رہا تھا کہ اُس نے ویڈیو میں کچھ لڑکیوں کی تصویریں لیں ہیں“، پوری بات تفصیل سے بتاتے ہاشم صاحب نے ٹشو نکال کر اپنے چہرے کو صاف کیا۔

”لڑکیوں کی کیوں؟ اور کن لڑکیوں کی؟ ان کے آفس میں کوئی کیمرہ نہیں تھا کیا؟ جس سے اُس شخص کا پتا چل سکے“، اس بارہ ہاشم صاحب کی بات سنتے ارحام کو صحیح معنوں میں فکر لاحق ہوئی۔

”یہی تو مسئلہ ہے کہ بد قسمتی سے ان کے آفس کا سسٹم خراب تھا جس کی وجہ سے سارے کیمرے بند تھے“، اپنا سر کپڑتے ہاشم صاحب دشمن کے مقاصد کی سمجھ نہیں آئی تب ہی جننجھلا ہٹ کا شکار ہوتے انہوں نے اپنی جگہ چھوڑی۔

”ٹھیک ہے آپ چلیں میرے ساتھ۔ ہم لوگ اُس سے مل کر بات کرتے ہیں“، اٹھ کر کھڑے ہوتے ارحام کو یہی مناسب لگاتب ہی اُس نے ہاشم صاحب کے منع کرنے کے باوجود بھی ان کو ساتھ لیتے باہر کا رخ کیا۔

”السلام عليكم“، وہ لوگ آر گنائزیشن میں پہنچے تو وہاں کے مالک نے ہاشم صاحب کی آمد کا سنتے ہی خود باہر نکلتے ان کا استقبال کیا۔

”ہمیں سر بیٹھیں“، انہیں اپنے آفس میں لاتے عبداللہ نے سامنے موجود صوفوں کی جانب اشارہ کیا تو ہاشم صاحب کے ساتھ ساتھ ارحام نے بھی اپنی نشست سنہجال لی۔

”ہم لوگ آپ سے اُس شخص کے سلسلے میں بات کرنے آئے ہیں جس کے متعلق آپ نے کچھ دیر پہلے ابو کو بتایا تھا“، ارحام نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو عبداللہ نے اثبات میں سر ہلاتے انہیں پوری بات بتائی کہ کس طرح وہ شخص اُس کے آفس میں آیا اور گن پوائنٹ پر اُس سے ویدیو نکلواتے اُس میں سے کچھ لڑکیوں کی تصویریں بنائیں۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ کیا آپ ہمیں اُس کے حلیے کے متعلق بتاسکتے ہیں؟ اور یہ بھی کہ اُس نے کس کس لڑکی کی تصویر بنائی تھی؟“ اُس کا جواب سنتے ارحام نے دماغ میں آیا ایک اور سوال کیا۔

”حلیہ... بالکل عام ساتھا کسی ویڈیو جیسا۔ بڑی بڑی موچھیں اور بال، قدچھ فٹ کے قریب تھا تقریباً“، اُس کا حلیہ بیان کرتے عبداللہ نے جو جو بات دماغ میں تھی سب سے ارحام کا آگاہ کیا۔

”اور تصویریں اُس نے کافی ساری بنائی تھیں پر میرے سامنے صرف کچھ دلوڑ کیوں کی بنائی“، اپنا لیپ ٹاپ آن کرتے عبد اللہ نے بتانے کے ساتھ ساتھ ارحام کو وہ چند تصویریں دکھائیں جسے اُس شخص نے ویدیو روکتے اپنے موبائل پہ کھینچا تھا۔

”یہ تو کسی نیوز چینل کی اینکرز ہیں اور اسے تو وہ ٹوپی پہ بھی با آسانی دیکھ سکتا تھا“، ویدیو میں نظر آنے والی لڑکیوں کو دیکھتے ارحام نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو عبد اللہ نے مزید اُس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”اس کے علاوہ بھی اُس نے چند تصویریں بنائیں تھی مگر مجھ سے چھپا کر... مطلب اُس نے لیپ ٹاپ اپنی طرف کر کہ بھی کچھ تصویریں لیں تھیں۔

”مطلب یہ اینکرز کی تصویریں اُس نے صرف ہمیں دھوکا دینے کے لیے لیں؟“، ہاشم صاحب جو تب سے خاموش بیٹھے تھے انہوں نے عبد اللہ کی بات سننے اپنی آنکھیں سکریٹرے اندازہ لگایا۔

”جی ایسا ہی سمجھ لیں“، اُن کی بات کی تصدیق کرتے عبد اللہ نے اُن کی پرائیویٹ ویدیو کی حفاظت نہ کرنے پر اُن دونوں سے معدترت کی تواریخ نے اُس کی کوئی غلطی نہ ہونے کا یقین دلا یا۔

”کیا کر رہی ہو تم؟“، زارون جو کب سے بیٹھا اسے اپنے لیپ ٹاپ میں نظریں ٹکانے دیکھ رہا تھا بلا آخر اٹھ کر اُس کے قریب آتے اسکرین کی جانب دیکھنے لگا۔

”تم نے تو کہا تھا کہ تمہیں اسائمنٹ بنانا ہے؟“، سامنے اسکرین پہ چلتے گیم کو دیکھتے اُس نے اپنے دونوں بازوں سینے پہ باندھے۔

”تو؟ میں اسائمنٹ ہی بنارہی تھی مگر وہ مجھ سے بنانہیں تو سوچا گیم کھیل لوں“، اُس کے گھورنے پر شرمندہ ہونے کی بجائے نور نے بے فکری سے جواب دیا۔

”نہیں بنا تھا تو مجھ سے پوچھ لیتیں۔ میں مدد کر دیتا پر نیت ہوتی تو پوچھتیں“، ہاتھ آگے بڑھا کر لیپ ٹاپ بند کرتے اُس نے کلاک کی جانب اشارہ کیا جہاں رات کے گیارہ نجح چکے تھے۔

”ہائے اللہ اتنا ٹائم ہو گیا اور مجھے پتا ہی نہیں چلا“، آنکھیں مسلتے اُس نے بے یقین سے ایک بار پھر سے کلاک کی طرف دیکھا۔

”بندہ گیم کھیلنے میں مصروف ہو تو سچ میں ٹائم کا پتا نہیں چلتا“، لیپ ٹاپ ٹیبل پر رکھتے اُس نے ایک بار پھر سے طرز کیا۔

”بس بس آپ نے یہ لیپ ٹاپ ایسے ہی مجھے نہیں دیا جو اتنی باتیں سُنارے ہے ہیں۔ باقی رہی بات یگم کھیلنے کی تو میں پچھلے تین گھنٹوں سے اسائمنٹ بنانے کی، ہی کوشش میں لگی تھی تب تو آپ نے ایک بار اٹھ کے نہیں دیکھا اور بس ابھی دو منٹ پہلے، ہی یگم لگایا تو آپ جلدی سے میرے سر پہ آپنچے“، زارون کی بات کا بُرا مناتے (جس نے شاستہ بیگم کی کسی بات کا ذکر عابدہ بیگم سے نہ کرنے پر اُس کی شرط کے مطابق رشوٰت کے طور پر لیپ ٹاپ اُسے اسائمنٹ بنانے کے لیے دیا تھا) اُس نے منه پھلا یا۔

”دو منٹ؟ بس بس زیادہ جھوٹ نہ بولو اور دوبارہ میرے لیپ ٹاپ کو ہاتھ مت لگانا“، تنبیہ کرتے اُس نے نور کو ناراض چھوڑ رہے ہی بالکل کوئی کارخ کیا۔

”میں لگاؤں گی ہاتھ اور اگر آپ چاہتے ہیں کہ میں ہاتھ نہ لگاؤں تو مجھے میرا لیپ ٹاپ لے دیں تاکہ میں اُس میں سکون سے اپنے سارے کام کر سکوں“، اُس کے پچھے ہی باہر آتے نور نے فرمائش کی۔ ”اچھا ٹھیک ہے لے دوں گا“، رات کے اس وقت لڑنے کی بجائے زارون نے اپنی آمادگی ظاہر کی تو نور کے چہرے پر ایک دم سے مسکراہٹ آگئی۔

”زار آپ بہت اچھے ہیں“، خوشی سے سر اُس کے سینے پر رکھتے اُس نے اپنے دونوں بازو اُس کے گرد لپیٹے تو زارون نے ساکت ہوتے اُس کی حرکت کو دیکھا۔

”اچھا! بس، بہت تعریف ہو گئی ہے اب جا کر سو جاؤ“، اُسے خود سے الگ کرتے زارون نے اپنا رخ پھیرا تو نور کو اپنی جلد بازی پہ شرمندگی ہوئی تب ہی کچھ کہے بغیر اُس نے شرم سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ جلدی سے کمرے میں جانے کی کی۔

”اُفف پتا نہیں یہ لڑکی مجھ سے کیا چاہتی ہے“، اُس کے جاتے ہی زارون نے اپنی رکی ہوئی سانس بحال کرتے چہرے پہ آئی مسکراہٹ کو لب سکریٹے غائب کیا۔

-----

”یہ اماں کہاں ہیں؟“، کل سے گھر میں خاموشی محسوس کرتے مراد شاہ نے بشری خاتون کے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر جھانکتے سائرہ سے استفسار کیا جو حیدر شاہ کے لیے چائے لے کر ان کے کمرے کی جانب جا رہی تھی۔

”سامنے، وہ بڑے سائیں نے بی بی جی کو پاگل خانے بھجوادیا ہے“، سرجھکائے دکھ کے ساتھ اُس کی بات کا جواب دیتے سائرہ کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”ہم اچھا کیا۔ جان چھوٹی پاگل سے“، اُس کی بات پر بے زاری سے شکر ادا کرتے اُس نے ٹرے اُس کے ہاتھ سے لی اور اپنے لیے ناشتہ بنانے کے کہتے حیدر شاہ کے کمرے کی جانب بڑھا تو سارہ نے بشری خاتون کے لیے دلبڑا شتہ ہوتے کچن کارخ کیا۔

”کیا ہوا تجھے؟ سائیں نے کچھ کہا ہے؟“ عالیہ جو سارہ کی چھوٹی بہن تھی اُس نے اُسے یوں کچن میں آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر روتا دیکھ کر فکر مندی سے اُس کے قریب آتے سوال کیا۔

”کچھ نہیں، بس بی بی جی کی یاد آگئی تھی“، دوپٹے سے آنسو پوچھتے اُس نے فرنج میں سے آٹاں کالا۔

”ہاں، بی بی جی تو مجھے بھی بہت یاد آتی ہیں۔ قسم سے بہت اچھی تھیں پر! یہ سائیں لوگ... توبہ بہت برے اور ظالم ہیں“، اُس کی بات سنتے ہی عالیہ نے نفرت سے کہا تو سارہ نے جلدی سے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے اُسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”کیا ہو گیا ہے پاگل ہو گئی ہو کیا؟ ابھی کوئی سُن لیتا تو قیامت آجائی“، اُسے آنکھیں نکال کر خاموش رہنے کا اشارہ کرتے اُس نے چور نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا۔

”بس کریں آپی اور خدا کے لیے ان ظالموں سے ڈرنا چھوڑ دیں جنہوں نے ہمارے جیسے کمزور لوگوں پر ہمارے اپنے ہی ڈر کی ہی وجہ سے حکومت جمار کھی ہے“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے عالیہ جو شروع سے ہی نظر تھی اُس نے دلیری کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

”تو گھر چل اماں کے پاس۔ میں تجھ سے گھر آگر بات کروں گی“، اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے سائرہ نے مراد شاہ کے خوف سے کانپتے ہوئے اُس کا بازو پکڑا اور کچن میں موجود دروازے سے باہر نکالتے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے تو عالیہ نے ایک ترس بھری نگاہ اُس پہ ڈالی جو پچھلے دس سالوں سے خود توہر ظلم خاموشی سے برداشت کر رہی تھی پر اب ساتھ اُسے بھی اپنے جیسا بنانے کی کوشش میں لگی بار بار زبان بند رکھنے کی نصیحتیں کرتی۔

”مجھے تجھ سے اب کوئی بات نہیں کرنی اب جو کرنا ہوا میں خود کروں گی“، اُس کے غصے پر آنکھوں میں بے خوفی لیے عالیہ نے دو قدم اُس کے قریب آتے دھمکی دی اور اپنی چادر ٹھیک کرتے گیٹ کی جانب بڑھی۔

”پا گل ہو گئی ہے یہ لڑکی“، اُس کی بات کو سنجیدہ لینے کی بجائے بیوقوفی سمجھتے سائرہ نے خود کلامی کی اور واپس کچن میں آتے جلدی سے ہاتھ چلانے لگی تاکہ مزید وقت ضائع کیے بغیر ناشستہ تیار کر کر کمرے میں لے جاسکے۔

”امی، امی کہاں ہیں آپ؟“ سڑھیاں اُترتے زارون نے اُنہیں آواز دینے کے ساتھ اپنارخ ان کے کمرے کی جانب کیا۔

”کیا ہوا؟ کیا شور مچا رکھا ہے؟“ کمرے کی بجائے ڈرائیور میں سے باہر آتے عابدہ بیگم نے اُس کے بار بار آواز دینے پر جھنجھلا کر سوال کیا تو زارون نے ہاتھ میں پکڑی شرٹس ان کے سامنے کیا۔

”میری شرٹس کا یہ حال کس نے کیا ہے؟“ بدرنگ ہوئیں چار شرٹس کو ان کی جانب بڑھاتے زارون نے اپنے غصے کو ضبط کرتے اپنے شور کرنے کی وجہ بتائی تو عابدہ بیگم نے شرٹس اُس کے ہاتھ سے پکڑتے اُنہیں باغور دیکھا۔

”کپڑے تو نسرین ہی دھوتی ہے پر پہلے تو کبھی اُس نے ایسی غلطی نہیں کی،“ شرٹس پر چڑھے رنگ کو دیکھتے عابدہ بیگم کو خود بھی حیرت ہوئی۔

”پہلے نہیں کر تیں تو اب کر دی۔ امی میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے کہ میرے کپڑے آپ اپنی نگرانی میں دھلوایا کریں،“ عابدہ بیگم کی بات سننے زارون نے ماہوسی سے کہتے پیچھے کھڑی نور پہ آک نظر ڈالی جو اُس کی آواز سننے کچن سے نکل کر قریب آچکی تھی۔

”نہیں بیٹا ایسی بات نہیں ہے اور مجھے نسرین پہ پورا یقین ہے وہ کبھی بھی ایسی غلطی نہیں کر سکتی اور اگر اس سے کچھ خراب ہو بھی جاتا تو وہ مجھے بتا کر جاتی“، زارون کی بدگمانی پر اُسے سمجھاتے ہوئے عابدہ بیگم نے اپنی ملازمہ کی سائیڈ لی جو کافی عرصے سے اُن کے گھر کام کر رہی تھی۔

”ٹھیک ہے اگر انہوں نے نہیں کی تو پھر یہ کام کس نے کیا؟ گھر کے سب کام وہی کرتی ہیں نا؟ اور آپ کے کہنے کے مطابق کپڑے بھی وہی دھوتی ہیں“، نسرین کے لیے عابدہ بیگم کی طرف داری زارون سے ہضم نہیں ہوئی تب وہی دلیل پیش کرتے اُس نے جواب طلب نظر وہ سے انہیں دیکھا۔

”بس کرو، اور کیا یہ چند ہزار کی شرٹس کے لیے تم مجھ سے بحث کر رہے ہو۔ جب کہہ دیا کہ نسرین یہ کام نہیں کیا تو فضول میں اُس غریب پہ الزام مت لگاؤ“، زارون کے بڑھتے سوال وجواب سے تنگ آتے عابدہ بیگم نے غصہ دکھایا تو نور نے معاملہ خراب ہوتا دیکھ کر جلدی سے اپنی زبان کھولی۔

”وہ.. ما مایہ شرٹس مجھ سے خراب ہوئیں ہیں“، سرجھ کائے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے اُس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”وہ... جب آپ پرسوں ماموں کو دیکھنے کئی تھیں تو آنٹی کے گھر سے اُن کی بیٹی اُن کو بلا نے آگئی۔ اُن کے چھوٹے بیٹے کی طبیعت خراب تھی تو میں نے انہیں جانے کا کہہ دیا اور

خود کپڑے دھونے لگ گئی، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کرتے اُس نے اپنے کارنامے سے اُن دونوں کو اگاہ کیا جو خاموشی سے کھڑے اُسے سُن رہے تھے۔

”سچ میں، میں نے جان بوجھ کے کچھ نہیں کیا۔ مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ شر ٹس رنگ دار کپڑوں کے ساتھ نہیں ڈالنی، آنکھوں میں نبی لیے اُس نے ڈانٹ کے ڈر سے جلدی جلدی اپنی صفائی دی تو عابدہ بیگم کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔

”کوئی بات نہیں بیٹا۔ جو کام انسان نے پہلے نہ کیا ہوا اُس میں غلطی ہو جاتی ہے پر تمہیں یہ بات چھپانی نہیں چاہیے تھی، اُس کی غلطی پہ ڈانٹنے کی بجائے عابدہ بیگم نے بے حد نرمی سے سمجھاتے اُسے اپنے ساتھ لگایا جواب باقاعدہ رونے لگی تھی۔

”میں۔۔۔ نے۔۔۔ چھپا یا نہیں تھا۔ بس مجھے آپ سے اور زار سے ڈر لگتا ہے اس لیے نہیں بتایا،“ سوں سوں کرتے اُس نے عابدہ بیگم سے الگ ہوتے صفائی پیش کی۔

”اچھا ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں بس اب تم رو نابند کرو اور جاؤ جا کر تیار ہو جاؤ۔ ارحم لوگ انتظار کر رہے ہوں گے،“ اُس کی آنکھیں صاف کرتے عابدہ بیگم نے اُسے شرمندگی سے نکالنے کے لیے بات بدلتی تو نور نے اثبات میں سر ہلاتے جلدی سے وہاں سے بھاگنے کی کی۔

”اُتنی مہنگی شر ٹس تھیں میری اور مجھے پسند بھی“، نور کے جاتے ہی (زارون جو اُس کے اکشاف پر صرف عابدہ بیگم کے آنکھیں دکھانے پر خاموشی اختیار کیا کھڑا تھا) اُس نے ماں سے شکایت کی۔

”کوئی بات نہیں اور آجائیں گی بس اب تم اُسے کچھ مت کہنا“، اُسے تاکید کرتے عابدہ بیگم نے اپنے موبائل کے بجھنے کی آواز سنتے رخ کمرے کی جانب کیا تو زارون بھی سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں آگیا جہاں نور گھسنوں پہ سر رکھے ابھی تک رونے میں مصروف تھی۔

”رونادھونا بند کرو اور اٹھ کر تیار ہو جاؤ۔ پہلے ہی ہمیں کافی دیر ہو چکی ہے“، کلاک پہ دوپھر کا ایک بجتاد کیکھ کر زارون نے اُسے مخاطب کیا جو اُس کی بات ان سنبھالنے کرتے اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔

”نور، میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں“، اُس کے رونے کی اسپیڈ تیز ہوتی دیکھ کر زارون نے ایک لمبا سانس لیتے خود کو پر سکون کیا اور اُس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

”تمہارے رونے سے میری شر ٹس ٹھیک ہو جائیں گی کیا؟ اگر ہو جائیں گی تو دل کھول کر رولو“، اُس کا چہرے اپنے ہاتھوں میں بھر کر اپنی طرف کرتے زارون نے غصہ دکھانے کی بجائے نرمی سے پوچھا۔

"ن۔ ہیں، پر میں ماما کو پہلے بتا دیتی تو یوں مجھے اُن کے سامنے شرمندگی نہ ہوتی" ، رونے کے درمیان بمشکل اپنی بات مکمل کرتے اُس نے مقابل کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا۔

"اچھا کوئی بات نہیں۔ غلطی ہو جاتی ہے ایسے ہی انسان سیکھتا ہے اور ماما مجھ سے خفا ہو سکتی ہیں پر تم سے نہیں اس لیے پلیز یہ سب سوچنا چھوڑ اور اٹھ جاؤ۔

ہماری دعوت دوپہر کی ہے رات کی نہیں" ، اُس کے آنسوؤں کو اپنی پوروں میں جذب کرتے زارون نے مسکراتے ہوئے اُس کا مودبھال کرنے کی کوشش کی۔

"مجھے نہیں جانا" ، نفی میں سر ہلاتے نور نے اُس کے ہاتھ ہٹائے۔

"کیوں نہیں جانا؟ یار ارحام اور رابعہ نے اتنے پیار سے ہمیں بلا یا ہے اگر ہم نہیں گئے تو انہیں بُرا لگے گا اور امی کو بھی اس لیے بس اب مجھے تمہاری کوئی بات نہیں سننی۔ اٹھو اور تیار ہو جاؤ" ، اُسے بازو سے کپڑ کر کھڑا کرتے زارون نے مزید اُس کے نخزے اٹھانے کی بجائے دھمکی دی تو نور نے عابدہ بیگم کی ناراضگی کا سنتے ہی جلدی سے اٹھتے الماری سے اپنے کپڑے نکالے اور منہ ہاتھ دھونے واش روم کی جانب بڑھی۔

"ہونہ نہ حد ہے شوہر کی ناراضگی سے زیادہ اسے اپنی ساس کی ناراضگی کی فکر ہے" ، واشر ورم کے بند دروازے کو گھورتے زارون نے خود کلامی کی اور اٹھ کر خود بھی تیار ہونے لگا۔

”بابا کیا ہوا آپ کو پلیز آنکھیں کھولیں“، نائلہ بیگم کے زور زور سے پکارنے پر رضا جو اپنے کمرے میں موجود کل کے پیپر کی تیاری کر رہا تھا جلدی سے اٹھ کر ان کے کمرے میں آیا جہاں ظہیر صاحب زمین پر بے ہوش پڑے تھے۔

”بابا پلیز آنکھیں کھولیں“، نائلہ بیگم کو رو تاد کیکھ کر رضا نے خود ہی ہمت کرتے کچن سے پانی لاتے ان کے چہرے پر چھینٹے مارے۔

”رضا گاڑی نکالو جلدی“، ان کے بے سدھ وجود کو دیکھتے نائلہ بیگم نے چلاتے ہوئے کہا تو اس نے باہر کی جانب دوڑ لگائی اور چند ہی منٹوں میں ابرا ہیم اور اس کے ابو کی مدد سے اس نے ظہیر صاحب کو ہسپتال پہنچایا جہاں ڈاکٹر نے بی پی ہائی ہونے کی وجہ سے ہارت اٹیک آنے کا بتاتے انہیں دعا کرنے کا کہا۔

”اما پلیز خود کو سن بھالیں“، نائلہ بیگم کو رو تاد کیکھ کر رضا نے انہیں تسلی دی۔

”رضاخدا کے لیے اپنے بابا کو بچالو۔ انہیں کہو کہ بس ایک بار مجھے معاف کر دیں۔ میں دوبارہ کبھی ان سے ناراض نہیں ہوں گی“، (نائلہ بیگم جو اس دن نور کے بارے میں ہونے والی بات کے بعد

ظہیر صاحب سے بالکل اپنی بول چال بند کیے ہوئے تھیں) بیٹے کے سامنے گڑ گڑاتے ہوئے کہنے لگیں۔ ”ان شاء اللہ بابا جلد ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ بس خود کو سنبھالیں اور دعا کریں“، ان کے آنسو صاف کرتے رضا نے تسلی دی اور نرس کے میدیں سن لانے کا کہنے پر ابراہیم کو ان کا خیال رکھنے کا کہتے جلدی سے ہسپتال میں موجود میدیں کل اسٹور کی جانب بڑھا۔

---

”نور یار کھانا کھاؤ ٹھنڈا ہو رہا ہے“، اُسے کب سے اپنی پلیٹ میں خالی چمچہ چلاتا دیکھ کر رابعہ نے کہا تو احمد اور زارون بھی اُس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟“ دوسری طرف کوئی جواب نہ پا کر رابعہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو ایک دم سے اپنی سوچوں سے نکلتے وہ ہوش کی دنیا میں آئی۔

”کیا ہوا؟“ ان تینوں کو اپنی جانب دیکھتا پا کر جواب دینے کی بجائے اُس نے اٹھاوساں کیا۔

”ہمیں کچھ نہیں ہوا پر لگتا ہے تمہیں کچھ ہوا ہے؟“ زارون نے کچھ کہا ہے تو مجھے بتاؤ“، احمد جو کب سے اُس کی خاموشی نوٹ کر رہا تھا اُس نے اپنی آستین چڑھاتے رابعہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نور سے پوچھا۔

”نہیں، زار نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس میرے سر میں درد ہے“، اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے اُس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”زیادہ درد ہے تو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ؟“ اُس کے سپید پڑتے رنگ کو دیکھتے اب زارون کو بھی فکر ہوئی تب ہی پانی کا گلاس اُس کی جانب بڑھاتے اُس نے استفسار کیا تو نور نے نفی میں سر ہلا کیا۔

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔ آپ لوگ کھانا کھائیں“، پانی کے دو گھونٹ لیتے اُس نے ان تینوں کو تسلی دیتے گلاس واپس ٹیبل پہ رکھا اور خود بھی کھانا کھانے کی کوشش کرنے لگی جو بلاوجہ ہی اُس کے گلے میں پھنس رہا تھا۔

”نور مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تم پلیز چلو۔ ہم ڈاکٹر پاس چلتے ہیں“، ایک چمچہ کھانے کے بعد وہ پھر سے رکی تو رابعہ نے فکر مندی سے اُس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں تم پریشان نہ ہو“، ان سب کی دعوت خراب ہونے کے ڈر سے نور نے بمشکل چہرے پہ مسکراہٹ سجائی۔

”اچھاٹھیک ہے، چلو را باہر گھوم کے آتے ہیں“، اُس کی تسلی کے باوجود بھی رابعہ کو سکون نہیں آیا تب ہی اُس نے اُس کا ہاتھ تھامتے ارجم کو کچھ دیر میں آنے کا کہا اور ہوٹل کی بیرونی سائیڈ کی جانب بڑھی جہاں سوئنگ پول موجود تھا۔

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے یا زارون سے پھر سے لڑائی ہو گئی؟“، وہاں پہنچتے ہی رابعہ نے پھر سے سوالوں کی بوچھاڑ کی تو نورِ نفی میں سر ہلاتے وہاں موجود کرسی پر بیٹھ گئی۔

”کسی نے کچھ نہیں کہا یا بس پتا نہیں کچھ دیر سے میرا دل بہت گھبر ا رہا ہے“، اُس کی بات کا جواب دیتے نور نے اپنے حجاب کو تھوڑا ڈھیلا کیا۔

”کیوں گھبر ا رہا ہے؟ بتاؤ کیا ہوا ہے؟“ اُس کے ساتھ واپسی کر سی سنبھالتے رابعہ نے پھر سے اپنی بات دوہرائی۔

”پتا نہیں، بس ایسا لگ رہا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہو، کچھ بُرا“، اب کی بار بے زاری سے کہتے نور نے خود پہ کسی کی نظریں محسوس کرتے سامنے دیکھا۔ جہاں وہی شخص کھڑا ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھ رہا تھا جس نے ارجمند کی منگنی پر اُس سے بد تمیزی کی تھی۔

”کچھ نہیں ہوتا یہ بس ہمارے وہم ہوتے جنہیں ہم سچ سمجھتے دماغ پر سوار کر لیتے ہیں“، اُس کی بات سنتے رابعہ نے نارمل سے انداز میں اُسے تسلی دی جواب اُس شخص کو پہچانتے ہی خوف زدہ ہو چکی تھی۔

”ہاں مجھے بھی یہی لگ رہا۔ بس چلو اندر چلتے ہیں ارجمند بھائی اور زارون ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے“، اُس کی جانب متوجہ ہوتے نور نے اندر چلنے کا کہا تو رابعہ نے اُسے دو منٹ رکنے کا کہتے اُس کے منع کرنے کے باوجود ہی وہاں ساتھ ہی موجود واش روم کا رخ کیا تو مراد شاہ جو حیدر شاہ کے کہنے پر وہاں ایک سیاسی پارٹی کے بندوں سے ملاقات کرنے آیا تھا فوراً سے اُس کی جانب بڑھا۔

”افف میری قسمت یقیناً بہت اچھی ہے تب ہی با بسانیں کے ایک بار کہنے پہ ہی میں یہاں آگیا“، اُسے وہاں سے فرار ہونے کی تیاری کپڑتاد کیکھ کر مراد شاہ نے اُس کا راستہ روکتے خوشی سے نہال ہوتے اپنے آپ پر رشک کیا۔

”میرا راستہ چھوڑیں پلیز“، اُس حصہ کے سنسان ہونے پر نور نے دو قدم پیچھے ہوتے اُسے تنبیہ کی۔

”نه نہ، اب یہ ممکن نہیں“، اُس کی بات پر قہقہہ لگاتے مراد شاہ نے اُس کے خوبصورت چہرے کو دیکھا جو آج اُس دن سے بھی زیادہ حسین لگ رہا تھا۔

”پیز آپ بد تیزی نہ کریں اور میرا راستہ چھوڑ دیں“، اُسے اپنی جانب بڑھتا دیکھ کر نور نے دوسری جانب سے نکلنے کی کوشش کی پر مراد شاہ نے اُس کے سامنے آتے اُسے روکا۔ ”بد تیزی؟ بد تیزی میں نہیں بلکہ تم کر رہی ہو جان من“، اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے مراد شاہ نے نظروں میں خمار لیے اُس کے چہرے کو چھونا چاہا تو نور نے بروقت پیچھے ہٹتے اُسے ایسا کرنے سے روکا اور غصے سے پوری طاقت لگاتے اُسے پیچھے کی جانب دھکا دیا تو وہ جو پول کے بالکل پاس کھڑا تھا اپنا تو زان برقرار نہ رکھتے پانی میں جا گرا۔

”دوبارہ تم نے میرے سامنے آنے کی کوشش کی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی“، اُس کے گرتے ہی نور نے اپنے خوف کو پس پشت ڈالتے مراد شاہ کو دھمکی دی اور رابعہ کے آنے کا انتظار کیے بغیر ہی اُس شخص کے باہر آنے کے ڈر سے جلدی سے وہاں سے بھاگتے اندر آگئی۔

”میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں“، شکار ہاتھ سے نکلنے پر غصے سے لال ہوتے مراد شاہ نے پانی میں زور سے ہاتھ مارا اور کنارے کی جانب بڑھتے باہر آیا پر اپنے سارے کپڑے گیلے ہونے کی وجہ سے وہ شرمندگی کے مارے اندر جانے کی بجائے جینٹس واشروم کی جانب بڑھا اور جیب سے موبائل نکال کر اُسے جلد از جلد آن کرنے کی کوشش کرنے لگاتا کہ باہر موجود اپنے ڈرائیور کو اُس لڑکی کا پیچھا کرنے کا کہہ سکے جو آج پھر اپنی چالاکی کی وجہ سے اُس کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

”کیا ہوا؟! تنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ اور رابعہ کہاں ہے؟“ نور نے وہاں سے دوڑ لگائی تو اپنے ٹیبل کے قریب پہنچتے سانس لیا جہاں ارجمند، زارون کو وید بیو والی بات بتا رہا تھا۔ ”وہ واش روم گئی ہے،“ ان دونوں کے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھتے نور نے جلدی سے جواب دیا اور ٹیبل پر پڑا پانی کا گلاں اٹھا کر ایک ہی سانس میں پی گئی۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ اس کے پانی ختم کرتے ہی زارون نے اٹھ کر اس کے قریب آتے پوچھا جو کب سے عجیب حرکتیں کرتے اُسے پریشان کر رہی تھی۔

”کچھ نہیں، مجھے کسی نے کیا کہنا ہے،“ کندھے اچکاتے نور کو ارجمند کے سامنے زارون کو کچھ بتانا مناسب نہیں لگاتب ہی کندھے اچکاتے اُس نے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کی۔

”نور میں تمہیں وہاں ڈھونڈ رہی تھی اور تم یہاں ہو،“ رابعہ جو اُسے ہر طرف دیکھنے کے بعد اندر آئی تھی اُس نے اُسے ارجمند اور زارون کے ساتھ دیکھ کے سکھ کا سانس لیا۔

”ہاں، بس وہ میرا دھوپ میں دل گھبر ارہا تھا اس لیے تمہارا انتظار نہیں کیا“، معقول سی وجہ بتاتے اُس نے اُن سب کو بیٹھنے کا کہا تو ایک مشکوک سی نظر نور پہ ڈالتے زارون نے اپنی کرسی سنبھالی تو ارجمند نے ویٹر کو آواز دیتے بل لانے کا کہا۔

---

پچھلے چار گھنٹوں سے ظہیر صاحب آئی سی یو میں موجود تھے مگر ابھی تک ڈاکٹر زکی طرف سے کوئی پر امید خبر نہ آنے پر نائلہ بیگم کا دل ہولنے لگا تھا۔

”رضا پلیز کسی ڈاکٹر سے پوچھو کہ کیا مسئلہ ہے؟ کیوں اتنی دیر لگ رہی ہے تمہارے بابا کو ہوش آنے میں؟“ کرسی سے اٹھ کر اُس کے قریب آتے نائلہ بیگم نے تب سے کوئی پچاس بار ایک ہی سوال دو ہرا یا۔

”ماما پلیز آپ پریشان نہ ہوں اور ڈاکٹر کہہ رہے ہیں کہ بابا کو جلد ہوش آجائے گا۔ بس آپ دعا کریں“، انہیں ڈاکٹر کی بتائی ہوئی بات بتاتے رضا نے مطمئن کیا تو اُس کے پاس کھڑے ابراہیم نے بھی آگے بڑھتے نائلہ بیگم کو تسلی دی۔ ”آنٹی پلیز آپ حوصلہ کریں۔ اللہ نے چاہا تو انکل جلد ٹھیک ہو جائیں گے“، رضا کو پہلے ہی پریشان دیکھ کر اُس نے انہیں سمجھایا جو پھر سے رونے لگیں تھیں۔

”میرا دل بہت گھبر ار ہا ہے۔ ابراہیم پلیز تم کسی ڈاکٹر سے بات کرو اور ان سے پوچھوا گراؤں کو سمجھ نہیں آرہی تو ہم ظہیر کو کسی اور ہسپتال لے جاتے ہیں“، اُس کی تسلی پر نائلہ بیگم نے اُس سے درخواست کی۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر زاپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ بس آپ دعا کریں اور پلیز ایسے پریشان نہ ہو۔ نہیں تو آپ کی اپنی طبیعت خراب ہو جائے گی“، اُنہیں پوری تفصیل بتاتے ابراہیم نے واپس کر سی پہ لے جا کر بٹھایا اور رضا کو بتاتے اُن کے لیے پانی لینے چلا گیا۔

”رضا، زارون کو کال کر کے اپنے بابا کے بارے میں بتا دو“، ابراہیم کے جاتے ہی نائلہ بیگم نے اُس سے کہا جو چند قدموں کا فاصلہ سیمیٹنے اُن کے قریب آچکا تھا۔

”میں نے دوبار کال کی ہے پر زارون بھائی کا موبائل بند ہے“، جھوٹ کا سہارا لیتے رضا کو اس وقت نور کا وہاں آنا مناسب نہیں لگاتب، ہی نائلہ بیگم کو پھر سے کال کرنے کا کہتے ٹال گیا۔

”اچھا بس تم کوشش کرتے رہنا اور جیسے ہی بات ہو اُسے کہنا کہ نور کو وہاں لے کر آجائے“، ابراہیم کو اپنی جانب آتا دیکھ کر انہوں نے تاکید کی تو رضا نے اثبات میں سر ہلا یا۔

-----

کچھ دیر موبائل کو آن کرنے کی کوشش کرتے جب مراد شاہ کو بات بنتی نظر نہ آئی تو اس نے اپنے گیلے کپڑوں کی پروپریتی ہی ہوٹل کے اندر ونی حصے کا رخ کیا اور ایک نظر ٹیبلز پر بیٹھے لوگوں کو دیکھتے جب وہ لڑکی اُسے کہیں بھی نظر نہیں آئی تو وہ غصے سے باہر کی جانب بڑھا جہاں اُس کے ڈرائیور نے اُسے دیکھتے ہی جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

”سامنے اب کہاں جانا ہے؟“ ڈرائیور نے سینجھا لتنے ڈرائیور نے پوچھا تو مراد شاہ نے غصے سے لال پیلے ہوتے اُس کو کھا جانے والی نظر ووں سے دیکھا۔

”جہنم میں لے چلو“، اُس لڑکی کا غصہ بے قصور ڈرائیور پہ نکالتے وہ دھاڑا تو رفیق نے اپنے ہونٹوں پہ زبان پھیرتے انہیں ترکیا۔

”سامنے میرا مطلب تھا کہ حوالی جانا ہے یا آپ کو مزید یہاں شہر میں کوئی کام ہے؟“ اپنے سوال کی وضاحت دیتے اُس نے خاموشی اختیار کرتے اُس کے جواب کا انتظار کیا۔ ”حوالی چلو“، اپنے غصے کو ضبط کرتے مراد شاہ نے اپنے موبائل کو پھر سے آن کرنے کی کوشش کی جو پانی میں گرنے کی وجہ سے بند ہو چکا تھا۔

”تمہارے پاس شکور کا نمبر ہے؟“، جھنچھلاہٹ سے موبائل سیٹ پہ پھینکتے اُس نے ڈرائیور سے پوچھا جس نے جی سائیں کہنے کے ساتھ ہی اُسے شکور کا نمبر نکال کر دیا۔ ”بیلنس ہے؟“ اسکرین کی جانب دیکھتے ہی اُس نے دوسرا سوال کیا تو رفیق نے اثبات میں سر ہلاایا۔

”جی سائیں ہے“، نظریں سامنے سڑک پہ مرکوز رکھتے اُس نے مراد شاہ کی بات کا جواب دیا جو اُس کی بات سنے بغیر ہی دوسری طرف کا ملاتے شکور سے بات کرنے لگا تھا۔

-----

”زار پلیز آپ مجھے یہ ٹاپک سمجھادیں گے؟“، گھروپی پر نور جو تب سے بیٹھی اپنے کل ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھی اُس نے ایک ٹاپک کے سمجھنے آنے پر زارون سے کہا۔ ”ہاں لاوڈ کھاؤ کیا سمجھنا ہے؟“، اُس کی بات سنتے اُس نے لیپ ٹاپ کی اسکرین سے نظریں ہٹاتے اُس کے ہاتھ سے رجسٹر لیتے وہاں بنی تصویر کو دیکھا۔

”یہ کیا ہے؟“، ماتھے پہ بل لیے اُس نے سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا جو صفحے پہ ایک کارٹون کہ ساتھ کچھ سوالیہ نشان لگا کر اُس کے پاس لائی تھی۔

”یہ آپ ہیں اور یہ سوالیہ نشان ہے“، انگلی پہلے کارٹون اور پھر اس نشان پر رکھتے نور نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اُس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

”یہ میں ہوں؟“ کارٹون کے ٹیڈھے منہ، بڑے بڑے دانت اور سر پہ نکلے سینگوں کی جانب اشارہ کرتے زارون نے تصدیق چاہی تو نور نے تیزی سے سر ہلایا۔

”بہت بد تمیز ہو تم۔ مجھے لگ رہا کہ تم نے اپنی شکل شیشے میں دیکھ کر یہ تصویر بنائی ہے“، لبوں پہ آنے والی مسکراہٹ کو دباتے زارون نے پرسوچ انداز میں اندازہ لگایا۔

”نهیں، میں نے آپ کو دیکھ کر ہی آپ کی تصویر بنائی ہے۔ یہ دیکھیں لگ رہے ہیں ہیں ناسیم سیم“، رجسٹر اٹھا کر اُس کے چہرے کے ساتھ لگاتے نور نے شیشے کی جانب اشارہ کیا تو زارون نے رجسٹر پکڑتے وہ صفحہ پھاڑتے اٹھ کر کوڑے دان میں پھینکا۔

”اب میں تمہاری تصویر بناؤں گا“، پینسل لے کر اُس کے سامنے بیٹھتے زارون نے رجسٹر اپنے سامنے رکھا تو نور نے اُس کی آنکھوں میں شرار特 دیکھ کر جلدی سے رجسٹر بند کیا۔

”نهیں، مجھے پتا ہے میں بہت پیاری ہوں اس لیے پلیز آپ اپنے نایاب ہاتھوں کو تکلیف نہ دیں اور پلیز میرے ساتھ لڈو کھیل لیں“، اپنے مطلب کی بات پہ آتے نور نے اُس کی منت کی۔

”ٹھیک ہے کھیل لوں گا پر ایک شرط پہ“، اُس کی بات سنتے زارون نے کچھ سوچتے ہوئے حامی بھری۔

”مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے بس میرے ساتھ لڈو کھیل لیں میرا بہت دل کر رہا ہے“، اُس کی شرط سے بغیر ہی نور نے رضامندی ظاہر کرتے جلدی سے اپنی طرف کی دراز کھولتے اُس میں سے لڈو نکال کر بیٹھ پڑ کھا۔

”شرط تو سن لو پہلے“، اُسے لڈو کھیلنے کی تیاری کرتا دیکھ کر زارون نے کہا۔

”میں نے کہا ناجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے بس آپ شروع کریں“، نور جس نے کل ہی یونیورسٹی سے واپسی پہ لڈو خریدی تھی اور اُس کے کھیلنے کی خوشی میں زارون کی آنکھوں میں ابھرتی شرارت کو فراموش کرتے اُسے باری چلنے کا کہا جو اُس کی جانب سے اپنی ہر بات ماننے کا سنتے خود بھی خاموشی سے کھیلنے لگا۔

”زار آپ نے چیٹنگ کی ہے۔ مجھے پتا جان بوجھ کر آپ نے میری گوٹ ماری ہے“، زارون نے اُس کی جو تھی گوٹ مار کر اُس کے خانے میں رکھی تو نور نے اُسے بے ایمانی کا نام دیتے ساری گوٹ ہاتھ مار کے ادھر ادھر پھینکتے منہ پھلا یا۔ ”بے ایمانی میں نہیں بلکہ تم کر رہی ہوا اور یہ کیا طریقہ ہے کھیلنے کا؟ جب دیکھا ہار نے لگی تو ساری گیم خراب کر دی“، اُس کے الزام پر بیڈ پہ بکھری گوٹوں کو اٹھاتے زارون نے ڈبے میں ڈالا۔

”تو میں کروں گی۔ جب آپ مجھے ہر انیں گے تو میں ایسے ہی سب خراب کروں گی“، بیڈ پہ پڑے کشن اٹھا کر دیوار پہ مارتے اُس نے دوپھر سے ہونے والی بے چینی کا غصہ زارون پہ نکلا جواب خاموش نظر وں سے بیٹھا اُس کی ہر بد تمیزی برداشت کر رہا تھا۔

”کھیل میں ایک شخص ہی جیتا ہے اور تم مانو یانہ مانو پر میں جیت چکا ہوں اس لیے تمہیں اب ہر حال میں میری شرط مانی پڑے گی“، اُس کے غصے کی پرواکیے بغیر زارون نے اپنے مطلب کی بات کہی۔

”مجھے کوئی شرط نہیں مانی۔ آپ نے جان بوجھ کے مجھے ہرا یا“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے صاف ہی مکرتے اٹھ کر جانا چاہا۔

”میں نے جان بوجھ کے ہر یا یا جیسے بھی، پر تم ہارچکی ہو اس لیے تمہیں اب میری بات مانی پڑے گی“، اُس کا ہاتھ پکڑتے زارون نے نظروں میں سنجیدگی لیے اُسے پابند کیا۔

”ہونہہ بتائیں کیا شرط ہے؟“ اُس کے ماتھے پہ بل پڑتے دیکھ کر نور نے اُس کا ہاتھ جھٹکتے خزرے سے پوچھا۔

”پہلے ادھر آؤ میرے پاس“، لڈو اٹھا کر سایہ پر رکھتے زارون نے اپنے قریب جگہ بنائی۔

”مطلوب؟ میں آپ کی ایسی کوئی شرط نہیں مانوں گی“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے سرخ پڑتے نظریں پھیریں۔

”شرط تو میں نے ابھی بتائی ہی نہیں بس پاس آنے کا کہا ہے اور فکرناہ کرو، جیسا تم سوچ رہی ویسا میں کچھ نہیں چاہتا“، کندھے اچکاتے اُس نے نور کی بات سنتے اپنی مسکراہٹ چھپاتے وضاحت دی۔

”مطلوب؟ میں کیسا سوچ رہی؟ میں نے کچھ نہیں سوچا“، اُس کے قریب بیٹھتے نور نے اُسے آنکھیں دکھائیں جواب مسکرا رہا تھا۔

”بتائیں اب؟“ سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھتے اُس نے استفسار کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ تم دوپھر سے ہی ایسے پریشان ہو؟ کوئی مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ“، اُس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے زارون نے بے حد نرمی سے اُسے بولنے کے لیے اکسایا۔

”یہ شرط تھی آپ کی؟“ اُس کے ہاتھ ہٹاتے نور جو دل میں خوف کھائے بیٹھی تھی ایک دم سے  
شیرنی بنتے پوچھنے لگی۔

”ہاں یہی شرط تھی۔ بتاؤ اب کیا ہوا ہے؟ اور پلیز سچ بتانا“، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے زارون  
نے تاکید کی تو نور نے نظروں کے ساتھ ساتھ اپنا سر بھی جھکایا۔

”کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ اُس کی تھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اوپر کرتے زارون نے اُس  
کی خاموشی پہ اپنا سوال پھر سے دھرا یا تو نور نے زبان کا استعمال کرنے کی بجائے نفی میں سر ہلا دیا۔  
”کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بس پتا نہیں دو پھر سے میرا دل پر پیشان ہے“، اُس شخص کی بد تمیزی کو  
اہمیت نہ دیتے نور نے زارون کو اُس کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

”کیوں پر پیشان ہے دل؟ کچھ چاہیے، کسی چیز کی ضرورت ہے تو مجھے بتاؤ میں لے دوں گا“، زارون  
کو لگا کہ شاید اُسے کسی چیز کی ضرورت ہے تب ہی وہ اُس سے کہنے کی بجائے پر پیشان ہو رہی ہے۔

”نہیں، سب کچھ ہے میرے پاس بس...“

”کیا بس؟ کیا بات ہے نور؟ دیکھو اب ہم دوست ہیں اور تم مجھے اپنے دل کی ہربات بتا سکتی  
ہو“، اُس نے بات ادھوری چھوڑی تو زارون نے اُسے اپنے ہونے کو یقین دلایا۔

”بس ماما بابا نہیں ہیں۔ میرا ان سے ملنے کا بہت دل کرتا ہے پر شاید اب وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتے“، آنکھوں میں نمی لیے نور نے چہرے پر جبرا مسکراہٹ سجائی تو زارون نے ٹکٹکی باندھے اُس کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔

”زار کیا میں اتنی بری ہوں؟“ دوسری طرف خاموشی پر نور کے الفاظ اُس کے گلے میں پھنسے تو اُسے اپنی بات مکمل کرتے دشواری ہوئی۔

”نہیں میری جان تم بہت اچھی ہو۔ بہت پیاری بالکل معصوم“، اُس کے گال پر ہاتھ رکھتے زارون نے آنکھوں میں سچائی لیے اُسے یقین دلایا تو کسی اپنے کے ہونے کے احساس کے تحت نور نے اُس کے سینے پر سر رکھتے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔

”یار کیا ہو گیا ہے؟ پلیز چپ کر جاؤ۔ دیکھو میں پاس ہوں نا اور تمہارے ماما بابا نہ سہی پر میرے امی ابو تو ہیں نا؟ جن پر تم نے آتے ہی اپنا قبضہ جمالیا ہے“، اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے زارون نے ماحول پر چھائی ادا سی کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

”نور یار رونا بند کرو اور میری بات سنو“، اُسے سیدھا کر کہ بٹھاتے زارون نے اُس کے دو پڑے سے اُس کا چہرہ صاف کیا۔

”میں کل تمہیں تمہارے امی ابو سے ملوانے لے جاؤں گا پر ایک شرط پہ“، اُسے کسی صورت رونے سے بریک گلتا نہ دیکھ کر زارون نے لاچ دیتے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا شرط؟ مجھے آپ کی ہر شرط منظور ہے“، اُس کی بات سننے ہی نم آواز میں کہتے اُس نے جلدی اپنا چہرہ صاف کیا۔

”شرط یہ ہے کہ تم دوبارہ کبھی نہیں روکوگی۔ بے شک کچھ بھی ہو جائے پر میں تمہاری آنکھوں میں آنسونہ دیکھوں“، اُس کی خاموشی پر اپنا موقف بتاتے زارون نے جواب طلب نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے نہیں روتی بس پلیز آپ صحیح مجھے لے جائیے گا“، اپنی آنکھیں صاف کرتے نور نے اُس کی بات پر رضامندی ظاہر کی تو زارون نے دستک کی آواز پر اُسے منہ دھونے کا کہا اور خود اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھا جہاں عابدہ بیگم انہیں رات کے کھانے کے متعلق پوچھنے آئیں تھیں۔

-----

پورے آٹھ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے ظہیر صاحب کی طرف سے تسلی بخش خبر دی تو نائلہ بیگم کی جان میں جان آئی۔

”میں شکرانے کے نفل ادا کر کہ آتی ہوں۔ تم اپنے بابا کا خیال رکھنا“، ڈاکٹر کے منہ سے ظہیر صاحب کی طبیعت سنچلنے کا سنتے ہی نائلہ بیگم نے رضا سے کہا اور نرس سے پوچھتے دوسری جانب بنی نماز کی جگہ کی طرف بڑھ گئیں۔

”تم نے آپی کو کال نہیں کی؟“ نور کی غیر موجودگی پر ابراہیم نے اُس سے استفسار کیا جو خود بھی اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا۔

”نہیں“، نفی میں سر ہلاتے اُس نے مختصر ساجواب دیا۔

”کیوں؟ میرا خیال ہے کہ تمہیں انہیں بتانا چاہیے تھا“، ابراہیم جو اپنی امی کے منہ سے نور کے متعلق بہت کچھ سنبھلنے کے بعد بھی رضا کا ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا اُس نے اُس کے انکار پر مشورہ دیا۔

”ہاں بتا دوں گا پر ابھی بابا کی طبیعت بہتر ہو جائے“، اُس کی بات ٹالتے رضا نے اپنارخ ڈاکٹر کی جانب کیا جو اشارے سے اُسے اپنے پاس آنے کا کہتے نہیں کہ نرس کو کچھ ہدایت دینے لگا تھا۔

”آپ میں سے کوئی ایک بندہ پیشنش سے مل سکتا ہے پر خیال رکھیے گا کہ اُن کے پاس کسی قسم کا کوئی شور نہ ہو“، رضا کے قریب آتے ہی ڈاکٹر نے اُسے ہدایت دی اور کچھ دیر میں ظہیر صاحب کو کمرے میں شفت کرنے کا بتاتے نہیں کہ ویڈو کی دوسری جانب بڑھ گیا۔

”میں دیکھ کر آتا ہوں تم پلیز ماما کا خیال رکھنا“، ڈاکٹر کے جاتے ہی رضا نے ابراہیم سے کہا اور آئی سی یو کے اندر چلا گیا جہاں باہر سے ہی ظہیر صاحب کو مختلف مشینوں میں جکڑا دیکھ کر اس کے قدم تھمے۔

”بابا...“ ہمت کر کہ اندر کمرے میں قدم رکھتے اُس نے انہیں پکارنے کی کوشش کی پر زبان نے اُس کا ساتھ چھوڑ دیا۔

”بابا پلیز جلدی سے ٹھیک ہو جائیں“، آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو صاف کرتے رضا نے اُن کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

”ہم آپ کے بغیر کچھ نہیں ہیں۔ آپ ہی تو ہمارا سہارا ہیں“، اُن کی بند آنکھوں کو دیکھتے اُس نے بس الفاظ کو اپنی سوچ تک ہی مدد و درکھا اور مزید ہمت نہ ہونے کی باعث اپنا ہاتھ ہٹاتے جلدی سے باہر کی جانب بڑھا جہاں نائلہ بیگم اُس کی واپسی کے انتظار میں کھڑی تھیں۔

”کیا ہوا؟ سب خیریت ہے نا؟“ اُسے یوں روتے ہوئے باہر آتا دیکھ کر اُن کے پاؤں تلے زمین نکلی۔

”ج۔۔۔ ٹھیک ہے سب بس بابا کو دیکھ کر...“، بات کے دوران رکتے اُس نے ماں کے گلے نکلتے خود پہ قابو پانے کی کوشش کی۔

”رضایا پلیز خود کو سنبھالو۔ دیکھو آنٹی بھی پریشان ہو رہی ہیں“، اُسے یوں نامید دیکھ کر ابراہیم نے تسلی دی تو وہ نائلہ بیگم سے الگ ہوتے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگا۔

”ہم ٹھیک ہوں میں“، ان دونوں سے نظریں ملائے بغیر سر ہلاتے اُس نے اپنے آپ کو سنبھالتے نائلہ بیگم کو اندر جا کر ظہیر صاحب کو دیکھنے کا کہا تو وہ اُسے دلا سہ دیتے لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ گئیں۔

-----

”سو گئی تھیں کیا؟“، ارحم جو کب سے رابعہ کو ویڈیو کال کر رہا تھا اُس نے دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی سلام دعا کے بغیر ہی سوال کیا۔

”نہیں نچے تھی امی کے پاس“، کشن اٹھا کر اپنی گود میں رکھتے اُس نے اپنے لیٹ کال ریسیو کرنے کی وجہ بتائی۔

”اچھا بس امی کے پاس ہی رہنا، کبھی میرے پاس مت بیٹھنا“، اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ارحم نے اُس کی بات سنتے شکوہ کیا۔

”ہونہ بس کرو، آج سارا دن تمہارے ہی ساتھ تھی اور رہی بات پاس بیٹھنے کی تو اس کے لیے ہمارے پاس ابھی کوئی پکا سرٹیفیکٹ نہیں“، اپنا ہونٹ دانتوں تلے دباتے اُس نے نظرؤں میں شرارت لیے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟ سرٹیفیکٹ تو صبح ہی مل جائے گا، بس! تم بتاؤ تم تیار ہو؟“ اُس کی بات کا مفہوم سمجھتے ارحام نے دوسری جانب اُس کی رضامندی جاننے کے لیے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ ”ہم اب اتنی بھی جلدی نہیں پڑی مجھے جو صبح ہی نکاح کر لیں“، اپنی مسکراہٹ دباتے رابعہ نے نخرے سے نظریں پھیریں تو ارحام نے اُسے گھوری سے نوازا۔

”یار یہ تم لڑ کیاں اتنی عجیب کیوں ہوتی ہو؟ مطلب خود ہی بات کرتی اور خود ہی مکر بھی جاتی ہو“، اُس کے انکار پر بُرا مناتے ارحام نے منہ بسورا۔

”بس بس تم لڑکوں سے کم ہی عجیب ہو تیں ہم لڑ کیاں اور یہ تم نے کمرے کا کیا حال بنار کھا ہے؟“ پیچھے بیڈ پر بکھرے کپڑوں کو دیکھتے رابعہ نے ناک چڑھاتے اُسے شرم دلانی چاہی۔

”میرا کمرہ ہے میں جو مرضی کروں اور رہی بات حال کی توجان میرا کمرہ اگر بالکل صاف ہو تو مجھے خوف آنے لگ جاتا بس اسی لیے ساری چیزیں پھیلا کر رکھتا تاکہ زندگی میں انسانوں سے نہ سہی تو

چیزوں سے ہی بہار لگی رہے، اُس کی بات پر شرمندہ ہونے کی بجائے فخر سے بتاتے ارحمنے بیک کیسرہ کر کہ جان بوجھ کر اُسے اپنے سارے کمرے کی ویڈیو دکھائی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری یہ فلسفیانہ باتیں۔ تو بہ بہت گندے ہو تم“، صوفے پر بکھری کھانے کی چیزوں کو دیکھتے رابعہ نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے تو ارحمنے قہقهہ لگاتے اُس سے صحیح کی ٹیسٹ کی تیاری کے متعلق پوچھا جس کے لیے ہوٹل میں بھی ان دونوں نے جلدی گھر جانے کا شور مچا رکھا تھا۔

کچھ دیر بعد ظہیر صاحب کو ہوش آیا تو انہیں کمرے میں شفت کر دیا گیا پر میڈیسین کے زیر اثر ابھی تک وہ غنودگی میں تھے اسی لیے ڈاکٹر زنے رضا کو ان سے کوئی بھی بات کرنے سے منع کرتے ان کی جانب سے تسلی رکھنے کا کہا جن کی طبیعت اب کافی حد تک سنبل چکی تھی۔

”نور...“، ڈاکٹر کے جانے کے بعد رضانا نلمہ بیگم کو ان کی ہدایات کے متعلق بتا رہا تھا جب ظہیر صاحب کی آواز ان دونوں کی کانوں میں پڑی۔

”نو...رمیر...ی جا...ن“، بند آنکھوں سے اُسے پکارتے ظہیر صاحب نے نفی میں اپنا سر ہلا�ا تو نائلہ بیگم جلدی سے اُن کی جانب بڑھیں۔

”ظہیر کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟“ ان کا ہاتھ تھامتے نائلہ بیگم نے فکر مندی سے پوچھا تو آنکھیں کھولتے ظہیر صاحب نے حیرت سے اُن کی جانب دیکھا۔

”میں کہاں ہوں؟“ اُن کے چہرے سے نظریں ہٹاتے ایک سرسری سی نظر کمرے کو دیکھتے اُنہوں نے پریشانی سے سوال کیا۔

”ہم ہسپتال میں ہیں۔ وہ صحیح آپ کی طبیعت تھوڑی خراب ہو گئی تھی تو ہم لوگ آپ کو یہاں لے آئے“، اُن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے نائلہ بیگم نے نرمی سے اُنہیں بتایا جو پھر سے آنکھیں بند کر چکے تھے۔

”نو...ر کو بلاو“، اپنی بات مکمل کرتے آنسو نکل کر اُن کی داڑھی میں جذب ہوئے تو نائلہ بیگم نے حیران کن نظروں سے پہلے اُن کو اور پھر ساکت کھڑے رضا کو دیکھا جو بالکل بھی اُن کے منہ سے نور کو بلانے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

”میری جان کو بلاو، میری بیٹی اُس سے کہو کہ اُس کے بابلا رہے ہیں“، اپنی پھر سے اکھڑتی سانسوں کو لمبا سانس لے کر بحال کرنے کی کوشش کرتے ظہیر صاحب نے نائلہ بیگم سے التجاء کی تو ان کی طبیعت پھر سے خراب ہوتی دیکھ کر رضا جلدی سے باہر ڈاکٹر کو بلا نے کے لیے بھاگا۔

”ہاں میں بلا تی ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں وہ ابھی آجائے گی“، ان کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے نائلہ بیگم نے انہیں پر سکون کرنے کی کوشش کی پر دل میں بڑھتے ہوئے ملال نے ظہیر صاحب کو سانس لینے میں دشواری پیدا کی تو ڈاکٹر نے کمرے میں آتے ہی نرس کو جلدی سے آسیجن ماسک لگانے کا کہا۔

”آپ لوگ باہر جائیں پلیز“، نرس نے ماسک لگاتے نائلہ بیگم کو رو تاد دیکھ کہا تو رضا ان کو ساتھ لیے باہر آگیا جو ظہیر صاحب کی حالت دیکھ کر بالکل ما یوس ہو چکی تھیں۔

”میں زارون بھائی کو کال کرتا ہوں“، انہیں کرسی پر بٹھاتے رضا نے اپنا موبائل نکالتے انہیں خود کو سنبھالنے کا کہتے ہوئے دوسری جانب کال ملائی جو چند بیل جانے کے بعد رسیبو کر لی گئی۔

”زارون بھائی...“، سلام دعا کے بغیر ہی رضا نے لرزتی ہوئی آواز میں اُسے ظہیر صاحب کی طبیعت خرابی کا بتاتے نور کو ساتھ لیے ہسپتال کا آنے کا کہا۔

”میں بس دس منٹ میں پہنچتا ہوں“، رضا کی ساری بات سننے کے بعد اسے تسلی دیتے زارون نے اپنا والٹ اور گاڑی کی چابی اٹھاتے کمرے سے باہر کا رخ کیا تاکہ نور (جو کچن میں عابدہ بیگم کے ساتھ تھی) کو ساتھ لے کر ہسپتال جاسکے۔

---

”کہاں جا رہے ہیں ہم؟“ زارون نے اُسے باہر جا کر گاڑی میں بیٹھنے کا بولتے عابدہ بیگم کو ظہیر صاحب کی طبیعت خرابی کا بتایا اور باہر گاڑی میں آگر بیٹھا تو نور نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”ہسپتال جا رہے ہیں“، گاڑی گیٹ سے باہر نکالتے زارون نے اُس سے چھپانا مناسب نہیں سمجھا۔

”ہسپتال کیوں؟ کون ہے وہاں؟“ اُس کی جانب دیکھتے نور کی زبان کے ساتھ اُس کا دل بھی لرزا۔

”انکل ہیں۔ مطلب تمہارے بابا“، گاڑی کی سپیڈ تیز کرتے زارون نے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”بابا... بامیرے بابا؟ کیا ہوا بابا کو؟“ آنکھوں میں نہیں لیے اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

---

”کچھ نہیں تم پر یشان نہ ہو، بس تھوڑی طبیعت خراب تھی تو اس لیے ہسپتال لے جانا پڑا“، اُس کے چہرے پر ہوا بیاں اڑی دیکھ کر زارون نے تسلی دیتے اپنی توجہ ڈرائیور نگ کی جانب مرکوز کی۔

”مجھے پتا ہے، باباٹھیک نہیں ہیں۔ زار پلیز مجھے بتائیں کیا ہوا ہے؟“ اُس کا بازو پکڑتے نور نے اُس کا رخ اپنی جانب کیا۔

”نور ٹھیک ہیں وہ۔ پلیز تم پر یشان نہ ہو، اور ہم جا رہے ہیں ناتم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا“، اُس کے رخسار پہ ہاتھ رکھتے زارون نے اُسے مطمئن کرنے کی کوشش کی جو آج صبح سے ہی کسی انجان خطرے سے پر یشان تھی۔

کچھ منٹ میں ہی زارون نے گاڑی پارکنگ میں روکی تو نور نے جلدی سے باہر نکلنے کی کی۔

”کس طرف جانا ہے؟“ زارون کے نکلتے ہی نور نے اُسے سوالیہ نظر وں سے دیکھا۔

”اس طرف آؤ“، رش کی وجہ سے زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑتے اپنا رخ اندر کی جانب کیا اور کاؤنٹر سے کمرے کے بارے میں معلوم کرتے ہسپتال کے دائیں جانب بڑھے جہاں کچھ دور جاتے ہی انہیں رضا اور نائلہ بیگم کھڑے نظر آگئے۔ ”ماما کیا ہوا بابا کو؟“ ان کے قریب جاتے ہی نور نے

روتے ہوئے اُن سے پوچھا جو خود پر یثان حال کھڑی ظہیر صاحب کی تندرستی کی دعا کر رہی تھیں اُس کے گلے لگتے رونے لگیں۔

”آنٹی پلیز حوصلہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا اور کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر ز؟“ رضا کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر انہیں تسلی دیتے زارون نے سوال کیا تو اُن کے جواب دینے سے پہلے ہی ایک نرس کمرے سے باہر آئی۔

”آپ میں سے نور کون ہے؟“ باہر آتے اُن سب کے چہروں پہ سوال رقم دیکھ اُس نے سوال کیا۔  
”م۔۔ یہ ہوں“، دو قدم آگے بڑھتے اُس نے اپنی جانب اشارہ کیا۔

”آپ میرے ساتھ آئیں۔ پیش نٹ بار بار آپ کا نام لے رہے ہیں“، نرس نے وجہ کے ساتھ اُسے اندر آنے کا کہا تو نور نے اپنادل بڑا کرتے لرزتے ہوئے قدموں کے ساتھ اندر قدم رکھا جہاں ظہیر صاحب کو ایک بار پھر سے مشینوں میں جکڑ دیا گیا تھا۔

”بابا“، اُن کی حالت دیکھ نور کا دل ایک دم سے گھبرا یا تو اُس نے تڑپ کر اپنا رخ بیڈ کی جانب کیا۔ ”نو...ر؟“، اُس کی آواز سنتے آکسیجن ماسک کے اندر سے ہی اُس کا نام پکارتے ظہیر صاحب نے اُسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔

”با... با“، ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے بوس سے لگاتے آنسو بے قرار ہو کر اُس کی آنکھوں سے نکلے اور اُس کے الفاظ نے اُس کی زبان کا ساتھ چھوڑا۔

”بابا... کی جا... ن۔ اپنے... با... با کو معاف کر... دو“، کاپتے ہوئے ہاتھوں کو اُس کے سامنے جوڑنے کی کوشش کرتے ظہیر صاحب نے بمشکل اپنی بات مکمل کی تو نور نے جلدی سے ان کے ہاتھ تھامتے انہیں چوما۔

”پلیز... بابا ایسا نہ کریں۔ غلطی میری تھی اُس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا“، ان کے سینے پر سر رکھتے نور نے انہیں شرمندگی سے نکالتا تو ظہیر صاحب نے آہستگی سے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے اپنے دل کے سارے شکوئے دھوڈالے۔

”بس آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں۔ پھر میں آپ سے دل کھول کر لڑوں گی“، اپنے آنسو صاف کرتے اُس نے سر اٹھاتے اپنی ہی دھن میں بولتے ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔

”بابا؟ کیا ہوا؟ آپ بول کیوں نہیں رہے؟“ دوسری طرف خاموشی پر نور نے اُسے ہلاتے نر س کو دیکھا جو جلدی سے ڈاکٹر کو بلانے کے لیے باہر کی جانب بڑھی۔

”بابا کیا ہوا آپ کو؟“، پلیز میری طرف دیکھیں، ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھامے نور نے اپنی طرف کرتے امید بھری نظروں سے ان کے جواب کا انتظار کیا۔

”آپ پلیز پچھے ہو جائیں“، ڈاکٹر کے آتے ہی نرس نے نور کو سائیڈ پے کیا۔ ”نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مجھے اپنے بابا کے پاس رہنا ہے“، اُس کا ہاتھ جھٹکتے وہ واپس بیڈ کے قریب آئی جہاں ڈاکٹر ظہیر صاحب کے سینے پہ دباؤ ڈالتے ان کا سانس بحال کرنے کی کوشش میں لگے تھے۔ ”پلیز آپ باہر جائیں اور ہمیں اپنا کام کرنے دیں“، اُسے بازو سے پکڑ کر کمرے سے باہر لے جاتے نرس نے تھوڑا غصہ دکھایا۔

”زارون پلیز میرے بابا کو بچالیں۔ پلیز آپ انہیں بچالیں“، ظہیر صاحب کے ساکت وجود کو دیکھتے نور نے اُس کے آگے ہاتھ جوڑے التجاء کی۔ ”سب ٹھیک ہو جائے گا۔ دیکھو ڈاکٹرز کو شش کر رہے ہیں نا“، نرس نے ظہیر صاحب کی طبیعت سیر کیس ہونے کا بتاتے نور کو سنبھالنے کا کہا تو زارون نے اُسے تسلی دی جو بالکل ہمت ہار چکی تھی۔ ”کیا ہوا ہے بابا کو؟ وہ ٹھیک تھے نا؟“، دو مزید ڈاکٹرز کو کمرے میں جاتا دیکھ کر رضانے فکر مندی سے اس سے پوچھا جو آنے والے وقت کا سوچتے بالکل خاموش ہو چکی تھی۔

”نور کیا ہوا ہے؟“، اُس کی خاموشی پر نائلہ بیگم نے بھی آگے بڑھتے اُس سے پوچھا جو بس روئے ہوئے نفی میں سر ہلا گئی۔

”اما، پیز بابا کو بچالیں۔ ان کو کچھ ہواتو میں کبھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاؤں گی“، زارون کے سنبھالنے کے باوجود بھی اُس کے ہاتھوں سے نکتے وہ روتے ہوئے نیچے زمیں پہ بیٹھ چکی تھی۔

”سر کیا ہوا ہے؟ کیا مسئلہ ہے آپ لوگ بتا کیوں نہیں رہے؟“ ڈاکٹر کے باہر آتے ہی زارون نور کو چھوڑتے آگے بڑھا۔

”آئی ایم سوری، ہم نے اپنی پوری کوشش کی پر....“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ڈاکٹر نے جو خبر دی وہ زارون کے ساتھ ساتھ ان تینوں کے لیے بھی ناقابل یقین تھی۔

”ظہیر...“، اپنے منہ پہ دوپٹہ رکھتے نائلہ بیگم چیختے ہوئے اندر کی جانب دوڑیں تورضا بھی ان کے پیچھے ہی بے یقینی کی سی کیفیت میں آگے بڑھا۔

”میں نے اپنے بابا کو مار دیا۔ وہ میری وجہ سے مر گئے“، زمین پر بیٹھے ہی نور نے ڈاکٹر کی بات سننے سکتے کی سی کیفیت میں زیر لب اُس نے اپنے الفاظ کو بے ترتیب کرتے بار بار دوہرایا تو زارون نے آگے بڑھتے اُسے کھڑا کیا۔

”زار میں نے اپنے بابا کو مار دیا“، اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھتے اُس نے پاگلوں کی طرح مسکراتے اُسے بتایا۔

”نور پلیز خود کو سنبھالو“، اُس کا سر اپنے سینے سے لگاتے زارون نے دلا سہ دیا تو وہ اپنے اعصاب پہ قابو نہ رکھتے ہوئے بے ہوش ہو گئی۔

---

ظہیر صاحب کی موت کو پورا ہفتہ گزر چکا تھا اور ان دنوں میں زارون نے ایک سینکنڈ کے لیے نور کو اکیلا نہیں چھوڑا اور یہ اُس کی اتنی توجہ کا ہی نتیجہ تھا کہ اُس نے بہت جلد اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا۔ ”نور اٹھو سب عورتیں باہر بیٹھیں ہیں۔ تم بھی ان کے ساتھ جا کر بیٹھو“، رضا کے ساتھ باہر ختم کے تمام انتظامات دیکھنے کے بعد وہ اندر آیا تو نور ابھی بھی خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھی تھی۔ ”نہیں، میں یہی ٹھیک ہوں“، لوگوں کی فضول باتوں اور حقارت بھری نظرؤں سے بچنے کے لیے اُس نے باہر جانے سے انکار کیا۔

”کیوں نہیں جانا؟ اٹھو شاباش سب باہر بیٹھے قرآن پڑھ رہے ہیں تم بھی جاؤ اور پڑھو“، اُس کے انکار پر معقول سی وجہ بتاتے زارون نے اُسے اکسایا۔

”نہیں مجھے نہیں جانا“، اپنی ضد برقرار رکھتے اُس نے پھر سے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”کیوں نہیں جانا؟ کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ بیدی پہ اُس کے سامنے بیٹھتے زارون نے استفسار کیا تو نور نے پلکیں اٹھاتے اُسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟ بتاؤ مجھے جو بھی بات ہے؟“ اُس کے رخسار پہ ہاتھ رکھتے زارون نے اُسے نرمی سے سہلا�ا۔

”خالہ کہتی ہیں کہ.... بابا میری بد کاری کی وجہ سے اس دنیا سے گئے ہیں اور پھوپھو بھی“، آنکھوں میں دکھ لیے اُس نے زارون کو اپنی خالہ اور پھوپھو کی باتوں کے متعلق بتایا جو اُس کی نیبلہ خالہ کی زبانی پورے خاندان میں مشہور ہو چکی تھیں۔

”زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس دینا یا لینا انسان کے اختیار میں نہیں اس لیے لوگوں کی باتوں پر غور کر کہ تم صرف اپنے آپ کو تکلیف دو گی اور لوگ تو تمہیں کمزور کرنا چاہتے کہ تم بے بس ہو کر ان کے آگے اپنے کردار کی صفائی دو انہیں یقین دلاؤ کے تم بے قصور ہو۔ مگر تمہیں کمزور نہیں ہونا۔ اپنے لیے نہیں اپنے بابا کے لیے جو آخری وقت میں تمہاری پاکیزگی کا یقین کرتے تمہیں معاف کر چکے تھے“، نرمی سے اُس کے گال سہلاتے زارون نے اُسے سمجھا یا جو بناء پلک جھپکے اُسے سُن رہی تھی۔

”میں لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ کو نہیں پتا خالہ کیسی کیسی باتیں کرتیں ہیں اور انہوں نے اپنے ساتھ پھوپھو کو بھی ملا لیا ہے“، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے نور نے نظریں جھکائیں۔

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے وہ ساری دنیا کو بھی اپنے ساتھ ملا لیں تو میں تمہارے ساتھ ہوں اور جب تک میں ہوں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بس اپنے اندر تھوڑی مضبوطی پیدا کرو“، اُس کا ہاتھ دباتے زارون نے اپنے لبوں سے لگایا تو نور نے جلدی سے اُسے پیچھے کیا۔

”میں جاتی ہوں باہر“، اُس کے لمس میں گھبرا تے اُس نے اپنی بات مکمل کی اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کمرے سے باہر نکلتے لاڈنچ کی جانب بڑھی جہاں تمام عورتیں قرآن خانی میں مصروف تھیں۔

”کیا کر رہے ہو تم سب؟ پورے دس دن؟ پورے دس دن ہو گئے ہیں پر تم لوگوں سے ایک لڑکی نہیں ڈھونڈی گئی“، شکور کے ساتھ باقی ملازموں کی بھی کلاس لیتے مراد شاہ نے پورے جلال کے ساتھ ان پہ برسنے آنکھیں نکالیں۔

”سامیں، ہم اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں پر....“ سر جھکائے شکور نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”پر؟ کیا پر؟“ اُس کا گریبان کپڑ کر جھنجھوڑتے مراد شاہ کی نظروں کے ساتھ ساتھ اُس کے ہاتھوں میں بھی سختی آگئی۔

”سامیں، بس کچھ دن کی مہلت دے دیں“، ایک نظر اُس کے غصیلے تیوروں کو دیکھتے شکور نے دبے ہوئے لہجے میں التجاء کی۔

”ٹھیک ہے۔ بس دو دن ہیں تم لوگوں کے پاس، اگر ان دونوں میں بھی تم لوگوں سے کچھ نہ ہوا تو میں تم سب کو یہاں زندہ گاڑھ دوں گا“، اُس کا گریبان چھوڑتے مراد شاہ نے انگلی اٹھا کر ان سب کو تنبیہ کی۔

”ٹھیک ہے سامیں، جیسے آپ کا حکم“، اپنے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اُس کے سامنے جھکتے شکور نے تابعداری کی مظاہرہ کیا تو باقی سب نے بھی اُس کی تائید کی۔

”ٹھیک ہے۔ دفع ہو جاؤ اب میری نظروں سے دور“، اُس کی بات سنتے ہی مراد شاہ نے اپنے غصہ کو ضبط کرتے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

”کیا ہوا ہمارے برخوردار کو اتنا غصہ کیوں کر رہے ہو؟“ حیدر شاہ جو ابھی ابھی ڈیرے سے آئے تھے انہوں نے لاڈنچ سے باہر آتی مراد شاہ کی آواز پر پریشان ہوتے اندر کا رخ کیا جہاں تمام ملازم اُن کو دیکھتے احترام سے نظریں جھکا کر سلام کرنے لگے۔

”بابا سائیں آپ کب آئے؟“ ان کی آواز پر نارمل ہوتے مراد شاہ نے جلدی سے قدم اُن کی جانب بڑھائے۔

”بس ابھی آیا ہوں“، ملازموں کو جانے کا اشارہ کرتے انہوں نے جا چلتی نظروں سے مراد شاہ کے چہرے کو دیکھا جو اُن سے کوئی بات چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اچھا سائیں آپ بیٹھیں“، اُن کا جواب سنتے اُس نے وہاں لگے صوفوں کی جانب اشارہ کیا تو حیدر شاہ نے مسکراتے ہوئے سر ہلا کیا اور قدم آگے بڑھاتے اُسے بھی اپنے سامنے بیٹھنے کا کہا۔

”کیا ہوا ہے؟ کافی دنوں سے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ پر پریشان سے ہو؟“ اُس کے بیٹھتے ہی حیدر شاہ نے باغور اُس کی آنکھوں میں دیکھتے پوچھا۔

”نهیں بابا سائیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ وہ بس ایکشن کی وجہ سے کام کافی زیادہ ہوتا اس لیے تھوڑی تھکا وٹ ہو جاتی ہے“، اُس لڑکی کی بات کو گول کرتے مراد شاہ نے چہرے پہ مسکراہٹ سجاتے انہیں مطمئن کیا۔

”ہم تو پھر وہ لڑکی کون ہے جس کے لیے تم ابھی کچھ دیر پہلے تمام ملازموں پہ غصہ کر رہے تھے؟“ حیدر شاہ جو صغيرے کی زبانی مراد شاہ کے آج کل کیے جانے والے کام کے متعلق جان چکے تھے انہوں نے مراد شاہ کے جھوٹ بولنے پر خود ہی استفسار کیا۔

”لڑکی... وہ تو بس ایسے ہی“، اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے سرجھاتے مراد شاہ نے انہیں ٹالنے کی کوشش کی۔

”اچھا بھئی ٹھیک ہے۔ ایسے ہے یا ویسے بس تھوڑا خیال رکھنا اور شکور کو بھی سمجھادینا کہ اکرم کی طرح کوئی بیوقوفی مت کرے“، اپنی موچھوں کو تاؤ دیتے حیدر شاہ نے دبے لفظوں میں اُسے خبردار کیا۔

”جی میں سمجھادوں گا اور کیا بنا اکرم کا؟ آپ کب تک اُسے واپس بلائیں گے؟“ ان کی بات سنتے ہی مراد شاہ نے اکرم کے بارے میں پوچھا جو ان کے کہنے پر پچھلے ایک مہینے سے روپوش تھا۔

”ہاں بس کچھ دنوں میں آجائے گا اور شکر ہے کہ یہ معاملہ خود ہی رفع دفع ہوانہ تو اس بارے میں کسی نے پولیس میں رپورٹ لکھوائی اور نہ ہی کوئی تحقیق کی گئی جس کی وجہ سے اکرم کے ساتھ ساتھ ہماری بھی بچت ہو گئی“، اُس کی بات کا جواب دیتے حیدر شاہ نے بات ہاشم تک نہ پہنچنے پر شکر ادا کیا۔

”جی مجھے حیرت ہے کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے دب کیسے گیا؟ مطلب یہ بات معمولی تو نہیں تھی؟ جو اتنی آسانی سے ہاشم صاحب فراموش کر دیتے“، ان کی بات کمل ہوتے ہی مراد شاہ نے پر سوچ اندازہ میں ان کی جانب دیکھا۔

”ہاں مجھے بھی یہی لگ رہا کہ اپنی بھوپہ ہونے والے اٹیک کو وہ اتنی آسانی سے نہیں بھولے گا اور ہو سکتا ہے اُس نے ہماری مخبری کے لیے اپنے بندے بھی ہمارے پیچھے لگا رکھے ہوں۔ اس لیے بس کچھ دن تھوڑی احتیاط سے کام لے لو بس ایک بار یہ ایکشن ختم ہو جائیں پھر تو بہت سے بد لے چکانے باقی ہیں“، نظروں میں حقارت لیے حیدر شاہ نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پیوست کیا تو مراد شاہ نے اثبات میں سر ہلاتے جلد ہی ہاشم صاحب سے سب بد لے لینے کا قیں دلا یا جواب ایکشن میں ان کے مخالفین کا ساتھ دے رہے تھے۔

”سلمہ یہ ظہیر صاحب کی بیٹی ہے نا؟“ نور آکر خاموشی سے سب کے درمیان بیٹھتے سپارہ پڑھنے لگی تو پاس بیٹھی ایک خاتون کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی جو اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی سے اپنی بات کی تصدیق کر رہی تھیں۔

”جی وہی منحوس ہے۔ توبہ توبہ اللہ معاف کرے ایسی بد کار اولاد سے جوماں باپ کو جیتنے جی مار ڈالے“، سرگوشی میں کہتے اس لڑکی نے کانوں کو ہاتھ لگائے تو نور نے اُس کی بات سننے (جو کچھ ہی فاصلہ ہونے کی وجہ سے با آسانی اُسے سنائی دی تھی) خود پہ ضبط کرتے نظریں جھکائیں۔

”شکل سے تو بڑی معصوم لگ رہی ہے“، اُس کے چہرے کی جانب دیکھتے اُس عورت نے پھر سے اظہار خیال کیا۔

”بس کریں خالہ آج کل یہ معصوم نظر آنے والی لڑکیاں ہی ماں باپ کامنہ کالا کر تیں ہیں اس لیے ان کی شکل کی بجائے کرتو تو پہ غور کریں“، نظریں نور کے چہرے پر مرکوز کیے اُس سلمہ نامی لڑکی نے ایک بار پھر سے اُس عورت کے کان میں گھستے سرگوشی کے انداز میں اپنی بات مکمل کی تو نور نے آنکھیں کھولتے اُن دونوں کی جانب دیکھا جو فوراً ہی خاموش ہوتے ہاتھ میں پکڑا سپارہ پڑھنے لگیں تھیں۔

”نور بیٹا جاؤ میرے لیے پانی لاو“، عابدہ بیگم جو اُس کے ساتھ ہی بیٹھیں خود ہی اُن عورتوں کی فضول گوئی سُن چکی تھیں انہوں نے نور کا دھیان ہٹانے کے لیے اُسے مخاطب کیا۔

”جی ماما...“، سپارہ اُن کے ہاتھ میں پکڑاتے وہ جو پہلے ہی وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی موقع ملنے ہی جلدی سے اٹھ کر لاو نج سے باہر نکل گئی۔

”کیا ہوا؟ اب کیوں باہر آئی ہو؟“، زارون جو اس کے جاتے ہی تھوڑا مطمئن ہوتے کپڑے وغیرہ تبدیل کر کہ باہر نکلا تھا نور کو واپس آتے دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”کچھ نہیں، وہ ما ما کے لیے پانی لینے آئی تھی،“، آنسوؤں کو ضبط کرنے کے باوجود بھی وہ بے اختیار ہو کر اس کی آنکھوں سے نکلے تو نور نے جلدی سے اپنا سر جھکایا۔

”کسی نے کچھ کہا ہے؟“، اس کے دونوں شانوں پہ ہاتھ رکھتے زارون نے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”نہ۔۔۔ ہیں۔۔۔ تو۔۔۔“

”پھر رو کیوں رہی ہو؟“، اپنی پوروں میں آنسو جذب کرتے اس نے سوالیہ نظر وں سے اُسے دیکھا۔

”پاگل ہو گئی ہوں میں“، اس کے دونوں ہاتھ جھکلتے نور نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا اور روتے ہوئے کمرے کی جانب بڑھتے دروازہ اندر سے لاک کر لیا۔

”نور یا رکیا بد تمیزی ہے یہ؟“، دروازے پہ ہاتھ مارتے زارون نے ناب گھومتے اُسے آواز دی۔

”زار پلیز آپ جائیں۔ بس مجھے اکیلا چھوڑ دیں“، دروازے کے ساتھ ہی نیچے زمین پر بیٹھتے اس نے گھٹی ہوئی آواز میں التجاء کی تو زارون نے رضا کی پکار پر اُس کے حال پہ چھوڑتے باہر کارخ کیا جہاں قاری صاحب دعا کے لیے آچکے تھے۔

”آپ یہ نور آپی کی خالہ اتنی عجیب باتیں کیوں کر رہیں تھیں؟“ حدیہ سپارہ پڑھ کر فارغ ہوئی تو اُس نے رابعہ کے ساتھ ہی لاونج سے نکلتے سوال کیا۔

”دماغ خراب ہوتا ہے ایسے لوگوں گاتب ہی نہ تو کسی کی تکلیف کی پرواکرتے ہیں اور نہ ہی موقع کی بس جو منہ میں آتا ہے بولتے چلے جاتے ہیں“، رابعہ جسے نیبلہ خالہ کی باتیں سُن کر پہلے ہی کافی غصہ تھا اُس نے حدیہ کی بات سنتے ہی بھڑکتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں یہ تو ہے۔ انہیں تو انٹی کا بھی احساس نہیں تھا۔ کیسے لوگوں کو بڑھ چڑھ کر نور آپی کے بارے میں غلط اور فضول قسم کی باتیں بتا رہیں تھیں؟“، نائلہ بیگم کا چہرہ حدیہ کے سامنے اُبھرا تو اُس نے افسوس سے ایسے لوگوں کی سوچ پر دکھ کا اظہار کیا۔

”اچھا بس پلیز اب تم نور کے سامنے ایسی کوئی بات نہ کرنا وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے“، اُس کے کمرے کی جانب بڑھتے رابعہ نے اُسے تاکید کی تو حدیہ نے اُس کی بات سمجھتے اثبات میں سر ہلا کیا۔ ”کون ہے؟“، اچھی طرح رو لینے کے بعد دل کا بوجھ کچھ ہلاکا ہوا تو اُس نے دروازے پر دستک کی آواز پر زارون کا خیال آتے اُسے کھولا۔

”رابعہ...“ سامنے رابعہ اور حدیہ کو دیکھ کر اُس نے دو پٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے اُنہیں اندر آنے کا راستہ دیا۔

”یار کیا ہو گیا ہے؟ پلیز خود کو سنبھالو اُس کے سستے ہوئے چہرے کو دیکھ کر رابعہ فوراً ہی سمجھ چکی تھی کہ وہ کمرے میں خود کو بند کیے رونے میں مصروف تھی۔

”ہاں ٹھیک ہوں میں“، حدیہ کی وجہ سے اپنے دل کی بات دل میں ہی چھپاتے نور نے اُنہیں بیٹھنے کا بولا۔

”نہیں، ہم تو بس جا رہے تھے دراصل اُمی کی طبیعت پھر رات سے خراب ہے۔ یہاں آنا ضروری تھا اس لیے کچھ دیر کے لیے اسد کو اُمی کے پاس رکنے کا بول کر آئے تھے“، اُسے اپنی مجبوری بتاتے رابعہ نے کل پھر آنے کا کہتے اُس سے اجازت طلب کی۔

”ہاں ٹھیک ہے بس تم آنٹی کا خیال رکھنا اور میری طرف سے اُن کی طبیعت کا پوچھنا“، اُس کی مشکل سمجھتے نور نے دل چاہنے کے باوجود بھی اُسے مجبور نہ کیا اور کل چکر لگانے کی تاکید کرتے اُنہوں خود باہر گیٹ تک چھوڑنے کے لیے آئی۔

"تم بھی اپنا خیال رکھنا اور آنٹی کا بھی" ، اُس سے گلے ملتے رابعہ نے ایک بار پھر سے کہا تو نور نے اثبات میں سر ہلاتے حدیہ کو اللہ حافظ کہا جو اُس کے مر جھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بس خاموشی اختیار کیے باہر کی جانب بڑھی۔

سب مہمانوں کے جاتے ہی عابدہ بیگم، نائلہ بیگم سے اجازت طلب کرتے باہر آئیں تو رضانے زارون کو وہیں رکنے کا کہا۔

"زارون بھائی آپ پلیز آج یہی رک جائیں" ، اُس کا ہاتھ پکڑتے رضا نے اصرار کیا تو زارون نے اثبات میں سر ہلا�ا۔

"امی آپ لوگ چلے جائیں میں کل صحیح آجائوں گا" ، عابدہ بیگم کے قریب آتے ہی زارون نے ان سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے، رک جاؤ پر پلیز نور کا خیال رکھنا مجھے اُس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی" ، اُس کی بات سنتے عابدہ بیگم نے تاکید کی اور رضا کے کندھے پر تھکنی دیتے باہر کی جانب بڑھیں جہاں احمد صاحب گاڑی میں بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے۔

"زارون نے نہیں جانا؟" ، نہیں اکیلے ہی گاڑی کی جانب بڑھتے دیکھ کر احمد صاحب نے سوال کیا۔

”نہیں وہ رضانے اُسے روک لیا ہے“، اُن کی بات کا جواب دیتے عابدہ بیگم نے دروازہ بند کیا تو  
احمد صاحب نے گاڑی سٹارٹ کی۔

”بہت ٹائم لگا دیا آج تو تم نے“، رات کی تاریکی کو دیکھتے احمد صاحب نے موڑ کا ٹٹے عابدہ بیگم سے  
کہا جو کسی سوچ میں گم تھیں۔

”ہاں وہ بس نائلہ کچھ پریشان تھی اسی لیے اُس کے پاس بیٹھی اُسے سمجھاتی رہی“، اپنی سوچوں  
سے نکل کر عابدہ بیگم نے گھری سانس لیتے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کی۔

”پریشان کیوں تھیں؟ مطلب کوئی گھر یا مسئلہ ہے تو مجھے بتاؤ میں حل کر دوں گا“، احمد صاحب کو  
لگا کہ شاید ظہیر صاحب کے جانے کی وجہ سے انہیں گھر چلانے میں مشکل ہو رہی ہے تب ہی  
انہوں نے پریشانی کا سنتے عابدہ بیگم سے استفسار کیا جو نائلہ بیگم کی سادہ اور پر خلوص طبیعت کی وجہ  
سے چند ہی دنوں میں کافی حد تک اُن سے منوس ہو چکی تھیں۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں بس وہ لوگوں کی باتوں کی وجہ سے پریشان تھیں۔ لوگ بھی کون وہ جو  
اُن کے اپنے ہیں۔ جن کے سہارے کی اس وقت نائلہ کو اشد ضرورت ہے اور وہی اُٹھ کر اُن پہ اور  
نور پہ فضول قسم کے الزامات لگا رہے ہیں“۔

”کون لوگ اور کیسے الزمات؟“ اپنادھیان سامنے سڑک پہ مرکوز کرتے احمد صاحب نے ان کی بات کاٹتے پوچھا۔

”نور کی خالہ اور اُس کی پھوپھو۔ پہلے تو ظہیر صاحب کے جنازے والے دن ان دونوں نے مل کر کافی واویلا کیا تھا سب عورتوں کو چیخ چیخ کے بتا، ہی تھیں کہ بیٹی کی بد کاری باپ کو لے ڈوبی اور اب اُس دن کے بعد سے ان دونوں نے ایک بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا جب نور کو اس بات کا احساس نہ دلایا ہو کہ ظہیر صاحب کی موت اُس کی وجہ سے ہوئی۔ تو بہ ان کی باتیں سن کر تو میرا دماغ خراب ہو رہا تھا تو نائلہ تو پھر ماں ہے ایک پہلے ہی شوہر کے جانے کا غم اوپر سے یہ باتیں“، احمد صاحب کی خاموشی پر تمام باتیں تفصیل سے بتاتے عابدہ بیگم نے نیبلہ بیگم کی سوچ پر دکھ کا اظہار کیا جو اپنی بہن کے دکھ میں شریک ہونے کی بجائے اُسے مزید بڑھا رہی تھیں۔

”تمم اللہ پاک بس ایسے لوگوں کو ہدایت دے۔ پتا نہیں کیا حاصل ہوتا ہے ان لوگوں کو یوں کسی کو دل آزاری کر کے“، عابدہ بیگم کی بات سنتے ہی احمد صاحب کو بھی بُرا لگاتا ہے اُنہوں نے بھی اپنے غصے کا اظہار کرتے ان سے نور کے بارے میں پوچھا جو آج ان کی وہاں موجودگی کے باوجود بھی ان سے نہیں ملی تھی۔

رضا کے ساتھ مل کر سارا کام وغیرہ ختم کروا کے تقریباً ایک بجے کے قریب وہ کمرے میں آیا تو نور گھٹنوں پہ سر رکھے بیٹھی ابھی تک جاگ رہی تھی۔

”تم سوئی نہیں؟“ دروازہ بند کرتے وہ اُس کے قریب آیا تو نور نے اُس کی آواز پہ سر اٹھاتے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔

”آپ ابھی تک یہی ہیں؟“ کلاک پر ٹائم دیکھتے وہ جو کافی دیر سے اپنے کمرے میں ہی موجود تھی اُس نے زارون کو دیکھ کر فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں کیوں؟ تمہیں اچھا نہیں لگا کیا میرا یہاں رکنا؟“ اُس کے چہرے پر پریشانی دیکھ کر زارون نے استفسار کیا۔

”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں،“ سید ہے ہو کر بیٹھتے اُس نے جلدی سے لنگی میں سر ہلاتے اُس کی بات کی تردید کی جواب اُس کے ساتھ خالی جگہ پہ لیٹ کر اپنے ہاتھوں سے اپنی پریشانی کو مسلنے لگا۔

”سر میں درد ہے؟“ اُس کے یوں سرد بانے پر نور نے قریب ہوتے پوچھنے کے ساتھ ہی اُس کا ہاتھ ہٹاتے اُس کی پریشانی پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

”ہاں بس تھوڑا سا“، اُس کے دبانے پر آنکھیں بند کرتے زارون نے اپنے اندر آتتے سکون کو محسوس کیا۔

”کھانا کھایا آپ نے؟“ ملکے ہاتھوں سے اُس کی پیشانی کو دباتے نور نے سوال کیا۔

”ہاں شام کو کھایا تھا رضا کے ساتھ اور تم نے کچھ کھایا؟“ اُس کا ہاتھ ہٹا کر اپنے ہاتھ میں پکڑتے زارون نے جواب دیتے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔ ”بھوک نہیں تھی مجھے“، اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالتے نور نے پھر سے اُس کی پیشانی پر رکھا تو زارون نے اٹھ کر بیٹھتے کوئی بھی جواب دینے کی بجائے باہر کا رخ کیا۔

”کہاں جا رہے ہیں اب؟“ اُسے دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ کر نور نے پکارا پروہ خاموشی سے دروازہ کھولتے باہر نکلا اور چند منٹ بعد ہاتھ میں کھانے کی ٹرے اور پانی لیے اندر داخل ہوا۔

”زار مجھے سچ میں بھوک نہیں ہے“، ٹرے بیڈ پر رکھتے زارون نے نوالہ بنائے کر اُس کے منہ کے قریب کیا تو نور نے اُسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

”بھوک نہیں بھی ہے تب بھی تھوڑا سا کھالو“، اُس کے نہ نہ کرنے باوجود بھی نوالہ زبردستی اُس کے منہ میں ڈالتے زارون نے خود ہی اپنے ہاتھ سے اُسے کھانا کھایا جو چند نواں کھانے کے بعد ہاتھ کھڑے کر چکی تھی۔

”بس اب نہیں کھایا جا رہا مجھ سے“، گلاس اٹھا کر پانی پیتے اُس نے انکار کیا تو زارون نے ہاتھ میں کپڑا نوالہ اپنے منہ میں ڈالتے اُس کا گلاس میں چھوڑا پانی پیا اور ٹرے اٹھا کر ٹیبل پر رکھ دی۔

”بس اب سوجاؤ سکون سے“، لائٹ آف کر کہ واپس بیڈ پر آکر لیٹتے اُس نے نور کو بھی اپنے ساتھ لٹایا تو وہ خاموشی سے تکیہ پر سر رکھ کے لیٹ گئی۔

”زار...؟“، ابھی اُسے آنکھیں بند کیے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ نور نے اُسے آواز دی۔

”ہم..“، سارے دن کی تھکاوٹ کی وجہ سے زارون جس کا سر اب درد سے پھٹ رہا تھا، اُس نے نور کی پکار پر آنکھیں کھولتے اُسے دیکھا۔

”میں آپ کے کندھے پر سر رکھ لوں؟ وہ مجھے ڈر لگ رہا ہے“، اندھیرے سے خوف کھاتے اُس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو زارون نے اُس کی جانب کروٹ لیتے اپنا بازو سیدھا کیا۔

”آجاو...“، اجازت کے ساتھ ہی اُس نے اُسے اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا تو نور نے چند انچ کا فاصلہ سمیٹتے اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھا۔

”طبعیت ٹھیک ہے تمہاری؟“، اُسے اپنے حصار میں لیتے زارون نے پوچھا تو نور نے سر ہلاتے اپنا چہرہ اُس کے سینے میں چھپایا جو چند ہی دنوں میں ایک عام انسان سے اُس کی زندگی کا سب سے خاص شخص بن چکا تھا۔

”زار سوری میں نے دوپھر میں آپ سے بد تیزی کی“، اپنے رویے کا یاد آتے ہی اُس نے معدرت کی تو اُس کے اس نئے روپ کو دیکھتے زارون کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”خیر ہے، میری جان یہ کون سا پہلی بار ہوا ہے“، اُس کی پیشانی پر بوسہ دیتے زارون نے اپنی بات ادھوری چھوڑی تو اُس کے لمس پہ نور نے مضبوطی سے اُس کی شرٹ کو اپنی مٹھی میں دبوچتے اُسے گھورا۔

”زار پلیز بد تیزی نہ کریں“، لرزتے ہوئی زبان سے اُسے بازرہنے کا کہتے نور نے خفگی سے دور ہونا چاہا۔

”اچھا اچھا، سوری اب نہیں کرتا بس اب سو جاؤ“، اُس کا سر واپس اپنے سینے پہ رکھتے زارون نے سردی کی وجہ سے کمفرٹ راچھے سے اُس کے اوپر دیا تو نور نے اُس کی حرکت کے بعد مزید کوئی بات کرنے کی بجائے خاموشی سے اپنی آنکھیں بند کرتے سونے کی کوشش کی۔

-----

سائرہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے عالیہ نے ملازم کے کہنے پہ کھانے کی ٹرے تیار کرتے مراد شاہ کے کمرے کا رخ کیا جوا بھی ابھی اپنے دوستوں کے ساتھ ایک کوٹھے سے واپس آیا تھا۔

”تم کون ہو؟ وریہ سائرہ کہاں ہے؟“ سائرہ کی بجائے کسی اور لڑکی کو ٹرے ہاتھ میں کپڑے اپنے کمرے کی باہر کھڑا دیکھ کر مراد شاہ نے اُس انجان اور نو خیز چہرے پر تعجب کا اظہار کیا جو آج سے پہلے اُس نے کبھی حولی میں نہیں دیکھا تھا۔

”جی سائیں وہ میں سائرہ کی چھوٹی بہن ہوں۔ سائرہ کی طبیعت خراب تھی اسی لیے آج میں آگئی،“ اُس کے اشارہ کرنے پر ٹرے ٹیبل پر رکھتے عالیہ نے اپنے گھبراۓ ہوئے لبھ پر قابو پاتے جواب دیا۔

”سائرہ کی بہن؟“ دروازہ بند کر کہ اُس کے قریب آتے مراد شاہ نے سرتاپوں اُس کا جائزہ لیا۔

”پر تجھے تو میں نے پہلے کبھی یہاں نہیں دیکھا،“ پر سوچ انداز میں کہتے اُس نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا جس کا گلابی چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتا نو خیز سراپا، اُسے آج کی رات حسین بنانے کے لیے اُس کو ٹھٹھے کی لڑکی سے کہیں زیادہ بہتر لگا۔

”جی سائیں وہ میں پڑھتی ہوں نا اس لیے کبھی کبھار ہی یہاں آتی،“ اُس کی بات کا جواب دیتے عالیہ نے اُس کی غلیظ نظر وہ کو خود پہ محسوس کرتے اپنی چادر کو مزید اپنے گرد لیپیٹا۔

”ہم کیا پڑھتی ہو؟“ اپنے اور اُس کے درمیاں حائلِ دو قدم کا فاصلہ طے کرتے مراد شاہ نے اُس کے چہرے کو چھوٹا چاہا تو عالیہ نے کھانے میں زہر ملانے کی تدابیر اپنے اوپر ہی الٹی پڑتی دیکھ کر جلدی سے پیچھے کی جانب قدم بڑھائے۔

”سامنے مجھے گھر جانا ہے۔ اماں پر پیشان ہو رہی ہوں گی“، مراد شاہ نے نظر وہیں پر اُس کی ساری دلیری ہوا ہوئی تو اُس نے جلدی سے بہانہ بناتے وہاں سے نکلا چاہا۔

”تو کوئی بات نہیں۔ اماں کو آج رات انتظار کر لینے دے۔ ویسے بھی میں مفت میں کچھ نہیں کرتا اس لیے بے فکر رہو“، اپنی جیب سے ہزار ہزار کے چند نوٹ نکال کر اُس کے ہاتھ پر رکھتے مراد شاہ نے اُس کی چادر کا پلو کھینچا تو عالیہ نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔

”نه میری جان“، مراد شاہ کے جذبات کو جگا کر اب توجہاگ نہیں سکتی“، اُس کا بازو پکڑ کر اپنے سامنے کرتے اُس نے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھ میں دبوچا۔ ”سامیں خدا کے لیے مجھے جانے دیں“، اپنی عزت کو خطرے میں دیکھ کر عالیہ نے ہاتھ جوڑے اور اُس وقت کو کو ساجب اُس نے مراد شاہ کو سبق سکھانے کے چکر میں سائرہ کی تمام باتوں اور نصیحتوں کو فراموش کرتے اُس نے وقت اُس کے کمرے میں آنے کی حماقت کی۔

”بکواس بند کرو اپنی اور خبردار اگر تمہاری آواز اب اس کمرے سے باہر گئی تو“، اُسے بیڈ پر دھکا دیتے مراد شاہ نے اُس کی چلتی ہوئی زبان کو ایک تھپڑ مارتے بند کیا۔

”سامنے خدا کے لیے مجھے جانے دیں۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں“، مراد شاہ کی تنہیہ کے باوجود بھی عالیہ نے اوپری آواز میں چلاتے ہوئے کہا تو اُس نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے اُسے خاموش کروایا۔

”میں نے کہانا کہ اپنی زبان بند رکھو تو تمہیں اثر نہیں ہوتا کیا“، اُس کے ہاتھ پاؤں چلانے پر مراد شاہ نے اُسی کی چادر اٹھا کر اُس کے منہ پہ باندھی اور اُس کی مزاحمت کرنے کا اثر لیے بغیر ہی وہ اُس کے اوپر جھکا۔

”عالیہ..؟ سامنے دروازہ کھولیں“، سائرہ جو اتنا وقت ہو جانے پر بخار کے باوجود بھی حولی اُسے دیکھنے آئی تھی ملازم کے منہ سے اُس کی مراد شاہ کے کمرے میں موجودگی کا سنتے ہی اوپر آتے زور سے دروازہ بجانے لگی۔

”کون خبیث ہے؟“ سائرہ کی مداخلت پر بد مزہ ہوتے مراد شاہ نے حیدر شاہ کے اٹھنے کے ڈر سے اُسے چھوڑتے دروازہ کھولا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ پورا دروازہ کھولنے کی بجائے اُس نے صرف سر باہر نکالتے اُس سے پوچھا جو چہرے پر فکر لیے کھڑی تھی۔

”سامیں وہ...“

”آپ پلیز مجھے بچالیں...“، سائرہ کی آواز پر عالیہ نے جلدی سے منہ سے چادر نکالتے اُسے پکارا جو ابھی اُسی کے بارے میں پوچھنے والی تھی۔

”عالیہ..“ اُس کی پکار پر سائرہ نے اندر جانے کی کوشش کی تو مراد شاہ نے اُسے دھکا دیتے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”چپ کر کہ یہاں سے چلی جاؤ ورنہ میں تمہاری بہن کو اپنی ہوس پوری کرنے کے بعد چھوڑنے کی بجائے اُس کا بھی وہی حال کروں گا جو فاطمہ کا کیا تھا“، انگلی ہونٹوں پر رکھ کر اُسے خاموشی اختیار کرنے کا کہتے مراد شاہ نے اندر کا رخ کیا تو سائرہ نے ڈرنے کی بجائے بے خوف ہوتے پھر سے اُس کی جانب قدم بڑھائے۔

”سامیں میری بہن کو چھوڑ دیں ورنہ اچھا نہیں ہو گا“، انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے سائرہ نے جان کی پرواکیے بناء بہن کے لیے آواز اٹھائی تو مراد شاہ نے اُس کی دلیری پر قہقہہ لگایا۔

”ہاہاہا، بس بہت ہو گیا“، اُس کا بازو پکڑتے اپنے جبڑوں کو بھنچتے اُس نے عالیہ کو پیچھے کی جانب دھکا دیا جواب اٹھ کر اُسے دروازے سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تمہارا بندوبست تو میں بعد میں کرتا ہوں“، دروازہ بند کر کہ باہر نکلتے مراد شاہ نے سائرہ کے منه پہ ہاتھ رکھا جو چلا چلا کر سب کو وہاں بلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اب میں تجھے بتاتا ہوں کہ مراد شاہ کے آگے زبان کھولنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے“، دروازہ لاک کرتے اُس نے ویسے ہی سائرہ کے منه پہ ہاتھ رکھتے سڑھیاں اُترتے باہر کا رخ کیا جہاں چوکیدار بیٹھا اونگھرہاتھا۔

-----

”کچھ دیر کے لیے اسے سنبھالو اور اگر اس کی آواز باساں میں کے کانوں میں پڑی تو میں تمہاری آواز ہمیشہ کے لیے بند کر دوں گا“، سائرہ کو چوکیدار کی جانب پھینکتے مراد شاہ نے اُسے تنبیہ کی جو اُسے دیکھتے ہی جلدی سے کھڑرا ہو گیا تھا۔

”جی سائیں، آپ بے فکر ہو کر جائیں“، سائرہ کو اپنی گرفت میں لیتے خان نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھا جو بار بار چخ رہی تھی۔

”خان بابا خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ میری بہن کی عزت خطرے میں ہے“، مراد شاہ کے اندر بڑھتے ہی خان نے سائرہ کے منہ سے ہاتھ ہٹایا تو اُس نے چوکیدار کے قدموں میں گرتے مدد کی فریاد کی۔

”میں نے تمہیں جانے دیا تو مراد سائیں مجھے مارنے میں ایک سکنڈ نہیں لگائے گا اس لیے اب جو ہو رہا ہے اُسے ہونے دو“، اُسے اندر کی جانب بھاگتا دیکھ خان نے پھر سے دبوچا اور اپنے ساتھ لی کواٹر کی جانب بڑھاتا کہ وہاں لے جا کر کچھ دیر کے لیے اُس کی زبان بند کروساکے جو بار بار اُسے واسطے دیتے اپنی بہن کو بچانے کی التجاء کر رہی تھی۔

”میں نے کہانا کہ چپ ہو جاؤ تو خدا کے لیے اپنی زبان بند کرو“، کوارٹر میں لاتے ہی اُس چار پائی پہ دھکا دیتے خان نے اب کی بار تھوڑا غصہ دکھایا تو سائرہ کی آواز بند ہوئی۔

”خان بابا آپ کو آپ کے بچوں کا واسطہ میری بہن کو اُس درندے کی درندگی کی نظر ہونے سے بچا لیں“، سائرہ جو کافی وقت سے حولی میں کام کر رہی تھی اُس نے چوکیدار کے آگے پھر سے فریاد کی جو نیا ہونے کی وجہ سے اُس سے کوئی بھی لحاظ کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔

”ہاہاہ ماڑا ہمارا کوئی بیوی بچہ نہیں اس لیے ایسی فضول قسم کی باتیں کر کہ ہمارا دماغ خراب مت کرو اور چپ کر یہاں بیٹھ جاؤ رونہ مراد سائیں کی اجازت کے بغیر ہی میں تمہارا حشر بگاڑ دوں گا“، اُسے اپنے قدموں میں بیٹھا دیکھ کر خان نے اُسے ٹھوکر مارتے پیچھے کیا اور کسی چیز کے گرنے کی آواز پہ اُسے وہیں چھوڑے جلدی سے باہر نکالا۔

”یہ کیا گرا ہے؟“ خان کے باہر جاتے ہی سائرہ بھی موقع ملتے باہر نکلی تو دوسرے ملازمین بھی وہاں اکٹھے ہوتے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا ہے؟ یہ کس چیز کا شور ہے؟“ شور کی آواز پر حیدر شاہ کی آنکھ کھلی تو وہ اپنی چادر لیے باہر آئے جہاں ملازمین پہلے ہی لان کا جائزہ لیتے معاملے کو جانبھے کی کوشش میں لگے تھے۔

”عالیہ...“ سائرہ جو سب کی نظروں سے نجح کر بیرونی حصے سے ہو کر مراد شاہ کے کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی اُس نے ایک دم چیختے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ منہ پہ رکھے۔

”عالیہ آنکھیں کھولو“، دور تک جاتی لکیر کی صورت میں بہتے خون کو دیکھتے جہاں سائرہ کے حواس کام کرنا چھوڑے وہیں اُس کی آواز پر ملازمین کے ساتھ ساتھ حیدر شاہ نے بھی وہاں کارخ کیا۔

”عالیہ میری جان میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گی“، اپنا دوپٹہ جلدی سے اُس کے سر کے نیچے رکھتے سائرہ نے خود کلامی کرتے سامنے سے آتے مراد شاہ کو نفرت سے دیکھا جس کے کمرے میں

پہنچتے ہی عالیہ نے موت کو ذلت بھری زندگی پر ترجیح دیتے دوسرا منزل پر موجود بالکوئی سے نیچے چھلانگ لگادی تھی۔

”کیا ہوا؟ اور سائرہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ ان کے قریب پہنچتے ہی آنکھ سے خان کو چپ رہنے کا اشارہ کرتے مراد شاہ نے ایسے انجان بنتے پوچھا جیسے اس معاملے سے اُس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

”پتا نہیں، یہ سائرہ کی بہن ہے اس نے کہیں اوپر سے چھلانگ لگائی ہے شاید“، حیدر شاہ نے اُس کے پوچھنے پر بتایا تو فسوں سے سر ہلاتے مراد شاہ نے سیلمان کو اُسے چیک کرنے کا کہا۔ ”دیکھ زرازندہ ہے یا مرکھ پ گئی“، سائرہ کی نظروں کی پرواکیے بناء اُس نے حکم دیا تو سیلمان نے آگے بڑھتے عالیہ کی نبض کو دیکھا جو بہت آہستہ رفتار میں چل رہی تھی۔

”سائیں ابھی زندہ ہے“، ہاتھ چھوڑتے اُس نے بتایا تو حیدر شاہ نے اپنے خاص ملازم کو روکتے باقی سب ملازمین کو جانے کا کہا۔

”رات کا اندر ہیرا ختم ہونے سے پہلے کہیں باہر آبادی میں لے جا کر دفن کراؤ اسے“، آہستہ آواز میں کہتے حیدر شاہ نے مراد شاہ کو بھی اندر جانے کا کہا جو اپنی موچھوں کو تاؤ دیتے سائرہ کو روٹے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

”پرسائیں یہ تو بھی زندہ ہے“، ان کی بات سنتے ملازم نے سلیمان کی بات دھرائی۔

”جیسا کہا ہے ویسا کرو“، اُس کے اعتراض پر آنکھیں دکھاتے حیدر شاہ نے غصے سے دھاڑتے ہوئے حکم دیا تو اُس ملازم نے جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے سائرہ کو پیچھے کیا جو بہن کو اس حالت میں دیکھ کر اب اوپر آواز میں مراد شاہ کو بد دعائیں دے رہی تھی۔

”کہاں لے کہ جا رہے ہو تم میری بہن کو؟“ چلاتے ہوئے اُس نے اُس ملازم کو پیچھے کی جانب دھکا دیتے عالیہ کو اٹھانے سے روکا تو حیدر شاہ نے غصے سے سائرہ کا بازو پکڑتے اُسے اپنے ساتھ حوالی کے اندر گھسیٹا جو بار بار اپنی بہن کے زندہ ہونے کا کہتے حیدر شاہ سے اُسے بچانے کی فریاد کر رہی تھی۔

-----

صحیح زارون کی آنکھ کھلی تو نور ابھی تک اُس کے سینے پر سر رکھے سکون سے سورہی تھی۔ ”افف اتنا طامُم ہو گیا ہے“، احتیاط سے ہاتھ بڑھا کر موبائل اٹھاتے زارون نے اُس پہ گیارہ بجتے دیکھ کر خود کلامی کی اور نور کو آواز دیتے جگانے لگا جو ہلاکاسا سمکا کر دوبارہ سوچکی تھی۔

”نور اٹھ جاؤ گیا رہ نج گئے ہیں“، اُس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے زارون نے اُسے پھر سے آواز دی۔

”زار کیا ہے آپ کو؟“، اُسے ٹس سے مس نہ ہوتا دیکھ کر زارون نے آنکھوں میں شرارت لیے اُسے سیدھا کرتے اُس کے گال کو اپنے ہونٹوں سے چھوایا تو نور نے فٹ سے آنکھیں کھولتے ایک ناراض نظر اُس پہ ڈالی اور اُس کے حصار کو توڑتے دوسرا طرف کروٹ لے کر لیٹ گئی۔

”اچھا نا سوری، اب نہیں کرتا“، اُسے والپس اپنی طرف کروٹ دلاتے زارون نے معذرت کی تو نور نے خفگی سے اُسے گھورا جو پھر سے اُس کے دوسرا رخسار پر ہونٹ رکھ چکا تھا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ“، شرم سے سرخ ہوتے نور نے اُسے پیچھے کی جانب دھکیلا اور اُس کی مزید کسی بد تنیزی سے پہلے اپنا دوپٹہ اٹھاتے بیڈ سے اٹھی۔

”اچھا نا ب منہ مت بناؤ، ویسے بھی ہم بچوں کو بھی پیار سے جگاتے ہوئے کس کر دیتے نا؟ بس میں نے بھی اسی لیے کی“، اُس کا مود خراب دیکھ کر زارون نے جلدی سے اٹھ کر اُس کے سامنے آتے وضاحت دی۔

”میں پچی ہوں؟“، اپنی جانب اشارہ کرتے نور نے تصدیق چاہی۔

”تو کیا نہیں ہو میرے لیے تم چھوٹے سے بے بی کی ہی طرح ہو، جو یا تو ہر وقت کھاتا رہتا ہے یا پھر چھوٹی چھوٹی باتوں کو دل پہ لیتے رو رو کر اپنی آنکھوں کا براحال کر لیتا ہے“، نظر وہ میں اپنا سیت لیے زارون نے اُس کے بالوں کو کان کے پیچھے کیا تو نور نے اُس کے اس قدر پیار پر بے ہوش ہوتے ہوتے پچی۔

”زار آپ کی طبیعت صحیح ہے نا؟ مطلب کہیں بخار تو نہیں؟“ اُس کی پیشانی پر ہاتھ لگاتے نور نے فکر مندی سے پوچھا تو زارون نے اُس کے بے تکے سوال پر بھنویں اچکائیں۔

”ہونہ سے میرا پیار سے بات کرنا اگر تمہیں طبیعت خرابی لگتا ہے تو دوبارہ میں ایسے بات نہیں کروں گا“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے زارون نے بُرا مناتے کھاتا تو نور کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”بس ایسے ہی غصے میں رہا کریں۔ زیادہ پیارے لگتے ہیں“، کچھ دیر کے لیے ہی سہی لوگوں کی تمام باتوں کو فراموش کرتے نور نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُس کے کان کے قریب جھکتے سر گوشی کی تو زارون نے اُسے آنکھیں دکھاتے کپڑنا چاہا جو اُسے موقع دیے بغیر ہی واش روم میں گھس گئی۔

”بہت بد تمیز ہوتم“، دروازے پر ہاتھ مارتے زارون نے اُس یاد دہانی کروائی اور باہر بیٹھتے اُس کا انتظار کرنے لگتا کہ خود بھی فریش ہو کر باہر جاسکے۔

”بابا سائیں آپ نے مجھے بلا یا تھا؟“، اجازت ملنے پر ان کے کمرے میں داخل ہوتے مراد شاہ نے ان سے نظریں ملائے بغیر پوچھا۔

”ہاں بیٹھو“، موبائل رکھ کر صوفے کی جانب اشارہ کرتے حیدر شاہ نے اُسے بیٹھنے کا کہا۔  
”جی بولیں؟“، رات والی بات کی وجہ سے دل میں چور لیے مراد شاہ نے حتی الامکان اپنے لمحے کو ہموار کھا۔

”رات جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا“، اُس کی توقع کے عین مطابق حیدر شاہ نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”جی...“، اظہار افسوس کی بجائے مختصر سا جواب دیتے اُس نے نظریں اٹھا کر اپنے باپ کو دیکھا جو کامل طور پر اُسی کی جانب متوجہ تھے۔

”مجھے لگا تھا کہ تم فاطمہ والے واقعے کے بعد میری بات پر عمل کرو گے اور دوبارہ حویلی میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں دھراوے گے“، ماتھے پہ بل لیے وہ بیڈ سے اٹھ کر کھڑکی کی جانب بڑھے۔

”بابا سائیں میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جیسا آپ سوچ رہے ہیں،“ ان کی بات سنتے ہی مراد شاہ نے اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہا پر اُس سے پہلے ہی حیدر شاہ نے ہاتھ اٹھاتے اُسے روکا۔

”تم نے کیا بھی ہوتا تو مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بس مجھے اعتراض حویلی میں ایسی حرکت کرنے پڑے ہے۔ تم جانتے ہو ناپہلے فاطمہ والے معاملے کو میں نے کتنی مشکل سے تمام ملازم میں کی زبانیں بند کروائے معاملہ رفع کیا تھا اور اب یہ نئی مصیبت تم نے میرے گلے ڈال دی ہے،“ غصے سے لال ہوتے حیدر شاہ نے اُسے کھری کھری سنائی جو بس پچ تاب کھاتے خاموشی سے بیٹھا تھا۔

”حویلی کے ارد گرد بہت سے معزز لوگ آباد ہیں۔ جو ہمیں بہت اچھے اور باکردار انسان کی حیثیت سے جانتے ہیں اور یہاں کے ملازم میں بھی ہمارے بہت سے چہروں سے ناواقف ہیں اس لیے دوبارہ جو بھی کرنا ہو، کسی بھی لڑکی کی خواہش ہو اسے ڈیرے لے جانا کیونکہ اگر وہاں تم کسی کو مار بھی دو تو ہمارے بندے سارا معاملہ سنبھال لیتے ہیں،“ ہاتھ پشت پر باندھتے انہوں نے مراد شاہ کو خبردار کرتے معاملے کی نزاکت سمجھانے کی کوشش کی۔

”جی ٹھیک ہے۔ دوبارہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں ملے گا،“ ان کے خاموش ہوتے ہی مراد شاہ نے ان کے قریب آتے معدرات کی۔

”ہم ٹھیک ہے۔ میں نے سائرہ کو نیچے تہہ خانے میں بند کر دیا تھا تاکہ وہ ہمارے بارے میں کوئی بھی بات گاؤں میں نہ پھیلانے اور تمام ملازموں کو بھی سمجھادیا ہے بس اب تم بھی تھوڑی احتیاط کرنا“، اپنے غصے پہ قابو پاتے حیدر شاہ نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہدایت کی۔

”جی میں دوبارہ خیال رکھوں گا“، دل میں ناگواری کے باوجود بھی چہرے پہ مسکراہٹ سجائتے مراد شاہ نے انہیں تسلی دی جو اُس کی طرف سے مطمئن ہوتے اُسے آج ایک سیاسی پارٹی سے ملاقات کا بتانے لگے۔

-----

آن چار ماہ دس دن بعد نائلہ بیگم کی عدت ختم ہوئی تو عابدہ بیگم نے نور کو گھر واپس چلنے کا کہا جو ظہیر صاحب کی وفات کے بعد سے وہیں موجود تھی۔

”ہاں بیٹا اب تم اپنے گھر جاؤ۔ بہت وقت ہو گیا ہے تمہیں یہاں رہتے ہوئے“، عابدہ بیگم کی بات سننے نائلہ بیگم نے بھی اُن کی بات کی تائید کی۔

”جی میں اپنی چیزیں وغیرہ رکھ لوں“، اُن کی بات پر اثبات میں سر ہلاتے نور نے اپنارخ کمرے کے جانب کیا تاکہ اپنی تمام ضروری چیزیں رکھ سکے۔

”زارون کی طبیعت کیسی ہے؟ کافی دن ہو گئے اُس نے چکر نہیں لگایا“، نور کے جاتے ہی نائلہ بیگم نے اُس کے متعلق پوچھا جو پچھلے دو ہفتوں نے اُن کی طرف نہیں آیا تھا۔

”جی بس اُس کے پیپر زہور ہے تھے اس لیے کافی مصروف ہے آج کل“، اُن کو زارون کی مصروفیات کا بتاتے عابدہ بیگم نے رضا کے کندھے پر تھیکی دی جوا بھی ابھی کانج سے واپس آیا تھا۔

”اچھا اللہ پاک اُسے ہر امتحان میں کامیاب کرے۔ ماشاء اللہ بہت اچھا اور نیک بچہ ہے“، اُن کی بات سننے نائلہ بیگم نے دعا دی اور جنید لوگوں کے بارے میں پوچھنے لگیں جن کا کچھ دنوں تک پاکستان آنے کا پروگرام تھا۔

”جی جی، اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو سب آر ہے ہیں۔ پہلے تو جنید اور مزمول کا، ہی آنے کا پروگرام تھا اب ماہم بھی ساتھ آر ہی ہے“، اپنی بیٹی کا ذکر کرتے عابدہ بیگم نے خوش دلی سے انہیں بتایا۔

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ سب ایک بار ہی اکٹھے ہو جائیں گے اور آپ کے گھر میں بھی رونق لگ جائے گی“، اُن کے چہرے کی چمک دیکھ کر نائلہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا تو عابدہ بیگم کی سر ہلاتے اُن کی بات کی تصدیق کی۔

”جی بس ایسا ہی ہے۔ پورے دو سال بعد اپنے بچوں کی صورت دیکھوں گی“، لمبی سانس لیتے عابدہ بیگم کی آنکھوں میں نمی آئی۔

”یہ پر دلیں بھی بہت بُری جگہ ہے۔ ماں سے اُس کے بچے اور ان کی خوشیاں سب کچھ چھین لیتا ہے پھر بھی ماں کا دل دیکھیں کہ اپنے بچوں کی خوشی کے لیے سب کچھ داؤپہ لگادیتی ہے۔ ایک سینکڑ بھی مشکل لگتا ہے ماں کو اپنے بچوں کے بغیر رہنا اور یہ پر دلیں پسیوں کا لاچ دیکھ کر سالوں کی دوریاں ڈال دیتا ہے“، آنکھوں کے نم کناروں کو صاف کرتے عابدہ بیگم نے اپناد کھبیان کیا تو نائلہ بیگم نے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے دلاسہ دیا۔

”بہت یاد آتی ہے مجھے ان سب کی پر پھر کچھ دیر آنسو بہا کر خود کو ان کے پاس ہونے کی تسلی دے لیتی ہوں۔ دل تڑپتا ہے بے چین ہوتا ہے کہ اپنے چاروں بیٹوں کو اپنے سامنے ایک چھت تلے دیکھوں، ان کی اولاد کے لاڈاٹھاؤں مگر...“، لرزتی ہوئی زبان نے لفظوں کا گلا گھونٹا تو عابدہ بیگم نے خاموش ہوتے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

کیوں رورہی ہیں آپ یہ تو خوشی کا موقع ہے اور فکر نہ کریں ان شاء اللہ آپ کے چاروں بیٹے کچھ دنوں میں ہی آپ کے ساتھ ہوں گے“، ان ہاتھ دباتے نائلہ بیگم نے انہیں تسلی دی تو خود کو سنبھالتے انہوں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”سوری میں نے آپ کو بھی پریشان کر دیا“، آنکھیں صاف کرتے عابدہ بیگم نے ان کی آنکھوں میں بھی نبی دیکھ کر معذرت کی۔

”ایسی بات کر کے مجھے شرمندہ نہ کریں اور میرے مشکل وقت میں جتنا آپ لوگوں نے میرا ساتھ دیا کوئی اور ہوتا کب سے بے زار ہو چکا ہوتا“، نور کو آواز دیتے چائے بنانے کا کہتے نائلہ بیگم نے بھی احسان مندی ظاہر کی تو عابدہ بیگم نے انہیں اپنا سیت دکھاتے ایسا کہنے سے روکا اور جنید اور مزمول کے بچوں کے بارے میں بتانے لگیں جنہیں انہوں نے پہلی بار دیکھنا تھا۔

---

”توبہ بہت زیادہ مشکل پیپر تھا آج“، کلاس سے نکلتے ہی ارحم نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”مشکل؟ کون سا سوال تم نے خود کیا جو پیپر مشکل لگا تھیں؟“، اُس کے پچھے آتے زارون نے اُس کی کلاس لی جو آج نقل کرنے کے چکر میں اُس کا پیپر بھی کینسل کروانے والا تھا۔

”سارے سوال خود ہی لکھیں ہیں وہ الگ بات کہ تمہارے پیپر سے دیکھ کے لکھے اور رہی بات مشکل کی توجان چیننگ کرنا کون سا سماں کام ہے۔ توبہ گردن میں بل پڑ گیا“، اپنی گردن کو چاروں طرف گھوما کر سیدھا کرتے ارحم نے بغیر کسی شرمندگی کہ زارون کو اپنے مسائل سے آگاہ کیا جو اُس کی ہٹ دھرمی پر گھری سانس لیتے آگے بڑھا۔

”اب کہاں جا رہے ہو؟“ اُس کے پچھے آتے ارحمنے اُسے روکا جو سر رزاق سے اپنی بے عزتی ہونے پر اب تک ناراض تھا۔

”کہیں بھی جاؤں تمہیں کیا اور پلیز مجھ سے دور رہو۔ آج جتنی تم نے میری پوری کلاس کے سامنے عزت افزائی کروائی نا بہت ہے“، اُس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے اُس نے تیز قدم اٹھاتے ڈپارٹمنٹ سے باہر کارخ کیا تو ارحمنے ایسی دوستی پر لعنت بھیجتے (جو مصیبت کے وقت کام نہ آئے) پھر سے اپنی گردن کو چاروں طرف گھماتے پر سکون کرنے کی کوشش کی جو پچھے بیٹھے زارون کے پیپر سے نقل لگاتے بار بار پلٹ کر دیکھنے کے چکر میں اکڑ چکی تھی۔

ایکشن بھر پور طریقے سے جیتنے کی خوشی میں آج رات حیدر شاہ نے ایک بڑے پیمانے پر پارٹی رکھی تھی اور مراد شاہ جو پچھلے کچھ مہینوں سے اپنی تمام سر گرمیوں کو ترک کیے ان کی سیاسی مہم کو چلانے میں مصروف نور کے متعلق بالکل بھول چکا تھا اُس نے فراغت ملتے ہی یاد آنے پر شکور سے اُس کے بارے میں پوچھا۔

”کیا بنا اس لڑکی کا؟“ ڈیرے پہنچتے ہی اُس نے شکور کو اپنے کمرے میں بلا تے استفسار کیا۔

”جی سائیں وہ لڑکی مل گئی ہے بس آپ کی مصروفیات کی وجہ سے میں خبر آپ تک نہیں پہنچا سکا“، سر جھکاتے شکور نے اُسے خوش خبری سنائی تو مراد شاہ نے بے یقینی سے اُس کی جانب دیکھا۔ ”مل گئی ہے تو ابھی تک وہ میرے سامنے کیوں نہیں آئی؟ کیا سوچ رہے ہو تم پچھلے پانچ منیوں سے؟“، دانت پسیتے اُس نے ایک دم، ہی اٹھتے اُس کا گریبان پکڑا۔

”سائیں وہ مجھے بڑے سائیں نے منع کیا تھا“، اُس سے نظریں چراتے شکور نے سچ بولا تو مراد شاہ نے حیدر شاہ کا نام سنتے ہی اپنا غصہ ضبط کیا جو اپنے ایکشن کی وجہ سے اُس کی ہر حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

”اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ اور وہ لڑکی کل تک ہر حال میں میرے کمرے میں موجود ہو“، اُس کا گریبان چھوڑتے مراد شاہ نے اُسے حکم دیتے جانے کا اشارہ کیا تو اپنی جان بخششی پر شکر مناتے شکور نے جلدی سے باہر کارخ کیا۔

”یہ بابا سائیں کا دماغ بھی کافی خراب ہو چکا ہے“، شکور کے جاتے ہی مراد شاہ نے سگریٹ جلاتے حیدر شاہ کی لگائی پابندیوں سے تنگ آتے خود کلامی کی۔

”علاج کرتا ہوں میں اُن کا بھی جلد ہی بس پہلے وہ لڑکی ہاتھ آجائے“، سگریٹ کالمباش لے کر ناک سے دھواں نکالتے اُس نے راکھ نیچے زمین پر پھینکتے اپنی آنکھیں سکریٹ تے باہر دیکھا جہاں حیدر شاہ کی کار آر کی تھی۔

---

یونیورسٹی سے واپسی پر وہ کچھ دیر احمد صاحب (جو کسی کام کے سلسلے میں لاہور گئے تھے) کے کہنے کے مطابق اُن کے آفس گیا جہاں ایک دو ضروری میٹنگ اٹینڈ کرنے کے بعد تقریباً شام چھ بجے کے قریب وہ گھر لوٹا تو اُس کا سب سے پہلا سامنا نسرین سے ہوا جس نے اُسے عابدہ بیگم کا احسان صاحب کی طرف جانے کا بتاتے کھانے کے متعلق پوچھا۔

”نہیں مجھے بھوک نہیں اور آپ بھی جائیں گھر کافی ٹائم ہو گیا ہے“، کلاک پر نظر پڑتے ہی اُس نے نسرین سے کہا جسے یقیناً عابدہ بیگم اُس کے کھانے کی فکر میں گھر چھوڑ کر گئی تھیں۔

”جی صاحب“، اثبات میں سر ہلاتے اُس نے زارون کو سلام کیا اور بیرونی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔

---

”اُفف آج تو بہت تھک گیا“، سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی جانب آتے اُس نے خود کلامی کرتے دروازہ کھولا تو سامنے بیڈ پر نظر پڑتے ہی ایک دم سے چونکا۔ ”یہ کب واپس آئی؟“، زارون جو نور کے واپس آنے سے ناواقف تھا اچانک سے اُسے اپنی نظروں کے سامنے دیکھ کر حیران ہوتے اُس کے قریب آیا جو سکون سے نیند پوری کرنے میں مصروف تھی۔

”ہوننہ، پورے چار مہینے دس دن بعد گھر آئی ہے اور پھر بھی شوہر کا انتظار کیے بناء، ہی سو گئی“، اپنا بیگ صوفے پر رکھتے اُس نے بیڈ پر اُس کے قریب بیٹھتے زیر لب شکوہ کیا اور خاموشی سے اُس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہو“، اپنا جھکاؤ تھوڑا اُس کے اوپر کرتے زارون نے اُس کے دونوں اطراف بیڈ پر اپنے ہاتھ رکھتے تعریف کی اور پھر سے خاموش نظروں سے اُس کے ہر ایک نقش کو با غور دیکھنے لگا۔

”زار آپ کب آئے؟“، خود پر کسی کی نظروں کی تیش محسوس کرتے نور نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اپنے چہرے کے بالکل قریب اُس کا چہرہ دیکھ کے ایک پل کے لیے گڑ بڑا گئی۔

”ابھی آیا ہوں“، اپنی نظروں میں کوئی بھی حرکت لائے بغیر زارون نے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”کیا ہوا؟ ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟“ اُس سے نظریں چراتے نور نے اپنا ہاتھ اُس کے سینے پر رکھتے اُس کی شرط کے بُٹن پر پھیرا۔

”دیکھ رہا ہوں کہ چڑیل پہلے سے زیادہ پیاری ہو گئی ہے یا بس مجھے ہی لگ رہی ہے“، اُس کے شرمانے پر مسکراتے زارون نے آنکھوں میں شرارت لیے کہا تو نور نے پلکیں اٹھاتے اُسے گھورا۔ ”نه بولیں مجھ سے“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے منہ پھلا�ا۔

”کیوں؟ اب کیا کیا ہے میں نے؟ بال اُس کے کندھے سے ہٹاتے زارون نے اُس کی ناراضگی پر بھنوں اچکاتے اپنا قصور پوچھا۔

”آپ نے مجھے چڑیل کہا اور مجھے پتا ہے چڑیل میں پیاری نہیں ہو تیں اسی لیے آپ مجھے ان سے تشییہ دے رہے تاکہ میں اپنی بے عزتی محسوس ہی نہ کروں“، اُس کا ہاتھ جھٹکتے نور نے عقلمندی سے جواب دیا تو زارون نے خاموش نظروں سے اپنی ذہین بیوی کو دیکھا جو اُس کی تعریف کا ستیاناس کر چکی تھی۔

”تمہیں پتا ہے؟“ اُس کے رخسار پر ہاتھ رکھتے زارون نے اپنی پیشانی اُس کی پیشانی ساتھ لگاتے بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا؟“ پوری آنھیں کھول کر نور نے اُس کے چہرے کو دیکھا جو آہستگی سے اوپر ہوتے اُس کی پیشانی کو اپنے ہونٹوں سے چھوچکا تھا۔

”یہی کہ تم جیسا انوکھا اور بے مثال سیمپل بس ایک ہی دنیا میں آیا ہے جو بد قسمتی سے میرے نصیب میں لکھ دیا گیا“، دونوں ہاتھوں سے اُس کے گال کھینچتے زارون نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہتے ایک آہ بھری تو نور نے اُس کے لمس کے سحر سے نکلتے اُس کی بات سمجھنے کی کوشش کی۔

”بھاڑ میں جائیں آپ اور دوبارہ میرے قریب نہ آئیے گا“، غصے سے اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سینے پہ رکھتے نور نے اُسے پیچھے ہٹایا جو اُس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کے قہقہہ لگاتے ہنسا۔ ”اچھا ناسوری، سچ میں، میں مذاق کر رہا تھا“، اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُٹھنے سے روکتے زارون نے معذرت کی تو نور نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے اپنا ہاتھ چھڑوا�ا اور اُس کی مزید کوئی بات سنے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

”توبہ ہے آتے ہی لڑائی شروع کر دی“، اُس کے جاتے ہی زارون نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور اُٹھ کر الماری سے کپڑے نکالتے واش روم میں گھس گیا۔

-----

”یہ دو سال بعد جنید اور مزمل کو پتا نہیں کیا دروازہ پڑا ہے کہ ایک دم ہی پاکستان جانے کا پروگرام بنا لیا“، حنانے شاپنگ سے تھک ہار کر کیفے ٹیریا کی جانب بڑھتے ہما سے کہا جو اس کی چھوٹی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دیواری بھی تھی۔

”جی آپ میں بھی یہی سوچ رہی تھی“، شاپنگ بیگ ساتھ رکھی چیز پر رکھتے ہمانے بھی اس کی بات کی تائید کی۔

”پتا نہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوچ بھی ان دونوں بھائیوں کو کہ اپنے ساتھ ساتھ بہن کو بھی تیار کر لیا۔ تو بہ میرا تو اتنے لوگوں کا ایک ساتھ ہونے کا سوچ کے ہی دل گھبرا رہا ہے“، ہما کو اپنی سائیڈ لینڈ لینڈ کیکھ کر حنانے بے زاری سے کہتے ویٹر کو دو جو سلانے کا کہا۔

”ویسے آپ آپ کو کیا لگتا ہے یہ سب ویسے ہی جا رہے ہیں یا وہاں جانے کا کوئی خاص مقصد ہے؟ مطلب معاذ کی شادی وغیرہ کا تو کوئی ارادہ نہیں؟“، ہمانے جا چختی ہوئی نظر وہ سے بڑی بہن کو دیکھتے ایک اہم نقطہ کی جانب متوجہ کروا یا۔

”نهیں مجھے نہیں لگتا ایسی کوئی بات ہے کیونکہ ایسا کوئی پلان ہوتا تواب تک جنید مجھے بتاچکے ہوتے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان ماں بیٹوں کے درمیان کیا کھچڑی پکر رہی ہے آج کل، ویسے

ہمارے سرالی ہیں بہت تیز، آنکھیں مٹکاتے ہنانے اپنی بات ادھوری چھوڑتے جو س کا ایک سب لیا۔

”وہ کیسے؟“ اُس کی بات پر نظروں میں بے چینی لیے ہمانے استفسار کیا تو ہنانے گلاس نیچ رکھتے ایک افسوس بھری نظر اُس پہ ڈالی جو ہمیشہ سے ہی ایسے معاملوں میں نادان تھی۔

”زارون کی شادی کر دی۔ بہو کو گھر لے آئے اور سب کچھ کرنے کرانے کے بعد ہمیں اطلاع دی گئی۔ یہ سب تیزی نہیں تو اور کیا ہے؟ پہلے تو بڑے بیٹے کو چھوڑ کر چھوٹے کی شادی کر دی وہ بھی کسی کو بتائے بغیر، اوپر سے یہ بہانہ کہ جی لڑکی کے ابو کی طبیعت خراب تھی اس لیے ایک دم سے نکاح کرنا پڑا۔ میں پوچھتی ہوں کہ کیا ہم پاگل ہیں جو اس طرح کی کہانیوں پہ لقین کر لیں اور یہ مان لیں کے واقعی ایسی ہی کوئی بات ہونی، ہنا (جو جنید سے بھی اس بات پہ کافی بحث کر چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ پاکستان نہیں جانا چاہتی تھی) نے تمثیرانہ اندازہ میں سر جھٹکتے ہما کو دال میں کچھ کالا ہونے کا اشارہ دیا۔

”جی میں بھی یہی سوچ رہی تھی اور میں نے مزمل سے پوچھا بھی کہ کہیں کوئی پیار و یار کا تو معاملہ نہیں تھا؟ تو کہتے نہیں سب کچھ ابونے اپنی مرضی سے کیا ہے اور وہ لڑکی ابو کے کسی دوست کی بیٹی ہے؟“ اُس کی بات سنتے ہمانے بھی اپنا حصہ ڈالا۔

”ہونہ بس بس رہنے دو جانتی ہوں میں جودوست کی بیٹی ہے اور میں نے شاکستہ ممانتی کی زبانی سُنا تھا کہ دیور صاحب چند سال پہلے بھی ایک لڑکی کے عشق میں متلا ہو کر پڑھائی وڑائی سب چھوڑ کر مجنوں بنے پھرتے تھے۔ بس مجھے اب بھی کوئی ویسا ہی معاملہ لگ رہا ہے“، لوگوں کی وجہ سے تھوڑا اُس کے قریب جھکتے ہنانے اُس کی معلومات میں اضافہ کیا تو ہمانے حیرت سے اُسے دیکھا۔ ”چج آپی؟“ بے یقینی نے آنکھیں پھیلاتے اُس نے تصدیق چاہی۔

”ہاں تو اور کیا ممانتی مجھ سے جھوٹ بولیں گی“، اُس کی عقل پہ ماتم کرتے ہنانے پھر سے جو سکا سپ لیا تو ہمانے توبہ کرتے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

”بس اب باقی توبہ گھر جا کر کر لینا اور پلیز یہ سب باتیں اب مزمل سے پوچھنے مت بیٹھ جانا“، اُسے جو سکینے کا کہتے ہنانے تاکید کی تو ہمانے اثبات میں سر ہلاتے گلاس اٹھا کر سپ لیتے اُسے ماہم کے فون کے متعلق بتایا جو شام تک اُن کے پاس پہنچنے کا بتار ہی تھی۔

-----

”ہاشم میں سوچ رہی تھی کہ ارحم کی منگنی کو کافی وقت ہو گیا ہے اور اُس کی پڑھائی بھی کچھ دنوں تک مکمل ہو جائے گی تو کیوں ناہم اب اُس کی شادی کا کچھ سوچیں“، آئمہ بیگم نے انہیں کوٹ پہناتے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ہاں خیال تو میرا بھی یہی ہے پر تمہیں نہیں لگتا کہ اس طرح رابعہ کی پڑھائی ڈسٹریب ہو جائے گی؟ مطلب ابھی تو اُس کا تھرڈ ایئر ہے اور ہم ابھی شادی کا کہیں گے تو ہو سکتا ہے اُس کے گھر والوں کو یارابعہ کو خود کوئی اعتراض ہو“، اُن کی طرف رخ کرتے ہاشم صاحب نے اپنے خدشے کے متعلق انہیں آگاہ کیا۔

”نہیں ہوتا کوئی اعتراض اور رابعہ اگر آگے پڑھنا چاہے تو پڑھ سکتی ہے۔ ہم کون سا کوئی پرانے خیالات رکھنے والے لوگ ہیں جو بہو کے آتے ہی اُس کی ہر خواہشات پر پابندی لگادیں گے اور بس آپ آج کل میں ٹائم نکالیں تاکہ ہم لوگ اُن لوگوں کی طرف جا کر اس معاملے پر بات کریں“، اُن کا لڑھیک کرتے آئمہ بیگم نے اُن کے ہر خدشے کو پس پشت ڈالتے اصرار کیا۔

”اچھا بابا لڑھیک ہے۔ کل چلیں گے اور آپ ارحم کو بھی کہہ دیجیے گا کہ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے“، اُن کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے ہاشم صاحب نے تسلی دی اور شیشے کے سامنے کھڑے ہوتے اپنے بالوں میں برش پھیرنے لگے۔

”ٹھیک ہے میں کہہ دوں گی۔ بس آپ اب اس بات کو زیادہ لمبا مت کریئے گا،“ ان کی گھڑی اٹھا کر انہیں پکڑاتے آئمہ بیگم نے ایک بار پھر سے انہیں تاکید کی تو ہاشم صاحب نے ان کی بے چینی پر مسکراتے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے بیگم صاحبہ جیسے آپ کا حکم ویسا ہی ہو گا،“ سرخم کرتے انہوں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا تو آئمہ بیگم نے انہیں گھورتے ہوئے باہر کا رخ کیا تاکہ ان کے لیے ناشتہ لگانے کا کہہ سکیں۔

-----

”یہ تم دونوں یہاں بیٹھی کس کی چغلیاں کر رہی ہو؟“ پیپر دے کر ان کے ڈیار ٹمنٹ کی طرف آتے ارحم نے نور اور رابعہ کو گروانڈ میں بیٹھے ایک دوسرے کے ساتھ باتوں میں مصروف دیکھ کر وہیں کا رخ کیا جو اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گئیں۔

”ہمارا کوئی پرسنل معاملہ تھا اور یہ تمہارا ہر وقت ہماری جاسوسی کرنا ضروری ہوتا کیا؟“ نور کو نظروں سے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے رابعہ نے اس کی کلاس لی جو مشکوک سے انداز میں ان دونوں کو گھور رہا تھا۔

”میں تم لوگوں کی جاسوسی کیوں کروں گا؟ وہ تو بس ایسے ہی میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا حال چال پوچھ لوں“، کندھے اچکاتے خود کو بری الزام ٹھہراتے ارحم نے رابعہ کی جانب دیکھا جو اپنی کلاس فیلو کی آواز پر اُس کی بات کا جواب دیے بغیر ہی اٹھ کر دوسرا جانب بڑھی۔

”یہ لو...“، اُس کے اٹھ کر جاتے ہی ارحم نے بیگ میں پڑی دوچال کلیس نکال کر نور کی جانب بڑھائی۔

”تحقینک یو! پر یہ کس خوشی میں؟“، انکار کی بجائے نور نے بلا جھگ دنوں چاکلیس اُس کے ہاتھ سے پکڑتے پوچھا۔

”خوشی نہیں میری بہنا یہ رشوت ہے وہ سب مجھے بتانے کی جو رابعہ نے ابھی ابھی تم سے کہا“، اک نظر پچھے مرکر دیکھتے ارحم نے رازداری سے سرگوشی کی تو نور نے چاکلیس واپس اُس کی جانب بڑھائیں۔

”مجھے نہیں چاہیے آپ واپس رکھ لیں اور دوبارہ ایسے مجھے رشوت دے کر کچھ بھی پوچھنے کی کوشش کی تو میں آپ کی شکایت رابعہ سے کر دوں گی“، اُس کی بات کا بُرا مناتے نور کا دل چاکلیس واپس کرتے تھوڑا عجیب ہوا مگر پھر بھی دوستی کی خاطر اُس نے اپنا دل مارتے یہ قربانی بھی دے دی۔

”ہونہہ رکھ لو۔ آئی بڑی اپنی دوست کی چمچی“، زیر لب بڑھاتے اُس نے آخری بات اپنے منہ میں کہی۔

”نہیں، اگر آپ مجھے رشوت کے طور پر یہ دے رہے تو میں یہ نہیں لوں گی“، نفی میں سر ہلاتے اُس نے سر سری سانکار کیا۔

”نہیں اب خوشی سے ہی دے رہا تم رکھ لو اور پلیز ان کے بد لے اس بات کا ذکر رابعہ کے سامنے مت کرنا“، اُسے واپس آتا دیکھ کر ارحام نے ہاتھ جوڑے تو نور نے جلدی سے چاکلیس اپنے بیگ میں چھپائیں۔

”کیا ہوا؟ اب تم دونوں بھی میری چغلیاں کر رہے تھے کیا؟ جو مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئے“، ایک نظر نور کی طرف دیکھتے جو اس کے دیکھنے پر زبردستی مسکرائی تھی۔ رابعہ نے ارحام کو بات دھرائی جو ہر وقت اُن دونوں پہ طنز کرتا تھا۔

”ہونہہ ہم کیوں تمہاری چغلی کریں گے؟ ہم تو تمہاری تعریف کر رہے تھے کیوں نور؟“، اپنا بچاؤ کرتے ارحام نے ساری بات اُس پہ ڈالی تو اُس نے سوچ سمجھے بغیر ہی نفی میں سر ہلایا۔

”ہاں ہاں، ہم تعریف ہی کر رہے تھے“، ارحم کے آنکھیں نکالنے پر نور نے کچھ سینڈ کے لیے رک کر اُس کی بات پر غور کرتے جلدی سے بات بدلتی تو رابعہ نے بھنویں اچکاتے اُن دونوں کے درمیان کچھ ٹھہری کونوٹ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے اور یہ زارون کہاں ہے نظر نہیں آرہا اج تمہارے ساتھ؟“ نور کی خبر بعد میں لینے کا سوچتے اُس نے زارون کے متعلق استفسار کیا۔

”ہاں، وہ کلاس میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ میں تو بس ایسے ہی بر گر لینے آیا تھا تو تم دونوں کو دیکھ کر رک گیا“، اُس کی بات کا جواب دیتے ارحم نے جاتے جاتے اپنے وقت ضائع ہونے کا طعنہ مارتے کہ نینٹیں کارخ کیا تو رابعہ نے ہاتھ میں کپڑی بینسل غصے سے اٹھا کر اُس کی طرف پھینکی۔

”بھاڑ میں جاؤ تم فالتو انسان“، نشانہ خطا ہونے پر خود کلامی کرتے وہ نور کے سر ہوئی جو اُس کا پارہ ہائی دیکھ کر وہاں سے کھسکنے کے چکر میں تھی۔

-----

تہہ خانے میں موجود سائرہ جسے حیدر شاہ کے کہنے کے مطابق پچھلے کچھ مہینوں سے اُسی جگہ قید رکھا ہوا تھا اج موت کی صورت ملنے والی آزادی پر اُس بند کمرے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی سے بھی رہائی پاچکی تھی۔

”سامنے آپ کے لیے ایک خبر ہے“، اُن کے کمرے کے دراوزے پر دستک دیتے (جو ابھی تک بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائے ہیم دراز تھے) سلیمان نے بات کرنے کی اجازت طلب کی۔

”ہاں بولو“، اپنی نظریں سامنے چلتے ہی سے ہٹاتے حیدر شاہ نے سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا جو بات کرنے کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش میں تھا۔

”وہ سائیں، رات سائرہ کی طبیعت کافی خراب تھی میں نے دو ایسا وغیرہ دیں مگر“۔

”کیا مگر؟ کیا ہوا ہے جلدی کبو“، اُس کے وقفہ دینے پر جھنجھلاتے ہوئے حیدر شاہ نے ماتھے پہ بل ڈالے۔

”سامنے مر گئی ہے وہ“، نظریں پیچی کرتے اُس نے انہیں باخبر کیا تو حیدر شاہ جو یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ کہیں بھاگ گئی ہے اک دم سے پر سکون ہوئے۔

”مرگئی ہے تو... کیا میں نے اُس کا نماز جنازہ پڑھوانا تھا؟ جو اس طرح افسوس سے آگر مجھے یہ خبر سنا رہے ہو؟“ اُس کے چہرے پہ ہوا بیاں اُڑی دیکھ کر حیدر شاہ نے طنز کیا تو سلیمان نے اُن کے غصے پر جلدی سے نفی میں سر ہلا�ا۔

”سامنے وہ آپ کی اجازت کے بغیر ہم کیسے کوئی کام کر سکتے تھے، اسی لیے بس اجازت لینے آیا تھا کہ اُس کی لاش کو دفنادیں؟“ تھوک نگتے سلیمان نے صفائی پیش کی تو حیدر شاہ نے اجازت دیتے اُسے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔

”ہونہہ پتا نہیں کہاں کہاں سے اٹھ کر آجاتے ہیں بے وقوف کہیں کے،“ اُس کے کمرے سے نکتے ہی حیدر شاہ نے اپنا وقت ضائع ہونے پر بے زاری سے خود کلامی کی اور ٹیڈی کی آواز تیز کرتے اسکرین پر چلتی فلم دیکھنے لگے۔

-----

”یہ تم تینوں مجھے کہاں لے کر جا رہے ہو؟“ زارون کے ساتھ آگے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ارجمنے پچھلے پانچ منٹ میں کوئی دسویں بار اپنا سوال دھرا�ا۔

”اغوا کر رہے ہیں ہم تمہیں اس لیے خاموشی کے ساتھ بیٹھو،“ گاڑی کارخ آیک ریسٹورنٹ کی جانب کرتے زارون نے مسکراتے ہوئے دھمکی دی۔

”اغوا وہ بھی مجھے؟ اتنی ہمت ہے تم میں کہ تم ارحام ہاشم کو ہاتھ لگا سکو؟“ اس کی بات سننے مقابل نے نظروں میں غرور لیے زارون کو چیلنج کیا۔

”بہت ہمت ہے چیک کرنا چاہو گے؟“ اس کے چیلنج پہ ہاتھ کا مکابنہ کر اس کی کمرپہ جڑتے زارون نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہی اپنی کہی بات پر عمل کیا۔

”اففف فیار میں تو مذاق کر رہا تھا تم تو سیر نہیں ہی ہو گئے،“ اپنی کمر سہلاتے ارحام نے پچھے مرڑ کر نور کو آنکھیں دکھائیں جو زارون کی بہادری پر تالیاں بجاتے اُسے داد دے رہی تھی۔

”اسی لیے کہتے ہیں کہ مقابل کی طاقت دیکھ کر بات کرنی چاہیے،“ پچھے سے ایک تھپڑا اس کے کندھے پر رسید کرتے رابعہ نے اُسے مزید تپایا۔

”بس بس زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں اور میں صرف دوستی کا لحاظ کرتے خاموش ہوں ورنہ مزہ مجھے بھی اچھے سے چکھانا آتا ہے،“ مکابنہ کر زارون کی نظروں کے سامنے کرتے ارحام نے دانت پیستے کھا تو زارون نے اُسے اپنی ازربی کسی اور کام کے لیے سنبھال کر رکھنے کا کہتے گاڑی روکی۔

”یا رکیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟ کیا کر رہے ہو تم میرے ساتھ؟“، زارون نے اُس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا تو ارحام نے اُس کی حرکت پر جھنجھلاتے ہوئے رابعہ کے ہاتھ تھامنے پر اندازے سے قدم آگے بڑھائے۔

”پسی بر تھڈے“، کچھ منٹ بعد ایک جگہ رکتے زارون نے اپنے ہاتھ ہٹائے تو ارحام نے اُن تینوں کی آواز کے ساتھ ساتھ دھنڈ لائی ہوئی نظروں سے سامنے کے منظر کو دیکھنے کی کوشش کی جہاں ہر طرف لگے غبارے اور پھول، پورے ہال کو دلکش بنار ہے تھے۔

”ہونہہ مطلب تم دونوں کو یاد تھا؟“، ان کے سر پر انہی پر حیرانگی کی بجائے ارحام نے منه بسو رتے استفسار کیا۔

”تو اور کیا؟ تمہارا بر تھڈے بھول کر میں نے پورا سال طعنے سننے تھے کیا؟“، اُس کے گلے لگتے زارون نے مسکراتے ہوئے کہا تو نور نے بھی ارحام کو بر تھڈے وش کرتے بیگ سے گفت نکال کر اُس کی طرف بڑھایا۔

”مجھے نہیں چاہیے۔ توبہ کتنی چالاک ہو گئی ہو تم بھی ان دونوں کے ساتھ رہ کے“، اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ارحام نے تھوڑی دیر پہلے ہی چاکلیٹ والپس کرنے والی بات کو سوچتے منه بسو را۔

”میں تو آپ کو بتانا چاہتی تھی مگر ان دونوں نے مجھے سختی سے منع کیا تھا اور ساتھ پر امس بھی لیا تھا اور نوراپنا پر امس نہیں توڑتی اس لیے پلیز ارحام بھائی سوری“، ایک ہاتھ سے اپنا کان پکڑتے اُس نے معذرت کی تو ارحام نے مسکراتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے اپنا گفت پکڑا تو رابعہ کے ساتھ ساتھ زارون نے بھی اُسے گھوڑ کر دیکھا جو ان کے سارے پلان کا مزہ خراب کرنے والی تھی۔

”تحقینک یو اور تم کیا لائے ہو میرے لیے؟“ فراغ دلی کا مظاہرہ کرتے اُس نے نور کی غلطی پر اُسے بخششے زارون سے پوچھا جو اُس کی بات سن کر انجان بن گیا تھا۔

”اوہیلو میں تم سے پوچھ رہا ہوں؟“ اُس کی ایکینگ پر بھنویں اچکاتے ارحام نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا تو زارون نے اپنی طرف اشارہ کیا۔

”تم نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”جی بالکل جناب میں آپ سے ہی پوچھ رہا ہوں“، دونوں ہاتھ سینے پہ باندھتے اُس نے استفسار کیا تو زارون نے اپنے بیگ سے ایک گفت نکالا۔

”نه یہ نہیں چاہیے مجھے“، اُس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو پیچھے کرتے ارحام نے انکار کیا۔

”کیوں پھر کیا چاہیے؟“ اُس کے منع کرنے پر زارون نے تیوری چڑھاتے اُس کی فرماش کے متعلق پوچھا۔

”نہم، مجھے تم چاہیے ہو“، اپنے اور اُس کے درمیان چار قدم کا فاصلہ سیمٹتے ارحمنے بے اختیار ہی اُسے گلے سے لگایا تو زارون کے ساتھ ساتھ وہ دونوں بھی خاموش ہو گئیں۔

”تمہاری دوستی چاہیے مجھے۔ زندگی کے ہر موڑ پہ تمہارا ساتھ چاہیے“، دونوں ہاتھ اُس کے گرد باندھے ارحمنے اپنی خواہش بتائی تو زارون نے بھی مسکراتے ہوئے اُس کے گرد بازو پیٹے۔

”میں ساتھ ہوں تمہارے۔ بس اب یہ جذباتی ڈرامے بند کرو میری بیوی بہت غور سے ہمیں دیکھ رہی ہے“، ایک نظر پچھے کھڑی نور پہ ڈالنے زارون نے اُسے خود سے الگ کیا تو ارحمنے اُس کے ہاتھ میں موجود اپنا گفت پکڑا۔

”زیادہ بیوی کے چچے مت بنو اور اسی بیوی نے تمہیں مجھ سے دور کیا ہے۔ چڑیل کہیں کی“، اُس کے کان کے قریب ہوتے سر گوشی کرتے ارحمنے مصنوعی خفگی دکھائی تو رابعہ نے کینڈ لز جلاتے ارحمنے کو کیک کا ٹنے کا کھا تو وہ تینوں ٹیبل کی جانب بڑھے جہاں ایک خوبصورت ساچا کلیٹ کیک ان کا منتظر تھا۔

”شکور بھائی ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟“، ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہی رفیق نے چاروں طرف نظر دوڑاتے اپنے وہاں آنے کا مقصد پوچھا۔

”کام کے سلسلے میں ہی آئے ہیں اور بڑے سائیں نے ہمارے لیے یہاں دعوت کا انتظام کیا ہے“، اُس کے بے تکے سوال پر بے زاری سے جواب دیتے وہ اُس جانب بڑھا جہاں کچھ دیر پہلے ہی اُس کے مخبر نے اُسے اُس لڑکی کی موجودگی کی اطلاع دی تھی۔

”چلو وہاں“، ایک جانب قدرے کم رش والی جگہ کی جانب اشارہ کرتے شکور نے اُسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

”آپ کو پکا پتا ہے کہ وہ لڑکی یہیں پہ ہے؟“، اُس کے ساتھ والی کرسی سنبھالتے ہی رفیق نے پھر سے اپنے خدشے کو زبان تک لاتے پوچھا۔

”ہاں کبی خبر ہے بس دعا کرو آج کوئی اچھا موقع ہاتھ آجائے تو ہم یہ کام بھی نمٹادیں ورنہ اس بار سائیں ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے“، ویٹر کو اپنے قریب آتا دیکھ کر وہ بات کرتے کرتے رکا۔

”دو جو سلاادیں“، مینو کارڈ دیکھے بغیر ہی شکور نے آرڈر دیا تو وہ سر ہلاتے واپس مڑا۔

”بھائی مجھے نہیں لگتا کہ اس کام کے لیے یہ جگہ مناسب ہے۔ مطلب یہاں کافی کیمرے لگے ہوتے“، ویٹر کے جاتے ہی رفیق نے اپنے سامنے دیوار پر لگے کیمرے کی جانب اشارہ کیا۔

”میں نے سب انتظام کر کھا ہے بس تم پریشان نہ ہو اور اپنے کام کی طرف توجہ دو“، شکور جو ایک ویٹر کو پسیے دے کر سارا کام کرو اچکا تھا اُس نے بے فکر ہوتے اُس ہال کی جانب دیکھا جہاں کچھ سینئڈ پہلے وہی ویٹر جوس لیے اندر گیا تھا۔

---

”افف مجھے ماما کو بتانے کا یاد ہی نہیں رہا“، اپنے موبائل پر آتی عابدہ بیگم کی کال دیکھتے نور نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے خود کلامی کی اور زارون لوگوں کے کچھ کلاس فیلوز اور دوست جوار حم کے کال کرنے پر ابھی ابھی آئے تھے اُن کے شور کی وجہ سے رابعہ (جو حدیہ کہ آنے پر اُس کے ساتھ مصروف تھی) کو دو منٹ میں آنے کا کہتے ہال سے باہر نکلی۔

”السلام علیکم جی ماما وہ ہم ریسٹورنٹ آئے ہیں ارحم بھائی کا بر تھوڑے ہے اس لیے“، سلام کرتے ہی دوسری طرف عابدہ بیگم کے پریشانی سے پوچھنے پر اُس نے بتایا۔

”جی زار بھی ساتھ ہیں بس ہم تھوڑی دیر میں گھر آ جائیں گے“، چلتے ہوئے ہال سے کچھ فاصلے پر جاتے اُس نے عابدہ بیگم کے زارون کے متعلق پوچھنے پر بتایا اور مزید ایک دو باتیں کرنے کے بعد کال کاٹ دی۔

---

”میڈم وہ ایک لڑکی آپ کو باہر بلارہی ہے“، اُس نے کال بند کرتے جیسے ہی قدم ہال کی جانب بڑھائے تو ایک ویٹر نے اُس کے قریب آتے باہر کی جانب اشارہ کیا۔

”اڑکی اور مجھے؟ نہیں بھائی آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی“، ویٹر کی بات کی تردید کرتے اُس نے آگے بڑھنا چاہا پر وہ پھر سے اُس کے سامنے آتے اُسے روکنے لگا۔

”نہیں میڈم مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوتی، وہ آپ کے ساتھ اندر ایک میڈم تھی نا وہ ابھی باہر گئی ہیں اور مجھے کہہ رہی تھیں کہ آپ فون سن لیں تو آپ کو باہر آنے کا کہہ دوں“، پوری ہوشیاری کے ساتھ اُس نے نور کو دروغ لانے کی کوشش کی۔

”رابعہ، وہ باہر کیوں گئی ہے؟“ زیر لب اُس کا نام دوہراتے نور نے ایک نظر ہال کی جانب دیکھا اور بناسوچے سمجھے ہی باہر کی جانب قدم بڑھائے کہ شاید کوئی مسئلہ ہو۔

”رابعہ کہاں ہو؟“ بیرونی دروازے سے نکلتے ہی اُس نے سنسان سڑک پر کھڑی کچھ گاڑیوں کو دیکھا اور سیڑھیاں اترتے اُس کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑانے لگی تو اچانک سے ایک گاڑی اُس کے قریب آگر کی اور اُس میں سے ایک نقاب پوش آدمی نے باہر نکلتے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہی اُس کے منہ پر رومال رکھتے گاڑی میں ڈالا تو وہاں موجود دو تین آدمی جلدی سے اُن کو کپڑنے کے لیے بھاگے پر اُس سے پہلے ہی رفیق نے گاڑی اڑاتے وہاں سے نکالی۔

”میرا خیال ہے ہمیں اندر جا کر بتانا چاہیے“، گاڑی ہاتھ سے لگتے ہی اُن میں سے ایک آدمی نے کہا۔  
 ”پاگل ہو کیا؟ اپنی بیوی پھوٹ کا خیال کرو اور ایسے معاملے میں نہ ہی پڑو تو بہتر ہے“، اُس کی بات سنتے دوسرے آدمی نے اُسے سمجھایا تو وہ تینوں جو پہلے ہی وہاں معمولی ملازم تھے اُس معاملے کو رفع دفع کرتے اپنے اپنے کاموں کی طرف متوجہ ہوئے۔

-----

”یہ نور کہاں ہے؟ کافی دیر سے مجھے نظر نہیں آئی؟“، زارون نے اُس کی غیر موجودگی محسوس کرتے ارجمند منٹ میں آنے کا کہتے رابعہ کے قریب آتے پوچھا۔

”وہ آنٹی کافون آیا تھا تو شور کی وجہ سے وہ باہر سننے کئی تھی مگر اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا“، زارون کے پوچھنے پر رابعہ کو بھی فکر لاحق ہوئی تب ہی اُس نے جواب دیتے فکر مندی سے اپنا رخ باہر ہال کی جانب کیا۔

”کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟“، زارون نے بھی اُس کے پیچھے باہر آتے چاروں طرف نظر دوڑائی۔  
”تقریباً پندرہ بیس منٹ ہو گئے ہیں“، اُس کی معلومات میں اضافہ کرتے رابعہ نے نور کے موبائل پر ٹرائی کیا۔

”فون بھی بند ہے“، دو تین بار کال کرنے کے بعد اُس نے پریشانی سے زارون کی طرف دیکھا جو اُس کی بات سنتے ہی ریسٹورنٹ کی دائیں جانب جاتے اُسے تلاش کرنے لگا۔

”کیا ہوا تم دونوں یہاں باہر کیوں آئے ہو؟ سب خیریت ہے نا؟“، ان دونوں کوہاں سے باہر نکلتا دیکھ کر ارحم بھی پریشانی سے اُن کے پیچھے آیا۔

”نهیں، ارحم وہ نور نہیں مل رہی۔ پہنچ نہیں ابھی پندرہ، بیس منٹ پہلے باہر آئی تھی آنٹی کی کال سننے اور اب وہ یہاں کہیں بھی نہیں ہے“، اُس کے بازو پہ پا تھر کھتے رابعہ نے اُسے پوری تفصیل بتائی جسے سنتے ہی اُس کے تاثرات سنجیدہ ہو گئے۔

”تم واش روم وغیرہ میں دیکھو میں بھی دیکھتا ہوں یہی کہیں ہو گی“، اُسے لیڈیز واش روم کی طرف جانے کا بولتے ارحم نے بائیں جانب جاتے ہر جگہ چھان ماری پر نور کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ”کچھ پتا چلا؟“، کچھ منٹ بعد واپس ہال کے قریب اکٹھے ہوتے زارن نے اُن دونوں سے پوچھا۔ ”نہیں کہیں نہیں ملی“، اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کرتے ارحم نے بتایا تو زارون نے رابعہ کی طرف دیکھا جوز بان کی بجائے نفی میں سر ہلا گئی۔ ”یہاں نہیں ہے تو پھر کہاں کئی؟ زمین نگل کئی یا آسمان کھا گیا“، غصے سے اوچی آواز میں چلاتے زارون نے اپنا سرد دونوں ہاتھوں سے تھاما۔

”پلیز یار پریشان نہ ہو مل جائے گی یہی کہیں ہو گی“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ارحم نے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ ہوتے دیکھ کر اُسے تسلی دی اور رابعہ کو باقی سب کو اندر سے بلانے کا کہانا کہ سب مل کر نور کو تلاش کر سکیں جو ایک دم سے ہی کہیں غائب ہو چکی تھی۔

پورے دو گھنٹے گزر چکے تھے ارحم کے ساتھ ساتھ باقی سب نے بھی ریسٹورنٹ کے ویٹرز سے لے کر ملازموں تک ہر بندے سے اُس کے متعلق پوچھ لیا تھا پر ابھی تک اُس کے ملنے کی کوئی امید یا

اُس کے غائب ہونے کے متعلق کوئی سراغ ہاتھ نہیں لگا تھا جس کی وجہ سے زارون کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور اُسے کہاں ڈھونڈے۔

”زارون مجھے لگتا ہے ہمیں پولیس کو انفارم کر دینا چاہیے“، توارحم جو ابھی بھی یونجر کے کمرے سے پورے دن کی ریکارڈنگ دیکھ کر آیا تھا اُس نے آتے ہی اُسے مشورہ دیا جو ایک بار پھر سے ریسٹورنٹ کے ہر ملازم سے پوچھ گچھ کر چکا تھا۔

”ہاں مجھ بھی یہی لگ رہا“، اُس کی بات سننے زارون نے تائید کی تو توارحم نے اُس وقت کی ریکارڈنگ غائب ہونے کے متعلق بتایا جب نورہال سے باہر آئی تھی۔

”مجھے تو لگ رہا کہ ان ریسٹورنٹ کے بندوں میں سے ہی کوئی ساتھ ملا ہوا ہے“، اُس کی بات سننے زارون جسے ایک دوویٹر زکے گھبرا کر بات کرنے پہ شک ہوا تھا اُس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنے خیال کا اظہار کیا تو توارحم نے موبائل نکالتے ہاشم صاحب کو کال کرتے اُنہیں ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں ڈی آئی جی کو کال کرتا ہوں مگر تمہیں یقین ہے ناکہ وہ لڑکی کہیں بھاگی نہیں بلکہ کسی نے اُسے غائب کیا ہے؟“، اُس کی پوری بات سننے کے بعد ہاشم صاحب نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے وضاحت چاہی۔

”ابو کیا ہو گیا ہے کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟ نور بالکل بھی ایسی لڑکی نہیں ہے اور اگر ایسی بات ہوتی تو اس وقت کی ریکارڈنگ یہ لوگ کیوں غائب کرتے؟ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا بس مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے اس ویڈنگ ارینجمنٹ والی بات کا اس واقعے سے ضرور کوئی تعلق ہے اس لیے پلیز آپ جو بھی کرنا ہے جلدی کریں“، اپنے ماتھے پہ آیا پسینہ صاف کرتے ارحم نے کچھ سوچتے ہی ہاشم صاحب کو اپنی مدد کا کہا تو انہوں نے ڈی آئی جی کو کال کرنے کا کہتے فون بند کر دیا۔

”کیا بنا؟ کیا کہتے ہیں انکل؟“ رابعہ جو اس کے قریب ہی کھڑی تھی اس نے ارحم کے کال بند کرتے ہی استفسار کیا۔

”کچھ نہیں بس کچھ دیر میں پولیس آجائے گی اور اب ریسٹورنٹ والوں کی تو میں ایسی بینڈ بجاوں گا کہ پوری زندگی یاد رکھیں گے“، دانت پسیتے اس نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچی اور اسے حدیہ کے ساتھ گھر جانے کا بولتے زارون کے پاس آیا جو عابدہ بیگم کی کال آنے پر انہیں لیٹ ہو جانے کا کہتے طال چکا تھا۔

”کیا بنا؟ کب تک آئے گی پولیس؟“ ارحم کے قریب آتے ہی زارون نے کال بند کرتے چہرے پر فکر لیے سوال کیا۔

”ہاں بس وہ لوگ تھوڑی دیر میں پہنچ رہے ہیں تم لوگ بس دھیان رکھو کہ یہاں سے کوئی بندہ باہر نہ جائے“، اُس کی بات کا جواب دیتے ارجمنے اپنے باقی دوستوں سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے بیرونی دروازے کی جانب بڑھ چکے تھے۔

---

”ماما کیا ہوا آپ کو؟“، نائلہ بیگم کا سر چکر ایسا توہاتھ میں پکڑے بر تن زمین پر گرنے کی آواز پر رضا نے جلدی سے اٹھ کر کچن کا رخ کرتے انہیں سنجھا۔

”کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے نا آپ کی؟“، کرسی آگے کھینچ کر انہیں اُس پر بٹھاتے رضا نے جلدی سے گلاس میں پانی ڈال کر ان کے لبوں سے لگایا۔

”بس ٹھیک ہوں میں“، دو گھونٹ بھرتے انہوں نے گلاس ہٹایا تو رضا کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔

”ٹھیک کہاں ہیں؟ اُٹھیں میں آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر چلوں“، اُن کے چہرے پہ آتے پسینے کو دیکھ کر رضا نے فکر مندی کا اظہار کیا تو نائلہ بیگم نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں بس چکر آگیا تھا“، اپنے دل میں ہونے والی گھبرائہٹ پہ قابو پاتے نائلہ بیگم نے اُسے مطمئن کیا جو ان کی طبیعت خراب دیکھ کر اک دم سے پریشان ہو چکا تھا۔

”توبہ ہی کہہ رہا ہوں کہ میرے ساتھ ڈاکٹر کے چلیں۔ ایک بارچیک کروالیں ہو سکتا ہے کہ بی پی ہائی ہو یا لو“، ان کے قریب ہی نیچے زمین پر ان کے سامنے بیٹھتے اُس نے اصرار کیا تو نائلہ بیگم نے ٹیبل سے گلاس اٹھا کر مزید دو گھونٹ پانی کے لیے۔

”نہیں بیٹا میں اب ٹھیک ہوں ویسے ہی پتا نہیں دل کو گھبراہٹ سی ہو رہی ہے۔ ایسے جیسے کچھ بُرا ہونے والا ہو، بس تم میری فکر چھوڑ اور نور کو فون کر کہ پوچھو وہ ٹھیک ہے نا؟“ اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے نائلہ بیگم نے کہا تو رضا نے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”آپ اُنکیں میرے ساتھ، کمرے میں جا کر آرام کریں میں پوچھتا ہوں آپی سے“، چولہا بند کرتے اُس نے ان کا ہاتھ تھاما اور سہارادے کر کمرے تک لا کیا۔

”بیٹا میں ٹھیک ہوں۔ تم بس بہن کا پوچھو وہ ٹھیک ہے نا؟“ بیڈ پر بیٹھتے ہی نائلہ بیگم نے پھر سے اپنی بات دھرائی تو رضا نے اثبات میں سر ہلاتے ان کی تسلی کے لیے لاونچ میں پڑا اپنا موبائل اٹھایا اور نور کو کال ملائی۔

”آپی کا نمبر توبند ہے شاید بیٹری لو ہو گئی ہو“، موبائل کان سے ہٹاتے انہیں اپنی طرف دیکھتا پا کر رضا نے بتایا اور ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی زارون کا نمبر ڈائل کیا۔

”السلام عليكم زارون بھائی کیسے ہیں آپ؟“ چو تھی بیل پہ کال ریسیو ہوئی تورضانے خوش دلی سے پوچھا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں تم کیسے ہو؟ اور آنٹی کی طبیعت کیسی ہے؟“ ارحم کو دو منٹ کا بولتے زارون نے سائیڈ پہ ہوتے رضا کی کال ریسیو کی جو یقیناً اُس نے نور کے نمبر بند ہونے کی وجہ سے اُس کے موبائل پہ کی تھی۔

”جی سب ٹھیک ہیں۔ وہ میں آپ کے نمبر پہ کال کر رہا تھا تو ان کا موبائل آف جارہا ہے اس لیے آپ کو تنگ کیا۔ آپ مصروف تو نہیں تھے؟“ پچھے سے آتی شور کی آواز پر رضا نے اُس کے کہیں باہر ہونے کا اندازہ لگاتے پوچھا۔

”نہیں وہ بس ارحم کا بر تھڈے ہے تو باہر آیا ہوں اور نور بھی میرے ساتھ ہے،“ اُس کی بات سنتے زارون نے اپنے لبھ کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے نارمل سے انداز میں بتایا۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے بس آپ لوگ انجوائے کریں میں رات کو کال کر لوں گا،“ کلاک پر شام کے سات بجتے دیکھ کر رضا نے اُسے ڈسٹر ب کرنے پر معدرت کی۔

”کوئی بات نہیں میں گھر جا کر نور سے بات کروادوں گا تم بس اپنا اور آنٹی کا خیال رکھو“، پولیس کے آتے ہی ارحم نے اُسے آواز دی تو زارون نے رات کو بات کرنے کا کہتے کال بند کرتے اپنارخ اُن کی جانب کیا۔

”کیا ہوا؟ کہاں ہے نور؟“ رضانے موبائل کان سے ہٹایا تو نائلہ بیگم نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”وہ ارحم بھائی کا آج بر تھڈے ہے تو آپی اور بھائی اُن کے ساتھ باہر ہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں آپی بالکل ٹھیک ہے اور زارون بھائی کے ساتھ ہی ہیں“، اُن کے قریب بیڈ پر بیٹھتے رضانے تسلی دی تو نائلہ بیگم نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نور ٹھیک ہے۔

”اچھا بس تم نے زارون کو کہہ دینا تھا کہ گھر جاتے ہی میری بات کروادے“، دل میں ابھی بھی ایک خوف ہونے کی وجہ سے نائلہ بیگم نے پھر سے اُسے کہا جو سر ہلاتے اُنہیں زارون سے ہونے والی بات کے متعلق بتانے لگا۔

-----

ڈیرے پہنچتے ہی شکور نے اُس لڑکی کو مراد شاہ کے کمرے تک پہنچاتے اُسے اطلاع دی جو ایک ضروری کام کے سلسلے میں حیدر شاہ کے ساتھ پشاور جانے کے لیے نکل چکا تھا۔

”سائیں، آپ کا کام ہو گیا ہے“، کال ریسیو کرتے ہی شکور کی آواز ابھری تو مراد شاہ کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

”ٹھیک ہے بس تم میرے آنے تک اُس کا خیال رکھو اور خبردار اگر میرے آنے سے پہلے کسی نے بھی اُسے ہاتھ لگایا بلکہ کسی نے اُسے نظر انداختا کر بھی دیکھا تو میں اُس کی آنکھیں نوچ لوں گا“، اپنے لب سکڑتے اُس نے ساری تفصیل سننے کے بعد دبی آواز میں غراتے ہوئے اُسے تنبیہ کی جو ابھی تک تک اُس لڑکی کے ساتھ ہی کمرے میں موجود تھا۔

”جی سائیں جیسے آپ کا حکم“، مراد شاہ کی دھمکی پر جلدی سے اُس سے نظریں ہٹاتے (جو ابھی تک بے ہوش تھی) وہ کمرے سے باہر نکلا۔

”بس میں کل تک واپس آجائوں گا۔ تم تب تک بس اُس کا خیال رکھنا اور اگر زیادہ شور شرابہ کرے تو بے ہوشی کا نجکشن لگادینا“، اُسے تاکید کرتے مراد شاہ نے کال کاٹی تو حیدر شاہ کو اپنی جانب متوجہ پایا۔

”گلتا ہے کوئی بہت خاص لڑکی ہے“، مراد شاہ کے چہرے پر بکھری چمک دیکھ کر حیدر شاہ نے اندازہ لگایا۔

”جی بہت خاص ہے اور بہت خوبصورت بھی“، گھری سانس لیتے مراد شاہ کی آنکھوں میں پھر سے اُس کا عکس ابھر اتو مسکراہٹ نے خود بخود ہی اُس کے ہونٹوں کا احاطہ کیا۔

”اچھا چلو مجھ سے بھی ملوانا میں بھی دیکھوں کہ کیا ہے اُس لڑکی میں جو پچھلے سات آٹھ مہینوں سے ہمارا یہاں اُس کے پیچھے مجنوں بناؤں کی تلاش میں لگا تھا“، شیشے سے باہر دیکھتے حیدر شاہ نے اُس کے لہجے کی خوشی کو محسوس کرتے اشتیاق سے کہا۔

”جی جی ضرور دکھاؤں گا“، اُن کی بات پر سر ہلاتے مراد شاہ نے بے چینی سے ڈرائیور کو گاڑی کی اسپیڈ بڑھانے کا کہا تو اُس کی بے قرار ای دیکھ کر حیدر شاہ نے قہقهہ لگایا۔

-----

پولیس نے اپنی کارروائی شروع کی تو ریسٹورنٹ کی انتظامیہ نے اپنی ریپوٹیشن خراب ہونے کے ڈر سے اُن کا بھر پور ساتھ دیتا کہ معاملہ زیادہ خراب نہ ہو۔ ”یہ اندر سے کچھ گھنٹوں کی روکارڈ نگ

کس نے غائب کی ہے؟، ایس پی نے سارے دن کی ریکارڈنگ دیکھنے کے بعد اندر سے کچھ گھنٹے کی فوٹج غائب دیکھ کر سوال کیا۔

”معلوم نہیں سر، میں کچھ دیر پہلے ہی یہاں کنڑول روم میں آیا تھا اور سب کچھ ٹھیک تھا پھر میری امی کی طبیعت خراب تھی تو میں تھوڑی دیر کے لیے گھر چلا گیا اور جب والپس آیا تو ریسٹورنٹ کے تمام کیمرے بند تھے۔ مطلب پچھے میں واڑز میں خرابی تھی جس کی وجہ سے سارا سسٹم بند ہو گیا تھا، وہاں موجود لڑکے نے پوری تفصیل کے ساتھ ایس پی کو وضاحت دی تو اس نے کچھ سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”رشید اس لڑکے کو بھی ساتھ لے لو، اپنے ساتھ موجود کائنٹل کو آواز دیتے ایس پی نے شک کی بناء پر اُسے بھی اپنی ہر است میں لیا۔

”پر سرجی میرا کیا قصور ہے۔ میں نے جو بات تھی آپ کو بتا دی ہے،، اُس لڑکے نے گھبراتے ہوئے اپنی صفائی پیش کی تو رشید نے اُسے زبان چلانے سے منع کرتے کمرے سے باہر کا رخ کیا۔

”ہم نے تمام ضروری کاروائی مکمل کر لی ہے ان شاء اللہ جلد ہی آپ کی سسٹر کا پتا چل جائے گا،، رشید کے جاتے ہی ایس پی نے ارحم کو تسلی دی اور گھر جانے کا کہا۔

”نہیں، مجھے گھر نہیں جانا جب تک نور نہیں ملتی میں کہیں نہیں جاؤں گا“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے نفی میں سر ہلاتے ارحم کو منع کیا۔

”یار ایسے یہاں رہنے سے کیا ملے گا؟ وہ یہاں نہیں ہے اس لیے پلیز خود کو سن جالو۔ سر کہہ رہے ہیں ناکہ یہ لوگ جلد ہی نور کو ڈھونڈ لیں گے تو تسلی رکھو اللہ پاک سب بہتر کرے گا“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ارحم نے ایس پی کے تعاون کرنے پر شکر یہ ادا کیا جو ہاشم صاحب کے تعلقات کی وجہ سے خود وہاں اُن کی مدد کے لیے آیا تھا۔

”کوئی بات نہیں یہ تو ہمارا فرض ہے بس آپ اپنے دوست کو سن جالیں اور مطمئن رہیں ہم بہت جلد اس معاملے کی تھہ تک پہنچتے آپ کی بہن کا کھونج لگا لیں گے“، اُس کے شکر یہ پہ عاجزی کے ساتھ منع کرتے ایس پی نے زارون کو بھی حوصلہ رکھنے کی تلقین کرتے گھر جانے کا بولا اور اجازت طلب کرتے باہر کی جانب بڑھا۔

”زارون چلو گھر چلتے ہیں“، ایس پی کے جاتے ہی ارحم نے اُس سے کہا جو نفی میں سر ہلاتے نظریں جھکا گیا۔

”یا رپلیز چلو، یہاں رہ کر کچھ حاصل نہیں ہونا اور پولیس کو شش کر رہی ہے ناتم دیکھنا کچھ ہی گھنٹوں میں نور تمہارے پاس ہو گی“، اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ارحم نے تسلی دی تو ایک گہری سانس لیتے اُس نے نظر اٹھا کر پھر سے ریஸٹورنٹ میں چاروں طرف دیکھا۔

”یا مرادل بہت گھبرا رہا ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گی“، اپنے سینے پہ ہاتھ پھیرتے زارون کی آنکھوں میں نمی آئی۔

”اللہ پاک اپنے معصوم اور اچھے بندوں کی خود حفاظت کرتا ہے جیسے اللہ نے تمہیں اور نور کو پہلے اُن لوگوں سے بچایا تھا اب بھی وہی مدد کرے گا۔ بس تم اُس کی ذات پہ لیقین رکھو اور اٹھو گھر چلتے ہیں۔ آئی انکل بھی پریشان ہو رہے ہوں گے“، خود کھڑے ہوتے اُس نے زارون کو بھی اٹھانا چاہا۔

”نہیں، میں نہیں جاؤں گا اور گھر جا کر میں امی ابو کو کیا جواب دوں گا؟ کیا بتاؤں گا اُنہیں کہ میرے ہوتے ہوئے نور کہیں غائب ہو گئی؟ نہیں میں ابھی کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا“، اپنے دونوں ہاتھ چھرے پہ رکھتے زارون نے پھر سے اُسے منع کیا۔

”کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ تم اُٹھو میں خود ہی آنٹی انکل کو سب بتادوں گا“، اُس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اُسے کھڑا کرتے ارجمنے اپنے ساتھ لیے باہر کا رخ کیا جہاں رات کا ندیہ راہ طرف پھیل چکا تھا۔

”یہ بچے پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں“، عابدہ بیگم نے فکر مندی سے خود کلامی کرتے کلاک پر گیارہ بجتے دیکھ کر پھر سے زارون کا نمبر ڈائل کیا۔

”بند کر دیا؟ ایک تو یہ لڑکا کبھی بھی وقت پہ کال رسیو نہیں کرتا“، اُسے چھوڑتے انہوں نے نور کا نمبر ڈائل کیا تو دوسرا جانب موبائل بند پا کر انہیں مزید پریشانی ہوئی۔

”اگر لیٹ آنا تھا تو انسان کم از کم گھر اطلاع دے دیتا ہے“، منه میں بڑھاتے انہوں نے پھر سے زارون کا نمبر ڈائل کیا تو ان کی بے چینی دیکھ کر احمد صاحب نے ٹوی کی آواز آہستہ کرتے انہیں مخاطب کیا۔

”کیا ہوا ہے بھئی؟ کسی بات کی پریشانی ہے تو مجھے بتاؤ“، انہیں کمرے میں ادھر ادھر چکر کا ٹاد دیکھ کر احمد صاحب نے ان کی طرف دیکھا جو موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر ان کے قریب آچکی تھیں۔

”زارون اور نور دو پھر سے ارجمند کے بر تھوڑے کا بول کے گئے ہیں اور ابھی تک واپس نہیں آئے اور نہ ہی میری کال ریسیو کر رہے ہیں“، چہرے پر فکر مندی سجائے انہوں نے احمد صاحب کو اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے آجائیں گے ابھی کچھ دیر میں اور آپ کو بچوں کا پتا ہی ہے جب اکٹھے ہوتے تو ماباپ کو بالکل ہی بھول جاتے ہیں“، ان کی بات سننے احمد صاحب نے انہیں مطمئن رہنے کا کہتے خود اپنا موبائل اٹھاتے زارون کو کال کی تاکہ ان کی تسلی کے لیے اُس سے واپسی کا پوچھ سکیں۔ ”ہاں بھی کہاں ہو اور کب تک واپسی کا ارادا ہے؟“، زارون کے کال ریسیو کرنے پر احمد صاحب نے سلام و دعا کے بعد سوال کیا۔

”جی ابو بس آرہے ہیں“، ایک نظر ارجمند کی طرف دیکھتے اُس نے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ جلدی پہنچ جاؤ تمہاری ماں پریشان ہو رہی ہے“، اُس کی بات سننے احمد صاحب نے عابدہ بیگم کے گھورنے کے باوجود بھی زارون سے کہا جو بس دس منٹ تک پہنچنے کا بتاتے کال بند کر گیا۔

”دس منٹ میں آر ہے ہیں اس لیے آپ یہ پریشان ہو نابند کریں اور جائیں میرے لیے چائے بناؤ کر لائیں“، ریبوت سے آواز اونچی کرتے احمد صاحب نے ان کے گھورنے کی پرواکیے بناء کہا تو عابدہ بیگم خاموشی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئیں۔

”توبہ ہیں ان عورتوں سے۔ چھوٹی سی بات پر پریشان ہو کر دوسروں کا بھی دماغ خراب کر دیتی ہیں“، ان کے جاتے ہی خود کلامی کرتے وہ پوری طرح ٹوٹی کی جانب متوجہ ہوئے جہاں ایک سیاسی پارٹی کے درمیان فائرنگ کی خبر چل رہی تھی۔

-----

نور کی آنکھ کھلی تو خود کو ایک انجان جگہ پا کر اس نے اپنے بھاری ہوتے سر کو با مشکل اٹھاتے کمرے میں چاروں طرف دیکھا۔

”زار کہاں ہیں آپ؟“ آنکھوں کو زور سے بند کر کہ کھولتے اُس نے اُسے پکارا۔ ”زار...“ سر جھکلتے اُس نے اپنے دماغ پہ زور دیتے پھر سے انجان نظروں سے اُس کمرے کو دیکھا۔

”کہاں ہوں میں؟ زار؟“ کچھ دیر پہلے اپنے ساتھ ہونے والے واقعہ کا یاد آتے ہی اُس نے چکراتے ہوئے سر کے ساتھ دروازے کے طرف قدم بڑھائے۔ ”کھولو...“ پھر سے بند ہوتی آنکھوں کو بامشکل کھولتے اُس نے دروازے پہ ہاتھ مارا۔

”زار کہاں ہیں آپ؟ پلیز مجھے یہاں سے نکالیں،“ خود کو کسی کی قید میں محسوس کرتے اُس نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے۔

”نکالو مجھے یہاں سے۔ کون ہو تم لوگ؟“ دروزے پر پورے زور سے ہاتھ مارتے وہ اوپھی آواز میں چلائی تو شور کی آواز پر شکور جو اسے ہی دیکھنے آیا تھا کمرے کی جانب بڑھا۔

”کون ہو تم؟“ کمرے کا دروازہ کھلا تو کسی آدمی کو اندر آتا دیکھ کروہ جلدی سے پیچھے ہوئی۔

”میں جو بھی ہوں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا بس اپنی زبان بند رکھو اور خاموشی سے بیٹھ جاؤ،“ انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے اُس نے نور کی طرف قدم بڑھائے تو وہ اپنے دوپٹہ ٹھیک کرتے مزید پیچھے ہوئی۔

”میرے قریب مت آنا،“ خود کو ایک کمرے میں غیر مرد کے ساتھ دیکھ کروہ اندر تک کانپ چکی تھی۔

”میں نے کہا ناجھ سے دور رہو“، لرزتے ہوئے بھی اُس نے پوری قوت سے چلاتے اُسے اپنے  
قریب آنے سے روکا جو چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ سجائے قدم آگے بڑھا رہا تھا۔

”اففف بہت مغورو اور خوبصورت ہو تم، اسی لیے سائیں اس قدر بے قرار تھے“، اُس کے  
قریب آتے دیوار پہ ہاتھ رکھتے وہ اُس کے اوپر جھکا تو نور نے پوری طاقت سے اُسے دھکا دیا۔

”میں تمہارا منہ توڑ دوں گی“، آنکھوں میں آتے آنسوؤں کے باوجود بھی اُس نے ہمت نہ ہارتے  
ہوئے شکور کو آنکھیں دکھائیں تو وہ اپنی تذلیل پر غصے سے غراتے ہوئے اُس کی جانب بڑھا۔

”تو سالی میرا منہ توڑے گی؟ اتنی ہمت ہے تجھ میں؟“ اُس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑتے  
شکور نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اُس کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ مارا۔

”اب بول بہت زبان چل رہی تھی ناتیری؟“ اُس کا چہرہ اپنے قریب کرتے شکور نے اُس کے اوپر  
جھکنے کی کوشش کی پر اُس سے پہلے ہی نور نے اُس کے ارادے کو بھانپتے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھا۔

”غلیظ انسان چھوڑو مجھے“، اپنی پوری جان لگاتے اُس نے شکور کو اپنے آپ سے دور کیا جو مراد شاہ  
کی بات کو بالکل فراموش کیے اُس پہ قابض ہونے کی کوشش میں لگا تھا پر اپنی نام کی پکار پر ایک دم  
سے پیچھے ہٹا۔

”شکور بھائی سائیں کافون آرہا ہے“، کمرے کے دروازے میں آتے رفیق نے ایک نظر اس سہمی کھڑی لڑکی کو دیکھتے اسے مخاطب کیا۔

”سائیں؟ مراد سائیں کا؟“ اس کی بات سنتے جلدی سے اس کے قریب آتے شکور نے موبائل اس کے ہاتھ سے پکڑا جو باغور اس کے چہرے پر ہوا یا اُڑی دیکھ کر معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”ہاں مراد سائیں کا ہی تھا“، کال بند ہوتے اس نے نظریں اس کی لڑکی پہنکائے شکور کو بتایا جو خود باہر آتے دروازے بند کر چکا تھا۔

”تو تم اٹھا لیتے۔ اب سائیں نے مجھے بولنا ہے“، اسے مشکوک نظروں سے خود کو دیکھتا پا کر شکور نے بات بدلتی اور مراد شاہ کا نمبر ڈائل کرتے باہر کی جانب بڑھا تو رفیق نے بھی کندھے اچکاتے باہر کا رخ کیا۔

-----  
اس آدمی کے جاتے ہی نور نے خوف سے نیچے زمین پر بیٹھتے ایک نظر بند روزے کو دیکھا۔

”زار پلیز مجھے یہاں سے لے جائیں“، اپنے گال پہ ہاتھ رکھتے تکلیف سے زیادہ اُس آدمی کی غلیظ نظروں اور حرکت پر گھبراتے اُس نے زارون کو پکارتے ہی رونا شروع کر دیا۔

”اللہ پاک پلیز مجھے بچالیں۔ مجھ میں اب لوگوں کی باتیں برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے“، خود کلامی کرتے اُس نے سر گھٹنوں پر رکھا اور مزید سمٹ کر بیٹھی۔

”کیوں، کیوں ہر بار میرے ساتھ ہی ایسا ہوتا ہے؟ پہلے بابا مجھ سے خفا ہوئے۔ ایک رات نے میری عزت کو خاک میں ملا دیا اور اب بناء کسی قصور کہ یہ لوگ مجھے یوں بار بار لوگوں کی نظروں کرتے ہیں آپ میرے ساتھ ایسا؟ کیا میں اتنی بُری ہوں جو آپ مجھے یوں بار بار لوگوں کی نظروں میں گردانیتے ہیں؟ بتائیں مجھے کیا قصور تھا اب میرا؟“، سر اٹھا کر اوپر چھت کو دیکھتے اُس نے اللہ سے شکوہ کیا۔

”بابا تو میرے تھے نا؟ انہوں نے میرا یقین نہیں کیا تو اب اس اندھیری رات کے بعد زارون میرا یقین کیسے کریں گے؟ میں کیا بتاؤں گی انہیں؟“، اپنے بال دونوں ہاتھوں سے جکڑتے اُس کے دل میں کئی وسو سے پیدا ہوئے اور ایک بار پھر سے رشتوں کی بے اعتباری کا ڈر اُسے اندر تک خوف زدہ کر گیا۔

”نہیں زارا یسے نہیں ہیں۔ وہ مجھ سے بہت پیار...“، منه میں بڑ بڑاتے وہ ایک دم سے رکی۔

”پیار؟“ اپنے الفاظ کو پھر سے دہراتے ایک تنخ مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پہ بکھری۔

”بaba بھی تو پیار ہی کرتے تھے مگر...“ الفاظ اُس کے گلے میں اٹکے تو اُس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو رگڑتے ہمت کی اور اٹھ کر کمرے کی تلاشی لینے لگی کہ شاید یہاں سے فرار کی کوئی تدبیر اُس کے ہاتھ لگ سکے۔

-----

”کیا مطلب غائب ہو گئی؟ کہاں غائب ہو گئی؟“ نور کی بجائے ارحم کو زارون کے ساتھ آتا دیکھ کر عابدہ بیگم نے اُس کے متعلق پوچھا تو ارحم نے انہیں ریسٹورنٹ سے نور کی گمشدگی کے بارے میں بتایا۔

”تم لوگ کہاں تھے اور ایسے کیسے وہ کہیں جاسکتی ہے؟“ عابدہ بیگم کو لگا کہ نور خود کہیں گئی ہے تب ہی انہوں نے بے یقینی سے لفی میں سر ہلا�ا۔

”انہیں وہ خود نہیں گئی۔ مطلب مجھے یقین ہے کہ اُسے کسی اور نے وہاں سے غائب کیا ہے“، اُن کی بات کی درستگی کرتے زارون نے صفائی دی تو شور کی آواز پر احمد صاحب بھی اپنے کمرے سے باہر آئے۔

”کیا ہوا؟ تم لوگ اتنے پریشان کیوں ہو؟“، زارون کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر انہوں نے عابدہ بیگم کی جانب دیکھا جن کے تاثرات سے فکر مندی صاف ظاہر ہو رہی تھی۔

”وہ انکل ہم ریسٹورنٹ کئے تھے تو نور رابعہ کو بتا کر ہاں سے باہر آنٹی کی کال ریسیو کرنے لگی اور پھر واپس نہیں آئی، مطلب اُسے کسی نے وہاں سے غائب کر دیا“، احمد صاحب کے پوچھنے پر احمد نے پوری تفصیل سے انہیں آگاہ کیا۔ ”ریسٹورنٹ سے کیسے کوئی کسی کواغوا کر سکتا ہے؟ مطلب وہاں ویٹر زہوتے ہیں، ریسٹورنٹ کا استاف اور لوگ بھی ہوتے، اب توہر جگہ کیمرے لگے ہوئے ہیں پھر ایسے کیسے کوئی اُسے اتنی آسانی سے لے گیا؟“، اس کی بات سننے کے بعد احمد صاحب نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا موقف پیش کیا تو احمد نے انہیں کیمرے بند ہونے کے متعلق بتایا اور لوگوں اور ویٹر ز کے بارے میں بھی جن سے اُن کے علاوہ پولیس نے بھی پوچھ گچھ کی تھی۔

”مطلب کہ وہاں کا کوئی بندہ ساتھ ملا تھا جو ایسے پیلک پیلیس پہ کسی نے اتنی آسانی سے نور کو غائب کر دیا، پر کیوں؟ کوئی ایسا کیوں کرے گا؟ نور کی کسی کے ساتھ کیا دشمنی؟“، ماتھے پہ بل لیے احمد صاحب جو کافی سمجھدار اور معاملہ فہم انسان تھے، اُن کو ایسے ایک دم سے نور کا غائب ہونا ہضم نہیں ہوا۔

”پتا نہیں پر آپ تو جانتے ہیں پہلے بھی نور اور زارون جب ساتھ باہر رہے تھے تو کچھ لوگوں نے نور کو انداز کرنے کے لیے ہی ان پہ حملہ کیا تھا اور اب بھی یہ کام مجھے ان ہی لوگوں کا لگ رہا ہے“، زارون کو خاموشی سے سیڑھیوں کی جانب جاتا دیکھ کر احمد صاحب کو خود ہی سارے حالات سے آگاہ کرتے پولیس سے مدد لینے کے بارے میں بتایا تو عابدہ بیگم ایک نئی مصیبت پہ اپنا سر پکڑتے صوفے پہ بیٹھ گئیں۔

”پتا نہیں کیا لکھا ہے میرے بچ کی قسمت میں پہلے اتنی جلدی شادی وہ بھی ایک انجان لڑکی سے اور اب یہ ڈرامہ“، عابدہ بیگم جن کا دل نور کے خود کہیں جانے پر ایمان نہیں رکھ رہا تھا مگر ایسے رش والی جگہ سے اتنی آسانی سے غائب ہو جانا ان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

”عابدہ بیگم خود کو سنبھالو اور دعا کرو کہ اللہ پاک ہمارے گھر اور بیٹیے دونوں کی عزت کی حفاظت کرے“، ان کی بد گمانی پر ٹوکتے احمد صاحب نے ارحام سے مزید کچھ سوالات کیے جن کا جواب دیتے وہ عابدہ بیگم کو دعا کرنے کا کہتے سیڑھیاں چڑھتے زارون کے کمرے میں اُس کے پاس چلا گیا۔

”مجھے تو پہلے دن سے ہی یہ لڑکی ٹھیک نہیں لگ رہی تھی مگر میں نے آپ کی اور زارون کی خاطر اُسے بیٹیوں کی طرح پیار دیا کہ ماں باپ سے بے اعتبار ہو کر آئی ہے اور اگر میں بھی اُس کے ساتھ

ایسا کروں گی تو وہ بالکل ٹوٹ جائے گی پر! مجھے کیا پتا تھا کہ میں بھوکوبی بن کر اس کی صورت آستین میں سانپ پال رہی ہوں،“، ارحم کے جاتے ہی عابدہ بیگم جوزارون کی زرد پڑتی رنگت کو دیکھتے پریشان ہو گئی تھیں انہوں نے ساس ہونے کا حق ادا کرتے سارا ملبہ نور پہ ڈالا۔

”بیٹی؟ اگر بیٹی مانتی ہو تیں تو اب تک آپ جائے نماز پہ ہو تیں نہ کہ یوں اُس بچی پہ الزام تراشی کر تیں اور میں نے آپ کو کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایسے بغیر سوچ سمجھے کسی پہ کوئی بات نہ کیا کریں کیونکہ یہ عمل بہتان کے مترادف ہے،“، عابدہ بیگم کے عقل پر پردے پڑ جانے پر غصہ ہوتے احمد صاحب نے اُن کی رہنمائی کی جو بعض اوقات معاملے کو سمجھتے ہوئے بھی بس اُس کے ایک ہی پہلو پر نظر رکھتیں۔

”مطلوب آپ کو بھی یہی لگتا ہے کہ ارحم سچ کہہ رہا ہے؟“ اُن کی بات پر نرم پڑتے انہوں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں، کیونکہ جو کچھ اُس نے بتایا اُس سے مجھے یہی لگ رہا اور نور پچھلے چھ، سات مہینوں سے ہمارے ساتھ رہ رہی ہے۔ آپ بتائیں آپ نے کبھی اُس میں کوئی ایسی بات دیکھی یا محسوس کی؟“ اُن کے قریب صوفے پر بیٹھتے احمد صاحب نے اُن کی بد گمانی دور کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔ ہاں وہ ابھی اپنے رشتے کو اُس طرح قبول نہیں کر پائی جیسے کرنا چاہیے مگر وہ بالکل معصوم ہے“، اُن کا سوال سنتے عابدہ بیگم نے کچھ منٹ پہلے اپنی زبان سے نکلے الفاظ پر شرمندگی سے سر جھکایا۔

”تو پھر آپ نے اتنی بڑی بات کیوں کی؟ مجھے آپ سے ایسی امید بالکل نہیں تھی“، اُن کے منہ سے نور کی تعریف سنتے احمد صاحب نے افسوس سے ایک نظر ان پہ ڈالی اور انہیں ویسے ہی پشیمان چھوڑے اُٹھ کر سیڑھیوں کی جانب بڑھے تاکہ زارون کو دیکھ سکیں جو انہیں کافی پریشان لگ رہا تھا۔

-----  
”بابا سمیں..“ دروازے پر دستک دیتے مراد شاہ نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔

”مراد اندر آؤ باہر کیوں کھڑے ہو“، اپنے بندے سے بات کرتے کرتے وہ اُس کی جانب متوجہ ہوئے جو ابھی تک دروازے کی چوکھت میں کھڑا تھا۔

”وہ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی“، کمرے کی اندر قدم رکھتے اُس نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو حیدر شاہ نے اُس بندے کو ایک دو ضروری ہدایات دیتے جانے کا اشارہ کیا۔

”اوہ بیٹھو، سب خیریت ہے نا؟“ اُس کے رات بھر جا گئے کا اندازہ لگاتے حیدر شاہ نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”جب خیریت ہے بس میں واپس جانے کا پوچھنے آیا تھا“، اُن کے سامنے ہی نشت سنبھالتے اُس نے اپنا مدعا بیان کیا۔

”واپسی؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ آج رات یہاں سے لڑکیوں کا ایک ٹرک افغانستان جانا ہے اور اگر تمہیں یاد ہو تو ہم اسی سلسلے میں یہاں آئے تھے کہ سب کچھ ہماری اپنی نگرانی میں کرو اسکیں،“ اُس کی بات سنتے ہی غصے سے گرجتے حیدر شاہ نے اُس کی عقل پر افسوس کیا۔

”جاننا ہوں پر! میں یہاں مزید نہیں رک سکتا“، اپنی بے چینی کو دبے لفظوں میں بیان کرتے مراد شاہ نے اُن سے نظریں چراکھیں۔

”کیوں نہیں رک سکتے؟ اور یہ سب بے وقوفی والی باتیں تم اُس لڑکی کی وجہ سے کر رہے ہو نا؟“ اُس کے سرپر پہنچتے حیدر شاہ نے اپنے غصے کو ضبط کرتے پوچھا تو مراد شاہ نے ناچاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا جو ایک لڑکی کے پیچھے پاگل ہو کر یہاں اتنے بڑے کام کو اپنے عام اور ناتجربہ کار بندوں کے سرپر چھوڑ کے جانا چاہتے ہو، تاکہ وہ پولیس کے ہتھے چڑھتے ہی سب سے

پہلے ہمارا نام لیں،“، دانت پسیتے انہوں نے مراد شاہ کی ہٹ دھرمی پر اُسے اُس کی ذمہ داری کا احساس دلا یا۔

”پر بابا سائیں..“ ان کو بھڑکتے دیکھ کر مراد شاہ نے اپنی صفائی میں کچھ بولنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی حیدر شاہ نے ہاتھ اٹھاتے اُسے خاموش کروادیا۔

”پرور کچھ نہیں۔ بس میں نے جو کہہ دیا ہے تمہیں اُس پر عمل کرنا ہو گا اور پو لیس تو پہلے ہی تاک لائے بیٹھی کہ کب انہیں موقع ملے اور وہ یہ لڑکیوں کی اسمگنگ والے مسئلے کے اصل کرادروں تک پہنچے، اس لیے خدارا معاملے کی نزاکت کو سمجھو کہ اس دفعہ کوئی دس بارہ لڑکیوں کی نہیں بلکہ پوری پچاس لڑکیوں کی بات ہے جن میں سے ہر ایک کی قیمت دو کڑوڑ مقرر ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ اس بار کوئی بھی غلطی ہو،“ اُس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر اپنے لہجے کو نرم کرتے حیدر شاہ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو اپنے جبرلوں کو سمجھنے اُن کی تمام گفتگو بڑے تحمل سے سُن رہا تھا۔

”ٹھیک ہے میں رک جاتا ہوں پر کل تک آپ ان تمام معاملات کو نمٹالیں،“ غصے کے باوجود بھی مراد شاہ نے اپنی آواز پیچی رکھتے اُن سے درخواست کی جو آگے بڑھتے اُسے اپنے سینے سے لگانے۔ ”خفا ہو گئے ہو؟“ الگ ہو کر اُس کے چہرے کو دیکھتے حیدر شاہ نے نرمی سے پوچھا۔

”نہیں“، مختصر ساجواب دیتے مقابل نے اُن سے نظریں ملانا ضروری نہیں سمجھا۔ ”ہونا بھی مت کیونکہ تمہارے بابا سائیں کو اس وقت تمہاری اشد ضرورت ہے“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر تنبیہ کرتے حیدر شاہ نے چہرے پہ مسکراہٹ سجائی تو مراد شاہ نے بھی زبردستی مسکراتے اشبات میں سر ہلايا اور کسی کام کا بولتے اُن کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ ”یہ بڑھا بھی دن بادن کچھ زیادہ ہی سخت ہو گیا ہے“، کمرے میں آتے ہی ہاتھ میں پکڑا موبائل بیڈ پہ پھینکتے مراد شاہ نے اپنا غصہ نکالا۔

”بس جلد از جلد اس ٹیئر ہی ہڈی کا بھی کوئی پکا انتظام کرتا ہوں“، منه میں بڑبڑاتے مراد شاہ نے ایک اور دن اُس لڑکی سے دور رہنے پر کڑھتے ہوئے اپنی پیشانی کو مسلا اور کچھ دیر کمرے میں ٹھلنے کے بعد غصہ ٹھنڈا ہوتے ہی موبائل اٹھا کر شکور کو کال ملائی۔

-----

ساری رات اللہ سے شکوؤں اور شکایتوں کے بعد وہ روتے دھوتے وہیں بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔ ”لو جی، یہاں یہ میڈم سکون سے سوئی ہوئی ہیں اور وہاں ہمارے سائیں فکر میں ایسے نڈھاں ہو رہے

کہ پتا نہیں اب تک ہم نے اس کے ساتھ کون کون سے ظلم کر دیے ہوں،“ مراد شاہ کے کہنے پر وہ نور کو دیکھنے کمرے میں آیا تو وہ زمین پر لیٹی سور ہی تھی۔

”ویسے ہے بڑی ٹاپ کی چیز“، اُس کے قریب ہی نیچے بیٹھتے شکور نے ایک بھر پور نظر اُس کے سراپے پہ ڈالی جو خود پہ کسی کی نظروں کی تپش محسوس کرتے کچی نیند کی وجہ سے جلدی سے اٹھ کر بیٹھی۔

”تم؟ دور رہو مجھ سے“، اُس رات والے منحوس شخص پر نظر پڑتے ہی اُس نے جلدی سے اپنا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹنے خود کو اُس سے چھپانے کی کوشش کی۔

”آہ، دور ہی ہوں میری بلبل میں کب پاس آیا تمہارے؟“، نظروں میں خبات لیے اُس نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا تو نور نے پچھے ہٹتے خوف زدہ ہو کر اٹھنے کی کوشش کی۔

”کہاں جا رہی ہو؟ چپ کر کہ یہاں بیٹھو ورنہ میں تمہارا وہ حشر کروں گا کہ زندگی بھر یاد رکھو گی“، اُس کا رد ادا بھانپتے ہی شکور نے اُس کا بازو پکڑتے دھمکی دی۔

”میں تمہارا منہ تو ٹردوں گی“، اپنا بازو چھڑوانے کی کوشش کرتے اُس نے اُسے اپنی جانب جھکتا دیکھ کر مزاحمت کی۔

”میں کہہ رہی ہوں مجھ سے دور رہو“، شکور نے اپنی پیش رفت جاری رکھی تو نور نے زور سے اُس کے ہاتھ پہ کاٹتے اپنا بازو آزاد کر واپس کا دھیان اپنے سے ہٹتا دیکھ کر جلدی سے موقع ملتے ہی اٹھ کر کمرے کے کھلے دروازے کی جانب بھاگی۔

”بہت تیز ہے تو، پر یہ تیزی ادھر کام نہیں آئے گی“، اپنا ہاتھ جھٹکتے شکور نے اُس کے ہوشیاری دکھانے سے پہلے ہی پیچھے آتے اُس کے بالوں کو اپنی مٹھی میں جکڑتے پوری طاقت سے اُسے بیڈ پہنچا۔

”بابا...“، نور جس کی پیشانی سیدھی جا کر بیڈ کے کونے میں لگی تھی اُس نے درد سے چینختے ہوئے ظہیر صاحب کو پکارا تو اُس کے چہرے پہ آتی خون کی سرخ لکیروں کو دیکھتے شکور کے اوسان خط ہوئے۔

”یہ کیا ہو گیا“، گھبراہٹ کے مارے جلدی سے آگے بڑھتے اُس نے بیڈ کی چادر اٹھا کر اُس کی پیشانی پر رکھتے خون روکنے کی کوشش کی۔

”زار“، اپنی نیم و آنکھوں کو با مشکل کھولتے اُس نے زارون کو آواز دی اور درد کے باوجود بھی شکور کا ہاتھ جھٹکا جواب مراد شاہ سے اپنی شامت پر پھولتے ہوئے ہاتھ پاؤں سے اُسے ہوش میں رکھنے کی کوشش میں لگا تھا جو خون بہنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہوش و حواس کھو رہی تھی۔

”مجھ... سے... دور... رہو“، آنسو بے قرار ہو کر اُس کی آنکھوں سے نکلے تو اُس نے آخری بار ہمت نہ ہونے کی باوجود بھی اُس غلیظ انسان کا ہاتھ اپنی پیشانی سے ہٹانا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی اُس کے اعصاب اُس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

---

”زارون کیا ہوا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟“ ساری رات اللہ سے نور کے ملنے کی دعا نہیں کرنے اور بے چین رہنے کے بعد وہ اب نیچے آیا تو عابدہ بیگم نے اُس کے منع کرنے کے باوجود بھی زبردستی اُسے جو س پینے کا کہا جس کا ایک گھونٹ بھرتے ہی اُس کا دل بُری طرح سے گھبرا یاتا ہی وہ جو س وہیں چھوڑ کر اپنا موبائل اور کار کی چابی لیے باہر کی جانب بڑھا۔

”میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں“، پچھے پلٹے بناء ہی جواب دیتے اُس نے عابدہ بیگم کے مزید کوئی سوال پوچھنے سے پہلے گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیور نگ سیٹ سنبحا لتے اپنارخ پولیس اسٹیشن کی جانب کیا۔

”یا اللہ میرے بیٹے کی مدد کرنا۔ پتا نہیں کس کی نظر لگ گئی ہے ہماری خوشیوں کو“، گاڑی نظر وہ سے او جھل ہوئی تو عابدہ بیگم نے اندر آتے دعا کی اور گلاس اٹھاتے کچن کی جانب بڑھیں۔

---

”اللہ پاک پلیز آپ نور کی حفاظت کریے گاؤں سے کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا“، گاڑی کو فل سیپڈ میں چلاتے زارون کا دل وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مزید بے چین ہو رہا تھا۔

”میں ہی پاگل ہوں جب مجھے پتا تھا کہ اُسے پہلے بھی کسی نے اغوا کرنے کی کوشش کی ہے تو کیوں میں نے اُسے یوں اکیلا چھوڑا۔ کیوں میں نے اُس کی پروا نہیں کی“، آنکھوں میں آئی نمی سے اُس کی نظر دھندا تھا تو زارون نے گاڑی کی اسپیڈ آہستہ کرتے زور سے اسٹرنسنگ پر ہاتھ مارا۔

”نور پلیز ایک بار میرے پاس آجائو۔ میں اب کبھی بھی تمہاری ذات سے لا پروا نی نہیں برتؤں گا“، رسٹورنٹ میں اپنی بے دھیانی پر خود کو ملامت کرتے زارون نے ہمت کرتے ارحم کو کال کی جورات تین بجے کے قریب گھر گیا تھا۔

”ارحم میں پولیس اسٹیشن جا رہا ہوں تم بھی وہاں آجائو“، اُس کے ہیلو کہتے ہیں زارون نے اپنی بات کہی۔

”کیوں؟ نور کا پتا چل گیا ہے کیا؟“، اُس کی بات سنتے ارحم جو اُسے ہی کال کرنے والا تھا ایک دم خوشی سے بولا۔

”نہیں بس تم آجاؤ میرا دل بہت گھبر ار ہا ہے۔ پتا نہیں وہ کس حال میں ہو گی“، ضبط سے سرخ ہو تیں آنکھوں کو بند کر کہ کھولتے زارون نے دوسری جانب کہا اور اُسے جلدی آنے کی تاکید کرتے کال کاٹ دی۔

-----

”یہ کیا کیا تم نے؟ سائیں کو پتا چل گیا تو وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑیں گے“، شکور نے اُس لڑکی کے بے ہوش ہوتے ہی کچھ سمجھنہ آنے پر رفیق کو کال کر کے کمرے میں آنے کا بولا جس نے آتے ہی نور کو بے سدھ خون میں لت پت دیکھ کر گھبرائی ہوئی نظروں سے اُسے دیکھا جو اپنی جلد بازی اور ہوس کے چکر میں مراد شاہ کے غضب کو دعوت دے چکا تھا۔

”یار میں نے تمہیں یہاں ڈرانے کے لیے نہیں بلا یا اور سائیں آج نہیں آئیں گے اس لیے تم بے فکر رہو اور بس میری اس آفت سے جان چھڑوانے میں مدد کرو“، اُس کے چہرے پر ہوا یاں اڑی دیکھ کر شکور نے تھوک نگتے خود کو سنپھالا۔

”میں؟ میں کیا مدد کروں؟“، اُس کی بات پر بوکھلاتے رفیق نے نظریں پھیریں تو شکور نے چالا کی کا مظاہرہ کرتے اُسے دھمکایا۔

”یا رایسمت کر تو مراد سائیں کو جانتا ہے نا اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے اور یہ بات یاد رکھا گر مجھ پہ کوئی بات آئی تو میں بخشوں گا تمہیں بھی نہیں“، انگلی اٹھا کر تنبیہ کرتے شکور نے اُسے سوچ میں ڈالا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں حولی سے سیلمان کو بلاتا ہوں تو جب تک یہ چادر اس کی پیشانی پہ دبا کر رکھتا کہ مزید خون ضائع نہ ہو“، اُسکی خصلت کا پتا ہونے کی وجہ سے رفیق نے مزید انکار کی، بجائے اُس کی مدد کرنے میں ہی اپنی بھلانی سمجھی۔

”بس جلدی آجانا پہلے ہی بہت خون بہہ چکا ہے“، اپنی چالا کی کام آتی دیکھ کر شکور نے پریشانی سے اُسے تاکید کی جو اثبات میں سر ہلاتے باہر کی جانب بڑھاتا کہ جتنی جلدی ممکن ہو سیلمان کو حولی سے لاسکے جو تھوڑی بہت ڈاکٹری جاننے کے ساتھ ساتھ اُس کا دوست بھی تھا۔

-----

”کیا کر رہے ہیں آپ لوگ کل سے؟ پورے چودہ گھنٹے گزر چکے ہیں اور ابھی تک آپ کے پاس تسلی دینے کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔ میں آپ سے کہہ رہا ہوں اگر میری بیوی کو کچھ ہوا تو

میں آپ سب کا جینا حرام کر دوں گا،“ ڈی ایس پی کے منہ سے ابھی تک نور کا کچھ پتانہ چلنے کا سن کر زارون نے ایک دم سے بھڑکتے انہیں کھری کھری سنائی۔

”زارون پلیز یار خود کو سن بھالو“، ارحم جو ابھی چند منٹ پہلے ہی آیا تھا اُس نے کرسی سے اٹھتے اُسے سن بھالتے ڈی ایس پی سے معدرت کی جس کے ماتھے پر بل پڑ پکے تھے۔

”کیا سن بھالوں میں ہاں؟ مجھے پتا یہ لوگ سب اُن کے ساتھ ملے ہوئے ہیں“، ارحم کا ہاتھ جھٹکتے زارون نے ڈی ایس پی کی باتوں میں ہیرا پھیری پر غصے سے چلاتے اُسے پیچھے کیا جو اُس کو کمرے سے باہر لے جانا چاہتا تھا۔

”ارحم سر پلیز اپنے دوست کو سمجھائیں کہ ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہے ہیں پر ایسے معاملوں میں کچھ وقت لگتا ہے“، ہاشم صاحب کی وجہ سے زارون کی بد تمیزی برداشت کرتے ڈی ایس پی نے بڑے تحمل کے ساتھ انہیں اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کی۔

”جی میں جانتا ہوں اور اس کی طرف سے میں آپ سے معدرت کرتا ہوں۔ وہ دراصل پریشان ہے اس لیے ایسی بات کر گیا“، ڈی ایس پی کی بات سنتے زارون نے ایک سخت نظر اس پر ڈالتے باہر کا رخ کیا تو ارحم نے اُن سے معدرت کی۔ ”جی میں سمجھ سکتا ہوں پر یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں اس لیے پلیزان کو سمجھائیں کہ حوصلہ رکھیں ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہیں ہیں

اور ان شاء اللہ آپ کی بہن جلد ہی آپ کو مل جائے گی، اُس کی بات پر مسکراتے ڈی ایس پی نے زارون کی حالت سمجھتے ارجم کو تسلی دی جو ان سے اپنی پیش رفت مزید بڑھانے کا کہتے اجازت لیتے کمرے سے باہر نکلا تاکہ اپنے پاگل دوست کو دیکھ سکے جو غصے میں پتا نہیں اندر کیا کچھ بول آیا تھا۔

”تم یہاں بیٹھے ہو؟ اور میں وہاں اندر تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا ہوں“، گاڑی کے قریب آتے اُسے خاموشی سے وہاں بیٹھا دیکھ کر ارجمنے ایک گہری سانس لی۔

”یار پلیز تمہارے پریشان ہونے سے کیا نور مل جائے گی؟ یا پھر یہ مسئلہ حل ہو جائے گا؟“ دوسری جانب جاتے ارجمنے ڈرائیونگ سیٹ سن بھالتے ہی اُسے پر سکون کرنے کی کوشش کی جس کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو چکا تھا۔

”مجھے ریسٹورنٹ جانا ہے“، اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے زارون نے اُس سے نظریں ملائے بغیر اپنا ارادہ بتایا۔

”ریسٹورنٹ؟ وہاں کیا ہے اب؟“، اُس کی بات سنتے ارجمنے گاڑی اسٹارٹ کرتے پولیس اسٹیشن سے باہر نکلتے سوال کیا۔

”بس مجھے وہاں جانا ہے اور پلیز میں کچھ دیر خاموش رہنا چاہتا ہوں“، اُسے مزید کسی سوال کے لیے منہ کھولتا دیکھ کر زارون نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے اپنا فیصلہ سنایا تو ارجمنے چپ

کرتے گاڑی کارخ ریسٹورنٹ کی جانب کیا جہاں پر جانے کا مقصد زارون کو خود بھی معلوم نہیں تھا۔

---

”زارون کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہونا؟“ ارحام نے ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روکی تو زارون کو ایک دم سے بونٹ پر ہاتھ رکھے رکناد یکھ کر اُس کی جانب بڑھا۔

”کیا ہوا؟ مجھے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی،“ اُس کا ہاتھ تھامتے ارحام نے اُس کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھتے فکر مندی کا انظہار کیا۔

”نہیں، ٹھیک ہوں میں،“ اپنا سر جھشکتے اُس نے ارحام کو تسلی دی جو چہرے پر پریشانی لیے ابھی تک اُس کا ہاتھ پکڑے کھڑا تھا۔

”چلو اندر چلتے ہیں،“ زارون نے پیٹ میں اٹھنے والے درد کو فراموش کرتے اُس سے کہا تو ارحام نے اثبات میں سر ہلاتے اُس کا ہاتھ پکڑے ہی اندر کارخ کیا۔ ”زارون مجھے تم ٹھیک نہیں لگ

رہے۔ چلو پہلے کسی ڈاکٹر کو دکھالیتے ہیں پھر یہاں آجائیں گے، ارحم نے اُس کے ٹھنڈے ہوتے ہاتھ کو محسوس کرتے اصرار کیا۔

”یار کچھ نہیں ہوا مجھے بس تم میری فکر چھوڑ اور پلیز نور کے بارے میں کسی سے پوچھو“، اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے نکالتے زارون نے ہمت نہ ہونے کے باوجود بھی صرف ارحم کی تسلی کے لیے خود چلتے اپنا رخ کا وضٹر کی جانب کیا۔ ”یہاں سے کس سے پوچھیں؟ اُس دن بھی ہمیں ان لوگوں سے کسی قسم کی کوئی معلومات نہیں ملی تھی“، اُس کے پیچھے ہی قدم اٹھاتے ارحم نے اپنی بات کہی۔

”اُس دن نہیں ملا تو شاید آج کچھ مل جائے تم پلیزا یہی ناامیدی والی باتیں چھوڑ کے میری مدد کرو اور باہر جاؤ جا کر دیکھو ہو سکتا ہے کسی اور شاپ کے باہر کوئی کیمرہ وغیرہ لگا ہو“، اُس کی بات پر خفا ہوتے زارون نے تھوڑے غصہ سے کہا تو اُس کی بات سنتے ارحم کو اُس دن ساتھ دوشاپس چھوڑ کر تیسرا شاپ کے باہر لگے کیمرے کے بارے میں یاد آیا جس پر اُس کی نظر سرسری طور پر پڑی تھی۔

”کیمرہ..“، پر سونچ اندازہ میں کہتے اُس کے دماغ نے کام کیا تو اُس نے زارون کو جواب دینے کی بجائے اُسے ساتھ آنے کا کہتے اپنا رخ باہر کی جانب کیا۔

”یہ دیکھو یہاں لگا ہے۔ یہ تو میں نے اُس دن واپسی پر دیکھا تھا پر پریشانی میں میرا دماغ کام ہی نہیں کیا“، دوشاب چھوڑ کر تیسری پہ آتے ارحم نے دروازے کے باہر لگے کیمرے کی جانب اشارہ کیا تو زارون نے اک امید کی کرن نظر آنے پر اپنا تمام درد بھلاتے جلدی سے اندر داخل ہوتے اُس موبائل شاپ پر موجود لڑکے کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

”السلام علیکم بھائی مجھے اس شاپ کے مالک سے ملنا ہے۔ کیا وہ یہیں ہیں؟“ اُس لڑکے کے یوینفارم سے اُس کے اسٹینٹ ہونے کا اندازہ لگاتے زارون نے بڑے تحمل سے پوچھا۔ ”جی وہ یہیں ہیں“، شاپ پر ایک جانب بیٹھے تقریباً پچاس سال کے لگ بھگ مرد کی جانب اشارہ کرتے اُس نے زارون کو جواب دیا جو اُس کی بات سنتے ہی اُس شخص کی جانب بڑھا جو چہرے سے کافی معزز دیکھائی دے رہا تھا۔

”السلام علیکم سر“، اُن کے قریب پہنچتے زارون نے سلام کیا تو ارحم بھی اُس کے پیچھے آیا۔ ”وَ عَلَيْكُمُ السَّلَامُ بِيَدِيْهِنِ بِيَدِيْهِنِ بِيَدِيْهِنِ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں“، ایک نظر اُن دونوں کی طرف دیکھتے اُس شخص نے اپنے ہاتھ میں پکڑی تسبیح ٹیبل پر رکھی۔

”وہ سر مجھے آپ کی کچھ مدد چاہیے تھی“، اُن کے سامنے نشست سن بھالتے زارون نے زیادہ ہیر پھیر کی بجائے اصل بات پر آتے بتایا۔

”کیسی مدد؟“ حامی بھرنے کی بجائے انہوں نے پہلے معااملے کی نوعیت جاننا مناسب سمجھا۔

”وہ انکل کل شام میں میرا یہ دوست اور ہماری بیویاں ساتھ موجود ریسٹورنٹ میں ایک بر تھ پارٹی کے لیے آئے تھے۔ ہم سب ہال میں موجود تھے جب میری بیوی فون سننے باہر آئی اور اُس کے بعد سے اُس کی کوئی خبر نہیں۔ ہم نے ریسٹورنٹ میں لگے کیمروں کی ریکارڈنگ چیک کی پر وہاں سے اُس وقت کی فوٹج گائے ہے۔ مطلب ہمیں یہ لگ رہا کہ میری بیوی کے غائب ہونے میں ریسٹورنٹ کے کسی بندے کا بھی ہاتھ ہے جس نے عین اُس وقت تمام سسٹم بند کر دیا،“ زارون نے اپنی بات کا آغاز کیا تو ساری بات تفصیل سے اُس شخص کو سمجھائی۔

”بہت افسوس کی بات ہے۔ اللہ پاک آپ کی بیوی کی حفاظت کرے، توبہ توبہ افسوس ہے لوگ پسے کے لیے کچھ بھی کر جاتے ہیں،“ اُس کی بات مکمل ہوئی تو اُس شخص نے افسوس کرتے کانوں کو ہاتھ لگاتے نور کے خیریت سے ہونے کی دعا دی۔

”بتائیں اب میں اس سلسلے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟“ زارون اور ارحمن نے ایک ساتھ اُس کی دعا پہ آمین کھا تو اُس شخص نے سوالیہ نظر وہ سے انہیں دیکھا۔

”سر ہمیں بس آپ کی شاپ کے باہر لگے کہرے کی کل شام کی ریکارڈنگ دیکھنی ہے۔ ہو سکتا ہے اُس سے ہمیں کچھ معلوم ہو سکے“، اپنے مقصد کے بارے میں بتاتے زارون نے اجازت طلب نظرؤں سے انہیں دیکھا جو اُس کی بات سنتے دوسینڈ کے لیے خاموش ہو گئے۔

”ٹھیک ہے۔ میں ایسے کسی کو اجازت دیتا تو انہیں پر معاملہ ایک بیٹی کا ہے اس لیے میں آپ کو دکھا دیتا ہوں“، کچھ سوچتے ہوئے انہوں نے کپیوٹر پر موجود لڑکے کو آواز دیتے اُسے اُن دونوں کو کل والی ریکارڈنگ دکھانے کا بولا۔

”بہت شکر یہ سر میں آپ کا یہ احسان پوری زندگی نہیں بھولوں گا“، اُن کی اجازت پر ایک امید زارون کے دل میں جاگی تو اُس نے عاجزی کے ساتھ اُس شخص کا شکر یہ ادا کیا جنہوں نے مسکراتے ہوئے اُسے دعا دی اور ایک اور کسٹمر کے قریب آنے پر انہیں دوسری جانب اُس لڑکے کے پاس جانے کا اشارہ کیا۔

-----

”کیا ہوا؟ کہیں مر مارا تو نہیں گئی؟“، سلیمان نے آتے ہی اُس کی نبض چیک کرتے ماتھے پہ تیوری ڈالے اُس کی پیشانی کے زخم کا جائزہ لیا تو شکور نے اپنی خراب ہوتی حالات پر قابو پاتے تھوک نگلا۔

”نہیں زندہ ہے ابھی“، اُسے مطمئن کرتے اُس نے زخم صاف کرنا شروع کیا تو ان دونوں کی جان میں جان آئی۔

”زندہ ہے؟ تو! پھر اتنی دیر سے ہوش میں کیوں نہیں آ رہی؟“ اُس کی بات سننے اب کی بار رفیق نے پچھلے آدھے گھنٹے سے اپنا خون خشک ہونے پر بے زاری کا اظہار کیا۔

”زخم اتنا گہرا نہیں ہے پربی پی کافی لو ہے اس وجہ سے ہوش میں نہیں آ رہی۔ کب سے ہے یہ یہاں؟ اور تم لوگوں نے اسے کچھ کھلا یا پلا یا تھا؟“ زخم پہ پڑی کرنے کے بعد سیلمان نے آپر میں لگا کر اُس کا بی پی چیک کرتے کچھ ضروری سوال پوچھے۔

”کل شام سے ہے اور کھلا یا پلا یا تو کچھ نہیں“، اُس کی بات سننے شکور نے اپنی عقل پر پردے پڑ جانے پر شرمندگی سے بتایا۔

”اسی لیے ہوش نہیں آ رہا۔ ایک تو بی پی لو ہے اوپر سے کمزوری“، آپر میں اُتارتے اُس نے اپنے بیگ سے سرخ نکالی اور اُس میں دو تین انجکشن اپنی سمجھ کے مطابق بھر کر نور کی بازو میں لگایا۔

”بس اب اسے کچھ دیر آرام کرنے دو اور اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر ہوش نہ آئے تو مجھے بتادینا میں پھر سے آکر چیک کر لوں گا“، اپنی تمام چیزیں بیگ میں رکھتے اُس نے ایک بھر پور نظر اُس سوئی

ہوتی لڑکی پہ ڈالی جس کا گلابی رنگ اور خوبصورت خدوخال اُس کے دل و دماغ میں نقش ہو رہے تھے۔

”ٹھیک ہے بتادیں گے اور یہ سائیں مراد کی امانت ہے اس لیے اپنی نظروں کو تھوڑا جھکا کر رکھو“، رفیق نے اُس کے چہرے پہ بکھرتی شیطانیت دیکھ کر باوار کروا یا تو سیلمان نے جلدی سے اپنی نظروں کا زدایہ بدلا۔

”ہونہہ تو پہلے بتاتے، ویسے ہے بڑی مست چیز“، پھر سے ایک نظر اُس کے سراپے پہ ڈالتے اُس نے ٹھنڈی آہ بھری تو شکور نے اُس کی نیت خراب ہوتی دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔

”شرم کر واور بے فکر رہو تم نے ہماری مدد کی ہے نا تو ہم بھی تمہارا حصہ تمہیں ضرور دیں گے بس ایک بار مراد سائیں اپنی حسرت پوری کر لیں پھر تو یہ مال ہمارے ہی کام آنا“، رفیق نے آگے بڑھتے اُسے تسلی دی تو سیلمان کے ساتھ ساتھ شکور کے چہرے پہ بھی ایک خباثت بھری مسکراہٹ بکھری۔

-----  
”ایک سینڈ...“ ویڈیو دیکھتے تقریباً 5 بجے کے قریب نور ریஸٹورنٹ سے باہر آتی نظر آئی توار حم نے اُس لڑکے کو روکنے کا کہا۔

”یہ نور ہی ہے نا؟“، تصویر کو خود ہی زوم کرتے اُس نے زارون کی طرف دیکھا۔

”ہاں نور ہی ہے“، حیرت سے اثبات میں سر ہلاتے اُس نے لڑکے کو ویڈیو پھر سے پلے کرنے کا کہما۔

”یہ، یہ کون ہیں؟“، کچھ سینٹ بعد ایک گاڑی کو اُس کے قریب رکتا دیکھ کر زارون کے ساتھ ساتھ ارحم کے چہرے پہ بھی ناگواری آئی۔

”ایک سینٹ روکیں“، گاڑی سے نکل کر ایک آدمی نے نور کے منہ پہ رومال رکھتے اُسے جلدی سے گاڑی میں ڈالا تو زارون نے پھر سے ویڈیو روکنے کا کہاتا کہ گاڑی کا نمبر دیکھ سکے۔

”اس پہ تو کوئی نمبر نہیں ہے“، ویڈیو کو روک روک کے ہر اینگل سے اُس کا جائزہ لیتے ان دونوں نے کافی کوشش کی کہ کوئی سراغ ان کے ہاتھ لگ جائے پر ان آدمیوں کے چہروں پہ نقاب کے ساتھ ساتھ گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی غائب تھی۔

”ایک امید تھی وہ بھی ختم“، تقریباً ایک گھنٹے تک ریکارڈنگ کو بار بار دیکھنے کے بعد بھی جب کوئی سر ان کے ہاتھ نہ لگا تو زارون نے مایوسی سے اپنا سر تھاما۔

”اچھا تم پریشان نہ ہوا اگر اللہ پاک نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہے نا تو وہ ہمیں نور تک بھی بہت جلد پہنچا دے گا اس لیے پلیز تم ہمت مت ہارو اور اُس ذات پہ امید رکھو جو انسان کو انہیں میں بھی

کوئی نہ کوئی راہ دیکھا دیتی ہے، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ارحم نے تسلی دی تو اُس شاپ کا مالک بھی اُن کے قریب آیا۔

”جی بیٹا جی، کچھ پتا چلا کیا؟“ اُن دونوں سے مخاطب ہوتے اُس شخص نے سوالیہ نظر وہ سے اُنہیں دیکھا۔

”جی انکل یہ یقین ہو گیا ہے کہ میری بہن کو کسی نے اغوا کیا ہے پر یہ پتا نہیں چلا کہ وہ لوگ کون تھے۔ مطلب ایک تو ان لوگوں نے چہروں پہ نقاب چڑھائے ہیں اور سے گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی غائب ہے“، ارحم نے ویدیو میں دیکھی جانے والی تمام باتیں اُنہیں تفصیل سے بتائیں۔

”اوہ یہ تو بہت پریشانی والی بات ہے پر آپ حوصلہ رکھو اور ساتھ کوشش بھی جاری رکھو اللہ سب خیر کرے گا“، ہاتھ اٹھا کر دعا دیتے اُنہوں نے زارون کے کندھے پہ ہاتھ رکھے تھکی دی جو افسردگی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

”جی بس آپ دعا کریئے گا اور پلیز کیا ہمیں یہ ویدیو مل سکتی ہے؟“ ارحم نے بڑی اُس کے ساتھ ان نے اجازت طلب کی تو اُنہوں نے اُس لڑکے کو وہ ویدیو اُنہیں دینے کا کہا۔

”ہم آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولیں گے“، خود کو سنبھالتے زارون نے ان کا ایک بار پھر سے شکر یہ ادا کیا اور وید یومتے ہی اجازت طلب کرتے باہر کی جانب بڑھا تو ارحمنے بھی ان سے مصافحہ کرتے اُس کے پیچے ہی قدم بڑھائے۔

---

”رضا گر تمہارا آج کا لج جانے کا ارادہ نہیں ہے تو ہم آج نور کی طرف چکر لگائیں؟“ نائلہ بیگم نے اُس کے کمرے میں آتے اپنی خواہش کا اظہار کرتے اُس سے اس کی رائے لی۔

”جی میں لے جاؤں گا پر شام کو کیونکہ ابھی مجھے بابا کہ ایک دوست سے ملنے جانا ہے اسی لیے میں نے کا لج سے چھٹی کی ہے“، ان کی بات سنتے رضا نے انہیں اپنے اردائے سے آگاہ کیا۔

”کیوں ظہیر کے دوست سے تمہارا کیا کام؟ مطلب انہوں نے بلا یا ہے یا تم نے خود ان سے ملنا ہے؟“، اُس کا مقصد جانتے ہی نائلہ بیگم نے فکر مندی سے ایک ساتھ کئی سوال پوچھے۔

”جی انہوں نے بلا یا ہے۔ وہ بابا کی جگہ مجھے وہاں جا ب دینا چاہتے ہیں اس لیے انہیں کچھ ضروری کاغذات اور میرا تعلیمی ریکارڈ چاہیے تھا“، رضا جو ابھی یہ بات نائلہ بیگم کو بتانا نہیں چاہتا تھا مگر پھر

بھی زبان سے بے دھیانی سے ادا ہوئے الفاظ پر اُس نے جھوٹ کی بجائے تمام بات سچ سچ انہیں بتا دی۔

”جب؟ نہیں ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے؟ اور پڑھائی؟ صرف میٹرک کیا ہے تم نے اور اس بنیاد پر جو جاب ملنی اُس کی نوعیت میں اچھے سے جانتی ہوں اس لیے عمر سے پہلے بڑا بننے کی کوشش مت کرو اور اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو“، اُس کی بات سننے ہی نائلہ بیگم نے اُسے سختی سے منع کیا۔ ”پرماما میں جاب نہیں کروں گا تو آپ گھر کا سر کٹ کیسے چلا کیں گئی؟ مطلب بابا کی پیشش اتنی نہیں ہے کہ ہم لوگ اُس میں اچھے سے گزارا کر سکیں“، اُن کا ہاتھ پکڑتے رضا نے انہیں اپنی بات سے متفق کرنے کی کوشش کی۔

”جتنی بھی ہے میں گزارا کر لوں گی بس تم ان باتوں کی فکر چھوڑ و اور اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو۔ تمہارے بابا کی بھی یہی خواہش تھی کہ تم پڑھ لکھ کے اُن سے کہیں آگے بڑھوں لیے ابھی سے ایسی فکر میں پال کر خود کو ہلکا ن مت کرو“، اُس کے چہرے پر ہاتھ رکھتے نائلہ بیگم نے اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے کو ایک دم سے بڑا اور ذمہ دار ہوتے دیکھ کر آنکھوں میں نمی لیے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے جیسا آپ کہیں گی میں ویسا ہی کروں گا پر پلیز اب آپ روئے گامت“، ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے لبوں سے لگاتے رضانے اُس پہ بوسہ دیا تو نائلہ بیگم نے اُسے پریشان ہوتا دیکھ کر اپنی آنکھیں صاف کیں۔

”نہیں رور ہی بس ایسے ہی آنکھوں میں آنسو آگئے“، دو پٹے سے چہرہ صاف کرتے انہوں نے بامشکل چہرے پہ مسکراہٹ سجائی۔

”اچھا بس اب آپ پریشان نہ ہوں اور اٹھ کر تیار ہو جائیں پھر آپ کی طرف چلتے ہیں“، ان کا اتر اہوا چہرہ دیکھ کر رضانے بات بدلتا کہ ان کا موڈ بحال ہو۔ ”ہاں، بس گھر کا کام ختم کر کہ ہوتی ہوں تیار... پتا نہیں کیا مسئلہ ہے کل سے میر انور کی جانب سے دل بہت پریشان ہے اور اوپر سے زارون نے اُس سے بات بھی نہیں کروائی“، بیڈ سے اٹھتے انہیں نے کل شام سے اپنے دل و دماغ پہ چھائی بے چینی کو ظاہر کیا۔

”یاد نہیں رہا ہو گا بھول گے ہوں گے بھائی اور آپ کیوں فکر مند ہو رہی ہیں؟ مجھے امید ہے کہ آپ بالکل ٹھیک ہوں گی اس لیے پلیز آپ پریشان نہ ہوں اور چلیں میں آپ کی کام میں مدد کرتا ہوں“، انہیں ایک نئی فکر میں مبتلا ہوتے دیکھ کر رضانے ان کا دھیان ہٹاتے ان کے ساتھ ہی باہر کارخ کیا تاکہ وہ فضول قسم کی باتوں کو سوچ سوچ پھر سے اپنی طبیعت خراب نہ کر لیں۔

-----

ویڈیو حاصل کرنے کے بعد ارحام نے گاڑی کارخ پولیس اسٹیشن کی جانب کیا تاکہ ڈی ایس پی کو وہ ریکارڈنگ دکھا سکے۔

”یہ آپ لوگوں کو کہاں سے ملی؟“ وہ فوٹج دیکھتے ہی ڈی ایس پی نے حیرانی سے اُن دونوں کی جانب دیکھا۔

”آپ کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ یہ ہمیں کہاں سے ملی، بس مجھے یہ بتائیں کہ کل سے آپ لوگ کون سی تحقیق کر رہے ہیں جو یہ ویڈیو آپ کے ہاتھ نہیں لگی؟“ زارون کی خاموشی پر اس بار ارحام نے ڈی ایس پی پہ برستے ہوئے سوال کیا۔

”سرد یکھیں ہم اپنی جانب سے پوری کوشش کر رہے ہیں پر اس بات کا خیال میرے ذہن میں نہیں آیا کہ وہاں آس پاس کے ایریا میں کوئی کیمرہ موجود ہو سکتا ہے اسی لیے یہ ویڈیو اب تک ہمارے ہاتھ نہیں لگی حالانکہ ہم نے اُس ایریا میں موجود ہر بندے کو اپنی تحقیق میں شامل کیا تھا،“ ارحام کے براہم ہونے پر ڈی ایس پی نے اپنی نوکری خطرے میں دیکھ کر بڑے تحمل کے ساتھ اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”مجھے آپ کی کسی بات پر یقین نہیں ہے اور اب ہم سیدھاڈی آئی جی صاحب سے بات کریں گے“، اُس کی باتوں کو دفع کرتے ارجم کو اُس کے گڑبرانے پر زارون کی بات صح لگی کہ یہ پولیس والے بھی ان لوگوں کے ساتھ ملے ہیں۔

”سر پلیز، آپ ٹھنڈے دماغ سے میری بات سنیں۔ میں آپ کو کہہ رہا ہوں ناکہ ہم اپنی جانب سے پوری کوشش کر رہے ہیں تو کیوں آپ میری بات کا یقین نہیں کر رہے۔ پلیز دیکھیں آپ بیٹھیں میں آپ کو ساری بات تفصیل سے بتاتا ہوں“، ڈی ایس پی جو اُس ویڈیو والے کی زبانی حیدر شاہ کے بیٹے مراد شاہ کو اس واقعے میں ملوث ہونے کے بارے میں جان چکا تھا اُس نے ارجم کی زبان سے ڈی آئی جی تک بات پہنچنے کا سنتے ہی جلدی سے بوکھلاتے ہوئے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی جو اُس کی کوئی بھی بات سننے کو تیار نہ تھا۔

”بس آپ نے جتنی کوشش کرنی تھی کری اب میں آپ کو بتاؤں گا کہ کوشش کرتے کیسے ہیں“، زارون کو اٹھنے کا کہتے ارجمنے اُسے دھمکی دیتے باہر کارخ کیا تو زارون بھی ایک سخت نظر ڈی ایس پی ڈالنے اُس کے پیچے بڑھا۔ ”ففف خدا یا، یہ کیمرہ مجھے نظر کیوں نہیں آیا“، ان دونوں کے جاتے ہی ڈی ایس پی نے اپنا سر پکڑتے اپنی عقل پر ماتم کیا اور موبائل اٹھاتے حیدر شاہ کو کاں

ملانے لگا جن سے وفاداری نبھاتے اُس نے اُس ویڈیو والے سے سب جانے کے بعد ہی اُسے کہیں روپوش کر دیا تھا۔

---

”زار...“ بند آنکھوں سے ہی اُس کا نام پکارتے نور نے سر میں ہونے والے درد کی وجہ سے چہرے پر تکلیف کے آثار سجائے تو شکور اور رفیق جو پچھلے چند گھنٹوں سے اُس کے پاس ہی بیٹھے تھے اُس کی آواز پر اٹھ کر بیڈ کے قریب آئے۔

”بابا،“ ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھتے اُس نے آنکھیں کھولیں تو ان دونوں نے شکر ادا کیا۔

”بابا،“ پھر سے آنکھیں بند کرتے وہ سر میں اٹھنے والی ٹیسوس پر سسکی۔

”لگتا ہے اس کہ سر میں درد ہے۔ میں سلیمان سے فون کر کہ کسی دوائی کے بارے میں پوچھتا ہوں جب تک تم اس کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرو،“ شکور سے کہتے رفیق نے اپنا موبائل نکالا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے باہر کی جانب بڑھا۔

”زار پلیز آپ مجھے یہاں سے لے جائیں۔ یہ لوگ بہت بُرے ہیں“، رفیق بھی دوسری طرف رابطہ جڑنے پر کمرے سے باہر نکلا تو نور نے چند منٹ تک اپنے آس پاس خاموشی محسوس کرتے پھر سے آنکھیں کھولیں اور ہمت نہ ہونے کے باوجود بھی اٹھ کر بیٹھی۔

”یا اللہ پلیز میری مدد کریں۔ مجھے ان شیطانوں سے بچالیں“، آنکھوں سے نکلتے گرم سیال کو گالوں پہ بہاتے اُس نے بے بُسی سے اپنے رب کو پکارا۔

”یا اللہ آپ کو آپ کے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا واسطہ مجھے ان لوگوں کے ہاتھوں بے آبرومت کریئے گا۔ آپ کو آپ کے محبوب کا واسطہ، مجھے موت دے دیں پر ان غلیظ لوگوں کے سامنے بے بُس مت کریں۔ آپ تو رحمان ہیں پلیز مجھ پہ رحم کریں مجھے اس طرح کی افیت نہ دیں جسے میں سسہ نہ پاؤں“، ہاتھ جوڑ کر التجاء کرتے وہ ایک بار پھر سے اشک بار ہوئی اور گڑ گڑاتے ہوئے اپنے رب سے اپنی رہائی کی دعا مانگنے لگی۔

”واہ بھی بلبل تو تو خود ہی اٹھ کر بیٹھ گئی“، چہرے کو ہاتھوں میں چھپائے وہ اپنے رب سے التجاؤں میں مصروف تھی جب ایک آدمی کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی۔

”کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟“ اُس کے ہاتھ ہٹاتے ہی اُسے روتا دیکھ کر شکور نے ہاتھ میں پکڑی کھانے کی ٹرے سائیڈ ٹبل پر رکھتے اُس کے قریب بیٹھتے فکر مندی کا اظہار کیا تو نور پھر سے اُس شخص کو اپنے قریب دیکھ کر جلدی سے پچھے ہوئی۔

”میرے قریب مت آنا“، نظروں میں خوف لیے اُس نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”ٹھیک ہے اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہارے قریب نہ آؤں تو چپ چاپ یہ کھانا کھالو ورنہ...“ اپنے ہونٹوں پہ انگوٹھا پھیرتے اُس نے اپنی بائیں آنکھ دبائی تو نور نے جلدی سے ٹرے اپنے سامنے کرتے اپنے آنسوؤں کو اندر جذب کیا اور اُس شخص کی خباشت دیکھ کر جلدی سے نوالہ بنا کر اپنے منہ میں رکھا۔

”شabaش، بلبل تو خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ کافی سمجھدار بھی ہے“ اُس کی ہڑبرڑانے پر ایک پر زور قہقهہ لگاتے شکور نے سر آگے کرتے اس پر جھکنا چاہا تو نور نے بروقت پچھے ہوتے اپنا بچاؤ کیا اور ساتھ ہی ٹرے میں پڑا شیشے کا گلاس اٹھا کر پورے زور سے شکور کے سر میں دے مارا جو اس حملے کے لیے بالکل بھی تیار نہ تھا۔

”میں نے کہا تھا مجھے ہاتھ مت لگنا“، غصے سے چیختنے کا موقع دیے بغیر ہی سائیڈ ٹبل پر پڑا شیشے کا جگ اٹھا کر بھی پوری طاقت سے اُس کے سر میں مارا تو شکور کے منہ سے ایک

دلخراش چنچ پورے ڈیرے میں گونجی اور ساتھ ہی اُس کے سر سے خون کی لکیریں نکلتے اُس کے چہرے کو سرخ کرنے لگیں تو نور نے خوف زدہ نظروں سے دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے ابھی تک کوئی بھی اندر نہیں آیا تھا۔

”یا اللہ، یہ میں نے کیا کر دیا؟“، اُس کے چہرے کو خون آکو دہ ہوتے دیکھ کر نور نے اپنے منہ پہ ہاتھ رکھتے اپنی چینیخوں کا گلا گھونٹا اور کچھ منٹ تک حواس باختہ سی کھڑی اُس شخص کو دیکھتی رہی جو شاید سر میں لگنے والی چوٹ سے بے ہوش ہو گیا تھا۔

”مو بائل..“، کچھ وقت تک کسی کو بھی کمرے میں نہ آتا دیکھ نور نے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے خود کو سنبھالا اور بیڈ پپڑے موبائل کی جانب متوجہ ہوئی جو یقیناً اسی شخص کے ہاتھ سے گرا تھا۔ ”زار، زار کو کال کرتی ہوں“، کانپتے ہاتھوں سے اُس نے پہلے دروازہ بند کیا اور پھر موبائل اٹھاتے اُسے آن کیا تو اُس پہ لاک لگا تھا۔ ہونٹوں پہ زبان پھیر کر انہیں ترکرتے نور نے ایک بار پھر سے دروازے کی جانب دیکھا۔

”یہ اب کیسے کھلے گا؟“، کسی کے بھی نہ آنے پر مطمئن ہوتے اُس نے حوصلہ کر کہ اُس شخص کا انگوٹھا پکڑ کر موبائل پہ لگایا تو خوش قسمتی سے وہ دوسرا ہی کوشش میں کھل گیا۔

”یا اللہ پاک پلیز میری مدد کرنا“، نظریں دروازے پر رکھے اُس نے جلدی سے زارون کا نمبر ڈال کیا جو ابھی اُس نے کچھ دن پہلے ہی با مشکل یاد کیا تھا۔

”زار پلیز فون اٹھا لیں“، نظریں دروازے پر ٹکائے اُس کا دل تیزی سے دھڑکا۔ ”ہیلو کون؟“، ایک انجان نمبر سے آنے والی کال کو ایک دوبار نظر انداز کرتے اُس نے ارحم کے کہنے پر رسیو کیا۔

”زا۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے۔۔۔ بچا لیں“، اُس کی آواز سننے ہی نور کے آنسو بے اختیار ہو کر آنکھوں سے نکلے تو اُس نے با مشکل زبان سے یہ الفاظ ادا کیا۔ ”نور؟ نور تم کہاں ہو؟ پلیز مجھے بتاؤ“، اُس کی آواز سننے ہی زارون نے بے یقینی سے ارحم کی جانب دیکھا جس کی اپنی بھی یہی حالت تھی۔

”نور پلیز رو نابند کرو اور بتاؤ مجھے کہ کہاں ہو تم؟“، دوسری جانب ہچکیوں کی آواز پر زارون نے بے چینی سے پوچھا پر اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی کمرے کے باہر سے آتی قدموں کی آوازنے اُس اندر تک لرزا کہ رکھ دیا۔

”زار مجھے بچالیں یہ لوگ بہت بڑے ہیں“، قدموں کی آواز قریب آنے پر اُس نے جلدی سے اپنی بات مکمل کی اور کسی کے آنے سے پہلے کال چلتی چھوڑ جلدی سے مو بال لے کر وہاں موجود واش روم کی جانب بڑھی۔

”نور کیا ہوا؟ بولو کیا ہوا ہے؟ کہاں ہو تم؟ تم ٹھیک ہونا؟“ دوسری طرف اُس کی آواز آنا بند ہوئی تو زارون نے مو بال کان سے ہٹاتے اُس کے کال پہ ہونے کا تفہین کیا۔

”پلیز تم گھبراو میت اور کچھ دیر جیسے بھی ہو سکتا ہے کال کو آن رکھو“، اُس کی گھٹی گھٹی سے سیکیوں پہ زارون نے اُسے حوصلہ دیتے چند منٹ مزید کال جاری رکھنے کا کہاتا کہ اس نمبر کو ڈیس کرنے میں آسانی ہو۔

”نور میں پاس ہوں تمہارے، تم بس پریشان نہ ہو میں بہت جلد تمہیں ڈھونڈ لوں گا“، ارحم نے اُس کے اشارہ کرنے پہ گاڑی ریورس کر کہ فون اسٹینچ کی جانب موڑی تو زارون نے دوسری جانب نور کو سہارا دیا جس کی نظریں اب واش روم کے دروازے کی جانب تھیں جو کوئی شخص اُسے گالیاں دینے کے ساتھ ساتھ پورے جوش سے کھولنے کی کوشش میں لگا تھا۔

-----

”سب تیار یاں ہو گئی ہیں نا؟“ حیدر شاہ نے مراد شاہ کو اپنی جانب آتاد کیھ کر پوچھا جو ابھی ابھی تمام انتظامات کا جائزہ لے کر آیا تھا۔

”جی سب کچھ ٹھیک ہے بس ابھی دس منٹ میں ٹرک یہاں سے نکل پڑے گا،“ انہیں ہر کام کی تفصیل بتاتے اُس نے مطمئن کیا۔

”ٹھیک ہے بس اب یہ ٹرک خیر خیریت سے پہنچے گا تو مجھے دلی سکون ملے گا،“ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کرتے حیدر شاہ نے آج کے کام کے لیے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”آپ بے فکر رہیں سب کام اچھے طریقے سے ہو جائے گا اور کسی کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو گی کہ اس ٹرک میں لڑکیاں ہیں یا پیڑوں،“ اپنی موچھوں کو تاؤ دیتے مراد شاہ نے انہیں ہر قسم کے خطرے سے بے فکر رہنے کی تلقین کرتے ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا بولا۔

”مراد پھر سے ایک بار سب انتظامات دیکھ لو، پتا نہیں کیوں اس بار میرا دل کچھ مطمئن نہیں ہو رہا ہے،“ حیدر شاہ نے گاڑی میں بیٹھتے ایک بار پھر سے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”بابا سائیں، آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ پہلے کبھی کوئی کام خراب ہوا جواب ہو گا اور ہی بات پولیس کی تو ان کے کچھ بندے ہمارے ساتھ ہیں اگر کوئی بھی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ ہمیں فورا

اطلاع کر دیں گے، ”ڈرائیور کے ساتھ والی نشست سنبھالنے مراد شاہ نے انہیں اپنے بھرپور اور پکے انتظامات کا یقین دلا یا تو حیدر شاہ کو اُس کی بات سے کچھ ڈھارس ملی۔

”چلو ڈرائیور،“ ٹرک ساتھ والی بلڈنگ سے نکلا تو مراد شاہ نے اپنے ڈرائیور کو بھی اشارہ کرتے اُس کے تعاقب میں چلنے کا کہاتا کہ شہر سے اپنی نگرانی میں وہ ٹرک باہر نکلواتے اُن بندوں کے حوالے کر سکیں جنہوں نے اُسے افغانستان لے جانا تھا۔

-----

”نور پلیز فون بند مت کرنا۔ میں ابھی کچھ دیر میں تمہارے پاس آجائوں گا،“ دوسری جانب سے کسی مرد کی فضول گوئی پر زارون نے اپنے جڑوں کو مضبوطی سے بند کرتے اُسے تسلی دی جو سہی ہوئی نظروں سے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”ز.. اریہ... لوگ .. مجھے مار... دیں گے،“ گھٹی ہوئی آواز میں نظریں دروازے کی سمت گاڑھے اُس نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی ایک زور دار دھکے کے ساتھ ہی ایک شخص اندر داخل ہوا۔

”تمہاری اتنی جراءت؟“ موبائل جو خوف کی وجہ سے نور کے کان سے لگا رہ گیا تھا اسے ہٹاتے رفیق نے پوری طاقت سے زمین پر مارا اور اُس کے بال اپنی مضبوط مٹھی میں دبوچے باہر نکالا۔ ”کیا کیا ہے تم نے میرے دوست کے ساتھ؟“ واش روم سے نکلتے ہی رفیق نے غصے کے مارے اُس کے چہرے پہ تھپڑوں کی بارش کی جوز خم سے نکتے خون پر درد سے کراہتے اُسے روکنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اتنی دلیری دکھانے کی؟“ اُس کے بالوں کو مزید مضبوطی سے پکڑ کر اپنے چہرے کے قریب کرتے رفیق کی آنکھوں میں خون اُترا۔

”و...ه...یہ... میں.....“ ہونٹ پھٹ جانے کی وجہ سے اُس سے نکتے خون اور درد کی شدت سے نور کو چند الفاظ ادا کرنے مشکل لگے تو رفیق نے اُسے پیچھے پڑے صوف پر دھکا دیا۔

”تمہارا اعلان میں واپس آکر کرتا ہوں“، شکور کی جانب متوجہ ہوتے اُس نے اُس کی آہستہ چلتی سانسوں پہ فکر مند ہوتے جلدی سے اُسے اٹھایا اور نور کو دھمکی دیتے کمرے سے نکل گیا۔

”زار پلیز جلدی آجائیں“، آنکھوں سے نکتے آنسو اور سر میں اٹھتی ٹیسوس پر درد سے نڈھاں ہوتے اُس نے اٹھنے کی کوشش کی پر نظروں کے آگے آجانے والے اندر ہیرے نے اُس کی ہر کوشش کو بے کار کر دیا۔

”زارون تم اس نمبر کا بائیوڈیٹاچیک کرو ہو سکتا ہے کچھ پتا چل جائے“، کال منقطع ہوتے ہی ارحم نے اُسے مشورہ دیا جو غصے کے مارے ہر چیز کو آگ لگانے کے درپہ تھا۔

”ایک بار بس ایک بار یہ لوگ میرے ہاتھ لگ جائیں میں اُن سے نور کی ہر تکلیف کا ایسا بد لہ لوں گا کہ موت بھی اُن سے پناہ مانگے گی“، اپنے موبائل سے اُس نمبر کی لوکیشن چیک کرنے کی کوشش کرتے جب دوسری طرف کوئی کام کی معلومات نہ ملی تو زارون کا پارہ مزید چڑھا۔

”ہاں بس ایک بار ان لوگوں کو ہاتھ آنے دو اور پتا چلنے دو کہ یہ کام ہے کس کا ہے پھر دیکھنا ان کا کیا حشر ہوتا ہے“، اُس کی بات کی تائید کرتے ارحم کی پیشانی پر بل پڑے۔

”پتا نہیں یہ نمبر موبائل سے ٹریس ہی نہیں ہو رہا“، بار بار کوشش کرنے کے بعد اُس نے ارحم کو بتایا جواب گاڑی فون ایکسچینج کے سامنے روک چکا تھا۔

”چلو ہو سکتا ہے یہاں سے ہمیں اس نمبر کا کوئی ڈیٹا مل جائے یا کال ریکارڈ“، اک امید لیے زارون کو تسلی دیتے وہ دونوں گاڑی سے باہر نکلتے اُس بلڈنگ کے اندر کی جانب بڑھے۔

”بھائی ہمیں ایک نمبر کا ڈیٹا معلوم کرنا ہے پلیز آپ بتادیں گے؟“ باہر ایک لڑکے سے پوچھ کروہ ڈیٹا نکواری کی جانب بڑھے جہاں تقریباً دس، بارہ کے قریب لڑکے مختلف کمپیوٹر پر موجود تھے۔ ”ڈیٹا؟ نہیں ہم ایسے کسی بھی نمبر کا ڈیٹا عام لوگوں کو نہیں دیتے۔ سوری یہ ہمارے اصولوں کے خلاف ہے“، اُس لڑکے نے حیرت سے اک نظر ان دونوں کی جانب دیکھتے معدود خواہانہ لجھ میں منع کیا۔

”پلیز بھائی میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے اصولوں کے خلاف ہے پر ہمیں اس کی اشد ضرورت ہے بس آپ یہ سمجھ لیں کہ کسی کی جان کو خطرہ ہے“، ارحم نے کاؤنٹر پر موجود لڑکی کی منت کی۔ ”نہیں، آپ کا جو بھی مسئلہ ہو پر مجھے کسی غیر نمبر کی معلومات دینے کی اجازت نہیں ہے“، کرسی کی بیک سے ٹیک لگاتے اُس نے بے فکری سے جھولتے ہوئے کندھے اچکائے تو زارون جو تب سے ضبط کیے کھڑا تھا ایک دم سے آگے بڑھتے اُس کا گریبان پکڑ گیا۔

”تم نے سنا نہیں کہ کسی کی جان کو خطرہ ہے۔ خطرہ سمجھتے ہو؟“ اُسے جھنجوڑتے ہوئے واپس کر سی پر پھینکنے زارون نے چلاتے ہوئے اپنی بات اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو خود بھی اُس کی حرکت پر برہم ہو چکا تھا۔

”کیا دہشت پھیلار ہے ہیں آپ یہاں؟ اور کیا لگتا ہے آپ کو آپ کے ایسے غصہ دکھانے پہ میں ڈر جاؤں گا؟“ اپنے باقی ساتھیوں کو اٹھ کر اپنی جانب آتادیکھ کر اُس نے دلیری سے اٹھ کر زارون کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے بے خوفی سے کہا۔

”میں تمہارا...“

”زارون پلیز کیا کر رہے ہو یا رپا گل ہو گئے ہو کیا؟“ اس سے پہلے کہ وہ ایک بار پھر سے اُس پہ جھپٹتا ارحام نے معاملہ خراب ہوتا دیکھ جلدی سے اُسے سننچالا۔ ”میں ڈی آئی جی سر سے بات کرواتا ہوں ان کی، خود ہی ڈیٹا نکال دیں گے تم بس سکون سے یہاں بیٹھو،“ اُسے کرسی پہ بٹھاتے ارحام نے اپنا موبائل نکال نکالتے ڈی آئی جی کا نمبر ڈائل کیا جوا بھی کچھ دیر پہلے ہی ڈی ایس پی کی حرکت کے بعد اُس نے ہاشم صاحب سے لیا تھا۔

”سر کیا مسئلہ ہے آپ کو؟ کیوں آپ ہمارے ملازم کو ہر اسماں کر رہے ہیں؟“ اُن میں سے ایک لڑکے نے مینجر کو خبر کی تو اُس نے وہاں آتے ہی ہجوم کو سائیڈ پہ کرتے ارحام سے پوچھا جو کسی سے فون پہ بات کرنے میں مصروف تھا۔

”جی سر، جی ایک سکنڈ میں بات کرواتا ہوں،“ اُس شخص کی بات کا جواب دینے کی بجائے ارحام نے پاس کھڑے لڑکے سے مینجر کا پوچھا تو اُس نے ابھی آئے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

”جی سر یہ لیں بات کریں“، موبائل مینجر کی جانب بڑھاتے ارحم نے اُسے بات کرنے کا کہا جو چہرے پہ کئی سوال لیے فون کان کو لگا گیا۔

”وعلیکم السلام جی سر، جی جی بتائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ دوسری طرف ڈی آئی جی نے اپنا تعارف کرو یا تو مینجر کا غصہ جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔

”جی سر ٹھیک ہے میں ابھی نکلوادیتا ہوں“، دوسری جانب پوری بات سنتے اُس نے اثبات میں سر ہلاتے پوری تابعداری کا مظاہرہ کیا اور کال منقطع ہوتے ہی موبائل ارحم کی جانب بڑھایا۔

”سر آپ کھڑے کیوں ہیں پلیز بیٹھیں“، ارحم نے موبائل پکڑا تو مینجر نے مuderat خواہانہ لجھ میں اپنے ملازم کی طرف سے معافی مانگتے باقی سب کو وہاں سے جانے کا کہا۔

”سر جو نمبر دے رہے ہیں فوراً سے اُس کا ڈیٹا زکالو اور اگر نہیں نکلتا تو کال ہسٹری دیکھو۔ کچھ بھی کرو پر مجھے اس نمبر کے بارے میں تمام معلومات اگلے دس منٹ میں اپنے کمرے میں چاہیے“، اُس لڑکے کو آنکھیں نکالتے وار نگ دیتے مینجر نے اُن دونوں لڑکوں کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں چلنے کا کہا۔

”نہیں بس ہم یہاں ہی ٹھیک ہیں اور بہت شکر یہ آپ کے تعاون کا“، اُس کی جانب سے کی گئی سفارش پر اُس کا شکر یہ ادا کرتے ارحم نے وہیں بیٹھے رہنے پر اصرار کیا تو مینجر نے پھر سے اُس لڑکے

کو جلدی ہاتھ چلانے کا کہا جواب غصے کی جگہ چہرے پہ شرمندگی لیے جلدی جلدی ہاتھ چلاتے اُس نمبر کے متعلق معلومات نکالنے کی کوشش میں لگا تھا۔

---

”نائلہ بہن آپ یہاں اس وقت؟“ نسرین نے کچھ مہمانوں کی آمد کا بتایا تو عابدہ بیگم نے انہیں ڈرائیور میں بٹھانے کا بولتے خود بھی اپنے کمرے سے نکلتے وہاں کارخ کیا جہاں رضا کے ساتھ نائلہ بیگم کو دیکھ کر وہ خوش ہونے کی بجائے ایک دم سے بوکھلائیں۔

”جی، بس آپ سب سے ملنے کا دل تھا تو ہم بناء بتائے ہی آگئے۔ آپ مصروف تو نہیں تھیں؟“ ان کی بوکھلاہٹ پر شرمندہ ہوتے نائلہ بیگم نے سلام دعا کرتے سوال کیا تو عابدہ بیگم نے ناچاہتے ہوئے بھی چہرے پہ مسکراہٹ سجائے بات کو سننچا لئے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں نے کہاں مصروف ہونا تھا اور اگر مصروف ہوتی بھی تو آپ کے لیے ضرور وقت نکالتی،“ مسکراتے ہوئے انہوں نے اپنا نیت دکھائی تو نائلہ بیگم کے دل کو کچھ تسلی ہوئی جو اک دم سے اُن کا بدله ہوا ہجہ دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں۔

”جی بس آپ کی محبت ہے“، ان کے کہنے پر اپنی نشست سنبھالتے نائلہ بیگم نے ان کے خلوص پر نرمی سے کہا تو رضا نے بھی آگے بڑھتے ان کے سامنے سر جھکایا۔

”جیتے رہو، کیسے ہو بیٹا؟“ اُس کے کندھے پر تھکلی دیتے عابدہ بیگم نے پوچھا تو رضا نے اپنی خیریت کا بتاتے ان کی طبیعت کے بارے میں استفسار کیا۔

”ہاں اللہ کا شکر ہے میں ٹھیک ہوں اور تم کھڑے کیوں ہو؟ بیٹھو نا“، اُسے کھڑا دیکھ عابدہ بیگم نے کہا اور ڈرانگ روم کے دروازے کی جانب بڑھتے نسرین کو آواز لگاتے چائے کا بولا۔

”اور سنائیں کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ دوبارہ بی پی کا مسئلہ تو نہیں بننا؟“ چائے کا بولتے انہوں نے نائلہ بیگم کے ساتھ نشست سنبھالی تو انہوں نے باقاعدہ کا آغاز کیا۔

”جی اللہ کا کرم ہے۔ میں ٹھیک ہوں، آپ بتائیں آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ اور بہت اچھا کیا آپ نے جو یہاں آگئیں“، اپنے رویہ کا ازالہ کرتے عابدہ بیگم نے ان کے آنے پر خوشی کا اظہار کیا۔

”جی بس کل سے نور کی جانب سے دل بہت پریشان تھا اور اُس کا موبائل بند ہونے کی وجہ سے اُس سے بات بھی نہیں ہو پائی۔ بس اسی لیے سوچا کہ ایک بار جا کر مل آؤں تو دل کو تسلی ہو جائے گی“، اپنے آنے کی اصل وجہ بتاتے نائلہ بیگم نے ڈرانگ روم کے دروازے سے اندر داخل ہوتے احمد صاحب کے سلام کا جواب دیا جو ڈرانگ روم سے آتی آوازوں پر وہاں آئے تھے۔

”جی... جی یہ آپ کا اپنا ہی گھر ہے۔ آپ جب چاہیں یہاں آسکتی ہیں“، نظروں میں فکر لیے عابدہ بیگم نے احمد صاحب کی جانب دیکھا جواب رضا سے مل کر اُس کے پاس ہی بیٹھ چکے تھے۔

”جی جانتی ہوں اسی لیے تو بناء بتائے ہی چلے آئے“، ان کے لہجے سے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہونے پر نائلہ بیگم نے زبردستی مسکراتے احمد صاحب سے ان کی طبیعت کا پوچھا جن کا چہرہ بھی عابدہ بیگم کی طرح انہیں کچھ پریشان پریشان سا لگا۔

”جی بہن میں ٹھیک ہوں اور یہ آپ یہاں بیٹھی باتیں ہی کر تیں رہیں گی یا چائے کا بھی کوئی انتظام کریں گی“، نائلہ بیگم کو جواب دیتے انہوں نے عابدہ بیگم سے کہا جو انہیں نسرین کے چائے لانے کے متعلق بتاتے رضا سے اُس سے پڑھائی کی متعلق پوچھنے لگیں۔

”یہ نور اور زاروں کہاں ہیں؟ میرا مطلب گھر میں ہیں یا کہیں گئے ہیں؟“ چائے وغیرہ پینے کے بعد بھی جب عابدہ بیگم نے نور کو نہیں بلا یا تو نائلہ بیگم نے طریقے سے اُس کی غیر موجودگی کے متعلق پوچھا۔

”جی وہ دونوں شاپنگ کرنے گئے ہیں۔ اگلے ہفتے جنید لوگوں نے آجانا تو میں نے خود ہی نور سے بولا کہ اپنے لیے کچھ کپڑے وغیرہ لے آؤ“، ان کے پوچھنے پر کچھ سیکنڈز سوچنے کے بعد عابدہ بیگم نے احمد صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی جھوٹ بولا۔

”اچھا، کب تک آجائیں گے؟ میرا مطلب ہے کہ اگر جلدی آجائیں تو ہم ان سے مل کر ہی گھر کے لیے نکلیں“، کلاک پر شام کے سات بختے دیکھ نائلہ بیگم نے کافی وقت گزر جانے پر فکر مندی سے پوچھا۔

”جی وہ آج رابعہ کی طرف ان کا ڈنر بھی تھا، کہہ رہے تھے کہ واپسی پر ان کی طرف سے ہو کر آئیں گے اور آپ نے ابھی سے گھر کیوں جانا ہے؟ ابھی رکیں نارات کا کھانا کھا کر جائیے گا“، بہانہ بناتے انہوں نے بات بدلتی۔

”نہیں کھانا پھر کبھی کھائیں گے ابھی تو بس آپ لوگوں سے ملنا تھا تو مل لیا“، نور اور زارون کے لیٹ آنے کا سنتے ہی نائلہ بیگم نے ان کے اصرار کے باوجود بھی اجازت چاہی اور رضا سے چلنے کا کہا جو خود بھی نور سے ملاقات نہ ہونے پر کچھ افسردہ سا تھا۔

-----

”ماما آپ کو نہیں لگتا کہ وہاں کچھ گڑ بڑ تھی؟“، گاڑی ان کے گھر سے نکلتے ہی رضانے نائلہ بیگم سے ان کی رائے پوچھی جو خود بھی کچھ گم صم سے بیٹھی تھیں۔

”ہاں، مجھے تو عابدہ بہن کا رویہ دیکھ کر ہی سمجھ آگئی تھی کہ اُن کے گھر میں ضرور کوئی مسئلہ ہے۔ پر کیا؟ یہ سمجھ نہیں آئی۔ بس مجھے تواب نور کی اور زیادہ فکر ہو رہی ہے پتا نہیں میری پچی بچاری کہاں ہے اور پتا نہیں یہ لوگ ہم سے کیا چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں؟ رضا مجھے تو بہت ٹینشن ہو رہی ہے پلیز تم زارون کو ابھی کال کرو اور اُسے کہو کہ میری نور سے بات کروائے“، رضا کے تاثرات جاننے کے بعد نائلہ بیگم کی بے چینی مزید بڑھ چکی تھی تب ہی انہوں نے فکر مند ہوتے اُس سے کہا جو خود بھی نور کی غیر موجودگی پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔

”اچھا بس آپ پر یشان نہ ہوں۔ آپی ٹھیک ہوں گی اور میں گھر جا کر آپ کی بات کرواتا ہوں ابھی ڈرائیور نگ کے دوران کال کی تو پولیس والے روک لیں گے“، گاڑی اشارے پر روکتے رضانے اپنی جانب سے فکر مندی ظاہر کر کہ انہیں مزید پر یشان کرنے کی بجائے تسلی دی جو اس کی بات سمجھتے اب اللہ سے نور کی حفاظت کی دعا نہیں مانگنے لگیں تھیں۔

-----

”آپ نے اُن لوگوں سے جھوٹ کیوں کہا؟“، احمد صاحب جو عابدہ بیگم کے جھوٹ کی وجہ سے کچھ بول نہیں پائے تھے انہوں نے نائلہ بیگم اور رضا کے جاتے ہی خفگی کا اظہار کیا۔

”تو پھر کیا کہتی؟ سچ بتا دیتی؟ احمد دیکھیں پہلے ہی وہ نور کی وجہ سے بہت کچھ برداشت کر چکی ہیں اور اگر میں انہیں یہ بتائی کہ ان کی بیٹی انعوا ہو چکی ہے اور کل سے لاپتا ہے تو سوچیں کے ان کے دل پر کیا گزرتی؟ پہلے ہی وہ شوہر کے صدمے سے باہر نہیں آئیں اور اب بیٹی کے ساتھ ہونے والے اتنے بڑے حادثے کو کیسے برداشت کرتیں؟ نہیں میں انہیں یہ سب بتا کر پریشان نہیں کر سکتی تھی، ان کی طرف سے ناراضگی پر عابدہ بیگم نے اپنے سچ نہ بولنے کی وجہ بتائی۔

”ہم، پھر بھی مجھے لگتا ہے ہمیں انہیں سب بتا دینا چاہیے تھا۔ اللہ نہ کرے کل کو کوئی ایسی ولیسی بات ہو تو ان کو ایک دم سے یہ سب سُن کر زیادہ پریشانی ہو گی“، ان کے موقف کو جھٹلانے کی بجائے اُس کی تائید کرتے احمد صاحب نے اپنی بات کہی۔

”اللہ نہ کرے کوئی ایسی ولیسی بات ہو۔ اللہ پاک نور کی حفاظت کرے“، ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی عابدہ بیگم نے درمیان سے ٹوکا۔

”ہاں اللہ کرے بس میں زارون کو فون کر کہ پوچھتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔ آپ بس دعا کریں کہ نور جلد از جلد صحیح سلامت گھر آجائے“، آئین کہتے احمد صاحب نے نائلہ بیگم کے سامنے بروقت عقل مندی دکھانے پر عابدہ بیگم کو دل سے سراہا پر منہ پر تعریف کرنے سے غرض بر تنتے اپنے کمرے کی جانب بڑھے۔

ٹرک کو صحیح سلامت شہر سے نکالنے کے بعد ایک کچی سڑک پر ڈالتے ڈرائیور نے درختوں کے جنہند میں لے جا کر کھڑا کیا تو مراد شاہ کے ساتھ ساتھ حیدر شاہ نے بھی سکون کا سانس لیتے گاڑی سے نکلتے وہاں کارخ کیا جہاں ان کے ایک بندے کے ساتھ لٹرکیاں خریدنے والے شخص کے بھی کچھ بندے موجود تھے۔

”السلام علیکم شاہ صاحب کیسا ہے آپ لوگ؟“ حیدر شاہ کے بندے نے ان کا آپس میں تعارف کروایا تو ان کے لیڈر نے آگے بڑھتے ان دونوں سے مصافحہ کیا۔

”ہم ٹھیک ہیں آپ بتائیں؟ ہماری رقم لائیں ہیں؟“ اس کی بات کا جواب دیتے مراد شاہ نے مطلب کی بات پر آتے سوال کیا۔

”جی جی ہم رقم لایا ہے پر وہ آپ کو ہم اپنے مال کے پورا ہونے کی تسلی کے بعد ہی دے گا“، اپنی شرط بتاتے اس پٹھان نے مراد شاہ کو چلنے کا بولا تو وہ حیدر شاہ کو وہیں رکنے کا کہتے اس کے ساتھ درختوں کی جانب بڑھا جہاں لٹرکیوں سے بھرا ہوا ٹرک موجود تھا۔

”ہو گئی تسلی؟“، لڑکیاں گنو انے کے بعد مراد شاہ نے اُس کے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھ کے پوچھا تو اُس پٹھان نے اپنی موخچوں کو تاؤ دیتے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”بابا تسلی بھی ہو گئی ہے اور یقین بھی کہ آپ کے ان معزز چہروں کے پیچھے کتنا گھنا فنا اور مکروہ چہرہ چھپا ہے“، لب سکیرٹے اُس نے اپنے دانت پیستے بات مکمل کرتے ہی گن نکال کر مراد شاہ کی کان پٹی پہ رکھی تو وہ اس اچانک آفتاب پہ ایک دم سے بوکھلا�ا۔

”پکڑ لو ان سب کو“، مراد شاہ کو اپنے قابو میں کرتے اُس نے اوپھی آواز میں وہاں پیچے فوجیوں کو آواز لگائی جو کسی هجوم کی مانند نکتے چند ہی سینڈ میں حیدر شاہ سیمیت ٹرک میں موجود بندوں اور گارڈز کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ ”بس بہت ہوا تمہارا کھیل“، اُس کی جیب سے پستول نکال کر اُس پٹھان نے مراد شاہ کو پیچھے کھڑے دو فوجیوں کی جانب دھکیلا جو اپنے ساتھ ہونے والے دھوکے پر ابھی تک بدحواس ساتھا۔

”سب لڑکیوں کو ٹرک سے نکالو جلدی اور میرے فارم ہاؤس پہنچا دو تاکہ کوئی میڈیا والے ان تک نہ پہنچ سکے“، ایک خونخوار نظر ان دونوں باپ بیٹیوں پہ ڈالتے اُس پٹھان نے اپنے کچھ جوانوں کو ہدایت دی جو اُس کا آرڈر ملتے ہی لڑکیوں کو ٹرک سے نکالنے لگے جو ابھی تک بے ہوشی کے انجکشن لگنے کی وجہ سے بے ہوش تھیں۔

”سریہ لیں، یہ فون کال اس جگہ سے کی گئی تھی“، کچھ ہی دیر میں اُس لڑکے نے اُس نمبر کی لاست کال لوکیشن نکالی تو احمد اور زارون جو تب سے بے چین بیٹھے سے اُس کی بات سنتے ہی اُس کے قریب آتے سکرین پر نظر آتے نقشہ پر اُس جگہ کو دیکھنے لگے جس کے متعلق انہیں کسی سے بھی پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

”یہ تو سید پور کے قریب ہی ہے“، ایک گاؤں کا نام لیتے احمد نے اپنا موبائل نکال کر اسکرین پر نظر آنے والے نقشہ کی ایک تصویر بنائی تو اس لڑکے نے بھی اُس کی بات کی تصدیق کی۔

”جی سریہ وہیں ہے اور سننا ہے کہ یہ سارا اعلاقہ ایک سیاست دان کی ملکیت ہے“، اُس کی بات میں اضافہ کرتے اُس لڑکے نے اُس جگہ کے متعلق معلوم کچھ مزید معلومات کے متعلق اُن کو آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے چلو بس ہمیں جلدی وہاں پہنچنا ہے“، اُس کی بات مکمل ہوتے ہی زارون نے مزید وقت ضائع کیے بناء باہر کا رخ کیا تو ارحام نے اُس لڑکے کا شکریہ ادا کرتے، اُس کے پیچھے ہی بلڈنگ سے نکلتے اُسے روکا۔

”زارون کیا ہو گیا ہے یا رپلیز ہوش سے کام لو۔ ہم لوگ وہاں ایسے آکیلے نہیں جاسکتے“، اُس کے سامنے آتے ارحام نے جذباتی ہونے کی بجائے ہوش سے کام لیا۔

”کیوں؟ کیوں نہیں جاسکتے؟ اور اگر تم وہاں نہیں جانا چاہتے تو میں اکیلا چلا جاؤں گا“، اُس کے منع کرنے پر زارون اُسے مزید کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر ہی اپنی بات کہتے، گاڑی کی جانب بڑھنا چاہا تو ارحام نے اُس کے سامنے آتے اُس کا راستہ روکا۔

”پہلے کب میں نے تمہارا ساتھ چھوڑا ہے جواب چھوڑوں گا؟ اور تمہارے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے“، اُس کی بات پر شکوہ کرتے ارحام نے اُسے اپنے سینے سے لگایا جو غصے میں اُس کا دل دکھا چکا تھا۔

”بکواس نہ کرو میں پہلے ہی پریشان ہوں“، اُس کے جذباتی انداز پر بُرا مناتے زارون نے اُسے خود سے الگ کیا۔

”بکواس نہیں کر رہا، بس تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہاں اکیلے جانا خطرے سے خالی نہیں۔ پتا نہیں وہاں کتنے لوگ ہوں اور ہو سکتا ہے اُن کے پاس ہتھیار بھی ہوں جن کا مقابلہ ہم اپنے ہاتھوں سے تو کرنہیں سکتے اس لیے پلیز ہوش سے کام لو“، اپنی بات دلیل کے ساتھ کہتے ارحام نے اُسے آنے والے وقت میں موجود خطروں سے خبردار کیا۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے پر میں پولیس کو ساتھ نہیں لینا چاہتا کیونکہ مجھے شک ہے کہ اُن میں سے کچھ لوگ ہم سے غداری کر رہے ہیں اس لیے میں اُن میں سے کسی کی مدد لے کر نور کو مزید مشکل میں نہیں ڈال سکتا“، ارحام کی بات سن کر زارون نے ٹھنڈے دماغ سے جواب دیا۔

”ہاں جانتا ہوں اگر تم نہیں چاہتے تو میں بھی اُن سے مدد لینے کا نہیں سوچ رہا“، اُس کے خدشے کے اظہار پر ارحام نے پر سوچ انداز میں کہتے اپنا موبائل نکالتے ہاشم صاحب کے پر سنل گارڈ کو کال ملائی تو زارون نے مطمئن ہوتے ڈرائیور نگ سیٹ سنبھالی اور اُسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا جو دوسروی طرف جگہ کے متعلق بتاتے انہیں جلد از جلد وہاں پہنچنے کا کہتے مزید کچھ ضروری ہدایات دے رہا تھا۔

وہ شکور کو لے کر ہسپتال پہنچا تو ڈاکٹر نے جلدی سے اُس کا زخم صاف کرتے ٹانکے لگائے اور کچھ ضروری علاج کے بعد رفیق کو اُس کے جلد ہوش میں آنے کی تسلی دی۔ ”ڈاکٹر صاحب پورے دو گھنٹے گزر چکے ہیں پر میرے مریض کو ہوش نہیں آیا آپ پلیز ایک بار خود چل کر اُسے دیکھ لیں“، پچھلے دو گھنٹوں سے مسلسل شکور کے ہوش سنبھالنے کا انتظار کرنے کے بعد رفیق نے تھک ہار کر ڈاکٹر کے کمرے کا رخ کیا۔

”جی میں دیکھتا ہوں“، دوسری طرف اُس کی پریشان پر اثبات میں سر ہلاتے ڈاکٹر نے حیدر شاہ کا ریفرنس ہونے کی وجہ سے غصے کرنے کی بجائے اُس کے ساتھ ہی باہر کا رخ کیا اور اُس کمرے کی جانب بڑھا جہاں شکور کو رکھا گیا تھا۔

”ان کا بی پی تو بہت لو ہے۔ مجھے لگ رہا خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری ہو گئی ہے“، بی پی وغیرہ چیک کرنے کے بعد ڈاکٹر نے پریشانی کا اظہار کرتے نر س کو آواز دیتے کچھ ہدایات دیں اور رفیق کو باہر بیٹھنے کا بولا جو خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

”بس ایک بار شکور کو ہوش آجائے پھر میں اُس لڑکی کا ایسا حال کروں گا کہ ساری زندگی یاد رکھے گی“، دانت پستے اُسے رہ رہ کر اپنی بیوی قوپی پہ غصہ آرہا تھا کہ کیوں وہ ڈیرے پہ سب کی غیر موجودگی کے بارے میں جانتے ہوئے بھی شکور کو وہاں اکیلا چھوڑ کر دوائی لینے گیا۔

”ہے کیا؟ اتنی سی جان ہے اور کام دیکھو۔ توبہ شہر کی لڑکیاں تو ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہوتی ہیں“، منہ میں بڑھاتے اُس نے یاد آنے پر موبائل نکالتے مراد شاہ کا نمبر ڈائل کیا تاکہ انہیں شکور کی طبیعت خرابی کے متعلق آگاہ کر کے اگلے لائچہ عمل کے بارے میں جان سکے۔

---

کچھ دیر ویسے ہی نیم بے ہوشی کی سی حالت میں لیٹے رہنے کے بعد اُس نے ہمت کی تاکہ اٹھ کر (موباکل کو دیکھ سکے جو اس شخص نے نیچے زمین پہ مار کر توڑ دیا تھا) ان لوگوں کے آنے سے پہلے اپنے بچاؤ کا کوئی راستہ ڈھونڈ سکے مگر کچھ قدم اٹھاتے ہی اُس کا سر چکرا�ا تو وہ واپس صوفے پہ بیٹھ کر اُسے جھکلنے لگی۔

”زار پلیز آجائیں، آپ جلدی نہ آئے تو یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے“، سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے اُس نے صوفے کی بیک سے سر ٹکاتے اپنی اکھڑتی ہوئی سانسوں کو پر سکون کرتے لمبا سانس لیا۔ ”بابا...“ تکلیف کی شدت اور اپنے انجام کے بارے میں سوچتے آنسو بے اختیار ہو کر اُس کی آنکھوں سے نکلے۔

---

”یا اللہ، میری مدد کریں۔ آپ کو آپ کے حبیب کا واسطہ، میری عزت کی حفاظت کریں۔ مجھے میری جان کی پروا نہیں ہے آپ چاہیں تو میری روح اسی وقت قبض کر لیں پر مجھے میری ہی نظر وہ میں یوں رسوانہ کریں کہ ساری زندگی میں اپنے آپ سے نظریں ملاتے کتاوں۔ میں تو پہلے ہی دنیا کی نظر وہ میں بہت بُری ہوں۔ مجھے تو پہلے ہی میرے اپنے پاکیزگی کے لفظ سے نا آشنا کر چکے ہیں۔ پلیز اب مجھے میری نظر وہ میں مت گرائیں۔ آپ سن رہے ہیں نا اللہ۔ میں آپ کی بندی ہوں اور اب مجھے اس اندر ہیر راستوں میں صرف آپ کا سہارا ہے“، کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اپنے آپ میں سمیٹتے اُس نے خود اذیتی کی حد تک پہنچتے اپنی بے بسی پر اللہ سے دعا کی۔

-----

کچھ دیر میں شکور کی طبیعت سنبھلی تور فیق نے اپنے ایک اور ساتھی کو اُس کے پاس ہسپتال میں چھوڑتے ڈیرے کا رخ کیا تاکہ وہاں پہنچ کر اُس لڑکی کا کوئی انتظام کر سکے جس کی حفاظت کی ذمہ داری وہ چوکیدار کو سونپ کے آیا تھا۔

”کیسی طبیعت ہے اب شکور کی؟“، رفیق کو گیٹ کی جانب آتا دیکھ اُس چوکیدار نے اٹھ کر اُس کے قریب آتے استفسار کیا۔

”ہاں وہ ٹھیک ہے اب اور کہاں ہیں سب؟ ابھی تک آئے نہیں؟“ ڈیرے میں خاموشی محسوس کرتے رفیق نے باقی ملازموں کے متعلق پوچھا جو آج صحیح سے ہی مراد شاہ اور حیدر شاہ کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے سیر سپاٹوں پہ نکلے تھے۔ ”نہیں، ابھی نہیں آئے میں نے شیرے کو فون کیا تھا، کہہ رہا تھا دس پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گے“، اُس کی بات کا جواب دیتے چوکیدار نے اُس سے مراد شاہ کے واپس آنے کے متعلق سوال کیا۔

”سامنے لوگ کب تک واپس آئیں گے کچھ اندازہ ہے تمہیں؟“  
 ”نہیں کوئی پتا نہیں، میں نے شکور کا بتانے کے لیے دو تین بار کال کی پر کرسی اور ہی بندے نے فون اٹھایا آگے سے“، رفیق نے اُس کی بات کا جواب دیتے اپنا رخ اندر کی جانب کیا تو چوکیدار بھی اوگنگھتے ہوئے واپس کرسی پہ جا بیٹھا۔

”کیا کر رہی ہو میری شہزادی؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس لڑکی کو ابھی تک صوفے پہ بیٹھا دیکھ کر شکور کے اندر کا شیطان بیدار ہوا۔

”ویسے تم نے شکور کو مار کے بہت اچھا کیا“، آہستہ قدم اٹھاتے وہ جو کچھ دیر پہلے دوست دوست کہہ کر اُس کے لیے پریشان ہو رہا تھا، ایک دم سے اپنا انداز اور رنگ بدلتے اُس کے قریب بیٹھا۔

”ن..ن..ہیں میں...نے ن...نہیں مارا“، اُس کے بیٹھتے ہی نور نے جلدی سے اپنی جگہ چھوڑتے نظروں میں خوف لیے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اپنی بات مکمل کی۔

”ہاہاہا میں نے کب کہا کہ تم نے مارا؟ میں تو یہ کہہ رہا کہ اُسے مار کے تم نے بہت اچھا کیا“، صوفے سے اٹھ کر اُس کے سر پہ پہنچتے رفیق نے اپنے لب سکریٹ مسکراہٹ کو غائب کیا۔

”پ...پلیز... مجھے چھوڑ دو۔ میں نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا ہے“، اُس کے منہ سے آتی سگریٹ کی خوشبو پر اپنا چہرہ پچھپے کرتے نور مزید و قدم پچھپے ہوئی۔

”زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تم جیسی لڑکیوں کو اچھے سے جانتا ہوں شکل سے معصوم اور اندر سے پوری آفت ہوتی ہیں“، اُس کا بازو پکڑ کر اپنے قریب کرتے رفیق نے چہرے پر خباشت لیے اپنے دانت پسیے۔

”پلیز بھائی، آپ کو اللہ کا واسطہ مجھے چھوڑ دیں“، اُس کی سرخ ہوتی آنکھوں سے خوف کھاتے نور نے اپنے مسلسل چکراتے سر کو سنبھالتے خود کو اس وقت ہوش و حواس میں رکھنے کی کوشش کی۔

”ہاہاہا بھائی؟ میری جان بھائی نہیں، میں بہت جلد تمہارا طلب گار بننے والا ہوں“، غصے سے کہتے نظروں میں اپنے مکروہ ارادوں کی چمک لیے رفیق نے اُس کا دوپٹہ کھینچتے ہوئے اُتار کر دور پھینکا۔

”میں تمہارا منہ توڑ دو گنگی ذلیل انسان چھوڑو مجھے“، اُس کی حرکت پر نور نے اپنی ہر تکلیف بھولتے تیر کی تیزی سے اُس کے ہاتھ پر پوری قوت سے کٹا اور موقع ملتے ہی جلدی سے واش روم کی جانب بڑھی پر اس سے پہلے ہی رفیق نے سامنے آتے اس کا راستہ روکا۔

”بہت چالاک بننے کی کوشش کر رہی ہو تم؟ پر یہ نہیں جانتی کہ یہاں تم سے بھی زیادہ چالاک لوگ موجود ہیں“، اُس کا جبڑا اپنے ہاتھ میں مضبوطی سے دبو پر رفیق نے ایک کھاجانے والی نظر اُس پر ڈالی اور پورے زور سے اُسے بیڈ پر دھکا دیا جہاں موجود کا نجخ نور کے جسم کے مختلف حصوں میں بری طرح پیوست ہوئے تو اُس کے منہ سے ایک دالخرش چیخ نکلی۔

”نور؟ یہ نور کی آواز ہے“، زارون اور ارحم جو گارڈز کے ساتھ ابھی وہاں پہنچ کر گیٹ پر موجود چوکیدار کو قابو کر کے تھے ایک دم سے دوسری جانب سے آنے والی چینیوں کی آواز پر اندر کی طرف بھاگے۔

”نور کہاں ہو تم؟“، فکر مندی سے زور زور سے چلاتے زارون نے وہاں موجود تمام کمروں کے دروازوں کو لات مارتے کھولتے اُسے تلاش کیا۔

”نور؟ کہاں ہو تم؟“، ارحم نے بھی اُسے پکارتے سیڑھیاں چڑھتے اوپر کی منزل کا رخ کیا تو زارون نیچے موجود کمروں کی اچھے سے تلاشی لینے لگا۔

”نور...“ اوپر پہنچتے ہی ارحم نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہاں بیڈ پہ موجود تازہ خون نے اُسے آگے بڑھنے سے روکا۔

”نور کہاں ہو تم؟“ جلدی سے اندر داخل ہوتے اُس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھا اور وہاں نظر آتے دوسرے دروازے کی جانب بڑھا جو اندر سے بند تھا۔

”کھولو دروازہ۔ میں تمہیں جان سے مار دوں گا، دروازہ کھولو“، ایک دولاتے مارنے کے بعد ارحم نے دروازے توڑتے بناء سوچے سمجھے ہی اندر کی جانب قدم بڑھائے تو رفیق جو پہلے ہی کسی انجان آوازوں پر اُس لڑکی کو بھی اپنے ساتھ واش روم میں بند کیے کھڑا تھا ایک دم سے اپنی جان جانے کے خوف پر ایک کے بعد ایک فائر نکالتے دوسری طرف سے آتے شخص کو وہیں خاموش کرو گیا۔

”ارحم...“ فائر کی آواز پر جہاں زارون بھاگتے ہوئے اوپر کی جانب بڑھا وہیں اُس کے گارڈز (جو ارحم کے کہنے پر دوسری جگہوں پہ نور کو تلاش کر رہے تھے) بھی جلدی سے اپنا اپنا کام چھوڑتے وہاں پہنچے۔

”ارحم..“ زارون نے ایک کمرے کے کھلے دروازے کی جانب اپنا رخ کیا تو دو گارڈز نے بھی اُس کی پیروی کی۔

”سر آپ پچھے ہو جائیں“، اُس شخص نے بھاگنے کی کوشش میں پھر سے فائر کیا تو ایک گارڈ نے آگے بڑھتے زارون کو دھکا دے کر دوسرا جانب کیا جوار حم کو زمین پہ گردی کیا کہ بالکل ساکت ہو چکا تھا۔

”ار حم..“ نور کی فکر بھلائے اُس نے دونوں جانب سے ہونے والی فائر نگ کی پرواکیے بناء ہی گارڈ کے ہاتھوں سے نکلتے اپنار خار حم کی جانب کیا۔

”ار حم آنکھیں کھولو“، اُس کا سراپنی گود میں رکھتے زارون نے اُس کے چہرے کو تھپتا یا۔ ”ار حم، میری جان آنکھیں کھولو میں تمہیں کچھ نہیں ہونے دوں گا“، پاگلوں کی طرح اُس کے سر اور سینے سے نکلتے خون کو دیکھتے زارون نے اُسے اپنے سینے سے لگایا۔

”سر آپ کی بیوی کی حالت بہت خراب ہے وہ اندر واش روم میں بے ہوش ڈری ہیں۔ آپ جائیں انہیں سنبھالنے ہم ارجمند کیلئے گے“، ان میں سے ایک گارڈ نے اُس شخص کو ہلاک کرتے ہی کمرے کی کمرے کی تلاشی لیتے زارون کو اطلاع کی جوار حم کی حالت دیکھتے ہی ہمت ہار چکا تھا۔

”سر پلیز یہ وقت سوچنے کا نہیں ہے۔ پلیز آپ اپنی بیوی کو دیکھیں ان کی حالت بہت خراب ہے“، دبے لفظوں میں زارون کو نور کے بارے میں بتاتے ہاشم صاحب کے پرسنل گارڈ نے کسی اور کو اُسے ہاتھ لگانے سے منع کیا۔

”نور...“ اُس کی آواز پہ ہوش میں آتے زارون نے زیر لب اُس کا نام لیا اور رحم کو گاڑی میں ڈالنے کا کہتے ہوئے گارڈ کے اشارہ کرنے پہ جلدی سے واش رومن کی جانب بڑھا۔

”نور؟“ اُسے بے سد ساز میں پر پڑا دیکھ اُس کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی پر پھر بھی اُن دونوں کی زندگی کی خاطر زارون نے حوصلہ کیا اور آگے بڑھتے اُسے اپنے بازوں میں اٹھایا جس کی پیشانی پر پٹی پی جمے خون کے ساتھ ساتھ پشت بھی خون سے بالکل تر ہو چکی تھی۔

-----

”سر ہم نے تمام لڑکیوں کو آپ کے فارم ہاؤس پہنچا دیا تھا اور اللہ کا بڑا کرم ہے کہ وہ تمام اب ہوش میں ہونے کے ساتھ ساتھ کافی حد تک بے خوف ہو کر ہمیں اپنے گھروالوں کے متعلق بتا چکی ہیں،“ اُس پٹھان کے کمرے میں آکر اُسے سیلوٹ کرنے کے بعد ایک فوجی نے اُسے تمام نئی معلومات کے بارے میں آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے، آپ لوگ بس اُن کے بتائے ہوئے نمبر پہ کال کر کہ اُن کے گھروالوں کو اُن کی بیٹیوں کے صحیح سلامت اور ہمارے پاس ہونے کی اطلاع کر دیں تاکہ اُن کے والدین کے دل کو تھوڑی تسکین مل جائے اور ابھی مجھے سر کو تمام حالات کے متعلق بتانا ہے اس لیے باقی معاملات

میں صحیح دیکھوں گا، اپنے گلے سے اسکارف اُتار کر سامنے میز پر رکھتے اُس پڑھان نے (جو ایک آرمی آفیسر تھا مگر پچھلے کچھ مہینوں سے وہ لڑکیوں کے سملگلنگ کے کیس میں بھیں بدل کر مجری کرتے اصل مجرموں کو تلاش کرنے کی کوشش میں لگا تھا اور آج پورے آٹھ مہینوں کی محنت کے بعد وہ ثبوت توں سیمت اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا تھا) اگلی ہدایت جاری کی تو اُس نے جی سر کہتے اُسے پھر سے سیلوٹ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”افف بہت تھک گیا آج تو،“ اُس فوجی کے جاتے ہی اُس آفیسر نے ایک بھرپور انگڑائی لی اور اگلے دس منٹ میں اپنے سے اعلیٰ عہدے پہ موجود آفیسر کے سامنے حاضر ہونے کے لیے اپنا یونیفارم لیتے واش روم کی جانب بڑھ گیاتا کہ جلدی سے تیار ہوتے اُن کے پاس جاسکے۔

-----

”یہ ارجمند کہاں ہے؟ صحیح سے نظر نہیں آیا،“ ہاشم صاحب جودو پھر سے آفس سے واپس آئے تھے اُنہوں نے کلاک پر رات کے دس بجتے دیکھ کر آئمہ بیگم سے پوچھا۔

”پتا نہیں، مجھے پہلے کبھی بتا کر گیا ہے کیا؟ جو آج جاتا،“ اپنے موبائل سے نظریں ہٹاتے آئمہ بیگم نے لاپ تولی سے جواب دیا۔

”پتا نہیں کیا کرتا پھر تاہے یہ لڑکا، کتنی بار کہا ہے کہ جہاں بھی جانا ہو، کسی کو بتا کر جایا کرے“، ان کے جواب پر پیشانی پر بل لیے ہاشم صاحب نے ارحم کو کال کرنے کے لیے سائیڈ ٹیبل پر پڑا اپنا موبائل اٹھایا جو ان کے نمبر ڈائل کرنے سے پہلے ہی بجھنے لگا۔

”اب اسے اس وقت کیا مصیبت پڑ گئی ہے“، اسکرین پر اپنے گارڈ کا نام چمکتا دیکھ ہاشم صاحب نے ناچاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کی۔

”ہاں بولو؟ کیا مسئلہ ہے؟“، کسی سلام دعا کے بغیر لمحے میں جھنجلا ہٹ لیے ہاشم صاحب نے دوسری جانب سوال کیا تو گارڈ نے مختصر الفاظ میں انہیں جو خبر دی وہ ان کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھی۔

”کس ہسپتال میں ہوتم؟ اور یہ سب کیسے ہوا؟“ میں نے تم لوگوں سے بولا تھا ان کہ اُس کے ساتھ رہنا“، موبائل کان سے لگائے ہی ہاشم صاحب ہکلاتے ہوئے لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ سائیڈ ٹیبل کا سہارا لیا۔

”کیا ہوا؟ کون ہے ہسپتال میں؟“، ان کی حالت دیکھ کر آئمہ بیگم نے اپنا موبائل رکھتے انہیں سنبھا لنما جو کسی بھی وقت گرنے والے تھے۔

”ہاشم کیا ہوا ہے؟ آپ بول کیوں نہیں رہے؟ کون ہے ہسپتال میں؟“ ان کی خاموشی پر موبائل ان کے ہاتھ سے لیتے آئمہ بیگم نے کان سے لگایا تو دوسرا طرف سے کال کٹ چکی تھی۔

”ہاشم بولیں؟ کیوں مجھے پریشان کر رہے ہیں؟“ انہیں سہارادے کر بیڈ پہ بٹھاتے آئمہ بیگم نے اپنے ملازم کو آواز دیتے پانی لانے کا کہا۔

”ار... حم... ہمارا بیٹا... مجھے ہسپتال جانا ہے تم بس جلدی چلو،“ ان کی آوز پہ ہوش میں آتے یہ چند الفاظ ہاشم صاحب کی زبان سے نکلے تو آئمہ بیگم کی زبان کے ساتھ ان کے قدم بھی رک گئے۔

”ار حم؟ کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو؟ ہاشم بتائیں وہ ٹھیک ہے نا؟“ انکھوں سے تو اتر سے نکلتے آنسوؤں پہ بدواس ہوتے وہ جلدی سے ہاشم صاحب کا گریبان تھام گئیں۔

”نہیں پتا بس تم چلو،“ باتوں میں وقت ضائع کرنے کی بجائے انہیں اپنے ساتھ لیے وہ باہر کی جانب بڑھے اور ڈرائیور کو گاڑی نکالنے کا کہا جو ان کا حکم ملتے ہی تیزی سے گراج کی جانب بڑھا۔

اپنی زندگی کے دو بہت عزیز رشتہوں کو یوں بے جاندی کیہ کر زارون کی اپنی حالت خراب ہو چکی تھی۔ وہ انہیں ہسپتال پہنچاتے ہی گم صم سا ہو کر نیچے زمین پہ بیٹھ گیا تھا۔ ”سر پلیز خود کو سنجا لیں،

اللہ نے چاہا تو احمد سر اور آپ کی بیوی بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گے، ہاشم صاحب کے پر سنل گارڈ نے (جو احمد کی وجہ سے زارون کو بھی اچھے سے جانتا تھا) اُسے یوں خستہ حالت میں بیٹھا دیکھ کے تسلی دی۔

”زندگی بہت بڑے امتحان لیتی ہے پر جو قیامت آج مجھ پہ ٹوٹی ہے اس کا اندازہ کوئی چاہ کر بھی نہیں کر سکتا“، کسی کے سہارا ملنے پر آنسو جو ضبط کے مارے آنکھوں میں ٹھہر گئے تھے ایک دم سے اُس کے گالوں پہ بہہ نکلے۔

”سر پلیز حوصلہ رکھیں اور دعا کریں اللہ کی ذات بہت بے نیاز ہے“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے اُس چالیس سال کے قریب شخص نے اُس کے چہرے سے اُس کے اندر اٹھتے طوفان کا اندازہ لگایا۔

”حوصلہ؟ ہونہہ، میرے سارے حوصلے وہاں اندر لیئے شخص کے ساتھ جوڑے ہیں۔ میری زندگی میری خوشیاں پچھلے پانچ سالوں سے اس ایک شخص کے ساتھ منسلک ہیں۔ نہیں میں حوصلہ نہیں کر سکتا“ گران دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کچھ ہوا میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر پاؤں گا“، لبجے میں خوف اور آنکھوں میں بے بسی لیے زارون نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑا۔

”سر پلیز خود کو سنبھالیں آپ ایسا کریں گے تو آپ کی بیوی کو کون سنبھالے گا؟ آپ پلیز ان کے پاس جائیں ہم یہاں ہیں ارحام سر کے پاس اور میں نے بڑے صاحب کو بھی کال کر دی ہے وہ بھی کچھ دیر میں پہنچ جائیں گے“، نور کے بارے میں یاد دلاتے گارڈ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو اُس کی بات سننے کے بعد بھی آئی سی یو کے سامنے سے نہیں اٹھا تھا۔

”مجھے نہیں جانا اُس کے پاس۔ مجھے یہی رہنا ہے ارحام کے پاس“، دروازے کی طرف نظریں جمائے زارون نے نور کو اُس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا کیونکہ آج اُسی کی وجہ سے ارحام اس حال میں تھا۔

”ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں، آپ پلیز یہاں سے اٹھے اور اوپر بیٹھیں“، اُس کے انکار پر بڑے تحمل کا مظاہرہ کرتے اُس نے زارون کو وہاں موجود کر سیوں پہ بٹھانا چاہا مگر وہ نفی میں سر ہلاتے اُس سے اپنے ہاتھ چھڑوا گیا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا دور ہو جاؤ سب مجھ سے“، اوپری آواز میں چلاتے اُس نے گارڈ کو دھکا دیا تو وہ اپنے باقی ساتھیوں کو اُسے سنبھالنے کا بولتے نور کو دیکھنے دوسری وارڈ کی جانب بڑھا۔

-----

”یہ زارون پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے۔ احمد پلیز آپ اُس سے کال کر کہ پوچھیں، پتا نہیں میرا دل بہت گھبر ارہا ہے“، چار سے پانچ بار باہر کا چکر لگانے کے بعد بھی جب زارون کے آنے کی کوئی امید نہ ہوئی تو عابدہ بیگم نے کمرے میں آتے احمد صاحب سے کہا جو ان کے بولنے سے پہلے ہی زارون کو دو تین بار کال کر چکے تھے۔

”ہاں میں نے کال کی ہے پر وہ رسیو نہیں کر رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہیں مصروف ہو“، ان کو تسلی دینے کے ساتھ احمد صاحب نے اپنے دل کو بھی مطمئن کیا۔

”مصطفیٰ کہاں ہونا؟ وہ تونر کی تلاش میں نکلا تھا اور آپ ارحم کو کال کریں۔ پوچھیں اُس سے وہ کہاں ہے؟“، عابدہ بیگم جو دو پھر میں زارون کے منہ سے ارحم کے ساتھ ہونے کا سن چکی تھیں، انہوں نے بے چینی سے کمرے میں ٹھلتے احمد صاحب سے کہا جو ان کی بات سننے ہی اپنے موبائل سے ارحم کا نمبر ڈائیل کرنے لگے۔

”نمبر بند ہے“، موبائل کان سے ہٹاتے انہوں نے پھر سے اُسے ری ڈائل کیا۔ ”پتا نہیں کیا کرتے پھرتے ہیں یہ لڑکے؟ ایک تو پہلے ہی نور کی اتنی پریشانی ہے اوپر سے یہ دونوں بھی غائب ہیں“، دوسری بار کال کرنے پر بھی مایوسی ہوئی تو احمد صاحب نے زارون کی غیر ذمہ داری پر غصے کا اظہار کیا۔

”تو کیا کرے؟ جب سے وہ لڑکی میرے بیٹے کی زندگی میں آئی ہے ایک سینڈ کا بھی سکون نہیں ملا اُسے، پتا نہیں کیسی منحوس ہے پہلے اپنے باپ کو کھائی اب میرے بیٹے کی پیچھے پڑی ہے“، ایک ہی سانس میں پریشانی اور غصے کے ملے جلے تاثرات لیے عابدہ بیگم نے ایک بار پھر سے نور کو قصوروار ٹھہرایا۔

”میں آپ کو بتا رہی ہوں اگر میرے بیٹے کو اُس لڑکی کی وجہ سے کچھ ہوا تو میں آپ کو کبھی معاف نہیں کروں گی“، احمد صاحب کی خاموشی پر انہوں نے دل میں اٹھنے والی بے چینی پر قابو پاتے اپنی بات مکمل کی۔

”پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے آپ کو ایک دم سے؟ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آپ نور کی فکر میں اُس کی والدہ سے جھوٹ بول رہی تھیں اور اب اپنے بیٹے کی بات آئی ہے تو آپ اُسی نور کو قصوروار ٹھہر ار رہی ہیں؟“، ایک گھری سانس لیتے احمد صاحب نے اُن کے بدلتے رنگوں پر حیرت کا اظہار کیا۔

”تو کیا کروں؟ میرا بیٹا کل سے بھوکا پیاس اُس کی فکر میں پاگل ہو رہا ہے اور آپ چاہتے ہیں میں اپنی زبان پر قفل ڈال لوں؟ خاموش ہو جاؤ؟“، اُن کی بات سمجھنے کی بجائے عابدہ بیگم نے لہجے میں کرواہست لیے اُن کی بات کاٹی۔

”نہیں آپ بولیں، آپ کا حق ہے پر برائے مہربانی ایسے الفاظ اپنی زبان سے نہ نکالیں جس پر بعد میں آپ کو اپنے آپ سے نظریں ملاتے ہوئے شرم محسوس ہوا اور ہاں، لوگ سچ کہتے ہیں ساس کتنی بھی اچھی کیوں نہ ہو پر! کبھی ماں نہیں بن سکتی اور آپ نے کل سے ایسی فضول باتیں کر کے اس کہاوت کو چھٹنگی دے دی ہے“، اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی لیے احمد صاحب نے ان کی سوچ پر افسوس کیا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑتے کمرے سے باہر نکلے تاکہ ارحم کی طرف جا کر زارون کے بارے میں پوچھ سکیں۔

”سر، آپ کی بیوی کی حالت کافی خراب ہے۔ پلیز آپ ایک بار جا کر انہیں دیکھ لیں“، لیڈریز وارڈ سے واپسی پر اس گارڈ نے چہرے پر پریشانی لیے اُسے کہا جو نظریں آئی سی یو کے دروازے پہنکائے گم صم سا بیٹھا تھا۔

”سر پلیز ہمت کریں۔ آپ کی بیوی کو آپ کی ضرورت ہے“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے اُس شخص نے اُسے احساس دلایا جو ایک انجان نظر اُس کے چہرے پہ ڈالتے اپنی خاموشی برقرار رکھے ہوئے تھا۔

”سر پلیز، ڈاکٹر نے کچھ پپر زپ سائنس کروانے ہیں اور آپ کے ہوتے ہوئے میں یہ ذمہ داری پوری نہیں کر سکتا“، دبے لفظوں میں اپنے اصرار کی وجہ بتاتے اُس نے زارون کو سمجھانے کی کوشش کی جو پھر سے ایک نظر آئی سی یو کے بندرو روازے پہ ڈالتے نفی میں سر ہلا گیا۔

”نہیں، مجھے کہیں نہیں جانا اور جہاں بھی سائنس کرنے ہیں آپ کر دیں۔ مجھے نہ تواب اُس کے زندہ رہنے سے کوئی فرق پڑے گا اور نہ ہی مر نے سے“، اُس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹاتے زارون نے ارحم کی حالت کا ذمہ دار نور کو ٹھہراتے سنگدی سے اپنا فیصلہ سنا یا اور ہاشم صاحب کے ساتھ آئمہ بیگم کو آتاد کیجھ کر جلدی سے اٹھ کے اُن کی جانب بڑھا جو ارحم کو ابھی تک آئی سی یو میں دیکھ کر بالکل ہمت ہار چکے تھے۔

”یہ اس پیشہ کے ساتھ کون ہے؟“ نور کی حالت خون بہنے کی وجہ سے خراب ہو رہی تھی تب ہی ڈاکٹر نے اُس کے گھروالوں کی طرف سے بر قی جانے والی لاپرواہی پر تھوڑا غصہ دکھایا۔

”جی میدم وہ... ایک لڑکا نہیں یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ مطلب وہ مجھے دوبارہ نظر نہیں آیا البتہ ایک شخص ہے وہ بار بار آگر اس لڑکی کا علاج شروع کرنے کا کہہ رہا ہے“، ایک نظر اس بے سُدھ پڑے وجود پہ ڈالتے نرس نے ڈاکٹر کو تفصیل بتائی۔

”مطلب اس کے ساتھ کوئی نہیں ہے؟“ اس کی بات سنتے ڈاکٹر فائزہ کو اس لڑکی پہ ترس آیا جو پچھلے آدھے گھنٹے سے ایسے ہی لاوارثوں کی طرح خون میں لٹ پٹ پڑتی تھی۔

”یہ تو معلوم نہیں میدم پر شاید لاوراث ہی جوا بھی تک کوئی بھی اس کے علاج کی فکر میں یہاں نہیں آیا“، نرس نے اپنا اندازہ لگایا تو ڈاکٹر فائزہ نے انسانیت کے ناتے کسی کی بھی اجازت کے بغیر اُس کا نام لاوارثوں کی فہرست میں لکھتے اپنی ذمہ داری پہ اُس کا علاج شروع کیا۔

-----

احمد صاحب ہاشم لاپنچے تو وہاں گارڈ کی زبانی ارحم کے ہسپتال ہونے کا سُن کر ان کے پاؤں نچے سے زمین نکل گئی تھی۔

”کون سے سے ہسپتال میں ہے؟ کوئی اندازہ ہے آپ کو؟“ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتے احمد صاحب نے اُس سے پوچھا جو اپنی لاعلمی پر نفی میں سر ہلا گیا۔

”نہیں صاحب مجھے نہیں پتا اور یہ ہسپتال کا بھی مجھے ابھی کچھ دیر پہلے ہی ڈرائیور کی زبانی پتا چلا ہے،“ انہیں تفصیل سے ساری بات بتاتے چوکیدار نے ارجم کے ٹھیک ہونے کی دعا کی تو احمد صاحب نے اُس کی بات کمل ہوتے ہی اُس کا شکر یہ ادا کیا اور اپنا موبائل نکالتے زارون کا نمبر ڈائل کرنے لگے جو خوش قسمتی سے دوسرا ہی بیل پر ریسیو کر لیا گیا۔

”زارون؟ کہاں ہو تم؟ تم ٹھیک ہونا؟ ارجم کو کیا ہوا ہے؟ وہ کیوں ہسپتال میں ہے؟ تم بھی اُس کے ساتھ ہو؟“ ایک ہی سانس میں پریشانی کے مارے انہوں نے کئی سوال کیے۔

”جی میں ٹھیک ہوں پر ارجم کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ پلیز ابو آپ بس جلدی ہسپتال آجائیں،“ اس بار خود کو سنبھالتے زارون نے نم آواز میں کہتے انہیں ہسپتال کا نام بتایا۔

”ہاں میں بس کچھ ہی دیر میں پہنچ رہا ہوں تم پریشان نہ ہو،“ اُسے تسلی دیتے احمد صاحب نے گاڑی میں بیٹھتے ہی گاڑی کو روپس کرتے زارون کے بتائے گئے ہسپتال کی جانب موڑا۔

-----

”ڈاکٹر کیسی طبیعت ہے اب میرے بیٹے کی؟ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“ آئمہ بیگم کو تسلی دیتے ہاشم صاحب نے آئی سی یو سے ڈاکٹر کو باہر آتا دیکھ کر جلدی سے اُن کے قریب آتے پوچھا۔

”جی ہم نے گولیاں نکال دیں ہیں پر اگلے چوبیس گھنٹے آپ کے بیٹے کی زندگی کے لیے بہت اہم ہیں۔ یہ گھنٹے اُسے زندگی کی طرف واپس لا سکتے ہیں اور نہیں بھی، اس لیے پلیز آپ ان کے لیے دعا کریں“، ہاشم صاحب کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ڈاکٹر نے ڈاکٹر نے انہیں ارحم کی حالت کے متعلق بتایا۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟ نہیں میرے بیٹے کو کچھ نہیں ہو گا۔ پلیز ڈاکٹر آپ کو جتنا پیسہ چاہیے لے لیں۔ آپ کو دنیا کے کسی بھی حصے سے ڈاکٹر کی ضرورت ہے میں آپ کو بلا کے دوں گا پر پلیز میرے بیٹے کو بچالیں“، ڈاکٹر کی طرف سے نامیدی پر بے بسی کی انتہا پر پہنچتے ہاشم صاحب نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگی۔

”سر پلیز ایسا مت کریں اور ہم لوگ تو بس اپنی سی ایک کوشش کر سکتے باقی سب کام تو اللہ پاک کا ہے اس لیے آپ اس طرح میرے سامنے گڑا گڑنے کی بجائے اُس سے مانگے جو زندگی اور موت دینے کا اختیار رکھتا ہے اور طاقت بھی“، ان کے ہاتھ نیچے کرتے ڈاکٹر نے بڑی نرمی کے ساتھ کہتے اپنی بات کو جاری رکھا۔ ”باقی رہی بات پیسوں کی تو؟ انسان دنیا کی ہر چیز پیسوں سے خرید سکتا ہے پر کسی کی سانسیس نہیں، اس لیے اس وقت اپنے بیٹے کی زندگی کو ان کاغذ کے چند نوٹوں کے عوض خریدنے کی کوشش کرنے کی بجائے اللہ پاک سے دعا کریں کہ وہ آپ کی مشکلیں آسان

فرمائے، ان کے پیسے کے غرور کو چند منٹوں میں خاک میں ملاتے ڈاکٹرنے ایک بار پھر سے انہیں تسلی رکھنے کا کہا اور نرس کے بلا نے پہ واپس اندر کی جانب بڑھ گیا۔

”انکل کیا ہوا؟ کیا کہہ رہا تھا ڈاکٹر؟ ارحام ٹھیک ہے نا؟“ زارون جو احمد صاحب کی بار بار کال آنے پر ایک سائیڈ پہ ہو کہ ان سے بات کر رہا تھا واپسی پر ڈاکٹر کو آئی سی یو میں جاتا دیکھا شم صاحب سے پوچھنے لگا جو اپنی سانس رو کے بالکل ساکت کھڑے تھے۔

”انکل کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟“ دوسری طرف سے جواب نہ ملنے پر زارون نے فکر مندی سے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے اپنی جانب متوجہ کیا تو وہ سوچ سے نکلتے اُس کی جانب دیکھنے لگے۔

”کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہے نا؟“ انہیں خاموش دیکھا زارون نے اک بار پھر سے اپنا سوال دوہرا یا۔

”ہاں آپر لیشن کا میاب رہا پر اگلے چوبیس گھنٹے ارحام کے لیے اہم ہیں اس لیے ڈاکٹرنے دعا کا بولا ہے،“ اپنے ضمیر کی ملامت پر زارون کی بات کا جواب دیتے انہوں نے اپنی شکست محسوس کرتے شرمندگی سے سر جھکایا۔

”انکل آپ ٹھیک ہیں؟“ ان کے زرد پڑتے رنگ کو دیکھتے زارون نے انہیں سہارا دے کر ساتھ لگی کر سیوں میں سے ایک پہ بیٹھایا۔

”ہاں، ٹھیک ہوں تم بس ارحم کے پاس رہنا میں ذرا نفل پڑھ کہ آتا ہوں“، اُسے اپنی جانب سے تسلی دیتے ہاشم صاحب نے اٹھ کے ساتھ ہی موجود کمرے کا رخ کیا جہاں کچھ دیر پہلے ہی آئمہ بیگم بھی ارحم کی صحت کے لیے نفل پڑھنے کی غرض سے گئی تھیں۔

---

اگلے دس منٹوں میں احمد صاحب ہسپتال پہنچے تو زارون نے انہیں آتے ہی ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔

”نور کہاں ہے؟ اُس کی طبیعت کیسی ہے؟ اور تم یہاں ہو تو اُس کے پاس کون ہے؟“ اس کی ساری بات سننے کے بعد احمد صاحب نے فکر مندی کا اظہار کرتے سوال کیا۔

”پتا نہیں مجھے“، ان کے سوال پہ نظریں چراتے زارون نے لا علمی ظاہر کی تو احمد صاحب نے حیرت سے اُس کے چہرے کی جانب دیکھا۔

”کیا مطلب تمہیں نہیں پتا کہ وہ کس حال میں ہے؟ یہ کیسی بات ہوئی؟ زارون؟ بتاؤ مجھے کیا بات ہے؟ کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟“ اس کی اس قدر لاپرواٹی پہ ماتھے پہ تیوری ڈالے احمد صاحب کو اُس کے لبھ سے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا۔

---

”کچھ نہیں اور میرے دماغ میں کچھ نہیں چل رہا۔ میرا بس دل نہیں کیا اس لیے نہیں گیا اس کے پاس“، احمد صاحب کی جانب سے سختی پر زارون نے نظریں ملائے بغیر انہیں بتایا۔

”بہت ہی افسوس کی بات ہے زارون مجھے تم سے بالکل بھی ایسی بے حسی کی امید نہیں تھی“، اس کی بات سنتے ہی احمد صاحب کا پارہ مزید چڑھ چکا تھا تب ہی انہوں نے کچھ بھی سنے یا کہے بغیر اپنے قدم لیڈیز وارڈ کی جانب بڑھائے تاکہ نور کو جا کر دیکھ سکیں۔

-----

”نور، مطلب زارون کی بیوی، کہاں ہے؟ آپ کو کچھ معلوم ہے؟“ لیڈیز وارڈ میں آتے احمد صاحب نے ہاشم صاحب کے گارڈ پر نظر پڑتے ہی سوال کیا جاؤ نہیں دیکھتے ہی پہچان چکا تھا۔ ”جی وہ اُس کمرے میں ہیں“، سامنے موجود کمرے کی جانب اشارہ کرتے اُس نے شکر ادا کیا کہ کوئی اپنا اُس لڑکی کی حالت پر پریشان ہوتے اُس کے پاس آیا۔ ”نور، کیسی طبیعت ہے اب میری بیٹی کی“، دروازے پہ دستک دیتے وہ اندر داخل ہوئے تو ڈاکٹر پہلے ہی اُس کے زخم صاف کرنے کے بعد پیاں وغیرہ کر چکی تھی۔

”جی اب بہتر ہے۔ آپ کون ہیں؟ کیا لگتے ہیں آپ امسٹرکی کے؟“ ان کی بات کا جواب دیتے ڈاکٹر نے اتنی دیر بعد اُس کے لیے کسی کے چہرے پر پیشانی دیکھی تو پوچھے بناءنہ رہ سکی۔

”یہ میری بیٹی ہے اور یہ بے ہوش کیوں ہے؟ کب تک ہوش میں آئے گی؟“ ڈاکٹر کی حیرت پر احمد صاحب نے زارون کی حرکت پر آنے والے غصے کو ضبط کرتے ایک نظر نور کی پیشانی پر بندھی پڑی کو دیکھا۔

”ہوش آنے میں ابھی وقت لگے گا کیونکہ ان کے جسم پر کافی زخم آئے تھے جن کا علاج کسی سر پرست کے نہ ہونے کی وجہ سے جلد شروع نہیں کیا جاسکا اور ابھی بھی میں نے اپنی ذمہ داری پر ان کا ٹریمنٹ کیا ہے بس آپ اللہ سے اچھی امید رکھیں اُس نے چاہا تو یہ بہت جلد ہوش میں آجائیں گی“، احمد صاحب کے شفقت بھرے چہرے کو دیکھ ڈاکٹر نے نور کی حالت کے بارے میں انہیں آگاہ کیا جو نظروں میں پیشانی لیے اُس کی تمام ہدایات سن رہے تھے۔

-----

”پتا نہیں کہاں رہ گئے ہیں۔ بندہ فون کر کے ہی بتا دیتا ہے پر نہیں بس دوسرے لوگوں کی پرواہ ہے اپنوں کی نہیں“، احمد صاحب کے جاتے ہی کچھ دیر تک ان کے فون کا انتظار کرنے کے بعد عابدہ

بیگم نے انا کے ہاتھوں مجبور دو تین بار کال کرنے کے لیے موبائل اٹھایا پر پھر سے بغیر کال کیے ہی واپس رکھ دیا مگر اب رات کا ایک بختاد لیکھ پر پریشانی سے اُن کی حالت خراب ہونے لگی تو انہوں نے احمد صاحب کی بجائے زارون کا نمبر ڈائل کیا۔

”زارون کہاں ہوتے؟ کوئی احساس ہے تمہیں کہ ایک ماں بھی گھر ہے؟ کب سے میں تمہیں کال کر رہی ہوں پر مجال ہے کہ میری کسی کو فکر ہو“، دوسری طرف اُس کی آواز سننے ہی عابدہ بیگم نے اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر غصے سے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

”جی، بس ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ ارحم کی کچھ طبیعت خراب ہے تو میں اُسے لیکر ہسپتال آگیا۔ ابو بھی یہی ہیں بس آپ پر پریشان نہ ہوں اور آرام کریں“، گولی والی بات کو گول کرتے زارون نے اپنے لہجے کو ہموار کھنے کی کوشش کی۔

”کیا ہوا ارحم کو؟ سب ٹھیک ہے نا؟ زیادہ طبیعت خراب ہے کیا اور دوپھر میں تم سے بات ہوئی تب تو تم نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تو پھر اچانک سے کیا ہو گیا؟“، اُس کی بات سننے ہی عابدہ بیگم نے پر پریشانی میں ایک ساتھ کئی سوال کیے۔ ”جی، ٹھیک ہے اور بس آپ پر پریشان نہ ہوں میں کچھ دیر بعد آپ کو کال کروں گا“، ایک دم سے آئی سی یو کے باہر ہاچل محسوس کرتے زارون نے دوسری

جانب سے کوئی بھی بات سنے بغیر کال کاٹی اور جلدی سے اُس جانب بڑھا جہاں کچھ ہی منٹوں میں دو سے تین ڈاکٹر زدا خل ہو چکے تھے۔

---

”سر کیا مسئلہ ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟“ آئی سی یو کی جانب بڑھتے ایک ڈاکٹر کو روکتے زارون نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں، اُن کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بس آپ دعا کریں،“ اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ڈاکٹر نے اُس کی بات کا جواب دیا اور جلدی سے اندر کی جانب بڑھ گیا تو اُس کی پشت کو پتھرائی ہوئی۔ نظروں سے دیکھتے زارون کو اپنے دل کی دھڑکن بند ہوتی محسوس ہوئی۔

”زارون کیا ہوا؟ تم ایسے کیوں کھڑے ہو سب ٹھیک ہے نا؟“ اُسے گم صم سما کھڑا دیکھا شم صاحب نے نمازوں کے نکلتے اُس کے قریب آتے لجھے میں بے چینی لیے سوال کیا تو آئمہ بیگم بھی اُن دونوں کو ساتھ دیکھ کے قریب آئیں۔

”ج... جی ٹھیک... ہے سب...، آپ پریشان نہ ہوں“، باری باری اُن دونوں کے چہرے پر رقم اذیت دیکھا زارون نے اپنے لجھ کی لڑکھڑاہٹ پہ قابو پاتے اُن سے نظریں چڑائیں اور کچھ دیر میں

---

آنے کا بولتے دل خراب ہونے کی وجہ سے دوسری جانب موجود واش رو مز کی طرف بڑھا جہاں پہنچتے ہی اُسے ایک دم سے قے آئی تو منہ سیست ناک سے بھی خون بہنے لگا۔

”خون؟ یہ کیوں نکل رہا ہے؟ ہاتھ سے ناک سے نکلتا خون صاف کرتے اُس نے واش بیسن میں موجود خون کو بے تینی سے دیکھا اور جلدی سے ٹل کھولتے پانی اپنے چہرے پہ ڈالا۔

”نه... میں کچھ نہیں ہوا... مجھے ہمت نہیں ہارنی، ابھی ارحم کو میری ضرورت ہے“، شیشے میں اپنے چہرے کو دیکھتے اُس نے اپنی حالت پہ حوصلہ ہارنے کی بجائے ہمت کر کہ اپنے منہ میں پانی ڈالتے کلی کی اور ہر بات کو فراموش کرتے باہر نکلاتا کہ آئی سی یو کے قریب جا کر ڈاکٹر سے ارحم کے طبیعت کے بارے میں پوچھ سکے جس کے متعلق اُس نے ہاشم صاحب اور آسمہ بیگم کو بھی اُن کی پریشانی دیکھ کے کچھ نہیں بتایا تھا۔

-----

”اما، آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ سکون سے سو جائیں“، رضا جو پیاس کی وجہ سے آنکھ کھلنے پر کچن میں پانی پینے آیا تھا، نائلہ بیگم کے کمرے کی جلتی لائٹ پہ متوجہ ہوتے اُس جانب بڑھا۔

”ہاں بس نیند نہیں آرہی تھی تو سوچا کچھ دیر قرآن پاک پڑھ لوں“، رضا کی آواز پر مڑ کر دروازے کی جانب دیکھتے انہوں نے اپنے سامنے کھلے قرآن کو بند کیا۔

”کیا ہوا کیوں نیند نہیں آرہی؟ میں نے آپ کو سمجھایا تھا کہ وہم جتنا کیا جائے اُتنا ہی بڑھتا ہے اس لیے خود کو پر سکون رکھیں“، ان کے قریب آکر بیٹھتے اس نے پھر سے اپنی بات دھرائی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نائلہ بیگم ابھی بھی نور کے بارے میں سوچ کر پریشان ہیں۔

”وہم؟ ماں کے دل کو اپنی اولاد کے بارے میں کبھی وہم نہیں ہوتے اُسے تو الہام ہوتے ہیں۔ اولاد کو خراش بھی آئے تو ماں کے دل کو فوراً پتا چل جاتا ہے اور میں جانتی ہوں کہ میری نور ٹھیک نہیں ہے تب ہی میرے دل کو کل سے اتنی بے چینی ہو رہی ہے،“، اُس کی بات پر نم آنکھوں سے مسکراتے نائلہ بیگم کے لہجے میں بھی نمی آئی۔

”جانتا ہوں پر ایسے پریشان ہونے سے آپ کی اپنی صحت خراب ہو گی اور میں نے آپ سے وعدہ کیا ہے ناکہ کل پھر سے میں نور آپی کے گھر جاؤں گا تو کیوں پھر آپ یوں رورو خود کو ہلاکان کر رہی ہیں؟“، ان کے گال پہ بہتے آنسوؤں کو صاف کرتے رضانے تسلی دی تو نائلہ بیگم نے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”تم کیوں اٹھے ہو؟ طبیعت ٹھیک ہے؟“ اپنے دوپٹے سے آنکھیں صاف کرتے انہوں نے کلاں کی جانب دیکھتے بات بدلتی۔

”جی ٹھیک ہوں پیاس لگی تھی تو پانی پینے آیا تھا،“ ان کی بات کا جواب دیتے رضا نے وہاں موجود سائیڈ ٹبل پر رکھی بوتل سے پانی گلاس میں ڈالا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم جا کر سو جاؤ میں بھی اب سو جاؤں گی،“ اُس نے پانی ختم کیا تو نائلہ بیگم نے اُسے اپنی جانب سے مطمئن کیا۔

”نہیں، میں یہی آپ کے پاس ہی ہوں اور جب تک آپ نہیں سوئیں گی میں بھی جا گتا رہوں گا،“ ان کے بہانے پر رضا نے کہنے کے ساتھ ہی بیڈ کی دوسری جانب جاتے تکیہ ٹھیک کیا۔

”بہت ضدی ہو تم بھی،“ اُسے بیڈ پہ لیستا دیکھنا ملہ بیگم نے قرآن پاک اٹھا کر الماری میں رکھا اور نیند نہ آنے کے باوجود بھی رضا کی بے آرامی کا سوچتے خاموشی سے آکر بیڈ پہ لیٹ گئیں تاکہ وہ سکون سے سو سکے۔

صحح چاربجے کے قریب نور نے تھوڑا ہوش سنبھالا تو احمد صاحب جو تب سے اُس کے پاس ہی تھے جلدی سے کرسی سے اٹھ کر بیڈ کے قریب آئے۔

”ز....ا...ر“، بند آنکھوں سے ہی اُس کا نام پکارتے نور نے سر میں اٹھنے والی تکلیف کے سبب اپنے آپ کو حرکت دینے کی کوشش کی۔

”نور پیٹا آنکھیں کھولو، بتاؤ اگر زیادہ درد ہے تو میں ڈاکٹر کو بلا لاؤ؟“ اُس کے سر پر نرمی سے ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے اُس کی زبان سے زارون کا نام سنتے اپنے اندر اٹھنے والے طوفان کو دبایا۔

”ز....ا...ر“، ایک بار پھر سے اُس کا نام پکارتے وہ خاموش ہوئی تو احمد صاحب نے اُس کے پر سکون ہوتے زارون کو اس بات کے لیے کبھی نہ معاف کرنے کارادہ کرتے کمرے سے نکلے تاکہ ڈاکٹر کو اُس کی نیم بے ہوشی کی حالت کا بتا کر ایک بارچیک کرنے کا بول سکیں۔

دوسری جانب پورے پانچ گھنٹے بعد ڈاکٹر نے ارحم کی جانب سے تسلی ظاہر کی تو زارون کے ساتھ ساتھ آئمہ بیگم اور ہاشم صاحب کی بھی جان میں جان آئی۔

”شکر ہے اللہ کا میں بس شکرانے کے نفل پڑھ لوں“، ڈاکٹر کے بتاتے ہی آئمہ بیگم نے ہاتھ اٹھاتے شکر ادا کیا اور نمازوں کی جانب بڑھیں تو ہاشم صاحب نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اتنے سالوں کی غفلت کے باوجود بھی ان کی دعائیں رد نہیں کی تھیں۔

”یہ لویہ پسے غریبوں میں بانٹ دو“، اپنے والٹ میں موجود کچھ نوت نکال کر گارڈ کو پکڑاتے انہوں نے کہا تو وہ سعادت مندی سے سر ہلاتے باہر کی جانب بڑھا۔

”زارون، مجھے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔ تم چاہو تو گھر چل کر کچھ آرام کر لوار حم اب ٹھیک ہے“، اُس کے قریب کرسی پہ بیٹھتے ہاشم صاحب نے اُس کی سرخ آنکھوں اور سپید پڑتے رنگ کو دیکھتے شفقت سے کہا۔ ”نہیں، انکل میں ٹھیک ہوں اور جب تک ارحم مکمل طور پہ ٹھیک نہیں ہو جاتا میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا“، پیٹ میں ہونے والی درد کی شدت کو برادرست کرتے اُس نے اُن کے اصرار پر انکار کرتے اپنا فیصلہ سنایا۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر میں جو س منگو اتا ہوں وہ پی لو۔ پتا نہیں کیوں مجھے تم ٹھیک نہیں لگ رہے“، اُس کے چہرے کی زردی دیکھ ہاشم صاحب نے فکر مندی کا اظہار کیا تو زارون نے انہیں اپنے ٹھیک ہونے کی تسلی دی اور انہیں کچھ دیر میں آنے کا کہتے اٹھ کر لیڈیز وارڈ کی جانب بڑھاتا کہ نور کو دیکھ سکے جسے وہ ارحم کی وجہ سے بد گمانی کا شکار ہوتے بالکل اکیلا اچھوڑ چکا تھا۔

-----

کمرے کے سامنے آتے اُس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ کھولا تو نور اُسے سامنے ہی بیٹھ پہ لیٹی نظر آئی۔

”یہ ابو کہاں گئے؟“ اُسے کمرے میں اکیلا دیکھ زارون کو حیرت ہوئی پر دل میں اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ احمد صاحب وہاں نہیں ہیں ورنہ جتنا ان کو غصہ تھا ہو سکتا تھا کہ وہ اُسے نور کو ایک نظر دیکھنے بھی نہ دیتے۔

”مجھے پتا ہے میں نے تمہارے ساتھ غلط کیا پر پتا نہیں کیوں ارحم کے ایک دم سے یوں بے جان ہونے نے میری جان نکال دی تھی،“ بیٹھ پہ لیٹے وجود کے قریب آتے زارون نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

”پر غصے میں جوز یاد تی میں نے تمہارے ساتھ کی اُس کے لیے میں شر مند ہوں۔ پتا نہیں کیوں میں اتنا بے حس ہو گیا تھا،“ خود ہی اپنی سوچ سے نفرت کرتے زارون نے با غور اُس کی پیشانی پر بندھی پڑی کو دیکھا۔

”جاننا ہوں، میں نے اُس وقت تمہارا ساتھ چھوڑا ہے جب تمہیں سب سے زیادہ میری ضرورت تھی پر! ارحم کی تکلیف نے میرے سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتیں مفلوج کر دی تھیں۔ مجھے سمجھ ہی نہیں آئی کہ اگر وہ میرے لیے اہم ہے تو تم بھی میری ذمہ داری ہو،“ اُس کا ہاتھ تھامتے زارون

نے اپنے لبوں سے لگایا تو اپنی بے اعتنائی پہ ضبط کے مارے اُس کی آنکھیں بالکل سرخ ہو گئیں۔

”تمہیں اجازت ہے اگر زندگی میں کبھی مجھ پہ ایسا وقت آئے تو تم بھی مجھے اکیلا چھوڑ دینا۔ میں

تڑپوں، تمہیں پکاروں توبہ بھی تم میرے قریب مت آنا۔ تم مجھے تنہا چھوڑ دینا اور میری اس اذیت کا بدلہ لے لینا جو آج میں نے تمہیں دی،“، ضبط کے باوجود بھی آنسو بے اختیار ہو کر اپنی بے بسی پہ اُس کی آنکھوں کے بند توڑنے لگے تو زارون نے ضبط سے آنکھیں بند کیں۔

”میں تمہارا گناہ گار ہوں پر یہ غلطی میں نے بے اختیاری میں کی یا شاید میرے لیے ارحم سے زیادہ اہم کوئی بھی نہیں ہے،“، اُس کے اوپر جھکتے زارون نے اُس کی پیشانی پہ نرمی سے بو سہ دیا تو نور نے کسی احساس کے تحت اپنی پلکوں کو حرکت دی۔

”ز...ار...“، نیم بے ہوشی کی حالت میں کسی جانے پہچانے لمس پر اُس نے زارون کا نام پکارا تو وہ اُس کی بے قراری پر مزید شرمند ہوا۔

”میں پاس ہی ہوں“، اُس کا ہاتھ اپنے رخسار پہ رکھتے زارون نے اپنے ہونے کا یقین دلا یا تو نور نے تکلیف کے باوجود بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔

”بہت... بُرے ہیں... آپ...“، بولنے سے سر میں اٹھنے والے درد کی وجہ سے اُس نے اٹکتے ہوئے اپنی بات مکمل کی تو اُس کی تعریف پر زارون کے چہرے پہ مسکراہٹ آئی۔

”ہاں بہت بُرا ہوں“، اُس کے رخسار پہ بوسہ دیتے زارون نے شکر ادا کیا کہ نور کے بے ہوشی میں ہونے کی وجہ سے اُس کی غیر موجودگی کا پتا نہیں چلا اور نہ اپنی زخموں کی تکلیف کے ساتھ ساتھ اُس کے رویے سے بھی اذیت ملتی۔

”نه... میں... تھوڑے... اچھے... بھی ہیں“، اُس کے لمس پر پھر سے آنکھیں بند کرتے نور نے اُس کے قریب ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا کہ اُس نے زارون کے دل میں بد گمانی پیدا نہیں کی ورنہ وہ وہاں اُس قید خانے سے نکل کر بھی کبھی آزاد نہ ہوتی۔

”کتنا اچھا ہوں؟“، اپنے دل میں شرمندہ ہوتے اُس نے اپنے لہجے کو ہمورا رکھتے نور کی بند آنکھوں پر اپنے ہونٹ رکھے۔

”تھوڑے سے... بس...“، اپنا ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھتے نور نے پلکیں اٹھاتے اُسے دیکھا جس نے اُس کامان رکھنے کے ساتھ ساتھ اُس کا یقین کرتے اُسے ایک بار پھر سے دنیا کی نظروں میں پامال ہونے سے بچا لیا تھا۔

”کیا ہوا؟ روکیوں رہی ہو؟ درد ہو رہا ہے کیا؟“، اُس کی آنکھوں سے نکتے آنسوؤں کو دیکھ کر زارون نے فکر مندی سے پوچھا۔

”کمر میں ہورہا ہے۔ سر میں بھی“، اُس کی اپنا بیت پہ نور کو پھر سے رونا آیا تو زارون دروازے پہ آہٹ سنتے جلدی سے پیچھے ہوا۔

”تم؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟“، احمد صاحب جو ڈاکٹر کے نہ ہونے کی وجہ سے وہیں اُس کا انتظار کرنے لگے تھے زارون کو کمرے میں دیکھ کے ایک دم سے بوکھلائے۔

”جی، بس نور کو دیکھنا آیا تھا“، ان سے نظریں ملائے بغیر زارون نے جواب دیا تو نور کو ہوش میں اور ڈاکٹر کی موجودگی کی وجہ سے انہوں نے ایک سخت نظر اُس پہ ڈالتے خاموشی اختیار کی اور آگے بڑھتے نور سے اُس کی طبیعت کے بارے میں پوچھنے لگے جواب بالکل مطمئن نظر آرہی تھی۔

-----

”میں ارحمن کو دیکھ کر آتا ہوں تم نور کے پاس رہنا“، ڈاکٹر کے جاتے ہی احمد صاحب نے کچھ دیر پہلے کی نسبت زارون کے لمحے میں واضح فرق محسوس کیا تو کسی اور وقت اُس کی کلاس لینے کا سوچتے کمرے سے باہر نکلے۔

”ارحم بھائی؟ کیا ہوا انہیں وہ بھی یہاں ہیں؟“، نور (جو زارون کی آوازوں پر اُسے چلا کر اپنی وہاں موجودگی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی) مگر اُس کا ارادہ بھانپتے اُس کی کوشش سے پہلے ہی اُس شخص

نے ہوشیاری کے ساتھ اُس کے منہ پر رومال رکھتے اُسے بے ہوش کر دیا تھا جس کی وجہ سے وہ وہاں ہونے والے کسی بھی واقعے سے اب تک انجان تھی) نے احمد صاحب کے منہ سے ارجمند کا نام سنتے زارون سے پوچھا۔

”ہاں، یہیں ہے۔ اُس کی تھوڑی طبیعت خراب تھی تو ڈاکٹر نے ڈرپ لگادی۔ بس تم پر یشان نہ ہو وہ ٹھیک ہے“، اُسے تسلی دیتے زارون نے اصل بات چھپائی تاکہ اُس کو مزید کوئی ملاں نہ ہو۔ ”اچھا اللہ پاک انہیں صحت دے“، نور نے دعا کی تو زارون نے آمین بولتے اُس سے کچھ کھانے کے متعلق پوچھا۔

-----

”یہ لڑکا کسی دن میرے ہی ہاتھوں مرے گا“، کل شام سے مسلسل کال کرنے کے باوجود بھی ارجمند نے رابعہ کی کال نہ اٹھائی تو اُس نے غصے سے موبائل بیڈ پہنچا۔

”آپ کیا ہوا؟ اتنے غصے میں کیوں ہیں آپ؟“، حدیہ جو اُس سے آج یونیورسٹی نہ جانے کے متعلق پوچھنے آئی تھی اُس کے موبائل پھینکنے پر فکر مندی سے پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں ہوا، دماغ خراب ہو گیا ہے میرا۔ ایک پہلے ہی اُس دن سے نور کی کوئی خبر نہیں اوپر سے ارحم صاحب بھی کل شام سے موبائل آف کر کہ پتا نہیں کہاں غائب ہیں“، صوفے پر بیٹھتے رابعہ نے اُسے اپنی پریشانی سے آگاہ کی۔ ”تو اس میں کیا مسئلہ ہے آپ ارحم بھائی کے گھر کا ل کر کہ پوچھ لیں“، اُس کی بات سنتے حدیہ نے بیڈ سے اُس کا موبائل اٹھایا۔

”نہیں، مجھے نہیں کرنی کا ل۔ جب اُسے میرا خیال نہیں تو میرا کیا دماغ خراب ہے جو اُس کے پیچھے ماری ماری پھروں“، اُس کے موبائل بڑھانے پر ان کے ہاتھوں مجبور ہوتے رابعہ نے انکار کیا۔

”تو پھر ایسے پریشان کیوں ہو رہی ہیں اور ایسے غصہ کر کہ خود کو جلانے سے بہتر ہے کہ آپ گھر کا ل کر کہ ارحم بھائی کے بارے میں پوچھ لیں۔ ہو سکتا ہے اُن کی طبیعت خراب ہو اور خود سوچیں کہ کیا پہلے کبھی ارحم بھائی کا موبائل بند ہوا؟“، اُس کا غصہ ٹھنڈا کرتے حدیہ نے پتے کی بات کی تو رابعہ نے اُس کی بات پہ غور کیا۔

”ہاں، یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں“، موبائل اُس کے ہاتھ سے لیتے رابعہ نے جلدی سے ارحم کے گھر کا لینڈ لائن نمبر ڈال کیا۔

”یہ بھی کوئی نہیں اٹھا رہا“، کچھ دیر طرائی کرنے کے بعد اب رابعہ کو صحیح معنوں میں فکر ہوئی۔

”تو آنٹی کے نمبر پر کر کہ پوچھیں“، حدیہ جو اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی اُس نے ایک بار پھر سے اُسے مشورہ دیا۔

”نہیں، آنٹی کیا سوچیں گی میرے بارے میں۔ نہیں بس میں کچھ دیر میں پھر سے ارجمند کے نمبر میں ٹرائی کرتی ہوں اگر اس بار نہ ریسیو کیا تو پھر آنٹی کو کال کر کہ پوچھ لوں گی“، اُس کی بات سننے رابعہ نے کہا تو حدیہ نے اثبات میں سر ہلاتے اُسے ناشتے کا بولا۔

”نہیں، میرا دل نہیں تم جاؤ میں خود ہی کچھ دیر میں کرلوں گی“، ناشتے کے لیے منع کرتے رابعہ نے اُسے اپنے کمرے سے نکلا جو اُس کی آج پھر چھٹی کا سنتے خود ہی چھٹی کا رادہ کر چکی تھی۔

-----

ارجمند کو ہوش آیا تو ڈاکٹر نے اُس کی حالت خطرے سے باہر ہونے کے باوجود بھی ایک دو گھنٹے کے لیے مزید اُسے اپنے انڈر رکھنے کا فیصلہ کیا تاکہ کسی بھی مسئلے کی صورت وہ جلد از جلد اُسے ضروری ٹرینمنٹ فراہم کر سکیں۔

عبدہ بن گم بھی صحیح ہوتے ہی ڈرائیور کے ساتھ ہسپتال پہنچ چکی تھیں اور ارجمند کی خیر خیریت پوچھنے کے بعد نور کے پاس چلی گئیں تاکہ مزید احمد صاحب کی ناراضگی مول نہ لیں۔

”انکل آنٹی آپ لوگ کچھ دیر گھر چلے جائیں۔ میں یہاں ہوں آپ پلیز ارحام کی فکر مت کریے گا“، ہاشم صاحب اور آئمہ بیگم کورات سے پریشانی کے عالم میں دیکھ زارون نے ان سے کہا۔

”نہیں ہم ٹھیک ہیں اور اپنے بیٹے کو چھوڑ کر ہم ایک منٹ بھی سکون میں نہیں رہ سکتے اس لیے پلیز ہمیں اُس کے پاس ہی رہنے دو“، ہاشم صاحب نے اُس کی بات سنتے انکار کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ نہ جائیں پر آنٹی کو بھچ دیں۔ دیکھیں کل سے رورو کر انہوں نے اپنی کیا حالت بنالی ہے“، آئمہ بیگم کو گم صم سا کر سی پہ بیٹھا دیکھا زارون نے اصرار کیا۔

”ٹھیک ہے میں کہتا ہوں پر مجھے نہیں لگتا کہ یہ ارحام کو دیکھے بناء یہاں سے جائیں گی“، اُس کی بات پر اپنا خد شہ ظاہر کرتے ہاشم صاحب نے آئمہ بیگم کی جانب قدم بڑھائے تاکہ انہیں کچھ دیر گھر جا کر آرام کرنے کا کہہ سکیں۔

-----

صحیح سے مسلسل کال کرنے کے بعد بھی جب ارحام کا نمبر بند ہی رہا تو بارہ بجے کے قریب رابعہ کی ہمت جواب دے گی تب ہی اُس نے آئمہ بیگم کا نمبر ڈائل کیا۔

”آنٹی بھی نہیں اٹھا رہیں، پتا نہیں کیا مسئلہ ہے“، آئسہ بیگم کے مو بال کپر تین چار بار ڈرانی کتنے کے بعد رابعہ کاغذہ اب پریشانی میں بدل چکا تھا۔

”زارون کو کال کرتی ہوں“، کچھ سوچتے ہوئے ایک دم سے اُس کے ذہن میں زارون کا خیال آیا تو اُس نے جلدی سے اُس کا نمبر ڈائل کیا جو دوسری ہی بیل پر ریسیو کر لیا گیا۔  
”السلام علیکم“، دوسری طرف سے ہیلو کی آواز پر اُس نے سلام میں پہل کی۔

”وعلیکم السلام، رابعہ کیسی ہوتا ہے؟“ زارون اُس کا نام دیکھتے ہی جان چکا تھا کہ اس نے اُسے کس مقصد کے لیے کال کی ہے تب ہی اپنے لہجے کو نارمل رکھتے پوچھنے لگا۔

”ہاں میں ٹھیک ہوں۔ تم ارحم کے ساتھ ہو؟ میرا مطلب میں کل رات سے اُس کے مو بال پر کال کر رہی ہوں پر وہ ریسیو ہی نہیں کر رہا۔ میں نے گھر کے نمبر پر بھی کال کی پر کوئی جواب نہیں ملا۔ آنٹی کے نمبر پر کی تو وہ بھی بیل جا جا کے بند ہو گیا۔ پلیز تمہیں ارحم کے بارے میں کچھ بتا ہے تو مجھے بتا دو یا اگر وہ تمہارے ساتھ ہے تو میری بات کروادو“، اپنے کال کرنے کا مقصد تفصیل سے بتاتے وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

”ہاں، وہ میرے ساتھ ہی ہے۔ وہ دراصل بات یہ ہے کہ ارحم کی کچھ طبیعت خراب ہے وہ ہسپتال ہے، باقی تم یہیں آ جاؤ اسے دیکھ بھی لینا“، مختصر سا جواب دیتے زارون نے گولی گلنے والی بات کو گول کیا۔

”کیا ہوا ارحم کو؟ وہ کل تو بالکل ٹھیک تھا؟ اور وہ ہسپتال میں ہے اور تم مجھے اب بتارہے ہو؟“ پریشانی سے صوفے سے اٹھتے اُس نے اُس سے بات کرتے ہوئے ہی سیڑھیاں اُترتے نیچے کا رخ کیا۔

”ہاں بس پریشانی میں تمہیں بتانے کا خیال ہی نہیں آیا۔ بس تم پریشان نہ ہو ارحم ٹھیک ہے“، اُسے تسلی دیتے زارون نے ہسپتال کا نام بتایا۔

”اچھا بس میں کچھ دیر میں پہنچتی ہوں۔ آنٹی انکل بھی وہیں ہیں کیا؟“، چہرے پہ فکر مندی لیے اُس نے اسد کے کمرے کا رخ کیا۔

”ہاں وہ بھی یہی ہیں اور تم پریشان نہ ہو اور آرام سے آنا“، زارون نے اُسے تاکید کرتے کال منقطع کی تواریخ نے اسد کو آواز لگائی جو واش روم میں تھا۔ ”اسد بھائی پلیز جلدی نکلیں“، دروازے پہ دستک دیتے اُس نے بے چینی سے کمرے میں ٹھلتے ہوئے اُسے کچھ ہی منٹوں میں کافی بار آواز دی۔

”کیا ہوا؟ ایسے ہوا کے گھوڑے میں کیوں سوار ہو؟“ تولیہ نے چہرہ صاف کرتے وہ باہر نکلا تو اس نے رابعہ سے پوچھا جس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑی تھیں۔ ”وہ... ارحام ہسپتال میں ہے۔ اُس کی طبیعت خراب ہے آپ پلیز جلدی مجھے وہاں لے جائیں“، گھبراہٹ کے مارے باقاعدہ روتے ہوئے اُس نے اسدے سے کہا جو خود بھی اُس کی بات سنتے فکر مند ہو گیا تھا۔

”کیا ہوا ارحام کو؟ پرسوں تو مجھ سے ملا تھا؟“ اپنی گاڑی کی چابی اٹھاتے اُس نے پریشانی سے استفسار کیا تو رابعہ نے زارون سے ہونے والی بات مختصر آگتاباتے اُسے جلدی گاڑی نکالنے کا کہا اور خود اپنی امی کو بتانے کے لیے اُن کے کمرے کی جانب بڑھی۔

-----

کچھ دیر ارحام کو اپنے نگہداشت میں رکھنے کے بعد ڈاکٹر زکی تسلی ہوئی تو انہوں نے اُسے کمرے میں شفت کرتے ملنے کی اجازت دے دی۔

”آئمہ آؤ اپنے بیٹے سے ملتے ہیں“، ڈاکٹر کے تمام ہدایات سننے کے بعد ہاشم صاحب نے اُن کے آگے ہاتھ کیا۔

”میں، میں کیسے اُس کا سامنا کروں گی؟ میں نے ماں ہو کے ساری زندگی اپنے بیٹے کو انور کیا۔ میں اپنی پارٹیز اور دنیا کی رنگینوں میں ایسا کھو گئی تھی کہ مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ میرے بیٹے کو میری توجہ چاہیے ہاشم اُسے پسیے کی عیش و عشرت کی ضرورت نہیں تھی اُسے ہماری ضرورت تھی ہمارے پیار کی جو ہم اُس کبھی بھی نہیں دے پائے“، اپنی غلطیوں کا اعتراف کرتے اُن کی آنکھوں سے بے اختیار ہی ندامت کے آنسو بہہ نکلے۔

”ہم نے اپنے بیٹے ساتھ بہت غلط کیا ہے اور دیکھیں ہمیں احساس کب ہوا، ایسے وقت پہ جب وہ زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا تھا۔ اس وقت ہمیں یاد آیا کہ ہمارے بیٹے کی زندگی پیسوں سے نہیں بلکہ ہماری دعاؤں سے بچے گی۔ نہیں میں اُس کا سامنا نہیں کر سکتی“، احساس ندامت میں باتوں کو توڑ پھوڑ کر کرتے آئمہ بیگم نے نفی میں سر ہلا یا تو زارون جو پاس کھڑا اُن کی باتیں سُن رہا تھا وقدم اٹھاتے اُن کے قریب آیا۔

”میں جانتا ہوں کہ غلطی کر لینا آسان ہے پر اُس کا احساس ہونے پر اپنے روے کی اذیت برداشت کرنا بہت مشکل پر! کچھ غلطیاں اور فیصلے ہمارے بس میں نہیں ہوتے۔ وہ تو ہماری قسمت میں لکھی کسی اگلی روداد کو بہتر بنانے کے لیے ہم سے سرزد ہو جاتے اس لیے بس آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ کی پچھلی زندگی کے رویہ کا مدار آج ارجح کو اپنی زندگی واپس مل جانے کی صورت ہو چکا ہے۔ اگر وہ آج

اپنی سانسیس لے رہا ہے تو سب آپ کی دعاؤں کی بدولت ہے۔ وہ آپ سے لڑتا تھا جھگڑتا تھا مگر وہ آپ سے اور انکل سے کبھی بد گمان نہیں ہوا اس لیے اندر جائیں اُسے آج آپ لوگوں کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اُن کے ساتھ نشست سنبھالتے زارون نے بڑی نرمی کے ساتھ انہیں سمجھایا۔

”ہم چلیں، ہمارے بیٹے کو ہماری ضرورت ہے“، زارون کی بات مکمل ہوئی تو اس کے الفاظ کی سچائی پہ آئمہ بیگم نے ہاشم صاحب سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے انہیں اپنے ساتھ لیے اندر کمرے کی جانب بڑھے۔

”میری زندگی میں پتا نہیں کون سی رواداد لکھی گئی ہے جس کو بہتر بنانے کے لیے میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی“، اُن دونوں کے جاتے ہی زارون نے اپنے الفاظ دو ہرائے اور نور کے ساتھ کیے گئے رویے پر شرمندگی سے ایک گھری سانس لی اور دوسرا جانب متوجہ ہوا جہاں اسد کے ساتھ ساتھ رابعہ بھی اُس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

”زارون، ارحم کہاں ہے؟ وہ ٹھیک ہے ناکیا ہوا اُسے؟“ آنکھوں کو پانیوں سے بھرے اُس نے نم لبھ میں استفسار کیا۔

”ہاں ٹھیک ہے وہ سامنے کمرے میں ہے۔ ابھی آنٹی انکل ملنے گئے ہیں وہ آتے ہیں تو تم مل لینا“، اُسے تسلی دیتے زارون اسد کی جانب متوجہ ہوا جوار حم کی طبیعت خرابی کی وجہ پوچھ رہا تھا۔

”گولی لگی ہے ارحام کو....۔“

”گولی؟ کس نے ماری؟ وہ ٹھیک ہے نا؟ مجھے اُسے دیکھنا ہے ابھی“، زارون کے بات تکمل ہونے سے پہلے ہی رابعہ نے گولی لفظ پر اٹکنے اُس کی بات کاٹی۔

”وہ ٹھیک ہے تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ پلیز حوصلہ رکھو، بس آنٹی انکل آتے ہیں تو تم مل لینا۔“ ڈاکٹر نے بس ایک وقت میں دلوگوں کو ملنے کی اجازت دی ہے اس لیے کہہ رہا ہوں“، اُسے تسلی دیتے زارون نے اُسے اندر نہ جانے دینے کی وجہ بتائی تو رابعہ نے اسد کے سہارا دینے پر خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

حیدر شاہ اور مراد شاہ کو گرفتاری کے بعد سے نظر بند رکھا گیا تھا تاکہ اُن دونوں سے اُن کے تمام دوسرے ٹھکانوں کے بارے میں پوچھ کرو ہاں سے بھی لڑکیوں اور بچوں کو بازیاب کروا یا جاسکے اور اُن کے ساتھ اس جرم میں شامل باقی لوگوں کو بھی گرفتار کر کے کیف کردار تک پہنچایا جائے

اور اسی مقصد کے تحت پچھلے دو دونوں سے اُن باپ بیٹی کے ساتھ کوئی بھی نرمی بر تے بغیر انہیں سخت قسم کے ریمانڈ پر کھا گیا تھا جس کے بعد انہوں نے اپنے ہر جرم کا اعتراف کرتے اپنے ساتھ شامل باقی مجرموں کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔

”السلام علیکم صاحب۔“

”وعلیکم السلام کیا خبر ہے؟“ ایک فوجی نے آکر اس پٹھان کو سلام کیا تو اس نے ہاتھ میں کپڑی فائل بند کی۔

”صاحب ہم نے اُن تمام لڑکیوں کو با حفاظت اُن کے گھروں تک پہنچا دیا ہے پر اُن میں سے پانچ بچیوں کے والدین نے انہیں اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا ہے،“ اس فوجی نے سامنے بیٹھے آفیسر کو اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

”ہم ٹھیک ہیں، آپ اُن لڑکیوں کو ہمارے گر لز ہو سٹل لے جائیں اور وہاں پہنچ کر میری ورڈ ان سے بات کروادیجیے گا،“ اپنی بند کی گئی فائل واپس کھولتے اس آفیسر نے ہدایت دی تو وہ فوجی جی صاحب کہتے اُسے سلیوٹ کرتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

-----

نور کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اسے ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا پر ارحام کے زخم گھرے ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر زنے اُسے کچھ دن مزید وہاں رکھنے کا فیصلہ کیا اور تقریباً دو ہفتے بعد اُسے وہاں سے چھٹی ملی تو سب نے اُس کی صحت یابی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔

”یارو یہے میرا تو دل سالگ گیا تھا ہسپتال میں“، گھر آنے پر زارون اُسے سہارا دے کر اوپر اُس کے کمرے میں لا یا تو ارحام نے افسردگی سے اپنا حال دل بیان کیا۔

”کیوں؟ وہ کیا دل لگانے کی جگہ تھی جو تمہارا دل لگ تھا وہاں؟“ سہارا دے کر بیڈ پر بیٹھاتے زارون (جو پچھلے دو ہفتوں سے کسی سایہ کی طرح ارحام کے ساتھ تھا اُس نے اُس دن کے بعد سے اپنی طبیعت خرابی کے باوجود بھی ایک سینئنڈ کے لیے اُسے اکیلا نہیں چھوڑا اور اب بھی ڈاکٹر نے ڈسچارج کیا تو وہ خود اُسے گھر چھوڑنے کے لیے آیا) نے اُس کی بات پر تیوری چڑھائی۔

”آئے ہائے یار تم کیا جانو؟ میرے دل لگنے کے اسباب۔ اففف تم نے دیکھا نہیں تھا کہ وہ نرس کتنی پیاری تھی جو چوبیس گھنٹے میرا خیال رکھتی۔ جی سرجی سر کرتے کبھی میرے دل نہیں کھڑی ہوتی تو کبھی بائیں“، ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ارحام نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”ہونہہ شرم کرو، تم کیا اس وجہ سے وہاں رکنا چاہتے تھے؟“، کفر ٹھیک کر کے اُس کے اوپر دیتے زارون نے بھنویں اچکائیں تو ارحام نے بے شرمی سے اثبات میں سر ہلا کیا۔

”شرم کرو اور اگر رابعہ نے سن لیا تو وہ تمہیں واپس ہسپتال پہنچ دے گی اس لیے اپنے دل کے ارمان دل میں ہی رکھو تو اچھا ہے“، اُس کے چہرے پہ بکھرتی شرارت دیکھ کر زارون نے اُسے مشورہ دیا۔

”ہونہے تم تو ہو ہی میری خوشیوں کے دشمن اور یہ جب بھی میں کسی لڑکی کی بات کرتا ہوں تم مجھے اُس چڑیل کا نام لے کر ڈرایامت کرو“، اُس کی بات کا بُرا مناتے ارحم نے منہ بسورا تو زارون نے اُس کے ڈراموں پہ ایک لمبا سانس لیتے دروازے کی جانب دیکھا جہاں سے آئمہ بیگم ہاتھ میں ٹڑے لیے اندر داخل ہوئیں۔

”میں نے سوچا میرے بیٹے کو بھوک لگی ہو گی اس لیے سوپ بناؤ کر لائیں ہوں“، ٹڑے ٹیبل پہ رکھتے انہیں نے نرمی سے ارحم کی پیشانی پہ بوسہ دیا جو جب سے ہوش میں آیا تھا ہاشم صاحب اور آئمہ بیگم کا حسن سلوک دیکھ دیکھ کر حیران تھا۔

”زارون بیٹھ جاؤ تم کیوں کھڑے ہو؟“، باول سے سوپ پلیٹ میں نکالتے آئمہ بیگم نے اُسے کھڑا دیکھ صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”نہیں، آنٹی بس میں اب گھر چلوں گا۔ جنید بھائی لوگ بھی کافی دنوں سے آئے ہیں پر میری ملاقات نہیں ہوئی اور اب ارحم کافی بہتر ہے آپ پلیز اس کا خیال رکھیے گا۔ میں ان شاء اللہ صبح پھر چکر لگاؤں گا“، اُن سے اجازت لیتے زارون نے ارحم سے بھی جانے کے متعلق پوچھا۔

”ہاں ہاں چلے جاؤ اور نور کو بھی وقت دواؤ سے بھی تمہاری ضرورت ہے“، خوش دلی سے اجازت دیتے ارحم نے اُسے ہدایت کی جو اُسے اپنا خیال رکھنے کا بولتے کمرے سے باہر کی جانب بڑھا۔

”چلو شاباش منہ کھولو آج میں تمہیں اپنے ہاتھ سے سوپ پلاوں گی“، زارون کے جاتے ہی آئمہ بیگم نے چمچہ بھر کر اُس کے منہ کے قریب کیا تو ارحم نے منہ کھولنے کی بجائے آہستگی سے سر اُن کی گود میں رکھا جواب بیڈ پہ اُس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔

”کیا ہوا طبیعت ٹھیک ہے؟“ پلیٹ والپس سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے آئمہ بیگم اُس کی حرکت پہ ایک دم سے فکر مند ہوتے پوچھنے لگیں۔

”جی بس دل تھا کہ آپ کی گود میں سر رکھوں“، آنکھوں میں آنے والی نمی پہ انہیں بند کرتے ارحم نے تسلی دی۔

”اچھا ٹھیک ہے رکھ لو“، اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے آئمہ بیگم نے نیچے ہو کر اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیا جو آج تقریباً بیس سال بعد ماں کے اتنے قریب آکر اپنی ہر تکلیف اور شکوہے شکایات بھول چکا تھا۔

”یہ زارون آج بھی گھر آئے گا یا نہیں؟“، حنا نے کچن میں آتے عابدہ بیگم سے سوال کیا جو نسرین کو رات کے کھانے کے متعلق ہدایت دے رہی تھیں۔

”ہاں آج آجائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی کال آئی تھی اُس کی کے ارحام کو ڈسچارج کر دیا ہے اور بس اُسے گھر چھوڑ کرو بھی آجائے گا“، حنا کی آواز پر نسرین کو اپنا کام شروع کرنے کا کہتے عابدہ بیگم نے اُسے تفصیل سے بتایا۔

”چلیں اچھا ہے آجائے۔ ویسے امی مجھے اس بار زارون کا یہ رو یہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا، کیا دوست اتنے ہی ضروری ہوتے ہیں کہ انسان اُن کے لیے اپنے گھر والوں کو انور کر دے؟ میرا مطلب ہے ہم پورے ہفتے سے گھر آکر بیٹھے ہیں اور اُسے پانچ منٹ کی بھی فروخت نہیں ملی کہ ہم سے اگر مل ہی لے“، کچھ دنوں سے اپنے اندر جلنے والی آگ کو زبان تک لاتے حنا نے شکوہ کیا۔

"ہاں بس وہ، تمہیں پتا تو ہے کہ زارون کا ایک ہی دوست ہے اور وہ اُس پر جان دیتا ہے اور کوئی موقع ہوتا تو مجھے بھی زارون کا یہ رو یہ بُرالگتا پر اب وقت ہی ایسا تھا کہ مجھے کچھ کہنا مناسب نہیں لگا"؛ حنا کی شکایت پر عابدہ بیگم نے بڑی تسلی کے ساتھ زارون کی طرف سے صفائی پیش کی۔

"ٹھیک ہے زارون کا رو یہ تو سمجھ آتا پر یہ آپ کی نئی بہو کی مجھے سمجھ نہیں آئی کہ وہ کیوں ہمارے آنے سے پہلے ہی اپنے میکے چلی گئی؟ مطلب امی اگر اسے پتند تھا کہ ہم لوگ آرہے ہیں تو پھر میرے خیال سے اُسے گھر رکنا چاہیے تھا"؛ حنانے اصل بات پر آتے (جس کے لیے اُس نے تمہید باندھی تھی) اندر کی بات جاننے کی کوشش کی۔

"نہیں، ایسی بات نہیں ہے اور نور (جسے احمد صاحب نے زارون کے کہنے پر جنید لوگوں کے آنے سے پہلے نائلہ بیگم کی طبیعت خرابی کا کہتے اُن کے گھر چھوڑ دیا تھا) تو جانا نہیں چاہ رہی تھی پر میں نے اُس کی امی کی طبیعت خراب کر کہ زبردستی بھیجا"؛ اُس کے سوال پر اپنے لبھ کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے عابدہ بیگم نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ہم ٹھیک ہے، جیسے اُن لوگوں کی مرضی۔ ہم تو اتنی دور سے اُن دونوں سے ملنے آئے تھے پر لگتا آپ کے بیٹے اور بہو کو ہمارا یہاں آنا کوئی خاص پسند نہیں آیا جو ہمارے آنے سے پہلے ہی گھر چھوڑ کر کھیں اور شفت ہو گئے"؛ اُن کے چہرے سے اُن کے جھوٹ بولنے کا اندازہ لگاتے حنانے لاپرواںی

سے کندھے اچکائے اور مزید ان کا کوئی جواب سنے بغیر واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھی تو عابدہ بیگم نے اُس کی باتوں کا غصہ نسرین پہ نکالا جوا بھی تک کھڑی غور سے اُن کی باتیں سُن رہی تھی۔

---

ارحم کے گھر سے نکلتے زارون نے گھر جانے کی بجائے اپنا رخ ظہیر صاحب کے گھر کی جانب کیا تاکہ نور کو ساتھ لے کر جاسکے۔ اُن کے گھر کے سامنے گاڑی روکتے وہ باہر نکلا اور بیل بجائی تو پچھ ہی سینکڑ ز میں رضانے گیٹ کھولا۔

”زارون بھائی آپ؟ آئیں باہر کیوں کھڑے ہیں؟“، اُسے دیکھتے ہی خوشگوار حیرت کے ساتھ کہتے اُس نے اُسے اندر آنے کی جگہ دی۔

”کیسے ہو؟ آنٹی کی طبیعت کیسی ہے؟“ اندر قدم رکھتے ہی زارون نے اُس سے گلے ملتے سوال کیا۔

”جی سب ٹھیک ہیں آپ اندر آئیں اور آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ ارحم بھائی ٹھیک ہیں؟ وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو گئے ہیں؟ یا بھی وہیں ہیں؟“ اُسے ساتھ لیے لاونچ میں داخل ہوتے رضانے ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

”ہاں ٹھیک ہے وہ اور میں اُسے ہی ابھی گھر چھوڑ کے آیا ہوں“، صوفی پر بیٹھتے زارون نے مختصر الفاظ میں اُس کی بات کا جواب دیتے گھر میں خاموشی محسوس کرتے نائلہ بیگم کے بارے میں پوچھا۔

”وہ ماما ساتھ ابراہیم کے گھر گئیں ہیں اور آپی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ سو گئیں“، نور کی زبانی اُس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا سنتے کے بعد رضا سیمت نائلہ بیگم کا دل بھی زارون کی طرف سے صاف ہو گیا تھا۔

”کیوں کیا ہوا اُس کی طبیعت کو؟ کہاں ہے وہ؟“، اُس کی بات سنتے ہی زارون ایک دم سے فکر مند ہوا۔

”کچھ نہیں کہہ رہی تھیں سر میں درد ہے اور اپنے کمرے میں سورہی ہیں۔ آپ جائیں دیکھ لیں اُنہیں میں جب تک ماما کو بلا کر لاتا ہوں“، اُس کی بے چینی دیکھ رضا نے اپنارخ باہر کی جانب کیا تو زارون بھی اٹھ کر دوسروی طرف بڑھا جہاں نور کا کمرہ موجود تھا۔

”ہونہہ، بہت ہی زیادہ بد تمیز ہو، شوہر کی تو کوئی فکر ہی نہیں بس ہر وقت سونے کی پڑی رہتی ہے“، کمرے میں داخل ہوتے ہی بیڈ کی جانب آتے زارون نے نور قریب بیٹھتے اُس کے خوابیدہ چہرے کو غور سے دیکھا جوان چند دونوں میں بالکل مر جھاسا گیا تھا۔

”گلتا ہے چڑیل کو میری یاد نے کافی ستایا ہے جو چند ہی دن میرے بغیر رہنے پر اس طرح مر جھائی گئی ہے“، ایک بازو اُس کے اوپر سے گزار کر بیڈ پر رکھتے زارون نے جی بھر کے اُس کے نقوش کو دیکھا جنہیں وہ پچھلے کچھ دنوں سے دیکھ نہیں پایا تھا۔

”زار آپ یہاں؟“ کسی کی نظروں کی تپش مسلسل اپنے چہرے پر محسوس کرتے نور نے آنکھیں کھولیں تو زارون کو اپنے سامنے دیکھ ایک دم سے بوکھلانی۔

”چپ رہو کچھ دیر“، اُس کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھتے زارون نے جواب دینے کی بجائے اُسے مزید کچھ بولنے سے منع کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟“، با مشکل دوسکنڈ ہی خاموش رہنے کے بعد نور نے اُس کی نظروں کی حدت اپنے چہرے پر محسوس کرتے انگلی اپنے ہونٹوں سے ہٹاتے سوال کیا۔

”اففف اب تمہیں دیکھنے پر بھی پابندی ہے کیا؟ ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے کوئی چڑیل نہیں دیکھی تو سوچا ان نظر آئی ہے تو اچھے سے دیکھ لوں“، اُس کے پھر سے بولنے پر اپنی نظروں کا زدایہ بدلتے زارون نے اپنے ہونٹ اُس کے بائیں گال کے ساتھ مس کیے۔

”بُرے ہیں آپ اور میرے قریب مت ہمیں۔ جب اتنے دنوں سے آپ نے میری پروانہیں کی تو اب بھی میرے پاس آنے کی یا یہ لاذد کھانے کی کوئی ضرورت نہیں“، اُسے اپنے دوسری گال پہ جھکتا دیکھ نور نے اُس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھتے اپنی نارا ضلگی کا اظہار کیا۔

”بس بس تمہیں بڑی میری پرواٹھی جو یہ گلے شکوے کر رہی ہو۔ دودن سے تم نے ایک بار بھی مجھے فون کیا؟ میں نے ہزار مسیجز کیے پر تم نے اپنے غصہ میں میرے مسیح کا جواب تنک دینا گواراہ نہیں کیا“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے زارون نے اُس کی غلطی بتانے کے ساتھ ہی اپنے ہونٹ اُس کے دائیں گال پہ رکھے تو نور نے اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”بھاڑ میں جائیں آپ اور کتنے دنوں سے آپ مجھے اگنور کر رہے ہیں اور اب جب میں نے تھورا غصہ دکھایا ہے تو آپ کو ساتھ ہی میری غلطیاں یاد آگئیں“، اُس سے اُس کے ہی رویے کا شکوہ کرتے نور نے اپنے دونوں بازو اُس کے گلے میں ڈالے۔

”ہاں تو اور کیا کروں۔ میں نے تمہیں اگنور نہیں کیا بس ارحم کی وجہ سے مصروف تھا“، اُس کی حرکت پہ مسکراتے زارون نے آہستگی سے اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔

”ٹھیک ہے پر اب آپ دوبارہ ایسے مجھے اکیلا چھوڑ کے مت جائیے گا“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے پلکیں جھپکاتے فرماش کی تو زارون نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کیا اور بے اختیار ہی اُس کے ہونٹوں پہ جھکا جو بالکل بھی اُس سے ایسی حرکت کی امید نہیں کر رہی تھی۔

”ز...ار“، اُس کی شرط تھامتے نور نے مزاحمت کرنے کی کوشش کی پر جب زارون نے اُس کی کوئی بھی بات نہ سنی تو وہ بے بسی اور گھبراہٹ کے مارے رونے لگی۔

”کیا ہوا؟ اب کیوں رو رہی ہو؟ حد ہے یا پیار ہی تو کیا ہے تھوڑا سا“، اپنے گال پہ نمی محسوس کرتے وہ پچھے ہوا تو نور کی آنکھوں میں آنسو دیکھ شرمندگی سے بولا۔

”تھوڑا... سا... تھایہ؟ میری سانس بند ہو گئی تھی“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے لمبی سانس لیتے اپنے آپ کو کوپر سکون کرتے اُسے گھورا جو باہر سے آتی رضا کی آواز پر جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہوتے دروازے کی جانب بڑھا۔

”اٹھ جاؤ اور فریش ہو کر باہر آ جاؤ میں جب تک آنٹی سے مل لوں“، اُس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے زارون نے اُسے سنبھلنے کا موقع دینے کے لیے رضا کے اندر آنے سے پہلے ہی اپنی بات مکمل کرتے باہر کا رخ کیا۔

”بُرے ہیں آپ اور بد تمیز بھی“، اُس کے جاتے ہی نور نے اٹھ کر بیٹھتے غصے سے کشن اٹھا کر دروازے پہ مارا جہاں سے ابھی ابھی زارون نکل کر باہر گیا تھا۔

---

”السلام علیکم آنٹی، کیسی ہیں آپ؟“ لاونج میں داخل ہوتے ہی زارون نے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے اُن کے سامنے سرجھ کایا۔

”وعلیکم السلام پیٹا میں ٹھیک ہوں، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟“ اُس کے کندھے پر تھکی دیتے نائلہ بیگم نے عاجزی سے پوچھا۔

”جی اللہ کا شکر ہے، ٹھیک ہوں“، اُن کے اشارہ کرنے پر صوفے پر بیٹھتے زارون نے جواب دیا تو نائلہ بیگم اُس سے ارحم کی طبیعت کے متعلق پوچھنے لگیں۔

”جی، وہ بھی اب بہتر ہے۔ ڈاکٹر نے ڈسچارج کر دیا ہے“، اُن کی بات کا جواب دیتے وہ رضا کی جانب متوجہ ہوا جو اُس کے لیے جوس لے کر آیا تھا۔

”یاراں تکلف کی کیا ضرورت تھی میں تو بس نور کو لینے آیا تھا“، ٹرے سے جوس کا گلاس اٹھاتے زارون نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

---

”بہت اچھا کیا جو تم آگئے۔ میں تو رضا سے کہہ رہی تھی کہ نور کو چھوڑ آؤ۔ گھر میں مهمان آئے ہیں اور وہ اتنے دنوں سے یہاں ہمارے پاس ہے“، اُس کی بات سنتے نائلہ بیگم نے اپنی بات کہی۔

”کوئی بات نہیں مهمانوں کی اور میں نے خود ہی نور کو منع کیا تھا کہ جب تک میں گھرنہ جاؤں وہ بھی نہ آئے۔ دراصل مجھے تھا کہ اُس کے زخم دیکھ سب سوال کریں گے کہ یہ کیا ہو؟ کیسے ہوا؟ بس اسی لیے میں نے نور کو یہاں رہنے کا کہا تاکہ میری غیر موجودگی میں اُسے کسی کی بات سے کوئی تکلیف نہ پہنچے“، اُن کی بات مکمل ہوتے ہی زارون نے نور کو وہاں بھیجنے کی اصل وجہ بتائی تو نائلہ بیگم کا دل تشکر سے بھر گیا۔

”بہت شکر یہ بیٹا، تم نے مشکل وقت میں میری بیٹی کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اب بھی تم نے اُس کا احساس کیا۔ زارون تم واقعی میں بہت اچھے بیٹے ہو“، اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے نائلہ بیگم کی آنکھوں میں نمی آئی جو پہلے ہی نور کی زبانی اُس کے ساتھ ہونے والے حادثے کا سُن کر کافی ڈر گئی تھیں کہ پتا نہیں اب اُن کی بیٹی کے ساتھ سرال میں کیسا سلوک ہو گا۔

”آنٹی پلیزاب آپ مجھے ایسی بات کر کے شرمندہ نہ کریں اور نور اب میری ذمہ داری ہے اُس کا خیال رکھنا میرا فرض ہے اس لیے پلیزاب دوبارہ آپ ایسی بات مت کریے گا“، اُن کے لمحے کی

نمی کو محسوس کرتے زارون نے بات کو سنبھالا اور رضا کو بھی بیٹھنے کا کہا جو تب سے کھڑا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔

---

کچھ ہی دیر میں وہ نور کو ساتھ لے کر گھر پہنچا تو ان کا سب سے پہلا سامنا جنید اور مزمل سے ہوا جو بچوں کے ساتھ باہر لان میں بیٹھے تھے۔

”السلام علیکم بھائی“، نور کو ساتھ لیے ہی قدم ان کی جانب بڑھاتے زارون نے ان کے قریب رکتے اپنی جانب متوجہ کیا تو اس کی آواز پر وہ دونوں ہی جوش سے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور باری باری زارون سے ملنے کے بعد نور سے ملے جو ان سے پہلی بار ملاقات پر تھوڑا گھبرائی ہوئی تھی۔

”باقی سب کہاں ہیں؟“ ان دونوں سے حال احوال کے بعد زارون بچوں سے ملا اور ان کا تعارف نور سے بھی کروایا جواب خود بھی انہیں پیار کرنے لگی تھی۔

”حنا، ہما تو شاپنگ پہ گئیں ہیں اور امی اندر رہیں۔ تم سناو؟ ارحام کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ جنید جو ہسپتال میں ارحام کی خیریت پوچھنے کے لیے دو تین بار جا چکا تھا اس نے زارون کے نشت سنبھالنے ہی سوال کیا۔

---

”جی اب بہتر ہے اور یہ ابو آج افس سے واپس نہیں آئے کیا؟“، احمد صاحب کی گاڑی گیراج میں نہ پا کر زارون نے فکر مندی سے پوچھا۔

”آگئے ہیں اور گاڑی حنا، ہمالے کر گئیں ہیں“، اُس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے مزمل نے اُس کے گاڑی کی غیر موجودگی پر پوچھے گئے سوال کا جواب دیا اور اپنی جیب سے والٹ نکالتے نور کو اپنے پاس بلا یا جوتب سے بچوں کے ساتھ لگی تھی۔

”نہیں، بھائی آپ رہنے دیں“، مزمل نے والٹ سے چند ہزار کے نوٹ نکال کر اُس کی جانب بڑھائے تو نور نے زارون کی جانب دیکھتے انکار کیا۔

”لو، ہم نے تمہیں پہلی بار دیکھا ہے ناس لیے دے رہے ہیں“، اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے مزمل سے شفقت کا مظاہرہ کیا تو زارون کے اشارہ کرنے پہ نور نے پسیے اُن کے ہاتھ سے لیے۔ ”شکریہ بھائی“، اُن کی نرمی پہ مسکراتے نور نے جنید کی جانب دیکھا جس نے بھی مزمل کی پیروی کرتے پسیے نکالتے نور کو تھمائے۔

”خوش رہو“، اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے جنید نے دعا دی تو نور نے اُس کا بھی شکریہ ادا کیا اور عابدہ بیگم سے ملنے کا کہتے اندر کی جانب بڑھی۔

-----

”حبہ بس کرو رونا اور ہمت کرو میں جانتی ہوں کہ میرا فیصلہ غلط تھا۔ میں نے اپنی انا اور جذباتی پر سے کام لیتے تمہارے ساتھ ساتھ ان بچوں کی زندگی بھی تباہ کر دی“، سارہ بیگم نے اُسے پچھلے کچھ گھنٹوں سے مسلسل رو تاد کیکھ اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔

”اب آپ کی غلطی ماننے سے کیا ہو گا؟ کیا حبہ کی زندگی کے وہ اہم سال واپس آجائیں گے؟ جو آپ نے اپنی ہٹ دھرمی برقرار رکھتے اُسے ایک وحشی اور جاہل شخص کے پلے باندھتے بر باد کر دیے۔ کاش آپ اُس وقت میری بات مان لیتی تو آج ہماری بیٹی یوں دو بچوں کے ساتھ طلاق کا دھبہ لیے ہماری دلہیز پر نہ بیٹھی ہوتی“، سلطان صاحب نے ایک افسوس بھری نظر ان پر ڈالی جنہیں اتنے سالوں بعد اپنی غلطی کا احساس ہوا بھی تو، تب جب بیٹی اپنی زندگی کا کل اثاثہ گنوائے ان کے درپہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آبیٹھی۔

”بس اب مجھے الزام دینا شروع کر دیں۔ میں نے اپنی طرف سے توبہ کے لیے اچھا ہی فیصلہ کیا تھا پر مجھے کیا پتا تھا کہ میرا بھانجا انسان نہیں بلکہ وحشی ہے جو میری بیٹی کو یوں اپنے ظلم کا نشانہ بناتے

اُس کی زندگی خراب کر دے گا،“ اُس کے جلے ہوئے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے سارہ بیگم کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”حبہ میری جان پلیز چپ کرو۔ حوصلہ کرو تھوڑا دیکھو بچے بھی تمہاری طرف دیکھ کر پریشان ہو رہے ہیں،“ سارہ بیگم کے لبھ میں نمی محسوس کرتے سلطان صاحب نے مزید انہیں کچھ کہنے کی بجائے حبہ کو اپنے ساتھ لگایا جو شادی کے کچھ دنوں بعد ہی احتشام کے نشہ کرنے کے متعلق جان چکی تھی پھر بھی ماں باپ کی عزت رکھنے کی خاطر اُس نے اپنے شوہر کا ہر ظلم برداشت کیا اور ایک سال بعد ہی اللہ نے اُس کی گودھری کی تودو جڑوں پچوں کی پیدائش نے اُس کے پاؤں میں مزید زنجیریں ڈال دیں۔

”حبہ میری جان پلیز چپ کرو دیکھو منیب تمہاری طرف دیکھ کر پریشان ہو رہا ہے،“ سلطان صاحب نے اُس کے آنسو تھمتے نہ دیکھ اُسے پچوں کی جانب متوجہ کروایا جو ماں کو روشنہ دیکھ پریشان سے کھڑے تھے۔

”حوصلہ کرو اور مجھے پہلے پتا چل جاتا کہ وہ خبیث انسان تمہارے ساتھ یہ رویہ بر تنا ہے تو میں اُسی وقت تمہیں اپنے ساتھ گھر لے آتا۔ میری جان میں زندہ تھانا کیوں تم نے اُس کا ہر ظلم چپ چاپ برداشت کیا؟ کیوں نہیں ہمیں بتایا کہ وہ شخص تمہارے اور پچوں کے ساتھ اس طرح کارویہ

اختیار کیے ہوئے ہے؟“ اسے اپنے دوپٹے سے آنسو صاف کرتا دیکھ سلطان صاحب نے اُس کے خاموشی سے سب سہنے پہ شکوہ کیا۔

”اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بچوں کی زندگی بر باد ہوا اور ابواً گر آپ نے انہیں مجھے مارتے ہوئے دیکھ ہی لیا تھا تو آپ خاموش رہتے۔ کیوں آپ نے ان سے بحث کی؟ دیکھیں آپ کی طرف داری نے میری اور میرے بچوں کی زندگی خراب کر دی،“ ان دونوں بچوں کو اپنے ساتھ لگاتے حبہ نے سلطان صاحب سے شکایت کی جو آج بناء بتائے ہی حبہ سے ملنے کے لیے گئے تو آگے اختشام کو اُسے بے دردی سے مارتا دیکھاں ہوا تو وہ اُس کا گریبان پکڑتے اُسے ایک دو تھپٹ جڑ گئے جس کے نتیجے میں نہ صرف اُس نے سلطان صاحب پہ ہاتھ اٹھایا بلکہ حبہ کے درمیان میں مداخلت کرنے اور روکنے پہ اُس نے اُسے بھی طلاق دے دی۔

”میں ابھی بیٹھا ہوں مرا نہیں ہوں، جو تم اُس بے غیرت اور بے حس انسان کے ساتھ یوں جانوروں سے بدتر زندگی گزارو اور بس میں آج کے بعد تمہیں اُس شخص کے لیے آنسو بہتانہ دیکھوں۔ اٹھو بچوں کو لے کر اپنے کمرے میں جاؤ،“ اُس کی بات سنتے ہی سلطان صاحب نے خفگی کا اظہار کیا تو حبہ خاموشی کے ساتھ بچوں کو لیے اوپر اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

”میں نے اپنی بیٹی کے ساتھ بہت غلط کیا۔ سلطان میں نے تو بھائی کی محبت میں آکر اپنی پھول سی پچی کار شتہ دیا تھا پر مجھے کیا پتا تھا کہ بھائی کی زندگی تو چند نوں کی ہے“، حبہ کے جاتے ہی سارہ بیگم نے بیٹی کی بر بادی پہ کھل کر آنسو بھائے۔

”یہ بات آپ کو پہلے سوچنی چاہیے اور اب یہ روناد ہونا چھوڑ کر بیٹی کو سنبھالیں جس نے صرف آپ کے سرچڑھ کر آج تک ہمیں اپنے ساتھ ہونے والی کسی بھی زیادتی کی بھنک تک نہیں پڑنے دی۔ سارہ اُس نے صرف آپ کی ضد کے لیے اپنی زندگی سیمت اپنی خوشیوں اور پیار کی قربانی دی تھی اور آج دیکھ لیں کہ آپ کی ذات پات اور استیلیں کی انانے ہمیں کس موڑ پہ لاکھڑا کیا ہے،“ اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھامتے سلطان صاحب نے انہیں آئینہ دکھایا جنہیں آج اپنی کچھ سالوں پہلے کی گئی غلطی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا پر اب نہ تور شستے اُن کے اختیار میں تھے اور نہ ہی وقت، اسی لپے چپ چاپ اپنے شوہر کی ہر بات سنتے اُن کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو رواں ہوئے۔

حنا اور ہمادونوں مارکیٹ سے واپس آئیں تو عابدہ بیگم نے نور کا ان دونوں سے تعارف کروایا۔

”السلام عليكم“، نور جو پہلے ہی انہیں تصویروں میں دیکھ چکی تھی خوش دلی سے ملنے کے لیے آگے بڑھی۔

”بس بس بھی کیا ہو گیا ہے۔ ہم لوگ یوں کسی سے گلے نہیں ملتے“، اُسے درمیان میں ہی روکتے حنا و قدم پیچھے ہٹی تو نور کا چہرہ خفگی کے مارے سرخ ہوا۔

”پلیز غصہ مت کرنا بس انسان کو رشتتوں کے ساتھ ساتھ اپنی صحت کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے“، عابدہ بیگم کے ماتھے پہ شکنیں دیکھ ہتھیں جلدی سے اپنی بات کی وضاحت کی تو نور نے خود کو سنبھالا اور ہما سے گلے ملنے کی بجائے اُس کے آگے ہاتھ بڑھایا۔

”کیسی ہوتا؟ اور اب تمہاری امی کی طبیعت کیسی ہے؟“ اُس سے ہاتھ ملاتے ہی حنا کے برعکس ہما نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

”جی، ما مٹھیک ہیں۔ آپ کیسی ہیں؟ اور آپ کی بیٹی ماشاء اللہ بہت پیاری ہے“، اُس کے لمحے میں نرمی دیکھ نور کو کچھ ڈھارس ہوئی تو اُس نے ایمان کی تعریف کی۔

”ہاں بس بچے تو پیارے ہی ہوتے، تم بھی ماشاء اللہ بہت پیاری ہو“، اپنی بیٹی کی تعریف پر فخر محسوس کرتے ہمانے نور کو چھیڑا تو حنا نے اُسے آنکھیں نکالتے مزید کچھ کہنے سے باز رکھا۔

”ماہم آپی نہیں آئیں؟“، ہما کی تعریف پہ شکریہ کہتے اُس نے ماہم کی غیر موجودگی محسوس کرتے سوال کیا۔

”نہیں، وہ ائیر پورٹ سے سیدھی اپنے سرال چلی گئی تھیں اور اب کل پر سوں تک یہاں ہمارے پاس آئیں گی“، حنا کو اپنے کمرے کی جانب بڑھتا دیکھ ہمانے جلدی سے جواب دیا اور فریش ہونے کا بولتے خود بھی اُس کے پیچھے ہی کمرے کی جانب بڑھی۔

”نور چلو ہم کھانا لگاتے ہیں“، حنا کے رویے کی وجہ سے نور کی اُتری ہوئی صورت دیکھ عابدہ بیکم نے اُس کا دھیان بٹانے کی کوشش کی تو وہ کوئی بھی شکوہ کیے بناء خاموشی سے اثبات میں سر ہلاتے اُن کے ساتھ ہی کچن میں آئی جہاں نسرین پہلے سے ہی موجود رات کے کھانے کی ساری تیاری کر چکی تھی۔

-----

”آپی کیا ہوا آپ کو؟ آپ وہاں سے ایسے کیوں آگئیں؟“، حنا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ہمانے اُس کے رویہ پر ناسمجھی سے استفسار کیا۔

”دماغ خراب تھا میر اس لیے آگئی اور یہ تم باہر کیا کر رہی تھیں؟ میں نے تمہیں پورا ہفتہ لگا کر سمجھایا کہ اُس لڑکی کو زیادہ منہ لگانے کی ضرورت نہیں پر تم؟ تمہیں تو اپنی بیٹی کی تعریف سنتے ہی پر لگ گئے“، اپنے ہاتھ میں کپڑے شاپر زبیڈ پہ پھینکتے حنا نے اُس کی نور کے ساتھ برتنی گئی خوش مزاجی پہ دانت پیسے۔

”نہیں آپی ایسی بات نہیں ہے وہ امی پاس تھیں۔ اسی لیے میں نے نور سے نرمی سے بات کی کیونکہ اگر میں امی کے سامنے کوئی بد تمیزی کرتی تو وہ فوراً سے مزل کو میری شکایت لگا دیتیں اور آپ کو پتا ہی مزل، جنید بھائی کی طرح تو ہیں نہیں، جو آنکھیں اور کان بند کر کے بس میری ہی بات کا لیقین کریں“، حنا کے غصے سے خائف ہوتے ہمانے اپنے رویے کی صفائی پیش کی۔

”زیادہ بکواس مت کرو اور جاؤ اس وقت میری نظروں سے دور ہو جاؤ ورنہ میں تمہارا گلاد بادوں گی“، اُس کے ظن پر حنا کا پارہ مزید چڑھا تو اُس نے ہما کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا جو اپنی خیریت خطرے میں محسوس کرتے جلدی سے دروازے سے نکل گئی۔

”أَفْفَ، اللَّهُ نَّعِ اِيْكَ، هِيَ بَهْنَ دِيَ وَهْ بَهْ بَيُوْ قَوْفَ اُورْ جَاهِلَ، تَوْبَهْ دَمَاغْ خَرَابَ كَرَكَهْ رَكَهْ دِيَا مِيرَا“، اُس کے جاتے ہی حنا نے بیڈ پہ بکھری چیزوں کو دیکھتے ایک لمبی سانس لیتے خود کلامی کی اور

ہما کی طبیعت صحیح اچھے طریقے سے سیٹ کرنے کا رادہ کرتے واش روم کی جانب بڑھی تاکہ جنید کے کمرے میں آنے سے پہلے پہلے فریش ہو کر اپنے آپ کو تھوڑا پر سکون کر سکے۔

---

”حبہ پلیز تھوڑا سا کچھ کھالو“، سارہ بیگم نے بچوں کو کھانا کھلانے کے بعد سُلاتے ہی اُسے مخاطب کیا جو گم صم سی بیٹھی سوچوں میں غرق تھی۔

”حبہ میری جان کھانا کھالو“، اُس کی خاموشی پر سارہ بیگم نے ایک بار پھر سے اُسے مخاطب کیا تو وہ گھر انسان لیتے اُن کی جانب متوجہ ہوئی۔

”کھانا کھالو تھوڑا“، اُس کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہی سارہ بیگم نے شرمندگی سے نظریں پھیریں اور نوالہ بنایا کہ اُس کے منہ کے قریب کیا۔

”نهیں، میرا دل نہیں ہے بس آپ جائیں آرام کریں۔ میں بھی بچوں کے ساتھ سو جاؤں گی“، اپنے دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے اُس کے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اُس کا لہجہ بھی خشک ہو چکا تھا۔

”بیٹا پلیز تھوڑا سا کھالو، شام سے تم نے کچھ نہیں کھایا“، اُس کے انکار پر سارہ بیگم نے ایک بار پھر سے اصرار کرتے اُس کے بائیں گال کو دکھ سے دیکھا جس پر احتشام کے ہاتھ کے نشان ابھی تک نیل کی صورت واضح تھے۔

”امی پلیز مجھے سچ میں بھوک نہیں ہے اور آپ پر یہاں نہ ہوں مجھے جب بھوک لگے گی میں خود ہی اٹھ کر کھانا کھالوں گی“، اُن کے اصرار پر اس بارنا چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے لبھ کی تلخی اُن پر ظاہر کر گئی۔

”ٹھیک ہے۔ میں کھانا بیہیں ٹیبل پر رکھ دیتی ہوں جب بھی بھوک لگے کھالینا اور پلیز اب دماغ سے اُس شخص کا خیال نکال دو اور اُس بے حس انسان کے لیے اپنے آپ کو مزید تکلیف نہ دو جس نے تمہارے ساتھ ساتھ اپنے معصوم بچوں تک کی پروانہیں کی“، ٹرے اٹھا کر ٹیبل پر رکھتے سارہ بیگم نے کمرے سے نکلنے سے پہلے اُسے تنبیہ کی جو بس خاموشی سے اُن کی بات سن کر اثبات میں سر ہلاتے واپس سر گھٹنوں پر ٹک گئی۔

-----

”کیا ہوا ہے تمہیں؟ رو کیوں رہی ہو؟“ زارون کھانا وغیرہ کھانے کے بعد کافی دیر تک بیٹھا جنید اور مزمول کے ساتھ با تیس کرتا رہا اور اب تقریباً ایک بجے کے قریب وہ کمرے میں آیا تو نور کو روتا دیکھ کر ایک دم سے پریشان ہوا۔

”کیا ہوا ہے بتاؤ مجھے، کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ اُس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے زارون نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

”نہیں، کسی نے کچھ نہیں کہا،“ نفی میں سر ہلاتے نور نے ہچکیوں کے درمیان اپنی بات مکمل کی۔ ”تو پھر روکیوں رہی ہو؟ میں نے تمہیں کہا تھا ناکہ تم سو جانا،“ اُس کے جواب پر الجھتے زارون نے اُسے کچھ دیر پہلے کی گئی نصیحت کی یاد دہانی کروائی۔ ”مجھے نیند نہیں آ رہی تھی اس لیے نہیں سوئی،“ اُس کے پہلے سوال کو اگنور کرتے نور نے دوسرے کا جواب دیا تو زارون نے اُس کا سراپنے سینے سے لگایا۔

”نیند نہیں آ رہی تھی تو مجھے مسح کر دیتی میں کمرے میں آ جاتا پر یوں رونے کی کیا ضرورت تھی،“ اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے اُسے لگا کہ نور اکیلے پن کی وجہ سے روئی ہے۔

”زار کیا مجھے جرا ثیم لگے ہیں؟“ اُس کے سینے سے سر اٹھاتے نور نے اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے پوچھا۔ ”مطلوب؟ کس نے کہا کہ تمہیں جرا ثیم لگے

ہیں؟ نور بتاؤ مجھے کیا بات ہے؟ امی نے کچھ کہا ہے یا بھا بھی نے؟“، زارون (جو ڈائنگ ٹیبل پر حنا کی طرف سے کیے جانے والے ایک دو طزیہ باتوں سے اندازہ لگا چکا تھا کہ اُسے نور کچھ خاص پسند نہیں آئی) نے نور کے منہ سے ایسا فضول سوال سنتے ہی تصدیق چاہی۔

”نہیں، کسی نے کچھ نہیں کہا وہ تو بس میں نے ایسے ہی پوچھا تھا“، اپنے لبھ کی لڑکھڑاہٹ پر قابو پاتے نور نے گھر میں کسی بھی قسم کی بد نظمی کے ڈر سے زارون کو حنا کی حرکت میں بتانا مناسب نہیں سمجھا۔

”اچھا کھاؤ میری قسم کہ کوئی بات نہیں ہے اور تم نے ویسے ہی یہ بات کی“، اس کا ہاتھ اپنے سر پر رکھتے زارون نے اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہی سوال کیا۔

”کیا کر رہے ہیں آپ اور ما کہتی ہیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر قسم نہیں کھاتے پلیز آپ اس بات کو چھوڑیں اور مجھے بتائیں کہ ارم بھائی اب کیسے ہیں؟“، جلدی سے اپنا ہاتھ اُس کے سر سے ہٹاتے نور نے بات بدلتی۔

”نور پلیز بات مت بدلو اور میں جو پوچھ رہا ہوں نا اُس کا جواب دو“، اپنی نظروں کے ساتھ ساتھ لبھ سے بھی سختی ظاہر کرتے زارون نے اپنی بات پر زور دیا تو نور نے کوئی بھی راہ فرار نہ ملنے پر گھری سانس لیتے بات کا آغاز کیا۔

”ٹھیک ہے پر پہلے آپ وعدہ کریں کہ آپ گھر میں کسی کو کچھ نہیں کہیں گے؟“ اس کا ہاتھ پکڑتے نور نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”ٹھیک ہے نہیں کہتا۔ بتاؤ تم کیا بات ہے؟“ وعدہ کرتے زارون نے اُسے بولنے کے لیے اکسا یا۔

”بات اتنی بڑی نہیں بس پتا نہیں کیوں مجھے بُری لگی۔ وہ جب بھا بھی لوگ آئیں تو میں ان سے ملنے لگیں پر حنا بھا بھی نے مجھ سے ملنے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ وہ ایسے کسی سے گلے نہیں ملتیں۔ زار سچ میں مجھے زیادہ بُرائی نہیں لگا پر پتا نہیں کیوں مجھے لگا کہ مجھ میں کوئی کمی ہے یا میں اچھوت ہوں جو انہوں نے ایسا کہا،“ پھر سے آنکھوں میں نمی آئی تونور کے الفاظ اُس کے گلے میں ہی اٹک گئے۔

”بھا بھی غلط نہیں ہیں، انہوں نے ٹھیک کیا مجھ سے نہ مل کے۔ ظاہر سی بات ہے جس کے ماں باپ نے اُسے بے آبرو کر کہ یو نہی رخصت کر دیا ہو اُسے گھروالے کیا معاشرہ بھی ملنا پسند نہیں کرتا۔ بس یہ آپ کا اور انکل آنٹی کا ظرف ہے کہ آپ نے اب بھی اتنا کچھ ہونے کے بعد مجھے قبول کر لیا۔ مجھ سے میرے کردار کی صفائی نہیں مانگی،“ اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے نور نے اپنی نظریں جھکاتے وہ سب کچھ کہا جو کافی دنوں سے اُس کے دل و دماغ میں چل رہا تھا۔

”بھا بھی نے جو کیا وہ غلط تھا اور میری جان کی تم میں نہیں بلکہ ان میں ہے جو صرف دوسروں کا دل دکھانا جانتی ہیں اور رہی بات ظرف کی تو پوری دنیا بھی تمہارے خلاف ہو جائے میں تب بھی

تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ کھڑا ملوں گا۔ پوری دنیا بھی تمہارا ساتھ چھوڑ دے پر میں کبھی نہیں چھوڑوں گا،” اُس کی بات مکمل ہوتے ہی زارون نے اُس کا ہاتھ تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگایا تو نور نے اُس کے اس قدر مان اور یقین بخشنے پہ خاموشی سے سروال پس اُس کے سینے سے لگایا۔ ”میں بھی آپ کے ساتھ ہوں اور ہمیشہ رہوں گی،“ آہستگی سے کہتے وہ اپنے دونوں بازوں باز و اُس کے گرد لیپٹ گئی جواب اُس کے بالوں میں نرمی سے ہاتھ پھیرتے اُسے دل بڑھا کرنے اور بات بات پر رونے سے منع کرتے رشتؤں کے بدلتے رنگوں سے آگاہ کرنے لگتا کہ آئندہ زندگی میں وہ ایسے کسی معمولی بات کو لے کر خود کو کسی سے کمتر نہ سمجھے۔

-----

اُس کی نصیحتوں کو سنتے سنتے نوروں میں اُس کے سینے سے سر ٹکائے سوچکی تھی۔ ”نور بولو بھی سوگئی ہو کیا؟“ کچھ دیر بولنے کے بعد جب اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو زارون نے اُسے خود سے الگ کیا۔

”ہونہ میں کب سے پاگلوں کی طرح بول رہا اور یہاں میدم سکون سے سوگتیں“، اُس کا سر آہستگی سے تکیہ پر رکھتے زارون نے سردی کی وجہ سے کمفرٹ کھو لتے اُس کے اوپر دیا جو خود ہی کروٹ لے کر لیٹ چکی تھی۔

”بس میری نیندیں اڑا کر خوداب آرام سے سوگئی ہے چڑیل“، اُس کا دوپٹہ جو گلے میں لیپٹھا اسے نرمی سے نکالتے زارون نے اُس کے خوابیدہ چہرے کو دیکھ کے شکوہ کیا اور نیچے جھکتے ہونٹ اُس کے دائیں گال سے لگائے۔

”زار، نہ کریں۔ مجھے سونے دیں“، اُس کے لمس پہ نور جو بھی کچھ کپی سی نیند میں تھی فوراً اسے سیدھا ہوتے اُسے غصے سے گھورنے لگی۔

”تو کیا کروں؟ پہلے مجھے نیند آئی تھی پر تمہارے رونے دھونے کی وجہ سے ساری اڑگئی اور اب جب تمہیں نیند آئی ہے تو میں سوچ رہا کہ میں بھی کچھ تھوڑی بد تمیزی کر کہ تمہیں جگائے رکھوں“، اُس کے آنکھیں کھو لتے ہی زارون نے شرارت سے مسکراتے اُس کی ناک پہ بوسہ دیا۔ ”اففف زار نہ تنگ کریں پلیز، سچ میں مجھے نیند آئی ہے“، اُس کی نظروں میں ابھرتی محبت دیکھ نور نے جلدی سے اپنی آنکھوں کو پھر سے بند کرتے اُسے خود سے دور کرنا چاہا۔

”میں نے کب تنگ کیا؟ میں تو بس پیار کر رہا وہ بھی تھوڑا سا؟“ پھر سے اُس کے باعث گال پہ جھکتے زارون نے چھوٹی سے شرارت کی تو نور نے اب کی بار اُس کے ہو نٹوں پہ ہاتھ رکھا۔

”بُرے ہیں آپ۔ جب میں کہہ رہی ہوں مجھے نیند آئی ہے تو کیوں آپ مجھے تنگ کر رہے ہیں؟“ آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے لیے اُس نے شکوہ کیا تو زارون نے بُرا مناتے اُس کا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹایا۔

”ہاں میں بہت بُرا ہوں جو کچھ دیر اپنی بیوی سے پیار کرنا چاہتا پر بیوی بہت اچھی ہے جو شوہر کے پاس آنے پہ بھی اُسے یوں ڈانٹ رہی۔ بس میں ناراض ہوں نہ بولو مجھ سے“، اُس کی بات سنتے ہی زارون نے مصنوعی خفگی سے پچھے ہٹنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی نور نے جلدی سے اُس کی گردان میں بازو حائل کیے۔

”میں نے کب منع کیا۔ مطلب میں نے کب کہا کہ آپ پیار نہ کریں۔ وہ تو بس میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے نیند آئی ہے اور اگر میں نہ سوئی تو میرے سر میں درد ہو گا“، اپنی بات سے صاف ہی مکرتے نور نے صفائی پیش کی تو زارون نے بھنویں اچکاتے اُسے گھورا جواب اپنی مسکراہٹ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

”اچھاٹھیک ہے سو جاؤ“، اپنے موبائل پہ ہونے والی بیل پہ اُس جانب متوجہ ہوتے زارون نے اُس کی پیشانی میں بوسہ دیا اور اٹھ کر اپنا موبائل اٹھایا تو نور نے اپنی جان بخشی پہ اللہ کا شکر ادا کیا اور کمفرٹ راوڑھے جلدی سے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

”جب... یہ مجھے اتنے سالوں بعد اور اس وقت کیوں کال کر رہی ہے؟“ ایک نظر نور کی طرف دیکھتے زارون نے زیر لب کہا اور ناچاہتے ہوئے بھی کال ریسیو کرتے کمرے سے باہر نکل گیا۔

-----

”ہیلو..“ کمرے کا دروازہ بند کرتے ہی اُس نے دوسری طرف سے خاموشی محسوس کرتے خود ہی مقابل کو مخاطب کیا جو اُس کی آواز سنتے ہی کا نینے لگی تھی۔

”جب...“ مسلسل خاموشی پہ زارون نے اُس کا نام پکارا جس کے نتیجہ میں دوسری طرف کوئی بھی جواب دینے کی بجائے کال کاٹ دی گئی۔

”بند کر دیا فون، افف پتا نہیں کون تھا۔ میں بھی بیو قوف ہوں اُس کا نمبر دیکھتے ہی کال ریسیو کر لی“، موبائل کان سے ہٹاتے کال کے بند ہونے کا تیقین ہوتے ہی زارون نے اپنی بے اختیاری پہ خود کو ڈپٹا اور دل کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی کچھ منٹ تک دوبارہ کال آنے کا انتظار کرتا رہا

مگر دس منٹ گزرنے کے بعد بھی جب دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ واپس کمرے کا دروازے کھولتے اندر داخل ہوا۔

”کس کی کال تھی؟“، زارون کے باہر جاتے ہی نور جو سونے کی تیاری میں تھی، پھر سے اُٹھ بیٹھی اور اُس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی جو آج سے پہلے کبھی بھی اس طرح کسی کی کال آنے پر موبائل لے کر کمرے سے نہیں گیا تھا۔

”ارحم کی تھی اور تم پھر سے اُٹھ بیٹھی ہو؟ خیریت ہے نا؟ مجھے لگ رہا آج تمہارا بھی سونے کا موڈ نہیں،“، سچ بولنے کی بجائے زارون نے سرسری سے انداز میں جھوٹ بولا کیونکہ وہ نور کو حبہ کے بارے میں بتا کر اُس کے دل میں اپنی طرف سے کوئی شک نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔

”ہونہے مجھے نیند آرہی ہے پر آپ ہی دو منٹ بعد مجھے جگادیتے،“، اُس کی نظروں میں شرارت دیکھ نور نے منہ بسورا اور کمفرٹر ٹھیک کرتے لیٹ گئی۔

”میں نے کب جگایا؟ ابھی بھی میں، تمہاری نیند خراب ہونے کے ڈر سے کمرے سے باہر گیا تھا کہ میرے بولنے سے تمہاری آنکھ نہ کھلے پر پھر بھی تم مجھے ہی الزام دے رہی ہو،“، لائٹ آف کرتے وہ بیڈ پہ اُس کے قریب آ کے لیٹتے خفگی سے اپنے باہر جانے کی وضاحت دینے لگا۔

”تو میں نے کب کہا کہ آپ کے بولنے سے میری نیند خراب ہوتی ہے اور ارحام بھائی نے اس وقت کیوں کال کی؟ میرا مطلب ان کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ اُس کے کندھے پر سر رکھتے نور نے فکر مندی سے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ ویسے ہی کال کی تھی،“ اُس کی نیند سے بھری آنکھوں کو دیکھتے زارون نے جواب دینے کے ساتھ ہی اُسے اپنے حصار میں لیا۔

”بُرے ہیں آپ، آپ کو نہیں پتہ میری کمر پر زخم ہیں۔ تو بہ اتنی زور سے دبایا آپ نے،“ اُس کے پشت پر ہاتھ رکھتے ہی نور نے دبی سی آواز میں چیختنے اُس کا ہاتھ ہٹایا۔

”مطلوب؟ زخم کیوں ہیں؟ ٹھیک نہیں ہوئے ابھی تک؟“ اُس کے چہرے پر تکلیف کے آثار دیکھ زارون نے فکر مندی ظاہر کی۔

”نہیں، ٹھیک ہیں اب، بس وہ کل میں صفائی کر رہی تھی تو ٹیبل لگ گیا میرے اور لگا بھی زخم پہ،“ چہرے پر معصومیت طاری کرتے اُس نے اپنا کارنامہ بتایا۔ ”افف بس کبھی کوئی سیدھا کام مت کرنا اور دکھاؤ مجھے زیادہ لگی ہے کیا؟“ اُس کی بات سنتے ہی زارون نے خود ہی اٹھتے اُس کا زخم دیکھنا چاہا پر اُس سے پہلے ہی نور نے سیدھے ہو کر لیٹتے اُسے منع کیا۔

”نہیں، ٹھیک ہے اب میں نے کریم لگائی تھی۔ بس آپ سو جائیں مجھے بھی نیند آ رہی ہے“، اُس کی بات پر اپنی ہچکچاہٹ پہ قابو پاتے نور نے تسلی دی تو اُس کی جھجک کو سمجھتے زارون نے مزید کچھ بھی کہے بغیر اپنی سائیڈ کالیپ بند کیا اور خود بھی سونے کی کوشش کرنے لگا پر آنکھیں بند کرتے ہی جبکہ خیال نے اُسے ایک بار پھر سے بے چین کرتے مختلف وسوسوں اور سوچوں میں ڈال دیا۔

---

کال بند کرنے کے بعد بھی کافی دیر تک موبائل ہاتھ میں پکڑ کے بیٹھے رہنے کے بعد حبہ نے اپنی بے اختیاری پہ خود کو کو ساجو آج اتنے سالوں بعد اُس نے زارون کو کال کر کے کی۔

”پتا نہیں کیوں؟ آج اس تھائی میں مجھے اُس شخص کی یاد آئی جسے اب سے پانچ سال پہلے میں نے ٹھکرایا۔ میں نے اپنی ماں کی ضد میں اُس محبت کرنے والے انسان کو تکلیف دی جس نے میری بے رخی پہ بھی مجھے خوش رہنے کی دعا دی۔ یا اللہ میں کیوں اُس وقت اتنی بے حس ہو گئی تھی کہ میں نے اپنے رشتؤں کو ترجیح دیتے اُس انسان کو تکلیف پہنچائی جس نے دنیا میں مجھے سب سے زیادہ چاہا۔ میری پرواکی۔ ہاں مجھے زارون کی ہی بد دعا لگی ہے۔ مجھے اُس کی آہ لگی ہے جس کے ساتھ میں نے اتنے سالوں تک محبت کا کھیل کھیلا۔ میں نے زارون کے ساتھ بُرا کیا۔ میں نے اُس کے

جد بات اور احساسات کی فکر نہیں کی۔ میں نے اُس کا دل توڑا، اسی لیے آج میرے ہی رشتؤں نے مجھے یوں ٹھکرایا۔

ہاں، مجھے اُس کے دل توڑنے کی سزا ملی ہے۔ مجھے اُسے پچ راستے میں تنہا چھوڑنے کی سخت ترین سزا ملی ہے۔ ہاں میں اسی قابل تھی۔ حبہ آندی اسی قابل ہے کہ لوگ اُسے یوں ٹھکرائیں اُسے بر باد کریں، اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپائے وہ ایک بار پھر سے اپنی اُس توہین پر پھوٹ پھوٹ کر روئی جو آج احتشام نے اُسے طلاق دے کر کی تھی۔

”ابو، آئیں آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟“، ارحم نے دروازے پہ دستک سنتے ہی ہاشم صاحب کو دہلیز پہ کھڑا دیکھ کر اندر آنے کا کہا۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟“، کمرے میں داخل ہوتے انہوں نے اُسے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرتا دیکھ خود ہی آگے بڑھتے اُس کی اٹھنے میں مدد کی۔

”جی ٹھیک ہوں اب۔ آپ آج آفس نہیں گئے؟“، ان کی بات کا جواب دیتے ارحم نے سوال کیا تو ہاشم صاحب نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”نہیں، آج میرا دل تھا کہ تمہارے ساتھ وقت گزاروں اسی لیے سارے کاموں سے چھٹی لے لی،“ اُس کے قریب ہی بیٹھتے ہاشم صاحب نے مسکراتے ہوئے اپنے آفس نہ جانے کی وجہ بتائی۔

”ٹھیک ہے۔ مطلب آج پھر سے آپ کا میرے ساتھ شترنج کھیل کے ہارنے کا ارادا ہے؟“ اُن کے ساتھ وقت گزرانے کا سنتہ ہی ارحم نے نظروں میں شرات لیے اُن کے زخموں پہ نمک چھڑ کا۔

”ہونہ بس بس پتا مجھے کہ پچھلی بار کیسے جیتے تھے تم اور بیٹا جی تکہ ہر بار نہیں چلتے اس لیے اس بار ذرا مجھے ہر اکے دکھنا،“ اُس کی مسکراہٹ پہ چینچ کرتے ہاشم صاحب نے اُسے اپنی قابلیت دکھانے کا پکا ارادا ہ کیا۔

”ٹھیک ہے، دیکھیں گے،“ اُن کے چینچ کو کھلے دل سے قبول کرتے ارحم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دیکھ لینا، اور میں یہاں تم سے ایک ضروری بات کرنے آیا تھا پر تم نے آتے ہی میرا دھیان بٹا دیا،“ ساری باتوں کو پس و پشت ڈالتے انہوں نے اپنے آنے کا اصل مقصد بیان کیا۔

”جی کریں، کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا؟“ اُن کی بات پہ بھرپور سنبھال گی کے ساتھ وہ سیدھا ہو کر بیٹھتے اُن کی جانب متوجہ ہوا۔

”ہاں ہاں سب خیریت ہے۔ وہ بس میں نے تمہیں یہ بتانا تھا کہ تمہارے اور زارون کی بیوی کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ سارا کیا دھر امراد شاہ کا تھا“، تھوڑا ہچکپا تے ہوئے انہوں نے ارحم کو آگاہ کیا۔

”مراد شاہ؟ حیدر شاہ کا پیٹا؟ اُس کی نور سے کیا دشمنی؟ اور آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟“، اُن کی بات مکمل ہوتے ہی ارحم نے ایک دم سے حیران ہوتے ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

”دشمنی کا تو پتا نہیں بہر حال مجھے یہ بات گارڈ کے ذریعے معلوم ہوئی ہے جنہوں نے میرے کہے بغیر، ہی اُس جگہ کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی تھی جہاں تمہیں گولی لگی، اور یہ تو زارون کی مہربانی تھی کہ اُس نے پولیس کیس کیسے ہونے کے باوجود بھی ڈاکٹرز کی منت کر کہ تمہارا آپریشن شروع کروادیا اور پھر جب مجھے پتا چلا تو میں نے ڈی آئی جی کو کال کر کے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تاکہ تمہارے علاج میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور یہی وجہ تھی کہ پولیس نے ایک بار بھی ہسپتال آکر تم سے کسی قسم کی کوئی تحقیق نہیں کی“، پوری بات تفصیل سے بتاتے ہاشم صاحب نے اُس کے سوالوں کے ساتھ ساتھ باقی کئی باتیں بھی واضح کیں۔

”تواب؟ آپ نے کیا سوچا ہے؟ مطلب آپ یہ چاہ رہے ہیں کہ میں پولیس کو بیان دوں؟“، اُن کی ساری بات سننے کے بعد نتیجہ پہ پہنچتے ارحم نے تصدیق چاہی۔

”نہیں، اُس کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ جس رات تمہارے ساتھ یہ حادثہ ہوا تھا مراد شاہ اور حیدر شاہ پشاور میں موجود تھے اور وہیں سے انہوں نے کچھ بچیوں کی سملگنگ افغانستان کرنی تھی پر بد قسمتی یہ کہ جس شخص سے وہ پچھلے دو مہینوں سے یہ ڈیل کر رہے تھے وہ درحقیقت آرمی کا ایک آفیسر تھا جس نے لڑکیوں کو بازیاب کروانے کے ساتھ ساتھ ان دونوں باپ بیٹوں کو بھی رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا اور اب وہ دونوں نظر بند ہیں“، ارحم کو ساری بات بتاتے ہاشم صاحب کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”وہ لوگ ایسے کام بھی کرتے تھے؟ اور آپ کو اتنی خفیہ معلومات کس نے دی؟“ لڑکیوں کی سملگنگ کا سنتے ہی ارحم کو مراد شاہ کے نور کو انداز کرنے کی وجہ سمجھ آئی تو اُس نے پھر سے کچھ الجھتے ہوئے ہاشم صاحب کی جانب دیکھا۔ ”مجھے ڈی آئی جی نے بتایا تھا جب میں نے گارڈز سے خبر ملتے ہی مراد شاہ اور حیدر شاہ کے خلاف ایف آئی آر کٹوانی چاہی تو انہوں نے مجھے آگے سے یہ خبر دی جسے سنتے ہی میرے اندر جلتی آگ کچھ ٹھنڈی ہوئی، ورنہ تم کیا سمجھے تھے کہ میں اب تک خاموشی سے ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھا ہوں؟ نہیں میں تو تمہارے ہوش میں آتے ہی اس کام کے پیچے لگ گیا تھا۔ کیا میں تمہیں تکلیف پہنچانے والوں لوگوں کو یوں آزاد چھوڑ سکتا ہوں؟ کبھی نہیں، مراد شاہ اگر زمین کی تہہ میں بھی چھپ جاتا تو میں اُس سے وہاں سے نکال کر اُس سے تمہاری تکلیف کا بدلہ

لیتا،“ غصے سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ ہاشم صاحب نے ارحم کی غلط فہمی دور کی جو تب سے یہ سمجھ کے بیٹھا تھا کہ اُس کے ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ ہر معاملہ ختم ہو گیا۔

”جانتا ہوں، کہ آپ مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں بس پہلے جاتے نہیں تھے اور اب جتنا لگے ہیں تو ہر روز اپنا ایک نیا روپ دکھا کر مجھے مزید شرمندہ کر دیتے ہیں“، اُن کے غصے کی پرواکیے بناء ارحم نے اُن کی فکر کا اعتراف نظر وں میں خفگی لیے کیا تو ہاشم صاحب اُس کے بچوں کی طرح منہ پھلانے پہ مسکراتے ہوئے اُسے اپنے سینے سے لگا گئے۔

”شرمندہ تو ہم ہیں اور غلطی بھی ہماری تھی جو ہم نے تمہیں زندگی کی ہر آسائش دی پر وقت نہیں“، اُس کی پشت تھپتھپاتے ہاشم صاحب نے اپنی غلطی مانی تو انہوں پھر سے افسردہ ہوتے دیکھے ارحم نے بات بدلتی اور اُن سے آئمہ بیگم کے بارے میں پوچھنے لگا آج صحیح سے ہی اُسے نظر نہیں آئی تھیں۔

-----

” هنا، یہ امی کیا کہہ رہی ہیں تم نے کل نور سے بد تیزی کی تھی؟“ جنید جو احمد صاحب کے کمرے میں اُن سے اپنے بزنس کے متعلق کوئی بات کرنے گیا تھا پر عابدہ بیگم کی زبان سے حنا کا نام سن کر وہیں رک کر اُن کی باتیں سننے لگا جو انہیں کل حنا کی نور سے کی گئی بد تیز کے متعلق بتا رہیں تھیں۔

” بد تیزی؟ دماغ ٹھیک ہے آپ کا؟ اور میں کیوں اُس دو لکھے کی لڑکی سے بد تیزی کروں گی؟ میں تو اُس کی شکل تک دیکھنا گوراہنہ کروں اور آپ بد تیزی کی بات کر رہے ہے“، اُس کے بات کرتے ہی حنا نے کوئی بھی لحاظ کیے بغیر غصے سے اپنی غلطی ماننے سے انکار کیا۔

” اور یہ آپ کی امی نے اس لیے ہمیں پاکستان بلا یا تھا کہ آپ کو میری شکایات لگا لگا کے ہمارے درمیان کشیدگی پیدا کر سکیں؟“ جنید کے کچھ بولنے سے پہلے ہی حنا نے ایک بار پھر سے اپنی زبان سے زہرا گلتے سارا الزام عابدہ بیگم کے سر ڈالا۔

” بس، زیادہ فضول بولنے کی ضرورت نہیں ہے اور امی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ میں تو اب سے بات کرنے اُن کے کمرے میں گیا تھا اور آگے سے امی ابو کو تمہاری کل کی حرکت کے بارے میں بتا رہیں تھیں جس کے بارے میں سُن کر مجھے بھی دکھ ہوا۔ حنا میں تو تمہیں بہت سمجھدار اور معاملہ فہم سمجھتا تھا پر تم نے جو رو یہ نور کے ساتھ بر تا، مجھے اُس سے بہت مایوسی ہوئی ہے“، اُس کی سوچ اور ان اپنے نفی میں سر ہلاتے جنید نے اُس سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

”ہونہہ آپ کو میرے رویے سے تو مایوسی ہوئی پر اپنے بھائی اور بھا بھی کے رویے سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑا جو ہمارے آنے سے پہلے ہی کہیں غائب ہو گئے اور پورے ہفتے بعد ہمیں اپنی شکل دکھائی۔ پہلے آپ کے والد اور والدہ صاحبہ نے ہم سے چوری چھپے بیٹے کو بیاہ ڈالا اور اب ہماری آمد پہ ان کی غیر موجودگی؟ تب امی کو یہ سب نظر نہیں آیا پر کل کی میری معمولی سے بے رخی انہیں نظر آگئی۔ افف، توبہ ہے اتنی سیاست؟ اللہ معاف کرے“، اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے حنا نے نان سٹاپ بولنا شروع کیا تو جنید کے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھنے کے باوجود بھی اپنی بات مکمل کر کے ہی دم لیا۔

”سیاست میری امی میں نہیں بلکہ تمہارے دماغ میں بھری ہے جو اتنی وضاحتوں کے بعد بھی تمہیں یہ سمجھ نہیں آئی کے نور اور زارون خوشی سے گھر سے غائب نہیں تھے اور میرے خیال سے یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے جس پر تم یوں ہنگامہ کر رہی ہو“، غصے کے باوجود بھی گھر میں کسی بھی قسم کی بد نظمی سے بچنے کے لیے جنید نے اپنے آپ پر ضبط کرتے حنا کو سمجھایا جس کو اُس کی بات سنتے ہی پتھنگے لگ گئے تھے۔

”ہاں اگر یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی تو میر آپ کی چھوٹی بھا بھی صاحبہ سے گلنہ ملنا بھی غیر معمولی تھا جسے آپ کی امی نے پورے گھر میں یوں نشر کیا جیسے پتا نہیں مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہو“

گیا ہو،” اُس کی بات کو درمیان سے کاٹتے ہنانے کسی کی بھی پرواکیے بناء چلاتے ہوئے کہا تو جنید نے اُس کا دماغ خراب دیکھ مزید کوئی بھی بات کرنے کا ارادا ترک کرتے غصے سے باہر کا رخ کیا تاکہ اُس کمرے میں رہنے سے ہنا کو کوئی اور بات کرنے کا موقع نہ ملے۔

”آئے بڑے اپنی امی کے جمایتی“، اُس کے جاتے ہی دانت پستے ہنانے اپنا غصہ صوف پہ پڑے کشنز کوز مین پر پھینک کر نکالا۔

-----

”نور، میرے خیال سے کل تمہارا پیپر ہے وہ بھی فائل اور تم پڑھنے کی بجائے یہاں بیٹھی گپے مارنے میں مصروف ہو“، اُسے سارے گھر میں ڈھونڈنے کے بعد وہ مزمل کے کمرے کے قریب سے گزرنے لگا تو وہاں سے نور کی آتی آواز پر رکتے اندر داخل ہوا جو اکیلی بیٹھی ایمان کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھی۔ ”پیپر؟ کون سا پیپر؟“ اُس کی بات سنتے ہی نور نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا جو اُس کی ساری چالکیوں سے واقف تھا۔

”یہ دیکھو، رابعہ نے ڈیٹ شیٹ سینڈ کی ہے“، اُس کا موبائل کھول کر اُس کی نظروں کے سامنے کرتے زارون نے اُس کے انجان بنانے کی ایکٹنگ پر پانی پھیرا۔

”یہ کب سینڈ کی؟ میں نے تو نہیں دیکھی“، موبائل اُس کے ہاتھ سے لیتے نور نے چہرے پہ پریشانی کے آثار سجائے تصویر کو زوم کر کے دیکھا۔

”بس بس زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے اور میں اچھے سے جانتا ہوں جو تم نے نہیں دیکھی۔“  
چھوڑو یہ سب اور اٹھو جا کر کمرے میں تیاری کرو پسپر کی“، اُس کی گود سے ایمان کو اٹھاتے زارون نے اُس کا بازو پکڑتے اُسے کھڑا کیا۔

”نہیں، میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔ بھا بھی نے مجھے اس کا خیال رکھنے کا کہا ہے“، زارون کی نظروں میں سختی دیکھ نور نے پھر سے بہانہ بنایا۔

”اے میں امی کو دے دوں گا اس لیے تم اس کی فکر چھوڑ اور جاؤ کمرے میں جا کر اپنی کتابیں لے کر بیٹھو“، اُس کی کوئی بھی بات سننے بغیر زارون نے حکم دیا اور ایمان کو عابدہ بیگم کے پاس چھوڑنے کے لیے اُن کے کمرے کی جانب بڑھا۔

”ہونہہ زار ہیں ہی بُرے۔ خود تو کبھی پڑھا نہیں اور ہر وقت مجھے پڑھنے کا بولتے رہتے“، اُس کے جاتے ہی نور نے خود کلامی کی اور خفگی سے پاؤں پٹختنے اپنے کمرے کی جانب بڑھی۔

-----

ایمان کو عابدہ بیگم کے پاس چھوڑنے کے بعد وہ تقریباً ایک گھنٹے تک انہی کے کمرے میں بیٹھا۔ احمد صاحب کے لیپ ٹاپ کو چیک کرنے لگا جو کافی دنوں سے مسئلہ کر رہا تھا۔

”یہ لیں ابو ہو گیا۔ اب یہ کوئی مسئلہ نہیں کرے گا“، زارون نے کچھ ضروری فائلز وغیرہ کرنے کے بعد اپنی تسلی ہونے پر لیپ ٹاپ احمد صاحب کی جانب بڑھایا۔

”شکر ہے ٹھیک ہو گیا۔ مجھے تو لوگ رہا تھا کہ جو اس کے حالات ہیں عین ضرورت کے وقت یہ جواب دے جائے گا“، لیپ ٹاپ میں مختلف فائلز کھول کر دیکھنے کے بعد احمد صاحب نے تسلی ہونے پر اُسے بند کیا۔

”نہیں، اتنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بس کچھ وائرس ایکٹیویٹ ہو گئے جس کی وجہ سے یہ بار بار ہینگ ہو رہا تھا“، انہیں اصل خرابی بتاتے زارون نے اپنا چائے کا کپ اٹھایا جو اس کے انتظار میں پڑا پڑا اٹھندا ہو چکا تھا۔

”میں گرم کر کے لادیتی ہوں یہ تو ٹھنڈی ہو گئی ہے“، اُسے کپ اٹھاتا دیکھ عابدہ بیگم نے ٹوکا۔

”نہیں کوئی بات نہیں میں پی لوں گا“، انہیں اٹھنے سے منع کرتے زارون نے ٹھنڈی چائے کا سیپ لیا۔

”زارون، میں سوچ رہا تھا کہ اب کچھ دنوں میں معاذ بھی آجائے گا تو کیوں نامیں سب کے حصے کی جائیداد اُن کے حوالے کر دوں۔ میرا مطلب ہے کہ زندگی کا کیا بھروسہ؟ اور ویسے بھی سب اتنے سالوں بعد اکٹھے ہوئے ہیں تو کیوں نامیں اس بار سب کو اُن کے حصے دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں“، احمد صاحب جو کچھ دنوں نے اس معاملے کے متعلق سوچ بچار کر رہے تھے انہوں نے اس وقت موقع دیکھ کے اپنے دل کی بات زارون سے کہی۔

”ابو، اللہ پاک آپ کو لمبی عمر دے اور ہمیں جائیداد کی نہیں بلکہ آپ کی ضرورت ہے“، اُن کی بات پر حیرت سے کپٹیبل پر رکھتے زارون نے اُن کا ہاتھ تھاما۔

”ہاں جانتا ہوں پر پھر بھی میں اپنے اس فرض سے ادا یکگی چاہتا ہوں اس لیے تم کل بینک سے تمام ضروری کاغذات نکلوالا نا اور ساتھ و کیل کو بھی فون کر دینا تاکہ تمام قانونی کروائی سب کی موجودگی میں ہی ہو جائے“، اُس کی بات پر مسکراتے احمد صاحب نے کچھ اہم کام اُس کے ذمے لگائے۔

”جی ٹھیک ہے میں نکالوں گا پر یہ بات آپ نے پہلے تو کبھی نہیں کی۔ میرا مطلب ہے جنید یا مزم بھائی نے آپ سے اس بارے میں کچھ کہا ہے کیا؟“، اپنے دماغ میں آنے والے سوال کو زبان تک لاتے زارون نے اُن کی جلدی کی وجہ جانی چاہی۔

”نہیں، اُن دونوں نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور یہ میرا اپنا فیصلہ ہے اس لیے تم پر بیشان نہ ہوا اور جو کام میں نے کہا ہے کل ہر حال میں کر دینا“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے اُس کے ہر خدشے کو دور کرتے احمد صاحب نے تسلی دی تو زارون نے اثبات میں سر ہلاتے اپنی چائے ختم کی اور عابدہ بیگم کی جانب متوجہ ہوا جو اسے نور کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔

---

احمد صاحب کی بات پہ دماغ میں کشکاش لیے وہ واپس اپنے کمرے میں آیا تو نور کو سکون سے بیڈ پہ بیٹھے اپنے سامنے لڈو کھو لے خود ہی اپنے ساتھ کھیلتا دیکھ زارون کا پارہ چڑھا۔

”نور، میں نے تمہیں یہاں پڑھنے کے لیے بھیجا تھا یا لڈو کھیلنے؟“، اُس کے سر پہ پہنچتے زارون نے ما تھے پہ بل لیے قدرے اوپھی آواز میں اُسے ڈالنا جو اپنے ہی دھیان میں بیٹھی گوٹ چلانے میں مگن تھی۔

”اُفف زار آپ نے تو مجھے ڈرا دیا“، اُس کے غصے کی پرواکیے بناء ہی نور نے ایک نظر پچھے پلٹ کر اُسے دیکھا اور مطمئن ہوتے پھر سے اپنے کام میں لگ گئی۔

”نور میں تم سے کچھ کہہ رہا ہوں“، اُس کی ہٹ دھرمی پہ زارون نے اب کی بار کہنے کے ساتھ ہی لڑو گوٹ سمیت بند کر کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا۔

”زار کیا مسئلہ ہے آپ کو؟ آپ نے میری ساری گیم خراب کر دی۔ بہت بُرے ہیں آپ“، اُس کی حرکت پر بلباتے ہوئے نور نے بیڈ پہ ہی کھڑے ہوتے اُسے بُرا جلا کہا۔

”بس زیادہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اتنی ازرجی جو تم بولنے میں ضائع کر رہی ہونا اگر اتنا پڑھا ہوتا تو اب تک سارا سیلیبس مکمل ہو چکا ہوتا“، اُس کے پھولے گالوں کو دیکھتے زارون نے کوئی بھی ترس کھانے کی بجائے اُسے کمر سے پکڑ کر بیڈ سے نیچے اٹارتے اپنے سامنے کھڑا کیا۔

”نہیں پڑھنا مجھے اور نہیں دینے پیپر میں نے“، اُس کی ڈانٹ پر آنکھوں میں نمی لیے نور نے نفی میں سر ہلا�ا۔

”تم پڑھو گی بھی اور پیپر بھی دو گی اس لیے میری جان یہ جذباتی ڈار مہ بند کر کے کتابیں لے کر بیٹھ جاؤ ورنہ میں پوری رات تمہیں پڑھاؤں گا وہ بھی خود“، اُس کی معصوم صورت دیکھ پکھلنے کی بجائے زارون نے دھمکی دی تو نور نے ایک ناراض نظر اُس پہ ڈالتے خاموشی سے اپنی کتابیں اٹھائیں اور خفگی کے اظہار کے لیے بالکونی میں جا بیٹھی۔

”اچھے سے پڑھنا، میں ارحم کی طرف جا رہوں اور واپس آکر تمہاراٹیسٹ لوں گا جس میں اگر تم فیل ہوئی تو میں ساری رات جگا کر تمہیں پڑھاؤں گا“، اُس کی ناراضگی کی پرواکیے بناء، ہی زارون نے پھر سے دھمکی دی تو نور نے اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے اُسے گھورا جو اُس پر توجہ دیے بغیر، ہی اپنا موبائل اور گاڑی کی چابی اٹھاتے کمرے سے نکل گیا تو نور نے ضد سے کتابیں بند کیں اور گھٹنوں میں سر رکھتے بادلوں کی طرف دیکھنے لگی جو آج صبح سے ہی برنسے کے لیے بے تاب تھے۔

-----

ارحم کے گھر پہنچتے ہی زارون کا پہلا سامنا آئمہ بیگم سے ہوا جو سیڑھیاں اُترتے کچن کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

”السلام علیکم آنٹی، کیسی ہیں آپ؟ اور ارحم کی طبیعت اب کیسی ہے؟“ اُن کے سامنے سر جھکاتے زارون نے مودبانہ انداز میں اُن کا حال احوال دریافت کیا۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ مِنِّي ٹھیک ہوں اور اپنے دوست کا حال تم خود ہی اوپر جا کر پوچھو لو“، اُس کے کندھے پر تھکلی دیتے آئمہ بیگم نے اوپر سے آنے والے شور پر زارون کو اُس جانب متوجہ کروایا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے سیر ھیاں چڑھتے ارحم کے کمرے میں آیا جہاں وہ اور ہاشم صاحب بیٹھے کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔

”السلام علیکم، انکل کیسے ہیں آپ؟ اور یہ کس بات پر بحث ہو رہی ہے؟“ انہیں سلام کہتے زارون نے معاملے کی نوعیت سمجھنے کی کوشش کی۔

”وَعَلَيْكُمُ السَّلَامُ، مِنِّي ٹھیک ہوں اور اپنے دوست کے حالات دیکھو لو۔ پہلے شترنج کھیلتے ہوئے اس نے اتنی بے ایمانی کی اور اب جب مجھ سے ہار رہا ہے تو اٹا مجھ پر ہی الزام لگا رہا کہ ابوآپ نے میرے ساتھ چیننگ کی ہے“، اُس کے سلام کا جواب دیتے ہاشم صاحب نے بحث کی وجہ بتائی تو ارحم نے نظروں میں خنگی لیے انہیں دیکھا۔

”ابوآپ اب غلط بیانی کر رہے ہیں اور اللہ سے ڈریں مجھ معصوم پر اتنا بڑا الزام لگاتے جسے بے ایمانی کی اب بھی نہیں پتا“، اُن کی شکایت پر صاف ہی مکرتے ارحم نے معصومیت دکھائی تو ہاشم صاحب نے گیم مکمل کیے بناء، اپنی ہار مانتے زارون کو بیٹھنے کا بولا جوار حرم کی ڈرامے بازی پر ابھی تک اُس کے قریب کھڑا تھا۔

”تم لوگ بیٹھو میں زر آفس فون کر کے وہاں حال احوال پوچھ لوں“، بیڈ سے شطرنج اٹھا کر ٹیبل پر رکھتے ہاشم صاحب نے اُن دونوں سے کہا اور زارون سے چائے پینے کے متعلق پوچھتے باہر کی جانب بڑھے۔

”کیسی طبیعت ہے اب؟“، ہاشم صاحب کے جاتے ہی زارون اُس کی جانب متوجہ ہوا، جو شاید تھک جانے کی وجہ سے بیڈ کی بیک سے ٹیک لگا کر بیٹھ چکا تھا۔

”ہاں یار طبیعت ٹھیک ہے، البتہ اپنے ماں باپ کا اپنے ساتھ اتنا اچھا رویہ دیکھ کر دماغ تھوڑا خراب ہو گیا ہے“، نظروں میں شرارت لیے ارحم کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

”ہونہہ پہلے جب خیال نہیں کرتے تھے تب بھی تمہارا دماغ خراب تھا اور اب اگر تمہیں وقت اور توجہ دینے لگے ہیں تب بھی تم ایسی باتیں کر رہے ہو؟ افف پہتا نہیں کس حال میں خوش ہونا تم نے“، اُس کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھتے زارون نے اُس کی بات پر تیوری چڑھائی۔

”ہونہہ بس بس زیادہ باتیں سنانے کی ضرورت نہیں اور میں خوش ہی ہوں پر یار ایک بات سمجھ نہیں آرہی؟“، نظروں میں الجھن لیے ارحم نے سوالیہ نظروں اُسے دیکھا۔

”کیا سمجھ نہیں آرہا؟“، اُس کے سوال کو دھراتے زارون نے وضاحت چاہی۔

”یہی کہ یہ جادو ہوا کیسے؟ مطلب اگر مجھے پتا ہوتا کہ میرے گولی لگنے سے میرے ماں باپ کو عقل آجائی تو میں آج سے دس سال پہلے ہی کسی کو پسیے دے کر گولی کھالتا“، اُس کی بات کا جواب دیتے ارحمنے اپنا ارادہ بتایا تو زارون نے اُس کی بات مکمل ہوتے ہی جواب دینے کی بجائے پاس پڑا کشن اٹھا کر اُسے مارا۔

”کہتے ہیں شکل اچھی نہ ہو تو انسان بات ہی اچھی کر لے پر نہیں، یہاں تو شکل کے ساتھ ساتھ زبان بھی کالی ہے“، اُس کے شور مچانے پہ کشن واپس رکھتے زارون نے دانت پسیے تو ارحمنے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

”بھاڑ میں جاؤ، میں جا رہا ہوں گھر“، اُسے ہنستاد کیہ زارون نے اُسے کھاجانے والی نظر وہ س دیکھتے اٹھنا چاہا۔

”اچھا اچھا اب کوئی فضول بات نہیں کرتا۔ بیٹھو مجھے تمہیں ایک ضروری بات بتانی ہے“، اُس کی ناراضگی پہ سنجیدہ ہوتے ارحمنے اُسے روکا۔

”ہم بولو کیا بات ہے؟ اگر پھر سے تم نے کوئی فضول بکواس کی تو میں سچ میں اٹھ کر چلا جاؤں گا“، اُسے بات کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی زارون نے اُسے تنبیہ کی تو ارحمنے اثبات میں سر ہلا کیا اور سنجیدگی اختیار کرتے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”تمہیں پتا ہے نور کو کس نے اغوا کیا تھا؟ مطلب اُس نے تمہیں اس بارے میں کچھ بتایا کہ وہ لوگ کون تھے؟“

”نہیں، میری اس بارے میں نور سے کوئی بات نہیں ہوئی اور نہ ہی اُس نے مجھے کچھ بتایا پر تم نے اس وقت یہ بات کیوں کی؟ میرا مطلب کیا تمہیں ان لوگوں کے بارے میں کچھ پتا ہے؟“ اُس کے اس طرح اچانک ذکر کرنے پر زارون کی چھٹی حسنے اسے کسی غیر معمولی بات کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں، ابھی کچھ دیر پہلے ہی ابو نے مجھے بتایا کہ وہ سارا مراد شاہ کا کیا دھرا تھا۔ مراد شاہ حیدر شاہ کا بیٹا، جس کی ہمارے ساتھ ہو ٹل میں لڑائی ہوئی تھی یاد ہے؟“ ارحم نے اُسے بتانے کے ساتھ یاد دہانی کروائی۔

”ہاں، ہاں مجھے یاد ہے پر اُس کا نور کے ساتھ کیا تعلق۔ وہ نور کو کیوں اغوا کرے گا؟“ مراد شاہ کا نام سننے ہی زارون کے ماتھے پہ بل پڑے۔

”یہ تو پتا نہیں، بس اتنا پتا کہ وہ لڑکیوں کی اسمگنگ میں بھی ملوث تھا۔ ہو سکتا ہے اُس نے ہم سے بدله لینے کے لیے نور کو اغوا کیا ہو،“ ارحم نے اُس کے سوال کا جواب دینے کے ساتھ ہی ہاشم

صاحب کی دی گئی تمام معلومات زارون تک پہنچائی جو مراد شاہ اور حیدر شاہ کے گرفتار ہونے کے بارے میں سُنتے ہی مطمئن ہونے کے ساتھ ساتھ حیران بھی ہوا۔

”اچھا ہوا، اُن دونوں باپ بیٹوں کا اعلان ہی یہی تھا۔ پتا نہیں لوگ برائی کرتے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اللہ پاک نے اگر ان کی رسی کو ڈھیلا چھوڑا ہے تو صرف اس لیے کہ وہ خود اپنی غلطی کو سمجھیں اور اُس پہ شرمند ہو کر اُس برائی کو چھوڑ دیں، اللہ تو چاہتا ہے کہ اُس کے بندے کی برائی دنیا کے سامنے نشر نہ ہو پر بندہ؟ بندہ اپنی غلطیوں کو چھوڑنے کی بجائے بار بار وہی غلطی دھرا تا رہتا ہے جب تک اُس کی پکڑ نہیں ہوتی۔ مراد شاہ اور حیدر شاہ نے بھی یہی سب کیا انہوں نے اپنی برائی پہ خود کو قادر سمجھتے یہ گمان کر لیا کہ اب اُن کی پکڑنا ممکن ہے اور یہی اُن کی سب سے بڑی غلط فہمی تھی،“ ارحم کی بات مکمل ہوتے ہی زارون نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ نور اُن درندوں سے نجگئی۔

”ہاں بس انسان کی اوقات ہی کیا ہے ابھی سانس چل رہی ہے تو اگلے لمحے بند۔ اور اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے نور کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اللہ پاک نے اُس کی عزت بھی محفوظ رکھی اور جان بھی،“ زارون کی بات سنتے ارحم نے خود بھی اُس کی بات کی تائید کی جواب اُسے رات آئے حبہ کے فون کے متعلق بتانے لگا۔

”جبہ؟ اُس نے کیوں کال کی تمہیں؟ مطلب اتنے سالوں بعد اُسے کیا ضرورت پڑ گئی تمہاری؟“، زارون کی زبان سے جبہ کا ذکر سننے ہی ارجمند ایک دم سے سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”پتا نہیں یار میں نے بتایا کہ صرف کال آئی پر دوسرا جانب سے اُس نے کوئی بات نہیں کی اور تقریباً رات دو بجے کے قریب کال آئی تھی اور مجھے لگا کہ وہ کسی مصیبت میں ہو گی اسی لیے میں نے ریسیو کر لی،“، کندھے اچکاتے زارون نے لا علمی کا اظہار کیا۔

”وہ کتنی بھی بڑی مصیبت میں ہو پر اُس کا تمہیں کال کرنا نہیں بنتا تھا اور اگر وہ زندگی میں آگے بڑھ چکی تھی تو اسے یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ تم بھی وہیں اُس موڑ پہ کھڑے اُس کا انتظار نہیں کر رہے کہ جب اُس کا دل کرے منہ اٹھا کر تمہیں کال کر لے اور زارون خبردار اگر تم نے دوبارہ اُس کی کال ریسیو کی،“، ارجمند نے اپنی رائے کا اظہار کرتے اُسے تنبیہ کی جس کارات سے ہی دل جبہ کی جانب سے بہت پریشان تھا۔

”یار، میں کیوں کال ریسیو کروں گا اُس کی؟ میں نے بتایا اتنی رات کو کال آئی تو میں پریشان ہو گیا تھا اس لیے فون اٹھا لیا اور نہ اب میری زندگی میں نور کے علاوہ کوئی نہیں ہے،“، اُس کی فکر کو سمجھتے زارون نے تسلی دی۔

”ہونا بھی نہیں چاہیے۔ یار نور بہت معصوم ہے اور اُس نے زندگی میں اپنی عمر سے بڑے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ پہلے اُس کے ابو اور پھر یہ مراد شاہ، پروہ اتنا کچھ سہنے کے بعد بھی سنبھل گئی۔ پتا ہے کیوں؟“ اُس کی آنکھوں میں دلکھتے ارحم نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”کیوں؟“

”کیوں کہ اُسے تمہارے ساتھ ہونے کا یقین تھا۔ زارون اُسے تمہارا سہارا ہے۔ اُسے یقین ہے کہ ساری دنیا بھی اُس سے بد گمان ہو جائے پر تم نہیں ہو گے اس لیے پلیز تم اُس کے مان کو برقرار رکھنا اور اپنا ماضی دہرا کے کوئی ایسی غلطی نہ کرنا کہ جس پر ساری زندگی تمہیں پچھتا ناپڑے“، اُس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ارحم نے بہت نرمی کے ساتھ اُسے اپنی بات پر قائل کیا جو آخر ہم بیگم کے آتے ہی خاموشی اختیار کرتے ان کی جانب متوجہ ہوا جو چائے کے ساتھ ساتھ مختلف لوازمات لیے کمرے میں داخل ہوئے۔

-----

”نور پیٹا کیا ہوا تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ عابدہ بیگم نے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر دستک دیے بناءہی اندر داخل ہوتے اُس سے پوچھا جو کتابوں میں سردیے پڑھنے میں مصروف تھی۔

”جی ماما میں ٹھیک ہوں۔ کیوں کیا ہوا؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟“، انہیں یوں فکر مند دیکھ نور نے کتاب بند کی اور صوفے سے اٹھتے ان کی جانب متوجہ ہوئی جواب اُس کی پیشانی پہ ہاتھ لگائے اُس کی بات کی تصدیق کر رہی تھیں۔

”نہیں بات تو کوئی نہیں ہوئی وہ بس نسرین نے تمہارے کھانے سے منع کرنے کے متعلق بتایا تو مجھے لگا کہ شاید تمہاری طبیعت خراب ہے اسی لیے بس دیکھنے آگئی“، اُس کی بات سے مطمئن ہوتے عابدہ بیگم نے اُسے تسلی دی جو ان کے یوں فکر مند ہونے سے خود بھی پریشان ہو گئی تھی۔

”جی طبیعت ٹھیک ہے میری اور کل میرا اپنے ہے نابس اُسی کی تیاری کر رہی تھی اور ابھی مجھے بھوک بھی نہیں تھی اس لیے منع کر دیا“، نور نے انہیں وجہ بتاتے بیٹھنے کا کہا۔

”نہیں، بس تم پڑھو اور جب بھوک ہو کھانا کھالینا، ایسے بھوک کے پیٹ مت سونا“، اُس کی بات سنتے عابدہ بیگم نے ہدایت دی اور اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے نیچے کی جانب بڑھیں جہاں سب لوگ کھانے کی ٹیبل پہ اُن کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔

”کیا ہوا؟ نورا بھی بھی کھانے کے لیے نہیں آئی؟“، انہیں اکیلا ہی آتے دیکھ سب سے پہلے احمد صاحب نے سوال کیا۔

”نہیں، کہہ رہی ہے بھوک نہیں ہے اور کل اُس کا پیپر ہے اُس کی تیاری کر رہی ہے“، اُن کے ساتھ ہی نشست سنبھالتے عابدہ بیگم نے اُس کے انکار کی وجہ بتائی تو احمد صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے سب کو کھانا شروع کرنے کا کہا تو حنا کو اپنا غصہ نکالنے کا ایک اور موقع مل گیا۔

”ویسے امی آپ نے ہمیں تو آتے ہی یہ بات کہہ دی تھی کہ بھوک ہونا ہو پر کھانے کے لیے سب کے اکھٹے بیٹھ جانے سے ہی گھر کا ماحول خوشنگوار رہتا ہے تو کیا آپ نے اپنی چھوٹی بہو کو یہ بات نہیں سکھائی؟ میرا مطلب آپ کو اُسے بھی بتانا چاہیے تھا کہ اس گھر کے اصولوں میں یہ بات سب سے اہم ہے“، جنید کے گھور نے کو نظر انداز کرتے حنا نے اپنی بات مکمل کر کے ہی دم لیا۔ ”اُسے بھی سکھائی ہے اور اگر اُس کا پیپر نہ ہوتا تو میں اُسے ڈانٹ کے نیچے لے آتی۔ بس اُس کی مجبوری تھی اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا اور رہی بات تم لوگوں کی؟ تو حنا آج تک میں نے تم سب پہ بھی ایسی کوئی پابندی نہیں لگائی“، اُس کے طنز پر چپ رہنے کی بجائے عابدہ بیگم نے بھی سب کے سامنے اُس کی بات کا جواب دیا تو جنید نے حنا کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی اُسے روکا۔

”حنا پلیز، خاموش رہو“، اُسے نظروں سے تنبیہ کرتے جنید نے چپ رہنے کی درخواست کی تو اُس نے احمد صاحب کی وجہ سے اپنی زبان کو مزید کچھ کہنے سے روکا اور کھانے کی جانب متوجہ ہوئی جو اُس کے طرز پر عابدہ بیگم کے حلق میں کہیں اٹک سا گیا تھا۔

تقریباً و گھنٹے ارحم کے ساتھ گزرنے کے بعد زارون نے موسم کے تیور خراب دیکھ اُس سے کل پھر ملنے کا کہتے اُس سے اجازت طلب کی اور گھر کے لیے روانہ ہوا۔

”صاحب جی اپنے بیوی کے لیے گجرے لیں“، سگنل پہ گاڑی رکی تو ایک پچی ہاتھ میں پھولوں کے گجرے پکڑے اُس کی جانب آئی تو زارون نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا۔

”تمہیں کیسے پتا کہ میری بیوی ہے؟“ اُس کے ہاتھ سے گجرے لینے کے ساتھ ہی زارون نے اپنے بٹوے سے کچھ ہزار کے نوٹ نکالتے اُس سے پوچھا جس کے معصوم چہرے پہ اُس کے سوال پوچھنے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”صاحب جی، یہ تو ہماری اماں نے ہمیں سیکھایا ہے کہ سب گاڑی والوں کو یہی کہہ کر گجرے بیچنے ہیں“، اُس کے سوال پر معصومیت سے جواب دیتے اُس نے زارون کے بڑھائے ہوئے کچھ ہزار کے نوٹوں کو حیرت سے دیکھا۔

”صاحب جی یہ گجرے اتنے مہنگے نہیں ہیں یہ تو بس ایک سوروپے کے ہیں“، اُسے لگا کہ زارون کو اُن کی قیمت کا اندازہ نہیں تب ہی وہ اُسے اتنے پلیے دے رہا ہے۔

”ہاں، میں جانتا ہوں کہ یہ سوروپے کے ہیں پر یہ میں تمہیں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں اس لیے خاموشی سے پکڑواور جا کر اپنی اماں کو دے دینا،“ سگنل کھلنے پہ زارون نے وہ پسیے اُس بچی کے ہاتھ میں تھمائے جو شکریہ صاحب کہتے خوشی سے فٹ پا تھے پھری ایک عورت کی جانب بڑھی (جو یقیناً اُس کی ماں تھی) تو اُس نے پیچھے ہارن کی آواز سننے اپنی گاڑی آگے بڑھادی۔

”کچھ دیر میں وہ گھر پہنچا تورات کے گیارہ نجح چکے تھے۔“ لگتا ہے سب ٹائم سے ہی سو گئے ہیں آج، بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے اُس نے چاروں طرف خاموشی محسوس کرتے اندازہ لگایا اور ہاتھ میں پکڑے گجروں کو ایک نظر دیکھتے چہرے پہ مسکراہٹ سجائی اور سیڑھیاں چڑھاتے اپنے کمرے میں آیا۔

”تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟“ اُسے صوفے پہ بیٹھے رجسٹر میں کچھ لکھتا دیکھ زارون کو اُس کی اتنی فرمانبرداری دکھانے پہ حیرت ہوئی۔

”کیا ہوا؟ ناراض ہو؟“ نور نے اُس کی آواز پر سر اٹھاتے ایک نظر اُس پہ ڈالی اور جواب دیے بغیر پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی تو زارون نے اُس کی خفگی پہ مسکراہٹ چھپاتے قدم صوفے کی جانب بڑھائے۔

”نہیں، مجھے کیا ضرورت پڑی ہے آپ سے ناراض ہونے کی“، کندھے اچکاتے اُس نے لاپرواںی دکھاتے اُس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا اور خود کو مصروف ظاہر کرنے لیے اپنے نوٹس کھول کر دیکھنے لگی۔

”یہ لو..“ اُس کی بات پہ مسکراتے زارون نے اُس کے قریب ہی نیچے زمین پہ بیٹھتے اپنی پشت پہ موجود ہاتھ کو آگے کیا۔

”یہ کیا ہے؟“ اُس کے ہاتھ میں موجود اخبار کو دیکھتے نور نے کچھ سینڈز کے لیے اپنی ناراضگی کو پس پشت ڈالتے اپنی تمام سر گرمیاں ختم کیں۔

”پتا نہیں خود دیکھ لو“، کندھے اچکاتے زارون نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے اُسے اکسایا تو نے نظروں میں بھر پورا شتیاق لیے اخبار کھولا جس میں موتیاں کے پھولوں کے دو خوبصورت گجرے موجود تھے۔

”گجرے؟ آپ میرے لیے لائیں ہیں؟“ ایک نظر گجروں کو دیکھنے کے بعد اُس نے زارون سے تصدیق چاہی جس نے اثبات میں سر ہلانے کے ساتھ ہی اخبار سے گجرے اٹھاتے اُس کے دونوں بازوں میں پہنادیے۔

”بہت پیارے ہیں“، اُس کے پہلے تختے پر خوشی سے نہال ہوتے نور نے انہیں اپنے ناک کے قریب کرتے اُن کی خوشبو کو محسوس کیا۔

”ہاں پر تم سے زیادہ نہیں“، اُس کی تعریف پر زارون نے اُس کے چہرے کی چمک دیکھ نظر وہ میں محبت لیے اُسے دیکھا۔

”بس بس زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا یہ سب آپ مجھے منانے کے لیے کر رہے پر! میں بھی اتنی آسانی سے نہیں مانوں گی“، اپنا غصہ برقرار رکھتے اُسے کچھ دیر پہلے زارون کی ڈانٹ یاد آئی تو نخرے سے کہتے اُس نے مقابل کی ہر غلط فہمی کو دور کیا جواب اٹھ کر اوپر صوفے پر اُس کے قریب بیٹھ کر اُس کی کتاب اٹھا چکا تھا۔

”ہاں میں بھی مکھن نہیں لگا رہا بس تمہیں اگلی ڈانٹ کے لیے تیار کر رہا جواب تمہیں ٹیسٹ اچھانہ ہونے کی صورت پڑنے والی ہے“، اُس کے نخرے دکھانے پر زارون نے اُسے مزید تپایا تو نور نے غصے سے کتاب اُس کے ہاتھ سے جھپٹی۔

”بُرے ہیں آپ اور مجھے نہیں دینا کوئی ٹیسٹ ویسٹ۔ پہلے ہی پچھلے چار گھنٹوں سے پڑھ پڑھ کر میرے سر میں درد ہو رہا اوپر سے میں نے کچھ کھایا بھی نہیں“، اُس کی سوئیں واپس اُسی جگہ اٹکتی دیکھ نور نے چہرے پر معصومیت طاری کرتے بتایا۔

”کیوں کھانا کیوں نہیں کھایا؟ انہو شاباش پہلے کھانا کھاؤ“، اُس کی بات سنتے ہی زارون کے ماتھے پہ بل پڑے تو اپنے مقصد میں کامیابی پہ نور کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

”وہ مجھے بھوک نہیں ہے بس نیند آرہی ہے۔ پلیز زار کیا اب میں سو جاؤ؟“ چیخ میں مجھے بہت نیند آئی ہے، چہرے پہ مظلومیت سجاتے اُس نے اجازت چاہی تو زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑتے، اُسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ہی اپنی گود میں بیٹھایا جو اُس کے جواب کے انتظار میں کھڑی تھی۔

”ٹھیک ہے سو جانا پر اُس سے پہلے میری ایک شرط ہے“، اُس کی جھجک کو محسوس کرتے زارون نے سیدھا اپنی بات پہ آتے اُس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کیا۔

”ک... لیسی؟ کیسی شرط؟“ ہکلاتے ہوئے اُس کے ہونٹ اپنے ہاتھ پہ محسوس کرتے ہی نور کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔

”یہی کہ تم صبح مجھے تنگ کیے بناء ہی ٹائم سے اٹھ کر جو ٹاپک رہ گئے ہیں انہیں اچھے سے تیار کرو گی“، اُس کے چہرے پہ ایک کے بعد ایک آتے رنگوں کو دیکھتے زارون نے با مشکل اپنی ہنسی کو کنٹرول کیا۔

”ٹھیک ہے میں کرلوں گی“، اپنے رکے ہوئے سانس کو بحال کرتے نور نے فٹ سے جواب دیا تاکہ وہ جلد از جلد اُسے اپنی قید سے آزاد کرے۔

”ابھی بھی ناراض ہو؟“ نور کا جواب سنتے زارون نے ایک اور سوال کیا تو نور نے زبان کی بجائے نفی میں سر ہلا�ا۔

”تو پھر چپ کیوں ہو؟“ اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے زارون نے بات لمبی کرتے اُس کے بالوں کو کندھے سے ہٹایا۔

”نہیں میں بول تو رہی ہوں“، کانپتے ہوئے ہونوں سے با مشکل جواب دیتے نور نے گھبرائی ہوئی نظروں سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا جو اُس کے چہرے پہ ہوا یا اُڑی دیکھ قہقہہ لگاتے ہنسا۔

”اُفف نور توبہ ہے۔ قسم سے ویسے تو تمہاری زبان میرے سامنے بہت چلتی ہے اگر میں تھوڑا سا قریب آجائوں تو تمہارے سارے ہی طو ط اُڑ جاتے ہیں اور تو اور زبان بھی ایسے بند ہوتی جیسے تم سے زیادہ معصوم اس دنیا میں اور کوئی پیدا ہی نہ ہوا ہو“، ہنسنے ہوئے اپنی آنکھ میں آئے پانی کو صاف کرتے زارون نے اُسے اپنے حصار میں لیا جو اُس کے مذاق اُڑانے پہ ساری شرم ایک سائیڈ پر رکھتے اب کھاجانے والی نظروں سے اُسے گھور رہی تھی۔

”بُرے ہیں آپ“، زور سے اُس کے سینے پہ مکامارتے نور نے اُس کے حصار سے نکلنے کی کوشش کی۔

”ہاں بہت بُرا ہوں“، اُس کی ہر کوشش کو ناکام بناتے زارون نے اُس کی پیشائی پہ بوسہ دیا تو نور نے مزید مزاحمت کرنے کی بجائے سر اُس کے کندھے پہ رکھ لیا۔

”پیارے لگ رہے ہیں گھرے“، کچھ دیر خاموشی سے اُس کی خوشبو کو محسوس کرتے نور نے سر اٹھاتے دونوں ہاتھ اُس کے سامنے کیے۔

”ہاں بہت پیارے لگ رہے ہیں“، اُس کے دونوں ہاتھوں پہ باری باری بوسہ دیتے زارون نے تعریف کی تو نور نے واپس اُس کے کندھے پہ سر رکھا۔

”پیارے ہیں پر آپ سے زیادہ نہیں۔ آپ کو پتا ہے جب ان لوگوں نے مجھے انغوہ کیا تھا تو جیسے جیسے رات ہو رہی تھی میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ مجھے کسی کی پروا نہیں تھی پر مجھے آپ کی فکر تھی۔ مجھے لگا کہ کہیں آپ بھی بابا کی طرح مجھ پہ شک کر کے مجھے چھوڑنہ دیں اس لیے میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ آپ کے دل میں میرے طرف سے کوئی بد گمانی پیدا نہ کرے“، اُس کی ثرث کے بُٹن پہ ہاتھ پھیرتے وہ سانس لینے کے لیے رکی۔

”زار... میں سب کی بد گمانی برداشت کر سکتی ہوں بس آپ کی نہیں، پلیز آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے پر آپ مجھ سے کبھی بھی بد گمان نہیں ہوں گے۔ آپ کو اگر کبھی بھی

میرے ذات پہ شک ہو تو آپ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار دیجیے گا پر پلیز کبھی بھی بابا کی طرح مت کر دیئے گا، اُس کی آنکھوں میں دیکھتے نور نے اُس کا ہاتھ تھاما۔

”جان ہو تم میری اور میں بھلا کیوں تم سے بد گمان ہونے لگا اور ہاں آج ایسی بات کی ہے پر دوبارہ کبھی مت کرنا“، اُس کا ہاتھ پھر سے اپنے ہونٹوں سے لگاتے زارون نے اپنے ساتھ کا یقین دلایا تو نور نے اُس کے لمس کو محسوس کرتے اپنی آنکھیں سختی سے بند کیں۔

”زار مجھے نیند آرہی ہے“، اُسے اپنے چہرے پہ جھکتا دیکھ اُس نے جلدی سے آنکھیں کھولنے اُسے مزید پیش رفت سے روکا۔

”اچھا ٹھیک ہے سو جاؤ“، اُس کے گال پہ نرمی سے ہاتھ پھیرتے زارون نے اُسے اپنے حصار سے آزاد کیا تو نور نے اٹھتے بیڈ کارخ کیا اور جلدی سے یہی سونے کی کوشش کرنے لگی تو زارون ایک نظر اُس پہ ڈالتے ایک لمبی سانس لی اور اٹھ کر الماری سے اپنا ٹراوزر شرٹ نکالتے تبدیل کرنے چلا گیا۔

”حصہ؟! کس بات کا حصہ؟ آج تک ہم نے اپنے ماں باپ کو دیا ہی کیا ہے؟ جو میں اُن سے حصہ کی بات کروں“، حنا کی بات سنتے ہی جنید جو پہلے ہی اُس پہ برہم تھا ایک دم سے بھڑکتے ہوئے پوچھنے لگا۔

”میں جائیدار میں سے حصے کی بات کر رہی ہوں آپ کے ابو کی کمائی میں سے نہیں جو آپ یوں مجھے بتیں سُنارہ ہے ہیں۔ دیکھیں جنید یہ ہمارا حق ہے اور ہمیں اس وقت ان پیسوں کی ضرورت بھی، اس لیے پلیز آپ ابو سے بات کریں کہ وہ ہمارے حصے کی جائیداد ہمارے نام کر دیں“، غصے سے کام لینے کی بجائے حنا نے اپنے لبھے میں نرمی سموتے جنید کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں ایسی کوئی بھی بات کر کے خود کو مزید اپنے ماں باپ کی نظر وں میں نہیں گراوں گا اور خبردار اگر تم نے امی ابو کے سامنے ایسی کوئی بات کی“، انگلی اٹھا کر اسے تنبیہ کرتے جنید نے دروازے پہ دستک کی آواز سنتے اپنے غصے کو قابو میں کیا۔

”آجائیں“، اپنے لبھے کو ہموار کرتے اُس نے جازت دی تو ہما کمرے کے اندر داخل ہوئی۔

”جنید بھائی وہ آپ کو مزمل باہر بلارہ ہے ہیں“، حنا سے نظریں چراتے اُس نے جنید کو مزمل کا پیغام دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے اپنا موبائل لیے کمرے سے باہر نکلا۔

”کیا ہوا؟ آپ نے جنید بھائی سے پھر لڑائی کی ہے کیا؟“، حنا کے غصے بھرے تیور دیکھہ ہمانے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، میرا دماغ خراب ہے ناجو میں ہر وقت کسی ناکسی سے لڑتی پھروں اور یہ تم آج کل کن ہواں میں ہو؟ دماغ سیٹ ہے تمہارا؟“، جنید کا غصہ ہماپہ نکالتے وہ اُس کے سر پہ آن پہنچی۔

”مطلوب؟ آپی میں نے اب کیا کیا ہے؟“، اُس کی ڈانٹ پر ہکلاتے ہمانے خائف سی نظروں سے اُسے دیکھتے اپنی غلطی جاننے کی کوشش کی۔

”کیا کیا ہے؟ یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو؟ عقل کی اندر ہی میں نے تمہیں آنے سے پہلے کیا سمجھایا تھا؟ یہی ناکہ اُس نور کو زیادہ لفت کروانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی امی ابو کے سامنے زیادہ اچھا بننے کی ضرورت ہے پر تمہاری کھوپڑی میں کوئی بات آئے تب نا،“، اُس کے سر کی جانب اشارہ کرتے حنا نے جنید کی باتوں کا سارا غبار ہماپہ نکالا جو بلا مقصد ہی اُس کی لپیٹ میں آچکی تھی۔

”آپی میں نے کسی کو لفت نہیں کروائی وہ تو نور خود میرے سر پہ آکر چڑھی رہتی اور رہی بات امی ابو کی تو میں اُن کے ساتھ بد تمیزی نہیں کر سکتی،“، اُس سے نظریں چراتے ہمانے آخری بات تھوڑی آہستہ آواز میں کہی تو حنا نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھورا۔

”ٹھیک ہے جو دل کرتا ہے کرو پھر جب احمد صاحب نے تمہاری اس پر خلوص طبیعت کا فائدہ اٹھاتے مزمل کو حصہ دینے سے انکار کیا تو پھر روتے ہوئے میرے پاس مت آنا کہ آپی ابو نے سارا کچھ اپنے اُس پیارے بیٹے زارون کے نام کر دیا، اُس کی عقل پہ ماتم کرتے ہنانے اصل بات کی طرف آتے اپنی بار بار تاکید کرنے کی وجہ بتائی تو ہما کے چودہ طبق روشن ہوئے۔

”مطلوب؟ ایسے کیسے وہ ہمارا حصہ زارون کے نام کریں گے؟ میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی اور جائیداد پہ ہمارا بھی اُتنا ہی حق ہے، جتنا باقی سب کا اس لیے آپ بے فکر رہیں میں آج ہی مزمل سے اس بارے میں بات کرتی ہوں، اُس کی بات سمجھ آتے ہی ہمانے اُسے تسلی دی اور ایمان کے رونے کی آواز سنتے کچھ دیر میں بات کرنے کا کہتے کمرے سے نکلتے لاونچ کی جانب بڑھی۔

”ہم اب آئے گامزہ، بڑے آئے زارون کے نام آدھی جائیداد کرنے والے، ہما کے جاتے ہی حنا (جو احمد صاحب کی وکیل سے کی جانے والی تمام باتیں سُن چکی تھی) نے مسکراتے ہوئے خود کلامی کی اور سمجھان کے اٹھنے پہ اُس کی جانب متوجہ ہوئی۔

-----

”نور، یا کسی تیاری ہے تمہاری؟ کچھ پڑھا ہے یا میری طرح ویسے ہی اٹھ کر پپر دینے آگئے ہو؟“ رابعہ نے اُسے دیکھتے ہی حال احوال کرنے کے بعد پوچھا۔ ”ہاں بس ٹھیک ہی ہے۔ پڑھے میں نے سارے ہی ٹاپک لیے تھے پر یاد کچھ نہیں کیا“، اُس کے سوال پر بڑے فکر کے ساتھ نور نے اُسے اپنے کارنامے سے آگاہ کیا تو رابعہ نے اُس کی بات سننے اپنا سر کپڑا۔

”اُفف نور، اگر یاد نہیں کیے تو سارے ٹاپک پڑھنے کا کیا فائدہ؟ اور میں نے تو اس آس پر کچھ نہیں پڑھا کہ تم نے تیاری کی ہوئی تو میں تمہارے پپر سے دیکھ کے لکھ لوں گی“، نور کی طرف سے نامیدی پر رابعہ کو صحیح معنوں میں فکر لاحق ہوئی۔

”اچھا تم پریشان نہ ہو، ہم آج شعیب بھائی سے مدد لے لیں گے ویسے بھی وہ میرے آگے ہی بیٹھے ہوتے“، اُس سے پریشان ہوتا دیکھ نور نے فوراً سے مسئلہ کا حل پیش کیا تو رابعہ کو تھوڑی ڈھارس ہوئی اور وہ سر کے آنے سے پہلے پہلے نور کو ساتھ لیے کلاس روم کی جانب بڑھی تاکہ اپنے کلاس فیلو کو آج کے پپر میں مدد کا کہہ سکیں۔

”پلیز شعیب بھائی ایسا تو نہ کہیں، دیکھیں میں نے پچھلے پپر ز میں آپ کی کتنی مدد کی تھی“، اُس کے انکار پر جہاں رابعہ نے ہار مانی وہیں نور نے اُسے جذباتی طریقے سے منانے کی کوشش کی۔

”مدد؟ کون سی مدد؟ وہ جو ایک سوال بتا کر تم نے پوری کلاس کو بتایا کہ تم نے سارا پیپر مجھے کروایا، میرے خیال سے تم اُسی مدد کی بات کر رہی ہو؟“ اُس کے مدد لفظ پہ بھڑکتے شعیب نے اُسے یاد دہانی کروائی تو نور نے گڑ بڑاتے ہوئے رابعہ کی جانب دیکھا جو پیچھے جا کر اپنی نشت سن بھال چکی تھی۔

”اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میں نے صرف صدف کو بتایا تھا وہ بھی اُس کے پوچھنے پر ورنہ کسی کی مدد کر کے جتنا میری فطرت میں شامل نہیں اور آپ کو ہماری مدد نہیں کرنی تو نہ کریں پر یوں الزام ترشی کر کے ہمیں اپنی ہی نظروں میں مت گرائیں“، اُس نے بات بنتی نہ دیکھ آنکھوں میں نمی لیے شعیب کو اُس کی غلطی کا احساس دلایا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں بتا دوں گا پر پلیز ایسے روئیت اور میں نے تم پہ کوئی الزام نہیں لگایا۔ وہ تو بس مجھے بُرا لگا کہ تم نے ساری کلاس کے سامنے یہ بتا کر میری انسٹ کروائی کہ میں نے تم سے سارا پیپر پوچھا“، اُس کی سوسوپہ شعیب نے اُس کی بات کا یقین کرتے مدد کرنے کی حامی بھری تو نور نے دوپٹے سے آنسو صاف کرتے خوشی سے پیچھے پلٹ کر رابعہ کو دیکھا جو اُس کی اس طرح کی ساری چالاکیوں کو بہت اچھے سے سمجھتی تھی۔

بینک سے احمد صاحب کے بتائے گئے تمام کاغذات لکھوںے کے بعد زارون واپس یونیورسٹی آیا تاکہ نور کو بھی اپنے ساتھ لے کر گھر جاسکے پر وہاں پہنچتے ہی ایک نئی مصیبت اُس کے لیے تیار تھی۔

”نور کیا ہوا؟ تم یہاں کیوں کھڑی ہو؟ اور یہ تم روکیوں رہی ہو؟“ اُسے کلاس کے باہر کھڑے رو تا دیکھ زارون نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”کیا ہوا ہے؟ پیپر ختم ہونے میں تو بھی آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟“ اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے زارون نے اُس کے سرخ ہوتے چہرے کو بے چینی سے دیکھا۔

”نور میں کچھ پوچھ رہا ہوں، کیا ہوا ہے؟ کسی نے کچھ بولا ہے تو مجھے بتاؤ“، اُس کی خاموشی پر الجھتے اب کی بار زارون نے اُس کے رونے پر تھوڑا غصہ دکھایا تاکہ وہ چپ کر کے اُسے اصل بات بتا سکے۔

”ز....ار....وہ...“ اپنا کار نامہ اپنی ہی زبان سے بتاتے وہ تھوڑا ہمکلائی۔

”کیا وہ کیا ہوا ہے؟“ اُس کے بات ادھوری چھوڑنے پر زارون نے اُس کے الفاظ دھراتے اُسے بولنے کے لیے اکسایا۔

”وہ... سرنے... میرا پیپر کینسل... کر دیا اور... مجھے ڈانٹا... بھی“، اُس سے نظریں ملائے بغیر نور نے شرمندگی سے سر جھکاتے اپنے رونے کی وجہ بتائی۔

”سچ میں زار میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو نقل بھی نہیں کر رہی تھی پھر بھی سرنے مجھے کہا کہ میں نے شعیب بھائی سے چینگ کی ہے“، اپنے کلاس فیلو کا نام لیتے نور نے اُس کے ماٹھے پہ بل پڑتے دیکھ جلدی سے اپنے کارنامے کی وضاحت دی تو زارون کی جان میں جان آئی جو اُسے یوں رو تاد کیچھ پتا نہیں کون کون سے خدشے دل میں پال چکا تھا۔

”اچھا، چپ کرو۔ کچھ نہیں ہوتا ایک پیپر ہی ہے ناپھر سے دے لینا“، پاس سے گزرتے لوگوں کی وجہ سے اُسے خاموش کروا تے زارون نے ڈالنٹے کی بجائے نرمی سے سمجھایا۔

”نہیں، میں کیوں دوبارہ دوں پیپر، پہلے ہی میں نے اتنی مشکل سے تیاری کی تھی اور زار میں آپ کو بتا رہی ہوں شعیب بھائی نے جان بوجھ کر مجھے پھنسایا ہے۔ میں نے انہیں کہا بھی تھا کہ جب سر انہیں مجھے بتا دیجیے گا پرانہوں نے مجھ سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے نور نے جذبات میں آکر سچ بولا تو زارون نے اُس کے رونے دھونے کی پرواکیے بناءما تھے پہ بل ڈالے اُسے گھورا۔

”اس کا مطلب کے تم سچ میں نقل کر رہی تھیں؟“، اپنے دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے زارون نے اُس کی بات پکڑتے ایک گہری سانس لی تو نور نے پہلے حیرت سے اُسے دیکھا اور پھر شرمندہ ہونے کی بجائے اپنی زبان سے نکلے الفاظ کی صفائی دینے لگی۔

”تو میں انسان ہوں میشن نہیں، جو اتنے بڑے بڑے سوال یاد رکھوں۔ باقی رہی بات نقل کی تو شعیب بھائی بھی مجھ سے پوچھتے ہیں پر میں نے کبھی ان کے ساتھ ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے جان بوجھ کر مجھے تب سوال دکھایا جب سر میری جانب متوجہ تھے۔ میں نے اتنی بار کہا کہ مجھے پسپر کی بیک سائیڈ پہ جواب لکھ کے دے دیں، مگر نہیں میری مدد کی دفعہ موت پڑ رہی تھی انہیں“، اپنی ہی دھن میں بولتے وہ زارون کے چہرے کے بدلتے زاویوں کو فراموش کیے شعیب کو کو سنے لگی جس کی بیو قوفی کی وجہ سے اُس کا آج کا پسپر کینسل ہوا تھا۔

”ہاں جان بہت اچھا کار نامہ کر رہی تھیں ناتم جو وہ تمہاری مدد کرتا۔ بس اب چپ کرو اور چلو گھر“، اُسے مزید کچھ بولنے کے لیے منه کھولتا دیکھ زارون نے آنکھیں نکالیں اور اُس کے منہ بسور نے کی پرواکیے بناء (گھر جا کر اُس کی کلاس لینے کا ارادہ کرتے) اُسے اپنے ساتھ لیے ڈیپارٹمنٹ سے نکلتے گاڑی کی جانب بڑھا۔۔۔

”مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ۔ مجھے پتا ہے اب آپ مجھے گھر جا کر ڈا نٹیں گے“، گاڑی کے پاس پہنچتے ہی نور نے زارون کے غصے سے بھر پور تیور دیکھ اُس کے ساتھ جانے سے انکار کیا۔

”نور، تنگ مت کرو اور چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ جاؤ“، اُس کی ہٹ دھرمی پہ زارون نے دراوزہ کھولتے اُس کی کوئی بھی بات سے بغیر اُسے اندر بٹھایا اور خود دوسری طرف سے آتے ڈرائیونگ سیٹ سنپھائی۔

”میں نے کہانا کہ مجھے نہیں جانا آپ کے ساتھ۔ پلیز مجھے میری ماما کے گھر چھوڑ دیں“، زارون نے گاڑی اسٹارٹ کرتے یونیورسٹی کے گیٹ سے نکالتے سڑک پہ ڈالی تو نور نے سب گھروالوں کے سامنے اُس کی ڈانٹ کا سوچ کر ایک بار پھر سے آواز بلند کی۔

”میں نے بھی کہانا کہ چپ کر کہ بیٹھ جاؤ تو بس بیٹھ جاؤ ورنہ اب مار کھاؤ گی مجھ سے“، اُس کے جذباتی ڈرامے سے متاثر ہو کر اُسے نہ ڈانٹنے کا کہنے کی بجائے زارون نے اپنی نظروں کے ساتھ ساتھ اس بارا پنے لجھے میں بھی سختی سموئی تو نور نے بالتوں سے معاملہ بگڑتا دیکھے خاموشی اختیار کی اور ایک بار پھر سے رونے کا شغل شروع کیا۔

”جننا مرضی رو لو پر آج تمہیں کسی حال میں معافی نہیں ملے گی“، زیر لب بڑ بڑاتے زارون نے ایک نظر اُس پہ ڈالی جواب زورو شور سے روتے اُسے جذباتی کرنے کی کوشش میں لگی تھی تاکہ وہ اُس کی غلطی کو در گزر کرتے کسی کے سامنے اس بات کا ذکر نہ کرے کہ اُس کا پیپر نقل کرنے کی وجہ سے کینسل ہوا ہے۔

”شعیب تم نے نور کے ساتھ اچھا نہیں کیا، مطلب اگر سر نے اُسے نقل کرتے دیکھ ہی لیا تھا تو تم کوئی بہانہ کر دیتے پر یوں اُس کا پیپر کینسل نہ کرواتے“، پیپر دینے کے بعد رابعہ نے نور کی غیر موجودگی پر شعیب کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ”میں میں کیوں بہانہ بناتا؟ اور رابعہ قصور میرا نہیں بلکہ نور کا اپنا تھا۔ میں نے اُسے اتنی بار منع کیا کہ سر تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں ابھی رک جاؤ میں کچھ دیر بعد لکھوادوں گاپر اُس نے میری کوئی بات نہیں سنی اور اپنی مرضی سے میرے پیپر کی طرف دیکھتی رہی“، رابعہ کے الزام پر شعیب نے بھی غصہ دکھاتے اُسے کھڑی کھڑی سنائی۔

”بس بس زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں اور میں اچھے سے جانتی ہوں جو تم نے نور کو منع کیا، وہ تو ہے، ہی معصوم اور اگر اُس نے کلاس میں کسی سے بول بھی دیا کہ اُس نے تمہاری پیپر میں مدد کی تو اس میں بدلہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا مطلب یہ اتنی بڑی بات نہیں تھی کہ تم اُس سے اس طرح اپنی بے عزتی کا بدلہ لیتے“، شعیب کے غصے دکھانے پر رابعہ نے اس بار تھوڑا تحمل سے اُسے سمجھایا۔

”یار میں نے کوئی بدلہ نہیں لیا اس سے اور اگر میں نے بدلہ ہی لینا ہوتا تو خود سوچو کہ میں اُس کی مدد ہی کیوں کرتا؟ سچ میں، میں نے جان بوجھ کر اُس کا پیپر کینسل نہیں کروایا اور جتنا دکھ تھیں ہو رہا اُس سے کہیں زیادہ میں خود پچھتا رہوں کہ میری وجہ سے کسی کا نقصان ہوا“، رابعہ کی بات مکمل ہوتے ہی شعیب نے شرمندگی کا اظہار کیا اور اپنے دوست کے آواز دینے پر رابعہ کو پھر بات کرنے کا کہتے اُس کی جانب بڑھا۔

”افف یہ نور بھی ناکبھی کوئی سیدھا کام نہیں کرتی اور یہ اتنی جلدی غائب پتا نہیں کہاں ہو گئی ہے“، شعیب کے جاتے ہی رابعہ نے خود کلامی کی اور ڈیپارٹمنٹ میں ایک نظر دوڑاتے بیگ سے اپنا موبائل نکالاتا کہ نور کو کال کر کہ اُس کے بارے میں پوچھ سکے۔

-----

سارے راستے اُس کے رو نے کی پرواکیے بغیر ہی زارون نے خاموشی سے ڈرائیونگ کرتے، اگلے دس منٹ میں گھر کے سامنے گاڑی روکتے ہارن دیا تو نور نے سوسو کرتے رحم طلب نظر وہ سے اُس کی جانب دیکھا جوتہ سے اب تک اُسے بالکل فراموش کیے بیٹھا تھا۔

”زار، پلیز آپ ماما بابا کو مت بتائیے گا کہ میرا پپر کینسل ہو گیا“، گیٹ کھلتے ہی اُس نے گاڑی اندر پورچ میں کھڑی کی تو نور نے اُس کا ہاتھ پکڑتے اُسے روکا۔

”میں بتاؤں گا اور سب کے سامنے بتاؤں گا اور جب امی ابو تم سے پپر کینسل ہونے کی وجہ پوچھیں گے ناقہ پھر بتادینا کہ میں نے کل زارون کے کہنے پہ منہ بنایا تھا اور تیاری نہیں کی تھی جس کی وجہ سے مجھے اپنے کلاس فیلو سے مدد لینا پڑی اور بس اُسی سے نقل کرتے ہوئے سر نے مجھے پکڑ لیا اور ساتھ ہی میرا پپر بھی کینسل کر دیا، اُس کی سو جھی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھتے ترس کھانے کی بجائے زارون نے اُس کی غلطی کا احساس دلایا تو نور کے آنسو بے اختیار ہو کر پھر سے اُس کے گالوں پہ بہہ نکلے۔

”ٹھیک ہے بتاؤں گی پر آپ اب مجھ سے بات مت کریے گا“، اُس کے طنز پر منتیں کرنے کی بجائے نور نے غصہ دکھایا اور اُس سے پہلے ہی گاڑی کا دروازے کھولتے ادھر ادھر دیکھے بناء ہی گھر کے اندر داخل ہوئی جہاں اُس کا سب سے پہلا سامنا عابدہ بیگم سے ہوا جو اُس کے سستے ہوئے چہرے کو دیکھ ایک دم سے پریشان ہو گئی تھیں۔

”نور کیا ہوا ہے؟ اور یہ تم روکیوں رہی ہو؟“ ایمان کو وہیں صوفے پہ بیٹھاتے وہ اٹھ کر اُس کے قریب آئیں جو ان کے مخاطب کرنے پہ بھی انجان بنتے زارون کے اندر آنے سے پہلے پہلے وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

”نہیں ماما ہوا کچھ نہیں، وہ تو بس مجھے زکام ہوا ہے اس لیے آپ کو ایسا لگ رہا،“ اُن سے نظریں ملانے بغیر نور نے بہانہ بنایا تو عابدہ بیگم اُسے جا چختی ہوئی نظروں سے دیکھتے پچھے سے آتی زارون کی آواز پر اُس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

”امی آپ اس سے کیا پوچھ رہی ہیں؟ مجھ سے پوچھیں ناکہ آج آپ کی بہونے کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے؟“ اُن دونوں کے قریب آتے زارون نے ایک اچکتی نظر نور پہ ڈالی جو اُس کے آتے ہی وہاں سے فرار ہونے کا کوئی راستہ سوچ رہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟ یقیناً تم نے ہی کچھ کہا ہو گا جو پچی بیچاری کی رو رو کے یہ حالت ہو رہی،“ اُس کی بات پر جہاں نور نے پچکی لیتے پھر سے رونا شروع کیا وہیں عابدہ بیگم نے جلدی سے اُسے اپنے ساتھ لگاتے زارون کو ڈالنا جس کی بات اُن کی حمایت پر درمیان میں ہی رہ گئی۔

”ہاں بس اب جذبائی ڈرامے شروع کر دوتاکہ میں امی کو تمہارے کارنامے کے متعلق بتانہ سکوں،“ اُس کے ہچکیاں لینے پہ زارون نے اُس کی ساری سیاست سمجھتے ہوئے طنز کیا تو عابدہ بیگم نے اُسے آنکھیں نکالیں۔

”بس بہت ہو گیا، چپ کر کے کمرے میں جاؤ اور خبردار اگر اب تم نے بھی کو کچھ کہا،“ نور کو چپ کرواتے عابدہ بیگم نے زارون کی اچھے سے کھنچائی کی جو قصور نہ ہونے پر بھی اُن کی نظروں میں برا بن گیا تھا۔

”امی پلیز میری بات تو سنئیں،“ انہیں نور کو ساتھ لیے صوفے پہ بیٹھا تا دیکھ زارون نے مداخلت کی پر عابدہ بیگم نے اُس کی کسی بھی بات پہ توجہ دینے کی بجائے نسرین کو آواز لگاتے پانی لانے کا کہا۔

”ہونہہ ہے ہی چڑیل، ڈرامے باز کہیں کی،“ نور کی مکاری پہ منہ میں بڑا بڑتے وہ کسی اور وقت اس بات کا بدله لینے کا سوچتے سڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں آگیا تاکہ ہاتھ میں موجود کاغذات کو احمد صاحب کے واپس آنے تک کہیں سنبھال کر رکھ سکے۔

-----

”حبہ پیدا کیا کر رہی ہو؟“ آفندی صاحب نے دستک دے کر اس کے کمرے میں داخل ہوتے اُسے مخاطب کیا جو بچوں کو سلانے کے بعد اب چپ چاپ سی بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔

”ابو آپ یہاں، آئیں بیٹھے اُن کی بات کا جواب دینے کی بجائے حبہ نے سر اٹھاتے خالی نظرؤں سے اُنہیں دیکھا جو چند ہی دنوں میں بیٹی کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر فکر مند ہوئے۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ اُس کی آنکھوں کے نیچے پڑے حلقوں کو با غور دیکھتے آفندی صاحب نے پوچھا تو حبہ نے بتانے کے ساتھ ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔

”جی ٹھیک ہوں میں اور آپ کو کوئی کام تھا تو مجھے بلا لیتے“، اُن سے نظریں ملائے بغیر حبہ نے بات بناتے اُن کی وہاں آمد کی وجہ دریافت کی۔

”کام کوئی نہیں تھا میں تو بس گھر میں خاموشی محسوس کرتے بچوں کو دیکھنے آگیا تھا۔ یہ یوں ایسے بے وقت کیوں سو گئے؟ طبیعت ٹھیک ہے نا ان کی؟“ اپنے آنے کی وجہ بتانے کے ساتھ ہی آفندی صاحب نے اپنے دونوں نواسوں کو دیکھا جو آج دوپھر کے وقت بھی سوچ کے تھے۔

”جی ٹھیک ہیں، بس صبح سے کھیل کو دیں مصروف تھے۔ اب میں نے نہ لایا تو دونوں ہی سو گئے“، ایک نظر اُن دونوں فرشتوں پہ ڈالتے حبہ نے سارہ بیکم کی غیر موجودگی پہ آفندی صاحب سے کھانے کے متعلق پوچھا۔

”نہیں، مجھے ابھی بھوک نہیں ہے اور یہ تمہاری امی کہیں گئی ہیں کیا؟“ سارہ بیگم کی غیر موجودگی محسوس کرتے آندی صاحب نے پھر سے سوال کیا تو حبہ نے انہیں سارہ بیگم کے مارکیٹ جانے کے بارے میں بتایا اور چائے بنانے کا کہتے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

”احتشام میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ تم نے میری بیٹی کو تکلیف دی ہے نااب دیکھنا میں پوری زندگی تمہیں تمہارے بچوں کی شکل کیا ان کے سائے تک سے محروم رکھوں گا“، حبہ کے جاتے ہی آندی صاحب نے خود کلامی کی اور احتشام کی جانب سے بچوں کی کسٹڈی کے لیے کیے گئے کیس کے متعلق سوچنے لگے جس کے بارے میں انہیں خود بھی آج ہی کورٹ کی طرف سے بھیج گئے کاغذات سے پتا چلا تھا اور وہ یہی بتانے کے لیے حبہ کے کمرے میں آئے تھے پر اس کی حالت دیکھ ان کی ہمت نہیں ہوئی تب ہی انہوں نے خود ہی اس معااملے کو دیکھنے کا سوچتے احتشام کو کو سا جو حبہ کے ساتھ اتنا کچھ کرنے کے بعد بھی سکون سے نہیں بیٹھا تھا۔

”واہ جی واہ آج تو بڑے بڑے لوگ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ یہ سورج آج مشرق سے ہی نکالا ہے نا؟“ آنکھ بیگم کے ساتھ ہی رابعہ کو اپنے کمرے میں آتا دیکھ ارحمنے نے طنز کیا۔

”ارحم شرم کرو گھر آئے مہمان سے ایسے بات نہیں کرتے“، رابعہ کامنہ بنتا دیکھ آئمہ بیگم نے اُسے ٹوکا اور اُسے بیٹھنے کا کہتے جو س لینے چلی گئیں۔

”اب بھی کیا ضرورت تھی آنے کی، میرے فوت ہونے پر اکٹھا ہی آجانا تھا“، اُن کے جاتے ہی ارحم نے ایک بار پھر سے طزر کیا تو رابعہ نے اُس کے زخموں کی پرواکیے بناء صوف پر پڑا کشن اٹھاتے اُسے رسید کیا جو کل سے اُس کے گھر پوچھنے نہ آنے کی وجہ سے منہ پھلانے بیٹھا اُس کی کسی کال یا میسج کا جواب نہیں دے رہا تھا۔

”بس کرو یار لگ جائے گی مجھے“، اُس کے اس اچانک حملے پر اپنا بچاؤ کے لیے ہاتھ چلاتے ارحم نے اُسے روکنے کی کوشش کی جو اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر اُس کشنسے مارنے میں مصروف تھی۔

”اپنے لگنے کا بڑا خیال ہے اور جو کل سے میں پریشان ہوں اُس کا کیا؟ حد ہے مجھے نہیں اچھا لگتا یوں شادی سے پہلے اپنے سرال میں آنا پر تمہیں میری بات سمجھ آئے تب نا“، اُس کے چلانے پہ اپنا ہاتھ روکتے رابعہ نے غصے سے کشن صوف پہ پھینکا اور منہ بسورے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔

”بس بس سب جانتا میں، جو تمہیں اچھا نہیں لگتا اور رسید ہے سے کہونا کہ تمہارا اپکا پکا یہاں آنے کا ارادہ ہے۔ تب ہی تم ایسی باتیں کر کے مجھے جتار ہی ہو، تاکہ میں جلد از جلد امی ابو کو تمہارے گھر

شادی کی ڈیٹ نکس کرنے بھیج دوں،“ اُس کی بات کا اپنے ہی معنوں میں رنگتے ارحم نے چہرے پہ سنجیدگی سجائی تو اُس کے اتنے بڑے الزام پر رابعہ نے آنکھیں سکیرتے اُسے گھورا۔

”ارحم تم ہو ہی بد تیز بلکہ نہیں تم بد تیز سے بھی کوئی اوپر کی چیز ہوا س لیے بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری طبیعت،“ خفگی سے سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ صوفے پر پڑے تمام کشن اُس کی جانب اچھالتے رابعہ نے اپنا غصہ نکالا۔

”بس کرو یار میں نے تو تمہارے ہی بھلے کی بات کی تھی پر تم تو ایسے مجھ معموم کو مار رہی جیسے پتا نہیں میں نے کون سا شوشہ چھوڑ دیا ہو،“ اپنی غلطی ماننے کی بجائے ارحم نے اُسے تنگ کرنے کے لیے اپنی ہٹ دھرمی برقرار رکھی تو رابعہ نے ایک کھا جانے والی نظر اُس پر ڈالتے اپنابیگ اٹھایا اور اُس وقت کو کوستے کمرے سے باہر نکلی جب اُس نے اُس بد تیز انسان کی فکر میں آکر یونیورسٹی سے سیدھا اُس کے گھر اُسے دیکھنے آنے کا ادارا کیا۔

”یار بات تو سنو؟ اب آگئی ہو تو میرا حال ہی پوچھ لو،“ اُسے دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ ارحم نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے ایک بار پھر سے اُسے چھڑایا جو دانت پسیتے ہوئے جاتے جاتے بھی زمین پہ پڑا کشن اٹھاتے اُسے رسید کر گئی جو اُس کے کمرے سے جاتے ہی اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے ایک بھر پور قہقہہ لگاتے ہنسا تھا۔

زارون کی ڈانٹ کے ڈر سے نورتب سے نیچے ہی عابدہ بیگم کے پاس موجود تھی جو کافی بار اسے اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کرنے کا کہہ چکی تھیں۔

”نور پیٹا جاؤ ذرا زارون کو بلا کر لاؤ“، احمد صاحب جو کچھ دیر پہلے ہی آفس سے واپس آئے تھے انہوں نے اُسے ٹوی میں مگن دیکھ کے آواز دی۔

”جی بابلاتی ہوں“، لاونچ میں عابدہ بیگم کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اُس نے ناچا ہتھی ہوئے بھی حامی بھری اور ہمت کر کے سیڑھیاں چڑھتے اوپر اپنے کمرے میں آئی جہاں زارون خاموشی سے آنکھوں پہ بازو رکھے صوفے پہ لیٹا تھا۔

”زار آپ کو بابلار ہے ہیں“، تھوک نگتے اُس نے اُسے مخاطب کیا جو اُس کی آواز سنتے ہی بازو اپنی آنکھوں سے ہٹا چکا تھا۔

”آپ کو بابلار ہے ہیں نیچے“، اُس کے گھورنے کی پرواکیے بناء ہی نور نے نظریں چراتے ایک بار پھر سے احمد صاحب کا پیغام اُس تک پہنچا جو ویسے ہی لیٹے پھر سے اپنا بازو آنکھوں پہ جما چکا تھا۔

”زار میں آپ سے کچھ کہہ رہی ہوں“، اُس کے خاموشی سے لیٹے رہنے پر اب کی بار نور نے اپنے الفاظ پہ زور دیا۔

”سن لیا ہے میں نے۔ بہرہ نہیں ہوں“، بازو ہٹائے بغیر ہی جواب دیتے زارون نے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

”سن لیا ہے تو اٹھ کر بابا کی بات سن لیں اور یہ خفا ہونے کی ضرورت مجھے تھی آپ کو نہیں“، اپنی کمر پہ ہاتھ رکھتے نور نے اُس کے خرے دکھانے پہ بھنویں اچکاتے اُس کا بازو اُس کی آنکھوں سے ہٹاتے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”تو ہو جاؤ خفا، میں نے منع کیا ہے کیا؟ اور ویسے بھی انسان جس چیز میں پرفیکٹ ہو، ہی کام کرتا ہے اور تم تو منہ بنانے کے ساتھ ساتھ ڈرامے کرنے میں بھی ماہر ہو“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے زارون نے عابدہ بیگم سے ہونے والی اپنی بے عزتی پر اُسے غصے سے گھورا۔

”ہاں تو میں نے آپ کو منع کیا تھا کہ آپ ماما بابا کو میرے پیپر کا نہ بتائیں پر آپ نے میری بات نہیں مانی اور جو آپ کو ٹھیک لگا آپ نے وہ کیا، اسی طرح اُس وقت جو مجھے صحیح لگا میں نے بھی کر لیا۔ وہ پھر منہ بنانا ہو یا ڈرامہ کرنا“، اُس کی بات کو خاطر میں لائے بغیر نور نے لاپرواں سے کندھے

اچکائے تو زارون نے نیچے سے آنے والی عابدہ بیگم کی آواز پر بس اُسے گھورنے پہ ہی اکتفا کیا اور جی آیا کہتے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھا۔

”اُفف شکر ہے نجگئی“، زارون کے جاتے ہی نور نے اللہ کا شکر ادا کیا اور اُس کے آنے سے پہلے کتابیں لے کر پڑھنے بیٹھ گئی تاکہ اُس کا غصہ مزید شدت اختیار نہ کرے۔

-----

”جی ابوآپ نے بلا یا تھا؟“ نیچے آتے ہی عابدہ بیگم نے بھی اُسے احمد صاحب کا پیغام دیا تو زارون نے اپنا رخ لاونج کی جانب کیا جہاں احمد صاحب کے ساتھ ساتھ مزمول اور جنید بھی موجود تھے۔

”ہاں وہ میں نے صحیح تمہیں کچھ کاغذات لانے کا کہا تھا“، اُس کے آتے ہی احمد صاحب نے اپنا مقصد بیان کیا تو زارون نے دو سینڈ میں آنے کا بولتے لاونج سے نکلتے واپس اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”کاغذات؟ کیسے کاغذات؟“ زارون کے جاتے ہی جنید نے سوالیہ نظر وہ سے احمد صاحب کی جانب دیکھتے استفسار کیا۔

”جائیداد کے کاغذات، میں چاہتا ہوں کہ جب اب تم سب لوگ اکھٹے ہو تو میں تم سب کی امانتیں تم لوگوں کے حوالے کر دوں“، زارون نے کاغذات لا کر احمد صاحب کو پکڑاے تو انہوں نے ٹیبل سے اپنی عینک اٹھاتے جنید کی بات کا جواب دیا۔

”ابو ہمیں کچھ نہیں چاہیے، ہمیں بس آپ کی ضرورت ہے“، جنید کے ساتھ ساتھ مزمل نے بھی اُن کا فیصلہ سنتے کسی بھی چیز میں سے حصہ لینے سے صاف انکار کیا۔

”میں جانتا ہوں پر یہ بھی تم لوگوں کا حق ہے اور میرا فرض بھی کہ میں اپنی جمع پوچھی کو اپنے بچوں کے درمیان اپنی زندگی میں ہی برابر حصوں میں تقسیم کر دوں تاکہ کل کو میری اولاد میں سے کوئی اٹھ کر دوسرے کی حق تلفی نہ کرے“، اُن دونوں کے خلوص پر بڑی نرمی کے ساتھ سمجھاتے احمد صاحب نے زارون کو بھی بیٹھنے کا کہا جو اُن تینوں کی بالتوں سے بالکل بے خبر اپنے چکراتے ہوئے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں لگا تھا۔

”زارون کیا ہوا؟ بیٹھو یہاں آکر“، اُس کی زرد پڑی رنگت کو دیکھتے احمد صاحب نے پھر سے اُسے آواز دی جو نظر وہ کے سامنے آئے اندھیرے کی وجہ سے بالکل بدحواس ہوتے جنید اور مزمل کے اٹھتے اٹھتے ہی زمین پہ گرچکا تھا۔

-----

نیچے سے آتے مسلسل شور کی آواز پر نور نے اپنی کتابیں بند کیں اور کمرے سے باہر نکلی تو نسرین چہرے پر پریشانی کے آثار سجائے اُس کی طرف ہی آرہی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟ یہ گھر میں اتنا شور کیوں ہو رہا؟“ اُس کے قریب آتے ہی نور نے ایک نظر نیچے دیکھتے اُس سے سوال کیا جواب اپنی تیز چلتی سانس کو بحال کرنے کے لیے لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ ”کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟“ اُس کے چہرے سے کسی غیر معمولی بات کا اندازہ لگاتے نور نے انتظار کرنے کی بجائے پھر سے اپنا سوال دھرا یا۔

”نہیں بی بی جی خیریت نہیں ہے۔ وہ... چھوٹے صاحب، مطلب زارون صاحب ایک دم سے بے ہوش ہو گئے تھے اور ان کے ناک اور منہ سے خون بھی نکل رہا تھا۔ بڑے صاحب، جنید اور مزمل صاحب کے ساتھ اُنہیں ہسپتال لے گئے ہیں،“ نسرین نے ایک ہی سانس میں اُسے پوری تفصیل بتائی تو نور نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔

”دماغ خراب ہے آپ کا، زارتوا بھی پانچ منٹ پہلے کمرے سے فائل لے کر گئے ہیں۔ آپ جھوٹ بول رہی ہیں نا؟“ اُسے دونوں بازوں سے تھامتے نور نے تصدیق چاہی۔

نہیں، بی بی جی اللہ معاف کرے میں کیوں اس طرح کا جھوٹ بولوں گی؟ آپ پلیز خود کو سنبھالیں اور نیچے آجائیں بڑی بیگم صاحبہ بہت پریشان ہیں،“، حنا اور ہما کی غیر موجودگی کی وجہ سے نسرین نے وہ سب نور کو بتایا جیسے سُن کر اُس کے اپنے حواس کام کرنے چھوڑ گئے۔

”بی بی جی، اپنے آپ کو سنبھالیں،“، دو قدم پیچھے ہٹتے وہ ایک دم سے آنے والی آفت پہ بالکل بوکھلا سی گئی تھی۔

”زار کہاں ہیں؟ زار... مجھے اُن کے پاس جانا ہے ابھی اور اسی وقت“، آنسو بے اختیار ہو کر اُس کی آنکھوں سے نکلے تو اُس نے نسرین کے ہاتھ ہٹاتے تیزی سے سیڑھیوں کا رخ کیا۔

”بی بی جی رک جائیں“، اُس کے پیچھے آتے نسرین نے اُسے روکنے کی کوشش کی جو جلدی میں سڑھیاں اُترتے دوبار گرتے گرتے بچی تھی۔

”نور کہاں جا رہی ہو؟“، نسرین کی آواز سنتے عابدہ بیگم نے لاڈنچ سے نکتے اُسے روکا جو پا گلوں کی طرح بد حواس سی بیرونی دروازے کی جانب بڑھ رہی تھی۔

”ماما مجھے زار کے پاس جانا ہے۔ مجھے انہیں دیکھنا ہے۔ پلیز مجھے جانے دیں“، اُن کے ہاتھوں سے نکلتے نور نے التجاء کی۔

”نور، پیز خود کو سنبھالو، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں“، اُسے اپنے ساتھ لگاتے عابدہ بیگم نے دل بڑا کرتے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیا ہوا ہے زار کو؟ مامانسرین آنٹی کہہ رہیں ہیں کہ وہ بے ہوش ہو گئے تھے ان کے منہ سے خون آرہا تھا۔ کیا ہوا ہے انہیں؟ وہ تو ابھی کچھ دیر پہلے کمرے سے فائل لے کر گئے تھے تب تو بالکل ٹھیک تھے“، ان سے الگ ہوتے نور نے ان کا ہاتھ تھامے یک بعد دیگر کئی سوال پوچھے۔

”پتا نہیں پیدا، بس تم دعا کرو کہ وہ ٹھیک ہو“، ایمان کے رونے کی آواز سننے (جسے ہما عابدہ بیگم کے پاس چھوڑ کر حنا کے ساتھ شاپنگ پہ گئی تھی) عابدہ بیگم نے نور کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دی اور نسرین کو پانی لانے کا کہتے اُسے اپنے ساتھ لیے لاونچ میں آئیں۔

ہسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹر زنے زارون کی حالت دیکھ اُسے کچھ ضروری ٹریمنٹ دیتے خون روکنے کے ساتھ ساتھ ہوش میں لانے کی کوشش کی جو تقریباً ادا ہے گھنٹے بعد کامیاب ثابت ہوئی۔

”کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ اب؟“، زارون نے کمزوری کی باعث با مشکل اپنی آنکھیں کھولیں تو ڈاکٹر نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”مجھے یہاں کون لایا اور کیوں؟“، ایک انجان چہرے کے ساتھ ساتھ ایک نظر کمرے پہ ڈالتے زارون کے چہرے پہ کشمکش آئی۔

”کون لایا؟ یہ میں نہیں جانتا پر کیوں لائے اس کا جواب میں دے سکتا ہوں“، اُس کے سوال پہ مسکراتے ڈاکٹر نے اپنی بات ادھوری چھوڑی تو زارون نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”کیوں لائے ہیں؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا کہ میں بے ہوش ہوا تھا“، اپنی کشمکش کو برقرار رکھتے زارون نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”جی بالکل آپ بے ہوش ہوئے تھے اور کس وجہ سے اس کا پتا ہم آپ کے تمام ٹیسٹ کرنے کے بعد لگائیں گے اس لیے آپ ابھی اپنی اس کنڈیشن کے بارے میں مجھے تھوڑا بتائیں۔ مطلب کہ یہ ناک منه سے خون آنا اور بے ہوشی آپ کو پہلی بار ہوئی ہے یا اس پہلے بھی آپ کے ساتھ ایسا کچھ ہوا ہے؟“، اُس کی بات مکمل ہوتے ہی ڈاکٹر نے پروفیشنل انداز میں زارون سے اُس کی جسمانی صحت کے بارے میں کچھ سوالات کیے تاکہ وہ اُس کے معائنہ کے حوالے سے کچھ فیصلہ کر سکیں۔

”خون؟ مطلب میرے ناک منه سے کیوں خون آیا؟“، ڈاکٹر کی بات سنتے ہی زارون کے چہرے کے تاثرات سرد پڑے۔

”اس کا فیصلہ اور تعین ٹیسٹ کے بعد ہی ہو گا بھی آپ پر سکون رہیں اور مجھے بتائیں کہ آپ کے ساتھ ایسا پہلے بھی کبھی ہوا ہے؟“ اُسے پریشان ہوتا دیکھ ڈاکٹرنے تسلی دی اور اُس سے کچھ مختلف سوالات کرنے کے بعد اُس نے پیپر پہ کچھ ٹیسٹ لکھتے نہ س کے حوالے کیے جو تب سے خاموش کھڑی اُن کی باتیں سن رہی تھی۔

”ان کے گھروالوں کو ان سے ملنے کی اجازت دے دیں اور جتنی جلدی ہو سکتا ہے یہ ٹیسٹ کروا کر مجھے انفارم کریں“، اُسے ہدایت دیتے ڈاکٹر نے شک کی بناء پر زارون کو کسی قسم کی کوئی بھی لاپرواٹی برتنے سے منع کرتے اپنا مکمل چیک اپ کروا نے کامشو رہ دیا اور کمرے سے باہر نکلا جہاں احمد صاحب اُن ہی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب کیسی طبیعت ہے اب میرے بیٹے کی؟“ اُن کے پاس آتے ہی احمد صاحب نے فکر مندی سے استفسار کیا تو جنید اور مزمل بھی چہرے پہ امید لیے اُن کے قریب آئے۔

”جی آپ کے بیٹے کو ہوش آگیا ہے اور طبیعت بھی اب پہلے سے بہتر ہے“، ایک نظر جنید اور مزمل پہ ڈالتے ڈاکٹر نے احمد صاحب کو تسلی دی جو زارون کے ہوش میں آنے کا سن کر کچھ مطمئن ہوئے۔

”ہوا کیا تھا؟ مطلب ایسے بے ہوش کیوں ہوا تھا؟ اور ناک منہ سے خون آنا؟ کیا آپ اس بارے میں کچھ بتاسکتے ہیں؟“ اللہ کا شکر داکرتے احمد صاحب نے پھر سے سوال کیا تو ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلا کیا۔

”کنفرم ابھی میں کچھ نہیں بتاسکتا بس میرا مشورہ ہے کہ آپ ان کا مکمل چیک اپ کروائیں اور میں نے کچھ ٹیسٹ لکھے ہیں جتنی جلدی ممکن ہو انہیں کروالیں تاکہ مسئلے کی اصل نوعیت کا پتا چل سکے“، ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ڈاکٹر نے اپنی طرف سے کوئی بھی خدشہ ظاہر کرنے کی بجائے انہیں ہدایت دی۔

”جی ٹھیک ہے ہم کروالیں گے اور کیا اب ہم زارون سے مل سکتے ہیں؟“ جنید جو پہلے ہی کسی غیر معمولی احساس کے تحت احمد صاحب کو زارون کا مکمل چیک اپ کروانے کا کہہ رہا تھا اس نے ڈاکٹر کی بات سننے جواب دیا۔

”جی آپ مل سکتے ہیں“، اثبات میں سر ہلاتے انہوں نے ایک بار پھر سے ٹیسٹ کروانے کی خاص ہدایت کی اور ابھی کچھ دیر زارون کو وہیں رکھنے کا کہتے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے۔

”ابو پلیز حوصلہ رکھیں اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو گا“، ڈاکٹر کے جاتے ہی احمد صاحب پریشانی سے اپنا سر پکڑے سامنے موجود کرسی پر بیٹھے تو مزمول نے انہیں تسلی دی جو پہلے ہی زارون کی حالت

دیکھ پریشان تھے اور اب ڈاکٹر کی طرف سے ڈھنکے چھپے لفظوں میں دی جانے والی ہدایات پر مزید فکر مند ہو گئے تھے۔ ”ٹھیک ہوں میں، بس تم لوگ زارون کے سب ٹیسٹ کرواؤ۔ مجھے بتا ہے وہ ایک بار گھر چلا گیا تو واپس ہسپتال نہیں آئے گا اس لیے تم ابھی سارا انتظام کروتا کہ جو بھی مسئلہ ہو اُس کا فوری علاج ہو سکے“، مزل کی تسلی پر احمد صاحب نے ہمت ہارنے کی بجائے حوصلہ کرتے اُن دونوں سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے انہیں مطمئن کرتے، اپنے ساتھ لیے اُس کمرے کی جانب بڑھے جہاں زارون کو رکھا گیا تھا۔

---

”ماما پلیز آپ بابا کو کال کر کے زار کی طبیعت کا پوچھیں، مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے“، تقریباً ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد نور نے کلاک کی طرف دیکھتے عابدہ بیگم سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے نسرین کو اپنے موبائل لانے کا کہنے لگیں۔

”تم پریشان نہ ہو۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، اپنی پریشانی اُس پر ظاہر کرنے کی بجائے عابدہ بیگم نے ہمت رکھتے نور کو تسلی دی جوتب سے رو رو کر اپنا براحال کر چکی تھی۔

”یہ لیں بی بی جی...“ لاونج میں داخل ہوتے نسرین نے موبائل عابدہ بیگم کی طرف بڑھایا جو اُسے تھامتے ہی احمد صاحب کا نمبر ملانے لگیں۔

”السلام علیکم! احمد کیسی طبیعت ہے اب زارون کی؟ اُسے ہوش آیا؟“ دوسری طرف کال ریسیو ہوتے، ہی عابدہ بیگم نے بے تابی سے پوچھا۔

”ہاں ٹھیک ہے زارون اب اور ہوش میں ہی ہے۔ یہ لو بات کرو“، ان کی بے چینی پہ تسلی دیتے احمد صاحب نے موبائل زارون کی طرف بڑھایا۔

”ماں ہے تمہاری“، اُس کی سوالیہ نظرؤں کے جواب میں بتاتے احمد صاحب نے اُسے بات کرنے کا کہا۔

”السلام علیکم! زارون میری جان کیسے ہو؟ کیسی طبیعت ہے اب میرے بیٹے کی؟“ دوسری جانب اُس کی آواز ابھرتے، ہی عابدہ بیگم نے اپنے آنسوؤں کو با مشکل روکا۔

”جی امی، میں ٹھیک ہوں اب اور پلیز آپ پریشان نہ ہوں“، انہیں تسلی دیتے زارون نے رونے سے منع کیا۔

”کیسے پریشان نہ ہوں، میری تو تمہاری حالت دیکھ کر جان ہی نکل گئی تھی“، دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرتے انہوں نے نور کی جانب دیکھا جو ان کی ساری بات سنتے منتظر سی بیٹھی تھی۔

”میں ٹھیک ہوں، پلیز آپ ایسے پریشان مت ہوں اور اپنا خیال رکھیں ہم بس کچھ دیر میں گھر آجائیں گے“، انہیں اپنی جانب سے مطمئن کرتے زارون نے نر س کے کہنے پر بازو سیدھا کیا تاکہ وہ ٹیسٹ کے لیے بلڈ نکال سکے۔

”اچھا ٹھیک ہے یہ نور سے تھوڑی بات کرلو۔ تب سے رورہی ہے“، اُس کی آواز سنتے عابدہ بیگم کے دل کو تھوڑی ڈھار س ملی تو انہوں نے زارون سے کہتے موبائل نور کی جانب بڑھایا اور خود شکرانے کے نفل ادا کرنے چلی گئیں۔

”ہیلو... زا... ر... آپ... کی... سے ہ... ہیں؟“ لرزتی ہوئی آواز میں لفظوں کو توڑتے ہوئے ادا کرتے نور کے ہونٹ کا نپے۔

”ٹھیک ہوں میں پر لگتا جب تک میں نے گھر آناتم نے رو رو کے اپنے چڑیلوں ساحلیہ بنالینا“، ایک نظر انجیکشن کو دیکھتے زارون نے نور کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سے اُس کی حالت کا اندازہ لگایا۔

”آ... پ بس جلد... می... گھ... رآ... جا... سیں“، اُس کے مذاق پر ناچاہتے ہوئے بھی آنسوؤں نے اپنے بند توڑے تو نور نے خود پہ قابو پانے کے لیے اپنے نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبایا۔

”میری جان میں ٹھیک ہوں پر اگر تم نے رونا بند نہ کیا تو میں پھر سے بیمار ہو جاؤں گا“، نرس کے جاتے ہی زارون نے احمد صاحب کو جنید اور مزمول کے ساتھ مصروف دیکھ آہستہ آواز میں نور کو دھمکی دی جس کے رونے سے اُسے اپنی تکلیف مزید بڑھتی ہوئی محسوس ہوئی۔

”نہیں... میں نہ... ہیں رو... لگی بس آپ... جلدی گھر... آجائیں“، اُس کی دھمکی سنتے ہی نور نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

”ٹھیک ہے، گلڈ گرل بس اب رونا نہیں میں ٹھیک ہوں“، اُسے اپنی طرف سے مطمئن کرتے زارون نے پیپر کی تیاری کرنے کی تلقین کی اور مزید دو چار باتیں کرنے کے بعد اُس نے جنید کے قریب آنے پر کال کاٹ دی اور اُس کی جانب متوجہ ہوا جو اُسے ایک دو مزید ٹیسٹ کروانے کے بارے میں بتا رہا تھا۔

-----

خفیہ طور پر تحقیق جاری رکھنے پر مراد شاہ اور حیدر شاہ کے خلاف اُن کے ہی علاقے کے کئی لوگوں نے گواہی دیتے اپنی بہن بیٹیوں کے ساتھ زیادتی اور قتل کے الزامات لگائے تو آرمی کے کچھ آفیسر نے اُس کیس کو اپنی ذمہ داری پر آگے بڑھاتے تمام ثبوت اور گواہوں کی موجودگی میں بات

عدالت تک پہنچائی جہاں اُن دونوں باپ بیٹے کو عمر قید بامشقت کے ساتھ ساتھ دو دو بار پھانسی کی سزا سنادی گئی تھی۔

”بابا سائیں؟ آپ ٹھیک ہیں؟“ پورے ایک مہینے بعد اُن باپ بیٹے نے عدالت میں ایک دوسرے کی صورت دیکھی تو مراد شاہ نے ایک آخری بار اپنے باپ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی جس پر جج نے فوجیوں کی موجودگی میں، اُسے حیدر شاہ کے ساتھ کچھ سینڈز کے لیے بات کرنے کا موقع دے دیا۔

”مراد، میرے بیٹے“، اُس کا چہرہ دیکھتے ہی حیدر شاہ نے لرزتی ہوئی زبان اور کانپتے ہوئے ہاتھوں اُسے اپنے حصار میں لیا جو مسلسل ریمانڈ پہ ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ کمزور ہو چکا تھا۔

”بابا سائیں مجھے معاف کر دیجیے گا۔ آج میری ایک غلطی کی وجہ سے آپ بھی اس مصیبت میں پھنس گئے، آنکھوں میں نمی لیے بوڑھے باپ کو ذلت کی گھرا یوں میں دیکھ مراد شاہ کا دل پھٹنے لگا۔

”معاف؟ معافی تو مجھے مانگنی چاہیے۔ آج جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا سب میری غلطی ہے۔ میں نے ہمیشہ ظلم کیا اور ظالم کا ساتھ دیا۔ میں نے مراد، میں نے تمہیں درندہ بنایا۔ میں نے تمہاری ہر غلطی کو بڑھا وادیتے تمہیں اس حد تک پہنچا دیا کہ تم میں بھی بدی کی تمیز بالکل ختم ہو گئی۔ میں نے

تمہیں اپنے ہاتھوں سے بر باد کیا۔ ہاں میں نے اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے جانور بنایا۔ میں نے ہی تمہیں سکھایا کہ زندہ انسانوں کو اپنی ہوس کی خاطر نوجوں ڈالو، میں نے تمہیں بچپن سے ہی اپنا جیسا بنایا۔ میں نے تمہارے کچے ذہن میں نفرت کا زہر بھرا۔ میں بُرا ہوں، ہاں میں ایک غلیظ انسان ہوں جس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بیٹے کی زندگی کو بر باد کر ڈالا، اپنے چہرے کو نوچتے حیدر شاہ نے چلاتے ہوئے اپنے گناہ کا اعتراف کیا اور صدمے کے مارے پاگلوں کی طرح کبھی ہستے اور کبھی روتے ہوئے مراد شاہ کے آگے ہاتھ جوڑتے معافی مانگنے لگے جو آج خود بھی موت کو اپنے سر پہ کھڑا دیکھنے کے آنسو بھار ہاتھا جن سے نہ تواب اُس کے ظلم چھپ سکتے تھے اور نہ ہی وہ وقت پلٹ سکتا تھا جب اُس نے اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر اللہ کی مخلوق کو اذیت پہنچائی تھی۔

اگلے دو گھنٹوں میں تمام رپورٹس کمکل ہوئیں تو ڈاکٹر نے اُن کا تفصیلی معاشرہ کرنے کے بعد زارون کے سامنے کچھ بھی بتانے سے غرض بر تھے احمد صاحب کو اپنے پاس کمرے میں بلا یا۔

”بیٹھیں...“، ان کے ساتھ ایک لڑکے کو دیکھ ڈاکٹر نے فائل ٹیبل پر رکھتے ان دونوں کو بیٹھنے کا کہا۔

”ڈاکٹر صاحب سب خیریت ہے نا؟“ اپنی نشست سنبھالتے ہی احمد صاحب نے ان کے چہرے سے کسی غیر معمولی بات کا اندازہ لگاتے سوال کیا۔

”جی، آپ حوصلہ رکھیں بس میں جو بھی بتاؤں گا اُسے صبر اور ہمت کے ساتھ سننے گا، کیوں کہ میں بھی ایک باپ ہوں اور جانتا ہوں کہ کسی بھی باپ کے لیے اپنی اولاد کی تکلیف برداشت کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے،“ عینک اُتار کر ٹیبل پر رکھتے ڈاکٹر نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کرتے انہیں معاملے کی سُگنی سے آگاہ کیا تاکہ وہ کسی بھی بُری خبر سے پہلے اپنے دماغ کو اُس کے لیے تیار رکھیں۔

”جی آپ بتائیں۔ میں سن رہا ہوں“، ان کی تمہید پر جہاں فکر مندی سے جنید کے ماتھے پر بل پڑے وہیں احمد صاحب نے دل بڑا کرتے ڈاکٹر سے کہا جو ایک بار پھر سے زارون کی رپورٹ کی فائل کھول چکا تھا۔

”آپ کے بیٹے سے پوچھ گچھ کرنے کے بعد ہی مجھے یقین ہو گیا تھا پر میں نے اُس وقت رپورٹس کی بغیر کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ اب جبکہ رپورٹس آگئیں ہیں تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ آپ کے بیٹے کو کینسر ہے“، آخری بات بڑے تحمل کے ساتھ بتاتے وہ کچھ سینڈز کے لیے رکے۔

”کینسر؟ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ ڈاکٹر صاحب آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا بیٹا تو ماشاء اللہ سے بالکل ٹھیک ہے“، ڈاکٹر کی بات سنتے ہی جہاں جنید کو حیرت کا جھٹکا لگا وہیں احمد صاحب نے بھی بے یقین سے نفی میں سر ہلا�ا۔ ”نہیں، مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی اور میں نے بتایا کہ پہلے مجھے شک تھا پر اب رپورٹس آپ کے سامنے ہیں“، فال ان کی طرف کرتے ڈاکٹر نے انہیں یقین دلانے کے ساتھ ساتھ خود ہی رپورٹس میں موجود علامات کے بارے میں انہیں آگاہ کیا۔

”پر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے زارون تو بالکل ٹھیک تھا اور ایک دم سے اچانک طبیعت خراب ہونا اور یہ کینسر؟“ ڈاکٹر کی طرف سے بات کمل ہونے کے بعد بھی جنید نے بے یقین سے ان کی طرف دیکھا۔

”معدے کے کینسر ایسے اچانک ہی علامات ظاہر ہوتیں ہیں اور وہ بھی تب جب بیماری اپنی شدت اختیار کر چکی ہوتی ہے۔ مطلب یہ کہ کینسر جب تیسری یا چوتھی استوج پہنچتا تو اپنی شکل میں مختلف

علامات کی صورت ظاہر کرتا جو کسی انسان کو بہت جلد اور کسی کو دیر سے پتا چلتی اور آپ کے بیٹے کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔ اُسے کافی طامہ سے معدے میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی جسے اُس نے اتنی توجہ نہیں دی اور نتیجہ آپ کے سامنے ہے، اپنی بات دلائل کے ساتھ انہیں سمجھتے ڈاکٹر نے جلد از جلد اینڈو سکوپی (جس میں ایک چھوٹے کیمرے کے ذریعے جسم کے ان دورنی اعضاء کا معائنہ کیا جاتا ہے) کروانے کا بولا تاکہ کینسر کی نوعیت کا پتا چلتے علاج شروع کیا جاسکے۔

”بھی بہت شکر یہ آپ کا“، ڈاکٹر کی طرف سے بتائی گئی معلومات کو با غور سنتے جنید نے اُن کا شکر یہ ادا کیا اور احمد صاحب کو سہارا دیتے باہر لایا جو زارون کی بیماری کا سُن کر بالکل حوصلہ ہار چکے تھے۔ ”ابو پلیز خود کو سنبھالیں۔ آپ یوں ہمت ہار جائیں گے تو زارون کو کون سنبھالے گا۔ مطلب اُسے تو فوراً ہی شک ہو جائے گا کہ ہم اُس سے کچھ چھپا رہے ہیں“، اُنہیں وہاں موجود چیز پہ بٹھاتے جنید نے سمجھانے کی کوشش کی۔

”کیسے ہمت کروں؟ میرا بیٹا اتنی بڑی تکلیف میں مبتلا تھا اور مجھے خبر تک نہیں ہوئی“، اپنی کمزور اور بوڑھی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو صاف کرتے احمد صاحب نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے اپنی بات مکمل کی۔

”اللہ پاک سب ٹھیک کرے گا آپ پر یشان نہ ہوں اور دیکھیں ڈاکٹرنے آپ کے سامنے ہی بتایا ہے کہ اب کینسر لا علاج نہیں ہے۔ اس کا علاج ممکن ہے اس لیے آپ فکر نہ کریں ہم زارون کا اچھے سے اچھا علاج کروائیں گے“، ان کا ہاتھ تھامتے جنید نے تسلی تو احمد صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے اپنے آپ کو مضبوط کیا تاکہ ان کے چہرے کو دیکھ کے زارون کو کسی بھی قسم کا کوئی شک نہ پڑے۔

”آئیں اندر چلتے ہیں۔ مزمل کی کال آرہی ہے“، اپنے موبائل کی اسکرین کو دیکھتے جنید نے انہیں بتایا جو اپنا چہرہ اچھے سے صاف کرتے اُس کے ساتھ ہی کوریڈور کے اندر ونی حصے کی جانب بڑھے۔

کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر نے کچھ میڈیسین کے ساتھ زارون کو ڈسپارچ کیا تو وہ تینوں اُسے لے کر گھر آئے جہاں عابدہ بیگم کے ساتھ ساتھ نور نے بھی اُس کی واپسی پہ اللہ کا شکر ادا کیا۔

”کیا کہا ڈاکٹرنے؟ مطلب زارون ایسے بے ہوش کیوں ہوا تھا؟“ مزمل نے اُس کے کمرے میں پہنچایا تو ہما (جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی واپس آئیں تھیں اور آتے ہی نسرین کی زبانی زارون کی طبیعت خرابی کا سن چکی تھیں) نے اُس کی طبیعت کا پوچھتے سوال کیا۔

”کچھ نہیں بس بی پی ہائی ہو گیا تھا“، کمفرٹر ٹھیک کر کے اُس کے اوپر دیتے جنید نے زارون کو بتائی گئی بات ہی دھرائی۔

”تو پھر خون کیوں آیا؟ بی پی ہائی ہونے سے تو ناک منہ سے خون نہیں نکلتا“، ہر بار کی طرح اس بار بھی حنا نے آگ لگانے کا موقع اپنے ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ ”خون صرف ناک سے نکلا تھا۔ وہ بھی بی پی زیادہ ہائی تھا تو دماغ کی وین میں سے آنے لگ گیا“، حنا کی بات کی درستگی کرتے جنید نے لفظوں کے ساتھ ساتھ اپنی نظروں میں بھی سختی سموتے اُس کی بات کا جواب دیا جو معاملے کی تھہ تک پہنچنے کی کوشش میں لگی تھی۔

”ایسے کیسے وین سے آنے لگ گیا؟ میرا مطلب وین پھٹ گئی تھی کیا؟“، جنید کی بات میں صدق محسوس نہ کرتے حنا نے اُسے مزید کریدنے کی کوشش کی تو جنید نے ایک گھری سانس لیتے خاموش نظروں سے اُسے دیکھا جو اپنے جواب کی منتظر تھی۔

”کہتے ہیں شکل اچھی نہ ہونا تو انسان زبان سے الفاظ ہی اچھے نکال لے اور جب میں ایک بار تمہیں بتاچکا ہوں تو یہ بار بار پوچھ کر سب کو یوں پریشان کرنے کا مقصد؟“، حنا کے سامنے آتے جنید نے زارون سیمت سب کی نظروں میں کشمکش دیکھ بات سن بھالنے کی کوشش کی۔

”نہیں، میں تو بس ویسے ہی پوچھ رہی تھی“، شوہر کی نظروں میں خاموشی اختیار کرنے کی واضح تنبیہ دیکھ ہنانے کندھے اچکائے اور چہرے پہ خلوص کا لبادہ اوڑھتے زارون کو جلد صحت یاب ہونے کی دعا دینے لگی جو خود بھی جنید اور احمد صاحب کے چہروں اور لہجوں سے اُن کی بات میں جھوٹ کی ملاوٹ محسوس کر چکا تھا۔

---

سب کے واپس اپنے اپنے کمروں کے جانے کے بعد نور نے اُس کو جنید کی بتائی گئی میڈیسین دی اور خاموشی سے لائیٹ آف کرتے اپنی سائیڈ پہ آگر لایٹ گئی تو زارون نے بھی اُس کے تھکے ہونے کا سوچتے اُسے مخاطب نہیں کیا اور غنوڈگی محسوس کرتے خود بھی آنکھیں بند کرتے سونے کی کوشش کرنے لگا تو اُسے اپنے سے کچھ ہی فاصلہ پہ لیٹے وجود میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔

”نور کیا ہوا ہے؟“ اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے زارون نے اُس کا رخ اپنی طرف کیا تو جواب دینے کی بجائے نور نے اُس سے لپٹتے زورو شور سے آنسو بھائے۔

”نور میری جان میں ٹھیک ہوں“، اُس کی پشت پہ ہاتھ پھیرتے زارون نے اُسے تسلی دی جو اُس کی کوئی بھی بات سمجھے اور سنے بغیر اپنا کام جاری رکھے ہوئے تھی۔

”نور میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ رونا نہیں ہے پر تم پھر سے شروع ہو گئی ہو“، اُس کی ہچکیاں بند ہتی دیکھ زارون کو اپنا ہر درد بھولتے اُس کی فکر ہوئی جو اُس کی ذرا سی تکلیف دل پہ لیتے رورو کر بر احوال کر چکی تھی۔

”نور کیا ہے یار، تم ایسے روؤں گی تو واپس ہسپتال چلا جاؤں گا“، اُسے کسی صورت بھی اپنی بات مانتانہ دیکھ زارون نے خود سے الگ کرتے دھمکی دی۔

”نہیں... میں آپ کو کہیں نہیں جانے دوں گی“، اُس کی دھمکی کا ہی اثر تھا کہ نور نے نبھی میں سر ہلاتے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے۔

”توبس پھر رونا بند کرو اور میری بات غور سے سنو“، اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیتے زارون نے اُس کی آنکھوں میں دیکھا جو رونے کی وجہ سے سرخ ہو چکی تھیں۔

”انسان کی زندگی میں بہت بڑے بڑے امتحان آتے ہیں۔ بہت سی مشکلات جس کا نہ توارہ تصور کرتا ہے اور نہ ہی ان کا حل اُس کے بس میں ہوتا پر ایک امید ہوتی کہ اللہ پاک ہے وہ سب ٹھیک کر دے گا اور یہ امید انسان کو بڑی سے بڑی پریشانی سے نکال دیتی اس لیے کبھی بھی کوئی مشکل ہو یا تمہیں لگے کہ اب حالات تمہارے بس میں نہیں ہیں تو بس صبر کرنا اور اللہ پاک پہ توکل رکھنا کہ

وہ تمہارے ساتھ ہے، ”اپنی پوروں میں اُس کے آنسو جذب کرتے زارون نے بہت پیار اور نرمی کے ساتھ اُسے سمجھایا جو ہر بات پہ دل چھوٹا کرتے رونے لگتی تھی۔

”میری جان رونا کسی مسئلے کا حل نہیں اور اگر رونے سے پریشان ہونے سے سب مسئلے حل ہو جاتے تو میں بھی تمہارے ساتھ مل کر رویتا ہوں،“، نظروں میں خفگی لیے زارون نے اپنی آخری بات مذاق میں کہی تو نور نے منہ ب سورے اُسے گھورا۔

”مرد روتے نہیں ہیں اور آپ تو روتے ہوئے بالکل بھی اچھے نہیں لگیں گے،“ اُس کے سینے پہ ہلکا سماہاتھ مارتے نور نے بازو اُس کے گرد لیپٹے تو زارون نے اُسے اپنے حصار میں لیتے مزید قریب کر لیا۔

”بس پریشان مت ہوا کرو۔ تم پریشان ہوتی ہو تو مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگتا،“ اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیتے زارون نے کمفرٹ راچھے سے اُس کے اوپر دیا جواب کچھ بھی بولے بغیر خاموشی سے اُس کے سینے پہ سر رکھے اُس کی دھڑکنوں کو محسوس کر رہی تھی۔

-----

”ابو یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں کسی صورت بھی اپنے بچوں کو اُس شخص کے حوالے نہیں کروں گی“، حبہ جو سارہ بیگم سے ناشتے کا پوچھنے آئی تھی آفندی صاحب کی زبان سے احتشام کے کیس کرنے کا سنتہ ہی بوکھلاتے ہوئے بغیر اجازت ہی کمرے میں داخل ہوتے کہنے لگی۔

”حبہ بیٹا، تم یہاں آؤ بیٹھو..“، وہ جو پچھلے دو دن سے اُس سے یہ بات چھپا رہے تھے اچانک سے اُس کے آنے پر پریشان ہوئے۔

”نہیں، مجھے بیٹھنا نہیں ہے، بس میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے بچوں کو زہر دے دوں گی پر اُس شخص کے حوالے کر کے اُن کی پوری زندگی کو روگ نہیں لگاؤں گی“، غصے اور تکلیف کے ملے جلے تاثرات لیے حبہ نے اپنا فیصلہ سنا کے وہاں سے جانا چاہا مگر سارہ بیگم نے اُس کے سامنے آتے اُسے روکا۔

”پلیز حبہ اپنے غصے پہ قابو پاؤ اور یہاں بیٹھ کر آرام سے ہماری بات سنو“، اُس کے دونوں بازوں تھامتے سارہ بیگم نے نرمی کے ساتھ اُسے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کی۔

”میں آپ لوگوں کی کوئی بات نہیں سنوں گی اس لیے پلیز اپنی فضول دلیلیں مجھے پہ استعمال مت کریں“، اُن کے دونوں ہاتھ جھٹکتے حبہ نے نظروں میں نفرت لیے اپنی ماں کو دیکھا جو اُس کا نیا گھر بسانے کے لیے آفندی صاحب کو پچھے احتشام کو دینے کا مشورہ دے رہی تھیں۔

”آپ پہلے ہی میری زندگی بر باد کر چکیں ہیں اب کیا مجھے پھر سے ایک بار اُسے دلدل میں دھکلیں گیں جس سے نہ صرف میں بلکہ میرے معصوم بچے بھی کہیں کے نہیں رہیں گے۔ نہیں امی نہیں، پہلے آپ نے جو کچھ بھی کہا میں نے کیا اور سہ بھی لیا پر اب اگر آپ لوگوں نے میرے بچوں کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی تو میں انہیں زہر دے کر خود کو بھی ختم کر لوں گی“، غصے میں کسی بھی رشتے اور چیز کا لحاظ کیے بغیر حبہ نے اپنی تمام فکروں کو پس و پشت ڈالتے ایک ماں ہونے کا حق ادا کیا اور آفندی صاحب کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ کمرے کا دروازہ کھولتے انہیں کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”دیکھ لیا؟ میں نے کہا بھی تھا کہ تم ایک بار اپنی بیٹی کی زندگی کو اپنے ہاتھوں سے بر باد کر چکی ہو اس لیے اب دوبارہ سے اُس کے بچوں کو اُس سے الگ کر کے اُسے مزید کھو کھلامت کرو“، حبہ کے جاتے ہی آفندی صاحب نے سارہ بیگم کو آڑے ہاتھوں لیا جو ان کے منع کرنے کے باوجود بھی بچوں کو احتشام کے حوالے کرنے کی ضد کرتے انہیں حبہ کو قائل کرنے کا کہہ رہی تھیں۔

”ہاں اس گھر میں ایک میں ہی غلط ہوں جو اپنی بیٹی کے لیے الگی زندگی میں آسانی کا سوچ رہی ہوں۔ آپ خود بتائیں کیا بیٹی کی جوانی کو یوں نہیں بر باد کر دیں گے یا اُسے ہمیشہ کے لیے گھر بٹھا کر رکھنے کا رادا ہے؟ آج کل مرد اپنے بچوں کی ذمے داری نہیں لیتے تو یہ تو پھر کسی اور کے بچے ہیں۔ تائیں

مجھے کیا کوئی مرد کسی عورت کو اُس کی پہلی اولاد کے ساتھ قبول کر سکتا ہے؟ آفندی صاحب، مرد میں طلاق یافتہ اور بیوہ عورت کو تو قبول کرنے کا حوصلہ ہوتا پڑوہ کبھی بھی عورت کی پہلی اولاد کو قبول نہیں کرتا۔ اسی لیے میں آپ کو سمجھا رہی تھی کہ پچوں کو ساتھ رکھ کر حبہ کی زندگی کو مزید روگ مت لگائیں خود بھی سمجھیں اور اپنی اس نام سمجھ بیٹی کو بھی سمجھائیں کہ ہم ساری زندگی اُس کے سر پہ سلامت نہیں رہیں گے، معاشرے کی سچائی بیان کرتے سارہ بیگم کی آنکھوں میں نمی آئی تو انہوں نے اُسے چھپانے کے لیے نظریں جھکائیں۔

”تمہاری بات ٹھیک ہے پر حبہ کے لیے پچوں کو چھوڑنا ناممکن ہے جیسے تم اپنی اولاد کو خود سے دور نہیں کر سکتیں اسی طرح وہ بھی ایک ماں ہے اور مجھے لگتا ہے کہ اگر تم بھی اُس کی جگہ ہو تو تیں تو کبھی بھی پچوں کو اپنی آنے والی زندگی کو آسان بنانے کے لیے اس ظالم اور بے حس شخص کے حوالے نہ کرتیں“، اُن کے لمحے کو نم ہوتا دیکھ آفندی صاحب نے اس بار تھوڑی نرمی اختیار کرتے سارہ بیگم کو سمجھایا جو سب کچھ حبہ کے بھلے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

”ٹھیک ہے آپ کو جو بہتر لگتا ہے آپ کریں۔ میں آج کے بعد آپ لوگوں کے کسی معاملے میں نہیں بولوں گی“، اُن کے بات پہ دلبرداشتہ ہوتے سارہ بیگم نے اپنی ہار تسلیم کی اور مزید بحث کیے بغیر کمرے سے نکلتے کچن کی جانب بڑھیں تاکہ ملازم کو ناشتہ لگانے کا بول سکیں۔

”ہسپتال؟ اب ہسپتال کیوں جانا ہے؟ ابواب میں بالکل ٹھیک ہوں“، جنید کی بات سنتے ہی زارون نے احمد صاحب کو وضاحت دی جو ان کے ساتھ ہی کمرے میں موجود تھے۔

”ہاں ہم جانتے ہیں کہ تم ٹھیک ہو پر اپنی تسلی کے لیے میں تمہارے ایک دو ٹیسٹ کروانا چاہتا ہوں“، اُسے ہسپتال کے نام پر یوں پریشان ہوتا دیکھ جنید نے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

”نهیں، میں اب کوئی ٹیسٹ نہیں کرواؤ گا اور پلیز بھائی آپ بھی اب بے فکر ہیں اگر مجھے کوئی مسئلہ ہوا تو میں خود ہی چیک کروالوں گا“، اُن کی باتوں اور حرکات سے زارون کو پہلے ہی کسی غیر معمولی بات کو احساس ہو رہا تھا جیسے وہ دونوں اُس سے کچھ چھپا رہے ہوں پر اب جنید کے منہ سے ایک بار پھر ٹیسٹ کی بات سن کر زارون کو پکا تلقین ہو چلا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے جس کی وجہ سے احمد صاحب بار بار اُس سے طبیعت کا پوچھتے اور میڈیسن وقت پہ لینے کی تلقین کر رہے تھے۔

”زارون ضد مت کرو اور جنید تمہاری بھائی کے لیے ٹیسٹ کروانے کا بول رہا ہے اس لیے جو بھائی کہتا ہے اُس کی بات مانو اور کل اس کے ساتھ جاؤ“، اُس کی ضد دیکھ احمد صاحب جو اُس کے

کسی بھی سوال کے ڈر سے خاموش بیٹھے تھے اُس کے خود ہی چیک کروانے کی بات کو سنتے ایک دم سے مداخلت کرتے کہنے لگے۔

”ٹھیک ہے، میں چلا جاؤں گا پر میری ایک شرط ہے“، صوفی سے اٹھ کر احمد صاحب کے قریب نیچے زمین پہ بیٹھتے زارون نے اُن کے دونوں ہاتھ تھامتے اُن کی آنکھوں میں دیکھا۔

”تمہاری شرط میں اچھے سے جانتا ہوں پر مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں تمہیں وہ سچ بتاسکوں جو تم سننا چاہ رہے ہو“، چہرے پہ ایک تلخی مسکراہٹ سجاتے احمد صاحب نے اُس کے چہرے پہ ہاتھ رکھا جو اُن کے اس قدر ٹھیک اندازے پہ حیرت زدہ سا بیٹھا نہیں بناء پلکیں جھپکائے تک رہا تھا۔

”بعض اوقات سچائیاں اتنی تلخ ہوتیں ہیں کہ اُن کے لیے الفاظ کے ساتھ ساتھ ہمتیں بھی جواب دے جاتیں اور جو تم جانا چاہ رہے ہو وہ تمہیں بتانا ضروری بھی ہے مگر... مجھے پتا ہے تم برداشت نہیں کر پاؤ گئے“، احمد صاحب جو پہلے ہی چاہتے تھے کہ زارون کو اُس کی بیماری کے بارے میں بتا دیں تاکہ وہ اینڈوسکوپی اور مختلف ٹیسٹ کے دوران اچانک سے پتا چلنے پہ گھبراہٹ کا شکار نہ ہوا اسی لیے اب موقع دیکھ کے اُنہوں نے بات کا آغاز کیا۔

”سچائی؟ کیسی سچائی؟ ابو پلیز مجھے بتائیں کیا مسئلہ ہے؟ میں پچھلے کچھ دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ آپ میری طبیعت خرابی کے بعد سے کافی پریشان ہیں۔ پلیز جو بھی بات ہے آپ مجھے بتائیں“، اُن کی باتوں سے زارون کی چھٹی حس نے اُسے کسی بڑے خطرے سے آگاہ کیا تھا ہی اُس نے اپنے چہرے پہ کسی قسم کی کوئی بھی گھبراہٹ لائے بغیر احمد صاحب سے اصرار کیا جو اُس سے نظریں ملائے بغیر مناسب الفاظ کی تلاش میں جنید کی جانب دیکھ رہے تھے۔

”ابو بولیں کیا بات ہے؟ پلیز جو بھی بات ہے مجھے بتائیں۔ کیوں آپ پھر سے ٹیسٹ کروانے کا کہہ رہیں؟“ اُن کے ہاتھ تھامے ہی زارون نے اپنی نظر و کارخ جنید کی جانب کیا۔

”پریشانی والی کوئی بات نہیں، اگر اللہ پاک انسان کو کوئی تکلیف دیتا ہے تو اس کا علاج بھی ممکن ہے اور آج کل تو سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہر بیماری کا علاج دریافت ہو چکا ہے اس لیے تم میری بات بہت ختم اور ٹھنڈے دماغ سے سننا“، احمد صاحب کو ہمارا نتاد کیا جنید نے خود ہی آگے بڑھتے زارون کو سب بتانے کا فیصلہ کیا۔

”بھائی پلیز میرے صبر کا امتحان مت لیں جو بھی بات ہیں مجھے بتائیں اور میں اتنا کمزور دل نہیں ہوں جسے آپ اس طرح کی باتیں سمجھا رہے ہیں“، اُن کی پہلیوں سے تنگ آتے اب کی بار زارون

نے تھوڑا غصہ دکھایا تو جنید نے ایک گہری سانس لیتے اُس کے قریب ہی بیٹھتے اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

”تمہیں کینسر ہے۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ تمہارے معدے میں السر ہیں جس کی وجہ سے کینسر بن رہا پر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی اور اگر بروقت علاج شروع کروادیا جائے تو یہ بیماری کچھ ہی مہینوں میں ختم ہو جائے گی“، جنید نے سچائی بتانے کے ساتھ ہی زارون کو تسلی دی جو ابھی تک کینسر لفظ پہ پھنسا خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا جو اُسے پتا نہیں کیا کیا باتیں سمجھاتے مختلف لوگوں اور علاج کے بارے میں بتا رہا تھا۔

”زارون میری بات سنو..“، جنید کی کسی بھی بات کا جواب دیے بغیر وہ ایک دم سے اپنا ہاتھ چھپڑواتے کھڑا ہوا تو احمد صاحب نے اُسے پکارا جو ان کی کوئی بھی بات سنے بغیر لاونج سے نکل چکا تھا۔

”میں نے کہا تھا ناکہ اُس سے برداشت نہیں ہو گا“، اُس کے جاتے ہی احمد صاحب نے نکلے ہوئے انداز میں کہتے جنید کی طرف دیکھا۔

”آپ پریشان نہ ہوں وہ سمجھدار ہے جلد ہی خود کو سنبھال لے گا،“ ان کے کندھوں پہ ہاتھ رکھتے جنید نے انہیں صوفے پہ بٹھاتے تسلی دی جو زارون کی اذیت کا سوچ کر بالکل بے بس ہو چکے تھے۔

---

”زار یہ دیکھیں میری فراک کیسی لگ رہی ہے؟“ اُس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نور نے شیشے کے سامنے سے ہٹتے، پورا گھوم کر اُسے اپنی فراک دکھائی جو اپنی ذہنی کشمکش میں اُس کی بات کا جواب دیے بغیر صوفے پہ بیٹھ چکا تھا۔

”زار کیا ہوا؟ اچھی نہیں لگ رہی کیا؟“ اُس کے نہ دیکھنے پہ نور نے منہ پھلانے مایوسی سے اُسے دیکھا جو نظروں میں عجیب بے چینی لیے اُس کے ہر سوال سے غافل جنید کے کہے گئے ایک لفظ پہ اٹکا ہوا تھا۔

”زار کیا ہوا؟ آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“ اُس کی خاموشی پر فکر مندی سے اُس کے قریب آتے نور نے استفسار کیا تواب کی بار زارون نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھنے پر نظر اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا جو اپنے جواب کی منتظر تھی۔

---

”کیا ہوا ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا؟“ اس کے پاس ہی صوفے پہ بیٹھتے نور نے اُس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑی دیکھ ہمدری سے پوچھا۔

”کچھ نہیں ہوا، پلیز کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو“، اپنے کندھے پہ دھر اُس کا ہاتھ ہٹاتے اُس نے درخواست کی تو نور نے بھنوئیں اچکاتے اُسے گھورا۔

”پہلے تو آپ نے میری تعریف نہیں کی میں نے فراک آپ کے لیے پہنی صحیح تیار ہوئی اور آپ نے ایک نظر بھی مجھے نہیں دیکھا اور اب؟ اب آپ مجھے یہاں سے جانے کا کہہ رہے ہیں؟ ہونہ نہیں جاؤ گی میں، یہاں آپ کے پاس ہی بیٹھی رہوں گی“، ہٹ دھرمی سے کہتے نور نے ضد کرتے سر اُس کے کندھے پر کھا تو زارون نے اُس سے اپنا بازو چھڑواتے اپنے آپ سے الگ کیا۔

”کیا یہ تم ہر وقت بچی بنی رہتی ہو؟ میں نے کہانا کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو تو دور ہو جاؤ میری نظروں سے“، اُس کے قریب آنے پہ چلاتے زارون نے اُسے ڈانٹا جاؤ اُس کا رو یہ دیکھ کا بکارہ گئی۔

”ہر وقت کی ضد، ہر وقت کا بچپنہ؟ کیا ہے یہ سب؟ نور تم اب بڑی ہو چکی ہواں لیے پلیز کبھی کبھار اپنے دماغ سے کام لیتے دوسرے کی بات بھی مان لیا کرو“، اپنی تکلیف کا غصے بلا مقصد ہی اُس پہ نکلتے زارون نے اُسے خود سے دور رہنے کی تلقین کی تو نور نے ضبط کے مارے اپنے سرخ چہرے کو مزید جھکاتے اپنے آنسو صاف کیے۔

”ہاں بس اب رونا شروع کر دو۔ میرا، ہی دماغ خراب ہے جو میں تمہیں سمجھا رہا،“، اُسے چپ کروانے یا اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی بجائے زارون نے اس بار اُس کے حال پہ چھوڑتے مزید کچھ کہے بغیر کمرے سے نکلتے اوپر، ہی موجود گیست روم کا رخ کیا تاکہ کچھ دیر تنہائی میں گزار کر اپنی اذیت کو کم کر سکے جو ایک دم سے ہی اُس کے مقدار میں لکھ دی گئی تھی۔

---

”جنید آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں آپ کو پورے گھر میں ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک گئی ہوں،“، وہ لاونچ میں داخل ہوئی تو جنید جو احمد صاحب سے کوئی بات کر رہا تھا اسے دیکھتے ہی ایک دم سے خاموش ہوا۔

”ہاں کیا ہوا کوئی کام تھا تمہیں؟“، احمد صاحب کو نظروں میں تسلی دیتے جنید اُس کی جانب متوجہ ہوا جو ان باپ بیٹے کے چہرے سے کسی غیر معمولی بات کو محسوس کر چکی تھی۔

”نهیں، کوئی کام نہیں تھا وہ بس میں نے یہ کہنا تھا کہ دو پھر میں مجھے امی کی طرف جانا ہے تو کیا آپ مجھے چھوڑ دیں گے؟“، نظریں احمد صاحب کے پریشان سے تاثرات پہ رکھتے ہنانے اپنا مقصد بیان کیا۔

---

”ہاں میں چھوڑ دوں گا۔ تم جاؤ تیاری کرو میں بس کچھ دیر میں آتا ہوں“، اُس کی جانچتی ہوئی نظر وں کو دیکھتے ہی جنید نے اُسے وہاں سے بھیجنے کی کی تاکہ اُسے زارون کی بیماری کے بارے میں کان و کان خبر نہ ہو۔

”ٹھیک ہے بس جلدی آجائیے گا“، اپنے شوہر کے لبجے اور احمد صاحب کے تاثرات سے دال میں کچھ کالا ہونے کا اندازہ لگاتے اُس نے اُسے تاکید کی اور اپنی تیاری کرنے کے لیے لاڈنچ سے نکلی پرشک کی بناء پر کمرے میں جانے کی بجائے وہیں سائیڈ پہ کھڑے ہوتے ان دونوں باپ بیٹی کی باتیں سننے لگیں جو اُس کے جاتے ہیں بے فکر ہو چکے تھے۔

”تم ہسپتال سے ڈاکٹر کے بارے میں ساری معلومات لے لوتا کہ کل جاتے ہی ہمارا کام ہو جائے“، حنا کے لاڈنچ سے نکلتے کچھ سینکڑ ز بعد احمد صاحب نے جنید کو تاکید کی جو اثبات میں سر ہلاتے اُنہیں سارے انتظامات کرنے کی تسلی دینے لگا۔

”اُفف پتہ نہیں ان دونوں باپ بیٹی کے درمیان کون سی کھجڑی پک رہی ہے“، ہسپتال کا سنتے ہی پیشانی پہ بل لیے حنا نے خود کلامی کی اور کان لگا کر اندر سے آنے والی آواز کو سنبھال کر شاید اُسے اصل بات پتا چل سکے پر اُس سے پہلے ہی بیرونی دروازے سے نسرین کے ساتھ ساتھ عابدہ بیگم کو اندر دا خل ہوتا دیکھو وہ ان کی نظر سے بچتے جلدی سے پیچھے ہوئی۔

”اُفف تو بہ ہے یہ بوڑھیا بھی ہمیشہ غلط وقت پر آتی ہے“، اپنے ارادے کی تکمیل نہ ہونے پر منہ میں بڑھاتے اُس نے عابدہ بیگم کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی دبے قدموں سے بھاگتے ہوئے اپنے کمرے کا رخ کیا تاکہ اُسے وہاں دیکھ کر اُن کے دماغ میں کسی قسم کا شک پیدا نہ ہو۔

---

”ارحم کہاں جا رہے ہو؟“ آئمہ بیگم نے اُسے بیرونی دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ اُس کے پیچھے آتے سوال کیا۔

”زارون کی طرف جا رہا ہو، پتا نہیں کیا مسئلہ ہے صبح سے نہ تو اُس کی کوئی کال آتی ہے اور نہ ہی وہ میری کال رسیو کر رہا ہے“، اُن کی بات کا جواب دیتے ارحم نے فکر مندی ظاہر کی۔

”بیٹا! بھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے اس طرح کہیں جانا مناسب نہیں اور زارون کہیں مصروف ہو گا تم پریشان نہ ہو۔ وہ خود ہی کال کر لے گا“، اُس کے بازو پر موجود خم کی وجہ سے آئمہ بیگم نے اُسے باہر جانے سے منع کرتے تسلی دی۔

”نہیں، وہ کبھی بھی اتنی لاپرواٹی نہیں کرتا وہ بھی تب جب اُس کو پتا ہو کہ میری طبیعت خراب ہے اور امی پلیز آپ فکر مت کریں میں ڈرائیور کو ساتھ لے کر جاؤں گا“، اُن کے اصرار کے باوجود بھی

ارحم نے رکنے کی بجائے باہر کا رخ کیا تو آئمہ بیگم نے بھی اُس کی ضد پر ایک گہری سانس لیتے پچھے سے آواز لگاتے اُسے اپنا خیال رکھنے کا کہا جواب ڈرائیور کو بلا تے، اُس کے ساتھ ہی اگلی نشست سنبھال چکا تھا۔

”پتا نہیں یہ لڑکا کیا کرتا پھرتا ہے۔ ماں کی بات تو اسے سمجھ ہی نہیں آتی“، ڈرائیور نے گاڑی گیٹ سے نکالی تو آئمہ بیگم نے خود کلامی کرتے اپنا رخ کچن کی جانب کیا تاکہ ملازمہ سے اپنی نگرانی میں ساری صفائی کرو۔ سکیں جو کچھ دنوں سے ارحم کی طبیعت خرابی کی وجہ سے اپنی مرضی سے ہی تھوڑا بہت کام کر کے چلی جاتی تھی۔

”رضایہ کپڑے ذرا ساتھ والی آنٹی سکینہ کے گھردے آؤ اور آتے ہوئے اُن سے پسیے بھی لے آنا“، ایک شاپر اُس کی جانب بڑھاتے نائلہ بیگم نے اُسے ہدایت کی۔

”کپڑے؟ مطلب یہ کپڑے اُن کے آپ کے پاس کیا کر رہے ہیں؟ اور پسیے کس بات کے؟“ اُن کے ہاتھ سے شاپر لیتے رضا نے چہرے پہ حیرت لیے سوال کیا۔

”وہ کچھ دن پہلے سکینہ کپڑے سلامی کے کام پوچھ رہی تو میں نے ہاں کر دی۔ مطلب وہ کچھ بوتیک کے ساتھ مل کر یہ کام کرتی ہے تو میں نے سوچا سارا دن فارغ رہنے سے اچھا ہے کہ میں بھی کچھ کام کر لوں“، اس سے نظریں ملائے بغیر نائلہ بیگم نے اُسے تفصیل بتاتے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ یہ کام وہ گھر کے اخراجات چلانے کے لیے کر رہی ہیں۔

”آپ کو کیا ضرورت تھی اس کام کی، پہلے گھر میں کتنے سارے کام ہیں اور آپ نے ایک نئی مصیبت اپنے گلے ڈال لی ہے“، ان کی بات سنتے ہی شاپر صوفے پر رکھتے رضانے انہیں بازوں سے پکڑ کر صوفے پہ بٹھایا۔

”مجھے پتا ہے یہ کام آپ اپنی مصروفیت کے لیے نہیں بلکہ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کر رہی ہیں۔ ماں میں نے آپ کو کہا تھا ناکہ بابا کی پسندش بہت کم ہے اُس میں گھر کا گزارا نہیں ہو گا اس لیے آپ مجھے جاب کرنے دیں“، انہیں اپنی جانب متوجہ کرتے وہ ایک دم ہی پریشان ہوا تھا۔ ”نہیں، تم جاب نہیں کرو گئے۔ تم بس اپنی پڑھائی پہ توجہ دو اور گھر بیٹھ کر ہاتھ پاؤں چلانے سے اگر ہمیں کچھ پسیے مل جائیں گے تو اس میں کوئی قباحت نہیں۔ ویسے بھی مجھے کہیں جانا نہیں ہے سکینہ خود ہی آکر مجھے کپڑے دے جاہا کرے گی“، اُسے مطمئن کرنے کے لیے نائلہ بیگم نے ہلکی سی مسکراہٹ چہرے پہ سجا تے وضاحت دی۔

”پھر بھی مجھے نہیں پسند کہ آپ میرے ہوتے ہوئے کوئی ایسا ویسا کام کریں۔ پلیز آپ یہ سب چھوڑ دیں میں خود ہی پڑھائی کے ساتھ ساتھ کوئی چھوٹی موٹی جا بڑھونڈ لوں گا“، ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے رضانے اصرار کرتے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”نہیں بس تم اپنی پڑھائی کی طرف توجہ دو اور بیٹھا محنت کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے اس لیے اپنا دل بڑا کرو اور یہ سوچیں اپنے ذہن سے نکال دو کہ میرے کام کرنے سے کوئی تمہیں کچھ بولے گا یا کسی کے سامنے تمہیں کوئی شرمندگی اٹھانا پڑے گی“، اُس کی آنکھوں میں دیکھتے نائلہ بیگم نے نرمی سے سمجھاتے اُسے اپنی بات پہ قائل کرنے کی کوشش کی۔

”ما ایسی بات نہیں ہے مجھے کیوں شرمندگی ہو گی میں تو بس آپ کے لیے بول رہا ہوں کہ آپ کی طبیعت تو پہلے ہی ٹھیک نہیں رہتی اور پھر سے سب... نہیں بس آپ چھوڑ دیں سب میں کرلوں گا کوئی کام“، ان کی بات پر مطمئن ہونے کی بجائے رضانے ایک بار پھر سے انہیں منع کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے بعد کی بعد میں دیکھیں گے ابھی تم یہ سب بتیں چھوڑ دو اور جاؤ یہ کپڑے سکینہ کے گھر دے آؤ“، اُسے اس وقت کشمکش کا شکار دیکھ نائلہ بیگم نے کوئی بھی بات کہنا یا مزید سمجھانا مناسب نہیں سمجھا اور اُس کی بات بدلتے شاپر اٹھا کر اُس کے ہاتھ میں پکڑا۔

”مجھے پتا ہے آپ میری بات ٹال رہی ہیں پر میں بھی آپ کا بیٹا ہوں اسیے کسی صورت بھی آپ کو یہ سب نہیں کرنے دوں گا“، صوفی سے اٹھتے رضا نے اپنا فیصلہ سنایا اور مزید ان کی کوئی بات سنے بغیر باہر نکلتے گیٹ کی جانب بڑھا۔

”اُفف میرا ہی دماغ خراب تھا جو اس سے کپڑے دینے کا کہہ دیا۔ توبہ بہت ضدی ہے“، اپنی غلطی پر خود کو کوستے نائلہ بیگم نے کسی اور وقت سکون سے رضا کو سمجھانے کارادہ کرتے اپنے موبائل کی بیل سنتے وہاں سے اٹھتے کمرے کا رخ کیا۔

زارون کے ڈاٹنے پر کافی دیر تک آنسو بھاتے رہنے کے بعد نور نے دروازے پر دستک کی آواز سنتے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

”کون ہے؟“، اپنی سوچ بھی ہوئی سرخ آنکھوں کی وجہ سے دروازہ کھولنے کی بجائے اُس نے اندر سے آواز لگائی۔

”بی بی جی میں نسرین، وہ نیچے ارحم صاحب آئے ہیں“، اُس کی آواز سنتے تعارف کے ساتھ ساتھ نسرین نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

”ارحم بھائی آئے ہیں“، منہ میں بڑ بڑاتے اُس نے اپنا چہرہ اپھے سے صاف کرتے دروازہ کھولا۔

”زار تو کافی دیر سے کمرے میں نہیں آئے۔ میرا مطلب وہ نیچے ہی تھے نا؟“، اُس کی طرف دیکھے بغیر نور نے تصدیق کے لیے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ ”نہیں، صاحب نیچے تو نہیں آئے البتہ جب میں کچھ دیر پہلے اوپر کی صفائی کر رہی تھی تو میں نے انہیں گیست روم میں جاتے دیکھا تھا“، اُس کے سنتے ہوئے چہرے سے اُس کے رونے کا اندازہ لگاتے نسرین نے کوئی بھی سوال کرنے کی بجائے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”چھاٹھیک ہے۔ میں زار کو بلا تی ہوں، آپ جائیں ارحم بھائی سے چائے وغیرہ کا پوچھیں“، نسرین کا جواب سنتے ہی نور نے اُسے ہدایت دی جو اثبات میں سر ہلاتے سیڑھیوں کی جانب بڑھی تو نور نے بھی غصے اور ناراضگی کے باوجود بھی اپنا رخ گیست روم کی جانب کیا۔

”کون ہے؟“ اندر داخل ہونے کی بجائے نور نے دروازے کے سامنے رکتے دستک دی تو تقریباً یہاں ایک منٹ بعد اندر سے زارون کی آواز ابھری۔

”نیچے ارحم بھائی نہیں ہیں“، باہر سے جواب دینے کی بجائے نور نے بناء اجازت ہی دروازہ کھولتے اندر قدم رکھتے اُسے بتایا جو ایک نظر اُس پہ ڈالتے ہی واپس صوفے کی بیک سے سر ٹکا چکا تھا۔

”مجھے کسی سے نہیں ملنا ہے۔ بس کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں اس لیے تم اُسے جا کر کہہ دو کہ میں سویا ہوں“، پنی ضبط سے جلتی آنکھوں کو بند کرتے اُس نے نور کی پوری بات سنتے ہی کہا۔

”میں، میں کیوں جھوٹ بولوں؟ وہ بھی آپ جیسے بد تیز اور کھڑوس انسان کے کہنے پہ، جس نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی مجھے اتنا سارا ڈالٹا ہے“، اُس کا بہانہ سنتے ہی نور جو پہلے ہی موقع کی تلاش میں تھی ایک دم سے بھڑکی۔

”میں نے ڈالٹا نہیں تھا بس سمجھایا تھا تمہیں“، اُس کے شکوے پہ اس بارا پنی تکلیف کی وجہ سے اُس کا دل توڑنے کی بجائے زارون نے تھوڑی نرمی اختیار کی۔

”آپ نے ڈالٹا ہی تھا، وہ بھی اتنی زور سے“، اُس سے اُس کے ہی رویے کا شکوہ کرتے وہ منہ بسورے اُس کی گود میں بیٹھی۔

”جان ہو تم میری اور میں تمہیں کبھی بھی ڈالٹ نہیں سکتا“، اُس کے خود سے اپنے قریب آنے پر اذیت کے باوجود بھی زارون کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھری۔

”جان ہوں تب ہی آپ نے مجھے رولا یا۔ میں نے اتنے پیار سے فرماک پہنی کے آپ خوش ہوں گے پر آپ نے الٹامیری بے عزتی کر دی“، اُس کے سینے پہ سر رکھتے نور نے اُس سے شکایت کی جواب اُسے ناچاہتے ہوئے بھی اپنے حصار میں قید کر چکا تھا۔

”ہاں، وہ بس میں تھوڑا پریشان تھا اس لیے تم سے ایسے بات کی“، اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے زارون کو اپنے رویے اور باتوں کے غلط ہونے کا احساس ہوا جو وہ ایک دم سے اپنی بیماری کا پتا چلنے پہ اُس سے بول چکا تھا۔

”ایسی باتیں؟ زار آپ نے مجھے ڈالنا تھا اس لیے سوری بولیں مجھ سے“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے سر اٹھاتے صدمے سے اُس کا حصار توڑا۔

”اچھا ٹھیک ہے سوری میری غلطی تھی“، اپنے ہاتھوں سے اُس کے کان پکڑتے زارون نے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ با غور اُس کی آنکھوں کو دیکھا جواب اُس کی حرکت پہ اُسے گھور رہی تھیں۔

”اپنے پکڑیں میرے نہیں“، خفیٰ سے کہتے نور نے اُس کے ہاتھ ہٹاتے اٹھنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی زارون نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے بازو اُس کے گرد لپیٹے۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟ مطلب کوئی پریشان ہے تو مجھے بتائیں“، کچھ دیر خاموشی سے اُس کے دل کی دھڑکن سنتے رہنے کے بعد نور نے سر اٹھاتے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا جو اُسے آج کچھ پریشان اور ال جھاسالگ رہا تھا۔

”نہیں کوئی پریشانی نہیں۔ بس اب میں ٹھیک ہوں اور تمہاری فراک بہت پیاری لگ رہی ہے،“ اُس کے بال کندھ سے ہٹاتے زارون نے مسکرانے کی کوشش کرنے کے ساتھ ہی اُس کی تعریف کی۔

”ہونہہ فراک کی نہیں میری تعریف کرنی تھی۔ پتا نہیں زار آپ کیوں اتنے کھڑوس سے ہیں۔ مطلب، کل میں نے ایک ڈرامے میں دیکھا کہ ایسے ہی لڑکی فراک پہن کہ اور اچھا ساتیار ہو کر اپنے شوہر سے پوچھتی ہے کہ وہ کیسی لگ رہی ہے تو اُس کے شوہرنے اُس کی اتنی تعریف کی اور ساتھ اُس کی دونوں چیکس پہ ک...“، اپنی قیچی کی طرح چلتی زبان کو اُس نے کلفظ پر رکتے ہوئے بریک لگائی۔

”کیا؟ کیا، کیا چیکس پہ؟ بتادو میں بھی وہی کر دیتا ہوں“، اُسے کپڑے رکنادیکھ زارون نے سمجھ آنے کے باوجود بھی نظروں میں شرات لیے اُسے چھیڑا جو اپنی بات پہ اب خود ہی پچھتا رہی تھی۔

”وہ... کچھ نہیں کیا... دیکھیں زار احمد بھائی کب سے نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ اٹھ جائیں مجھے بھی نماز کے لیے دیر ہو رہی ہے“، کلاک پہ چار بجتے دیکھ نور نے بُری طرح پھنسنے کی وجہ سے ہکلاتے ہوئے اُسے اپنے آنے کے مقصد سے باوار کروا یا۔

”اچھا، ٹھیک ہے تم بھی اٹھ جاؤ اور اب گھر میں لگھو منے پھرنے کی بجائے چپ کر کے مجھے کمرے میں پیٹھی پڑھتی ہوئی نظر آؤ“، اُس کے شرم سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ زارون نے مزید تنگ کرنے کی بجائے اُس کے باعث رخسار پہ نرمی سے بو سہ دیا جو اپنی خواہش کا اظہار اپنی زبان سے کر چکی تھی۔

”ٹھیک ہے پڑھ لوں گی پر ارحم بھائی سے ملنے کے بعد“، اُس کا حصار ٹوٹنا دیکھ، جلدی سے اُس کی گود سے نکلتے نور نے اپنی شرط بتائی اور ساتھ ہی خود کھڑے ہوتے اُس کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھایا تو زارون نے اُسے تھامتے اپنی ساری ماہیوں اور پریشانیوں کو سائیڈ پر رکھتے صرف اُس کی خاطر چہرے پہ مسکراہٹ سجائی جو اُس کے بُرے رویے اور ڈانٹ کے باوجود بھی ناراض ہونے یا لڑنے کی بجائے سب کچھ بھلائے اُس کے قریب اس رشتے کی خاطر آچکی تھی۔

-----

”زارون پیٹا کھاں رہ گئے تھے؟ ارحم کب سے بیٹھا تمہارا انتظار کر رہا ہے“، عابدہ بیگم جو تقریباً دس، پندرہ منٹ گزر جانے کے بعد خود اُسے بلانے کے لیے ڈرائیگ روم سے نکلی تھیں انہوں نے اُسے سامنے سے آتا دیکھ کر خفگی سے کہا۔ ”جی بس وہ سویا ہوا تھا، سر میں تھوڑا درد تھا اسی لیے

دیر ہو گئی، انہیں اپنے دیر سے آنے کی وجہ بتاتے وہ ڈرائیور میں داخل ہوا جہاں ارحام کے ساتھ جنید اور مزمل بھی بیٹھے تھے۔

”السلام علیکم، کیسے ہو؟“ اپنے چہرے سے کسی قسم کا کوئی بھی تاثرد یہ بغیر زارون نے ارحام کو گلے لگایا جو اُسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

”میں ٹھیک ہوں پر! یہ تمہارا دماغ کیوں خراب ہے؟“ اُس سے الگ ہوتے ارحام نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا جو جواب دینے کی بجائے جنید کی طرف دیکھنے لگا تھا۔

”میرا دماغ کیوں خراب ہونا؟ میں نے ایسی کوئی حرکت کی ہے جو تمہیں لگا کہ میرا دماغ خراب ہے؟“ جواب دینے کی بجائے اُس نے ٹھاوساں کرتے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”حرکت؟ صحیح سے کوئی پچاس کے قریب کال کر چکا ہوں پر تم نے میری ایک بھی کال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے انکل کو کال کی تو انہوں نے بھی ریسیو نہیں کی اسی لیے میں پریشان ہو گیا کہ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے جو کوئی بھی کال ریسیو نہیں کر رہا،“ اُسے اپنی وہاں موجودگی کا مقصد بتاتے ارحام نے مزمل اور جنید کی وجہ سے اپنے غصے پہ قابو رکھتے کوئی بھی فضول بات کرنے سے خود کو روکا۔

”ہاں موبائل کو صحیح سے کوئی مسئلہ ہے پتا نہیں چلتے چلتے خود ہی بند ہو جاتا چارج بھی نہیں ہو رہا،“ جنید کی نظریں خود پہ محسوس کرتے زارون نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا۔

”یا رتونسان بتادیتا ہے انکل کا موبائل میل ہے، آنٹی کا ہے، گھر کا نمبر یا پھر تم نور کے موبائل سے ایک مسج کر دیتے کہ میرا موبائل خراب ہے تو اتنے مشکل حالات مجھے یہاں تمہاری یہ سڑی ہوئی شکل دیکھنے کے لیے آنے کی زحمت اٹھانا نہ پڑتی“، اُس کے چہرے سے کسی غیر معمولی بات کا اندازہ لگاتے ارحم نے منہ ب سورے اپنا وقت ضائع ہونے پر اُس کو کھری کھری سنائی۔

”تونہ آتے، میں نے کون سا تمہاری منت کی تھی کہ آؤ اور میری شکل دیکھو“، مزمل اور جنید کے جاتے ہی زارون نے بھی کسی لحاظ کے بغیر اُس کی بات اُسی کو لوٹائی۔

”کیا ہوا ہے؟ سچ بتانا“، اُس کے لبھ میں طنز کی ملاوٹ کو محسوس کرتے ہی ارحم نے سوال کیا۔

”کیا مطلب کیا ہوا ہے؟ یا رکھ نہیں ہوا کیوں یہ تم ہر وقت شکلی بیویوں کی طرح میرے پچھے پڑے رہتے ہو“، چہرے پر مسکراہٹ سجانے کی ناکام کوشش کرتے زارون نے اُس کی بات کو طالا۔

”ٹھیک ہے چلو باہر چلتے ہیں کافی دن ہو گئے ہیں میں نے تمہارے ساتھ اکیلے میں وقت نہیں گزارا“، خود کھڑے ہوتے ارحم نے زارون کے منع کرنے کے باوجود بھی اُسے اپنے ساتھ باہر کی جانب گھسیٹا۔

”کہاں جا رہے ہو تم دونوں؟“، انہیں ڈرائیگ روم سے نکلتا دیکھ عابدہ بیگم نے پچھے سے پکارا جو ارحم کی فرمائش پہ کباب بنانے کا لائیں تھیں۔

”ہم لوگ کچھ دیر کے لیے باہر جا رہے کچھ ضروری کام ہے۔ آنٹی پلیز آپ یہ کباب رکھ دیں میں واپس آکر کھاؤں گا اور پلیز ساتھ بریانی بھی بنالیجیے گا“، زارون کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ارحم نے جواب دیتے ایک اور فرمائش کی تو عابدہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”ٹھیک ہے بس جلدی آجانا“، نسرین کو ٹرالی واپس لے جانے کا اشارہ کرتے عابدہ بیگم نے انہیں تاکید کی جو ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بیرونی دروازے سے باہر نکل چکے تھے۔

”آفف ان لڑکوں کا بھی کوئی ایمان نہیں کبھی جلدی کباب بنالیں تو کبھی واپس آکر کھائیں گے“، ارحم کے جواب پہ خود کلامی کرتے عابدہ بیگم نے ایمان کو اٹھایا جو ابھی ابھی کمرے سے نکل کر ان کے پاس آئی تھی۔

”تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ تیار ہو جانا میں تمہیں کچھ دیر میں چھوڑ آؤں گا“، کمرے میں آتے حنا کو ویسے ہی گھر کے حلیہ میں بیٹھا دیکھ جنید نے کہا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا اور آپ کو اپنے باپ اور بھائیوں سے فرصت مل گئی ہے جو میری جانے کی فکر میں یوں پریشان ہو رہے ہیں یا پھر آپ چاہتے ہی یہ ہیں کہ میں اپنی امی کی طرف چلی جاؤں تاکہ آپ لوگ پیچھے سے جو بھی کھجڑی پکانا چاہتے ہیں وہ تسلی سے پکا سکیں“، حنا جو پہلے ہی بھری بیٹھی تھی اُس نے جنید کے بات کرتے ہی اُس کے سامنے آتے طنز کیا۔

”کوئی کھجڑی پکار ہے ہیں ہم لوگ؟ اور یہ تم مجھ سے کس لمحے میں بات کر رہی ہو؟ دماغ سیٹ ہے تمہارا؟“، جنید جو کافی دنوں سے اُس کی بد تیزیاں خاموشی سے برداشت کر رہا تھا، اُسے کے لمحے میں حقارت محسوس کرتے ہی غصے سے بھڑکا۔

”ہاں تو اور کس طرح بات کروں؟ جب سے ہم یہاں آئے ہیں کوئی ایک دن بھی سکون سے نہیں گزر اور مجھے میرا لمحہ دکھانے یا باوار کروانے کی بجائے آپ اپنارویہ دیکھیں۔ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیوں آپ ان سب لوگوں کے پیچھے لگ کر مجھ سے دور ہوتے جا رہے ہیں؟ جب سے ہم یہاں آئے ہیں نہ تو آپ کو میری پرواہ نہ ہی اپنے بیٹے کی۔ بس اپنے بھائیوں، باپ یا ماں کی فکر ہے، آنکھوں میں نبی لیے حنانے جنید کو بھی آگے سے غصے میں دیکھ تھوڑی نرمی سے کام لیا تاکہ وہ مزید اُس سے بد گمان ہو کر اپنے ماں باپ کے قریب نہ ہو۔

”یا میں کب دور ہوا ہوں تم سے؟ اور سبحان تو میری جان ہے میں بھلا تم دونوں سے غافل ہو سکتا ہوں؟“ اُسے روتا دیکھ جنید کا دل ایک دم سے موم ہوا۔

”نہیں پر! آپ کارویہ مجھے یہ محسوس کروار ہا ہے جیسے ہم دونوں یہاں بلا مقصد ہی آئے ہیں۔ نہ تو گھر میں کوئی سیدھے منہ مجھ سے بات کرتا ہے اورہ ہی سبحان کو ایمان جیسا پیار ملتا ہے۔ سب سارا وقت ایمان کو اٹھائے لوریاں دیتے پھرتے ہیں“، دوچار باتیں اپنے پاس سے لگاتے حنا نے اب جنید کو بیٹھ کے حوالے سے جذباتی کیا تاکہ وہ اُس کی سائیڈ لے۔

”ہاں، یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی ہے پر کوئی بات نہیں ایمان بھی ہماری ہی بیٹھی ہے ویسے بھی سبحان کون سا کسی کے پاس جاتا ہے؟“، اُس کی بات کی تائید کرتے جنید نے اُس کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دی کہ صرف سبحان کے کسی کے ساتھ جلدی نہ گھلنے ملنے کی عادت کی وجہ سے کوئی بھی اُسے خاص توجہ نہیں دیتا۔

”ہم ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ پر جو بھی ہے سبحان ابھی بچہ ہے اگر اسے بھی ایمان جتنی توجہ ملے گی تو وہ خود ہی سب سے منوس ہو جائے گا پر یہاں توجہ دے گا کون؟ دادا کو کاموں سے فرصت نہیں اور چچا، چھی اپنی ہی پڑھائی میں مگن ہیں“، جنید کو اپنی سائیڈ لیتا دیکھ جنید بیٹھ کی جمایت کی۔

”اچھا چھوڑو ہم ہیں ناپنے بچ کا خیال رکھنے کے لیے بس ہمیں کسی اور کی توجہ نہیں چاہیے“، اس کی باتوں میں سچائی پا کر جنید کا اپنا دل بھی بُرا ہوا پر اس پہ کچھ بھی ظاہر کرنے کی بجائے اُس نے بات ختم کرتے حنا کو اپنے ساتھ لگایا جو پھر سے جھوٹے آنسو بہاتے جنید کو اپنی باتوں سے متفق کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

---

”ماما یہ ارحم بھائی کہاں ہیں؟ چلے گئے ہیں کیا؟“ نور جو زارون کے نیچے آتے ہی خود منہ ہاتھ دھونے کے لیے کمرے میں چلی گئی تھی تقریباً دس منٹ بعد وہ نیچے آئی تو ہر طرف خاموشی محسوس کرتے عابدہ بیگم کی جانب بڑھی جو ایمان کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔

”ہاں چلا گیا اور ساتھ زارون کو بھی لے گیا“، صوفے پہ پڑاٹیڈی بیسراٹھا کرا ایمان کو پکڑاتے عابدہ بیگم نے اُس کی بات کو جواب دیا۔

”کیوں؟ زار کو کیوں لے گئے؟ میرا مطلب سب خیریت تھی؟“ اُن کے قریب بیٹھتے نور نے ایمان کو پکڑا جو اُسے دیکھتے ہی گود میں آنے کے لیے بے تاب ہو گئی تھی۔

”ہاں، پتا نہیں ان لڑکوں کا کون سا کچھ پتا چلتا ہے۔ تم پر بیشان نہ ہو تھوڑی دیر میں واپس آجائیں گے“، اُسے تسلی دیتے عابدہ بیگم نے نسرین کو آواز لگائی جو کب سے اُن کے لیے چائے بنانے کی تھی۔

”بھا بھی لوگ کمرے میں ہیں؟“، نہیں واپس اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ نور نے ایک اور سوال کیا۔

”ہاں کمرے میں ہیں اور تمہارا کل پیپر تو نہیں ہے؟ مطلب اگر تم نے پڑھنا نہ ہو تو تھوڑا میرا رات کا کھانا بنانے میں ہاتھ بٹا دینا“، اپنی طبیعت میں کچھ بے زاری محسوس کرتے عابدہ بیگم نے اُس سے کہا جو کل پیپر ہونے کے باوجود بھی مدد کے لیے حامی بھر گئی۔

”پیپر ہے پر میری تیاری مکمل ہے اس لیے آپ پر بیشان نہ ہوں جو بھی کام ہے بتائیں میں آپ کی مدد کر دوں گی“، ایمان کو نیچے اُتارتے نور نے عابدہ بیگم کے چہرے پہ تھکن کے آثار دیکھ منع کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”اچھا ٹھیک ہے تم بس نسرین کے ساتھ مل کر سبزیاں وغیرہ کاٹ لینا، ارجمند بھی بریانی کا بول کے گیا ہے تو اس کے لیے بھی ساری تیاری کر لینا میں بس چائے پی کے کچھ دیر آرام کروں گی پھر اٹھ کے کھانا پکالوں گی“، نسرین کے ہاتھ سے کپ لیتے انہوں نے نور کو ہدایت کی۔

”جی ٹھیک ہے آپ پریشان نہ ہوں ہم سب کر لیں گے“، انہیں مطمئن کرتے نور نے ہما کے آواز دینے پہ ایمان کو اٹھایا اور اسے اُس کے حوالے کرنے دوسری جانب بڑھی تاکہ عابدہ بیگم کچھ دیر سکون سے آرام کر سکیں اور وہ بھی اپنا کام پہ دھیان دے سکے۔

---

”اب بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ ڈرائیور کو ایک جگہ گاڑی روکنے کا کہتے ارحم نے زارون کو باہر نکلنے کا بولا اور اسے اپنے ساتھ لیے اور پن ائیر ریஸٹورنٹ میں قدرے ایک پر سکون جگہ پہ جا بیٹھا۔ ”کیسا مسئلہ؟ یار میں نے تمہیں بولانہ کچھ نہیں ہے تو کیوں میرے پیچھے پڑے ہو، اور تم مجھے یہاں یہ پوچھنے کے لیے لائے تھے؟“ ایک نظر اس جگہ کو دیکھتے زارون نے ماٹھے پہ بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

”بات مت بدلو اور جو پوچھ رہا ہوں سچ سچ بتاؤ“، اُس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ارحم نے اپنی ضد برقرار رکھی تو زارون نے ایک گہری سانس لیتے اُس کی طرف دیکھا۔

”یار کچھ نہیں ہے اور یہ کیوں تم بار بار ایک ہی بات کر کے میرا اور اپنا موڈ خراب کر رہے ہو“، زارون نے اُس کے اصرار پہ تھوڑا چڑتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

---

”اچھا ٹھیک ہے اب نہیں پوچھتا۔ جب تمہارا دل ہو بتا دینا کہ کیا مسئلہ ہے“، ویٹر کو اشارے سے بلا تے ارحم نے اُسے بے زار دیکھ مزید اصرار کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فیصلہ اُس کے ہاتھ میں دیتے خاموشی اختیار کی۔

”یونیورسٹی جانے کا کیا ارادہ ہے؟“ اُس کے خاموش ہوتے ہی زارون نے بات بدلتا کہ اُس کا دھیان بٹ سکے۔

”ہاں بس یہ بازو کا ذخیرہ ٹھیک ہو جائے پھر ان شاء اللہ با قاعدگی سے آؤں گا“، ویٹر کو تین جو س لانے کا آرڈر دیتے اُس نے زارون کی بات کا جواب دیا۔

”تیسرا کس کے لیے؟ ہم تو دلوگ ہیں“، اُس کے عجیب کام پر زارون نے اُسے یادداہانی کروائی۔

”ہاں پتا ہے اور تیسرا ڈار یور کے لیے منگوایا ہے وہ بھی کب سے میرے ساتھ ہے“، اُس کی حرمت کم کرتے ارحم نے اپنے موبائل پر آنے والی کال کو منقطع کیا۔

”بڑی بات ہے، یہ تم کب سے اتنے عقل مند ہو گئے؟“ اُس کی فراغ دلی پر مسکراتے زارون نے اُس کا مذاق اڑایا۔

”تب سے جب تم نے مجھ سے باتیں چھپانی شروع کی ہیں۔ پتہ کیا مسئلہ ہے یہ جو تمہاری آنکھیں ہیں نا یہ کبھی جھوٹ نہیں بولتیں اور شائد تمہارا سب سے بڑا خسارہ یہی ہے کہ جب تم جھوٹ

بولتے ہو تو یہ تمہارا ساتھ بھی نہیں دیتیں اسی لیے مجھے فوراً سے پتا چل جاتا ہے کہ کس وقت تمہارے دماغ میں کون سی کھجڑی پک رہی ہے، اُس کی کھوکھلی مسکراہٹ پہ ایک بار پھر سے اپنی بات کا رخ اُسی جانب کرتے ارحم نے سوالیہ نظرؤں سے اُسے دیکھا۔

”اُفف تم اور تمہارے یہ فلسفے۔ توبہ ہے یاد تم تو میری بیوی سے بھی کہیں زیادہ شکی ہو۔ وہ تو پھر کسی بات کو چھوڑ دیتی پر تمہیں بس ایک بار میری کوئی کمزوری پتا چل جائے تو بس ہاتھ دھو کر پچھے ہی پڑ جائے مگر اس بار میں بھی پکا ہوں“، اُس کے پلٹ کر پھر سے اسی بات پہ آنے پر زارون نے

بھی اپنے ارادے کو مضبوط رکھتے اُسے اپنی بیماری کے متعلق کچھ بھی بتانے سے غرض برتا۔

”ٹھیک ہے پھر جب تمہارا دل ہو بتا دینا کیونکہ مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ تم ضرور مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ کوئی معمولی بات نہیں ہے اگر معمولی ہوتی تو تم فوراً سے مجھے بتا دیتے“، ویٹر کے آتے ہی خاموش ہوتے ارحم نے ایک جوس کا گلاس اٹھایا اور ڈرائیور کو دینے کے لیے اپنی گاڑی کی جانب بڑھا۔

”اُفف توبہ ہے پتا نہیں اس کی آنکھوں میں کون سا سکینز لگا جو دیکھتے ہی سمجھ جاتا کہ مجھے کوئی پریشانی ہے“، اُس کی پشت کو گھورتے زارون نے خود کلامی کی اور معدے میں ہونے والی جلن کی وجہ سے اُس کی واپسی کا انتظار کیے بغیر ہی گلاس اٹھاتے جوس کے سپ لینے لگا۔

”واہ جی واہ آج تو بڑے بڑے لوگ کچن میں موجود ہیں“، حنا جو سمجھان کا دودھ لینے آئی تھی اُس نے نور کو نسرین کے ساتھ کام کرتا دیکھ طنز کیا۔

”جی بس ماما کی طبیعت تھوڑی خراب تھی اسی لیے....“، نور نے اُس کے قریب آتے ہی اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”اسی لیے تم نے سوچا کہ کیوں نامی کے سامنے تھوڑے نمبر بنالیے جائیں۔ ویسے یہ تم اور زارون کتنے چالاک ہونا، مطلب کیسے تم نے امی ابو کو اپنے ہاتھوں میں کیا ہوا ہے۔ جیسا تم دونوں چاہتے ہو گھر میں ویسا ہی ہوتا اور ایک ہم لوگ ہیں اتنے سالوں ساتھ رہنے کے باوجود بھی یہ گھر سیکھ نہیں پائے“، طنز پڑ کرتے اُس نے نور کی طرف دیکھا جو خاموشی سے سرجھ کائے بیٹھی تھی۔ ”ویسے کیسے کر لیتی ہو تم یہ سب؟ میرا مطلب ایک تو تم گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی اوپر سے کوئی کام کا ج بھی نہیں کرتی پھر بھی آج تک امی نے تمہارے خلاف زبان سے ایک حرف ادا نہیں کیا۔ کوئی تعویذ وغیرہ ڈالیں ہیں؟ یا ویسے ہی بیٹھ کی محبت نے امی کا دماغ اور آنکھیں دونوں ہی بند کر دیں

ہیں؟، نور کی خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے اُس نے اُسے بھڑکانے کی کوشش کی جو گھر سے بھاگ لڑ کی پرائیکی، نظروں میں حیرت لیے اُس کی طرف دیکھنے لگی۔

”بھا بھی میں گھر سے بھاگ لڑ کی نہیں ہوں۔ زار مجھے عزت کے ساتھ میرے گھر سے نکاح کر کے لائیں ہیں“، اُس کے اتنے بڑے الزام پہ آنسو پیتے نور نے اپنے دفاع میں کمزور سی مزاحمت کی۔

”ہاہاہا بس کرو لڑ کی یہ دلیل اور وضاحتیں کسی اور کو دینا۔ میں سب جانتی ہوں کہ تم کس طرح یہاں آئی ہو اس لیے میرے سامنے یہ زیادہ پارسا بننے کی ضرورت نہیں ہے“، اُس کی بات سننے ہی ایک طنزیہ قہقہہ لگاتے حنانے دانت پسیے اور دودھ لیتے کچن سے باہر نکلی تو نور نے آنکھوں کے سامنے دھنڈ آجائے کی وجہ سے ہاتھ میں کپڑی چھری بے دھیانی میں سبزی کی بجائے اپنے ہاتھ پہ چلائی۔

”لبی جی آپ کے ہاتھ سے خون نکل رہا ہے“، نسرین جو سر جھکائے خاموش بیٹھی حنا کی تلمذ کلامی کو سن رہی تھی ایک دم سے ٹیبل پہ خون کے قطرے دیکھ اٹھ کے اُس کے قریب آئی۔

”نهیں، کچھ نہیں ہوا۔ آپ یہ کام ختم کریں میں خود ہی صاف کر لوں گی“، مزید وہاں رکنے کی بجائے نور نے اُسے تسلی دی جو اُس کا ہاتھ صاف کرنے کے لیے کوئی کپڑا ڈھونڈ رہی تھی۔

”نہیں بی بی جی آپ کو زیادہ لگی ہے۔ آپ بیٹھیں میں اس کو صاف کرنے کے لیے کوئی دوائے کر آتی ہوں“، انسانیت کے ناتے نسرین نے اُسے بٹھانے کے ساتھ ہی کچن سے باہر نکلتے عابدہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا تاکہ اُن سے کوئی دوائے کرنور کے ہاتھ میں لگاسکے جو اپنے زخم سے بالکل لا پرواگم صم سی بیٹھی ابھی تک حتاکی باتیں سوچ رہی تھی۔

---

”نور یہ کیا کیا تم نے؟ میں نے تمہیں اس لیے کام کرنے کا نہیں کہا تھا کہ اپنا ہاتھ زخمی کر کے بیٹھ جاؤ“، نسرین کے ساتھ ہی کچن میں داخل ہوتے انہوں نے نور کی بے دھیانی پر اُسے ڈالنٹے ہوئے ہاتھ میں کپڑا ڈبہ ٹیبل پر رکھا۔

”نہیں ما ما زیادہ نہیں لگی“، اُن کی آواز پر ہوش میں آتے نور نے اپنا خون سا بھرا ہوا ہاتھ دیکھا تو اُسے اور رو نا آیا۔

”زیادہ نہیں ہے تو کم بھی نہیں بیٹھا۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ دھیان سے کام کیا کرو“، ڈبے سے دوائی نکال کر روئی پر لگاتے انہوں نے خون صاف کیا تو نور نے دبی سی آواز میں سسکتے اُن کی طرف

دیکھا جواب اُس کے چہرے پہ تکلیف کے آثار دیکھ زخم صاف کرنے کے ساتھ ساتھ پھونک مار نے لگی تھیں۔

”دیکھو تو کتنا زخم کر لیا ہے۔ میرا ہی دماغ خراب تھا جو میں تمہیں کام کا بول گئی“، مرہم لگا کر پڑی کرتے عابدہ بیگم نے خود کو کوسا۔

”اما آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں، میں ٹھیک ہوں اور زخم بھی اتنا زیادہ نہیں ہے۔ پلیز آپ ایسے خود کو برا بھلا بول کر مجھے شرمندہ مت کریں“، ان کے چہرے اور باتوں سے اپنے لیے فکر دیکھ نور نے اپنے آنسو صاف کرتے انہیں تسلی دی۔

”اچھا بس اب اٹھو، جا کر آرام کرو یہ کام میں اور نسرین مل کے کر لیں گے“، اُسے پھر سے چھری کی طرف ہاتھ بڑھاتا دیکھ کر انہوں نے ٹوکا۔

”اما میں ٹھیک ہوں آپ پلیز پریشان نہ ہوں اور میں کرلوں گی۔ آپ جائیں آرام کریں“، انہیں تسلی دیتے نور کو نسرین پہ غصہ آیا جو اپنے ساتھ ساتھ عابدہ بیگم کو بھی لے آئی تھی۔

”نهیں، بس بہت کر لیا آرام میں نے۔ تم اٹھو جاؤ اپنے کمرے میں“، اُس کے ہاتھ سے چھری لیتے عابدہ بیگم جن کے پہلے ہی سر میں درد تھا ایک دم سے اُس کا خون سے بھرا ہاتھ دیکھ مزید ہونے لگ

گیاتب ہی انہوں نے تھوڑی سختی سے نور کو وہاں سے جانے کو بولا تو وہ خاموشی سے کوئی بھی جواب دیے بغیر اُن کی ڈانٹ پہ دلب رداشتہ ہوتے اُٹھ کر کچن سے نکل گئی۔

”بس ایک کام کہہ دوسرا تھا ہی کوئی ناکوئی کارنامہ سرانجام دے دیتی ہے“، اُس کے جاتے ہی کرسی پہ بیٹھتے عابدہ بیگم نے منہ میں بڑ بڑاتے نسرین کی طرف دیکھا جوا بھی تک کھڑی تھی۔

”بیٹھ جاؤ تم یا تمہیں بھی کام سے جان چھڑوانے کا کوئی بہانہ چاہیے“، اپنی طبیعت کی وجہ سے لمحے میں بے زاری لیے انہوں نے اُسے گھورا جو ان کی بات سنتے ہی فوراً سے بیٹھتے سبزی کا ٹنگی تھی۔

”بی بی جی وہ مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا۔ میرا مطلب پتا نہیں مجھے یہ بات آپ کو بتانی چاہیے بھی یا نہیں“، کچھ سینکڑ زا پنے دماغ میں الفاظ ترتیب دیتے نسرین نے عابدہ بیگم کو مخاطب کیا جواب نور کی چھوڑی ہوئی گا جریں کا ٹنے میں مصروف تھیں۔

”کیا بات ہے بولو اور جو بات بتانے والی نہیں ہوتی پھر اُس کے لیے تمہید باندھ کر دوسرے کو کشکش میں مبتلا نہیں کرتے“، اپنا ہاتھ روکتے وہ پوری طرح سے اُس کی جانب متوجہ ہوئی جو ایک نظر کچن کے دروازے کی جانب دیکھ کر اپنا گلا صاف کرنے لگی۔

”وہ جی چھوٹا منہ اور بڑی بات، میں جانتی ہوں مجھے آپ کے گھر کے معاملے میں نہیں بولنا چاہیے پر جی، چھوٹی بی بی کے ساتھ حنا باجی کارویہ دیکھ میرا دل خون کے آنسو رورہا ہے اسی لیے میرے دل نے یہی مناسب سمجھا کہ میں آپ کو ساری بات بتا دوں“، ایک بار پھر سے تمہید باندھتے اُس نے اپنی مداخلت پر صفائی پیش کی۔

”چھوٹی بی بی؟ نور کی بات کر رہی ہو تم؟ کیا ہوا؟ حنا نے کچھ بولا ہے کیا؟“ اُس کے پہلیاں بجھوانے پر عابدہ بیگم نے تیوری چڑھاتے تصدیق چاہی۔

”جی انہی کی بات کر رہی، ابھی کچھ دیر پہلے حنا باجی کچن میں آئیں تھیں انہوں نے آتے ہی چھوٹی بی بی کو باتیں سنانا شروع کر دیں۔ توبہ توبہ بی بی جی ایسے الفاظ انہوں نے چھوٹی بی بی کو کہے کہ نہ پوچھیں۔ یقین جانیں اگر چھوٹی بی بی کی جگہ اور کوئی ہوتا پورے گھر میں فساد ڈال دیتا پر نہ جی نہ انہوں نے حنا باجی کو پلٹ کہ ایک جواب تک نہیں دیا بس خاموشی سے سب سن کر خود اپنے آپ کو ہی تکلیف دے ڈالی“، کانوں کو ہاتھ لگاتے نسرین نے دوچار باتیں اپنے پاس سے لگاتے سارا معاملہ تفصیل سے عابدہ بیگم کو بتایا جو بلا وجہ ہی نور پر اپنا غصہ نکال چکی تھیں۔

”بس اب یہ بات یہیں ختم کر دینا یہ نہ ہو پورے محلے میں ہمارے چرچے کیے ہوں“، اُس کی پوری بات سننے کے بعد عابدہ بیگم نے اپنا غصہ ضبط کرتے اپنے گھر کی بات کہیں بھی باہر کرنے سے منع کیا۔

”توبہ کریں بی بی جی نسرین مرتبی مر جائے گی پر آپ کے گھر کی بات کبھی کسی سے نہیں کرے گی“، انہیں اپنا یقین دلاتے وہ ہما کے آنے کی وجہ سے بات ادھوری چھوڑتے خاموشی سے پیاز کا ٹنگ لگی تو عابدہ بیگم نے بھی چپ سادھے اٹھ کر فریج میں سے گوشت نکال کر باہر رکھا۔

تقریباً تین چار گھنٹے ساتھ گزارنے کے بعد ارحام نے زارون کو گھر چھوڑا اور اُس کے اصرار کے باوجود بھی آئمہ بیگم کی بار بار آنے والی کالز کی وجہ سے پھر چکر لگانے کا بولتے ڈرائیور کو چلنے کا کہا۔ ”افف بہت طامہ ہو گیا ہے پتا نہیں نور نے کچھ پڑھا بھی ہو گایا نہیں“، گھر میں داخل ہوتے اپنے موبائل پہ وقت دیکھتے وہ منہ میں بڑا بڑا یا۔

”زارون تم نے اتنا طامہ کہاں لگادیا اور ارحام کہاں ہے؟ وہ ساتھ نہیں آیا“، عابدہ بیگم جوان ہی کے انتظار میں بیٹھی تھیں اُسے اکیلا آتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔ ”نہیں، وہ آنٹی کی بار بار کال آر ہی تھی

اس لیے وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا اور کہہ رہا تھا کہ پھر چکر لگاؤں گا، ان کے قریب آتے انہیں ساری تفصیل بتاتے زارون نے گھر میں خاموشی محسوس کرتے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

”سب سو گئے ہیں کیا؟“

”نہیں جنید اور مزمل اپنی اپنی فیملی کے ساتھ باہر گئے ہیں اور تمہارے ابوکمرے میں ہیں،“ اس کی بات کا جواب دیتے عابدہ بیگم نے اُس سے کھانے کا پوچھا۔

نہیں مجھے بھوک نہیں ہے، ہوئی تو میں خود ہی کھالوں گا۔ آپ جائیں اپنے کمرے میں آرام کریں مجھے آپ کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی، ان کے چہرے پہ تنہکن دیکھ کھانے سے منع کرتے زارون نے انہیں آرام کا مشورہ دیا۔

”ہاں بس شام سے سر میں درد ہے۔ بی پی بھی ہائی ہے، میں نے دوائی لی ہے بس اب آرام کروں گی تو ٹھیک ہو جائے گا،“ اُسے اپنی طبیعت کا بتاتے عابدہ بیگم نے اُسے لامٹس وغیرہ بند کرنے کا بولتے اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھائے تو زارون بھی تمام غیر ضروری لامٹس آف کرتے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

”یہ کہاں گئی؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی چاروں طرف نظر دوڑاتے زارون نے دروازہ بند کیا اور نور کی تلاش میں واش روم کے دروازہ پہ ہاتھ رکھا جو کھلا تھا۔

”پتا نہیں اس چڑیل کو ہر رات کیا دورہ پڑتا ہے، اُسے دیکھنے کے لیے بالکلوں کی جانب بڑھتے وہ منہ میں بڑھا یا۔

”ہونہ بس سارا دن یہی ایک کام ہے۔ پڑھنے کا کہہ دو تو میڈم کو ساتھ ہی نیند آ جاتی“، کتاب اپنے اوپر رکھے وہیں چیسر کی بیک سے سرٹکائے اُسے سوتا دیکھ زارون نے خود کلامی کی اور قدم آگے بڑھاتے اُس کے قریب آیا جس نے ابھی تک صحیح والی فرماں پہنی ہوئی تھی۔

”نور اٹھو شاباش اندر جا کر لیٹو یہاں سردی ہے“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلاتے زارون نے موسم میں بڑھتی خنکی کی وجہ سے اُسے جگایا جو ایک بار آنکھیں کھول کر اُسے دیکھتے پھر سے بند کر چکی تھی۔

”نور؟ اٹھ جاؤ“، اُسے پھر سے سوتا دیکھ زارون نے آواز دی۔

”زار کیا ہے آپ کو، کیا ہر وقت آپ مجھ پہ حکم چلاتے رہتے ہیں۔ نور اٹھ جاؤ، نور پڑھ لو، نور سو جاؤ، حد ہے بس مجھ معصوم کو کہیں سکون مت کرنے دیجیے گا“، اپنی نیند خراب ہونے کی وجہ سے چڑتے نور نے غصے سے بھری آنکھوں سے اُسے دیکھا جس کا دھیان اب اُس کے پٹی بندھے ہاتھ پہ تھا۔

”یہ کیا ہوا؟“ اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے زارون نے جلدی سے اُس کا ہاتھ تھاما۔

”کچھ نہیں ہوا، سبزی کاٹ رہی تھی تو چھری لگ گئی“، جتنے تھمل سے نور نے اُس سے اپنا ہاتھ چھڑ رواتے بتایا زارون نے اُتنے ہی غصے سے اُسے گھورا۔

”کتنی بار کہا ہے کہ کام دھیان سے کیا کرو اور جو کام نہیں کرنا آتا جواب دے دیا کرو پر تم میں اثر نام کی کوئی چیز نہیں۔ بس ہر وقت کوئی نیا کارنامہ سرا نجام دیے رکھا کرو“، پٹی کھول کر زخم کا جائزہ لیتے اُس نے ناچاہتے ہوئے بھی لبھ میں سختی سموتے اُسے ڈالنا جو پہلے ہی حنا کے طنز اور عابدہ بیگم کی ڈانٹ سے خائف تھی۔

”ہاں میں پا گل ہوں جسے کوئی کام کرنا نہیں آتا اور کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو میری فکر کرن کی۔ جسے دیکھو ہر وقت مجھے ہی ڈانٹا رہتا ہے“، اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچتے نور نے غصے کے ساتھ ساتھ آنکھوں میں نمی لیے شکوہ کیا تو زارون نے اعصاب کو نارمل کرتے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

”مطلوب؟ لگتا ہے امی سے بھی ڈانٹ پڑی ہے میرے بے بی کو“، اُس کے خفگی سے پھولے ہوئے گال دیکھ کر زارون نے اندازہ لگایا۔

”جس سے مرضی پڑی ہو آپ کو کیا۔ آپ جائیں ارحم بھائی کے ساتھ گھومیں پھریں“، اُس سے نظریں ملائے بغیر نور نے اپنا سارا غصہ اُس پہ نکالا جواب اُس کی خفاسی صورت دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”اچھا اندر چلو، پھر میں تمہاری ساری شکایتیں سکون سے سنتا ہوں“، ٹھنڈی ہوا کا جھانک اُس کے جسم سے ٹکرایا تو اُس نے کہنے کے ساتھ ہی خود اٹھتے نور کے آنکھیں نکالنے کے باوجود بھی اُسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لیے کمرے میں آگیا۔

”مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی بس سونا ہے اس لیے آپ بھی سو جائیں“، بالکونی کی طرف کھلتا دروازہ بند کرتے وہ اُس کے قریب آیا تو نور نے کمفرٹر اور ہتھے دوسری طرف سائیدلی۔

”اچھا ٹھیک ہے نہ کرو بات پر مجھے ہاتھ تود کھاؤ“، دراز سے دوائیوں والا ڈبہ نکالتے زارون نے اُس میں سے ایک دوائی نکالی تاکہ اُس کے زخم پہ لگا سکے۔ ”نہیں، مجھے نہیں دکھانا“، اُس نے ہاتھ پکڑا تو نور نے فوراً سے واپس کھینچتے نخڑے سے کہا۔

”ٹھیک ہے نہ د کھاؤ۔ میں بھی جو چاکلیٹس لے کر آیا ہوں وہ صحیح ایمان اور سبحان کو دے دوں گا“، اُسے سید حمی طرح اپنی بات مانتانہ دیکھ زارون نے لاچ دیا۔

”تودے دیں، میرے پاس پسیے ہیں میں خود لے لوں گی“، رخ اُس کی جانب کیے بغیر ہی نور نے جواب دیا تو زارون نے اُس کی ہٹ دھرمی دیکھ خود ہی اُسے سیدھا کیا۔

”بس پٹی کرو والو بعد میں جو تم کہو گی میں ویسا ہی کروں گا“، اُس کا ہاتھ پکڑتے زارون نے اُس کے کچھ بولنے سے پہلے ہی زخم پہ دوائی لگائی۔

”بُرے ہیں آپ، ہائے اللہ جلن ہو رہی ہے“، آنکھوں میں آنسو بھرتے وہ دبی سی آواز میں چیختنے اٹھ کر بیٹھی۔

”ہاں تو کٹ لگا ہے اور کٹی ہوئی جگہ پہ کچھ بھی لگے تو جلن تو ہوتی ہی ہے“، روئی اٹھاتے زخم پہ پھونک مارتے زارون نے ڈبے میں پڑی ٹیوب نکال کر لگائی اور پٹی باندھنے لگا۔

”اتنی بھی نہیں ہوتی، مامانے بھی لگائی ہی تھی پر مجھے پتا آپ نے جان بوجھ کر زیادہ دوائی لگائی تاکہ مجھے جلن ہو“، اُسے مہارت سے پٹی باندھتا دیکھ نور نے ہمیشہ کی طرح سارا الزام اُس پہ لگایا۔

”ہاں، میں تو سب کام جان بوجھ کر کرتا“، ڈبہ واپس دراز میں رکھتے اُس نے نور کے الزام کی تصدیق کی اور لائٹ آف کرتے اپنی جگہ پہ آکر لیٹ گیا تو وہ بھی غصے سے دوسری طرف کروٹ لیتے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

کچھ دیر یو نہیں لیٹے رہنے کے بعد بھی جب دوسری طرف خاموشی برقرار رہی تو نور نے تھک ہار کر خود ہی اُسے مخاطب کیا۔

”زار سو گئے ہیں کیا؟“ اُس کی آنکھوں پہ دھرا ہاتھ دیکھ نور نے تصدیق چاہی۔

”نہیں، اٹھا ہوا ہوں“، اپنا بازو ہٹاتے اُس نے نور کی طرف دیکھا جو کوئی بھی بات کیے بغیر اُس کے قریب آتے سر اُس کے کندھے پر رکھ چکی تھی۔

”سوری وہ مجھے پتا نہیں کیوں غصہ آگیا تھا“، بازو اُس کے گرد لپیٹنے نور نے اپنے رویے کے لیے معدرت کی۔

”اچھا، کوئی بات نہیں اور امی کی بات کا غصہ نہ کیا کرو وہ تو تمہیں تمہاری بھلانی کے لیے کہہ دیتی ہیں“، اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیتے زارون نے اُسے شر مندہ دیکھ سمجھایا۔

”نہیں، میں نے ماما کی بات پہ غصہ نہیں کیا وہ تو بس ایسے ہی...“، حنا کا نام لینے سے پہلے ہی اُس نے اپنی زبان کو بریک لگاتے بات ادھوری چھوڑی۔

، اچھا بس ایسے بھی غصہ نہ کیا کرو، قسم سے پہلے ہی چڑیل ہو غصہ کرتی تو بالکل ڈائن لگتی وہ بھی خون پینے والی“، نظروں میں شرارت لیے زارون نے اُس کی ناک دبائی جو ڈائن لفظ پر سکر چکی تھی۔

”برے ہیں آپ“، اُس کے سینے پہ ہاتھ مارتے نور نے مصنوعی خفگی سے اُسے گھورا جواب مسکراتے ہوئے اُسے اپنے حصار میں لے چکا تھا۔

”جان ہو تم میری بس سو جاؤ اب، مجھے بھی نیند آرہی ہے“، کمفرٹر ٹھیک کر کے اُس کے اوپر دیتے زارون نے کہا تو نور نے بھی مزید لڑنے کی بجائے اُس کی قربت میں پر سکون ہوتے آنکھیں موند لیں۔

-----

”جبہ بیٹا کب تک خود کو یوں کمرے میں بند رکھو گی، چلو اٹھوشا باش باہر آؤ“، صحیح آفس جانے سے پہلے اُس کے کمرے میں آتے آندی صاحب نے شفقت سے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے سمجھایا جس کی سو جھی ہوئی سرخ آنکھیں رات بھر جاگ کر روتے رہنے کی داستان بہت واضح الفاظ میں سنا رہی تھیں۔

”جی، بس بچے سور ہے تھے۔ میں بھی ابھی اٹھی ہوں اس لیے باہر نہیں آئی“، ان سے نظریں چراتے حبہ نے اپنے لبجے کو ہموار کھتے اپنے کمرے میں بند ہونے کی وضاحت دی۔

”ہم جانتا ہوں اسی لیے تو خود تمہیں منانے آیا ہوں“، اُس کے جھوٹ پہ مسکراتے آفندی صاحب اُس کے سامنے ہی بیڈ پہ بیٹھ گئے۔

”نہیں ابو میں ناراض نہیں ہوں بس تھوڑا غصہ تھا وہ بھی ختم ہو گیا“، ان کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی حبہ نے اُس موضوع پر کوئی بھی بات کرنے سے کتراتے دوپٹہ اپنے سر پہ ٹھیک سے جمایا۔ ”دیکھو بیٹا جیسے تم اپنے بچوں کے لیے حساس ہوں ان کا اچھا برا سوچتے انہیں کچھ کاموں کے کرنے اور کچھ نہ کرنے کی اجازت دیتی ہوں اسی طرح تمہاری ماں بھی تمہارے لیے فکر مند ہے اور کل اُس نے جو کچھ بھی کہا وہ صرف تمہاری فکر میں کہا ورنہ اُس کا اپنادل بھی بچوں کو اُس جانور کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہے“، ایک نظر اُس کے افسردہ چہرے کو دیکھتے آفندی صاحب میں گھر میں پھیلی خاموشی کو تواریخ اُسے سمجھایا جو کل سے ان سے اور سارہ بیگم سے خفا ہو کر خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھی تھی۔

”فکر؟ ابو، امی کونہ کل میری فکر تھی اور نہ آج ہے اگر انہیں میری ذرا سی بھی پرواہوتی تو وہ ایسی بات کرنے سے پہلے ہزار بار سوچتیں۔ وہ پہلے بھی خود غرض تھیں اور اب بھی ہیں پر اس بار میں

اپنی طرح اپنے بچوں کو کو ان کی انا اور ضد کی نظر نہیں ہونے دوں گی۔ یہ آپ بھی سن لیں اور انہیں بھی اچھے سے بتا دیں، ”لبجے میں تلخی لیے اُس نے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر اپنے بچوں کو احتشام کے حوالے کرنے سے صاف انکار کیا۔

”میں اُسے تمہارے کہنے سے پہلے ہی سمجھا چکا ہوں اور حبہ بیٹا، سارہ نے صرف ایک سرسری سی بات کی تھی، اُس کا مطلب ہرگز بھی تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا، اس لیے پلیز یوں اپنے دل کو بد گمانی کا شکار کر کے نہ تو خود پر یشان ہو اور نہ ہی ہمیں اذیت میں مبتلا کرو“، اُس کے لبجے اور باتوں میں موجود حقارت محسوس کرتے آفندی صاحب نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”ابو کیا کر رہے ہیں آپ، پلیز ایسا کر کے مجھے شرمندہ مت کریں“، جلدی سے اُن کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے لبوں سے لگاتے حبہ کو اپنے رویے پہ شرمندگی ہوئی۔

”میں تمہیں شرمندہ نہیں کر رہا بلکہ میں خود تمہارے سامنے شرمندہ ہوں اور بے بس بھی، میں مانتا ہوں ہم سے غلطی ہوئی ہم نے تمہاری پسند کو چھوڑ کر اپنا فیصلہ تم پہ مسلط کیا پر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہر بار تم پہ اپنے فیصلے مسلط کر کے تمہیں تکلیف سے دوچار کریں گے“، اپنے ہاتھ نیچے کرتے آفندی صاحب نے چہرے پہ تکلیف کے آثار لیے اُس کے دل سے سارہ بیگم کے لیے موجود بعض کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

”اگر یہ بچے تمہیں پیارے ہیں اور ہماری بھی ان میں جان بستی ہے، اگر تم انہیں خود سے الگ نہیں کر سکتی تو کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ نہیں بیٹا، اپنی اولاد کا دکھ بڑا ہوتا پر اولاد کی اولاد کا دکھ اُس سے بھی کہیں گناہ بڑا ہو جاتا کیوں کہ اُس میں اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ اُس کے بچوں کی تکلیف کی بھی ملاوٹ ہوتی،

اس لیے کبھی بھی یہ مت سوچنا کہ ہمیں ان کا احساس نہیں۔ یہ تواب ہمیں تم سے بھی زیادہ پیارے لگتے ہیں، آنکھوں میں نمی لیے آندی صاحب نے بے بسی کے حد تک پہنچتے بیٹی کو سمجھایا جو اپنی خاموشی سے انہیں مزید اذیت دے رہی تھی۔

”جانتی ہوں پر ابوامی کو میری حالت دیکھ کر ترس نہیں آتا؟ وہ کیوں پھر سے مجھے اُسی دلدل میں دھکیلنا چاہتی ہیں جس سے پہلے ہی میں مشکل سے نکلی ہوں وہ احتشام جیسے شخص کے حوالے میرے بچوں کو کرنا چاہتی ہیں جس نے نہ کبھی مجھ سے پیار کیا، کبھی میری عزت تک نہیں کی۔ ابو وہ شخص حیوان ہے میں مر کر بھی اپنے بچوں کو اُس کے پاس جانے نہیں دوں گی“، روندی ہوئی آواز میں اپنی بات مکمل کرتے اس نے آندی صاحب کی طرف دیکھا جو با غور اُس کی ساری باتیں سُن رہے تھے۔

”مجھ میں کسی اور شخص کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے اور نہ ہی میں مستقبل میں کسی کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہوں اس لیے پلیز آپ امی کو کہیں میری فکر چھوڑ دیں اور اگر میرے یا میرے پھوٹ کا آپ پہ کوئی بوجھ پڑ رہا ہے تو مجھے بتا دیں میں کہیں جا ب کر لوں گی“، آخری بات پہ اُن سے نظریں چراتے حبہ نے لاپرواں کی تمام حدیں پار کرتے اُن سے پوچھا جو اُس کی بات سننتے بالکل سن ہو چکے تھے۔

”حبہ مجھے تم سے اس قدر بے رنجی کی امید نہیں تھی اور ابھی میں زندہ ہوں جب مر جاؤں گا تب جو دل میں آئے کرنا“، غصے سے کہتے انہوں نے وہاں رکنے کی بجائے لمبے ڈگ بھرتے باہر کارخ کیا تو حبہ نے ایک نظر بھوٹ پہ ڈالتے اپنی بے لبی پہ ایک بار پھر سے آنسو بھائے جو اُسے دن بدن کمزور کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ماں باپ سے بھی بد گمان کر رہی تھی۔

-----

”آپ اتنی صبح صحیح تیار ہو کر کہاں جا رہے ہیں؟“، آنکھیں کھولتے ہی جنید کوششی کے سامنے کھڑا دیکھ اُس نے حیرت کا اظہار کیا۔

”ابو کے ساتھ آفس جا رہا ہوں کچھ ضروری کام ہے“، مہارت کے ساتھ جھوٹ بولتے جنید نے پر فیوم اٹھا کر اپنے اوپر اسپرے کیا۔

”کیسا ضروری کام؟ میرا مطلب رات کو تو آپ نے کہیں جانے کا ذکر نہیں کیا“، اٹھ کر بیٹھتے اُس نے اپنے بال سیمینٹ سبجان کے اوپر ہاتھ رکھا جو شاید اُس کی آواز کی وجہ سے ڈر گیا تھا۔

”یار یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے بھلا، اور ابو نے تو مجھے پرسوں کا ہی بولا کہ میں اُن کے ساتھ آفس چلوں۔ دراصل اُن کے کچھ بزنس کے معاملات پھنسے ہوئے ہیں بس انہیں دیکھوں گا اور تم بے فکر ہو میں دو تین گھنٹوں میں واپس آجائوں گا“، اپنا کام چھوڑے اُس کے قریب آتے جنید نے نظر وہ میں اپنا نیت لیے اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیا جس پہ اُس کے جانے کو سن کر بل پڑ چکے تھے۔

”جلدی آجائیے گا آپ کو یاد ہے نااج ماہم نے آنا ہے اور آپ نے مجھے امی کی طرف بھی لے کر جانا تھا“، اُس کے پیار بھرے لمس پہ مسکراتے حنا نے اُسے تاکید کی۔

”جی، میری جان یاد ہے بس تم ابھی آرام کرو۔ میں تقریباً با گیارہ بجے تک واپس آجائوں گا پھر جو تم کہو گی اور جیسا کہو گی ویسا ہی ہو گا“، ایک بار پھر سے اُس کی پیشانی پہ اپنے ہونٹ رکھتے جنید نے اُسے کسی بھی شک میں ڈالنے کی بجائے بڑی نرمی اور پیار سے اپنی بات سے قائل کیا۔

”ٹھیک ہے پر اگر آپ لیٹ ہوئے تو سزا کے لیے تیار ہیے گا“، اُس کی محبت پر نظروں میں غرور لیے حنا نے دھمکی دی تو جنید نے سر خم کرتے تابعداری کا مظاہرہ کیا۔

”بس میں یوں گیا اور یوں آیا اور اس بار میں تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا“، اُٹھ کر اپنا وولٹ اور مو باکل اٹھاتے اُس نے حنا کو تسلی دی جو اُس کی بات پر مسکراتے واپس سبجان کے ساتھ لیٹ چکی تھی۔

”لاست آف کر دیں“، اُسے دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ حنا نے آواز لگائی تو جنید نے سوچ میں ہاتھ رکھتے کمرے کی لاست آف کی اور اپنی جان بخششی پر اللہ کا شکر ادا کرتے باہر آیا جہاں احمد صاحب اُسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

”یہ زارون کہاں ہے؟ ابھی تک اٹھا نہیں ہے کیا؟“، انہیں اکیلا کھڑا دیکھ جنید نے پاس آتے ہی سوال کیا۔

”اُٹھ گیا ہے، بس پانچ منٹ میں تیار ہو کر آتا ہے تم چلو ہم جب تک جا کر گاڑی میں بیٹھتے ہیں“، اُسے زارون کے متعلق بتاتے احمد صاحب نے کہا تو جنید اُن کے ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھا۔

”اُفف یہ لوگ بھی ناپتا نہیں مجھے صحیح کس قصائی کے پاس لے جانا چاہتے ہیں“، احمد صاحب کی کال پہ زارون نے ناچاہتے ہوئے بھی اٹھ کر کپڑے وغیرہ تبدیل کیے اور اب بالوں میں برش پھیرتے وہ مسلسل بڑ بڑا رہا تھا۔

”ہونہہ میں یہاں پر یشان ہوں غصے سے پاگل ہو رہا اور ان میڈم کو دیکھ لو، کیسے سکون سے نیند کے مزے لینے میں مصروف ہیں“، ٹیبل سے اپنا موبائل اور والٹ اٹھاتے اُس نے ایک نظر نور کے خوابیدہ چہرے پہ ڈالی اور ایک گہری سانس لیتے اُس کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھ گیا۔

”میں نہیں جانتا کہ جب تمہیں حقیقت پتا چلے گی تمہارا رد عمل کیا ہو گا، پتا نہیں شاید تم میری بیماری کا سُن کر مجھے اکیلا چھوڑ دو اور ہو بھی سکتا ہے کہ تمہارے اس معصوم سے دل مجھ جیسے بیمار شخص کا ساتھ نہ چھوڑنے کی خواہش پیدا ہو جائے اور تم مجھ پہ ترس کھاتے میرے ساتھ رک جاؤ“، اُس کے چہرے کے نقوش کو با غور دیکھتے وہ اپنی حالت پہ طنزیہ ہنسا۔

”پر تمہارا جو بھی فیصلہ ہوا میں اُسے دل کی گہرائیوں سے قبول کروں گا۔ میں کبھی تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گا کیوں کہ تمہارا حق ہے کہ تم مجھ سے اُس وقت کا بدلہ لوجب میں نے تمہیں تکلیف میں اکیلے چھوڑا۔ میں نے اُس وقت تمہارا ساتھ چھوڑا جب تمہیں میری سب سے زیادہ

ضرورت تھی۔ میں خود غرض ہو گیا تھا۔ میں نے دوستی کو تم پر ترجیح دی جو غلط تھا۔ میں چاہتا تو عدل کر سکتا تھا۔ میں ارحم کے ساتھ ساتھ چند بیل تمہارے لیے بھی نکال سکتا تھا۔ پر میں نے تمہیں غیروں کی طرح دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور دیکھو کتنی جلدی اللہ مجھ پر بھی وہ وقت لے آیا ہے جب مجھے تمہاری سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ہاں نور میں چاہتا ہوں کہ تم میری بیماری کا سن کر بھی مجھے نہ چھوڑو۔ تم میرے ساتھ رہو، ہاں اس بار بھی میں خود غرض ہو رہا ہوں پر! زارون علی کی جان بسنے لگی ہے تم میں، آنکھوں میں آئی نمی کے باوجود بھی مسکراتے ہوئے اُس نے اپنی محبت کا اعتراف کیا۔

”میں اس بیماری سے نہیں مرتا، تم میرے ساتھ ہوئیں تو میں اس سے بھی لڑاؤں گا“، اُس کی پیشانی پر آہستگی سے ہونٹ رکھتے وہ پھر سے مسکرا یا تو اُس کے لمس پر نور نے ہلاکا سا کسمس کاتے ماتھے پہ بل ڈالے۔

”ہونہ سوتے ہوئے بھی بس مجھے گھورتی ہی رہتی ہے۔ انسان کبھی بیمار سے بھی دیکھ لیتا ہے“، اُس کی تیوری دیکھ زارون نے بھنوئیں اچکاتے اُس کے بائیں گال پر ہونٹ رکھے۔

”زار کیا ہے آپ کو سونے دیں نا“، اس بارغصے سے اُسے پیچھے کرتے نور نے دوسری طرف کروٹ لی تو زارون نے اُس کی حرکت پہ نفی میں سر ہلا کیا اور کمفرٹ رُس کے اوپر ٹھیک سے دیتے اپنارخ دروازے کی جانب کیا۔

---

ہسپتال پہنچتے ہی ڈاکٹر نے اینڈوسکوپی سے پہلے کچھ ضروری ٹیسٹ کروانے کا بولاتا کہ تمام رپورٹس دیکھنے کے بعد وہ لوگ اُس تکلیف دہ ٹیسٹ کی جانب جائیں جسے کروانے سے اکثر لوگ گھبراہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔

”اُفف ابو اتنا خون مجھ میں ہے نہیں جتنا ان لوگوں نے ٹیسٹوں کے لیے نکال لینا“، نرس کے دو انجکشن بھر کر لے جاتے ہی زارون نے روئی سے اپنے ہاتھ پہ لگا خون صاف کیا۔

---

”ہاں مجھے بھی بھی لگ رہا پر ایک بار اس ہسپتال سے ٹیسٹ ہو جائیں تو ہمیں بھی تسلی ہو جائے گی“، اُس کی بات کی تائید کرتے احمد صاحب نے جنید کے بتانے پر وہاں کے انتظامات سے اطمینان ظاہر کیا۔

”جی بالکل ایسا ہی ہے، یہاں سہولتوں کے ساتھ ساتھ بہت سے قابل اور تجربہ کارڈاکٹرز بیسٹھتے ہیں اسی لیے میں نے اس ہسپتال کا انتخاب کیا“، احمد صاحب کو مطمئن دیکھ جنید نے مزید ان کے معلومات میں اضافہ کیا۔

”ہاں بس ان تجربہ کارڈاکٹرز کا تب ہی فائدہ جب وہ میرے بیٹے کو جلد از جلد صحت یاب کر دیں“، اُس کی بات سنتے ہی احمد صاحب نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ”ان شاء اللہ زارون جلد ٹھیک ہو جائے گا۔ اللہ کے ہاں سے اچھی امید رکھیں گے تو سب اچھا ہی ہو گا۔ کیوں بھی؟“، انہیں تسلی دیتے جنید نے اُس سے تصدیق چاہی جو احمد صاحب کی بات سن کر بالکل خاموش ہو گیا تھا۔

”جی بس جو اللہ کو منظور ہوا، ہونا تو وہی ہے“، اپنی وجہ سے اُن دونوں کو تکلیف میں دیکھ زارون کی اذیت کئی گناہ چکی تھی تب ہی آہستگی سے کہتے وہ چہرے پر چھائی مایوسی کو ختم کرنے کے لیے مسکرا یا۔

”ہاں بس سب اچھا ہی ہو گا، یہ صرف ایک آزمائش ہے اگر ہم اس سے ہار گئے تو تم جھیں کہ کچھ بھی ہمارے حق میں نہیں ہو گا پر اگر ہم نے اس کا مقابلہ کیا تو! اللہ کو شش کرنے والوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا اس لیے بس ابو آپ کو ہمت رکھنی ہے اور زارون تمہیں بھی“، ان دونوں کو ناامید اور پریشان دیکھ جنید نے ان کا حوصلہ بڑھایا جو اثبات میں سر ہلاتے کمرے میں داخل ہوتے ڈاکٹر کی جانب متوجہ ہوئے۔

”ما آپ نے زار کو کہیں دیکھا ہے؟ میرا مطلب وہ نیچے ہیں کیا؟“ نوبجے موبائل پر لگے الارم کی وجہ سے نور کی آنکھ کھلی تو اس نے زارون کو کمرے میں نہ پا کر نیچے آتے عابدہ بیگم سے اُس کے متعلق استفسار کیا۔

”ہاں وہ تو صبح ہی احمد کے ساتھ کسی کام کے سلسلے میں اُن کے آفس چلا گیا تھا، کیوں کیا ہوا؟ تمہیں بتا کر نہیں گیا؟“ اُسے پریشان دیکھ انہوں نے اندازہ لگایا۔ ”نہیں میں سوئی ہوئی تھی شاید اسی لیے نہیں بتایا“، اُن کی بات کا جواب دیتے اُس نے منہ پر ہاتھ رکھتے جمائی کو روکا۔

”اتنالیٹ کیوں اُٹھی ہو؟ مطلب تمہارا تو انچ پیپر تھانا؟“، اُس کی سستی دیکھ انہوں نے تصدیق کے لیے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”جی، آج تین بجے ہے پیپر بس اسی لیے لیٹ اُٹھی ہوں“، کلاک پہ ساڑھے نو ہوتے دیکھ نور نے تھوڑی شرمندگی سے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک تم جاؤ فریش ہو کر کپڑے وغیرہ تبدیل کرو، ماہم لوگ کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں“، اُس کا حلیہ دیکھ عابدہ بیگم نے تاکید کی تو نور نے اثبات میں سر ہلاتے جلدی سے اپنارخ اوپر کی جانب کیا۔

”نسرين تم یہ سب کام چھوڑ و اور جا کر ماہم کا کمرہ صاف کرو“، اُسے کچن میں ناشستہ بنتے دیکھ عابدہ بیگم نے تیوری چڑھائی۔

”وہ بی بی جی، میں حنا با جی کا ناشستہ بنارہی ہوں“، ہچکچاتے ہوئے نسرين نے اپنی بے عزتی کے ڈر سے عابدہ بیگم کو جواب دیا۔

”تم حنا کی نہیں بلکہ میری بات ماننے کی پابند ہوا س لیے جو میں نے بولا ہے وہ کرو اور جس کو ناشستہ کی ضرورت ہے وہ خود تھوڑے ہاتھ پاؤں چلالے یہاں کوئی کسی کا نوکر نہیں ہے“، وہ جو حنا پر کل سے برہم تھیں نسرين کی بات سنتے مزید تپتے اونچی آواز میں چلائیں۔

”جی بی بی بس میں یہ کام دومنٹ میں ختم کر کے کمرہ صاف کرتی ہوں، آپ غصہ نہ ہوں“، حنا کو کچن کی جانب آتا دیکھ نسرین نے عابدہ بیگم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”میں نے کہانا جس کو ضرورت ہے وہ خود بنالے۔ تم چلو جا کر کمرہ صاف کرو۔ ماہم لوگ کچھ دیر میں پہنچنے والے ہیں“، حنا کی پرواکیے بناء عابدہ بیگم نے آگے بڑھتے چولہا بند کیا تو چارونا چار نسرین کو اثبات میں سر ہلاتے وہاں سے جانا پڑا۔

”چھوٹی بہو کو تو آپ اپنے ہاتھوں سے ناشتے اور کھانے بنانا کر پیش کرتی ہیں اور میں نے نوکرانی کو ناشتہ بنانے کا بول دیا تو آپ سے یہ بھی برداشت نہیں ہوا۔ آخر چاہتی کیا ہیں آپ؟“ نسرین کے سامنے اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہنا نے اُس کے جاتے ہی غصے سے سرخ ہوتے عابدہ بیگم کے سامنے آئی۔

”میں کسے ناشتے اور کھانے بنائ کر دیتی ہوں اس سے تمہیں کوئی غرض نہیں ہو ناچاہیے اور رہی  
بات میرے چاہنے کی توجیسے تم نے کل نوکرانی کے سامنے نور کی بے عزتی کی اُسے فضول قسم کی  
باتیں بول کر دلبڑا شستہ کیا تو بس میں نے بھی وہی کیا تاکہ تمہیں احساس ہو کہ دوسرا لے لوگوں  
کے سامنے اپنوں کی بے عزتی کرنا اور انہیں نیچا دیکھانا کیسا ہوتا ہے“، دونوں ہاتھ باندھتے عابدہ  
بیگم نے بے خوفی سے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے جواب دیا جواب اپنی تمام حدود پار کر چکی تھی۔

”اوو تو یہ بات ہے مطلب آپ کو آپ کی چھوٹی بہونے سب کچھ بتا دیا؟ ویسے میں نے غلط تو کچھ نہیں کہا تھا پھر بھی پتا نہیں کیوں آپ کو اتنی آگ لگی ہے“، چہرے پہ طنزیہ مسکراہٹ سجائے حنا کو عابدہ بیگم کے رویے کے پیچھے وجہ کی سمجھ آئی تو اُس نے اپنی صفائی دینے یا شرمندہ ہونے کی بجائے مزید بد تمیزی سے کام لیا۔

”ہاں بالکل کسی کا دل د کھانا اور تمہت لگانا غلط نہیں ہے۔ بس تمہیں جو ٹھیک لگتا ہے کرو پر جب تمہاری آنکھوں کے آگے سے انا اور حسد کا پردہ ہٹے گا تو تم بہت زیادہ پچھتاوگی“، اُس کی نظر وہ میں اپنے لیے حقارت دیکھ عابدہ بیگم نے اپنی بات مکمل کی اور چو لہابند کرتے مزید اُس کے منہ لگے بغیر نسرین کو دیکھنے کے لیے کچن سے باہر نکل گئیں۔

”اس نسرین کو تو میں دیکھ لوں گی اور ساتھ اس بڑھیا کو بھی“، اُن کے جاتے ہی حنانے دانت پیتے خود کلامی کی اور ایک نظر چو لہے پہ پڑی چائے کو دیکھتے، ناشستہ کرنے کا رادہ ترک کیا اور غصے سے پاؤں پٹختے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

-----

آفندی صاحب کے کمرے سے جاتے ہی کچھ دیر تک آنسو بہانے کے بعد اسے اپنے رویے کے تنخ ہونے کا احساس ہوا جسے اُس نے سارہ بیگم کی باتوں اور ارادوں سے خوف زدہ ہو کر قبول کرنے کی بجائے جھٹلا یا۔

”نہیں، میں اس بار نرمی اختیار کر کے امی کو اپنے بچوں کی زندگی تباہ کرنے کا موقع نہیں دوں گی“، شرمندگی کے احساس کی ہلکی سی رمق کو وہیں پہ دباتے اُس نے اپنے دل کے ساتھ ساتھ اپنے لہجے کو بھی مضبوط کیا جو بار بار اُسے اپنوں کے سامنے کمزور کرتے کوئی بڑا فیصلہ لینے کے لیے مجبور کر رہا تھا۔

”میں کبھی بھی اپنے معصوم بچوں کو اُس شخص کے حوالے نہیں کروں گی۔ میں انہیں لے کر سب کی نظروں سے او جھل ہو جاؤں گی۔ ہاں میں ایسا ہی کروں گی میں اپنے بچوں کو لے کر دور چلی جاؤں گی اور کبھی اپنے ماں باپ کو بھی ان کے قریب نہیں آنے دوں گی۔ میں اپنی اولاد کو کسی کا محتاج نہیں بناؤں گی۔ ہاں میں کسی کو اپنے بچوں پہ حق جمانے نہیں دوں گی“، ایک نظر ان سوئے ہوئے دو معصوم پھولوں کو دیکھتے ہبہ نے اپنے آپ سے عہد کیا اور اٹھ کر الماری سے اپنا پاسپورٹ ڈھونڈنے لگی جو آفندی صاحب نے اُس کی شادی سے کچھ دن پہلے ہی ری نیو کروا یا تھا۔

”شکر ہے مل گیا“، اپنی کچھ ضروری چیزیں نکالتے اس کی نظر دراز میں پڑے پاسپورٹ پہ گئی تو اُس نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ وہ اُس کی رکھی ہوئی جگہ پہ ہی موجود تھا۔

”بس اب مجھے بچوں کے پاسپورٹ بنوانے ہیں پر کیسے؟“ اپنے پاسپورٹ کو اچھے سے دیکھنے کے بعد اُس نے عدت میں ہونے کی وجہ سے واپس بیٹھ پ آکر بیٹھتے کسی قابل اعتماد انسان سے مدد لینے کا سوچا جو کسی اور کو بھنک پڑے بغیر اُسے اس سلسلے میں آگاہی دے سکے جس کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہ تھا۔

”زارون؟ ہاں وہ میری مدد کر سکتا ہے“، کچھ سینڈ سوچنے کے بعد اُس کے دماغ میں اُس کا عکس اُبھر اتوحہ نے جلدی سے زیر لب بڑھاتے اپنا موبائل اٹھایا تاکہ اُسے کال کر سکے۔

”نہیں، میں اُس سے مدد نہیں لے سکتی میں کس منہ سے اُسے اپنی مدد کا بولوں گی؟ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی“، نمبر ڈائل کرتے اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے یس کرنے سے پہلے سوچا۔

”اُفف اللہ میری مدد کر مجھے سمجھ نہیں آرہی کہ میں کیسے اپنے بچوں کو اس دلدل سے نکاؤں؟“ اُس کے ساتھ کی گئی زیادتی کا یاد آتے ہی اُس نے موبائل بند کرتے ٹیبل پہ رکھا اور اپنا سردونوں ہاتھ میں تھامے خاموشی سے بیٹھ کر پاسپورٹ کو دیکھنے لگی جواب اُس کے کسی کام کا نہیں تھا۔

”بھائی میں آپ کو بتا رہا ہوں میں پوری رات اس ہسپتال میں نہیں گزرا سکتا بس گھر چلیں مجھے مزید کوئی ٹیسٹ ویسٹ نہیں کروانا“، تمام رپورٹس آنے کے بعد ڈاکٹرنے اُسے رات وہیں رکھنے کا بولاتا کہ اینڈوسکوپی کے لیے تمام ضروری ہدایات پہ عمل کروایا جاسکے پر اُس کے جاتے ہی زارون نے جنید کو مخاطب کرتے وہاں رکنے سے انکار کیا۔

”کیوں نہیں کراونا؟ اور یار بس ایک ہی رات کی تو بات ہے وہ کون سا تمہیں یہاں رہنے کا بول رہے جو تم اس قدر بے زاری دکھار ہے ہو“، اُس کی ضد پہ مسکراتے جنید نے بات کو مذاق میں ڈالا۔

”ایک رات کی بات ہو یا ایک گھنٹے کی بس مجھے یہاں نہیں رہنا۔ آپ پلیز ابو سے بولیں اور گھر چلیں“، دوائیوں کی بو اور ڈاکٹر کی باتوں سے گھبراہٹ کا شکار ہوتے زارون نے جنید کی منت کی۔ ”زارون یار کیا ہو گیا ہے، پلیز بہادر بنویہ وقت کمزور پڑنے کا نہیں ہے۔ دیکھو اینڈوسکوپی کروانا کوئی معمولی بات نہیں، یقیناً یہ ایک تکلیف دہ عمل ہے جیسے بار بار دھرا کر کر نامزید اذیت ناک ہو جاتا ہے اسی لیے ڈاکٹر زچاہتے ہیں کہ ہسپتال رکھ کر تمہیں اُس مرحل سے پہلے تمام ضروری

ہدایات پہ عمل کروالیں، جیسے کہ کچھ گھنٹے پہلے کوئی چیز کھانے پینے سے پرہیز کرنا اور میڈیسین وغیرہ۔ اس میں گھبرانے یا پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ لوگ تمہاری بھلانی کے لیے تمہیں یہاں رکھ رہے اور دیکھو ناڈا ڈاکٹر نے تمہارے سامنے بتایا کہ کوئی کسی قسم کی بد پرہیزی یا لاپرواہی اس ٹیسٹ کو مشکل بنانے کے ساتھ ساتھ دوبارہ کرنے کی بھی نوبت لے آتی بس اسی وجہ سے ہم نے تمہیں یہاں رکھنے کی حامی بھری ہے تاکہ جب یہ کروانا ضروری ہی ہے تو پھر ٹھیک طریقے سے کروالیں“، جنید نے نرمی کے ساتھ اُسے وضاحتیں دے کر اپنی بات سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”ضروری کیوں ہے مطلب اس سے کیا ہو جانا؟“، ”زارون جو اس معاملات کے بارے میں بالکل لا علم تھا اس نے جنید کی بات مکمل ہوتے ہی سوالیہ نظر وہ اُسے دیکھا۔

”اس سے ڈاکٹر جسم کے اندر کسی بھی اعضاء کا تفصیلی جائزہ لے سکتے ہیں۔ جیسے کہ اب تمہارے معدے میں وہ السر کی نوعیت کو دیکھیں گے کہ وہ کہاں کہاں اور کس حد تک ہے اور پھر اس کی رپورٹ کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ ہمیں آگے کے علاج کے متعلق آگاہی دیں گے، اسی لیے یہ ٹیسٹ ضروری ہے“، اُس کی بات کا تفصیلی جواب دیتے جنید نے اُسے سمجھانے کے لیے ہر بات کھول کر بیان کی۔

”ٹھیک ہے پر میں بتارہا ہوں یہ بس پہلی اور آخری دفعہ ہے، اس کے بعد میں یہاں نہیں آؤں گا“، اُس کی بات توجہ سے سننے کے بعد زارون نے غور کرتے حامی بھریتے ساتھ ہی اپنی شرط بتائی تو جنید نے اثبات میں سر ہلا�ا۔

”اچھا ٹھیک ہے نہ آنا پر ابھی تو سکون سے لیٹیو۔ میں ابو کودیکھ کر آتا ہوں“، تکیہ ٹھیک کرتے جنید نے اُسے پریشان دیکھ آرام کا بولا اور خود کمرے سے نکلتے احمد صاحب کو دیکھنے چلا گیا جو اپنے آفس سے آنے والی کال سننے باہر گئے تھے۔

ماہم (جو پاکستان آتے ہی اپنے سرال چلی گئی تھی) کے واپس آنے سے جہاں عابدہ بیگم کا خراب موڈخو شکوار ہوا وہیں نور کو بھی اپنی نند سے مل کر خوشی ہوئی جو عابدہ بیگم کی ہی طرح نرم مزاج اور خوش گفتار تھی۔

”بھی ہماری چھوٹی بھا بھی تو زارون کی دکھائی گئی تصویروں سے بھی زیادہ معصوم اور خوبصورت ہیں“، کوئی تیسری یا چوتھی بار نور کی تعریف ایک الگ انداز میں کرتے ماہم نے اُس کا ہاتھ تھاما جو اُس کے قریب ہی بیٹھی تھی۔

”آپ بھی بہت اچھی ہیں پیاری بھی“، اُس کی تعریف پر جھپٹنے نور نے کچھ سمجھنہ آنے پر الٹا اُس کی تعریف کی جو سچ میں دوپھوں کی ماں ہونے کے باوجود ابھی تک بالکل چاق و چوبند اور پروقار لگ رہی تھی۔

”شکریہ ویسے میں نے تمہاری تعریف اپنی تعریف کروانے کے لیے ہی کی تھی“، اُس کی معصومیت پر مسکراتے ماہم نے اُس کے قریب ہوتے سرگوشی کی تو نور نے نامجھی سے اُس کی طرف دیکھا پر! مطلب پوچھ کر سب کے سامنے شرمند ہونے کی بجائے اُس نے ہلاکا سما مسکراتے سر جھکایا۔

”یہ جنید بھائی اور حنا بھا بھی نظر نہیں آرہے؟ کہیں گئے ہیں کیا؟“ ان دونوں کی غیر موجودگی محسوس کرتے اُس نے عابدہ بیگم سے سوال کیا۔

”ہاں جنید اور زارون تمہارے ابو کے ساتھ گئے ہیں۔ آفس میں کچھ کام تھا اور حنا شاید اپنے کمرے میں ہے“، ٹیبل سے چائے کا کپ اٹھا کر اُسے تھماتے عابدہ بیگم نے آخری بات پر تصدیق کے لیے ہما کی طرف دیکھا۔

”جی آپ کی طبیعت تھوڑی خراب تھی تو وہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہیں“، عابدہ بیگم کے دیکھتے ہی ہمانے جلدی سے وضاحت دی جس پر سر ہلاتے ماہم نے عبیرہ (اپنی بیٹی) کو روکا جو کافی دیر سے چپس کھانے میں مصروف تھی۔

”کچھ نہیں ہوتا کھانے دو اور تم بتاؤ شر جیل (ماہم کا شوہر) کب تک پاکستان آئے گا؟ مطلب اُس کا کوئی ارادہ وغیرہ ہے یا نہیں؟“، کباب پلیٹ میں رکھ کر مزمل کو دیتے عابدہ بیگم نے ماہم سے اُس کے شوہر کے متعلق پوچھا جو اُسے اور بچوں کو بھیج کر اب خود کسی کام میں پھنسنے کا بتاتے ابھی تک نہیں آیا تھا۔

”جی بس، کچھ ضروری کام پڑ گیا تھا اس لیے انہیں اپنی ٹکٹ پھر سے کینسل کروانا پڑی۔ اب ان شاء اللہ اگلے ہفتے آنے کا کہہ رہے ہیں۔ دیکھیں کیا کرتے ہیں؟“، اُن کی بات کا تفصیلی جواب دیتے ماہم نے چائے کا ایک اور سپ لیا۔

”اچھا بس اللہ پاک خیر کرے۔ کام بھی زندگی کے ساتھ ساتھ ہی ہیں“، اُسے افسر دہ دیکھ عابدہ بیگم نے تسلی دی اور اُس سے اُس کے سسرال والوں کا حال احوال پوچھنے لگیں۔

-----

”ابو آپ گھر چلے جائیں میں یہاں زارون کے پاس رک جاؤں گا“، جنید نے اُن کے چہرے پہ تھکاوت دیکھ کے تاکید کی۔

”نہیں میں یہاں رک جاؤں گا۔ تم جاؤ گھر ورنہ سب کوشک ہو جائے گا“، حنا کا نام لینے سے خود کو باز رکھتے احمد صاحب نے اپنی بات میں سب لفظ کو شامل کیا۔

”شک؟ کس بات کا شک؟ آپ فکر نہ کریں میں خود ہی کوئی معقول سا بہانہ بنادوں گا پر آپ دونوں کو ایسے اکیلا کسی کے آسرے پہ چھوڑ کر نہیں جاؤں گا“، اُن کی غرض کو اچھے سے سمجھتے جنید نے صاف لفظوں میں گھر جانے سے انکار کیا۔

”بھائی میں ٹھیک ہوں اور ابو بالکل صحیح کہہ رہے ہیں یوں ہمارے تینوں کا گھر سے غائب ہونا مناسب نہیں“، زارون نے بھی احمد صاحب کی سائیڈ لیتے جنید کو سمجھایا جو اپنی بات پہ بضرر تھا۔

”نہیں میں کہیں نہیں جاؤں گا اور میں اچھے سے جانتا ہوں کہ آپ دونوں یہ بات حنا کی وجہ سے بول رہے ہیں۔ بس ابو پلیز آپ پریشان نہ ہوں میں خود ہی اُسے سنبھال لوں گا۔ میں کہہ دوں گا کہ مجھے شہر سے باہر پر اپرٹی کے کاغذات کے سلسلے میں کچھ کام پڑ گیا ہے بلکہ میں یہ کہہ دوں گا کہ ہم تینوں ہی ساتھ جا رہے ہیں“، حنا کی زبان بند رکھنے کے لیے جنید کو اس کے علاوہ اور کوئی بات سوچھائی نہ دی تب ہی اپنا ارادہ اُن دونوں کو بتاتے اُس نے تصدیق چاہی۔

”اچھا ٹھیک ہے، جیسے تمہیں مناسب لگتا ہے کرلو پر یہ خیال رکھنا کے ابھی کسی کو کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو“، اُس کے بار بار اصرار کرنے پر احمد صاحب نے منع کرنے کی بجائے احتیاط برتنے کی تاکید کی۔

”ٹھیک ہے، آپ بے فکر ہیں، میں بس حنا کو کال کر کے بتا کر آتا ہوں“، انہیں وہیں زارون کے پاس رکنے کا بولتے جنید نے باہر کا رخ کیا۔

”بھوک گلی ہے تو کچھ کھانے کے لیے لادوں؟“ جنید کے جاتے ہی احمد صاحب نے زارون سے سوال کیا جو جنید کے وہاں رکنے کے بالکل بھی حق میں نہیں تھا۔

”نہیں مجھے بھوک نہیں ہے اور آپ نے بھائی کو منع کیوں نہیں کیا؟ میرا مطلب حنا بھا بھی کا تو آپ کو پتا ہی ہے کہ وہ غصے میں کسی چھوٹے بڑے کا لحاظ نہیں کرتیں اور ویسے بھی میری وجہ سے بھائی انہیں زیادہ ٹائم نہیں دے رہے وہ پہلے ہی چڑی ہوئیں ہیں اور اب بھائی نے گھر نہ آنے کی بات بتائی تو وہ گھر میں کوئی نیا ہنگامہ نہ کھڑا کر لیں“، زارون نے اپنا خدشہ ظاہر کرتے سوالیہ نظر وہ سے احمد صاحب کی طرف دیکھا جو خود بھی صرف اسی وجہ سے جنید کے وہاں رکنے کے لیے رضامند نہ تھے۔

”ہاں جانتا ہوں پر اس طرح منع کر کے جنید کا دل توڑنا مجھے مناسب نہیں لگا۔ وہ کیسے صحیح سے تمہارے لیے بھاگ دوڑ کر رہا اور اب جا کر اگر میں اُس کی بات نہ مانتا تو شاید اُسے بُرا لگتا“، زارون کو پریشان دیکھ احمد صاحب نے بھی کشمکش کا شکار ہوتے اُسے واضح تر دی۔

”اچھا چھوڑیں اب توجو ہونا تھا ہو گیا۔ بس آپ بھی امی کو کال کر کے ہمارے نہ آنے کے بارے میں بتا دیجیے گا تاکہ وہ پریشان نہ ہوں“، اُنہیں فکر مند ہوتا دیکھ زارون نے تسلی دیتے بات بدلتی۔

”ہاں بس کرتا ہوں کال کچھ دیر میں“، اُس کی بات کو جواب دیتے وہ کمرے میں داخل ہوتے ڈاکٹر کی جانب متوجہ ہوئے جو آتے ہی ساتھ موجود نرس کو زارون کا بی پی وغیرہ چیک کرنے کا بول چکا تھا۔

”کہاں غائب ہیں آپ صحیح سے؟“؟ جنید کا نام دیکھتے ہی حنانے کال رسیسو کرتے کسی بھی سلام دعا کے بغیر غصے سے سوال کیا۔

” بتا یا تو تھا کہ ابو کے ساتھ ہوں“، اپنے لبھ کو نارمل رکھتے جنید نے شور سے قدرے پر سکون جگھے پہ جاتے جواب دیا۔

” بتایا تھا اور ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ دو تین گھنٹوں کا کام ہے پھر واپس آجائوں گا پر اب تو صبح سے شام ہو گئی ہے“، اُس کی بات سنتے ہی دوسری طرف سے بھڑکتے ہوئے یاد ہانی کروائی گئی۔

” ہاں بس وہ کام ہی ایسا پڑ گیا کہ مجھے رکنا پڑا اور اب اُسی سلسلے میں ابو اور زارون کے ساتھ لا ہور جا رہا ہوں“، ایک اور دھماکہ اُس کے سر پہ کرتے جنید نے اپنا سکون برقرار کھا۔

” مطلب؟ آپ رات کو نہیں آئیں گے؟ اور کون سا ایسا ضروری کام ہے جو صبح سے لے کر اب تک ختم نہیں ہوا؟“، اُس کی بات مکمل ہوتے ہی حنانے عابدہ بیگم سے ہوئی تلحہ کلامی کا غصہ اُس پہ نکالا۔

” وہ ابو کی کچھ زمینیں جو لا ہور میں ہیں نا؟ بس انہی کا کچھ مسئلہ بنانا ہوا اور ہم لوگ اُسی کے سلسلے میں صبح سے لگے اور اب بھی اسی لیے لا ہور جا رہے کہ وہاں جا کر سارے معاملے کو دیکھ سکیں“، بڑی صفائی اور پختگی سے جھوٹ بولتے جنید نے اپنے لبھ کو بھی تھوڑا افسردہ کیا۔

” کون سی زمینیں؟ مطلب ابو کی وہاں بھی کوئی زمین ہے؟ پر آپ نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا“، پر اپرٹی کی بات سنتے ہی غصہ کو ایک سائیڈ پر رکھتے اُس نے اپنے حواس بحال کرتے دماغ پہ زور دیا۔

” ہاں مجھے بھی آج ہی پتا چلا ہے بس تم اب یہ غصہ چھوڑ و اور میری بات دھیان سے سنو، دیکھو وہ زمین کروڑوں کی ہے اس لیے ہم اُسے ایسے ہی ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتے میرا مطلب میرا

ساتھ جانا ضروری تھا اسی لیے میں نے حامی بھری پر اگر تم کہتی ہو تو میں نہیں جاتا؟، سارا معاملہ اُس کے اوپر چھوڑتے جنید نے سمجھداری سے کام لیا۔

”نہیں پاگل ہیں کیا آپ اور بھلا میں کیوں غصہ کروں گی۔ آپ جائیں ساتھ تاکہ زارون ابو کو ہاتھوں میں لے کر اکیلا اس زمین کو ہڑپ نہ کرے“، اُس کی بات سننے ہی حنا نے للاچتے ہوئے جنید کو اجازت دی جو اپنے مقصد میں کامیاب ہوتے ہی اُسے اس زمین والی بات کا ذکر کسی سے بھی کرنے سے منع کرتے سبjan کے بارے میں پوچھنے لگا۔

---

احمد صاحب نے عابدہ بیگم کو کال کرتے اپنے اور زارون کے گھرنہ آنے کے متعلق بتایا تو انہوں نے فون بند کرتے اپنے پاس بیٹھی ماہم اور نور کو اُس کے بارے میں آگاہ کیا۔

”کیا مطلب نہیں آنا؟ آپ نے انہیں بتایا کیا؟“ نور سے پہلے ہی ماہم نے سوال کرتے خفگی کا اظہار کیا۔

”پتا ہے انہیں بس کہہ رہے کچھ اہم کام ہے شہر سے باہر جا رہے اس لیے رات نہیں آجئیں گے“، اپنے دل میں پڑتی کھینچ پر توجہ دیے بغیر انہوں نے احمد صاحب سے ہوئی بات کے متعلق ماہم کو بتایا۔

”ہونہہ اتنا بھی کیا اہم کام تھا کہ مجھ سے دو منٹ کے لیے ملنے بھی نہیں آئے۔ بس واپس آجائیں میں بھی بات نہیں کروں گی“، اُن کی وضاحت پر منہ پھلاتے ماہم نے نور کی طرف دیکھا جو زارون کے گھرنہ آنے کا سن کر پریشان سی بیٹھی تھی۔

”بس ایسے خفائنہیں ہوتے، دعا کرو جہاں جا رہے ہیں خیر خیریت سے جائیں اور واپس آجیں“، اُس کے منہ ب سورنے پر سمجھاتے عابدہ بیگم نے عثمان کو اُس کی گود سے لیا۔

”اچھا ٹھیک ہے کچھ نہیں کہتی اب، نور چلو میں تمہیں تمہارے گفت دیتی ہوں“، عابدہ بیگم کی نصیحت پر عمل کرتے اُس نے معدرات کی اور نور کی جانب متوجہ ہوئی جو یونیورسٹی سے آتے ہی پھر سے اُس کے پاس آگئی تھی۔

”جی آپ چلیں میں بس کپڑے تبدیل کر کے آتی ہوں“، زارون کے نہ آنے کا سنتے ہی اُس کے چہرے کے تمام رنگ پھیکے پڑ چکے تھے جسے چھپانے کے لیے اُس نے بہانہ بناتے اپنے کمرے کا

رخ کیا تاکہ اُسے کال کر سکے جو صحیح سے اُسے بغیر بتائے کہیں غائب ہو گیا تھا اور اب تک اُس نے نہ تو اُسے کوئی مسج کیا تھا اور نہ ہی فون۔

”کہاں ہیں آپ؟“ کمرے میں آتے ہی اُس نے زارون کا نمبر ملایا اور دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی پوچھنے لگی۔

”میں تمہارے دل میں ہوں“، جنید اور احمد صاحب کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتے زارون نے دوسری طرف اپنی چڑیل کو غصہ میں دیکھ جواب دیا۔

”ہونہے زیادہ شوخ مبتبنیں، جانتی جو میرے دل میں ہیں آپ، حد ہے صحیح سے آپ نے مجھ سے بات نہیں کی اور اب اس وقت آپ کو رو میں سو جھر ہا وہ بھی تھکے ہوئے ڈائیلوگ کے ساتھ“، اُس کی آواز کی کھنک پہ منہ بسورے نور نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”تو جان تم بتا دو نا کوئی اچھے والے ڈائیلاگ، ویسے آج کوئی ڈرامہ نہیں دیکھا کیا؟“ اُس کا دھیان اپنے اوپر سے ہٹانے کے لیے زارون نے اُسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگایا۔

”نہیں آج نہیں دیکھا اور دوبارہ سے دیکھوں گی بھی نہیں“، اُس کی بات کا مفہوم سمجھ کر بھی انجان بنتے نور نے اپنی آخری بات پہ زور دیا۔

”کیوں نہیں دیکھو گی؟“

”بس نہیں دل تو نہیں دیکھنا اور آپ مجھے الجھائے مت اور یہ بتائیں کہ آپ نے گھر کیوں نہیں آنا؟“ اُس کی باتوں کے ہیر پھیر پہ گھبرا تے نور نے اصل مقصد کی جانب آتے سوال کیا۔

”ہاں وہ بس کچھ کام ہے اس لیے نہیں آنا تم بس اپنا خیال رکھنا اور کمرے میں ڈر لگے تو امی کے ساتھ جا کر سو جانا“، اُس کی بات کا جواب دیتے زارون نے ساتھ دو چار نصیحتیں کی تو نور نے تیوری چڑھاتے اُسے فون کے اندر سے ہی گھورا۔

”میں کوئی چھوٹی بھی نہیں ہوں جو ڈر جاؤں“، اُس کی بات درمیان سے ہی کاٹتے اُس نے دیوار پہ موجود چھپکلی کو دیکھ کر جھر جھری لی اور وہاں سے تھوڑا ہٹ کر صوف پہ جا بیٹھی۔

”میرے لیے بھی ہو وہ بھی چھوٹی سی اس لیے جو بول رہا ہوں ویسا ہی کرنا“، اُس کا جواب سن کر پھر سے تاکید کرتے زارون نے اُس کے پیپر کے بارے میں پوچھا تو نور نے نظریں چھپکلی پہ جمائے اُسے اپنے پیپر کے ٹھیک ہونے کے متعلق بتایا۔

”اچھا کھانا کھایا ہے اور ماہم سے ملی ہو کیا؟“ اُس کے لمحے میں گھبراہٹ محسوس کرتے زارون نے اُسے باتوں میں لگایا جو اپنے ڈر کو اُس کے سامنے بیان کرنے کی بجائے نظریں دیوار پہ ٹکائے بڑی بہار دی سے اُس کی باتوں کا جواب دینے لگی۔

زارون سے بات کرنے کے بعد وہ نیچے ماہم کے کمرے میں آگئی۔

”یہ دیکھو، یہ میں تمہارے لیے لاٹی ہوں اور یہ زارون کے ہیں“، کچھ گفٹس اُس کے سامنے رکھتے ماہم نے بتایا۔

”اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ میرا مطلب آپ خود ہی آگئیں یہی بہت تھا“، اُس کی مصنوعی گھوری پہ بات سنjalat نے نور نے جلدی سے وضاحت دی۔

”ضرورت نہیں بھی تھی، تب بھی میں اپنی خوشی سے لائیں ہوں اس لیے چپ کر کے رکھ لو“، اُس کی بات پہ مسکراتے ہوئے ماہم نے باقی چیزیں سیمٹ کر الماری میں رکھیں۔

”تحقینک یو آپی، آپ سچ میں بہت اچھی ہیں“، نظروں میں سچائی لیے نور نے شفاف لبجے میں اُس کی تعریف کی۔

”موسٹ ویکم اور تم خود اچھی ہو، اسی لیے میں بھی تمہیں اچھی لگ رہی ہوں“، واپس اُس کے پاس آکر بیٹھتے ماہم نے کھلے دل سے اُس کی تعریف کی جوانتنے سارے گفت دیکھ کر انہیں جلد از جلد کھولنے کے لیے بے تاب تھی۔

”واہ جی واہ لگتا ہے نند کو بھی آتے ہی ہاتھوں میں کر لیا ہے تم نے“، کمرے کا کھلا دروازہ دیکھ بغیر اجازت ہی اندر داخل ہوتے حنا نے نور کو بھی وہاں موجود دیکھ کر طنز کیا۔

”بھا بھی کچھ لوگوں کو کسی کو ہاتھوں میں کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی مطلب ان کا الہجہ اور اخلاق ہی ایسا ہوتا کہ اگلا انسان خود بخود ان کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور میرے خیال سے نور میں ایسی بہت سی خوبیاں ہے جس کی وجہ سے میری اتنی جلدی اس سے دوستی ہو گئی“، اُس کے طنز پر ٹکسا جواب دیتے ماہم اٹھ کر حنا سے ملی جسے اب جا کر اُس سے ملنے کی فروخت ملی تھی۔

”اچھا ॥ ॥ ॥ ॥ اوسے بڑی بات ہے جو تمہیں اتنی جلدی اس کی خوبیاں نظر آگئیں بھی ہمیں تو آئے دو ہفتے گزر گئے نہ تو اس میں کوئی خوبی نظر آئی اور نہ ہی خوش اخلاقی“، تکلفا مہم سے گلے ملتے حنا نے چہرے پہ مسکرات سجائے گہرا طنز کیا۔

”آپی میں یہ کمرے میں رکھ کے آتی ہوں آپ لوگوں با تین کریں“، حنا کی بڑھتی بد تیزی پہ نور نے وہاں سے جانا، ہی مناسب سمجھاتب ہی ماہم کے دیے تمام گفٹس اٹھاتے وہ بیڈ سے اٹھی اور خاموشی سے کمرے سے چلی گئی۔

”بھا بھی آپ نے اچھا نہیں کیا، آپ کو نور سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی“، اُس کے جاتے ہی ماہم نے حنا کو آڑے ہاتھوں لیتے اُسے اُس کے غلط ہونے کا احساس دلا یا۔

”بس بس بی بی زیادہ مجھے پیکھر دینے کی ضرورت نہیں اور رہی بات تمہاری چھوٹی بھا بھی کی تو مجھے کوئی شوق نہیں اُس بذات کے منہ لگنے کا“، ماہم کو نور کی سائیڈ لیتا دیکھ جنانے درشتی سے جواب دیا۔

”بھا بھی اب آپ اپنی حد سے باہر نکل رہی ہیں، پلیز خاموشی ہو جائیں“، بذات لفظ پہ بھڑکتے ماہم نے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر جانا کو آنکھیں دکھائیں۔

”اووو، تواب ماہم بی بی مجھے میری حد بتائیں گی، جنہیں خود اپنی حدود کا نہیں پتا“، اُس کے آنکھیں نکالیں پہ جنانے مزید بات کو بڑھاوا دیا۔

”بھا بھی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟؟ امی نے مجھے آپ کے رویے کے متعلق بتایا تھا مگر میں نے یقین نہیں کیا، مطلب آپ کی دشمنی کیا ہے نور سے؟ اُس نے آپ کا کیا بگاڑا ہے جو آپ اس طرح اُس کے بارے میں فضول گوئی کر کے گھر کا ماحوال خراب کر رہی ہیں“، ماہم کو جانا کے رویے کے پیچھے پیچھی وجہ سمجھ نہیں آئی تب ہی الجھتے ہوئے اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”جو لوگ فضول ہوں ناؤں کے بارے میں اچھے الفاظ نہیں بولے جاتے، اور تمہیں میرا رویہ نظر آ رہا پر اُس کی حرکتیں نہیں، دیکھا نہیں کیسے مجھے اگنور کر کے گئی ہے حالانکہ میں نے تو بس ایک مذاق ہی کیا تھا“، اُس کے نرم پڑتے ہی جانا نے اپنے رویے کی صفائی میں ایک پتہ پھینکا۔

”ہاں تو کیا کرتی وہ؟ آپ نے بات ہی ایسی کی اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو آپ کے منہ پہ ہی جواب دے دیتا پر وہ آپ کو کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے چلی گئی، پلیز آپ بات کو سمجھیں وہ بربی نہیں ہے بس وہ آپ سے خائف ہو جاتی اسی لیے بات کا جواب نہیں دیتی“، ماہم جو کچھ دیر پہلے ہی عابدہ بیگم کی زبانی حنا کے رویے اور باتوں کے بارے میں جان چکی تھی اُس نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”بس اتنی وہ معصوم نہیں جو میری باتوں کو دل پہ لگائے خاموش ہو جائے۔ ماہم میں تمہیں بتا رہی ہوں یہ لڑکی ضرورت سے زیادہ چالاک ہے، تم نے دیکھا نہیں کہ کیسے اس نے امی کو اپنی انگلیوں پہ نچایا ہوا ہے۔ وہ سارا دن کبھی اس کو کھانا بنانا کر دے رہیں، کبھی کپڑے دھو کے تو کبھی پریس کر کے تو بہ مجھے تو سوچتے ہوئے بھی عجیب لگتا کہ میں اپنے کام امی سے کرواؤ“، کانون کو ہاتھ لگاتے حنا نے ایک جھر جھری لی۔

”بھا بھی کام کرنے سے کوئی چھوٹا برا نہیں ہو جاتا اور نور کو ابھی کھانا وغیرہ پکانا نہیں آتا اسی لیے امی اُسے بنادیتیں اور وہ کون سا خاص طور پہ اُس کے لیے بناتی ہیں، جہاں سب کے لیے بنتا اس کے کے لیے بھی بن جاتا۔ پلیز آپ کیوں یوں اپنے دل میں نفرت پیدا کر کے سب کو اپنے آپ سے

بد گمان کر رہی ہیں؟، اُس کا ہاتھ تھامتے ماہم نے بہت پیار سے اُسے اپنی بات سے قائل کیا جو عابدہ بیگم کی طرح اب نند سے بھی بگاڑا کر نور کو مزید اپنی جگہ بنانے کا موقع نہیں دے سکتی تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں کو شش کروں گی، تم بتاؤ بچے کہاں ہیں نظر نہیں آرہے؟“ بات بدلتے حنا نے اُس کا دھیان اس بات سے ہٹایا۔

”وہ امی کے پاس ہیں آپ آئیں ہم بھی وہیں چلتے ہیں،“ اُس کا موڈ کچھ ٹھیک ہوتا دیکھا ہم نے پیشکش کی تو وہ صرف دولت کی حوس کے میں تمام گھروالوں سے اپنارو یہ ٹھیک کرنے کا سوچتے اُس کے ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھی تاکہ احمد صاحب یا جنید کے کانوں تک کوئی بھی بات پہنچنے سے پہلے عابدہ بیگم سے اپنے صحیح والے رویے کی معافی مانگ سکے۔

-----

Hanna کی وہاں موجود گی اور اُس کی باتوں نے نور کا سارا جوش خاک میں ملا دیا تھا تب ہی سارے گفٹس الماری میں رکھتے وہ خاموشی سے صوفے پہ آبیٹھی۔

”پتا نہیں بھا بھی ایسی باتیں کیوں کرتیں ہیں؟ میں نے تو انہیں کبھی بھی کچھ نہیں بولا پرتب بھی وہ مجھے ایسے گندے گندے لفظ بولتی ہیں“، بد ذات لفظ پہ آنکھوں میں نمی لیے نور نے حنا کے رویے کے متعلق سوچا جو دن بد دن بد سے بدتر ہوتے اُس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

”بس زار گھر آجائیں، میں انہیں آتے ہی حنا بھا بھی کی شکایت لگاؤں گی“، روتے ہوئے اُس نے ارادہ کیا اور ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کرتے اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوئی جہاں رابعہ کا نام چمک رہا تھا۔

”السلام علیکم“، کال رسیو کرتے ہی نور نے دوسری طرف سلام کیا۔

”و علیکم السلام، کیسی ہوتا اور کہاں غائب ہو؟“، اپنے میسجز کا جواب نہ ملنے پہ شکوہ کرتے رابعہ نے اپنے بیڈ کی چادر ٹھیک کی۔

”میں، میں گھر ہی ہوں کیوں کیا ہوا؟“، اُس کے بے تکے سوال پہ ماتھے پہ تیوری ڈالتے نور نے استفسار کیا۔

”یار ہونا کیا ہے؟ کب سے تمہیں مسیح کیا ہے کہ میرے پاس کچھ ٹاپکس نہیں ہیں وہ سینڈ کر دو پر تمہیں اپنے زار سے فروخت ملے تو میرا مسیح دیکھوںا“، اُس کی لا عملی پہ منہ بسو رتے رابعہ نے اُس کی ٹانگ کھینچی۔

”ہونہ بس زیادہ طمع نہ مارو، میں نیچے تھی اسی لیے میسح نہیں دیکھا اور زار تو گھر ہی نہیں ہیں“، اُس کی بات پہ جھنپتے ہوئے نور نے وضاحت دی۔

”کیوں؟ کہاں گئے ہیں تمہارے زار؟ اور تم نیچے کس کے پاس تھیں؟“، نظروں میں شرارۃ لیے رابعہ نے پھر سے اُسے چھیڑا۔

”پتا نہیں کہہ رہے تھے کوئی کام ہے اس لیے آج نہیں آئیں گے اور میں وہ ماما ہم آپی آئیں ہیں نابس اُن ہی کے پاس بیٹھی تھی“، تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھتے نور نے بیڈ کی بیک سے ٹیک لگائی۔

”اچھا مطلب نند کے ساتھ مصروف تھیں اور یہ زارون کو اسے ایسا کون سا کام تھا جس کے لیے وہ رات کو باہر رکا، مطلب نور نظر رکھا کر ویہ نہ ہو کہ معصومیت میں شوہر کو ہاتھوں سے گوا دو“، اپنی ہنسی دباتے رابعہ نے اُسے شنک میں ڈالتے مشورہ دیا۔

”مطلب؟ اس میں نظر رکھنے والی کیا بات ہے اور ہو سکتا ہے کام مجھے بتانے والا نہ ہو“، اُس کی بات کو سنجیدگی سے لینے کی بجائے نور نے اُس کے ساتھ ساتھ اپنے آپ کو کو بھی تسلی دی۔

”ہاں ہو سکتا ہے پر یہ بھی تو ہو سکتا ہے ناکہ زارون کا کہیں اور چکر چل رہا ہو، مطلب کوئی گرل فرینڈ یا بیوی...“، اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دباتے رابعہ نے اس وقت نور کے چہرے کے تاثرات سوچ کر اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”مطلوب؟ تم یہ کہنا چاہ رہی ہو کہ زار کی کوئی گرل فرینڈ ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے وہ تو بس مجھ سے پیار....“ روانی سے بولتے وہ پیار لفظ پہ اٹکی تو دوسرا طرف رابعہ نے زور سے قہقہہ مارا۔

”اففف نور تمہیں ہر معاملے میں بے وقوف بنایا جا سکتا پر زارون کے معاملے میں تم بالکل پکی ہو، توبہ توبہ میں نے کتنی سنجیدگی سے تمہیں بھڑکانے کی کوشش کی پر تم؟ نہیں زار ایسے نہیں ہیں“، اُس کی نقل اُتارتے رابعہ نے بد مزہ ہوتے اپنی مکمل کی۔

”ہاں توجہ ایسی کوئی بات نہیں ہے تو میں کیوں کسی کی بات کا یقین کروں؟ میں نے کبھی بھی انہیں کسی لڑکی سے بات کرتے نہیں دیکھا بلکہ وہ تو کسی کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے“، اپنے لہجے کو مضبوط کرتے نور نے رابعہ کی بات سنتے ہی زارون کے کردار کی گواہی دی۔

”اچھا بھی پتا مجھے کہ تمہارا زار بہت اچھا ہے بس اب زیادہ تعریفیں کر کے مجھے ارحم پہ غصہ نہ دلاو“، اُس کی خوشامد پہ بھنوئیں اچکائے رابعہ نے اُس کی زبان کو بریک لگوائی جواب مسکراتے ہوئے اُس سے اُن لیکچرز کے متعلق پوچھنے لگی جو اُسے چاہیے تھے۔

رات کے دوسرے پھر گلا خشک ہونے کی وجہ سے زارون کی آنکھ کھلی تو اس نے سر اٹھاتے ایک نظر کمرے پہ ڈالی۔

”اُفف کیا مصیبت ہے، میں نے اپنے ساتھ ساتھ ان لوگوں کو بھی بے آرام کیا ہوا ہے“، جنید کو صوف پہ بیٹھے بیٹھے ہی سوتا دیکھا اس نے خود کلامی کی اور اٹھ کر خود ہی سائیڈ ٹیبل پہ پڑی بوتل سے پانی گلاس میں نکلتے پینے لگا۔

”ابھی بس دو بجے ہیں، پتا نہیں کب صحیح ہو گی“، پانی ختم کر کے گلاس والپس ٹیبل پہ رکھتے اس نے اپنے موبائل پہ نامم دیکھتے بے زاری سے سوچا اور نیند نہ آنے کی وجہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر موجود بالکونی میں آگیا۔

”نور کو پتا نہیں میرے بغیر نیند آئی ہو گی یا نہیں؟“، ایک نظر آسمان پہ چمکتے تاروں کو دیکھا اس کے دل میں خیال اُبھرا۔

”چڑیل ہے پوری، پہلے بڑی میری پرواکرتی جو آج کرنی تھی۔ ہونہہ منہ کھولے آرام سے سو گئی ہو گی“، اپنے سوال کو خود ہی جواب دیتے زارون نے موبائل میں موجود اس کی تصویر نکالی جو اس نے کل رات ہی اس کی نیند کا فائدہ اٹھاتے بنائی تھی۔

”کتنی معصوم لگ رہی ہے سوتے ہوئے، بالکل بچوں کی طرح نرم نازک سی“، اسکرین پر ہاتھ پھیرتے اُس کے چہرے پر ایک تلخی مسکراہٹ بکھری۔

”جب تک میں زندہ ہوں میں تمہاری معصومیت یو نہی برقرار رکھوں گا، ہاں میں کبھی تمہیں کوئی تکلیف نہیں آنے دوں گا۔ میں تمہیں اتنی محبت کروں گا کہ میرے جانے کے بعد بھی کبھی تمہیں میری کمی محسوس نہیں ہو گی“، اپنی آنکھوں میں نمی لیے زارون نے اُسے مناطب کیا جو تصویر کی صورت اُس کے موبائل میں قید تھی۔

”ہاں میں خود غرض ہوں اور تمہارے معاملے میں بے بس بھی، میں چاہ کر بھی تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ نور میں اپنی زندگی کے یہ پل تمہارے ساتھ گزرانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم میری بیماری کو سن کر بے شک مجھ سے نفرت کرو پر مجھ سے دور مت جاؤ، پلیز تم ایسا ہی کرنا“، ایک آنسو ٹوٹ کر موبائل کی اسکرین پر گرا تو اُس نے اُس کے سحر سے نکلتے ایک گھری سانس لیتے خود کو آنے وقت کے لیے تیار کیا جو تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کے لیے کافی مشکل اور اذیت ناک ہونے والا تھا۔

صحح ہوتے ہی ڈاکٹر نے اُسے اینڈو سکوپی کے لیے جسمانی اور ذہنی طور پر تیار کیا اور پھر کچھ ہی منٹوں میں ایک تکلیف دہ عمل اپنے اختتام کو پہنچا جس کے بعد زارون کو کچھ دیر کے لیے بے ہوشی میں رکھا گیا تاکہ گلے کی درد کی وجہ سے اُسے زیادہ مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

”السلام علیکم ڈاکٹر صاحب آپ نے ہمیں بلا یا تھا؟“ دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوتے جنید نے انہیں سلام کیا جو زارون کی روپرٹس ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔

”جی جی بیٹھیں آپ“، روپرٹس ٹیبل پر رکھتے ڈاکٹر نے انہیں بیٹھنے کا بولا تو احمد صاحب کے ساتھ جنید نے بھی اپنی نشست سنبحاں۔

”زارون علی کے ساتھ ہیں آپ لوگ؟“ فائل سے پیشنت کا نام پڑھتے ڈاکٹر نے تصدیق چاہی۔

”جی جی ہم اُن ہی کے ساتھ ہیں۔ میں بھائی ہوں اور یہ والد“، احمد صاحب کی جانب اشارہ کرتے جنید نے اپنا اور ان کا تعارف کروایا۔

”ٹھیک، آپ نے پہلے بھی کہیں سے ٹیسٹ وغیرہ کروائیں ہیں؟ مطلب کسی ڈاکٹر سے علاج وغیرہ کروایا ہو؟“ عینک اٹار کر ٹیبل پر رکھتے ڈاکٹر نے جنید کے تعارف پر سر ہلاتے سوال کیا۔

”نہیں پہلے کہیں سے علاج نہیں کروایا۔ ہمیں تو بھی دو تین دن پہلے ہی پتا چلا کہ ہے زارون کو یہ مسئلہ ہے۔ مطلب وہ بے ہوش ہوا تو ہم لوگ اُسے ہسپتال لے گئے وہاں ڈاکٹر نے شک کی بناء پر

کچھ ٹیسٹ کیے جس کے بعد ہمیں اس بیماری کا علم ہوا، جنید نے پوری تفصیل کے ساتھ ڈاکٹر کو ساری بات بتائی۔ ”ٹھیک، یعنی کہ میر اندازہ درست تھا کہ آپ کے پیشنت کا کینسر تیسرے مرحلے میں پہنچ کے سامنے آیا ہے۔ معدے کے امراض میں اکثر ایسا ہی ہوتا کہ بیماری اندر ہی اندر اپنا کام دیکھا کر ظاہر ہوتی اور آپ کے بھائی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہوا ہے،“ اپنے دونوں ہاتھ آپس میں پیوسٹ کر کے ٹیبل پر رکھتے ڈاکٹرنے بات کے آغاز کے لیے تمہید باندھی۔

”معدے میں چھوٹے چھوٹے خم جیسے ہم عام طور پر السر کا نام دے دیتے ہیں وہ اگر بروقت علاج سے ٹھیک نہ ہوں تو وہ کینسر کی شکل اختیار کر جاتے ہیں جس کی وجہ سے علاج ناممکن تو نہیں بہر حال مشکل ضرور ہو جاتا اور آپ کے بھائی کی صورت حال اس وقت یہی ہے کہ بروقت تشخیص نہ ہونے کی وجہ سے اُن کے معدے میں السر نے بگاڑ پیدا کر کے کینسر کی شکل اختیار کر لی ہے جس کا آپریشن یا کیمبو کے سوا کوئی علاج نہیں، ہاں میڈیسین ہیں پر وہ وقتی سکون کے لیے اُس سے یہ بیماری ختم نہیں ہو گی،“ تمام رپورٹس کو اچھے سے دیکھنے اور سمجھنے کے بعد ڈاکٹر نے اپنے تجربے اور تعلیم کی بناء پر انہیں صاف الفاظ میں زارون کی حالت کے بارے میں آگاہ کیا۔

”کیو تو کافی تکلیف دہ ہے اور آپریشن سے کیا آپ کینسر کو ختم کر سکتے ہیں؟ میرا مطلب آپریشن سے کتنے پر سنت چانس ہیں بہتری کے؟“ ان کی بات مکمل ہوتے جہاں احمد صاحب کارنگ زرد پڑا وہیں جنید نے ہمت کرتے ڈاکٹر سے رہنمائی طلب کی۔

”آپریشن سے بھی پچاس فیصد تک امید ہے کہ بہتری آئے گی پر میرے خیال سے کیمودی طرف جانا زیادہ ٹھیک رہے گا کیوں کہ جس حساب سے رپورٹ میں کینسر کے جرا شیم دیکھے گئے ہیں اُس سے ممکن ہے کہ آپریشن کے بعد بھی پیشہ کی زندگی کو خطرہ ہو،“ ان سے کچھ بھی چھپانے کے بجائے ڈاکٹر نے سب کچھ کھول کر بیان کرتے انہیں علاج کے متعلق کچھ اور ہدایات دیں جنہیں سننے کے ساتھ ساتھ جنید نے احمد صاحب کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے انہیں بھی تسلی دی جو ڈاکٹر کی باتیں سن کر خاموشی سے بیٹھے تھے۔

-----  
”جنید اب کیا ہو گا؟“ ڈاکٹر کے کمرے سے نکلتے ہی احمد صاحب نے کشکاش کا شکار ہوتے اُس سے سوال کیا۔

”کچھ نہیں ہو گا اور آپ کیوں پریشان ہو رہے ہیں؟ ڈاکٹرنے کہا ہے ناکہ علاج مشکل ہے پر ناممکن نہیں تو بس حوصلہ رکھیں اور آپ ایسے ہمت ہاریں گے تو زارون کو کون سمجھائے گا؟ وہ تو پہلے ہی ایک رات ہسپتال رہنے کے لیے تیار نہ تھا ب کیمو کا سُن کر اُس کا رد عمل کس قدر شدید ہو گایا۔ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی، اس لیے پلیز ابوآپ ہمت رکھیں اور یہ سوچیں کہ زارون کو یہ سب کس طرح بتانا اور سمجھنا ہے، ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھے اپنے ساتھ لیے وہاں موجود کر سیوں میں سے ایک پہ بٹھاتے وہ خود بھی ان کے قریب بیٹھا۔

”مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہی اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ میں زارون کو یہ سب کچھ سمجھاؤں،“ نفی میں سر ہلاتے انہوں نے صاف ہی انکار کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں خود ہی بتادوں گا بس آپ پریشان نہ ہوں اور خود کو سنبھالیں،“ ان کے کندھے پہ تھوڑا دباو ڈالتے جنید نے مختلف دلیلیں دیتے انہیں زارون کے جلد تدرست ہو جانے کی تسلی دی۔

”ہاں بس مجھے میرا بیٹا ٹھیک چاہیے، تم پاکستان سے ہی نہیں باہر کے ممالک سے بھی پتا کرو ہو سکتا ہے کہیں دوائیوں کے ذریعے اس کا علاج ممکن ہو تو ہم زارون کو اتنی تکلیف میں نہ ڈالیں،“ ڈاکٹر کی زبانی کیمو کا سارا عمل اور نقصانات کا سن کر احمد صاحب نے اک آس لیے جنید سے کہا۔

”جی میں پتا کرتا ہوں، بس آپ دعا کریں اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، ان کی امید کو قائم رکھتے جنید نے انہیں تسلی دی جواب اُس کی باتوں اور دلساوں سے کچھ مطمئن ہوتے اُس کے ساتھ ہی کمرے کی جانب بڑھے جہاں زارون کو رکھا گیا تھا۔

---

کچھ دیر میں زارون کو مکمل ہوش آیا تو ڈاکٹر نے کچھ ضروری ہدایات اور میڈیسین دینے کے بعد اسے ڈسچارج کر دیا۔

”زارون گلے میں زیادہ درد ہے تو ابھی بتا دو“، گاڑی میں بیٹھتے جنید نے اُسے مخاطب کیا جو اپنے گلے پہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔

”نہیں، زیادہ نہیں ہے“، ہسپتال میں مزید رکنے کے ڈر سے جھوٹ بولتے اُس نے کھنکھارتے ہوئے اپنی آواز کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا ٹھیک ہے ویسے ڈاکٹر نے پین کلر لگائے ہیں، امید ہے کہ تمہیں زیادہ درد محسوس نہیں ہو گا“، پانی کی بوتل اُس کی طرف بڑھاتے جنید نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

---

”کیا بتایا ڈاکٹر نے؟ مطلب کیا رپورٹ آئی ہے؟“ پانی کے دو گھونٹ بھرنے کے بعد زارون نے ڈاکٹر کا نام سنتے ہی سوال کیا تو جنید نے اس وقت موقع دیکھا اُسے سب بتانے کا فیصلہ کیا۔

”دیکھو زارون بات ایسی ہے کہ ہم نہ تو تم سے زیادہ دیر چھپا سکتے ہیں اور نہ ہی وہ چھپی رہ سکتی،“ گاڑی سڑک پہ ڈالتے جنید نے اُس کی اسپیڈ آہستہ کرتے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”ہم جانتا ہوں، بتائیں آپ میں سُن رہا ہوں“، ہوش میں آنے کے بعد ان کے چہروں پر پریشانی دیکھ زارون کو اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے تب ہی اپنے لمحے سے اطمینان ظاہر کرتے اُس نے خود کو ہر خبر کے لیے تیار کیا۔

”رپورٹ اچھی نہیں آئی ڈاکٹر نے جلد از جلد کیمو کروانے کا بولا ہے“، مختصر الفاظ میں اُسے بتاتے جنید نے اُس کے تاثرات دیکھنے کے لیے ایک نظر اُس کے چہرے پہ ڈالی۔

”نہیں، میں کچھ نہیں کراؤں گا بس جتنی زندگی ہے ایسے ہی گزار لوں گا“، لمحے کے ساتھ ساتھ الفاظ کو بھی بے تاثر کرتے اُس نے منع کیا۔

”مطلوب ساری زندگی یو نہی تکلیف میں رہو گے؟ یا ربات کو سمجھنے کی کوشش کرو، کیمو بس کچھ انجکشن ڈال کر ڈرپ وغیرہ لگانے کا نام ہے۔ ہاں انجکشن تیز ہوتے کچھ دیر کے لیے جسم میں

گرماش پیدا کر دیتے پر یہ عمل اتنا مشکل نہیں ہے، اُسے کیمو کے بارے میں آگاہ کرتے جنید نے منانے کی کوشش کی۔

”میں نے کہانا کہ مجھے کچھ نہیں کروانا تو بس جو جیسا ہے ویسا ہی رہنے دیں“، اُس کی وضاحت پر اس بار سختی کے ساتھ انکار کرتے زارون نے باہر گزرتی گاڑیوں کو دیکھا تو احمد صاحب نے اشارہ کرتے جنید کو مزید کچھ بولنے سے روکا۔

”گھر جا کر بات کریں گے“، زارون کے چہرے پر چھائی اذیت کو دیکھا تو احمد صاحب نے اُسے منع کیا جو اثبات میں سر ہلاتے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا چکا تھا۔

-----

گھر پہنچتے ہی ماہم سے ملنے اور کچھ دیر سب کے ساتھ بیٹھے رہنے کے بعد زارون نے کچھ دیر آرام کا کہا اور اپنے کمرے میں آگیا۔

”نور پیٹا زارون کی چائے کمرے میں دے آؤ“، وہ سب کے لیے چائے بنایا کر لاؤ نج میں لائی تو عابدہ بیگم نے اُسے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے باقی سب کو چائے دینے کے بعد ایک کپ اور کچھ بسکٹ اور کیک پلیٹ میں رکھتے اور پر لے آئی۔

”زار سو گئے ہیں کیا؟“ ٹرے سائیڈ ٹیبل پر رکھتے نور نے اُسے مخاطب کیا جو آنکھوں پر بازو رکھ لیٹا تھا۔

”نہیں سویا، کوئی کام تھا کیا؟“ بازو ہٹاتے زارون نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔  
”ہونہ بجھے کیا کام ہو گا آپ سے، چائے لے کر آئی ہوں پی لیں،“ اُس کے قریب بیٹھتے نور نے کپ اٹھا کر اُس کی نظروں کے سامنے کیا۔

”دل نہیں ہے میرا تم پی لو،“ نفی میں سر ہلاتے زارون نے چائے پینے سے انکار کیا تو نور نے کپ واپس رکھتے اُسے گھورا جو جب سے واپس آیا تھا کچھ عجیب ہی رو یہ اختیار کیے ہوئے تھا۔

”کیوں دل نہیں کر رہا؟ کیا ہوا ہے؟ کوئی مسئلہ ہے کیا اور یہ آپ کا گلا ایک دم سے اتنا خراب کیسے ہو گیا؟“ اُسے کچھ الجھا اور پریشان دیکھ نور نے فکر مندی کا اظہار کرتے ایک ساتھ کئی سوال پوچھے۔

”نہیں کوئی مسئلہ نہیں اور گلامٹی کی وجہ سے خراب ہو جاتا میرا،“ اُسے جا نچحتی ہوئی نظروں سے اپنے چہرے کی جانب دیکھتا پا کر زارون نے مختصر سا جواب دیا اور تنکیہ سے سر اٹھا کر اُس کی گود میں رکھ کے لیٹ گیا جو اُس کی حرکت پر سانس روکے بالکل ساکت ہو چکی تھی۔

”سرد باو میرا“، اُس کی خاموشی پہ خود ہی اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی پیشانی پر رکھتے زارون نے کہا تو نور نے ہوش میں آتے اُس کی طرف دیکھا۔

”کیا ہوا؟ ایسے گھور کیوں رہی ہو؟ کوئی غلط فرماں ش کر دی ہے کیا میں نے؟“ اُسے ٹکلٹکی باندھے اپنی جانب متوجہ پا کر زارون نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے معصوم بننے کی کوشش کی۔

”ن۔۔۔ نہی۔۔۔ یہ۔۔۔ وہ مجھے نیچے۔۔۔ جانا تھا۔ میں آگر دبادوں گی“، بہانہ بناتے نور نے وہاں سے فرار ہونا چاہا۔

”نهیں جانا کہیں بھی بس میرے پاس رہو“، اُسے تنگ کرنے کے لیے وہیں جم کر لیئے زارون نے تھوڑی سختی دکھائی تو نور نے چہرے پہ آتی بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے کرتے اپنے تیزی سے دھڑکتے دل پہ قابو پایا اور ہلاکا ساد باوڈا لتنے اُس کا سرد بانے لگی۔

”رات کو نیند آگئی تھی میرے بغیر؟“ دوسری طرف مسلسل خاموشی پہ زارون نے ایک بار پھر سے سوال کیا۔

”ج۔۔۔ جی“، اُس سے نظریں ملائے بغیر نور نے ہکلاتے ہوئے بتایا۔ ”مطلوب تم اب میرے بغیر بھی آسانی سے سو سکتی ہو؟“ پیشانی سے اُس کا ہاتھ ہٹاتے زارون نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

”ن۔۔۔ نہی۔۔۔ میں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ میں تھک گئی تھی اسی لیے نیند آگئی“، اُس کی گھوری پہ جلدی سے وضاحت دیتے نور نے اپنی تیز ہوتی دھڑکنوں سے گھبرا کر لبجے میں نمی سموئی تو زارون نے اُسے مزید تنگ کرنے کا رادہ ترک کرتے اُس کی گود سے سر اٹھایا۔

”تو اس میں گھرانے کی کیا بات ہے، پلیزا ایسے ڈرامت کرو تم ایسے میرے قریب آنے سے خوف زدہ ہوتی ہو تو مجھے لگتا کہ میں کوئی ڈرائیکیو لا ہوں جس کی شکل دیکھ کر ہی تمہیں رونا آجائنا“، اُس کے رخسار پہ بہتے آنسو کو دیکھتے زارون نے خفگی سے منہ پھلا یا تو نور کو رو تے رو تے ہنسی آگئی۔

”ہاں ہنس لو، اڑا لو مجھ معصوم کا مذاق“، اُس کے دھوپ چھاؤں سے رنگوں کو دیکھ چہرے پہ مصنوعی خفگی سجائے زارون نے بازو اپنے سینے پہ باندھے۔ ”معصوم اور آپ؟ تو بہ توبہ زارا تنا بڑا جھوٹ تو نہ بولیں“، معصوم لفظ پہ حیرت کا اظہار کرتے نور نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔

”ہاں تو، معصوم ہی ہوں ناجو تم جیسی چڑیں کے ساتھ گزارا کر رہا“، اُس کی بات کا جواب دیتے زارون نے آگے بڑھتے نامحسوس طریقے سے اُس کے گال پہ اٹکے آنسو کو اپنے ہونٹوں میں جذب کیا۔

”بُرے ہیں آپ“، اُس کے لمس کو اپنی رخسار پہ محسوس کرتے ہی وہ اُسے مزید پیش رفت کا موقع دیے بغیر ہی پیچھے کی جانب دھکا دیتے اٹھی اور کچھ بھی سوچ سمجھے بغیر کمرے سے نکل گئی۔

”ہونہ بس ہر وقت بھاگنے اور رونے کی ہی پڑی رہتی ہے، شوہر کا تو کوئی خیال ہی نہیں“، اُس کے جاتے ہی خود کلامی کرتے زارون نے ایک نظر ٹیبل پہ پڑی چائے کو دیکھا اور غنوڈگی سی محسوس کرتے کچھ دیر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

-----

”رضامیں سوچ رہی تھی کہ ہم لوگ زارون کی ساری فیملی کو دعوت پہ بلا لیں، مطلب اُس کے بھائی بھا بھی بھی نہیں اور بہن بھی تو بس اس بہانے سب یہاں اکٹھے ہو جائیں گے اور ہماری ان سے ملاقات بھی ہو جائے گی“، نائلہ بیگم نے اُسے پاس بلاتے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

”جی ٹھیک ہے جیسے آپ کو مناسب لگتا ہے کر لیں پروہ لوگ آجائیں گے کیا؟ میرا مطلب نہیں کوئی اعتراض نہ ہو“، رضانے دبے لفظوں میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

”نہیں اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ میں پھر بھی پہلے عابدہ بیگم سے پوچھ لوں گی“، اُس کے خدشے پہ تسلی دیتے نائلہ بیگم نے اپنا موبائل اٹھایا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ بات کر لیں اور جو بھی فائل ہو مجھے بتا دیجیے گا“، انہیں نمبر ملاتا دیکھ رضاۓ تاکید کی اور ابراہیم کی طرف جانے کا بتاتے باہر کی جانب بڑھا۔

”السلام علیکم کیسی ہیں آپ؟“ دوسری طرف کا لریسیو ہوئی تو نائلہ بیگم نے خوش دلی سے سلام میں پہل کی۔

”وعلیکم السلام میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں؟“ لاڈنچ میں شور کی وجہ سے موائلے کر باہر آتے عابدہ بیگم نے بھی نرمی سے استفسار کیا۔

”جی اللہ کا کرم ہے۔ گھر میں سب کیسے ہیں؟ احمد بھائی کی طبیعت ٹھیک ہے؟ اور لگتا ہے کافی رونق لگی ہوئی ہے؟“ پچھے سے آنے والے شور پہ مسکراتے نائلہ بیگم نے ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

”جی جی بس سب مل کر بیٹھے ہیں اور سب ٹھیک ہیں اللہ کا بڑا احسان ہے۔ آپ بتائیں رضا کیسا ہے اُس کی پڑھائی کیسی جارہی ہے؟“ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی بیٹھ پہ بیٹھتے عابدہ بیگم نے تسلی سے جواب دیتے رضا کے بارے میں پوچھا۔

”جی وہ ٹھیک ہے، پڑھائی بھی اچھی جارہی ہے۔ وہ بس میں نے آپ کو ایک ضروری کام کے لیے کال کی ہے۔ آپ مصروف تو نہیں ہیں؟“ تھوڑا ہچکچاتے نائلہ بیگم نے اصل مدعا پہ آتے سوال کیا۔

”نہیں میں مصروف نہیں ہوں، آپ بے جھجک بولیں جو بھی بات ہے“، اُن کے لہجے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے عابدہ بیگم نے بڑی اپنا نیت کے ساتھ انہیں بولنے کے لیے اکسایا۔

”جی وہ، میں بس آپ سب کو اپنے گھر دعوت پہ بلانا چاہ رہی تھی اگر آپ کے پاس وقت ہو؟“ اپنا گلا کھنکھارتے نائلہ بیگم نے اصل مقصد بیان کرتے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”جی جی وقت ہے اور اگر نہ بھی ہوتا تو ہم آپ کے لیے ضرور نکال لیتے، بس آپ تیاری کریں اور ہمیں دن بتادیں کہ ہم لوگ کب آپ کو اپنی خدمت کا موقع دیں“، اُن کی بات پہ مسکراتے عابدہ بیگم نے کھلے دل سے نہ صرف اُن کی دعوت قبول کی بلکہ اپنی باتوں اور اخلاق سے نائلہ بیگم کی جھجک کو بھی دور کیا۔

”بہت شکر یہ آپ کا، اور ویسے تو آپ کا جب دل چاہے آپ آسکتے ہیں، مگر مقررہ وقت کا پوچھر رہیں تو کل کارات کا وقت کیسار ہے گا؟“، فیصلہ اُن کے اوپر چھوڑتے نائلہ بیگم نے رائے طلب کی۔

”جی ٹھیک ہے ہم لوگ کل آجائیں گئے۔ باقی اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ مطلب دوبارہ توبی پی کا مسئلہ نہیں ہوا؟“، اُن کی بات کی تائید کرتے عابدہ بیگم نے کل رات کی دعوت کی حامی بھرتے اُن سے اُن کی طبیعت کے متعلق پوچھا اور مزید ایک دو باتیں کرنے کے بعد کل ملاقات کا بولتے کال کاٹ دی۔

”کس کافون تھا؟“ ماہم جو انہیں دیکھنے کمرے میں آئی تھی ان کے موبائل کان سے ہٹاتے ہی پوچھنے لگی۔

”نور کی امی کا تھا، کل کی دعوت کا بول رہی تھیں“، موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے عابدہ بیگم نے اُسے بتایا۔

”دعوت؟ مطلب سب گھروالوں کو بلا�ا ہے؟“ ان کے قریب ہی آکر بیڈ پر بیٹھتے ماہم نے تصدیق چاہی۔

”ہاں توجہ دعوت کا بولا تو سب کی ہی ہے نا“، اُس کے بے تکے سوال پر تیوری چڑھاتے انہیں نے جواب دیا۔

”میرا مطلب حنا بھا بھی بھی جائیں گی؟“ ان کی بات سنتے ماہم نے حیرت سے ایک اور سوال پوچھا۔

”ماہم کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ جب سب گھروالوں کا کہا ہے تو پھر اس سوال کا کیا مقصد؟“ حنا کے نام پر ماتھے پہ بل لیے انہیں نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”امی آپ کو نہیں لگتا کہ حنا بھا بھی کا وہاں جانا مناسب نہیں۔ میرا مطلب وہ جس طرح نور کے ساتھ بولتیں طنز کرتیں، مجھے نہیں لگتا کہ وہ وہاں جا کر باز آئیں گی“، ان کا ہاتھ تھامتے ماہم نے اپنے دماغ میں چلتی کشکاش کو ان کے سامنے بیان کیا۔

”تم ایسے ہی فضول سوچ رہی ہو اور تمہارے سامنے ہی حنانے رات کو مجھ سے معافی مانگی اور نور سے بھی اپنارو یہ درست کرنے کا بولا تھا؟ بس تم بے فکر رہو مجھے نہیں لگتا کہ اب وہ مزید کوئی بد تمیزی کرے گی“، اُس کے شک کی نفی کرتے عابدہ بیگم نے اُس کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی تسلی دی۔

”اللہ کرے ایسا ہی ہو پر مجھے رات سے حنا بھا بھی کارو یہ دیکھ عجیب سی بے چینی لگی ہے اور ان حالات میں نور کے گھر جانا... اچھا چلیں چھوڑیں جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ آپ مجھے یہ بتائیں کے ماموں لوگ آج کل کہاں غائب ہیں؟“، اپنی بات پیچ میں، ہی ادھوری چھوڑے ماہم نے عابدہ بیگم کو پریشان دیکھ کر بات بدلتی اور اپنے ماموں کے متعلق پوچھنے لگی جو اُس کے آنے کا پتا چلنے پہ بھی ابھی تک اُس سے ملنے نہیں آئے تھے۔

-----

”جنید کیا بنا پھر زمین کا؟ مطلب کوئی معاملہ حل ہوا یا نہیں؟“، کمرے میں آتے ہی تہائی پاتے حنا نے بڑی رازداری سے اُس کے قریب بیٹھتے سوال کیا جو ساری رات کی بے آرامی کی وجہ سے اب کچھ دیر سونے کی غرض سے لیٹا تھا۔

”نہیں ابھی نہیں ہوا پر امید ہے کہ جلد ہو جائے گا اور تم نے اس بات کا ذکر کسی سے کیا تو نہیں تھا؟ میرا مطلب ہما سے؟“، تصدیق کے لیے اُس نے اپنی بات چھوڑی۔

”نہیں، میں پاگل ہوں کیا؟ جو اُس بے وقوف سے اس بات کا ذکر کرتی“، نفی میں سر ہلاتے اُس نے کندھے اچکاتے اپنی عقل مندی ظاہر کی۔

”ٹھیک ہے بس خیال رکھنا اور ابھی اس بات کا ذکر کسی سے مت کرنا“، اُسے تاکید کرتے اُس نے تکلیف ٹھیک کیا تو حنانے اُسے سونے کی تیاری کرتا دیکھے منہ بسورا۔

”اب آپ سو کیوں رہے ہیں؟ کل سارا دن اور رات آپ نے باہر گزار دی اور اب بھی مجھ سے با تین کرنے کی بجائے آپ کو سونے کی پڑی ہے“، تیوری چڑھاتے اُس نے کمفرٹ رأس کے چہرے سے ہٹایا۔

”تو کیا کروں یا ررات ساری بس کاموں میں سوہی نہیں پایا اور اب تو نیند سے سر میں درد ہو رہا، پلیز بس تھوڑی دیر سونے دو پھر میں اٹھ کر تمہاری ساری باتیں سن لوں گا“، نظروں میں التجاء لیے اُس نے ہنا سے درخواست کی۔

”اچھا ٹھیک ہے سو جائیں پر اٹھ کر آپ نے مجھے امی کی طرف لے کر جانا ہے اور اس بار میں آپ کا کوئی بہانہ نہیں سنوں گی“، کفر ٹرچھوڑتے اُس نے اپنی شرط بتائی جس پر سر ہلاتے جنید نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔

”ٹھیک ہے لے جاؤں گا بس تم مجھے چار بجے تک جگادینا“، کفر ٹرچھر سے چہرے پہ لیتے جنید نے اُسے تاکید کی تو ہنا نے اُس کے ارادے مضبوط دیکھا ایک لمبی سانس لیتے خود کو پر سکون کیا اور سچان کے رونے کی آواز سننے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھی تاکہ اُسے دیکھ سکے جیسے وہ کچھ دیر کے لیے نسرین کے حوالے کر کے آئی تھی۔

-----

”ارحم بیٹا کیا کر رہے ہو؟ مطلب کوئی مصروفیت تو نہیں ہے؟“ اُس کے کمرے کے دروازے پہ دستک دیتے ہاشم صاحب نے اُسے لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ نظریں جمائے بیٹھا دیکھ کے پوچھا۔

”نہیں، کوئی مصروفیت نہیں ہے آپ انہیں وہاں کیوں کھڑے ہیں“، انہیں دروازے پر رکا دیکھ ارحم نے جواب دینے کے ساتھ ہی لیپ ٹاپ بند کرتے ایک سانیڈ پر رکھا۔

”وہ مجھے ایک ضروری کام تھا تم سے اس لیے اس وقت تمہیں تکلیف دی“، اندر داخل ہوتے اس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھتے انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”جی بولیں کیا بات ہے، خیریت ہے نا؟“، انہیں اجازت دینے کے ساتھ ہی ارحم نے فکر مندی سے استفسار کیا۔

”ہاں ہاں خیریت ہی ہے۔ وہ میں نے اور تمہاری امی نے آج شام رابعہ کی طرف جانے کا سوچا ہے کیونکہ اب ہم چاہتے ہیں کہ جلد از جلد تمہاری شادی ہو جائے اور ہم اپنی زندگی میں ہی تمہاری تمام خوشیاں دیکھ سکیں“، ہاشم صاحب نے اُسے اپنے ارداوں سے آگاہ کرتے رائے طلب کی۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کو مناسب لگتا ہے کر لیں، مجھے کوئی اعتراض نہیں پر شاید رابعہ کے گھروالوں کو ہو۔ میرا مطلب اُس کی پڑھائی ابھی نا مکمل ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ ابھی اس بات کے لیے تیار نہ ہوں“، انہیں اپنی رائے دیتے ارحم نے خدشہ ظاہر کیا۔

”نہیں انہیں کوئی اعتراض نہیں، میں نے ظفر سے بات کر لی تھی اور اُس کی طرف سے اجازت ملنے پہ ہی میں تم سے بات کرنے آیا ہوں“، اُس کے خدشے کو دور کرتے ہاشم صاحب نے اُسے مطمئن رہنے کا بولا تو ارحمنے بے ساختہ ابھر نے والی مسکراہٹ کو چھپاتے اثبات میں سر ہلا یا۔

”ٹھیک ہے، پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، آپ جائیں بلکہ میری ڈیٹ فائل ہونی ہے نا؟ تو میں بھی ساتھ جاؤں گا“، اُن کی تسلی پہ فٹ سے اپنا مطلب بیان کرتے ارحمنے سوالیہ نظر وہ سے انہیں دیکھا جواب اُس کی جلد بازی اور جوش دیکھ بس اُسے گھور کر رہ گئے۔

”شرم کرو، لڑکے خود اپنی شادی کی ڈیٹ فائل کرنے نہیں جاتے اس لیے خاموشی سے گھر بیٹھو“، آنکھیں نکالتے اُس کی ساری خواہشات پہ پانی پھیرتے ہاشم صاحب نے اُسے ڈپٹا اور جواب زبان سے جواب دینے کی بجائے بس منہ ب سورے اپنی ناراضی کا اظہار کرنے لگا۔

”ہاں بس جس کی شادی اُسے تو کوئی پوچھتا ہی نہیں حد ہے سارے فیصلہ خود ہی کیے جا رہے سب“، ہاشم صاحب نے اُس کی ناراضی کو خاطر میں لائے بغیر اپنا خ باہر کی جانب کیا تو ارحمنے غصے سے منہ میں بڑھاتے اپنا مو باکل اٹھایا تاکہ رابعہ کو اس اہم خبر کے بارے میں بتاسکے۔

-----

شام پانچ بجے کے قریب زارون کی آنکھ کھلی تو کمرے میں ہر طرف خاموشی محسوس کرتے اُس نے سر اٹھا کر دیکھا۔

”لگتا ہے چڑیل ابھی تک کمرے میں واپس نہیں آئی“، اُس کی غیر موجودگی پہ خود کلامی کرتے اُس نے ایک بھر پور انگڑائی لی اور اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھاتا کہ نہا کراپنے آپ پہ غالب سستی کے غبار کو اُتار سکے۔

”نور پیدا زارون اٹھ گیا ہے یا نہیں؟“، احمد صاحب جو گھنٹوں کے درد کی وجہ سے سیڑھیاں چڑھنے سے کتراتے تھے انہوں نے اُسے ہما اور ماہم کے ساتھ بیٹھے دیکھ استفسار کیا۔

”نہیں بابا ابھی نہیں اٹھے، میں ابھی کچھ دیر پہلے ہی دیکھ کر آئی تھی“، ان کی جانب متوجہ ہوتے نور نے عبیرہ کو اپنی گود سے اتارا۔

”اچھا، پھر بھی ایک بار دیکھ آؤ شاید اٹھ گیا ہو“، ڈاکٹر کی باتوں اور زارون کے تلخ رویے سے پریشان احمد صاحب بے چینی محسوس کرتے پچھلے دو تین گھنٹوں میں چار پانچ بار نور اُسے دیکھنے کے لیے بھیج چکے تھے۔

”احمد کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ زارون کے بارے میں آج ایسے پریشان کیوں ہو رہے ہیں؟ اور پچھلے کافی بار اوپر کے چکر لگا چکی ہے“، ان کی آواز پر کچن سے نکلتے عابدہ بیگم نے نور کے کوئی جواب دینے سے پہلے ہی ان کے قریب آتے سوال کیا۔

”نہیں، پریشان کیوں ہونا بس اُس کا گلا خراب تھارات بھی بخار تھاسی لیے کہہ رہا ہوں کہ دیکھ لو کہیں زیادہ طبیعت خراب نہ ہو جائے“، اپنے لبھ کے ساتھ ساتھ بات کو بھی سن بھالتے احمد صاحب نے اپنی فکر کی وضاحت دی۔

”اچھا، ٹھیک ہے، نور تم بیٹھو میں دیکھ کر آتی ہوں“، اُس کے چہرے پر بے زاری دیکھ عابدہ بیگم نے احمد صاحب کی بات کمل ہوتے ہی اثبات میں سر ہلایا اور خود زارون کو دیکھنے کے لیے اوپر کی جانب بڑھیں۔

”لگتا ہے واش روم میں ہے“، دروازہ کھولتے ایک نظر خالی کمرے کو دیکھ انہوں نے واش روم سے پانی گرنے کی آواز پہ اندازہ لگایا۔

”پتا نہیں احمد کو کیا ہو گیا ہے، جب سے آئے ہیں بس بار بار زارون کا پوچھ رہے ضرور کوئی بات ہے جو یہ مجھ سے چھپا رہے ہیں“، وہیں صوفے پر بیٹھتے زارون کے باہر آنے کا انتظار کرتے عابدہ بیگم

نے پر سوچ انداز میں خود کلامی کی اور صحیح سے احمد صاحب کے برترے جانے والے رویے کے متعلق سوچنے لگیں جس میں فکر کے ساتھ ساتھ پریشانی اور تشویش بھی شامل تھی۔

”امی آپ یہاں؟ خیریت ہے؟“ واشن روم سے باہر آتے ہی انہیں کسی سوچ میں گم دیکھ زارون نے تو لیے سے اپنے بال صاف کرتے انہیں مخاطب کیا۔

”ہاں خیریت ہے بس تمہیں ہی دیکھنے آئی تھی، طبیعت کیسی ہے اب؟ اور گلا کچھ بہتر ہوا؟“ اُس کی آواز پر ہوش میں آتے اُس کی جانب متوجہ ہوتے عابدہ بیگم نے اپنی وہاں موجودگی کی وجہ بتاتے اُس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔

”جی ٹھیک ہے اب بس رات نیند پوری نہیں ہوئی تھی، اس لیے کچھ زیادہ دیر سو گیا“، انہیں اپنے لیے پریشان دیکھ زارون نے طبیعت کے ساتھ ساتھ اپنے زیادہ دیر تک سونے کے بارے میں بھی وضاحت پیش کی۔

”اچھا کوئی بات نہیں بس تم بال وغیرہ برش کر کے نیچے آجائو تمہارے ابو کتنی ہی بار تمہارے بارے میں پوچھ چکے ہیں“، اُسے برش اٹھاتا دیکھ عابدہ بیگم نے تاکید کی تو زارون نے دو منٹ میں آنے کا بولتے اُن کے کمرے سے نکلتے ہی جلدی سے اپنے بال برش کیے اور پرفیوم اسپرے کرتے اپنا مو باکل لیے نیچے کی جانب بڑھا۔

”حبہ ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو“، اُسے بچوں کے ساتھ مصروف دیکھ سارہ بیگم نے خود ہی اُسے مناسب کیا جو پچھلے دو تین دن سے اُن سے ناراض تھی۔ ”جی؟“ بچوں کو ملازمہ کے حوالے کرتے وہ اپنا روایہ مزید اُن کے ساتھ سخت نہیں کر سکی تب ہی کوئی بھی بہانہ بنائے خاموشی سے اُن کے قریب آبیٹھی۔ ”ناراض ہو مجھ سے؟“ اُسے نظریں جھکائے بیٹھادیکھ اُنہوں نے آنکھوں میں نمی لیے سوال کیا۔

”نہیں میں نے کیوں ناراض ہونا ہے“، کندھے اچکاتے اُس نے ایک تلخ مسکراہٹ اپنے چہرے پہ سجائی۔

”اُس دن میں نے جو بھی کہا اگر ہو سکے تو مجھے اُس کے لیے معاف کر دینا۔ میں نے بس تمہارے مستقبل کا سوچ کر تھوڑی خود غرضی سے کام لیا“، اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑتے سارہ بیگم نے بیٹی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ بے بسی کی انتہاء تک پہنچتے معدرات کی۔

”امی پلیز کیا کر رہیں ہیں آپ، ایسا کر کے مجھے شرمندہ تونہ کریں“، اُن کے ہاتھ ینچے کرتے حبہ نے ایک نظر ملازمہ کی طرف دیکھا جو بچوں کو لیے باہر لان میں جا چکی تھی۔

”میں تمہیں شرمندہ کرنا نہیں چاہتی اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ تم ایک بار پھر سے اپنی ماں کے لیے دل میں کوئی بدگمانی پیدا کرو۔ دیکھو بیٹا بچوں کو احتشام کے حوالے کر کے تمہارا گھر بسانے کا سوچنا ایک فطری عمل ہے۔ میں ماں ہوں اور کوئی بھی ماں یہ نہیں چاہتی کہ اُس کی جوان بیٹی اپنی پوری زندگی کسی مضبوط سہارے کے بغیر گزار دے“، دپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے سارہ بیگم نے اُس کا رو یہ ٹھیک دیکھ کر اپنی صفائی پیش کی۔

”جی، میں جانتی ہوں پر میں ابو کو بھی بتا چکی ہوں اور آپ کو بھی بتا رہی ہوں کہ میرے مستقبل کے حوالے سے کوئی بھی خواب نہ دیکھیں۔ میں اب کسی اور شخص کو اپنی زندگی میں شامل کرنا نہیں چاہتی اور رہی بات مضبوط سہارے کی تو میرے بچے ہی میرا سب کچھ ہیں۔ بس باقی زندگی میں اُن کے سہارے گزار دوں گی اسلیے پلیز.... اگر آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ سے خفانہ ہوں تو اس بات کا ذکر دو بارہ میرے سامنے مت کریے گا“، اپنے غصے کو ایک سائیڈ پر رکھتے ہبہ نے لمحے کو نرم کیے بغیر سختی سے اپنی بات پہ زور دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے، جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہو گا اور آج کے بعد ہم تمہاری مرضی کے بغیر کوئی بات نہیں کریں گے“، اُس کے ارادوں میں پختگی دیکھ سارہ بیگم نے اس موضوع پر کسی اور وقت بات

کرنے کا سوچتے معااملے کو رفع کیا اور اُس سے بچوں کے سکول داخلے کے متعلق پوچھنے لگیں جو چار سال کے ہو چکے تھے۔

---

زارون سے ملاقات کے بعد احمد صاحب پر سکون ہو کر اپنے کمرے میں آگئے تو جنید بھی حنا کو تیار ہونے کا بولتے باہر آیا جہاں گھر کے تمام افراد خوش گپیوں میں مصروف تھے۔

”واہ جی واہ یہاں تو خوب رونق لگی ہوئی ہے“، ماہم ہما، زارون اور نور جو لڈو کھلینے میں مصروف کسی بات پر شور مچا رہے تھے جنید کی آواز پر اُس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”بھائی دیکھ لیں یہ تینوں چالاک خواتین مل کر مجھ معموم کی بینڈ بجارتی ہیں“، زارون نے اُسے مدد طلب نظر وں سے دیکھتے ہی شکوہ کیا۔

”خواتین؟ یہ تم نے خواتین کس کا بولا؟ ہم دودو بچوں کی امی بن کر بھی تم سے چھوٹی ہی لگتی ہیں“، خواتین لفظ پہ بھڑکتے ماہم نے اُسے پھر سے گھیرا جو جتنے کے چکر میں مسلسل بے ایمانی کر رہا تھا۔

”توبہ اللہ کا خوف کرو، تمہارے ساتھ کے تو کوئے بھی فوت ہو چکے ہیں اور بس جاؤ اگر ایسی ہی بات ہے تو میں نہیں کھیل رہا تم لوگوں کے ساتھ“، اپنی بے ایمانی پکڑے جانے پر رب جماتے زارون نے ساری گوٹوں کو ہاتھ مارتے گرایا۔

”تم ہو ہی بد تیزیز ہمیشہ ایسا ہی کرتے ہو“، غصے میں پاس پڑا کشن اُس کے سر پہ مارتے ماہم نے اپنا غصہ نکالا اور ہما اور نور کو ساتھ لیے لڈو سیمت اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

”اُفف توبہ ہے ان عورتوں سے“، ان کے جاتے ہی زارون نے کانوں کے ہاتھ لگائے تو جنید نے اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ قہقہہ لگایا۔

”ہاں بس یہی حال ہے اور تمہیں کس عقل مند نے مشورہ دیا تھا کہ ان کے ساتھ کھیلو“، اُس کے قریب ہی صوفی پہ بیٹھتے جنید نے اُسے صحیح کی نسبت اس وقت قدرے بہتر دیکھ خود بھی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بس دماغ خراب تھا جو ان پاگلوں کے ساتھ بیٹھ گیا کھیلنے، توبہ ہے کھیلنا خود کو نہیں آتا اور سارا الزام مجھ پہ لگائے جا رہیں کہ میں بے ایمانی کر رہا“، چہرے پہ کسی بھی تکلیف کا کوئی بھی آثار لیے بغیر زارون نے اپنا غصہ نکالا۔

”اچھا بس چھوڑوا نہیں اور بتاؤ طبیعت کیسی ہے؟ بخار و غیرہ تو نہیں ہے؟“ کہنے کے ساتھ ہی جنید نے اُس کی پیشانی پہ ہاتھ لگاتے خود حرارت کو محسوس کیا۔

”ٹھیک ہوں میں اور میں نے ویسے بیمار نہیں ہو نا پر آپ کی اور ابو کی پریشانی اور مسلسل توجہ سے ہو جانا“، بات کو مذاق میں ڈالتے زارون نے غیر سنجیدگی سے اپنی بات کی۔

”بات فکر کی ہے تو تب ہی پریشان ہو رہے ورنہ ہمیں بھی کوئی شوق نہیں پڑا پریشان ہونے کا“، اُس کے مذاق پہ اُسے ایک گھوری سے نوازتے جنید نے اس وقت اس کا موڈ ٹھیک دیکھ کیمو کی بات کرنا چاہی تاکہ وہ جلد از جلد ان کی بات سمجھتے حامی بھردے۔

”افف بھائی آپ خو مخواہ ہی پریشان ہو رہے۔ میں ٹھیک ہوں اور کینسر کوئی بہت بڑی بیماری نہیں ہے جس کے ہوتے ہی میں فوراً سے مر جاؤں گا“، اپنی ہی دھن میں بولتے زارون نے لاونچ کے باہر کھڑے وجود کو ساکت کیا جو بس اندر قدم رکھنے والی تھی۔

”زارون فضول مت بولو اور اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو“، اُس کی بات پہ اب کی بار تھوڑی سختی سے جنید نے اُسے ڈپٹا۔

”اُفف پتا نہیں کیا ہو گیا ہے آپ کو اور ابو کو مجھے تو کچھ بولنے بھی نہیں دیتے“، اُس کے ڈانٹنے پر  
بے زاری دکھاتے وہ مزید کچھ کہے بغیر اٹھا تو باہر کھڑا وجود ہوش میں آتے ہی اُس کے وہاں سے  
نکلنے سے پہلے ہی دروازے سے ہٹ کر دیوار کی اوڑی میں چھپ گیا۔

---

”یار کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں بات بات پر یوں غصہ کر کے ہماری پریشانی میں مزید اضافہ کر  
رہے ہو؟“ اُسے باہر کی جانب بڑھتا دیکھ جنید نے اُس کے سامنے آتے راستہ روکا۔  
”تو کیا کروں؟ آپ کے کہنے پر عمل کر کے سب کے لیے تماشہ بن جاؤ؟ بھائی پلیز میں ایسا نہیں  
کر سکتا“، ان کے اصرار پر چہرے پر بے بسی لیے زارون نے انہیں اپنے موقف پر قائل کرنے کی  
کوشش کی۔

”تماشہ؟؟ علاج کروانے سے شاید ہی تم اُس تماشے سے بچ جاؤ جو ساری زندگی محتاجی کی صورت  
تمہارے گلے پڑ جائے گا اور کیا چاہتے ہو تم امی ابو ساری زندگی تمہیں تکلیف میں دیکھ دیکھ کے  
اذیت میں رہیں؟ زارون پلیز کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ تم ایک پڑھے لکھے انسان ہو اور ایسے معاملے

میں تمہارا انکار اور ہٹ دھرمی، میری سمجھ سے بالکل باہر ہے، جنید نے اُس کی سوچ پر افسوس کرتے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”پلیز بھائی ہم کسی اور موضوع پر بات کر سکتے ہیں؟“ اُس کی نصیحتوں کو در گزر کرتے زارون نے جواب دینے کی بجائے بات بدلتی۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی کرو، میں ابو کو بھی منع کر دوں گا کہ وہ تم سے اس بارے میں کوئی بات نہ کریں،“ اُسے نرمی سے بات سمجھتنا نہ دیکھ جنید نے تھوری سختی دکھائی اور مزید اُس کی کوئی بھی بات سنے بغیر غصے سے لاؤنج سے نکلتے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

”آف ف پتا نہیں کیا ہو گیا ہے بھائی کو، میری تو کوئی بات ان کو سمجھ ہی نہیں آتی،“ جنید کے جاتے ہی بے بسی اور کشمکش کا شکار ہوتے زارون نے باہر جانے کے بجائے وہیں صوفے پر بیٹھتے خود کلامی کی۔

”مجھے پتا ہے سب لوگ اس بات کو سن کر سمجھ لیں گے، صبر کر لیں گے پر نور؟ وہ کیسے برداشت کر پائے گی؟ میں نے علاج شروع کروایا تو وہ ہر لمحہ مجھے تکلیف میں دیکھ دیکھ کر بے چین ہو گی، روئے گی۔ خود کوبے بس محسوس کرتے وہ اپنی معصومیت اور خوشیاں سب فرماش کر دے گی۔“

مجھے پتا ہے یہ بات یہاں سے باہر گئی تو لوگوں کے ظریطے اُس کا جینا محال کر دیں گے، نہیں میں ایسا

نہیں کر سکتا۔ میں خود کو تکلیف دے سکتا اپنی افیت برداشت کر سکتا پر اُس کی نہیں،“، اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے بے بسی کی انتہاء پہ پہنچتے زارون نے آنے والے وقت کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنے فیصلہ کو مزید مضبوط کرتے خود کو جنید کی بات نہ ماننے پر پختہ کیا۔

---

”تم یہاں ہوا اور میں تمہیں کمرے میں ڈھونڈ رہا تھا“، کمرے میں دیکھنے کے بعد جنید حنا کو تلاش کرنے کے لیے باہر آیا تو اُسے اپنی طرف آتاد کیجھ کر کہنے لگا۔ ”ہاں بس وہ میں ہما کو تیار ہونے کا بولنے گئی تھی، وہ بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گی“، چہرے اور لبھ سے کوئی بھی بات ظاہر کیے بغیر حنا نے بڑی چالاکی کے ساتھ اُسے وضاحت دی۔

”اچھا ٹھیک ہے جلدی کرلو، چھ تو ادھر ہی نجح چکے ہیں اور پھر ہمیں واپس بھی آنا ہے“، کلاک کی طرف دیکھتے جنید نے اُسے تاکید کی جو بس دس منٹ میں آنے کو بولتے جلدی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

”اُفف یہ عورتیں بھی نا، سارا وقت تیار ہونے میں ہی گزار دیتی ہیں“، اُس کے جاتے ہی جنید نے خود کلامی کی اور احمد صاحب سے زارون کے بارے میں بات کرنے کے لیے اُن کے کمرے کی جانب بڑھا۔

”اچھاتو یہ بات تھی، میں بھی کہوں کے ان باپ بیٹے کی درمیان پتا نہیں کون سی کھجڑی پک رہی ہے“، کمرے میں داخل ہوتے ہی حنا نے لمبی سانس لیتے خود کو پر سکون کیا۔

”توبہ توبہ اتنی بڑی بات اب تک سب سے چھپا کر رکھی ہوئی ہے“، زارون کے منہ سے کینسر کا سنتہ ہی جہاں حنا کو حیرت ہوئی وہیں اُس کے ہاتھ جنید اور احمد صاحب کی سب سے بڑی کمزوری بھی آگئی جسے وہ کسی بھی وقت کسی بھی طرح استعمال کر سکتی تھی۔

”اب مزہ آئے گا نور بی بی کو، بڑا زار، زار کرتی پھیرتی ہیں نا، جب اُسی زار کی اصلاحیت سامنے آئے گی تو گھٹ گھٹ کر روئے گی“، بالوں میں بر ش پھیرتے حنا کے چہرے پہ ایک طنزیہ مسکرا ہٹ بکھری جسے اُس نے دروازے پہ دستک کی آواز پہ لب سکڑتے غائب کیا۔

”آجائیں“، بر ش ڈریسنگ ٹیبل پہ واپس رکھتے اُس نے اجازت دی تو عابدہ بیگم دروازہ کھولتے اندر داخل ہوئیں۔

”حنایٹا تم مصروف تو نہیں تھیں؟ وہ دراصل مجھے تم سے بات کرنی تھی“، اُسے کھلے بالوں کے ساتھ کھڑا دیکھ عابدہ بیگم نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”نہیں امی، آپ آئیں بیٹھیں“، بالوں کو جوڑے کی شکل دیتے اُس نے کچھر میں قید کیا اور اُنہیں بیٹھنے کا بولا۔

”نہیں بیٹھنا نہیں ہے۔ بس تمہیں یہ بتانا تھا کہ کل نور کی امی کے گھر ہم سب کی دعوت ہے تو کیا تم ہمارے ساتھ چلو گی؟ میرا مطلب تمہیں کوئی کام تو نہیں ہے؟“، معقول سے انداز میں عابدہ بیگم نے اُس کی رضامندی پوچھی۔

”نہیں، کوئی کام نہیں ہے اور اگر ہوتا بھی تو میں ضرور چلتی۔ وہ دراصل جب سے ہم آئے ہیں نور کے گھر والوں سے ملاقات نہیں ہوئی اور اُس کی امی کی طبیعت بھی خراب تھی نا، بس اچھا ہے جائیں گے تو ان کی عیادت بھی ہو جائے گی“، اُن کی بات سننے ہی حنا نے ہاتھ آیا موقع گنوانا مناسب نہیں سمجھا اسی لیے جلدی سے حامی بھرتے اُس نے عابدہ بیگم کے دل کا بوجھ ہلاکا کیا جو ماہم کی باتوں سے کشمکش کا شکار ہو چکی تھیں۔

”اچھاٹھیک ہے بس تم تیاری کرو جنید بتارہا تھا کہ تم لوگوں کو جانا ہے“، اُس کا جواب سنتے ہی چہرے پہ مسکراہٹ سجائے عابدہ بیگم نے نرمی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی اور خوشی خوشی کمرے سے باہر نکلیں۔

”اُفف لوگ صحیح کہتے ہیں کبھی کبھی اللہ انسان کو کامیابی کے موقع ایک ساتھ ہی فراہم کر دیتا ہے پر ان کا فائدہ کب اور کیسے اٹھانا ہے یہ انسان کی عقل پر منحصر کرتا ہے“، عابدہ بیگم کے جاتے ہی چہرے پہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ سجائتے حنانے سوچا اور الماری سے اپنے کپڑے نکالتے تبدیل کرنے چلی گئی تاکہ جنید کے واپس آنے سے پہلے تیار ہو سکے۔

-----

”کہاں غائب ہو تم؟ صحیح سے پچاس بار میں تمہیں کال کر چکا ہوں پر نواب صاحب کے پاس ٹائم ہو تو ہم غریب بندوں کی طرف دھیان دیں“، دوسری طرف کال ریسیو ہوتے ہی ارحم نے زارون کو کچھ بولنے کا موقع دیے بغیر اُس کی کھنچائی کی جواب اپنے کمرے میں آچکا تھا۔

”بس بس، زیادہ بننے کی ضرورت نہیں ہے اور صرف دو کالزائیں ہیں تمہاری صحیح سے“، باہر بالکوئی میں آتے زارون نے اُس کی پچاس کالزوائی بات کو پکڑتے اُسے آڑے ہاتھوں لیا جواب سر کھجاتے مسکرا رہا تھا۔

”تو کی تو ہیں نا؟ تمہاری طرح تو نہیں کہ یونیورسٹی ختم تو ساتھ دوستی بھی ختم“، کپ سے چائے کا سپ لیتے ارجمنے اتنی آسانی سے اپنی ہار تسلیم کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”یونیورسٹی ابھی ختم کہاں ہوئی ہے؟ ابھی پراجیکٹ جمع کروانا باقی ہے، ہاں تمہارے لیے ختم ہی ہے تم نے کون سا بنا نا ہے جو میں تمہیں یاد کروارہا“، زارون نے اُسے یادداہی کروانے کے ساتھ ہی طنز کیا۔

”ہاں ہاں سنادو، اگر زندگی میں ایک پراجیکٹ بنانا کر دے ہی رہے ہو تو اُس کا بھی احسان ابھی سے جتنا ناشروع کر دو تاکہ میری آنے والی سات نسلوں تک یہ بات حفظ ہو جائے کہ تم نے میری مدد کی تھی“، اُس کے طنز پہ بھڑکتے ہوئے ارجمنے منہ بسورا اور چائے کا ایک اور سپ لیا۔

”اُفف تو بہ ہے تم اور نور دونوں ہی ایک جیسے ہو، گھر میں وہ ہر وقت مجھ سے لڑتی رہتی اور فون پہ تم۔ ویسے کیا کھا کے پیدا ہوئے تھے تم دونوں؟“ اُس کی ڈرامے بازی پہ بھنوئیں اچکاتے زارون نے وہاں موجود کرسی پہ بیٹھتے رات کی پہلی تاریکی کو دیکھا۔

”نور کا توپتا نہیں پر میں نے پیدا ہوتے ہی چائے پی تھی اور اب بھی پی رہا“، اُس کے تنے پہ اپنی ہنسی چھپاتے ارحام نے ایک اور سپ بھر اتو زارون نے اُس کے لئے جواب پہ ضبط سے اپنی آنکھیں بند کرتے اپنے غصے کو کنٹرول کیا۔

”ٹھیک ہے پی لو اور یہ بتادو کہ اس وقت میرا سر کھانے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی تمہیں؟“، زارون نے دبے لفظوں میں اُس سے اُس کے فون کرنے کی وجہ پوچھی۔

”وہ میں آج کافی زیادہ خوش تھا تو سوچا کہ تمہیں بھی اپنی خوشی میں شامل کر لیا جائے“۔  
”کیسی خوشی؟“، اُس کے بات ادھوری چھوڑنے پہ مقابل نے سوال کیا۔

”وہ آج امی ابو رابعہ کی طرف گئے ہیں ہماری شادی کی ڈیٹ فکس کرنے“، اُس کی بے چینی پہ ارحام نے زیادہ تنگ کرنے کی بجائے مدعے کی بات پہ آتے اپنے خوش ہونے کی وجہ بتائی۔

”اووتب، ہی اتنا پھول رہے، پر بیٹا جی یہ خوشی بس چند دن کی ہی ہے۔ جب بیوی سر پہ آکے بیٹھے گی ناتب تمہیں پتا چلنا کہ آزادی کتنی بڑی نعمت ہے“، اُس کے جوش پہ بُرا سامنہ بناتے زارون نے اُسے شادی کے نقصانات سے آگاہ کرتے اُس کی ساری خوشی کو خاک میں ملا�ا۔

”لعنت ہے تم پہ اور ساتھ مجھ پہ بھی جس نے تمہیں دوست سمجھ کر سب سے پہلے یہ خبر دینے کے لیے فون کیا۔ حد ہے چلو بندہ دل سے نہ سہی اوپر اوپر سے ہی کسی کی خوشی میں اُس کا ساتھ

دے دیتا، پر نہیں! ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی تم نے ایسی بکواس کر کے میری ساری پر خوشی پر پانی پھیر دیا۔ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری دوستی، اُس کی بات سنتے ہی ارحم نے جلے ہوئے دل کے ساتھ اُسے بُرا بھلا کہتے اُسے مزید کوئی فضول بات کرنے کا موقع دیے بغیر ہی کال منقطع کر دی۔ ”ہونہہ مزہ آگیا، شنکر ہے میرا غصہ بھی کسی پہ اُترنا“، اُس کے کال بند کرتے ہی زارون نے افسوس کی بجائے مسکراتے ہوئے خود کلامی کی اور صحیح گھر جا کر ارحم کو مبارک باد دینے کا سوچتے اٹھ کر کمرے میں آگیاتا کہ اپنے پر اجیکٹ پر کچھ کام کر سکے جس کے متعلق وہ خود بھی بالکل بھول چکا تھا۔

---

”کیا بنا پھر آپ کی دعوت کا؟“ ابراہیم کی طرف سے آتے ہی رضا نے منه ہاتھ دھونے کے بعد کھانے کی میز پر آتے ہی سوال کیا۔

”ہاں وہ لوگ آجائیں گے، میں نے کل رات کی دعوت کا کہہ دیا“، سالن اُس کی پلیٹ میں نکلتے نائلہ بیگم نے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”یعنی کہ وہ لوگ مان گئے؟ اور آپ نے کل کا کیوں کہا؟ میرا مطلب یہ کچھ زیادہ جلدی نہیں ہے؟“ اُن کی بات سنتے ہی رضا کو اتنے سارے انتظامات ایک ہی دن میں مکمل کرنا کچھ ناممکن سا

---

لگاتب ہی اُس نے اعتراض اٹھاتے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا جو چہرے پہ سکون لیے اب اپنی پلیٹ میں سالن ڈال رہی تھیں۔

”اس میں جلدی کیا ہے؟ اور ہم نے کون سا ڈیڑھ سوبندوں کا انتظام کرنا ہے جو تم اس طرح گھبرا رہے ہو، بس وہ دس ہی تلوگ ہیں“، اُس کی حیرت کے پیچھے چھپی وجہ کو سمجھتے نائلہ بیگم نے نارمل سے انداز میں اُسے تسلی دی۔

”ماما بات دس لوگوں کی نہیں ہے، بات یہ ہے کہ ہم اتنی جلدی یہ سب کہاں سے کریں گے؟ میرا مطلب دو تین ڈشز بنانا کرتے تو آپ کو سکون آنا نہیں ہے تو کم از کم پانچ چھ مختلف قسم کے پکوان بننے کا مطلب تقریباً بیس ہزار تک خرچا، جس سے ہمارے پورے مہینے کا سرکٹ چل سکتا ہے“، کھانے سے ہاتھ روکے ہی رضا نے اپنی پریشانی کی اصل وجہ بیان کی۔

”رضایسا نہیں کہتے، مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور ان کو کھلانے سے مال میں برکت آتی ہے اس لیے مہمانوں کی آمد سے پریشان نہیں ہوتے بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اُس نے آپ کو یہ سعادت نصیب کی کہ آپ کسی کی خدمت کر سکیں اور بیٹا ہر کوئی اپنے گھر کھا کہ ہی سوتا ہے وہ ہمارے کھانے کا بھوکا نہیں ہوتا اور یہ دعو تیں تو بس رشتتوں کی آپس میں مل بیٹھنے کی کچھ تراکیب

ہیں جس سے ہم اپنوں کے مزید قریب ہو جاتے ہیں،“ اُس کی بات پہ نرمی کے ساتھ نائلہ بیگم نے اُسے سمجھایا تاکہ وہ دوبارہ کبھی مفلسوں کے ڈر سے کسی کو کھانے پلانے سے ہاتھ نہ روکے۔

”سوری، پتا نہیں کیوں میرے دماغ میں ایسی بات آگئی، بس آپ پریشان نہ ہوں میں دوبارہ ایسا کچھ نہیں کہوں گا“، نائلہ بیگم کی نصیحتوں پر شرمندگی سے سر جھکاتے رضا نے معدرت کی۔

”اچھا ٹھیک ہے، یہ سب بتیں چھوڑو اور کھانا کھاؤ ٹھنڈا ہو رہا ہے“، روٹی نکال کر اُس کی پلیٹ میں رکھتے نائلہ بیگم نے اُسے فضول کی سوچوں سے نکالتے کھانے کی طرف متوجہ کروایا۔

”جی کھارہ ہوں آپ بھی کھائیں اور کل کے لیے جو بھی سامان لانا ہے اُس کی لسٹ بنادیجیے گا، میں لے آؤں گا“، اُن کی بات پہ اثبات میں سر ہلاتے رضا نے تاکید کی تو نائلہ بیگم نے کھانے کے بعد بنانے کا کہتے خود بھی اپنے لیے روٹی نکالی اور کھانے میں مصروف ہو گئیں۔

-----

”آپ کمرے میں کیوں آگئے؟ میرا مطلب آپ نے کھانا نہیں کھانا تھا کیا؟“ عابدہ بیگم کے کہنے پہ وہ (جودو پھر سے اُس سے چھپتی پھر رہی تھی) اوپر آئی تو زارون کو اپنے لیپ ٹاپ میں مصروف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”نہیں، مجھے بھوک نہیں ہے بس جو سپیوں گا وہ لادینا“، مصروف سے انداز میں ایک نظر اُس کی طرف دیکھتے زارون نے واپس اپنی توجہ اسکرین کی جانب کی۔

”کیوں بھوک نہیں ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے آپ کی؟“ اُس کے جواب پر فکر مندی سے آگے بڑھتے نور نے اُس کی پیشانی پہ ہاتھ لگایا۔

”یار کیا ہو گیا ہے تم سب لوگوں کو؟ ٹھیک ہوں میں“، ایک ہی سوال سب کے منہ سے سنتے زارون نے بے زاری سے اُس کا ہاتھ اپنی پیشانی سے ہٹایا۔

”ہونہہ میں نے تو ویسے ہی پوچھا ہے اس میں غصہ کرنے والی کیا بات تھی“، اُس کی حرکت پہ منہ پھلائے وہ جو پہلے ہی دوپہر والی حرکت پہ اُس سے خائف تھی مزید ناراض ہوتے وہاں سے اٹھی۔

”نور بات سنو میری میرا یہ مطلب نہیں تھا، بس صحیح سے سب یہی سوال کر رہے تو میں تھوڑا چڑھا گیا تھا“، اُسے دروازے کی جانب بڑھتا دیکھ زارون نے لیپ ٹاپ سائیڈ پر رکھتے اُسے وضاحت دی۔

”ہاں بس آپ کو مجھ پہ چڑھنا آتا ہے، باقی تو کسی سے آپ غصہ نہیں کرتے اور نہ ہی کسی سے ایسے کھا جانے والے لجھے میں بات کرتے ہیں“، اُس کی بات پہ پلٹ کر دیکھتے نور نے اُس کے پل پل بدلتے روپے پہ تنگ آتے شکوہ کیا۔

”کیوں کہ کوئی دوسرا مجھے اُس طرح پیارا نہیں جیسے تم ہوا اور ہی بات غصے کی تو میں تم پر اس لیے اپنا غصہ نکالتا کیوں کہ مجھے پتا ہے کہ تم وہ واحد انسان ہو جس سے میں کچھ بھی بول سکتا ہوں کہہ سکتا ہوں پر اگر تمہیں میرا یوں بات کرنا یا حق جتنا اچھا نہیں لگتا تو میں دوبارہ تم سے ایسے بات نہیں کروں گا“، اٹھ کر اُس کے سامنے آتے زارون نے اپنے رویے کی وضاحت دینے کے ساتھ ہی فیصلہ اُس پر چھوڑا جواب کمرپہ ہاتھ رکھے اُسے گھورنے میں مصروف تھی۔

”بس زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے یہ سب باتیں کرنے کے بعد پھر سے میں نے کوئی شرارت کی تو آپ نے مجھے ڈانٹنے لگ جانا“، منہ ب سورے نور نے خفاسی نظروں سے اُسے دیکھا جواب اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھ اپنی ہنسی چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ ”اچھا کر لینا شرار تیں، نہیں ڈانٹنا ب میں“، اُس کے شکوئے سنتے زارون نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتے توبہ کی۔

”ٹھیک ہے میں کھانا کھا کر آتی ہو پھر دیکھتی ہوں کہ آپ کتنا سچ بول رہے“، اُس کی بات مکمل ہوتے ہی نور نے جانچتی ہوئی نظروں سے تنبیہ کی اور مزید کچھ کہے بغیر اُس کی سائیڈ سے نکلتے نیچے چلی گئی۔

”اُفف اب پتا نہیں اس چڑیل کے دماغ میں کیا چل رہا ہے“، اُس کے جاتے ہی اُس کی دی گئی وارنگ پر مسکراتے زارون نے سر جھٹکا اور واپس صوف کی جانب بڑھتے لیپ ٹاپ گود میں رکھتے بیٹھ گیا تاکہ نور کے واپس آنے سے پہلے کچھ کام کر سکے۔

---

”ابو آپ نے بلا یا تھا مجھے؟“ کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہبہ نے اندر قدم رکھتے ان سے استفسار کیا جو کچھ کاغذات ہاتھ میں لیے بیٹھے اُس کے ہی منتظر تھے۔

”ہاں بیٹا آؤ“، صوف کی جانب اشارہ کرتے آفندی صاحب نے کاغذات سائیڈ ٹیبل پر رکھے۔ ”جی، کوئی کام تھا آپ کو؟“ ایک نظر سارہ بیگم پر ڈالتے جو ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئیں تھی ہبہ نے سوالیہ نظر وہ سے آفندی صاحب کو دیکھا جو بات کرنے کے لیے کچھ مناسب الفاظ کی تلاش میں تھے۔

”ہاں کام ہی تھا، وہ مجھے تمہیں یہ بتانا تھا کہ احتشام نے اپنا کیس واپس لے لیا ہے“، اُسے اپنی جانب متوجہ پا کر آفندی صاحب نے کوئی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی بجائے مختصر الفاظ میں اُسے اس وقت زحمت دینے کی وجہ بتائی۔

---

”مطلوب؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ شخص اتنی آسانی سے کیسے مان گیا؟“، حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لیے حبہ نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کیے۔

”یہ تو مجھے پتا نہیں بہر حال اُسے شاید عقل آگئی ہے تب ہی اُس نے بغیر کسی وجہ کے ہی اپنا کیس واپس لے لیا اور بچوں کو پوری زندگی کے لیے تمہارے حوالے کر کے خود کو ہر حق سے بری کر دیا ہے“، کاغذات اٹھا کر اُسے پکڑا تے آفندی صاحب نے جو خبر حبہ کو سنائی تھی وہ اُسے تاریکی سے نکالتے پھر سے اجالوں میں لے آئی تھی۔

”ابو آپ سچ کہہ رہے ہیں نا؟ آپ مجھ سے کوئی مذاق تو نہیں کر رہے“، کاغذات پہ لکھی تحریر کو پڑھنے کے باوجود بھی حبہ نے بے یقینی سے اُن کی طرف دیکھا جو اُس کے مسکرانے کے ساتھ ہی اثبات میں سر ہلاتے اُس بات کے سچ ہونے کی تصدیق کر چکے تھے تو اُس نے کوئی بھی جواب دینے کی بجائے روناشر ورع کر دیا۔

”حبہ کیا ہو گیا ہے پیٹا یہ تو خوشی کی بات ہے اور تم رو نے لگ گئی ہو“، اُسے آنسو بہاتا دیکھ آفندی صاحب نے ہلکے ہلکے انداز میں اُسے اپنے ساتھ لگایا جو احتشام کے اتنی آسانی سے پیچھے ہٹنے پہ جہاں حیران تھی وہیں خوش بھی کہ اُس کے پچھے ہمیشہ کے لیے اُسے مل گئے ہیں پر اچانک سے اتنی بڑی

خوش خبری پہ اُسے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے الفاظ نہ ملے تو اُس نے آنسو بھاتے اپنے احساسات کو بیان کیا۔

”نہیں میں رو نہیں رہی۔ میں تو خوش ہوں بس میں شکرانے کے نفل پڑھ کر آتی ہوں“، اُن کے سامنے بار بار اپنا ضبط ٹوٹا دیکھ جبکہ نے مزید وہاں رکنے کی بجائے اپنا رخ باہر کی جانب کیا تو سارہ بیگم نے آفندی صاحب کو اشارے سے اُسے روکنے سے منع کیا۔

”آپ نے مجھے منع کیوں کیا؟ دیکھئے گا اب ساری رات روئی رہے گی“، جبکہ کے جاتے ہی آفندی صاحب نے مصنوعی خفگی سے سارہ بیگم کو دیکھا جو اپنے حصے کی ساری جائیداد احتشام کے نام کرتے اپنی بیٹی کی زندگی کی آخری خواہش کو پورا کر چکی تھیں۔

”بس کچھ نہیں ہوتا، تھوڑا روئے گی تو دل سے تمام غبار دور ہو جائے گا“، کاغذات اٹھا کر دیکھتے انہوں نے شوہر کو تسلی دی جو جبکہ کویوں روتا دیکھ پر یہاں ہو گئے تھے۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ، تم نے اس بار بچوں کے معاملے کو اپنی انانہ بناتے اپنی بیٹی کی خوشی کو ترجیح دی اور یہ خیال تمہارے دماغ میں آیا کیسے؟ مطلب؟ احتشام نے تم سے پر پرائی کی کوئی بات کی تھی؟“، آفندی صاحب کو خود بھی ابھی تک اس معاملے سے انجران تھے انہوں نے شکریہ کے ساتھ ہی کچھ لمحتے ہوئے سارہ بیگم سے سوال کیا۔

”بس چھوڑیں ان سب باتوں کو، کیا، کیسے اور کب ہوا یہ معنی نہیں رکھتا، بس مجھے اپنی ایک غلطی کا کفارہ ادا کرنا تھا کر دیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اپنی بیٹی کو اذیت دی تھی ناپر اب مجھے احساس ہو گیا اور احتشام کی لاپچی طبیعت سے تو میں بہت دیر سے واقف ہوں اسی لیے میں نے جب اُسے ایک ساتھ اتنی ساری دولت کی پیشکش کی تو وہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ یہ اُس کے بچوں کی قیمت ہے جو وہ مجھ سے لے رہا ہے“، ساری بات آفندی صاحب کو بتاتے سارہ بیگم نے اپنے انتخاب پہ دل کھول کر افسوس کیا۔

”بس یہ سب تو تقدیر میں لکھا تھا، اس میں آپ کا یا کسی اور کا کوئی قصور نہیں تھا اس لیے اب ان باتوں کو پچھے چھوڑتے اپنے دل سے تمام خدشات دور کرتے ہمیں ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا ہے“، ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیتے آفندی صاحب نے بے حد نرمی کے ساتھ ان کے ملاں کو دور کرنے کی کوشش کی جو جبکہ کی طلاق کے بعد انہیں دن بدن اندر ہی اندر ختم کر رہا تھا۔

-----

”اُفف ایک تو یہ لڑکی، توبہ ہے شوہر کا ذرا برابر بھی خیال نہیں ہے“، کلاک پہ ایک بجتاد کیہ زارون نے ابھی تک نور کی غیر موجودگی پہ غصے سے تپتے ہوئے لیپ ٹاپ بند کیا اور اپنی گردان کو پر سکون کرتے اُسے دیکھنے کے لیے باہر نکلا تو وہ اُسے سامنے سے آتی دکھائی دی۔

”کہاں تھیں تم؟ ٹائم دیکھا ہے تم نے؟“ اُس کے قریب آتے ہی زارون نے غصے سے غراتے ہوئے اُسے گھورا جو اُس کے سوال کی پرواکیے بغیر ہی منہ پہ ہاتھ رکھتے جمائی روکنے لگی۔

”دیکھ لیں، آپ پھر سے مجھ پہ غصہ کر رہے ہیں حالانکہ آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے ہی بولا تھا کہ میں کچھ بھی کر لوں پر آپ مجھے نہیں ڈانتیں گے اور نہ ہی غصہ کریں گے“، منہ بسورتے نور نے کچھ دیر پہلے اُس کے بولے گئے الفاظ کے متعلق اُسے یاد دہانی کروائی۔

”مطلوب تم اتنی دیر سے نیچے اس لیے موجود ہو کہ یہ دیکھ سکو کہ میں تمہارے لیٹ آنے پہ تمہیں ڈانتا ہوں یا نہیں؟“ اُس کی بات پہ ہو نقوں کی طرح منہ کھولے زارون نے اندازہ لگاتے تصدیق چاہی۔

”جی بالکل میں اسی لیے اوپر نہیں آئی، حالانکہ مجھے اتنی نیند آرہی تھی پھر بھی میں اُٹھی رہی تاکہ یہ دیکھ سکوں کے آپ کو مجھ پہ غصہ آتا ہے یا نہیں“، اُس کی سائیڈ سے ہو کر کمرے میں داخل ہوتے

نور نے جتنی تسلی سے جواب دیا زارون کو اُتنی ہی اُس تپ چڑھی جو پچھلے پانچ گھنٹوں سے اُسے اس بات کے لیے انتظار کروار، ہی تھی کہ وہ یہ دیکھ سکے کہ وہ اُسے ڈانتا ہے یا نہیں۔

”نور تم پاگل ہو کیا؟ حد ہے میں یہاں پچھلے پانچ گھنٹوں سے اس انتظار میں بیٹھا کہ تم آؤ گی تو میں سوؤں گا اور تم ہو کہ...“، شدید غصے کی وجہ سے اپنی بات ادھوری چھوڑتے زارون نے اُسے بازو سے کپڑتے اپنی جانب کھینچا جو بیڈ پہ جا کر جلد از جلد سونے کا رادہ رکھتی تھی۔

”ہونہہ پاگل میں نہیں بلکہ آپ ہیں اور میں نے کہا تھا کیا کہ میرا انتظار کریں“، اُس کے غصے سے ڈرنے کی بجائے نور نے بے خوف ہو کر اُس کی آنکھوں میں دیکھا جواب ضبط سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”ہاں میں ہی پاگل ہوں جو تمہارا انتظار کرتا رہا، سو جاؤ تم مجھے کچھ کام ہے“، اُس کی ہٹ دھرمی دیکھ وہ جو پہلے ہی اُس کی حرکت پہ خائف تھا مزید ناراض ہوتے کمرے میں رکنے کی بجائے اپنا موبائل اٹھاتے بالکلونی میں آگیاتا کہ اپنی مزید کسی بات سے اُسے دلبرداشتہ نہ کرے۔

”ہاں پتا مجھے جو کام ہے، سیلوں سے بات کرنی ہو گی تب ہی باہر چلے گئے“، اُس کے غصے کو کسی بھی خاطر میں لائے بغیر نور نے منہ میں بڑ بڑاتے جمائی روکنے کے لیے پھر سے منہ پہ ہاتھ رکھا اور لائٹ آف کرتے چپ چاپ سونے کے لیے لیٹ گئی۔

نیند آنے کے باوجود بھی ایک بے چینی سی تھی جو اسے بار بار کروٹیں بد لئے پہ مجبور کر رہی تھی۔

”اُفف ایک تو یہ شخص پتا نہیں کون سی سکون کی دوا اپنے اندر گھولے پھرتا ہے کہ جب تک یہ میرے قریب نہ ہو مجھے نیند نہیں آتی“، تھک ہار کر کمفرٹ راپنے چہرے سے ہٹاتے نور نے ایک گھری سانس لی اور مزید وقت ضائع کیے بغیر اٹھ کر بالکونی میں آئی جہاں وہ آنکھیں موندیں کر سی کی بیک سے سر ٹکائے بیٹھا تھا۔

”ہونہہ بس غصہ کرنے کا ہی پتا پر منانے کا نہیں“، زیر لب بڑا بڑتے نور نے ایک نظر اس کے چہرے پہ ڈالی اور کچھ بھی کہے بغیر آگے بڑھتے اس کی گود میں بیٹھتے اپنا سر اس کے سینے سے لگ گئی۔

”تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟“ اس کے بیٹھتے ہی فٹ سے آنکھیں کھولتے زارون نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا جوا بھی کچھ منٹ پہلے ہی اس کی پرواکیے بغیر سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔

”نہیں، نیند نہیں آرہی“، بازو اُس کے گرد لپیٹ نور نے دنیا جہاں کی معصومیت اپنے چہرے پہ طاری کی۔

”کیوں نہیں آرہی نیند؟ کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟“، کچھ دیر پہلے ہونے والی لڑائی کی کوئی بھی رمق اپنے الفاظ میں لیے بغیر زارون نے فکر مندی سے اُس کی پیشانی پہ ہاتھ لگایا۔

”ہونہہ ٹھیک ہوں میں، بس آپ پاس نہیں تھے نا اس لیے مجھے نیند نہیں آئی“، سراٹھا تے براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھتے نور نے سچ بولا تو زارون کے چہرے پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اچھا ب پاس ہی ہوں، سو جاؤ“، اُس کے گال پہ ہاتھ رکھتے زارون نے بڑی نرمی سے اُسے اپنے ساتھ لگایا۔

”آپ ناراض ہیں مجھ سے؟ مطلب میں نے بد تمیزی کی تھی نا آپ سے؟“، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے نور نے سونے کی بجائے نظروں میں فکر لیے تصدیق چاہی۔

”نہیں، ناراض کیوں ہونا؟ اور میری جان تمہاری کون سی یہ پہلی بد تمیز تھی جس سے میں دلبرداشتہ ہو کر ناراض ہو جاتا“، اُس کی ناک دباتے اُس نے ماہول پہ چھائی سو گواری کو دور کرنے کے لیے بات کو مذاق میں ٹالا۔

”مطلوب میں سارا دن آپ سے بد تیزیاں کرتی ہوں؟“ اُس کی بات پر حیرت سے پوری آنکھیں کھولے نور نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”تو اور کیا؟ سارا دن تمہیں دو ہی کام ہیں۔ ایک سونا اور دوسرا مجھ سے زبان چلانا،“ اُس کی ناراضی کے ڈر سے زارون نے پہلے ہی اُسے اپنے حصار میں قید کیا۔

”ہونہ بُرے ہیں آپ اور یہ زبان صرف آپ کے سامنے ہی چلتی ہے کیوں کہ مجھے یقین ہوتا کہ آپ اس کا چلنابرد اشت کر لیں گے،“ دونوں بازوؤ اُس کی گردن میں حائل کرتے نور نے اُس کی بات کا بُرا ماننے کی بجائے لبھ میں اعتماد سمونے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ کو پتا ہے میرے ساتھ اتنا کچھ ہوا، اتنے بڑے بڑے حادثے پہلے کچھ لوگوں کا حملہ جس نے میری پوری زندگی بدل کر رکھ دی۔ بابا کی بے اعتباری، ان کی نفرت پھر ان کی اچانک موت اور میرا غواہ ہونا۔ کچھ ہی وقت میں، میں نے بہت کچھ سہا ہے پران تمام حادثوں کے باوجود بھی میں نے اپنا بچکانہ رویہ تبدیل نہیں کیا۔ پتا ہے کیوں؟“ بات ادھوری چھوڑتے نور نے اب اپنے دونوں ہاتھ اُس کی دائیں اور بائیں رخسار پر رکھ لیا جو سانس روکے آج اُس کے ایک نئے روپ کو دیکھ رہا تھا جس سے وہ آج سے پہلے تک بالکل ناواقف تھا۔ ”کیوں؟“ اُس کے رکنے پر بے چیلں

ہوتے زارون نے اُس کے نم گوشوں میں دیکھا جو شاید آج کوئی بڑا اکشاف کرنے کے لیے بے قرار تھے۔

”کیوں کہ ان سارے حادثوں میں ایک شخص تھا جو مجھے حوصلہ دے رہا تھا کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ وہ مجھے، میری معصومیت کو سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اُن حادثوں کا کوئی بھی عکس اپنے دل و دماغ میں رکھتے خود کو بے مول سمجھ بیٹھوں،“ اُس کی بڑی ہوئی شیوپہاتھ پھیرتے وہ چند لمحوں کے لیے رکی تو زارون کی دھڑکنوں نے منتشر ہوتے اُس کے سینے میں ایک طوفان برپا کیا۔

”اتنی ساری عنایتوں کے بعد اُس شخص نے ایک ہی تو خواہش کی تھی تو، میں کیسے اُسے رد کر دیتی؟ کیسے میں اُن حادثوں کا اثر اپنے چہرے میں سجائے اُسے یہ جلتاتی کہ اُس کی ساری محنت رائگاں چلی گئی؟ کیسے میں اُس کے سامنے روؤں جو میرے چہرے پہ مسکراہٹ دیکھنے کے لیے اپنی تمام تر تکلیفیں پس و پشت ڈال دیتا ہے؟ میرے سکون کے لیے مجھے یہ تک نہیں بتاتا کہ اُسے کہیں درد ہے،“ ضبط کے باوجود بھی آنسوؤں نے کناروں سے نکلتے گستاخی کی تو زارون کے دل نے ایک نئی لے پہ دھڑکنا شروع کیا جس میں اب اپناراز کھلنے کے کئی خدشات سر اٹھا رہے تھے۔

”نور کیا ہوا ہے؟ کوئی بات ہے کیا؟ مطلب کسی نے تم سے کچھ بولا ہے؟“ اُس کی آنکھوں میں افیت دیکھ زارون نے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرا۔

”نہیں کسی نے کچھ نہیں بولا، کوئی مجھے کیا بولے گا بھلا“، کندھے اچکاتے اُس نے انجان بننے کی کوشش کی پر اُس کے لبھ نے اُس کا ساتھ چھوڑتے زارون کو مزید شک میں ڈالا۔

”نور کیا بات ہے جو بھی ہے بولو؟“ اپنی بات پر زور دیتے زارون نے اپنی نظروں میں سختی سموئی۔

”کچھ نہیں ہے، بس ایسے ہی مجھے لگا کہ اب مجھے بھی اپنی محبت کا اقرار کر دینا چاہیے تاکہ آپ ڈراموں کے ہیر و کی طرح دلب رداشتہ ہو کر میرے سر پر کوئی سوتن لا کر مسلط نہ کر دیں“، خود پر قابو پاتے نور نے بات بدلنے کے ساتھ ساتھ منہ ب سورا تو زارون کی جان میں جان آئی۔

”ہونہ تھپٹر کھالو اور مجھے پہلے جیسی جھلی سی نور ہی پسند ہے اس لیے دوبارہ ایسے عقل مندی کی باتیں کر کے مجھے ہارت اٹیک کروانے کی کوئی ضرورت نہیں“، کہنے کے ساتھ ہی زارون نے خفگی سے اُس کی ناک پر اپنے ہونٹ لگائے جو سردی سے سرخ ہو رہی تھی۔

”بُرے ہیں آپ، حد ہے اگر کبھی میں عقل مندی کی کوئی بات کر رہی لیتی تو کچھ دیر کے لیے مجھے محسوس ہی کر لینے دیا کریں کہ میرے پاس بھی دماغ ہے جو کبھی کبھی کام کر لیتا“، اُس کے لمس پر

جھینپے یا گہرانے کی بجائے نور نے اپنی بات مکمل کرنے کے ساتھ ہی اُس کے باعث رخسار پہ اپنے ہونٹ لگائے تو زارون کو سچ میں اُس سے خوف محسوس ہوا جو آج اپنی ایک کے بعد ایک حرکت سے اُسے چونکار ہی تھی۔

”اُٹھ جاؤ، سونا نہیں ہے کیا آج؟“ اُس کے لمس پہ انجان بنتے زارون نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”آپ بھی ساتھ لیٹیں پھر سوؤں گی“، اُس کی بات سنتے نور نے اپنی شرط بتائی۔ ”اچھا ٹھیک ہے چلو“، اُس کی شرط سنتے زارون نے اُسے اپنی گود سے نکالا تو اس بار نور خاموشی سے کمرے میں داخل ہوئی۔

”افف یہ لڑکی مجھے پا گل کر دے گی“، اُس کے جاتے ہی اپنے دل کی دھڑکنوں کو ایک گہری سانس لیتے پر سکون کرتے وہ خود بھی اٹھا اور اندر آگیا جہاں نور پہلے ہی اپنا تکمیل اُس کے تکمیل کے قریب کرتے لیٹ چکی تھی۔

”سو جاؤ اب مجھے اب تمہاری آواز نہ آئے“، لائٹ آف کرتے وہ اُس کے قریب آکر لیٹا تو نور نے اُس کے کندھے پہ سر رکھتے کچھ کہنا چاہا مگر اُس سے پہلے ہی زارون نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھے منع کیا۔

”ہونہہ آپ ہیں، ہی برے“، اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھتے نور نے پھر سے اپنا تکیہ کلام بولا اور خاموشی سے آنکھیں بند کرتے سونے کی کوشش کرنے لگی۔

---

”عبدہ یہاں آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے“، انہوں نے قرآن پاک کی تلاوت کرنے کے بعد اُسے بند کر کے الماری میں رکھا تو احمد صاحب نے انہیں پکارتے اپنے پاس بیڈ پہ بیٹھنے کا بولا۔ ”جی بولیں“، دوپٹہ کھول کر لیتے عبدہ بیگم نے صحیح صبح ان کی زبان سے کسی ضروری بات کا سنا تو ایک دم سے چوکنا ہوتے ان کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”زندگی کے چالیس سال ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت سکون اور احسن طریقے سے گزارے ہیں اور ان سالوں میں ہم نے کبھی بھی ایک دوسرے سے کچھ نہیں چھپایا اور آج بھی مجھے لگتا ہے کہ یہ بات آپ سے چھپانا مناسب نہیں اسی لیے اب جو بھی میں بولوں گا آپ کو بہت تحمل سے سننا ہے“، ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے احمد صاحب نے بات کے آغاز کے لیے تمہید باندھی۔

”کیا بات ہے؟ جو بھی ہے آپ بولیں میں سن رہی ہوں“، ان کی تمہید سے وہ یہ تو جان رہی پچھی تھیں کہ بات کوئی اتنی خوشگوار نہیں ہے پر پھر بھی اپنے دل کی تسلی کے لیے انہوں نے خود کو مضبوط کرتے احمد صاحب کو بولنے کے لیے اکسایا۔

”میں جانتا ہوں کہ ایک باپ سے زیادہ بچوں کی تکلیف ماں کے لیے افیت ناک ہوتی ہے پر پھر بھی میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ زارون کے لیے دعا کریں۔ سنا ہے ماں کی دعاؤں میں بہت اثر ہے وہ انسان کو موت کے منہ سے نکال لاتی ہے“، ان کے ہاتھ پہ دباؤ ڈالتے احمد صاحب نے بڑی نرمی اور پیار کے ساتھ مسکراتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”زارون کے لیے دعا کروں؟ زارون کو کیا ہوا ہے؟ احمد کیا بات ہے میں کچھ دنوں سے محسوس کر رہی ہوں کہ آپ مجھ سے کچھ چھپا رہے ہیں پلیز جو بھی ہے مجھے بتائیں“، زارون کا نام سنتے ہی عابدہ بیگم جو کچھ دنوں سے اُس کے حوالے سے بُرے خواب دیکھ رہی تھیں ایک دم سے پریشان ہوتے پوچھنے لگیں۔

”ہم کل کسی کام کے سلسلے میں باہر نہیں گئے تھے، میں اور جنید زارون کے ساتھ ہسپتال تھے، جس دن زارون بے ہوش ہوا تھا اور اُس کے ناک منہ سے خون آیا تھا ہمیں اُسی دن ہی ڈاکٹر

نے بتا دیا تھا کہ ایسے سب کینسر کی علامات ہیں تب ہی ہم نے وہاں سارے ٹیسٹ کروائے اور...، ان کا رنگ زرد پڑتا دیکھ احمد صاحب نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”کیا اور؟ احمد کیا ہوا ہے میرے زارون کو؟ کینسر کی علامات؟ کیوں کہاڑا کٹر نے ایسا؟ نہیں میرے بیٹے کو کوئی بیماری نہیں ہے وہ بالکل ٹھیک ہے“، احمد صاحب کی بات سننے ہی عابدہ بیگم نے ٹوٹے پھوٹے الفاظ ادا کرتے اپنے دل کو یقین دلا یا۔

”پلیز خود کو سنبھالو اور مجھے دیکھو میں بھی تو اتنے دنوں سے یہ بات دل میں رکھے ہوئے ہوں نا؟“ صرف اس لیے کہ میں نے ہمت ہاری تو زارون ساتھ ہی دل چھوڑ دے گا، وہ پہلے ہی علاج کے لیے نہیں مان رہا اور وہ اگر ہم بھی اُس کے سامنے رونے پیٹنے لگ جائیں گے تو اسے کون سمجھائے گا؟، ان کی آنکھوں سے قطار در قطار نکلتے آنسوؤں کو دیکھ کر احمد صاحب نے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ان کا حوصلہ بڑھایا۔

”نہیں، احمد آپ پھر سے ٹیسٹ کروالیں مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی“، ان سے الگ ہوتے عابدہ بیگم نے پر امید انداز میں انہیں مشورہ دیا جواب انہیں چپ کروانے کے ساتھ ساتھ ساری بات تفصیل سے بتانے لگے تاکہ کسی اور کی زبانی جان کر کوئی بڑا صدمے نہ پہنچے۔

”ہنا آپ کا کیا پہنچ کا رادا ہے؟ میرا مطلب کوئی ہلاکا چلا کا لباس پہنیں گی یا کوئی مہنگا؟“، ہمانے اُس کے ساتھ ہی صوفے پہ بیٹھتے سوال کیا۔

”ظاہر سی بات ہے کوئی مہنگا ہی پہنؤں گی تاکہ انہیں بھی ہماری حیثیت اور مرتبے کا احساس ہو“، سبحان کو گود سے نکال کر نیچے فرش پہ چھوڑتے ہنا نے اپنے مخصوص کم ظرفی والے لبج میں جواب دیا۔

”تو ٹھیک ہے، میں بھی پھر کوئی اچھا سا پہن لوں گی ویسے آپ آپ کے دماغ میں چل کیا رہا ہے؟“  
میرا مطلب وہاں جا کر کوئی نیاد ہماکہ کرنے کا تو کوئی پلان نہیں آپ کا؟“، ہمانے اُس کے مغرورانہ انداز دیکھ کے اندازہ لگایا۔

”نہیں، ابھی تک تو کوئی پلان نہیں پر ہو سکتا ہے کہ بن جائے“، نظر وہ میں تنبیہ لیے ہنا نے اُسے اپنے کسی بھی ارادے سے آگاہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ”مطلب میر اندازہ ٹھیک تھا، آپ ضرور وہاں جا کر کوئی ہنگامہ کریں گی۔ میرا مطلب کوئی ایسی بات جس سے آپ نور کے گھروں والوں

کو نیچا دیکھا سکیں،“، ہنگامہ لفظ پہ حنانے آنکھیں نکالیں تو ہمانے جلدی سے وضاحت دیتے تصدیق چاہی۔

”پتا نہیں کیا کیا سوچتی ہو تم اور دماغ خراب ہے کیا تمہارا؟ میں بھلا کیوں انہیں نیچا دکھاؤں گی،“ ماہم پہ نظر پڑتے ہی حنانے جلدی سے بات بدلتے سارا الملہہ ہماپہ ڈالا جو اس کے ایک دم سے بدلتے روپ پہ حیران و پریشان سی بیٹھی اُس کی نظروں کے تعاقب میں اپنی پشت پہ کھڑی ماہم کو دیکھنے لگی۔

”ماہم تم کب آئیں؟“ خود کو جلدی سے سننجاتے ہمانے اُس کے چہرے سے کچھ جانچنے کی کوشش کی۔

”بس ابھی آئی ہوں اور یہ حنا بھا بھی آپ کس کو نیچا دکھانے کی بات کر رہی تھیں؟“ ہما کی بات کا جواب دیتے ماہم نے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”وہ بس ہم لوگ اپنی ایک پرانی دوست کی بات کر رہے تھے، توبہ بہت ہی مغرور اور گھمنڈی عورت ہے۔ کل ہم امی کی طرف گئے تو وہ ہمیں باہر کالونی میں ہی مل گئی بس ہم اُس کی ہی باتیں کر رہے تھے کہ ایسے لوگوں کو کیسے سبق سکھایا جائے،“ بڑی مکاری کے ساتھ بات بدلتے حنانے اُسے ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ لوگ کریں باتیں، میں تو بس عبیرہ کو دیکھنے آئی تھی“، اُس کی بات سنتے ماہم کو تسلی ہوئی تو اُس نے اپنے آنے کا مقصد بتاتے واپسی کا راستہ ناپا جس پر ہما کے ساتھ ساتھ حنا نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ ماہم نے اُن کی کوئی بات نہیں سنی۔

---

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ نور جو نیچے سے ابھی ابھی نسرین کے ساتھ کچن سیمٹ کر آئی تھی اُس نے کمرے میں آتے ہی زارون کی تیاری دیکھ اُس سے سوال کیا۔

”ارحم کی طرف جا رہوں کافی دن ہو گئے ہیں اس سے ملاقات نہیں ہوئی“، بالوں میں برش پھیرتے زارون نے مصروف سے انداز میں اُس کی بات کا جواب دیا۔

”تو آپ نے ماما کی طرف نہیں جانا؟ میرا مطلب ہمیں وہاں جانا تھا“، اُس کے جواب پر نور کو لگا کہ شاید وہ بھول چکا ہے تب ہی یاد دہانی کرواتے اُس نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا جواب برش ٹیبل پر واپس رکھتے اُس کے قریب آچکا تھا۔

”نور وہاں ہمیں شام کو جانا ہے اور ابھی دوپھر کا ایک بج رہا تو بس میں کچھ دیر میں ارحم سے مل کر واپس آجائے گا“، اپنا لیپ ٹاپ بیگ میں رکھتے اُس نے اُسے تسلی دی جو اس وقت اُس کے کہیں بھی جانے سے ناخوش تھی۔

”شام کو نہیں مجھے ابھی جانا ہے۔ وہ دراصل میں سوچ رہی تھی کہ ہم تھوڑا جلدی چلے جائیں“، اصل وجہ پر آتے نور نے تھوڑی پچکچاہٹ کے ساتھ اپنا موقف بتایا۔

”کیوں جلدی کیوں جانا ہے؟ مطلب آنٹی نے تم سے کچھ کہا ہے؟“، زارون کو لگا کہ شاید نائلہ بیگم نے اُسے جلدی آنے کا بولا ہوتا ہی اپنا کام چھوڑتے وہ اُس کی جانب متوجہ ہوا۔

”نہیں مامانے کچھ نہیں بولا پر مجھے تو ان کا خیال ہے نا؟ دیکھیں کتنا سارا کام ہو گا اور ماما کیلے یہ سب کیسے کریں گیں تو میں نے خود ہی سوچا کہ میں ٹائم سے چلی جاؤں تاکہ ان کی کچھ مدد کروا سکوں“، تفصیل سے اپنی بات کی وضاحت دیتے نور نے جواب طلب نظر وہ اُس کی طرف دیکھا۔

”اگر تم آنٹی کی کچھ مدد کرنا چاہتی ہی ہو تو پھر جان تم ایسا کرو کہ گھر پہ ہی رکو اور شام کو ہمارے ساتھ ہی جانا کیوں کمکہ تمہارے جانے سے آنٹی کی مدد ہونا ہو پران کے کام خراب ضرور ہو جائیں

گے، اُس کی عقل مندی پہ ایک معقول سامشورہ دیتے زارون نے چار جرأٹھا کر بیگ میں رکھا تو نور نے کھاجانے والی نظروں سے اُس کی پشت کو گھورا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ کیا میں سب کے کام بگاڑتی ہوں؟“ اُس کے سامنے آتے نور نے غصے سے بھر کتے ہوئے استفسار کیا۔

”نہیں جان میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو بس اتنا کہہ رہا تھا کہ جہاں تم موجود ہو وہاں کاموں میں خود بخود ہی بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اس لیے مہربانی کر کے آنٹی پر رحم کرو اور گھر رہو تاکہ وہ سکون سے سارے کام کر سکیں،“ اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے زارون نے اُسے مزید تپایا۔

”آپ ہیں ہی برے بد تمیز بھی اور ویسے ہی بول دیتے کہ نہیں لے کر جانا ایسے میری بے عزتی کرنے کی کیا ضرورت تھی،“ اُس کی بات پہ منه پھلاتے نور نے پچھے صوفے پہ بیٹھتے شکوہ کیا۔ ”ویسے بول دیتا تو تمہیں جلدی اثر نہیں ہونا تھا اس لیے تھوڑے مرچ مسالے لگا کر تمہیں منع کیا تاکہ جلد اثر ہو سکے،“ اپنا موبائل اٹھا کر دروازے کی جانب بڑھتے زارون نے اپنی آخری بات مکمل کی اور اُس کے کشن اٹھانے سے پہلے ہی دروازہ کھولتے باہر نکل گیا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ، حد ہے لوگوں کو پتا نہیں کہاں سے اتنے اچھے اچھے شوہر مل جاتے جو ہر وقت ان کی تعریف کرتے ان سے پیار کرتے اور مجھے ملا بھی تو کیا؟ ایک سڑیں اور بد لحاظ

انسان،“، کشن زور سے دروازے پہ مارتے نور نے کڑھتے ہوئے خود کلامی کی اور اس بات کا بدلہ آج نائلہ بیگم کی طرف رک کر لینے کا ارادہ کرتے اٹھی اور الماری سے اپنے کپڑے نکالتے دیکھنے لگی۔

---

”زارون کہاں جا رہے ہو؟“ عابدہ بیگم جو احمد صاحب کے سمجھانے پہ کافی حد تک خود کو کنٹرول کر چکی تھیں انہوں نے اُسے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتا دیکھ کر مخاطب کیا۔

”وہ امی میں ارحم کی طرف جا رہا ہوں کچھ کام تھا؟“ ان کی سوچھی ہوئی آنکھوں سے ان کے رو نے کا اندازہ لگاتے وہ واپس پلٹتے ان کے قریب آیا۔

”آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟“

”ہاں بالکل ٹھیک ہے کیوں کیا ہوا؟“ جلدی سے نظریں چرانے کے ساتھ ہی انہوں نے آگے بڑھتے صوفے پہ موجود کشنز کو ٹھیک کیا۔

”نہیں، کچھ نہیں بس آپ کی آنکھیں دیکھ کر مجھے لگا کہ شاید اند آپ کی طبیعت خراب ہے“، ان کے اس طرح غرض برتنے پہ جہاں زارون کو کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا وہیں اُس نے سچائی بیان کرتے جا چلتی ہوئی نظر وہیں سے ان کا جائزہ لیا۔

”ہاں وہ بس رات کو تھوڑی طبیعت خراب تھی تو میں ٹھیک سے سو نہیں سکی اسی لیے شاید تمہیں لگ رہا ہو..“، اُسے جواب دیتے انہوں نے خود کو مصروف ظاہر کرنے لیے نسرین کو آواز لگاتی۔

”اچھا ٹھیک ہے بس اپنا خیال رکھیں میں ارحم کی طرف سے ہو کر آتا ہوں“، آگے بڑھ کر ان کی پیشانی پہ بوسہ دیتے زارون نے انہیں اپنے ساتھ لگایا۔

”میں ٹھیک ہوں تم پریشان نہ ہو اور دھیان سے جانا اور ہاں جلدی واپس آجانا شام کو نائلہ کی طرف بھی جانا ہے“، اُسے یاد دہانی کرواتے عابدہ بیگم نے تاکید کی تو زارون نے جی اچھا کہتے باہر کا رخ کیا۔

-----

”ارحم یہ دیکھو حیدر شاہ اور اُس کے بیٹے کو پھانسی ہو گئی ہے“، ہاشم صاحب نے اخبار پڑھتے پڑھتے ایک خبر کی نشاندہی کرتے اُس کی توجہ اُس جانب کروائی جہاں اُن دونوں باپ بیٹے کی تصویر کے ساتھ اُن کے جرام کی مکمل تفصیل موجود تھی۔

”بس کہتے ہیں نابرائی کا نجام ہمیشہ بُرا ہوتا ہے تو سب حیدر شاہ اور مراد شاہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا“، اُن کی موت کا فسوس کرنے کی بجائے ارحم نے اُن کے کالے کرتوت پڑھتے ایک لمبی سانس لیتے خود کو پر سکون کیا۔

”ہاں بس ایسے لوگ اپنی زندگیوں میں تو کچھ اچھا کر نہیں پاتے پر مر نے کے بعد بھی مغفرت کی دعاؤں سے محروم ہو جاتے، اپنی دنیا تو خراب کرتے ہی کرتے ساتھ آخرت بھی بر باد کر لیتے“، ارحم کی بات سنتے ہاشم صاحب نے بھی اُن کی موت پر مذمت کرتے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

”جی بس کچھ ایسا ہی ہے، اللہ پاک ہم سب کو ان جیسے لوگوں کے شر سے بچائے“، دعا کرتے ارحم نے اخبار ہاشم صاحب کے حوالے کرنے کی بجائے اُسے تہہ کرتے سامنے موجود ٹیبل پر رکھا۔

”ارحم بھائی وہ باہر زارون بھائی آئے ہیں“، جمال نے لاڈنج بھنگ میں داخل ہوتے اُسے اطلاع دی۔

”تو کیا کروں میں؟ اُسے کہہ دو کہ میں مصروف ہوں“، زارون کا نام سنتے ہی رات والی اُس کی بد تیزی کا یاد آتے ارحم نے اُس نے ملنے سے انکار کیا۔

”کیوں بھی کیا ہوا؟ ملنا کیوں نہیں ہے؟ میرا مطلب کوئی لڑائی وڑائی ہوئی ہے کیا؟“ اُس کے انکار پہ جمال سے پہلے ہی ہاشم صاحب نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”لڑائی؟ میں اُس جیسے بد تیز انسان سے بات کرنا پسند نہ کروں اور آپ لڑنے کی بات کر رہے ہیں اور تم یہاں کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو؟ جاؤ جا کر اُسے کہو کہ میں گھر میں نہیں“، ہاشم صاحب کی بات کا جواب دیتے ارحم نے وہیں جمع کھڑے اپنے ملازم پہ بستے ہوئے اُسے وہاں سے جانے کا بولا۔

”ارحم بیٹا ایسے گھر آئے مہمانوں کے ساتھ بد تیزی نہیں کرتے اور ہو سکتا ہے اُسے تم سے کوئی ضروری کام ہو، اسی لیے پلیز میرے کہنے پہ اُسے ایک بار مل لو“، اُس کی ہٹ دھرمی دیکھ ہاشم صاحب نے جمال کو رکنے کا اشارہ کرتے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے آپ کو اتنا ہی شوق ہے نا تو آپ خود مل لیں پر میں اُس منحوس انسان کی شکل نہیں دیکھوں گا“، ہاشم صاحب کی بات سنتے ہی غصے سے سرخ ہوتے ارحم نے اپنا فیصلہ سنا یا اور ایک کھا جانے والی نظر جمال پہ ڈالتے وہاں سے نکلتے سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے میں آگیا۔

”صاحب جی کیا بولوں پھر میں زارون بھائی کو؟“، ارحم کے غصے سے خائف ہوتے جمال نے ہاشم صاحب کی طرف دیکھا۔

”ہاں اُسے یہیں بلا لاؤ میں خود ہی بات کر لوں گا“، اس کی آواز پر ہوش میں آتے ہاشم صاحب نے زارون کو وہیں بھجنے کا بولا تاکہ اُسے ارحم کے غصے کے بارے میں آگاہ کر سکیں۔

-----

”السلام علیکم انکل“، جمال کے کہنے پر لاڈنج میں داخل ہوتے زارون نے ہاشم صاحب کو دیکھتے ہی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

”و علیکم السلام آؤ بیٹا بیٹھو“، اس سے مصافحہ کرتے گرم جوشی دکھاتے ہاشم صاحب نے سامنے موجود صوفے کی جانب اشارہ کیا۔

”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“، اپنی نشست سنبھالتے ہی زارون نے ارحم کی غیر موجودگی محسوس کرتے ان کا حال دریافت کیا۔

”میں ٹھیک ہوں پر تمہارے دوست کا دماغ کچھ گرم ہے اسی لیے تم سے ملنے سے انکار کرتے اپنے کمرے میں چلا گیا ہے“، اُس کی بات کا جواب دیتے ہاشم صاحب نے اُسے ارحم کی ناراضی کے متعلق سماں کیا۔

”جی جانتا ہوں بس اُسے ہی منانے آیا تھا“، اُن کی زبانی ارحم کی خفگی کا سنتے زارون نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

”اچھا پھر ٹھیک ہے چلے جاؤ تم وہ اوپر ہی ہے“، اُس کے بتانے پر مطمئن ہوتے ہاشم صاحب نے اُسے اوپر جانے کی اجازت دی تو وہ اُن کا شکر یہ ادا کرتے سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔

”کون؟“، ارحم جو پہلے سے ہی زارون کی آمد کے بارے میں جانتا تھا اُس نے دروازے پر دستک کی آواز سنتے اجازت سے پہلے آنے والے کا تعارف پوچھا۔

”میں ہوں زارون، دروازہ کھولو“، دروازے کو اندر سے لاک دیکھ کر زارون نے چارونا چار صبر کا مظاہرہ کرتے آواز لگائی۔

”کون زارون؟ میں کسی زارون کو نہیں جانتا“، لبھ کو حتی الامکان سخت رکھتے ارحم نے اُس سے رات والی بد تمیزی کا بدلہ لیا۔

”ارحم پلیز بد تمیزی مت کرو اور دروازہ کھولو، ورنہ میں یہیں سے واپس چلا جاؤں گا“، نیچے ہاشم صاحب کی موجودگی کی وجہ سے زارون نے سختی سے کام لینے کی بجائے اپنے لمحے کو ہموار رکھتے اُسے دھمکی دی۔

”ہاں تو چلے جاؤ، مجھے تمہارے یہاں رکنے نہ رکنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا“، نظریں موبائل اسکرین پہ مرکوز کیے ارحم نے بے اعتنائی بر تی تو زارون کو اُس کی حرکت پہ سخت غصہ آیا۔

”ٹھیک ہے میں جا رہا ہوں اور ہاں میں تمہیں پراجیکٹ دکھانے آیا تھا پر مجھے لگتا ہے کہ اب اُس کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں“، اُس کی ہٹ دھرمی پہ دانت پیستے زارون نے ایک آخری حر بہ آزمایا۔

”ہاں ہاں مجھے کوئی ضرورت نہیں نہ تمہاری اور نہ تمہارے بنائے پراجیکٹ کی اور ہاں یہ دھمکیاں انہیں جا کر دو جن پر اس کا اثر ہو“، فٹ سے دروازہ کھولتے ارحم نے گردن باہر نکالتے اُسے مزید تپایا۔

”اچھا ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی“، کندھے اچکاتے زارون نے اُس سے بھی زیادہ اکڑ دکھائی اور واپسی کے لیے سیڑھیوں کی جانب پلٹا تو ارحم نے اُس کے سامنے آتے اُس کا راستہ رو کا۔

”یار میں تو مذاق کر رہا پر تم تو سیر میں ہی ہو گئے“، دانت نکالتے ارحم نے اُس کے چہرے پہ بارہ بجے دیکھ اپنی صفائی پیش کی۔

”پر میں مذاق نہیں کر رہا اس لیے پچھے ہٹو اور مجھے گھر جانے دو“، اپنی بات پر زور دیتے زارون نے اُس کی سائیڈ سے نکلا چاہا۔

”اچھا بس کرو، زیادہ غصہ کرنا صحت کے لیے اچھا نہیں ہوتا، اوندر بیٹھ کر سکون سے بات کرتے ہیں“، ارحم نے معاملہ بگڑتا دیکھ کر بات سننچالنے کے لیے زارون کو ٹھنڈا کرنا چاہا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری بات حد ہے میں تمہارے گھر اس لیے آیا تھا کہ تم میری بے عزتی کر سکو“، اُس کی آنکھوں میں شرارت امڈتی دیکھ زارون نے چیخ و تاب کھاتے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا جواب کانوں کو ہاتھ لگائے نیچے بیٹھ چکا تھا۔

”سوری یار اور میرے ابو کی بھی توبہ جو میں تمہیں دوبارہ گھر بلا کر بے عزت کروں، بس آج سے جو ہو گا باہر ہی ہو گا“، ارحم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنے رویے کی معدرات کرتے آخر میں اپنی بائیں آنکھ دباتے شرارت سے کھا تو زارون ہاتھ میں کپڑا بیگ اُس کی کمر میں رسید کیا۔

”ہائے یار اب اتنا بھی ظلم نہ کرو ایک بیمار بندے پہ“، اُسے مسکراتا دیکھ ارحم نے خود بھی مسکراتے ہوئے مسکین سی صورت بنائی اور جمال کو آواز دے کر جوں لانے کا بولتے اُسے اپنے ساتھ لیے کمرے میں داخل ہوا۔

”اُفف یار بس کرو، میرا دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا لیکھر سن سن کے“، زارون کو ایک اور فائل کھولتا دیکھ کر ارحم نے بے زاری سے لیپ ٹاپ اپنے سامنے کیا۔

”ہونہہ ابھی سنا ہی کیا ہے تم نے، جو میں بس کر دوں اور پلیز یار تھوڑی سنجیدگی کے ساتھ میری پوری بات سن لوتا کہ میں اس کو مکمل کر کے اپنی جان چھڑاؤں“، اُسے غیر سنجیدہ دیکھ زارون نے ایک بار پھر سے لیپ ٹاپ اپنی طرف کیا۔

”میں نے کہانا بس، تو! پلیز بس کرو اور میری جان بخش دو اور ہاں جو ٹاپ تمہیں پسند ہو اُسی پر اجیکٹ بنادینا“، ارحم نے اُسے پھر سے لیکھر دینے کے موڑ میں دیکھ کے جلدی سے ہاتھ جوڑتے بات ختم کی اور لیپ ٹاپ میں موجود مختلف فالز کھولتے اُس میں پڑی موویزا اور تصاویر دیکھنے لگا۔

”تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے اور اگر میری ہی مرضی کا ٹاپ پسند کرنا تھا تو یہ بات مجھے کچھ دیر پہلے بتا دیتے ایسے ہی میرا اتنا تمام ضائع کیا“، اُس کی پیش گوئی پر منہ بسو رتے زارون نے کلاک کی طرف دیکھا جہاں شام کے چھ نجح رہے تھے۔

”ہاں تو کس نے کہا تھا کہ میرے ٹیچر بنو اور یہ ٹیسٹ کس کے ہیں؟“، ایک فولڈر میں سے تصویریں دیکھتے ارجمنے اچانک سے سوال کیا تو زارون نے ہڑ بڑاتے ہوئے لیپ ٹاپ کی اسکرین پہ ہاتھ مارا۔

”کیا مسئلہ ہے تمہیں؟ کیوں تم میری ہر چیز کی تلاشی لینے بیٹھ جاتے ہو؟“، اُس سے نظریں چراتے زارون نے اپنے لبجے کو ہموار کرنے کی کوشش کی جو اپنی چوری کپڑے جانے پہ بالکل بوکھلا چکا تھا۔

”کیا چھپا رہے ہو مجھ سے؟ میں نے اُس دن بھی تم سے پوچھا تھا کہ کیا مسئلہ ہے پر تم نے مجھے ٹال دیا لیکن آج میں تمہیں ایسے جان چھڑانے نہیں دوں گا“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے لیپ ٹاپ واپس اپنی طرف کرتے ارجمن جو ٹیسٹ پہ زارون کا نام پڑھ چکا تھا اُس کے ایک دم سے غصہ کرنے پہ سنجیدگی سے کہنے لگا۔

”یار کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ بس.... میں نے پچھلے دونوں کچھ بلڈ ٹیسٹ کروائے تھے اس کی ہی رپورٹس ہوں گی“، خود کو سنبھالتے زارون نے اُسے روکنے کی کوشش کی۔

”جو بھی ہیں بس چپ کر کے بیٹھو اور مجھے دیکھنے دو“، لیپ ٹاپ اٹھا کر صوفے پہ لے جاتے ارجمن نے اُسے اشارے سے اپنے قریب آنے سے روکا۔

”ارحم میں کہہ رہا ہوں ناکچھ نہیں ہے تو پھر تم کیوں میری بات کا یقین نہیں کر رہے،“ (رات جنید کی موبائل پر بھیجی گئی رپورٹس کی تصویروں کو زارون نے نور کے ڈر سے لیپ ٹاپ میں سیو کر لیا تھا تاکہ وہ اُس کے پاس محفوظ رہیں اور کسی کو چیک کروانے کے لیے اُسے وہ رپورٹس دوبارہ نہ کروانی پڑیں) اپنی بے دھیانی پر خود کو کوستے زارون نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو اسکرین پر نظریں جمائے بالکل ساکت ہو چکا تھا۔

”کینسر؟ یہ کیا لکھا ہے ان رپورٹس میں؟ زارون مجھ سے جھوٹ مت بولنا، پلیز جو بھی ہے مجھے سچ بتاؤ۔ تمہیں میری قسم ہے،“ لیپ ٹاپ گود سے نکال کر صوف پر رکھتے ارحم نے اُس کا ہاتھ پکڑتے اپنے سر پر رکھا۔

”ارحم پلیز مجھے مجبور نہ کرو اور ہاں آج ظہیر صاحب کی طرف ہم سب کی دعوت ہے مجھے سات بجے تک گھر پہنچنا ہے،“ اپنا ہاتھ کھینچتے زارون نے لیپ ٹاپ اٹھا کر بیگ میں ڈالا۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گے، یہاں بیٹھو اور بتاؤ مجھے کیا بات ہے؟ کیا چھپا رہے ہو مجھ سے؟“ اُسے بازو سے پکڑ کر اپنے ساتھ بٹھاتے ارحم نے ہٹ دھرمی دکھائی۔

”کیا بتاؤ؟ سب کچھ تم پڑھ تو پکے ہو،“ اُس سے نظریں چراتے زارون کے چہرے پر ایک تنفسی مسکراہٹ بکھری۔

”نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، مجھے لگتا ہے یہ رپورٹس غلط ہیں“، ارحم جواپنی دادی کے کینسر کی وجہ سے ان رپورٹس کو پڑھنا اور سمجھنا جانتا تھا ایک دم سے بوکھلاتے ہوئے زارون کا ہاتھ چھوڑ گیا۔

”کچھ غلط نہیں ہے، ٹھیک ہے سب، میں دو جگہ سے یہ رپورٹس کرو اچکا ہوں“، نفی میں سر ہلاتے زارون نے ضبط کا مظاہرہ کرتے سچائی بیان کی۔

”یار پاگل ہو تم؟ کیوں تم نے مجھ سے اتنی بڑی بات چھپائی؟“، آگے بڑھ کر جلدی سے اُسے اپنے سینے سے لگاتے ارحم نے اپنی آنکھوں کو بند کرتے آنسوؤں کو بہنے سے روکا۔

”کیا بتاتا؟ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ میں تمہیں یہ سب بتا کر پریشان کرتا“، اُس کی پشت پہ ہاتھ رکھتے زارون نے بے بسی سے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا پریشانی؟ پاگل ہو تم؟ کتنے دنوں سے تکلیف میں ہو اور مجھے بتایا بھی نہیں۔ پہلے کب ہم ایک دوسرے سے اپنی باتیں چھپاتے تھے؟ کب ہم ایک دوسرے کی پریشانی کا سوچ کے چپ رہتے تھے؟“ زارون کوئی ایک بھی موقع بتاؤ جب تم نے مجھے خود سے الگ پایا ہو؟ کوئی ایک وقت بتاؤ جب تمہاری تکلیف سے مجھے پریشانی ہوئی ہو؟ ہم تو ایک دوسرے کا عکس ہیں یا را اور زارون کے بغیر تو ارحم کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک بے معنی اور بے وقت انسان ہے ارحم جسے زارون نے اپنی

محبت کے رنگ بھرتے اب تک زندہ رکھا ہوا تھا تواب یہ سب...، نہیں میں تمہیں کچھ بھی ہونے نہیں دوں گا، آنکھوں سے بہتے آنسو کو صاف کرتے وہ اُس سے الگ ہوا۔ ”کچھ نہیں ہو گا مجھے اور ایسے بچوں کی طرح روتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ حد ہے یہاں دوست، دوست کی تکلیف کا سنتے حوصلہ دیتے اُن کی ہمت بڑھاتے پر یہاں حساب ہی الٹا ہے“، اُس کو یوں روتا دیکھ زارون کی بے چینی کئی گناہ بڑھ چکی تھی۔

”ہاں تو کیا کرو؟ میں جتنا بھی بڑا ہو جاؤں پر تمہارے لیے میرا دل بالکل بچوں کی طرح ہے، نہیں برداشت ہوتی مجھ سے تمہاری کوئی بھی تکلیف“، اُس کے مذاق اڑنے پر شرمندگی کی بجائے ارحم نے صاف گوئی سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”دعا کرو، اس وقت مجھے تمہاری ضرورت ہے تمہارے ساتھ کی“، نم آنکھوں سے مسکراتے زارون نے اپنی اذیت اُس پہ عیاں کی جسے وہ کافی دونوں سے خود سے بھی چھپائے بیٹھا تھا۔ ”ہاں میں ساتھ ہوں تمہارے، بس تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ میں تمہیں کچھ ہونے ہی نہیں دوں گا“، واپس اُسے اپنے سینے سے لگاتے ارحم نے خود کو مضبوط کرتے اُسے تسلی دی جو اُس کا ساتھ میسر آتے ہی اُسے تمام صورت حال سے آگاہ کرتے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے لگا۔

”رضا جلدی کر لو وہ لوگ بس آنے ہی والے ہیں“، کچن میں کام کرتے کرتے کوئی چوتھی بار نائلہ بیگم نے باہر آتے اُسے اپنے ہاتھوں میں تیزی پیدا کرنے کا بولا جوا براہیم کے ساتھ مل کر ان کے گھر سے ان کا ڈائنسنگ ٹیبل لاتے اپنے ٹیبل کے ساتھ سیٹ کرنے میں مصروف تھا۔

”جی ماں بس ہو گیا ہے“، تمام چیزیں اپنی جگہ پر رکھتے رضا نے انہیں تسلی دی جو اُسے برتن نکال کر لگانے کا بولتے پھر سے کچن میں جا چکی تھیں۔

”یہ تمہارے گھروالے سارے کام تم سے ہی کرواتے ہیں کیا؟“ اُس کے ساتھ ہی برتن لا کر ٹیبل پر رکھتے ابراہیم نے طنزیہ سوال کیا۔

”نہیں مجھ سے اکیلے سے نہیں کرواتے بلکہ جب کبھی ضرروت پڑے تو ساتھ والی ابراہیم خالہ کو بھی بلا لیتے“، اُس کے سوال پر دانت پیستے رضا نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا جواب اُس کے جواب پر ماتھے پہ بل ڈالے کھڑا تھا۔

”یہ خالہ کس کو کہا؟ ایک تو میں صبح سے پاگلوں کی طرح تمہارے ساتھ لگا ہوں اور تم میرا شکریہ ادا کرنے کی بجائے مجھے خالہ بول رہے ہو؟ حد ہے آج کل تو بھلانی کازمانے ہی نہیں ہے“، رضا کی بات پر کڑھتے ہوئے ابراہیم نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹیں ٹیبل پر رکھیں۔

”شکر یہ؟ وہ بھی تمہارا؟ میں مر کر بھی ادا نہ کروں اور پہلے بات تم نے شروع کی تھی میں نے نہیں،“ گلاس ترتیب سے لگاتے رضا نے اپنی غلطی ماننے کی بجائے اُس پر مزید چڑھائی کی۔

”ٹھیک ہے پھر میں جا رہا ہوں، کرو اپنے سارے کام خود ہی پر یہ مت بھولنا کہ جس ب瑞انی کالا لچ دے کر تم نے سارا دن مجھ سے کام کروایا ہے میں اُس کے متعلق بھول جاؤں گا،“ اُس کی ہٹ دھرمی پہ تھوڑا اوپنجی آواز میں کہتے ابراہیم نے اپنی بات رضا سے زیادہ کچن میں موجود نائلہ بیگم کو سنائی تاکہ وہ اُسے جانے سے روک سکیں۔

”ٹھیک ہے جاؤ اور ب瑞انی کی بات کام پورا کروانے کے بعد کی ہوئی تھی اور تم کام ادھورا چھور کر جا رہے ہو اس لیے ب瑞انی اور پیز ادونوں کو ہی بھول جانا،“ اُس کی ہٹ دھرمی پہ اُس سے بھی زیادہ تیزی دکھاتے رضا نے حکمکی دی تو ابراہیم نے نائلہ بیگم کو کاموں میں مصروف دیکھ کر چاروں ناچار خاموشی سے واپس پلٹتے باقی بر تن اٹھائے اور دوسرے ٹیبل پہ لگانے لگا۔

-----

اپنادل ہلکا کرتے ہی زارون نے ارحم سے اجازت طلب کی اور دوبارہ ملنے کا بولتے گھر کے لیے روانہ ہوا جہاں سب لوگ اُس کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ ”زارون یار اتنا لام کہاں لگا دیا؟ ہم لوگ

کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں، اُس کی گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو جنید جولان میں موجود اُسی کو کال ملار ہاتھ اُس کے قریب آتے کہنے لگا۔

”جی بھائی بس ارحم کی طرف ہی ٹائم لگ گیا آپ سب کو بلائیں بس نکلتے ہیں، اپنی گھری میں آٹھ بجتے دیکھ زارون نے کپڑے تبدیل کرنے کا رادہ ترک کرتے اُن سے کہا۔

”تم نے چیخ نہیں کرنا؟“

”نہیں بس یہی ٹھیک ہے آپ بلائیں سب کو۔ میں جب تک ڈرائیور کو دوسرا گاڑی نکالنے کا بولتا ہوں،“ اُسے تاکید کرتے زارون نے اپنا رخ دوسری جانب کیا اور کچھ ہی دیر میں وہ لوگ دو گاڑیوں میں سوار ہوتے ظہیر صاحب کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔

-----

اگلے آدھے گھنٹے میں وہ لوگ ظہیر صاحب کے گھر پہنچے تو رضا کے ساتھ ساتھ نائلہ بیگم نے اُن سب کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔

”آئیں اندر آئیں،“ سب سے ملنے کے بعد نائلہ بیگم نے اُن سب کو ساتھ لیے لاڈ بجھ کا رخ کیا تو نور رضا کے ساتھ کچن میں آگئی۔

”کیا کیا بنایا ہے؟“، کچن میں پھیلی محصور کن خوشبو پہ منہ میں پانی بھرتے نور نے للچاتے ہوئے رضا کے جواب دینے سے پہلے ہی ڈھکن اٹھاتے مختلف چیزوں کا جائزہ لیا۔

”بنایا تو کافی کچھ ہے بس آپ کے سرال والوں کو پسند آجائے۔ ویسے آپی باقی سب تو ٹھیک ہیں پر یہ جنید بھائی کی بیوی کچھ عجیب نہیں؟“، رضا جو حنا کی نظر وہ میں اپنے گھر کو دیکھ کر آنے والی حقارت کو محسوس کر چکا تھا اس نے سرسری انداز میں اس بات کا ذکر نور کے سامنے کیا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں، تمہیں ویسے ہی کوئی غلط فہمی ہو گی اور یہ فضول باتیں چھوڑواور گلاس نکالو۔ مامانے جو سلانے کا بولا تھا“، فرنج سے جو س کی پیک نکالتے نور نے حنا کی برائی کرنے کی بجائے رضا کے خدشے کو دور کرتے اُس کا دھیان بٹایا تاکہ اُس کے دل میں کوئی بد گمانی پیدا نہ ہو۔

”میں کچھ مدد کروں تم دونوں کی؟“، نور نے جو س ڈال کر گلاس ٹرے میں رکھے تو زارون نے کچن میں داخل ہوتے اُن دونوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

”نہیں آپ کی مدد کی کوئی ضرورت نہیں، رضا یہ پکڑواور باہر لے جا کر سب کو سرو کرو“، زارون کو جواب دیتے نور نے ٹرے اُس کے ہاتھ میں تھمائی۔ ”کیوں؟ کیا ہوا ہے؟ میں مدد کیوں نہیں کر سکتا“، رضا کے جاتے ہی زارون نے ایک نظر اُس کی تیاری پہ ڈالتے (جو ڈیپ ریڈ گلر کی پاؤں تک

چھوٹی فرائک میں ملبوس ہلکے پھلکے میک اپ اور کھلے بالوں کے ساتھ اُسے عام دنوں کی نسبت کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھی) سوال کیا۔

”اس لیے کہ پھر سب آپ کامڈا ق اڑائیں گے اور کہیں گے کہ آپ اپنے سرال میں آگر کام کرتے ہیں“، حنا کی طرف سے کسی فضول گوئی کے خطرے کے تحت نور نے منہ بسورے زارون کو ٹرے اٹھانے سے منع کیا۔

”ہونہہ کوئی کچھ نہیں کہتا اور اگر کوئی کہے گا تو میں خود ہی جواب دے دوں گا اس لیے تم زیادہ پریشان نہ ہو اور اپنے بالوں کو سمیٹو“، پچھے جلتے ہوئے چوہے پہ نظر پڑتے ہی زارون نے اُسے ہدایت کی۔

”بھائی لائیں مجھے دیں“، اس سے پہلے کے نور کوئی مزید بات کرتی رضا نے کچن میں آتے ٹرے اُس کے ہاتھ سے لی اور واپس لاوٹھ کی جانب بڑھا۔

”کیوں سمیٹوں میں بال؟ نہیں سمیٹنے...“، رضا کے جاتے ہی نور نے بات کا سرا وہیں سے جوڑا۔

”سمیٹ لو، نہیں تو جتنی تمہاری عقل ناتم نے سارے جلا لینے“، خود آگے بڑھ کر اُس کا رخ دوسری جانب کرتے زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اُسے بالوں کو دو چار بل دے کر چھیا کی شکل دی۔

”برے ہیں آپ، حد ہے یہاں میں بال کھول کر اس لیے آئی کہ آپ کو اچھی لگ سکوں۔ جیسے ناول میں ہیر ولڑکی کے کھلے بالوں کو دیکھ پا گل ہو جاتے اُس کی تعریفیں کرتے مجھے لگا آپ بھی ایسے ہی کریں گے پر نہیں آپ ہیں ہی سڑیل“، وہ جو پہلے ہی اُس کی شام والی بات سے ناراض تھی مزید خفا ہوتے کہنے لگی۔

”ہاں بہت براہوں پر جس دن یہ برالانسان مر مارا گیا ناتب تمہیں لگے گا پتا....“، اُس کی بات پر اپنی ہی دھن میں بولتے وہ کس قدر سخت الفاظ استعمال کر چکا تھا اسے خود بھی اندازہ نہیں ہوا۔ ”ٹھیک ہے آپ باہر جائیں جو سپینیں۔ مجھے سلااد بنانا ہے“، رضا کو آتا دیکھ نور نے بات بدلنے کے ساتھ ہی اپنا رخ بھی پھیرتے سلیپ پر سے سلااد کی سزیاں اٹھائیں۔

”زارون بھائی آپ بھی آجائیں، ماما بلار ہی ہیں“، اس سے پہلے کہ وہ نور کو اپنی بات کی کوئی صفائی پیش کر تارضا نے کچن میں داخل ہوتے مداخلت کی تو زارون نے بعد میں بات کرنے کا سوچتے اثبات میں سر ہلا یا اور اُس کے ساتھ ہی باہر نکلتے لاو نجخ کی جانب بڑھا۔

”پتا نہیں کہاں سے سیکھتے ہی ایسی فضول باتیں“، اُن دونوں کے جاتے ہی نور نے اپنی آنکھوں میں آئی نمی کو صاف کیا اور ٹیبل پر سبزیاں رکھتے غصے سے اپنے بالوں کو پکڑتے جوڑے کی شکل میں باندھ گئی۔

”ابو آپ فارغ ہیں؟ وہ مجھے کچھ بات کرنی تھی آپ سے“، ان کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے حبہ نے اجازت ملنے پر اندر داخل ہوتے سوال کیا۔

”ہاں ہاں میں فارغ ہی ہوں، آؤ بیٹھو“، عینک اُتار کر موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھنے انہوں نے اُسے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں بولو کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا؟“، اُس کے بیٹھتے ہی آفندی صاحب نے مطلب کی بات پر آتے استفسار کیا۔

”جی خیریت ہی ہے۔ بس دماغ میں ایک بات کافی دونوں سے چل رہی تھی تو سوچا آپ کو بتا دوں“، اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پیوست کرتے اُس نے اپنی بات کے لیے کچھ مناسب الفاظ کی تلاش میں کچھ دیر کی خاموشی اختیار کی۔

”ہاں بولو، جو بھی بات ہے بلا جھگ کر دیا کرو“، اپنی تمام تر توجہ اُس کی جانب مرکوز کرتے آفندی صاحب نے اُسے بولنے کے لیے اکسایار۔

”وہ میں سوچ رہی تھی کہ کیوں ناہم لوگ اپنے امریکہ والے گھر میں شفت ہو جائیں۔ میرا مطلب کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم لوگ ہمیشہ کے لیے وہاں نچلے جائیں؟“ احتشام کی پھر سے کسی ایسی ولیٰ حرکت کے پیش نظر حبہ جو پچھلے کچھ دنوں سے اس بات پر غور کر رہی تھی بلا خرآج ہمت کرتے اُس نے آفندی صاحب کے سامنے اپنا موقف رکھا۔

”ہاں کیوں نہیں اور یہ بات تم ہی نہیں بلکہ میں اور تمہاری امی بھی سوچ رہے تھے مگر ابھی مجھے پاکستان سے اپنا بزنس وغیرہ ختم کرنے میں وقت لگے گا اس لیے تم لوگ بس اپنی تیاری وغیرہ کرو تو تک میں بھی اپنے کچھ ضروری معاملات نمٹالوں گا،“ آفندی صاحب جو سارہ بیگم کے کہنے پر پہلے ہی امریکہ شفت ہونے کا سوچ کچکے تھے انہوں نے حبہ کے سر پر ہاتھ رکھتے امید دلائی۔

”شکریہ ابو، مجھے پتا ہے آپ دونوں کے لیے یہ سب بہت مشکل ہے پر میرے اور میرے بچوں کی خاطر آپ نے اپنا بہت کچھ قربان کیا ہے،“ آنکھوں میں نمی لیے حبہ نے اُن کے احسانات پر ممنون ہوتے شکریہ ادا کیا۔

”اُف بیٹا ہم اور ہمارا سب تمہارا اور تمہارے بچوں کا ہی ہے اور جہاں تم لوگ خوش وہاں ہم بھی خوش یہ گھر اور دیس کوئی معنی نہیں رکھتے بس تمہارا اور بچوں کا سکون اور اطمینان ضروری ہے

جو یہاں پاکستان میں رہ کر ممکن نہیں،“ دبے لفظوں میں احتشام کی جانب اشارہ کرتے آفندی صاحب نے اُسے شر مندگی سے نکالا جواب کافی حد تک سن بھل چکی تھی۔

”جی جانتی ہوں اور یہ بھی سمجھتی ہوں کہ انسان نے جو گھر بر سوں لگا کر سجا یا اور بنایا ہوا سے چھوڑنا آسان نہیں ہوتا پر میں اب آپ لوگوں کو اپنی اور بچوں کی وجہ سے کسی مشکل میں نہیں ڈال سکتی، اسی لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے“، خود کو حالات سے مقابلے کے لیے تیار کرتے ہبہ نے آفندی صاحب کو وضاحت دی۔

”ٹھیک کیا، کچھ فیصلے انسان کو وقت پہ کر لینے چاہیے تاکہ کسی بڑے نقصان سے بچا جاسکے اور میں نے پہلے بھی کہا کہ گھروں اور دیسوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا انسان کی اصل خوشی اُس کے اپنے ہوتے ہیں اور جب تم لوگ میرے ساتھ ہو تو مجھے یہ اینٹوں سے بنامکان چھوڑنے میں کوئی دقت نہیں“، اُس کے چہرے کی چمک دیکھ آفندی صاحب نے نرمی سے کہتے اُس کے دل پہ چھائی افسردگی کو دور کیا اور اُسے اپنے ساتھ لگاتے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دینے لگے۔

”آنٹی یہ کھر آپ لوگوں کا اپنا ہے یہ کرائے کا؟“ سب لوگ دل جمعی سے اپنی اپنی گفتگو میں مصروف تھے جب حنا نے ایک طائرانہ نظر لاوٹھ میں پڑی چیزوں پہ ڈالتے سوال کیا۔

”جی، بیٹا ہمارا ذاتی ہے“، اس کے اس بے تک سوال پہ جہاں جنید نے اُسے آنکھیں نکالیں وہیں نائلہ بیگم نے غصہ کیے بغیر بڑے تحمل سے جواب دیا۔

”اچھا پھر ٹھیک ہے۔ مجھے لگا کہ شاید مدد کرائے کا ہے جو اتنی بری حالت کی ہوئی آپ نے اس کی“، دیوار میں پڑی دراڑ کو دیکھتے اُس نے جتنی آسانی سے یہ بات کہی تھی اتنی ہی تیزی سے نائلہ بیگم کے چہرے سے مسکراہٹ گائب ہوئی۔

”حنا پلیز چپ ہو جاؤ“، اُس کا ہاتھ دباتے جنید نے اُسے دبے لفظوں میں خاموشی اختیار کرنے کا کہا جو مزید کچھ کہنے والی تھی۔

”سوری آنتی مجھے لگتا ہے آپ کو میری بات بری لگی میں تو بس ایسے ہی بات کر رہی تھی“، آگ لگانے کے بعد احمد صاحب سیمت سب گھروالوں کے سخت تاثرات دیکھنے جلدی سے معذرت کرتے بات کو سنبھالا۔

”نہیں نہیں بیٹا اس میں غصہ کرنے والی کیا بات ہے اور بس جو بھی ہے تمہارے سامنے ہی ہے“، با مشکل مسکراتے نائلہ بیگم نے اُس کی معذرت قبول کی اور رضا کو آواز دیتے کھانا لگانے کا بولا جوتب سے نور کے ساتھ ہی کچن میں موجود تھا۔

”کچھ ہی دیر میں رضا، نور اور ماہم نے سارا کھانا ٹیبل پہ لگاتے سب کو کھانے کے لیے بلا�ا۔

”واہ بھئی خوشبو تو بڑی اچھی آرہی ہے“، اپنی نشست سنبھالتے ہی زارون نے ماحول پہ چھائی افسردگی کو ختم کرنے کے لیے تعریف کی۔

”خوشبو اور کھانا کتنا بھی اچھا ہو پر دیور جی آپ نے کون سا کھانا ہے؟“، ایک بار پھر سے زارون کی بات پکڑتے ہنانے مداخلت کی تو اس بار نور سمیت سب نے اُس کی طرف دیکھا۔

”کیوں؟ میں نے کیوں نہیں کھانا؟ مطلب مجھے منع ہے کیا؟“، بات کو مذاق میں ڈالتے زارون نے کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی حنا کو جواب دیتے یک ڈش سے ڈھکن ہٹایا اور اپنے لیے سالن نکالنے لگا۔

”نہیں بس وہ میرے کہنے کا مطلب تھا کہ تھوڑا ہاتھ روک کے کھانا یا نا ہو کہ سرال کے چکر میں اپنے معدے کا مزید نقصان کر لو جو کہ پہلے ہی کینسر جیسی موزی بیماری کی زد میں ہے“، سب

لوگوں کی موجودگی میں ہنانے اک ادا کے ساتھ اپنی مسکراہٹ چھپاتے ایک آخری وار کیا جو زارون سمیت وہاں موجود تمام فریقین کو سکتے میں ڈال گیا۔

”تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس طرح کی فضول بکواس کرنے کی“، سب سے پہلے جنید نے ہوش میں آتے ہنا کو بازو سے پکڑتے جھنجھوڑا۔

”ویسے ہی جیسے آپ کی اُس دن مجھ سے جھوٹ بول کر رات باہر اپنے اس بیمار بھائی اور باپ کے ساتھ گزرانے کی ہوئی تھی“، جنید کی بات پہ اُس سے بھی زیادہ اوپنچی آواز میں بھرتکتے ہوئے وہ چلائی۔

”منہ بند کرو اپنا“، ایک زوردار تھپٹ اُس کے چہرے پر رسید کرتے جنید نے اُس کی زبان بند کروانے کے ساتھ ساتھ سب کا سکتہ توڑا۔

”بھائی کیا کر رہے ہیں آپ... پلیز میری وجہ سے اپنے رشتے میں تلخی پیدا نہ کریں“، سب سے پہلے زارون نے اُٹھتے اُس کا ہاتھ پکڑا جو ایک بار پھر سے ہنا کے اوپر اُٹھ چکا تھا۔

”تم نے مجھ پہ ہاتھ اٹھایا؟ وہ بھی اپنے اس بھائی کے لیے جس نے زندگی میں پتا نہیں کون کون سے گل کھائے ہیں جس کی سزا اُسے ایسی بیماری کی صورت میں ملی ہے۔ میں تمہیں چھوڑوں گی

نہیں،، کرسی پیچھے کی جانب دھکیلتے ہنانے غصے سے جنید کو دھمکی دی اور سجان کو اٹھاتے نائلہ بیگم کی جانب آئی جو ہنا کی زبانی اتنا بڑا انکشاف سن کر ابھی تک سانس روکے کھڑی تھیں۔

”زارون کو کیسی رہے یہ بات میں نے خود اسی کے منہ سے سنبھال لیے یہ لوگ آپ کو جتنی بھی صفائیاں پیش کریں آپ ان کا یقین مت کریئے گا کیوں کہ یہ لوگ ہیں ہی دھوکے باز۔ یہ صرف اپنا مفاد چاہتے ہیں اس لیے پلیز آپ اگر اپنی بیٹی کی زندگی چاہتی ہیں تو اسے اس شخص سے دور رکھیں جو شروع دن سے پہ آپ سب کو ہی نہیں بلکہ آپ کی بیٹی کو بھی پاگل بنارہا ہے،“ جنید کے تھپٹر کا بدلہ نائلہ بیگم کو ان سے بد گمان کر کے لیتے ہنانے مزید وہاں ٹھہر نے کی بجائے اپنا بیگ اٹھایا اور لاونج سے نکلتے بیر و نی دروازے کی جانب بڑھی۔ م

”اما، ما ما پلیز ہوش کریں،“ ہنا کے جاتے ہی نائلہ بیگم نے ایک نظر ان سب پہ ڈالتے کرسی کا سہارا لیتے کھڑا رہنا چاہا مگر اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے وہ ایک دم سے گرتے زمین بوس ہو گئیں۔

”خطرے کی کوئی بات نہیں ہے بس کسی شاک کے زیر اثر پیشنت بے ہوش ہو گئی ہیں“، ڈاکٹر نے چیک اپ کرنے کے بعد رضا کو تسلی دی جو نائلہ بیگم کی حالت دیکھ کر بہت زیادہ گھبرا چکا تھا۔ ”تو پھر ابھی تک انہیں ہوش کیوں نہیں آیا؟ پلیز سر میری ماما کو جلد ٹھیک کر دیں“، چہرے پہ فکر لیے رضانے بے چینی ظاہر کی تو ڈاکٹر نے اُسے نائلہ بیگم کے جلد ہوش میں آنے کا بتاتے مطمئن کیا اور کچھ ضروری ہدایات دیتے احمد صاحب سے اجازت طلب کی جنہوں نے کال کر اُسے گھر بلا یا تھا۔

”جی آئیں میں آپ کو باہر تک چھوڑ دیتا ہوں“، صورت حال پیچیدہ دیکھ مزمل نے ڈاکٹر کا بیگ پکڑتے اُس کے ساتھ ہی باہر کا رخ کیا۔

”رضاء پلیز خود کو سن بھالو، ڈاکٹر نے کہا ہے ناکہ آنٹی کو جلد ہوش آجائے گا“، اُسے نائلہ بیگم کے قریب ہی اُن کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھنا دیکھ زارون نے حوصلہ دیا۔

”ماما تو ٹھیک ہو، ہی جائیں گی پر آپ نے جو دھوکہ ہمیں اور آپی کو دیا ہے اُس کا ازالہ کسی صورت ممکن نہیں، اس لیے پلیز ہماری تکلیف میں مزید اضافہ نہ کریں اور اپنی ہمدردیوں سمیت یہاں سے چلے جائیں“، لبھے میں کسی قسم کی لچک لائے بغیر رضانے اپنے کندھے پر رکھا زارون کا ہاتھ جھٹکتے ہوئے تنخی سے کہا۔

”رضاتم بالکل غلط سمجھ رہے ہو جنانے جو کچھ بھی کہا، اُس میں کچھ بھی سچ نہیں تھا، ہاں زارون کو مسئلہ ہے پر اس میں اس کا کیا قصور؟ کیا کوئی بھی بیماری انسان کی اپنی خریدی ہوئی ہوتی ہے؟ تم خود سمجھدار ہو یہ بات اچھے سے سمجھ سکتے ہو کہ اگر زارون کو شروع سے یہ مسئلہ ہوتا تو یہ بات اتنی دیر تک تم لوگوں سے پھپھی نہ رہتی“، جنانے کے بعد جنید نے آگے بڑھتے بات کو سننا چاہیے کی کوشش میں کچھ وضاحتیں پیش کیں۔

”سمجھدار ہوں تب ہی آپ لوگوں سے کہہ رہا ہوں کہ یہاں سے چلے جائیں اور رہی بات چھپانے کی تو آپ لوگ تو ابھی بھی ہمیں دھوکے میں ہی رکھتے اگر آپ کی بیوی ہمیں نہ بتاتیں تو....“، اُٹھ کر جنید کے سامنے کھڑے ہوتے رضا نے اب کی بار اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے کرب سے اپنی بات ادھوری چھوڑی تو زارون نے وہاں ٹھہر کر مزید اپنی ذات کی دھیاں اڑتی دیکھنے کی بجائے خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

”رضاتم اب جذباتی ہو رہے ہو، میں تمہیں بتا رہا ہوں ناکہ ہم میں سے کسی نے بھی تم لوگوں کو دھوکہ نہیں دیا۔ ہمیں تو خود زارون کی بیماری کا علم چند دن پہلے ہوا ہے“، اُس کے کمرے سے نکلتے ہی جنید نے اپنے غصے کو کنٹرول کرتے رضا کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”تو؟ علم ہو تو گیا تھانا؟ چلیں ہمیں نہ سہی آپ نے تو آپ کو بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ کیا سمجھ رہے تھے آپ لوگ کہ ان کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے؟ میں آپ لوگوں کو بتارہا ہوں اگر آپ کے بھائی کی وجہ سے میری بہن کو کچھ ہوا تو میں آپ لوگوں کو چھوڑوں گا نہیں“، انگلی اٹھا کر تنہہ کرتے رضا نے کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر اپنی بات مکمل کی اور مزید کسی کی کوئی بھی بات سنے بغیر کمرے سے نکلا تاکہ نور کو دیکھ سکے جو اس وقت سے اپنے آپ کو کمرے میں بند کیے بیٹھی تھی۔

”ابو چلیں گھر چلتے ہیں“، رضا کے اس قدر سخت رویے کے بعد جنید نے ان سے کہا جو اتناسب سننے کے بعد بھی خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ ”نہیں، جب تک نائلہ بہن کو ہوش نہیں آتا اور ہم لوگ ان کا دل اپنی طرف سے صاف نہیں کر لیتے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا“، جنید کی بات سننے ہی احمد صاحب نے اپنا فیصلہ سنایا اور زارون کو دیکھنے کے لیے باہر چلے گئے۔

”پتا نہیں کس کی نظر کھائی میرے بھائی کو“، ماہم جواب کافی حد تک خود کو سنبھال چکی تھی اُس نے عابدہ بیگم کو خاموش کرواتے (جو مسلسل روئے جارہی تھیں) خود کلامی کی۔

”نظریں باہر کے لوگوں کی کم اور اپنوں کی زیادہ لگتی اور زارون کی خوشیوں کو حنا آپی نے اپنی حسد کے نظر لگاتے ہمیشہ کے لیے نہ صرف خود کو ہماری نظروں میں گرا لیا بلکہ جنید بھائی کے دل میں بھی اپنا مقام کھو بیٹھی ہیں“، ہما جو بہن کے عمل پہ تب سے شرمندگی سے سر جھکائے خاموش تھی

اُس نے ماہم کی بات سنتے ہی بہن کی سوچ پر افسوس کا اظہار کیا جو پتا نہیں کیوں اپنے اندر اتنا زہر بھرتے اپنے ہی گھر کو برباد کرنے میں لگی تھی۔

”ہاں جنانے تو آج حد ہی کر دی اگر اسے کچھ پتا بھی تھا تو اسے ایسے سب کے سامنے بتانا نہیں چاہیے تھا“، مزمول جوا بھی ابھی کمرے میں داخل ہوا تھا اُس نے ہماکی بات سنتے بتا سید کی۔

”وہ عورت شروعِ دن سے ہی پاگل ہے۔ اُس نے پہلے دن سے ہی میرے اپنوں کے لیے اپنے دل میں بغض رکھا اور ہمیشہ چالیں ہی چلیں مگر اس بار اُس کی چال کس طرح اُس کے ہی اوپر الٹی پڑے گی نہ تو وہ جانتی ہے اور نہ ہی صححتی“، ان سب کی باتوں کے بعد جنید نے دماغ میں چلتے ارادے پر عمل کرنے کے لیے باہر کارخ کرنا چاہا پر اُس سے پہلے ہی عابدہ بیگم نے کسی خدشے کے تحت اُس کے سامنے آتے آتے اُسے روکا۔

”جنید ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں اس لیے خدا کے واسطے جلد بازی اور غصے میں کوئی فیصلہ کر کے ہمیں مزید پریشانی میں مت ڈالو“، اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے عابدہ بیگم نے بے بسی سے اپنی بات مکمل کی۔

”وہ نادان ہے، حسد اور بد لے کی آگ میں نادانی کر بیٹھی ہے پر تم تو سمجھدار ہوا یسے جلد بازی کر کے زارون کو مزید تکلیف مت دو“، جنید نے اُن کے ہاتھ پکڑتے نیچے کیے تو عابدہ بیگم نے اپنے آنسو صاف کرتے اُسے نصیحت کی اور کوئی بھی بڑا قدم اٹھانے سے روکا۔

”نادانی سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی اور ابھی تو میں آپ کی خاطر خاموش ہو گیا ہوں پر اب میں اُس عورت کو سبق سکھائے بغیر پچھے نہیں ہٹوں گا“، اُن کے جڑے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھتے جنید نے ضبط کرتے اپنے ارادوں سے انہیں آگاہ کیا اور احمد صاحب کے پکارنے پر وہاں سے نکلتے لاوچ کی جانب بڑھا۔

”آپی پلیز دروازہ کھولیں۔ ماما کی طبیعت پہلی ہی خراب ہے اور اگر آپ بھی ایسے خود کو بند رکھیں گی تو میں کیسے اُن کو سن بھالوں گا“، پچھلے پندرہ منٹ سے لگاتار دروازے پر دستک دیتے رضانے اُسے پکارا جو اندر پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ باہر سے آنے والی کسی بھی آواز پہ کان بند کیے بیٹھی تھی۔

”آپی پلیز دروازہ کھولیں، دیکھیں ایسے خود کو بند کر لینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتے۔ ایسے تہائی میں رہ کر تو آپ کی تکلیف اور بڑھ جائے گی“، پھر سے دستک دیتے رضا نے اُسے دروازہ کھولنے کے لیے اکسا یا پروہ اُس کی تمام باتیں سننے کے باوجود بھی سمجھنے سے قاصر مزید سمت کر بیٹھ چکی تھی۔

”میں دیکھتا ہوں تم آنٹی کے پاس جاؤ“، اُس کی ہر کوشش ناکام ہوتی دیکھ زارون نے ہمت کر کے اُس کے قریب آتے کہا۔

”کوئی ضرروت نہیں ہے آپ کو دیکھنے کی، ابھی مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ میں اپنی ماں اور بہن کو سنبحال سکوں“، ایک حقارت بھری نظر اُس کے چہرے پر ڈالتے رضا نے کہنے کے ساتھ ہی اُس کے سینے پر ہاتھ رکھتے پچھے کیا۔

”رضا پلیز، اگر میں تمہاری عزت کر رہا ہوں نا تو تم بھی اپنی حد میں رہو“، اُس کی بڑھتی ہوئی بد تمیزیوں پر اس بار ضبط کے باوجود زارون نے اُسے آنکھیں دکھائیں جو پوری بات جانے بغیر ان کو قصور وار ٹھہرا رہا تھا۔

”عزت؟ بس بس جانتا ہوں جو آپ نے ہماری عزت کی اور کروائی اس لیے پلیز میرا منہ مت کھلوائیں اور یہاں سے چلے جائیں“، اُس کی بات پر طزر کرتے رضا نے ایک بار پھر سے اُسے اپنی

نظروں سے دور جانے کا بولا جیسے وہ اپنا خیر خواہ سمجھتے اپنی بہن کی تمام تر ذمہ داریاں اُس کے حوالے کر کے مطمئن تھا۔

”میں نور کو لیے بغیر یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گا اس لیے تمہیں جتنا بھی غصہ کرنا ہے کر لو“، اُس کے غصے پر زارون نے ہٹ دھرمی دکھاتے اپنا فیصلہ سنایا۔

”آپی اب آپ کے ساتھ نہیں جائیں گی اور پلیز شرم کریں ایک جیتنے جاگتے انسان کو آپ اپنے مردہ وجود کے ساتھ باندھ کر کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ میری بہن آپ کے ساتھ کہیں نہیں جائے گی اور آپ کے ساتھ سمجھنے سے اچھا ہے میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلاڈ بادوں“، تلخی کی تمام حدیں پار کرتے رضا نے بناسوچے اُس کے لیے ایسے الفاظ استعمال کیے جنہیں سن کر زارون کا ضبط جواب دے گیا۔

”ہم ٹھیک کہہ رہے ہو تم، مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا کہ میں نور کو اپنے ساتھ لے جاؤں پر پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ نور خود مجھ سے یہ بات کہے“، چہرے پہ مسکراہٹ سجائے زارون نے اپنوں کے ایک پل میں بدلتے رویوں پہ حیرت کا اظہار کرتے اپنے ارادہ بتایا اور آگے بڑھتے دروازے پر دستک دینے لگا۔

”نور دروازہ کھولو، مجھے تم سے بات کرنی ہے“، ایک امید کے تحت اُسے پکارتے زارون نے دو سے تین بار دروازے پہ دستک دی۔

”میں نے کہا ناکہ آپ کے ساتھ نہیں جائیں گی تو کیوں بار بار آپ میرے منہ سے اپنے لیے فضول الفاظ سن رہے ہیں“، اُس کا ہاتھ روکتے اس بار رضا نے خود کو مزید کچھ سخت کہنے سے باز رکھا۔

”جب سننے والے کو دکھ نہیں ہے تو سنانے والا کیوں پشیمان ہو رہا ہے؟“ اُس کی بات سننے ہی زارون نے لبھج میں افیت لیے رضا کو مزید شرمندہ کیا۔

”تم پریشان نہ ہو اور جو دل کرتا ہے بولو پر میں یہاں سے نورا کا فیصلہ سنے بغیر نہیں جاؤں گا۔ سب کا اصل چہرہ دیکھ چکا ہوں اس لیے چاہتا ہوں کہ جس سے میں نے زندگی میں سب سے زیادہ پیار کیا ہے جس پر اس وقت مجھے سب سے زیادہ مان اور یقین ہے اُس کا فیصلہ بھی اپنے کانوں سے سن لوں اس لیے تم پریشان نہ ہو میں تمہاری بہن کو اپنے ساتھ کے لیے پابند نہیں کروں گا“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے زارون نے مسکراہٹ کو اپنے چہرے پہ برقرار رکھا تو رضا نے ایک خالی نظر اُس پر ڈالی اور مزید کچھ بولے بغیر فیصلہ نور پر چھوڑتے ناکہ بیگم کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

-----

”نور پلیز ایک بار دروازہ کھول کر میری بات سن لو پھر جو بھی تمہارا فیصلہ ہوا میں اُس میں مداخلت نہیں کروں گا“، رضا کے جاتے ہی زارون نے دروازے پہ دستک دیتے اُسے مخاطب کیا۔

”نور تمہیں مجھ پہ یقین ہے نا؟ تمہیں کبھی دھوکہ نہیں دے سکتا، پلیز دروازہ کھولو ایسے خود کو بند کر کے تم اپنے آپ کو ہی نہیں بلکہ مجھے بھی افیت دے رہی ہو“، پھر سے ہاتھ مارتے زارون نے بے بسی سے اُسے پکارا جس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اب اُس کی آواز سے حرکت پیدا ہوئی۔

”بس یک بار میری بات سن لو اُس کے بعد تم جو بھی فیصلہ سناؤ گی میں تمہیں نہیں رکوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تم سے اپنی بیماری کا چھپا کر غلط کیا پر یہ سب میں نے تمہارے لیے کیا، میں نہیں چاہتا تھا کہ تم یہ سب سن کر کمزور پڑو، تمہاری تکلیف کا سوچ کر مجھ میں ہمت نہیں ہوئی کہ میں تمہیں اپنے متعلق کچھ بتاسکوں۔ یقین جانواں میں میرا اپنا کوئی مفاد نہیں تھا۔ میں نے تو صرف تمہیں تکلیف سے بچانا چاہا“، ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں سے اپنے ناکرده جرم کی صفائی دیتے زارون کی زبان چند لمحوں کے لیے لڑکھڑائی۔

"بس تم ایک بار میری بات سن لو، میں تمہیں سب کچھ سچ بخداوں گا،" اُس کے ساتھ دینے کی امید دل میں لیے زارون نے ایک بار پھر سے اُسے پکارا جس کی آنکھوں سے آنسو تو اتر سے بہنے لگے تھے اور باہر کھڑے شخص کے ٹوٹے پھوٹے لفظوں اور لمحے کی لڑکھڑاہٹ اُسے اپنے دل میں ہلچل مچانی محسوس ہوئی تب ہی ضبط کرتے اُس نے آج اُس شخص کے ساتھ ساتھ اپنے رشتہ کامان برقرار رکھتے اٹھ کر لرزتے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ دروازہ کھولا۔

"تم ٹھیک ہونا؟" دروازہ کھولتے ہی زارون نے بے تابی سے اندر داخل ہوتے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لیا جو ضبط کی انتہا پہ پہنچتے اثبات میں سر ہلاکئی تھی۔

"میں پانی لے کر آتا ہوں" اُس کے زرد پڑتے چہرے کو دیکھ زارون نے جلدی سے اُسے صوف پہ بٹھایا اور کمرے سے نکلتے کچن کی جانب بڑھا۔

"یہ لوپانی پیو" کچھ سیکنڈز میں کمرے میں واپس داخل ہوتے زارون نے گلاس اُس کے لبوں سے لگایا جس میں سے صرف ایک گھونٹ بھرتے نور نے اُسے پیچھے کیا۔

"تم ٹھیک ہونا؟ نہیں طبیعت ٹھیک تو مجھے بتاؤ میں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں" اُس کے چہرے پہ آئے بالوں کو پیچھے کرتے زارون نے نرمی کے ساتھ اُسے بولنے پہ اکسایا جس کی خاموشی اُس کے دل میں طوفان اُٹھا رہی تھی۔ "اُس... صبح.... میں سو نہیں رہی تھی.... میں.... نے آپ

کی... ساری باتیں سن لی تھیں پر! مجھے یہ اندازہ نہیں تھا... کہ جس بیماری کا آپ ذکر... کر رہے تھے وہ اتنی خطرناک ہے...، لب بھینچے نور نے آنسوؤں کو بند توڑنے سے روکا جو سامنے بیٹھے شخص کے حقیقت نہ بتانے پر نہیں بلکہ اُس کو کھو جانے کے ڈر سے بہہ رہے تھے۔

”کیا مطلب تم نے میری باتیں سن لیں تھیں؟“، اُس کی بات پہ دوہرًا کرو پوچھتے زارون نے سکتے سی کیفیت میں تصدیق چاہی۔

”آپ نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کو چھوڑ دوں گی۔ ہاں حنا بھا بھی کے اچانک بتانے پہ میں خود کو سنبھال نہیں پائی لیکن کیا میں آپ کو اتنی کم ظرف لگتی ہوں؟ کہ آج اللہ نے آپ کو آزمائش میں ڈالا ہے تو میں آپ کو اکیلا چھوڑ دوں“، اُس کے سینے پہ سر رکھتے نور نے اُس کے کسی بھی سوال سے پہلے اُسے سارے جواب فراہم کیے۔

”آپ کو لگتا تھا کہ میں بھی لوگوں کی طرح آپ کو چھوڑ دوں گی؟“ تب ہی آپ نے اتنی بڑی بات مجھ سے چھپائی۔ خود تکلیف میں رہ کر میرے چہرے پہ مسکراہٹیں بکھرتے رہے۔ مجھے دکھ اس بات کا نہیں کہ آپ نے یہ سچائی مجھ سے چھپا کر رکھی بس تکلیف اس بات کی ہے کہ اگر آپ مجھے بتادیتے تو میں اس طرح آپ کو سب کے سامنے نشر ہونے سے بچا لیتی، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے نور نے اپنی آنکھوں کو مضبوطی سے بند کرتے آنسوؤں کو اندر اترانے کی کوشش کی۔

”آپ مجھ پہ اعتبار تو کرتے کیا میں اتنی نادان تھی کہ آپ نے مجھے اپنی تکلیف سے لا علم رکھا، خود اکیلے ہی اتنا کچھ برداشت کرتے رہے پر مجھ سے ایک لفظ تک نہیں کہا“، اپنا ہاتھ اُس کے رخسار پہ رکھتے نور نے اپنی تمام بالوں کی وضاحت چاہی۔

”کتنی دفعہ میں نے منع کیا ہے کہ رویامت کرو، مجھے تمہارا رونا بالکل بھی پسند نہیں“، اُس کے چہرے پہ کرب دیکھ زارون نے اس وقت کوئی بھی جواب دینے کی بجائے اُسے اپنے ساتھ لگایا جس کا دل ضبط سے پھٹنے کو تھا۔

”میں پوری زندگی آپ سے کچھ نہیں مانگوں گی بس، پلیز زار مجھے چھوڑ کر کہیں مت جائیے گا، نور آپ کے بغیر ایک کھوکھلاسا وجود ہے۔ مجھ میں آپ کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے“، اُس کی شرط کو مضبوطی سے اپنی مٹھی میں جکڑتے نور نے کسی معصوم سے بچ کی طرح اپنا آپ اُس میں چھپانے کی کوشش کی۔ ”کہیں نہیں جاؤں گا، میں پاس ہوں نا اپنی جان کے“، اُس کے ساتھ نے زارون کو ہر انسان کے بُرے رویے کا دکھ بھلاتے بالکل ہلکا پھلا کا سا کر دیا تھا تب ہی اُسے خود میں بھنپتے ہوئے اُس بات کا یقین دلایا جس کا علم اُسے خود بھی نہ تھا۔

نائلہ بیگم کو ہوش آیا تو انہوں نے ایک نظر اپنے پاس کھڑے نفوس پہ ڈالی اور ایک گھری سانس لیتے واپس آنکھیں موند گئیں۔

”ماما کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ رضا جو ان کے قریب ہی کھڑا تھا جلدی سے بیٹھ پہ بیٹھتے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام گیا۔

”ماما پلیز آنکھیں کھولیں، بتائیں مجھے کیسا محسوس کر رہی ہیں اب آپ؟“ ان کا چہرہ اپنی جانب کرتے رضا نے انہیں بولنے کے لیے اکسایا جن کا دل بیٹی کی زندگی میں آنے والے اتنی بڑی اذیت پہ خون کے آنسو رور ہاتھا۔

”ماما کیا ہوا ہے؟ کیوں رو رہی ہیں آپ؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟“ ان کی آنکھوں سے تو اتر سے بہتے آنسوؤں پہ تڑپتے ہوئے رضانے یک بعد دیگرے کئی سوال کیے۔

”نور؟ نور کہاں ہے؟“ اس کی باتوں کا جواب دینے کی بجائے نظروں میں نا آشنائی کی رمق لیے نائلہ بیگم نے اپنے سے کچھ فاصلے پہ کھڑی عابدہ بیگم اور ماہم کو دیکھا جو صرف رضا کی وجہ سے ابھی تک خاموش کھڑی ان ماں بیٹی کی باتیں سن رہی تھیں۔

”آپی ٹھیک ہیں، باہر ہیں آپ پریشان نہ ہوا اور اٹھیں تھوڑا جو سپی لیں پھر میں بلاتا ہوں“، ان کے پیچے تکیہ ٹھیک کرتے رضا نے انہیں بٹھانے کے ساتھ ہی سائیڈ ٹیبل پر کھا گلاس اٹھاتے ان کے بوس سے لگایا۔

”مجھے کچھ نہیں پینا، بس نور کو بلا دو میں اُسے ایک بار دیکھ لوں گی تو میرے دل کو تسلی ہو جائے گی“، گلاس پیچھے کرتے نائلہ بیگم نے لنفی میں سر ہلانے کے ساتھ ہی رضا سے درخواست کی۔ ”میں بلا تی ہوں تم آنٹی کے پاس ہی رکو“، نائلہ بیگم کی بے اعتنائی دیکھ ماہم نے کہنے کے ساتھ ہی عابدہ بیگم کو بھی اپنے ساتھ چلنے کا بولا۔

”رہنے دیں بہت مہربانی آپ کی۔ میں خود بلا لوں گا“، نائلہ بیگم کی طبیعت کے پیش نظر رضا نے دبے لفظوں میں ماہم کی عنایت پہ اُسے منع کیا اور ان سے پہلے ہی اٹھ کر کمرے سے نکلا تاکہ نور کو بلا سکے۔

”نائلہ بہن کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“، رضا کے جاتے ہی ماہم کے منع کرنے کے باوجود بھی عابدہ بیگم نے آگے بڑھتے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”مارنے والے حال نہیں پوچھا کرتے۔ ویسے کون سی دشمنی تھی آپ کو ہمارے ساتھ؟ آپ بھی ایک بیٹی کی ماں ہے نا؟ ذرا سا بھی آپ کے دل میں خوف نہیں آیا ہم سے اتنی بڑی بات چھپاتے“، ٹوٹے ہوئے لمحے کے ساتھ الفاظ کو ٹھہر

ٹھہر کر ادا کرتے نائلہ بیگم نے نظروں میں حقارت لیے انہیں دیکھا جو اتنے مخلص چہرے کے پیچھے اتنا بھیانک سچ چھپائے ہوئے تھیں۔

”نائلہ بہن پلیز، ایک بار میری بات سن لیں جنانے جو کچھ بھی کہا وہ سب کچھ غلط تھا اور مجھے تو خود رات کو یہ بات پتا چلی ہے۔ ہم لوگوں نے آپ کو یانور کو کوئی دھوکہ نہیں دیا ہے“، ان کے قریب بیٹھتے ان کا ہاتھ تھما تے عابدہ بیگم نے نرمی کے ساتھ ان کا دل صاف کرنے کی کوشش کی۔

”غلط تھا یا نہیں اس کا فیصلہ کرنے والی آپ کون ہوتی ہیں؟ آپ نے جو کرنا تھا کر لیا، شرم نہیں آئی آپ لوگوں کو اپنے بیمار بیٹے کے ساتھ میری پھولوں جیسی بچی کو باندھتے ایک بار بھی نہیں سوچا آپ نے؟ کہ جب یہ سچائی سامنے آئے گی تو کتنے رشتے ٹوٹیں گے؟ کتنی زندگی بر باد ہوں گی؟“، ان کی صفائی پہ کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر نائلہ بیگم نے اپنے درد سے پھٹتے دل کے ساتھ انہیں کھری کھری سنائی جو ان کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے اپنے بیمار بیٹے کا گھر بسا چکے تھے۔

”ماما یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ کس طرح آپ ماما سے ایسی بات کر سکتی ہیں؟ آپ بھول رہی ہیں باندھا انہوں نے اپنے بیٹے کو نہیں بلکہ آپ نے لوگوں کے ڈر سے اپنی بیٹی کو ایک انجان شخص کے حوالے کیا تھا۔ بیٹی کی وضاحتوں، صفائیوں اور منتوں کو درکنار کرتے آپ لوگوں نے ایک بار بھی سوچا کہ جس شخص کے حوالے آپ لوگ مجھے کر رہے ہیں وہ کیسا ہے؟ کون ہے؟ خاندان؟ نسل؟

کچھ بھی تو نہیں دیکھا آپ نے۔ اُس وقت تو صرف آپ لوگوں کو اپنی عزت کی فکر تھی جو میرے ایک ناکردار گناہ کی وجہ سے داؤ پہ لگی تھی،، ان کی طبیعت خرابی کا کوئی بھی لحاظ کیے بغیر نور نے سچائی بیان کی تو نائلہ بیگم کے ساتھ ساتھ رضا کی بھی زبان کوتالا لگا۔

”کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں آپ لوگ یہ سب کر کے کہ میں ایک ایسے شخص کا ساتھ چھوڑوں جس نے مجھے اُس وقت سہارا دیا جب یہ ساری دنیا حالانکہ میرے اپنے ماں باپ تک میرے خلاف تھے؟“ نائلہ بیگم اور رضا کی زارون کے لیے نفرت دیکھ دلبر داشتہ ہوتے اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”نور پلیز چپ کرو آنٹی کی طبیعت پہلے ہی خراب ہے،“ اُس کو مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتا دیکھ زارون نے درمیان میں آتے مداخلت کی۔

”نہیں پلیز زار مجھے بولنے دیں اگر میں آج چپ رہی تو میں کبھی بھی اپنے آپ کو معاف نہیں کر پاؤں گی،“ اُس کا اپنے کندھے پہ موجود ہاتھ ہٹاتے نور نے آنکھوں میں نمی لیے التجاء کی۔

”نہیں بس میں نے کہانا کہ تم اب کچھ نہیں بولوگی تو پلیز میری بات مان لو،“ نائلہ بیگم کے سپید پڑتے چہرے کو دیکھ زارون نے اُس کی التجاء کو خاطر میں لائے بغیر نفی میں سر ہلا�ا۔

”ٹھیک ہے گھر چلیں بس، میں کچھ دیر اور یہاں رہی تو میرا دم گھٹ جائے گا“، آنسوؤں کو اپنے اندر اتارتے نور نے کہنے کے ساتھ ہی باہر کا رخ کیا تو عابدہ بیگم اور ماہم بھی اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

”آپ پریشان نہ ہوں اور پلیز نور کی طرف سے میں آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ پتا نہیں غصے میں کیا کیا بول گئی ہے“، ان سب کے جاتے ہی زارون نے نائلہ بیگم سے معذرت کی جو بیٹی کی باتیں سن کر شرمندگی سے سر جھکائے پیٹھی تھیں۔

”پلیز آنٹی کا خیال رکھنا میں صبح نور کو ساتھ لے کر چکر لگاؤں گا“، رضا کی اتنی تلخ باتوں پر بھی زارون نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے تاکید کی اور جنید کی پکار سنتے باہر کی جانب بڑھ گیا جہاں سب اُسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

”مجھے ایک بار بات کر لینے دوناں لہ بہن سے“، باہر نکلتے ہوئے بھی احمد صاحب نے اصرار کیا پر ماہم نے انہیں ایسا کرنے سے روکا اور صبح آکر بات کرنے کا بولتے انہیں ساتھ لیے گیٹ کی جانب بڑھی۔

-----

”اما پلیز خود کو سنبھالیں“، اُن کے جاتے ہی نائلہ بیگم کی حالت غیر ہونے لگی تو رضا نے جلدی سے گلاس اٹھاتے انہیں پانی پلا یا۔

”ٹھیک ہوں میں“، دو گھونٹ بھرتے انہوں نے گلاس پیچھے کیا۔

”پلیز آپ کچھ دیر لیت جائیں۔ مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی“، اُن کی سپید پڑتی رنگت کو دیکھتے رضا نے تکیہ ٹھیک کرتے انہیں لٹایا۔

”پلیز آپ پریشان نہ ہوں، آپی کے دماغ میں تو پتا نہیں اُن لوگوں نے کون سازہر بھردیا ہے کہ ہم لوگ انہیں نظر ہی نہیں آتے“، اُن کے چہرے سے پسینہ صاف کرتے رضا کو نور پہ غصہ آیا جو نائلہ بیگم کی طبیعت خرابی کا معلوم ہوتے ہوئے بھی اُن کو اتنا کچھ سنا چکی تھی۔

”زہر نہیں تھا وہ، سچائی تھی جسے ہم فراموش کیے سارا الزام اُن لوگوں پہ لگا رہے تھے جن کا اس عمل میں کوئی قصور نہیں تھا“، رضا کے لبجے میں حقارت محسوس کرتے نائلہ بیگم نے اُس کی سائیڈ لینے کی بجائے آنکھوں کے آگے سے دکھ اور غصے کا پردہ ہٹاتے نور کی حمایت کی۔

”اما آپ بھی آپی کو ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ وہ تو شروع سے ہی نادان ہیں پر آپ تو سمجھ سکتی ہیں ناکہ زارون بھائی نے ہمارے ساتھ ساتھ آپی کو بھی دھو کے میں رکھا ہوا تھا“، رضا جس کا دماغ ابھی تک حنا کی باتوں میں اٹکا تھا اُس نے نائلہ بیگم کو نور کی سائیڈ لیتاد کیکھ کر آواز اٹھائی۔

”نادان وہ نہیں بلکہ ہم ہو گئے تھے، نور ٹھیک کہہ رہی تھی انہوں نے اپنے بیٹے کو ہمارے پلے نہیں باندھا بلکہ ہم نے زبردستی اپنی بیٹی ان کے سر مسلط کیا اور یہ تو اس وقت ان لوگوں کا بڑا پن تھا جو انہوں نے ہماری عزت بچالی ورنہ ایک داغ دار لڑکی کو کوئی بھی اپنے گھر کی بہو نہیں بناتا ہے شک قصور ان کے بیٹے کا بھی ساتھ کیوں نا ہو“، رضا کے اعتراض پر ظہیر صاحب کے جلد بازی کے فیصلہ پر پچھتا تے نائلہ بیگم نے اپنی بات مکمل کی۔

”ٹھیک ہے میں مانتا ہوں کہ ان لوگوں کا ہم پر احسان ہے پر کوئی احسان کا بدلہ ایسے اچکاتا ہے کیا؟ اس سے بہتر تھا کہ بابا آپی کو اُسی وقت مار دیتے کم از کم ایک یہاں شخص کے ساتھ رہ کر روز رو روز مرنے سے تو اچھا ہی تھا“، نور کے آنے والے مستقبل کو سوچ کر رضا نے لرزتی ہوئی زبان کے ساتھ اپنی بات کہی۔

”اگر وہ اُس وقت مرتی تب بھی میں زندہ نہ رہتی اور اگر وہ اب اذیت میں ہے تو تب بھی میری سانسیں ہر وقت اٹکی رہتیں۔ ماں کے لیے تو اولاد کا دکھ ہر لحاظ سے ہی بُرا ہوتا ہے اور میری نور کی قسمت میں تو پتا نہیں ابھی کتنی اور مصیبتیں لکھی ہیں۔ بس اللہ پاک اب اُسے کوئی دکھ نہ دے مجھے میں ہمت نہیں ہے کہ میں اُس کی کوئی تکلیف برداشت کر سکوں“، آنکھوں میں آنسو لیے نائلہ بیگم نے اپنی بیٹی کے حق میں دعا کی۔

”آمین، پر آپ کو نہیں لگتا آپی نے زارون بھائی کا ساتھ دے کر غلط کیا۔ مطلب وہ کیوں ان کے ساتھ گئیں جب کہ انہیں پتا چل چکا تھا کہ انہوں نے ان کے ساتھ دھوکہ کیا ہے“، نائلہ بیگم کے آنسو دیکھ کچھ ٹھنڈا پڑتے رضاۓ ایک اور سوال کیا۔

”کیوں نادیتی وہ ساتھ، وہ نادان اور معصوم ضرور ہے پر ہماری طرح بے رحم اور جذباتی نہیں۔ ہم نے صرف زارون کی بیماری کا جان کر اُس کی تمام اچھائیوں کو فراموش کر دیا۔ ہمیں یہ تنک یاد نہیں رہا کہ اُس نے نور کونہ صرف مشکل سے نکالا بلکہ اُس کی عزت کی حفاظت کرتے اُسے اپنا نام دیا، اُسے اپنی زندگی میں شامل کرتے پھر سے اعتماد دیا کہ وہ خود کو ایک بد کرادار اور ماں باپ کی طرف سے جھٹلائی ہوئی لڑکی نہ سمجھے، اُس وقت جب اُس سے سب سے زیادہ ضرورت تھی تو نہ تو تم نے بھائی ہونے کا فرض ادا کرتے ظہیر کو روکا اور نہ ہی میں نے ماں بن کر اُس کے لیے آواز اٹھائی اور جب اُس وقت ہم خاموش رہے تو اب بھی ہمارا کوئی حق نہیں تھا کہ وہ ہمارے لیے رکتی۔ اُس نے بالکل ٹھیک کیا بس ہم ہی چند لمحوں کے لیے ہنا کی باتیں سن کر بیوی قوف بن گئے تھے“، اس کے سوال پہ نم آنکھوں کے ساتھ اپنے دماغ میں چلنے والی تمام باتوں کو اُس کے سامنے بیان کرتے نائلہ بیگم نے اپنے ساتھ رضا کا بھی دل صاف کیا جو ایک دم سے زارون کی بیماری کا سن کر اُن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو مغلوب کر چکا تھا۔

”ہم جو بھی تھا پر اگر کوئی ایسی ویسی بات تھی تو زارون بھائی کو نکاح کے وقت بتانی چاہیے تھی اور مامایہ کوں سی کوئی چھوٹی سے بیماری ہے جو چند گھنٹوں اور دنوں میں ظاہر ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ زارون بھائی کی بھا بھی کی بات ٹھیک ہو۔ مطلب آپ خود سوچیں ایک شخص جس کو سارا کچھ پتا ہو، یعنی نور آپی کارات باہر رہنا بے شک وہ ان کے ساتھ ہی تھے پر اتنی آسانی سے ان کے گھروالوں کا مان جانا کوئی معمولی بات نہیں“، نائلہ بیگم کی ہمدردی کو پیش نظر رکھتے رضا نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”پتا نہیں پر جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے اب ان باتوں کو دہرانے سے کچھ بدل نہیں جائے گا۔ زارون ہماری نور کی قسمت میں لکھا تھا اسے ہی ملنا تھا بس اب تم دعا کرو کے اللہ پاک اُسے جلد از جلد صحت یاب کر دے“، اپنے چکراتے ہوئے سر کی وجہ سے آنکھیں موند تے نائلہ بیگم نے اپنے آپ کو پر سکون کرنے کی کوشش کی تو رضا نے بھی مزید اس بارے میں کوئی بھی بات کرنے سے غرض بر تنتے کمفر طرائق کے اوپر ٹھیک سے دیا اور انہیں آرام کا بولتے گیٹ بند کرنے کے لیے کمرے سے نکلا۔

گھر پہنچتے ہی نور کسی سے کوئی بھی بات کرے یا سنے بغیر اور پرانے کمرے میں جا چکی تھی اور زارون کچھ دیر کے لیے وہیں سب کے ساتھ نیچے رک گیا۔

”حنانے آج جو بھی کیا وہ اچھا نہیں تھا۔ بے شک ابھی یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی پر ہمارا مقصد اس بات کو چھپانا ہرگز نہیں تھا۔ بس ابھی تو خود ہم اپنے آپ کو سنبھال رہے تھے اور یہ کوئی ایسی بات تو تھی نہیں جو زیادہ دیر تک چھپی رہتی پر حنانے بہت غلط وقت پر اس بات کو بیان کر کہ نہ صرف ہمیں شرمندہ کیا بلکہ ہمارے دل سے اپنا مقام بھی کھو دیا“، سب کے بیٹھتے ہی احمد صاحب نے شدید برہم ہوتے جنید کو سنائی جو دوسروں کو سمجھاتے سمجھاتے اپنے گھر اور بیوی کو سمجھنا بالکل بھول چکا تھا۔

”ابو پلیز آپ پریشان نہ ہوں یہ بات ایک نا ایک دن سب کے سامنے آئی ہی تھی اس میں حنا بھا بھی کا کیا قصور؟ انہوں نے تو اپنے ظرف کے مطابق سب کیا“، زارون نے اُن کے قریب بیٹھتے انہیں تسلی دی۔

”اتنا گراہوا ظرف بھی کسی کا نا ہو، توبہ ہے اس گھر میں حنا کو کس چیز کی کمی تھی جو اُس نے بھری محفل میں ایسی بات کر کے ہماری توہین کی؟ اور یہ نور کی امی اور بھائی کم از کم یہ تو سوچ لیتے کہ

زارون نور کو کن حالات میں بیاہ کر لایا تھا، ماہم جو نائلہ بیگم اور رضا کے رویے پہ سخت خائن تھی اُس نے اپنی زبان کو کوئی بھی ایسی بات کہنے سے روکا جس سے زارون کو مزید تکلیف ہوتی۔

”ہاں بس ان کا بھی ظرف ہی تھا جو حنا آپی میں تو سب کو نظر آرہا پر ان میں نہیں اور اگر غلطی حنا آپی کی تھی تو نور کے امی اور بھائی نے کیا کیا؟ انہوں نے کیسے سب کو ایک ہی پل میں پرایا کرتے اتنی فضول اور گری ہوئی باتیں سنائیں،“، ہما جو کب سے بہن کے حق میں موقع تلاش کر رہی تھی اُس نے ماہم کی بات مکمل ہوتے ہی حنا کی حمایت کی۔

”بس کریں آپ سب کیوں آپ لوگ ایک بات کو طول دیتے مجھے مزید تکلیف دے رہے ہیں اور کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور صرف میرا ہے جس کی وجہ سے یہ سب ہوا۔ قصور میری بیماری کا ہے جس کو بنیاد بنا کر حنا بھا بھی کو موقع ملا اور میرے سرال والوں کے ساتھ ساتھ میں سب کے لیے ایک موضوع اور مذاق بن گیا ہوں“، ان سب کی رائے پہ زارون جو تب سے ضبط کر کے بیٹھا تھا ایک دم سے پھٹتے ہوئے ہما کے ساتھ ساتھ سب کی زبان کو بریک لگا گیا۔

”زارون بیٹا پلیز غصہ نہ کرو ہم سب تو ویسے ہی بات کر رہے تھے“، عابدہ بیگم نے خاموشی توڑتے اٹھ کر اُس کے قریب آتے سمجھانے کی کوشش کی پر وہ اُس سے پہلے ہی کسی کی بھی کوئی بات سنے بغیر لاونج سے نکلا اور لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے میں آگیا۔

”کیا ہوا کسی سے لڑ کے آئے ہیں کیا؟“، کمرے میں داخل ہوتے ہی زارون نے اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کیا تو نور اپنے آنسو صاف کرتے اٹھ کر اُس کے قریب آئی جو اپنا سردونوں ہاتھوں میں تھا مے بیڈ پہ بیٹھ چکا تھا۔

”نہیں لڑنا کس سے ہے، بس سر میں تھوڑا درد ہے“، نیچے ہوئی کوئی بھی بات اُسے بتا کر پریشان کرنے کی بجائے زارون نے بہانہ بنایا۔

”اچھا ٹھیک ہے آجائیں، رکھیں سر میں دبادیتی ہوں“، دونوں ٹانگمیں اوپر کر کے بیٹھتے نور نے کشن اٹھا کر اپنی گود میں رکھتے اُس کے لیٹنے کے لیے جگہ بنائی۔

”خیر ہے نا؟ آج کچھ زیادہ پیار نہیں آرہا تمہیں مجھ پہ؟“ سر اُس کی گود میں رکھتے ہی زارون نے اُسے چھیڑا جو اُس دن اُس کے سر رکھنے پہ ایک دم سے گھبرائی تھی اور آج خود ہی اُس کے لیے جگہ بناتے اُسے لیٹنے کا بول رہی تھی۔

”ہونہے زیادہ شوخ بننے کی ضرورت نہیں ہے وہ آپ کے سر میں درد تھا اسی لیے لٹایا ہے“، اُس سے نظریں چراتے نور کو اپنی بے اختیاری پہ غصہ آیا جسے اُس نے زارون کو آنکھیں دکھاتے ضبط کیا۔

”ٹھیک ہے اب تنگ نہیں کرتا، دباؤ سر“، اُس کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ زارون نے مزید اُسے چھیڑنے کی بجائے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی پیشانی پر رکھتے آنکھیں موند لیں۔

”زار...“، کچھ دیر خاموشی سے سرد باتے رہنے کے بعد نور نے اُسے مخاطب کیا جو آنکھیں بند کیے سب کے رویے اور باتوں کو پس پشت ڈالنے اُس کے ہاتھوں کی نرمی کو اپنی پیشانی پر محسوس کر رہا تھا۔

”ہوں، بولو؟“، اُس کی آواز کانوں میں پڑی تو زارون نے پلکیں اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا۔

”میں جانتی ہوں حنا بھا بھی کے ساتھ ساتھ رضا اور مامانے بھی آپ کا بہت دل دکھایا ہے۔ اُنہیں آپ سے اور ہمارے گھروالوں سے ایسے بات نہیں کرنی چاہیے تھی“، اپنی ماں اور بھائی کے رویے پہ شرمندگی کا اظہار کرتے نور نے بات کا آغاز کیا۔

”پہلی بات کہ میرا کسی کی باتوں سے دل نہیں دکھا، نور کی مجھ میں ہے اُن سب کا با تین کرنا اور سنانا جائز تھا اور دوسرا بات کہ رضا اور آنٹی اپنی جگہ ٹھیک تھے۔ کوئی بھی بھائی یا ماں یہ کیسے

برداشت کر سکتی ہے اُن کی بیٹی یا بہن کسی ایسے شخص کے ساتھ رہے جو کینسر جیسی بیماری میں مبتلا ہو۔ میں اُن کی جگہ ہوتا تو شاید ایک دم سے ایسی بات معلوم ہونے پہ اس سے بھی سخت رد عمل ظاہر کرتا۔ میری جان ہم فرشتے یا ولی نہیں ہیں جو ایک دم سے تکلیف ملنے پہ صبر کر جائیں، ہم عام انسان ہیں جو کچھ دیر بعد صبر کرنی کی صلاحیت رکھتے، اُسے شرمندہ دیکھ زارون نے سر اٹھاتے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے بڑی نرمی سے سمجھایا۔

”پھر بھی جو بھی تھا انسان کو رد عمل بھی اپنے پچھلے اعمال اور فیصلوں کو سامنے رکھ کر دینا چاہیے۔ بے شک کتنی بھی بڑی تکلیف کیوں نا ہو انسان کسی کا احسان اور اُس کی مشکل وقت میں کی گئی مدد کیسے بھول سکتا ہے؟ میرا مطلب جو کچھ آپ نے میرے لیے کیا وہ تو الگ بات ہے پر ماما بابا نہ صرف مجھے قبول کیا بلکہ مجھے اُس وقت سہار دیا میرا اپنے کیا جب میرا بنوں نے میرا ساتھ چھوڑ دیا اور بے شک میں نا سمجھ ہوں پر اتنی سمجھ مجھ میں بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں ساس سسر ایسے بھوؤں کا ساتھ نہیں دیتے اور ایسی بھوکا توہر گز بھی نہیں جس کے کردار پہلے سے داغ....“ اس سے پہلے کے وہ کچھ اور کہتی زارون نے اُس کے منہ پہ ہاتھ رکھتے روکا۔

”یہ بات تم نے آج کر دی ہے دوبارہ مت کرنا اور تمہارے کردار میں کوئی داغ نہ تھا اور نہ ہی اب ہے اور جس داغ کی تم بات کر رہی ہو نا وہ میرے ہی نام کا لگا تھا جسے میں نے تم سے ایک پاک

رشته قائم کرتے اُسی وقت دھوڈا لاتھا۔ اس لیے پلیز دو بارہ یہ بات کبھی انجانے میں بھی اپنی زبان سے ادامت کرنا، اپنے لفظوں پہ زور دیتے زارون نے اپنا ہاتھ ہٹایا تو نور نے اُس کی آنکھوں میں سختی دیکھ کچھ کہنے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”ٹھیک ہے نہیں بولوں گی۔ بس اب آپ سو جائیں مجھے بھی نیند آ رہی ہے،“ اُس کے ڈانٹنے پہ فٹ سے منہ پھلاتے نور نے کہنے کے ساتھ ہی اٹھنا چاہا مگر اُس کا رادا بھانپتے ہی زارون نے واپس سر اُس کی گود میں رکھا۔

”سردار، ہی تھیں شاید تم میرا،“ نظروں میں شرارت لیے زارون نے اُس کا ہاتھ اپنی پیشانی پر رکھا جسے نور نے غصے سے ہٹاتے کشن سیمت اُسے اپنی گود سے نکالا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کا سر، مجھ سے بات مت کریئے گا، حد ہے میں تو ویسے ہی بات کر رہی تھی کیسے مجھے ڈانٹا،“ اپنی پرانی ٹون میں واپس آتے نور نے منہ بسورے شکایت کی۔

”ڈانٹا کب؟ میں تو سمجھا رہا تھا،“ اُس کے الزام پہ پوری آنکھیں کھولے زارون نے وضاحت دی اور اُس کا ہاتھ پکڑے اپنی طرف کھینچا۔

”بُرے ہیں آپ،“ نور کی پیشانی اُس کے سینے سے ٹکرائی تو اُس نے کہنے کے ساتھ ہی ہاتھ کا مکا بناتے ہلکے سے اُس کے کندھے پر رسید کیا۔

”ہاں تم بڑی اچھی ہو جو شوہر کو مار رہی“، اپنے کندھے پہ ہاتھ پھیرتے زارون نے پھر سے اُسے آنکھیں نکالیں جواب اُسے گھورتے ہوئے خاموشی سے سر اُس کے سینے پہ رکھ لیٹ چکی تھی۔

”جان ہو تم میری“، اُس کی حرکت پہ بے ساختہ انداز میں مسکراتے زارون نے اُسے اپنے حصار میں قید کرتے خود میں سمیطاً تو نور نے پر سکون ہوتے اپنی آنکھوں کو موندا جو اُس شخص کے کھو جانے کے احساس سے بار بار نم ہو رہی تھیں۔

-----

”حنا کیا مسئلہ ہے؟ کچھ تو بتاؤ؟ جب سے تم آئی ہو بس روئے ہی جا رہی ہو“، شائشہ بیگم جو پہلے ہی اُسے اتنی رات کو اکیلے اپنے گھر دیکھ کر حیران تھیں اور اب اُس کے مسلسل روئے پہ عاجز آتے پوچھنے لگیں۔

”پھوپھو جنید نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا“، ظہیر صاحب کے گھر سے نکلتے ہی اُس نے اپنے والدین کی شہر میں غیر موجودگی پہ اپنا رخ احسان صاحب کے گھر کی جانب کیا جو جنید کے ماموں ہونے کے ساتھ ساتھ حنا کی پھوپھو کے شوہر بھی تھے۔

”کیا مطلب؟ کیا اچھا نہیں کیا؟ اور تم یہاں جنید سے لڑ کر آئی ہو کیا؟“، شائستہ بیگم جنہیں پہلے ہی خدشہ تھا انہوں نے اندازہ لگاتے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”لڑائی؟ لڑائی بہت دور کی بات ہے، جنید نے اپنے اُس بیمار بھائی کا راز فاش کرنے پر مجھے سب کے سامنے تھپٹر مارا“، تو اتر سے آنسو بہتے ہنانے زارون کی بیماری سے لے کر اُس کے سرال جانے اور وہاں پلان کے ساتھ کی گئی بات کو اپنی بے ساختگی کا نام دیتے شائستہ بیگم کے گوش گزار کیا۔

”توبہ توبہ، اللہ تیر الا کھلا کھلکر ہے کہ تو نے میری بچی کو اتنی بڑی مصیبت سے بچالیا“، زارون کی بیماری کا سنتہ ہی شائستہ بیگم جو اپنی بیٹی کی شادی اُس سے کروانا چاہتی تھیں کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتے اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔

”مجھے تو شروع سے ہی شک تھا کہ جو یہ چوری چھپے عابدہ اور احمد نے زارون کی شادی کی ہے اس میں ضرور کوئی راز ہے ورنہ جتنا عابدہ کا دماغ اونچانا، کبھی بھی ایسی بد کردار بہو بیاہ کرنے لاتی“، شائستہ بیگم نے اپنی تلخی نکالتے ہنانکی ہاں میں ہاں ملائی۔

”جی بس یہی سمجھ لیں کہ ان لوگوں نے پوری چالاکی کے ساتھ یہ کھیل کھیلا ہے اور جب میں نے سب کے سامنے راز فاش کیا تو الٹا مجھ پر ہی چڑھائی کر دی“، سوسو کرتے ہنانے ہمدردی سیمینٹنے کے لیے جھوٹے آنسو بہائے۔

”بس صبر کرو اور احسان کل تک لاہور سے آجائیں گے پھر ہم دونوں جا کر جنید سے بات کریں گے، بھلا یہ کیا طریقہ ہوا کہ کسی اور کی خاطر اپنی بیوی پہ ہاتھ اٹھاتے اُسے رات کے اس پھر اکیلے ہی گھر سے نکال دیا جائے“، اُس سے ہمدردی جاتے شاستہ بیگم نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے تسلی دی جواب پورے خاندان میں زارون کی بیماری کی خبر مرچ مسالے لگا کر پھیلانے کے لیے اپنے ساتھ ساتھ ایک اور پختہ انسان کو تیار کر چکی تھی۔

-----

کچھ دیر تک اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے زارون نے اُس کی آہستہ ہوتی سانسوں کو محسوس کیا تو اُسے اندازہ ہوا کہ وہ سوچکی ہے۔

”افف کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے اور ایسے ہی سو گئی اب ساری رات تنگ ہو گی“، آہستگی سے اوپر ہو کر اُس کے چہرے کو دیکھتے اُس نے خود کلامی کی اور احتیاط کے ساتھ اٹھ کر اُس کا سر تکیہ پہ رکھاتا کہ وہ سکون سے سو سکے۔

”توبہ ہے یہ لڑکی بھی ہر روز کوئی نیا ہی کام کرتی ہے“، اُس کا سر تکیہ پہ رکھتے وہ پیچھے ہونے لگا پر اپنی شرط نور کی مسٹھی میں قید دیکھ رک گیا۔

”پتا نہیں کیوں پر اب مجھے تم سے سوتے ہوئے بات کرتے ڈر لگتا ہے“، اُس کی آج کی پیش گوئی کے بعد زارون جو کچھ مزید کہنے والا تھا ایک دم سے رکتے سوچنے لگا۔

”ویسے اور کچھ نہیں پر تمہاری تعریف تو کر سکتا ہوں نا؟“، اُس کے اوپر جھکتے زارون نے دلچسپی سے اُس کے خوابیدہ نقش کو دیکھا جو آج اُسے کچھ زیادہ ہی پیارے لگ رہے تھے۔

”جب شام میں نے تمہیں بال باندھنے کا بولا تھا نا تو اس لیے کہ تمہارے کھلے ہوئے بال میرے دل میں ہلچل مچا رہے تھے۔ دل کر رہا تھا کہ میں انہیں چھو کے ان کی نرمی کو اپنے پوروں پر محسوس کروں“، نظریں اُس کے چہرے پر ٹکائے زارون نے کہنے کے ساتھ ہی ہاتھ بڑھاتے اُس کے بالوں کو چھوتے اپنے ہونٹوں سے لگاتے اُس کی خوشبو کو محسوس کیا۔

”تمہاری آنکھوں میں دیکھتا ہوں تو لگتا ہے وقت تھم سا گیا ہے اور جب ان میں میرا عکس ابھرتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ میں دنیا کا خوش قسمت انسان ہوں جسے ان معصوم گوشوں میں جگہ مل جس میں صرف میرے لیے ہر احساس پیدا ہوتا ہے“، اب نظریں اُس کی بند آنکھوں پر مرکوز کرتے زارون نے جھک کر اُس کی مڑی ہوئی پلکوں پر آہستگی سے اپنے ہونٹ لگائے تو نور کی گرفت اُس کی شرط پر کچھ ڈھیلی ہوئی۔

”ناک بھی پیاری ہے تمہاری پر ایک مسئلہ ہے، آنکھوں سے آگے بڑھتے اب زارون کی نظر اُس کی ناک پہ پڑی تو اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”سرخ بہت ہوتی ہے اور ہر وقت غصے سے تنی رہتی، اُس کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر خود ہی مسکراتے ہوئے زارون نے ہونٹ اُس کی ناک پہ لگائے جوا بھی بھی اُسے غصے میں لگ رہی تھی۔

”ہم ہونٹ بھی بس ٹھیک ہی ہیں کھٹے میٹھے سے، ویسے مجھے تو لگتا کہ ان پہ زبان کا اثر ہے جو ہر وقت قیچی کی طرح چلتی رہتی، اُس کے رخسار پہ ہاتھ رکھتے زارون نے اُس کے گلابی ہونٹوں کو دیکھا جن پر نظر پڑتے ہی اُس کے دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے لگیں۔

”اففف بہت ہو گئی ہے تعریف اور آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے، اپنے دل کی خواہش پہ لبیک کہنے کی بجائے نظریں چراتے اُس نے پچھے ہٹنا چاہا مگر نور نے بند آنکھوں سے ہی اُس کی گردان پہ بازو ڈالتے اُسے ایسا کرنے سے روکا۔

”آپ نے سب چیزوں کی تعریف کرنے کے بعد کس کی ہے پر آخری جگہ نہیں کی،“ نظروں میں شکایت لیے نور نے نیند سے بھری آنکھوں کو کھولنے اُسے یادداہی کروائی۔

”اُس آخری جگہ پھر کبھی کروں گا بھی تم سو جاؤ مجھے بھی نیند آئی ہے“، اصل وجہ بتانے کی بجائے زارون نے نظریں چرانے کے ساتھ ہی اُسے بچوں کی طرح بہلا یا۔

”کیوں پھر کبھی کیوں؟ ابھی کریں میرا دل ہے“، اُس کے بہلانے پہ منہ بسورے نور نے اُسے ایک نئے امتحان میں ڈالا۔

”ابھی مجھے نیند آئی ناتو نیند میں مجھ سے ٹھیک سے نہیں ہونی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ صبح کردوں گا“، اُس کی ضد کو دیکھ زارون کو اب اپنی بے ساختگی پہ غصہ آیا۔

”نہیں ابھی کریں جیسی بھی کریں گے مجھے اچھی ہی لگے گی“، اُس کی حالت سے بے خبر نور نے اپنی بات پہ زور دیا تو زارون نے اُس کی ضد کے آگے بے بس ہوتے اُس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھتے اُس پہ اپنے ہونٹ رکھے۔

”یہ آپ نے مجھے کس کی ہے یا اپنے ہاتھ کو؟“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے نور نے شرمانے کی بجائے صدمے کے زیر اثر سوال کیا تو زارون نے اُسے آنکھیں نکالنے کے ساتھ ہی ایک گہری سانس لیتے خود کو پر سکون کیا اور اُس کی خواہش پوری کرنے کے لیے آہستگی سے جھک کر اُس کے ہونٹوں پہ اپنا لمس چھوڑا۔

”ٹھیک ہے اب؟“، پچھے ہٹتے زارون نے اُسے حیرت زدہ سادیکھ تصدیق چاہی۔

”ہم ٹھیک ہے“، اپنی شرارت پر دم سادھے نور نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا�ا اور اسے اپنے اوپر سے ہٹاتے دوسری طرف کروٹ لیتے کمرٹ راپنے سر تک تانے لیٹ گئی۔

”حد ہے بھلانی کا تو زمانہ ہی نہیں آج کل“، اُس کے شرمانے پر اپنی مسکراہٹ چھپاتے زارون نے اوپنجی آواز میں کہا اور کلاک پر تین بجتے دیکھ ایک بھر پور جمائی لیتے اٹھا اور لائست آف کرتے اپنے جگہ پر آتے سونے کے لیے لیٹ گیا۔

-----

”ہمام نے حنا کا کچھ پتا کیا کہ وہ کہاں گئی ہے؟“، صبح احمد صاحب کے لیے ٹیبل پر ناشتہ لگاتے عابدہ بیگم نے فکر مندی سے ہما سے استفسار کیا جو ایمان کے لیے فیڈر بنانے آئی تھی۔

”وہ جہاں بھی ہوں آپ کو اس سے کیا؟ اور آنٹی آپ کی یہ فکر تب کہاں تھی جب جنید بھائی نے آپی کو سب کے سامنے مارا تھا؟“، ہما جورات سے ہی جنید پر برہم تھی اُس نے اپنا غصہ عابدہ بیگم پر نکالنے انہیں حنا کے متعلق کچھ بھی بتانے سے غرض بر تا۔

”تب بھی مجھے فکر تھی اور اب بھی ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اُس کی بے عزتی کروانا نہیں چاہتا تھا پر وہ کہتے ہیں ناکہ انسان کی عزت اُس کے اپنے ہی ہاتھ میں ہوتی ہے تو بس حنانے غلط وقت پر بات

کر کے نہ صرف اپنے شوہر کی نظروں میں خود کو گرا لیا بلکہ ہم سب کے دلوں میں بھی اپنا مقام کھو پیٹھی،“، ہما کے طنز پر عابدہ بیگم نے خاموش رہنے کی بجائے اُسے کھری کھری سنائی تاکہ وہ اپنی بہن کی طرح زبان کھولتے اپنا گھر بر بادنہ کرے۔

”اوو تو مطلب آپ کو میری بہن کی بات کا احساس ہے پر ان ماں بیٹے کا کیا؟ جنہوں نے میری آپی سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر کم ظرفی دکھائی، ویسے وہاں ان کے سامنے آپ کی زبان کو قفل کیوں پڑ گیا تھا؟ میرا مطلب آپ انہیں بھی تو سنا سکتی تھیں نا؟ جیسے اس وقت مجھے سنار ہی ہیں“، رضا اور نائلہ بیگم کے سامنے عابدہ بیگم کی خاموشی جورات سے ہما کو کھل رہی تھی اُس کو بنیاد بناتے اُس نے ایک اور طنز کرتے اپنی بہن کا بدلہ لیا۔

”ہم میں سے کسی نے بھی زبان حنا کے سامنے بھی نہیں کھولی۔ صرف اُس کے شوہرنے ہی اُسے جواب دیا اور رہی بات نائلہ اور رضا کی تو وہ سب ان کا وقتی غصہ تھا ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا تنی بڑی بات بے موقع پتا چلنے پہ ایسا ہی رد عمل دیتا“، اُس کی نظروں میں حقارت دیکھ عابدہ بیگم نے اس بار تھوڑے غصے کا مظاہرہ کیا تو ہما کی زبان کو کچھ بریک لگی۔

”پھر بھی جو بھی تھا جنید بھائی کو سب کے سامنے حنا آپی پہ ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا، اگر انہوں نے بیو قوفی کر لی تو بھائی ہی کچھ صبر کا مظاہرہ کر لیتے“، مزمل کو کچن کی طرف آتا دیکھ ہمانے بڑی چالاکی کے ساتھ بات بدلتے نرمی سے بات مکمل کی۔

”ہما ایمان کب سے رورہی ہے جلدی دودھ لے آؤ“، اس سے پہلے کہ عابدہ بیگم اُس کے بد لے ہوئے روئے پہ حیرت کا اظہار کرتیں یا کوئی جواب دیتیں اُن کی پشت پہ آتے مزمل نے ہما کو مخاطب کیا۔

”جی جی بس لارہی ہوں“، ایک خاموش نظر عابدہ بیگم پہ ڈالتے ہمانے کہنے کے ساتھ باہر کا رخ کیا۔

”کیا ہوا می؟ آپ کس سوچ میں گم ہیں؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟“، ہما کے جاتے ہی عابدہ بیگم کو گم صم سا کھڑا دیکھ مزمل نے پکارا۔

”ہاں، ٹھیک ہوں۔ تم ناشتہ کرو گے؟“، ہما کی چالاکی پہ کچھ بھی ظاہر کرنے کی بجائے جلدی سے خود کو سنبھالتے عابدہ بیگم نے اُس سے ناشتہ کا پوچھا جو نفی میں سر ہلاتے ابھی کچھ دیر اور سونے کا بولتے کچن سے نکل گیا۔

”توبہ ایک بہن تو تھی ہی ایسی دوسری اُس سے بھی دوہاتھ آگے ہے، اُفف پتا نہیں زندگی میں ہم سے کون سی ایسی کوتا ہی ہو گئی جس کی سزا ایسی بہوؤں کی صورت ہمیں ملی ہے“، مزمول کے جاتے ہی اپنا سر پکڑتے عابدہ بیگم نے حنا کے ساتھ ساتھ ہما کے بھی رات و رات بدلتے رویے کو سوچتے اللہ سے ان دونوں کی ہدایت کی دعا مانگی۔

---

”ارحم پیٹا طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟ رات بھر بھی تم ایسے ہی سارے گھر میں ٹھلتے رہے اور اب بھی صحیح ٹھھٹھ لگنے ہو“، آئمہ بیگم جورات اُسے کبھی لان اور کبھی گھر میں بے چینی سے ٹھلتا دیکھ چکی تھیں اور اب ناشتہ کی ٹیبل پہ اُس کی موجودگی پہ فکر مندی کا اظہار کرتے پوچھنے لگیں۔ ”جی طبیعت ٹھیک ہے ویسے ہی بس نیند نہیں آرہی تھی“، ان کی پریشانی پہ مختصر ساجواب دیتے وہ ہاشم صاحب کی جانب متوجہ ہوا۔

”طبیعت ٹھیک ہے تو کوئی پریشانی ہے کیا؟ رات بھی آئمہ بتا رہی تھی کہ تم کافی دیر تک لان میں ٹھلتے رہے“، اُس کا جواب سنتے ہاشم صاحب نے بھی چہرے پہ فکر کے آثار لیے سوال کیا۔

”نہیں ابوالیسی کوئی بات نہیں وہ بس رات کمرے میں مجھے گھٹن سی ہو رہی تھی اسی لیے کچھ دیر لان میں چلا گیا تھا“، اپنی بے چینی کی اصل وجہ کو گول کرتے ارحم نے انہیں مطمئن کیا۔

”اچھا بس آج سے اپنی ساری سستیاں دور کرو اور میرے ساتھ بنس کو دیکھو میں اب اکیلا اتنے سارے کاموں کو نہیں دیکھ سکتا“، اُس کی بات سنتے ہی ہاشم صاحب کو لگا کہ شاید وہ گھر رہ رہ تگ آگیا ہے اسی لیے انہوں نے اپنے بنس کا حوالہ دیتے اُسے آفس جوان کرنے کا کہا۔

”ٹھیک ہے پر ابھی نہیں، ابھی مجھے اپنا پراجیکٹ جمع کروانا ہے اور میری شادی بھی تو ہے نا؟ تو بس میں شادی سے پہلے کوئی کام نہیں کروں گا البتہ شادی کے بعد کر سکتا ہوں وہ کیا ہے نا کہ آپ کی طرح ہر وقت میرا بھی بیوی کے ساتھ رہنا ممکن ہے“، باہم آنکھ دباتے ارحم نے نظروں میں شرارた لیے اُن کے قریب جھکتے سر گوشی کی تو ہاشم صاحب نے آئمہ بیگم کو اپنی طرف متوجہ پا کر اُسے آنکھیں دیکھائیں۔

”شرم کرو کیوں میری بیوی کو شک میں ڈالتے میرے لیے مشکلات کھڑی کر رہے ہو“، اُس کے مسکرانے پر اُسے گھورتے ہوئے انہوں نے دبے لفظوں میں تنبیہ کی تو ارحم کا قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔

”یہ کیا راز و نیاز چل رہے ہیں آپ دونوں باپ بیٹے میں؟“، ارحم کے قہقہہ پر نظروں میں شک لیے آئمہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا جوانجان بنتے بالکل سنجیدہ ہو چکے تھے۔

”کچھ نہیں وہ بس ابو نے ایک لطیفہ سنایا تھا اس پر ہنسی آگئی“، ہاشم صاحب کو ناشتہ کی جانب متوجہ دیکھا ارحم نے معقول سا بہانہ بنایا۔

”مجھے تو کبھی نہیں سنایا، اچھا خیر چھوڑو یہ سب تم بھی ناشتہ کرو ٹھنڈا ہورہا ہے“، ایک اچکتی نظر ہاشم صاحب پر ڈالے آئمہ بیگم نے پر اٹھانکال کر اس کی پلیٹ میں رکھا اور جمال کی غیر موجودگی کی وجہ سے خود ہی کچن سے چائے لینے چلی گئیں۔

”طبعت کیسی ہے اب آپ کی اور یہ صحیح ہی صحیح کہاں جانے کی تیاری کر رہی ہیں؟“، انہیں الماری سے اپنی چادر نکال کر لیتا دیکھ رضا نے حیرت سے پوچھا۔

”نور کی طرف جا رہی ہوں“، مختصر سا جواب دیتے انہوں نے اپنا پاؤ بچ اٹھایا۔

”آپ کی طرف کیوں جا رہی ہیں؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا آپ کی اُن سے؟“، نائلہ بیگم کا جواب سنتے ہی رضا نے فکر مندی سے استفار کیا۔

”نہیں کوئی بات نہیں ہوئی پر مجھے لگ رہا ہے رات جو کچھ بھی ہم نے کہا وہ غلط تھا بس اسی لیے جا رہی ہوں تاکہ اُن لوگوں سے معدرت کر سکوں“، ساری رات ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کے بعد بھی نائلہ بیگم کو اپنا ہی قصور نظر آیا تو انہوں نے اپنی غلطی سدھارنے کے لیے احمد صاحب کے گھر جا کر معدرت کرنے کا فیصلہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ رکیں میں بھی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں پھر اکٹھے چلیں گے“، اُن کی بات سن کر کوئی سخت در عمل دینے کی بجائے رضا جو خود بھی رات اپنے کہے گئے الفاظ پہ پچھتارہاتھا انہیں انتظار کرنے کا کہتے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

”یارب تیرا شکر ہے اگر تو نے ہم انسانوں کو غلطیوں کا پتلا بنانا کر اس دنیا میں بھیجا تو ساتھ ہمارے اندر دل کی صورت ایک نرم گوشہ پیدا کیا تاکہ ہم اپنی کوتا ہیوں پہ ڈٹے رہنے کی بجائے اُس پہ شرمند ہوتے اپنی اصلاح کر سکیں“، رضا کی زبان سے ساتھ چلنے کا سنتے نائلہ بیگم نے آنکھوں میں تشکر کے آنسو لیے اللہ کا شکر ادا کیا جس نے اُن کے ساتھ ساتھ رضا کو بھی اپنا عمل غلط ہونے کی طرف نظر ثانی کروائی۔

”نہیں میں مان ہی نہیں سکتا کہ جنید نے بلا وجہ ہی حنا پہ ہاتھ اٹھایا ہو“، شائستہ بیگم کی زبانی سارا قصہ سننے کے بعد بھی احسان صاحب (جو ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچ تھے) نے اپنے بھانجے کی سائیڈ لیتے اُس کی طرف داری کی۔

”جی، یقین تو مجھے بھی نہیں آرہا تھا پر حنا کی حالت دیکھ مجھے اعتبار کرنا پڑا، توبہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ وہ رات جس وقت ہمارے گھر پہنچی تو اس کی حالت کیا تھی۔ بس یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ وہ اپنے پچ کو لے کر صحیح سلامت یہاں آگئی“، شائستہ بیگم نے بتانے کے ساتھ ہی چہرے پہ افسردگی طاری کی تاکہ احسان صاحب اُن کی بات پر ایمان لاتے جنید کے رویے کا یقین کر لیں۔

”ٹھیک ہے جو بھی تھا جنید نے حنا کو کسی بات پہ ڈانشایا مارا پر یہ اُسے یوں رات کو معصوم بچ کو لے کر اپنے قدم گھر سے نہیں نکالنے چاہیے تھے اور میاں بیوی کے درمیاں ایسے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں پر اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسان اپنے گھر کو چھوڑ کر معاملے کو مزید خراب کر لے“، شائستہ بیگم کی آگ لگانے والی عادت سے واقف ہونے کی وجہ سے احسان صاحب نے کوئی سخت رد عمل ظاہر کرنے کی بجائے تحمل کا مظاہرہ کرتے حنا کو بھی قصور وار ٹھہرایا۔

”ہاں آپ کو توبس ہر معاں میں اپنے بھانجے اور بہن، ہی سچے لگتے باقی سب جائیں بھاڑ میں“، ان کے بار بار حنا کا قصور نکالنے پر برہم ہوتے شاستہ بیگم نے غصے سے چلاتے ہوئے انہیں ان کی غلطی کا احساس دلا یا۔

”تو کیا کرو؟ اور میں کسی کی سائیڈ نہیں لے رہا ہو تمہیں سمجھا رہا ہوں کہ ان دونوں کو اپنا مسئلہ خود ہی حل کرنے دو، ایسے کسی کے ذاتی معاملے میں ٹانگ اڑانا مناسب نہیں“، ان کے چلانے کی پرواکیے بغیر ہی احسان صاحب نے مناسب الفاظ میں احمد صاحب کے گھر جانے اور اس معاملے میں پڑنے سے صاف انکار کیا۔

”ٹھیک ہے آپ کے بارے میں تو مجھے پہلے ہی اندازہ تھا اسی لیے آپ بے شک جائیں نہ جائیں پر میں اپنی بھتیجی کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ میں آج ہی عابدہ کی طرف جاؤں گی اور ان سے جنید کے رویے کے متعلق بات کروں گی“، ان کا فیصلہ سنتے ہی شاستہ بیگم نے اٹل لبھے میں اپنا رادہ بتایا اور احسان صاحب کی مزید کوئی بات سننے کی بجائے خاموش سے کمرے سے نکل گئیں۔

”اُفف فسادی عورت ہر معاں میں بس آگ لگانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی“، ان کے جاتے ہی خود کلامی کرتے احسان صاحب نے اپنا موبائل اٹھایا تاکہ عابدہ بیگم سے بات کر کے زارون کی طبیعت کے ساتھ ساتھ شاستہ بیگم کی پیش گوئیوں کے بارے میں دریافت کر سکیں۔

”نورا دھر آؤ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے“، وہ جو کمرے میں زارون کی غیر موجودگی پر اُسے دیکھنے کے لیے نیچے آئی تھی عابدہ بیگم کی آواز پر اُن کی جانب متوجہ ہوئی۔

”جی ماں، بولیں کیا بات ہے“، زارون کی لاونچ سے آتی آواز پر مطمئن ہوتے اُس نے عابدہ بیگم کے قریب آتے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا جو اپنے کمرے کی جانب بڑھتے اُسے بھی آنے کا بول چکی تھیں۔

”جی سب خیریت ہے نا؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُن کے کہنے پر دروازہ بند کرتے نور نے اُن کے قریب بیٹھتے استفسار کیا۔

”ہاں خیریت ہی ہے وہ مجھے زارون کے متعلق تم سے کچھ بات کرنی تھی“، نائلہ بیگم اور رضا کے رویے کے باوجود نور کے اُن کے ساتھ گھر واپس آنے اور اُن کے دفاع میں آواز اٹھانے پر عابدہ بیگم کا دل اُس کی طرف سے کسی شک و شہبات سے پاک تھا تب ہی انہوں نے زارون کو علاج کے لیے منانے کے لیے اُس کا انتخاب کیا۔

”جی بولیں کیا بات ہے؟“ اُن کے تاثرات سے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہونے پر نور نے سنجیدہ ہوتے دریافت کیا۔

”وہ زارون کی بیماری کے متعلق تو تم جان، ہی چکی ہو اور علاج کے بارے میں بھی شاید تمہیں تھوڑا بہت اندازہ ہو؟“ اپنی بات ادھوری چھوڑتے عابدہ بیگم نے اُس کی معلومات کے بارے میں اندازہ لگانا چاہا۔

”نہیں مجھے اندازہ نہیں ہے میرا مطلب یہ تو پتا کہ میڈیسن وغیرہ ہوتی یا کیموپر اس کے علاوہ مجھے اس کے متعلق کچھ نہیں پتا،“ اُن کی بات کا مفہوم سمجھتے نور نے سچائی سے کام لیتے اُنہیں اگاہ کیا۔

”ہاں ڈاکٹر نے کیموکاہی بولا ہے یعنی کہ کینسر اس استیج پر ہے کہ اُس پر میڈیسن کا اثر صرف تھوڑے عرصے کے لیے ہی ہو گا اس لیے اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ مرض جلد زارون کی جان چھوڑ دے تو اُس کے لیے بس واحد راستہ کیمو ہے جس کے لیے وہ بالکل بھی تیار نہیں،“ عابدہ بیگم نے اصل بات کی جانب آتے نور کو اپنی پریشانی کی وجہ بتائی۔

”کیوں؟ کیوں تیار نہیں ہیں؟ اور آپ پریشان نہ ہوں بس بابا سے کہیں کے سارا انتظام کر لیں میں خود ہی زار کو منالوں گی،“ اُن کے منہ سے زارون کے انکار کے متعلق سنتے ہی نور نے حیرت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ اُنہیں اُسے راضی کرنے کی تسلی دی۔

”بہت شکر یہ بیٹا، میں جانتی ہوں ایک تم ہی ہو جو اسے اس کام کے لیے مناسکتی“، اُسے آج پہلی بار کسی معاملے میں بچپنے کی بجائے سنجیدہ دیکھ عابدہ بیگم کے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔

”لبی آپ کافون کب سے نج رہا ہے میں ابھی کچن میں گئی تودیکھا“، دروازے پہ دستک کی آواز سننے عابدہ بیگم نے آنے کی اجازت دی تو نسرین ان کا موبائل ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئی جو وہ کچن میں ہی بھول گئی تھیں۔ ”احسان بھائی کی اتنی کالز؟“، اسکرین پہ بیس کے قریب کالز دیکھ عابدہ بیگم نے خود کلامی کی اور نور کو ناشتہ کرنے کا بولتے خود احسان صاحب کا نمبر ملاتے دوسری طرف رابطہ بحال ہونے پر ان سے بات کرنے لگیں۔

-----  
”عابدہ یہ میں کیا سن رہا ہوں زارون کو ایسے اچانک سے اتنی بڑی بیماری کیسے ہو گئی؟“، سلام و دعا کے بعد احسان صاحب نے مدعا کی بات پہ آتے ان سے استفسار کیا جو ان کی زبان سے زارون کا نام سن کر ٹھٹک چکی تھیں۔

”جی بھائی صاحب بس آزمائش آتے کون سا پتا چلتا پر آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟ میرا مطلب احمد نے اس سلسلے میں آپ سے کوئی بات کی ہے کیا؟“ ان سے زارون کی بیماری کا سنتے ہی انہوں نے براہ راست پوچھنے کی بجائے اندازہ لگایا۔

”نہیں، احمد نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، یہ سب مجھے شائستہ نے بتایا۔ وہ حنارات سے ہمارے گھر ہی ہے“، ان کی بات سنتے احسان صاحب نے حنا کی موجودگی کا بتایا تو عابدہ بیگم کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوئی کہ اُس نے زارون کی بیماری کے ساتھ ساتھ اور کیا کیا ان لوگوں کو بتایا ہو گا۔

”اچھا وہ آپ کے گھر ہے۔ مجھے لگا شاید اپنی امی کی طرف گئی ہے“، حنا کا نام سنتے ہی عابدہ بیگم نے اپنے لہجے کو ہموار کرتے احسان صاحب کے مزید سوالوں کے لیے خود کو تیار کیا۔

”نہیں، ذوالفقار اور طاہرہ (حنا کے امی ابو) تو کل کے کوئی نہ گئے ہوئے ہیں اسی لیے وہ ہماری طرف آگئی اور کیا وہ جو کہہ رہی ہے جنید کے رویے کے متعلق، وہ سچ ہے؟ میرا مطلب پہلے تو کبھی تمہارے گھر سے میں نے ایسی کوئی بد مزگی والی بات نہیں سنی پھر! اچانک سے ایسا کیا ہو گیا جو نوبت اس حد تک پہنچ گئی ہے“، شائستہ بیگم کی کسی بھی بات کا یقین کرنے کی بجائے احسان صاحب نے کھل کر ہر بات بہن سے پوچھی تاکہ معاملے کو دونوں طرف سے جانچ سکیں۔

”جی بس کچھ بد مزگی انسان کی خود ہی پیدا کی ہوتی ہے اور جب بیوی شوہر کے آگے زبان چلانے اُس کے گھروالوں کو دوسرا جگہ جا کر بے عزت کرتے اُن کا تماشہ بنائے تو کیا عزت دار لوگ یہ سب برداشت کرتے ہیں؟“ بات کا آغاز کرتے ہی عابدہ بیگم نے اُن سے کچھ بھی چھپانے کی بجائے حنا کے بد لحاظی سے لے کر کل رات جو کچھ بھی نور کی امی کی طرف ہوا وہ سب تفصیل کے ساتھ احسان صاحب کو بتایا۔

”ٹھیک، تو اصل کہانی یہ تھی میں تو پہلے ہی شاستہ سے کہہ رہا تھا کہ مجھے حنا کی بات میں کوئی سچائی نہیں لگ رہی اور جو بھی ہوا لڑائی جھگڑے کس جگہ نہیں ہوتے پر یوں رات کے اندر ہیرے میں اپنے گھر سے نکل کر دوسروں کے درپہ آنا سر اال والوں کے ساتھ ساتھ انسان کی اپنی بھی بے عزتی ہے“، اُن کی پوری بات سننے کے بعد احسان صاحب نے حنا کے فیصلے پہ افسوس کرتے عابدہ بیگم کو اسے سمجھانے کی اور جلد از جلد گھروالیں بھیجنے کی تسلی دی اور پھر بات کرنے کا کہتے کاں منقطع کر گئے۔

”آنٹی آپ لوگ اس وقت یہاں؟ میرا مطلب سب خیریت ہے نا“، زارون جوار حم کے بار بار کال کرنے پہ اُس سے ملنے کے لیے جا رہا تھا پورچ میں ظہیر صاحب کی گاڑی رکتے اور اُس میں سے نائلہ بیگم اور رضا کو نکلتا دیکھ جیرت سے اُن کی جانب بڑھا۔

”سب خیریت ہے بس ہم اپنے رات کے رویے کے لیے سب سے معذرت کرنے آئے تھے“، اُس کے کندھے پہ تھکی دیتے نائلہ بیگم نے نظریں چراتے اُسے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ ”معذرت؟ کس چیز کی؟ اچھا چھوڑیں سب آپ اندر آئیں“، انہیں باہر ہی رکا دیکھ زارون نے تمام باتوں کو پس پشت ڈالتے انہیں اندر آنے کا کہا اور خود بھی ارجمند کی طرف جانے کا ارادہ کچھ دیر کے لیے ترک کرتے انہیں ساتھ لیے اندر ونی دروازے کی جانب بڑھا۔

”آئیں بیٹھیں“، ڈرائیگ روم میں داخل ہوتے ہی زارون نے اُن دونوں کو بیٹھنے کا بولا اور خود واپس باہر نکلتے نسرین کو آواز دیتے عابدہ بیگم اور نور کا بلا نے کا کہا۔

”آپ کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اور آپ نے کیوں زحمت کی مجھے بتا دیتیں میں نور کو لے کر آ جاتا“، اُن کی رات خراب ہونے والی طبیعت کے پیش نظر زارون نے رضا کے قریب بیٹھتے اپنے لہجے سے کسی قسم کی ناراضی ظاہر کیے بغیر اپنی بات کہی۔

”طبعیت بہتر ہے اب اور تم کیوں آتے؟ غلطی تمہاری نہیں تھی“، نائلہ بیگم نے شرمندگی سے نظریں جھکاتے پھر سے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”غلطی جس کی بھی تھی آپ اُس بات کو چھوڑ دیں جو ہو گیا سو ہو گیا“، زارون نے انہیں اپنے رویے پہ شرمندہ دیکھ بات بد لئے کی کوشش کی۔

”ارے نائلہ بہن آپ، آپ کب آئیں؟“ اس سے پہلے کے وہ کوئی جواب دیتیں عابدہ بیگم نے اندر داخل ہوتے انہیں وہاں دیکھ جیرت کا اظہار کیا۔

”بس ابھی کچھ منٹ پہلے ہی آئے ہیں“، سلام دعا کے بعد نائلہ بیگم نے اُن کے چہرے اور تاثرات سے کسی قسم کی کوئی بھی حقارت نہ دیکھ آنکھوں میں نمی لیے اپنے لہجے کو مضبوط کرنے کی کوشش کی۔

”رضائیٹا کیسے ہو؟“ نائلہ بیگم سے ملنے کے بعد عابدہ بیگم نے اُس کی جانب بڑھتے اُس کے کندھے پہ تھکنی دی۔

”جی آنٹی میں ٹھیک ہوں“، اُن کی نرمی پہ رضا جو اپنے رات کہے جانے والے الفاظ پہ جی بھر کر شرمندہ ہورہا تھا اُس نے مختصر سا جواب دیتے آہٹ پہ دروازے کی جانب دیکھا۔

”آپی..“، نور کو وہاں کھڑا دیکھ کر وہ ملنے کے لیے اُس کی جانب بڑھا پر وہ اُس کی پیش قدمی سے پہلے ہی بغیر کچھ کہے دروازے سے پلٹ گئی۔

”میں دیکھتا ہوں تم پریشان نہ ہو“، نور کی حرکت پر رضا کے چہرے پہ ہوا یاں اُڑی تو زارون نے اُسے تسلی دیتے بیٹھنے کا بولا اور خود اٹھ کر ڈرائیور سے نکلا تاکہ نور کو منا کر لانے کے ساتھ ساتھ نسرین کو چائے بنانے کا کہہ سکے۔

-----

”یہ کیا بد تمیزی تھی نور؟ اگر تم نے آنٹی لوگوں دیکھے ہی لیا تو ایسے پلٹ کر آنے کا مقصد؟“، نسرین کو چائے بنانے کا بولتے اُس نے اپنا رخ اپنے کمرے کی جانب کیا۔

”تو کیا کرتی؟ سلامی پیش کرتی یا پھولوں کے ہار پہناتی اُن لوگوں کو؟ اور وہ لوگ کرنے کیا آئے ہیں یہاں؟ رات کوئی کسر رہ گئی تھی کیا جو یہ اب پوری کرنے آئے ہیں؟“، زارون کے سمجھانے پر کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر نور نے اُس کی طرح اعلیٰ ظرفی دکھانے کی بجائے نائلہ بیگم اور رضا کی موجودگی پر غصہ دکھایا۔

”نور تمہارے گھروالے ہیں وہ اور یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو ان کے بارے میں؟“ اُس کے غصے اور طنزیہ لہجہ پہ سنجیدگی کے ساتھ زارون نے اُسے مزید کوئی سخت الفاظ ادا کرنے سے روکا۔

”ہاں توجہ گھروالوں نے آپ کا اور ماما بابا کا لحاظ نہیں کیا تو! میں بھی کیوں کروں؟“ اُس کے منع کرنے کے باوجود بھی نور نے کہنے کے ساتھ ہی لاپرواٹی سے کندھے اچکائے۔

”مطلوب تم اُن سے اُن کے الفاظ اور رویے کا بدلہ اُن ہی کے طریقے سے لو گی؟“ اگر انہوں نے نا سمجھی میں کچھ غلط کیا تو تم سوچ سمجھ کر غلطی کرو گی؟“ اُس کی بات پہ افسوس کا اظہار کرتے زارون نے اب کی بار سمجھانے کی بجائے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھتے تصدیق چاہی۔

”برائی کے بد لے اُتنی ہی برائی کرنا عدل ہے اور میرے ساتھ انہوں نے جو کیا سو کیا پر اب ہی تھوڑا خیال کر لیتے کہ ہم کس انسان کو باتیں سنارہے ہیں،“ اپنی بات پہ قائم رہتے نور نے دکھ کے ساتھ اپنا موقف بیان کیا۔

”اگر برائی کے بد لے اُتنی برائی عدل ہے تو میری جان برائی کے بد لے معاف کر دینا احسان ہے اور اللہ پاک بد لے سے زیادہ احسان کو پسند فرماتا اس لیے پلیز جب میں نے اور امی نے اُنہیں اُن کی غلطی پہ شرمندہ نہیں کیا تو تم بھی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے اُنہیں معاف کر دو،“ اُسے کسی صورت مانتانہ دیکھ زارون نے نرمی کے ساتھ کہتے اُسے دونوں بازوں سے تھاما۔

”علی طرفی میں ایک بار دکھا چکی ہوں، بار بار دکھانے کی مجھ میں ہمت نہیں اور آپ شاید بھول رہے ہیں کہ یہ لوگ دوسری بار ایسی غلطی کر چکے ہیں جس کی معافی ممکن نہیں، پہلے بھی انہوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ بے شک غصہ بابا کا تھا مگر میرے حق میں بولے تو یہ دونوں میں بھی نہیں تھے،“ نظروں میں تکلیف کے آثار لیے نور نے پھر سے پچھلی باتوں کو دھرا۔

”نور وہ سب پرانی باتیں ہیں اور غلطی کس انسان سے نہیں ہوتی؟ اور رات جو کچھ بھی ہوا وہ صرف وقتی رد عمل تھا جس کا مدوا کرنے کے لیے آٹی اور رضا صبح صحیح ہی آگئے ہیں۔ دیکھو یار انہیں احساس ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی بولا وہ غلط تھا اسی لیے وہ خود چل کر سب سے مغدرت کرنے آئے ہیں۔ کیا ان کے لیے اتنی شرمندگی کافی نہیں؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھتے زارون نے اس کے دل کو صاف کرنے کی کوشش کی۔

”پتا نہیں مجھے پر میرا نہیں دل کہ میں ان لوگوں سے ملوں اس لیے پلیز آپ مجھے مجبور نہ کریں،“ اس کے دونوں ہاتھ ہٹاتے نور نے نرم پڑنے کے باوجود بھی رضا اور نائلہ بیگم سے ملنے سے انکار کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی اگر تمہیں میری بات کا بھی مان نہیں رکھنا تو میں کیا کر سکتا ہوں“، اُس کی ہٹ دھرمی پہ مزید کچھ کہنے یا سمجھانے کی بجائے زارون نے فیصلہ اُس کے اوپر چھوڑا۔

”مان کی بات نہیں ہے زار، بس میرا دل نہیں ہے کہ میں اُن سے ملوں“، اُسے خفگی سے باہر کی جانب بڑھتا دیکھ نور نے اُس کے سامنے آتے اُسے روکا۔

”بعض اوقات ہمیں کچھ فیصلے دل کے خلاف جا کر دماغ سے کرنے پڑتے ہیں اور اسی میں ہماری بھلائی ہوتی ہے اور آج اگر آنٹی لوگ یہاں سے ناامید ہو کر لوٹے تو سمجھ لینا کہ یہ وقت بھی بھی تمہارے ہاتھ نہیں آئے گا۔ بعد میں بے شک تم جیسے مرضی انہیں معاف کر دو، اچھی بنو پر تم بھی اپنا وہ مقام کھودو گی جو آج اُن کے دلوں میں ہے“، اُسے کشمکش میں دیکھ زارون نے غصے کی بجائے بڑے تخل کے ساتھ سمجھاتے اُسے اپنی فیصلے پہ نظر ثانی کرنے پہ مجبور کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں پر میں آپ کو بتا رہی ہوں میں جلدی نہیں مانوں گی“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے دو تین سینڈز سوچنے کے بعد اپنی شرط بتائی تو زارون نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کیا اور اُسے ساتھ لیتے نیچے آگیا جہاں رضا اور نائلہ بیگم اُسی کے انتظار میں بیٹھے تھے۔

-----

”پھوپھو، آپ نے پھوپھا سے بات کی؟“ حنا جو کب سے اُن ہی کے انتظار میں ٹھل رہی تھی انہیں علیزے (شائستہ بیگم کی بیٹی) کے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”ہاں کی ہے بات پر تمہیں اپنے پھوپھا کا توپتا ہی ہے وہ کبھی بھی میری سائیڈ نہیں لیتے“، اُس کی بات کا جواب دینے کے ساتھ ہی شائستہ بیگم نے احسان صاحب پہ بڑھم ہوتے شکوہ کیا۔

”کیا مطلب؟ پھوپھانے آپ سے کچھ کہا ہے کیا؟“ اُن کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگاتے حنا نے فکر مندی سے پوچھا۔

”کہنا کیا ہے، میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کہ احسان کبھی بھی اپنے بھانجے اور بہن کو غلط نہیں کہیں گے۔ پتا نہیں کون سے تعویذ گھول کر پلائے ہیں اس عابدہ نے کہ تمیں سال ساتھ گزارنے کے بعد بھی یہ شخص مجھ سے زیادہ اس کی بات کا یقین کرتا ہے“، حنا کے سوال پر کڑھتے ہوئے شائستہ بیگم نے دانت پیتے اپنی بات مکمل کی۔

”پھوپھا بو کو کوئی تعویذ گھول کرنہیں پلاتیں اور نہ ہی اُن سے کوئی غلط بیانی کرتی ہیں۔ وہ اگر لبجے کی نرم ہیں تو دل کی بھی صاف ہیں اسی لیے ابوآپ سے زیادہ اُن کی بات سننے اور مانتے

ہیں،“ علیزے جو تب سے خاموش بیٹھی سبھاں کو کھیلا رہی تھی اُس نے شاستہ بیگم کے ان گنت شکوؤں پہ زبان کھولی۔

”تو میں کون سے تیر برساتی ہوں تمہارے باپ پہ؟ اور یہ غلط بیانی سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ حنا کو چھوڑتے شاستہ بیگم نے بیٹی کے سر ہوتے سوال کیا جیسے عابدہ بیگم کی سائیڈ لینا مہنگا پڑ چکا تھا۔ ”غلط بیانی سے مراد یہ ہے کہ آپ ہر وقت ابو کے خلاف جا کر بات کرتی کبھی بھی اُن کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتیں بس ہر وقت شکوے شکایات کرتی رہتیں،“ اُن کے آنکھیں دکھانے پہ ڈرے بغیر علیزے نے اُن کی ہر وقت کی ناشکری پہ آئینہ دکھایا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ اور یہ تم کس کی شہ پہ اپنی ماں کے آگے اتنی لمبی زبان نکال رہی ہو؟“ علیزے کی بات پہ حنا کی موجودگی کی وجہ سے اپنے غصے کو ضبط کرتے شاستہ بیگم نے دبے لفظوں میں اُسے مزید کوئی فضول گوئی کرنے سے منع کیا۔

”مجھے کسی کی شہ نہیں ہے، میرے پاس اپنا بھی دماغ ہے جو صحیح اور غلط میں فرق کرنا جانتا ہے اور حنا آپی پلیز آپ بھی اپنے دماغ سے کام لیں کسی کے پیچھے لگ کر کیوں آپ اپنا ہنستا بستا گھر بر باد کر رہی ہیں،“ کوئی بھی لحاظ رکھے بغیر علیزے نے ماں کو سنانے کے ساتھ ہی حنا کو مشورہ دیا جو اُس کی فرائی سے چلتی زبان پہ حیرت زده سے کھڑی تھی۔

”تمہاری اتنی ہمت کہ تم اپنی ماں کو باتیں سناؤ“، حنا کے سامنے اپنی بے عزتی پر شائستہ بیگم نے اب کی بارضبط سے کام لینے کی بجائے بغیر کچھ سوچے سمجھے ایک زوردار تھپٹر علیزے کی گال پر رسید کیا۔

”پھوپھو پلیز کیوں مار رہی ہیں آپ علیزے کو؟“ اس سے پہلے کہ شائستہ بیگم مزید کوئی رد عمل ظاہر کر تیں حنا نے درمیان میں آتے مداخلت کی۔

”دماغ خراب ہو گیا ہے اس لڑکی کا تم نے دیکھا نہیں کیسے میرے آگے زبان چلا رہی ہے وہ بھی اُس پھوپھو کے لیے جس نے اپنے بیٹے کے لیے اس کی بجائے اُس بد کرادار لڑکی کو ترجیح دی اور کیا اپنے بھائی کی چاہت بھول گئی ہو؟ جس کے لیے تمہاری پھوپھونے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی ماہم کی عمر نہیں ہے اور پھر اگلے ہفتے کسی اور لڑکے کے ساتھ اُس کی بات پکی کر دی۔ کیا میرا بیٹا اُس لڑکے سے کم شکل تھا؟ یا کم حیثیت؟ کیا کمی تھی میرے بچے میں جو عابدہ نے اُسے چھوڑ کر ایک باہر کے خاندان کا انتخاب کیا“، حنا کے سنبھالنے پر دکھ کے ساتھ شائستہ بیگم نے علیزے کو اُس کی پھوپھو کی زیادتیاں یاد کروائیں۔

”زارون میری قسمت میں نہیں تھا اس لیے مجھے نہیں ملا اور جسے آپ اپنی بیٹی کا بھلا سونج رہی ایسے ہی پھوپھو نے بھی ماہم آپی کی لپسند کو ترجیح دیتے ان کا اچھا سوچا اور کس سیٹے کی بات کر رہی ہیں

آپ؟ اُس کی جو آج ایک لڑکی کے پیچھے ہے تو کل دوسری کے، اُن کے تھپٹر پ بھی اپنے لہجے میں نرمی لائے بغیر علیزے نے بے خوف ہو کر اُن کی بات کا جواب دیا۔

”علیزے پلیز چپ کر جاؤ تم کیوں پھوپھو سے بحث کر رہی ہو، اور پھوپھو آئیں آپ میرے ساتھ ہم باہر چل کر بات کرتے ہیں“، اُس کی بد لحاظی پہ حنا نے ایک نئی ہی کہانی آشکار ہونے پہ تھوک نگتے شائستہ بیگم کو سمجھایا جواب بیٹی کی بد کلامی پہ اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہیں تھیں۔ ”تمہارے دماغ سے تو میں یہ اپنے پن کا بھوت بعد میں اُتاروں گی“، مزید اُسے کوئی بھی راز فاش کرنے کا موقع دیے بغیر شائستہ بیگم نے اُس کے قریب جاتے آہستہ آواز میں تنبیہ کی اور سبحان کو اٹھاتے حنا کے ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھیں۔

”ہونہے خود جو مرضی اور جیسا دل چاہے بول لیں لیکن اگر میں سچائی بیان کر دوں تو ساتھ ہی دماغ خراب ہو جاتا ہے ان کا“، اپنے گال پہ ہاتھ رکھتے علیزے نے اُن کے جاتے ہی آنکھوں میں آنسو لیے خود کلامی کی اور دروازہ اندر سے لاک کرتے خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھ گئی۔

-----

”میں ارحم سے بات کر کے آتا ہوں“، اپنے موبائل پہ آنے والی کال پہ زارون جو پہلے ہی انہیں تہائی فراہم کرنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا اٹھ کر ڈرائیور روم سے باہر نکلا۔

”میں بھی ذرا جنید کو دیکھ کر آتی ہوں اُس کی کچھ طبیعت خراب تھی“، زارون کے جاتے ہی عابدہ بیگم نے بھی معقول سا بہانہ بناتے نور کو ان سے بتیں کرنے کا بولا جوتب سے منہ پھلانے پڑھی تھی۔

”ناراض ہیں آپ؟“، عابدہ بیگم کے جاتے ہی رضا نے اٹھ کر اُس کے قریب صوفے پہ بیٹھتے بات کا آغاز کیا۔

”کیسی ناراضی؟ میں کسی سے ناراض نہیں“، ایک نظر اُس پہ ڈالتے نور نے اپنے لمحے کو ہموار کھتے جواب دیا۔

”کل رات جو کچھ بھی ہوا ہم اُس کے لیے معدرت کرنے یہاں آئے ہیں، مانا کہ غلطی ہماری ہے پر تم بتاؤ کہ اتنی بڑی بات سننے کے بعد کیا ہم خاموش رہتے؟“، نائلہ بیگم نے بھی اٹھ کے اُس کے قریب آتے سمجھانے کی کوشش کی۔

”خاموش رہنا ان الفاظ سے بہتر تھا جو آپ نے اور رضا نے زار کے لیے ادا کیے۔ میں بھی مانتی ہوں کہ حنابھا بھی کے ایک دم سے بتانے پہ آپ دونوں کو صدمہ پہنچا پر کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ آپ

لوگ ایک ہی پل میں اپنے لبھے اور دماغ بدل ڈالتے؟ اور ہو سکتا ہے یہ بیماری زار کی بجائے مجھے ہوتی تو! کیا تب بھی آپ دونوں ایسا ہی کرتے؟، آنکھوں میں نمی لیے نور نے اپنے لبھے کو سنجیدہ رکھتے اُن دونوں کو مزید شر مندہ کیا۔

”اللّٰه نہ کرے کہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچے اور دوبارہ کبھی ایسی بات منہ سے مت نکالنا“، اُس کی بات پر تڑپ کے نائلہ بیگم نے اُس کا ہاتھ تھامتے اپنے لبوں سے لگایا۔

”کیوں نا نکالوں؟ جب آپ کو میرے ساتھ جڑے رشتؤں کی تکلیف کا احساس نہیں تو مجھے بھی کیا ضرورت پڑی ہے آپ کو لوگوں کی تکلیف کا سوچ کر الفاظ ادا کرنے کی“، کندھے اچکاتے نور نے اتنہائی سنگدلي کا مظاہرہ کرتے اُن کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا۔

”آپی پیزیز بات سمجھنے کی کوشش کریں رات جو کچھ بھی ہوا وہ ہمارے بس میں نہیں تھا۔ ہم نے جان بوجھ کر کچھ نہیں کیا جو کچھ بھی ہوا یا ہم نے بولا وہ صرف وقتی رد عمل تھا جس کا مد او اہم زاروں بھائی سے اور آنٹی سے معدرت کر کے کرچکے ہیں“، اُس کی بے رخی پر جہاں نائلہ بیگم نے خاموشی اختیار کی وہیں رضانے نور کی بات کا جواب دیتے اُسے وقت کی نزاکت کے متعلق آگاہ کیا۔

”مداوا غلطیوں کا ہوتا وہ بھی اُن غلطیوں کا جو آپ سے انجانے میں سرزد ہو جاتی۔ جان بوجھ کے ادا کیے جانے والے الفاظ کا کوئی مداوا نہیں ہوتا کیونکہ اس سے لگنے والا خم وہ واحد خم ہے جو بغیر

کسی تیر کمان یا ہتھیار کے سیدھا انسان کے دل پر اثر انداز ہوتا ہے اور کسی انسان کے دل کو تکلیف پہنچانے کا مطلب تو آپ لوگ سمجھتے ہیں نا؟“ رضا کے اتنی آسانی سے مذہر ت کا کہنے پر نور نے چہرے پر ایک تلخ مسکراہٹ سجاتے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”بڑی ہو گئی ہیں اب آپ، مجھے پتا ہی نہیں تھا کہ اب میری بہن وہ نا سمجھ اور بیو قوف نہیں رہی جس کو میں ایک چاکلیٹ دے کر اپنی بڑی سے بڑی غلطی معاف کروالیتا تھا“، اُس کی بات پر کچھ سخت کہنے کی بجائے رضا نے مسکراتے ہوئے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”اتنی بھی بڑی نہیں ہوئی کہ تمہاری چاکلیٹ کونہ کر دوں اور اب زیادہ رو کر میرا دل بُرانہ کرو،“ اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نور کا دلفٹ سے پکھلا تو اُس نے رضا کو اپنے ساتھ لگایا جو زندگی میں پہلی بار بہن کی سختی دیکھ کر دلبڑا شتہ ہو چکا تھا۔

”نہیں لا کر دینی حد ہے اتنی بے عزتی کروانے کے بعد تو میں کبھی بھی آپ کو چاکلیٹ لے کر نہ دوں“، اُسے نرم پڑتا دیکھ رضا نے نفی میں سر ہلاتے اُس کے بال کھینچنے اُسے چھیرا جواب انہیں مزید شر مندہ کیے بغیر اپنادل صاف کرتے انہیں معاف کر چکی تھی۔

”ماما دیکھ لیں یہ پھر سے مجھے تنگ کر رہا ہے“، نور نے بھی مقابلے میں اُس کے کشن رسید کرتے نائلہ بیگم کو شکایت لگائی جو انہیں پہلے کی طرف آپس میں لڑتا جھگڑتا دیکھ پر سکون ہوتے اللہ کا شکر ادا کرنے لگیں۔

---

”جنید بیٹا اٹھ جاؤ باہر آؤ، کیا تم نے رات سے اپنے آپ کو کمرے میں بند کیا ہوا ہے“، دروازے پر دو تین بار دستک دینے کے بعد جنید نے اندر سے لاک کھولا تو عابدہ بیگم نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”بند نہیں کیا، ویسے ہی میرے سر میں درد تھا اس لیے صحیح نماز پڑھنے کے بعد پھر سے سو گیا“، اپنی سرخ آنکھوں کو ان سے چھپانے کے لیے جنید نے نظریں چراتے جواب دیا۔

”میں سب جانتی ہوں جو تمہارے سر میں درد تھا اور ایسے خود کو تکلیف دینے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا“، اُس کے قریب ہی صوفے پر بیٹھتے عابدہ بیگم نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

---

”کوئی تکلیف نہیں ہے مجھے اور میں کسی بھی کم ظرف انسان کے لیے خود کو پریشان کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں اس لیے پلیز آپ یہ مت سمجھیں کہ میں اُس عورت کی وجہ سے درد سر کا بہانہ بنارہ ہوں جس نے آپ لوگوں کی تودور کی بات میری بھی عزت کا خیال نہیں کیا“، عابدہ بیگم کے بات کا مقصد سمجھتے ہی جنید جو پہلے ہی بھرا بیٹھا تھا ایک دم سے بھڑکا۔

”تو پھر کیوں رات سے یوں خود کو کمرے میں بند کیے بیٹھے ہو؟ اور تم شاید بھول رہے ہو کہ وہ عورت تمہاری بیوی ہے اور تمہارے بیٹے کی ماں بھی“، جنید کی نظر وہ میں حقارت دیکھ عابدہ بیگم نے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”بیوی ہے پر اب نہیں رہے گی، میں اُسے طلاق دینے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور بہت جلد میں اپنے بیٹے کو بھی اُس سے لے لوں گا“، اپنے الفاظ پہ زور دیتے جنید نے اپنا فیصلہ سنایا تو کچھ سیکنڈز کے لیے عابدہ بیگم نے خاموشی کے ساتھ اُس کے چہرے کو دیکھا جہاں کسی قسم کی کوئی بھی نرمی موجود نہ تھی۔

”پہلی بات کہ حنا کی غلطی اتنی بھی بڑی نہیں کہ تم اُسے یوں طلاق دینے کی بات کروا اور دوسرا بات تم اُسے آزاد کر کے اپنی جان چھڑ والوں کے اور ہو سکتا ہے وہ بھی تم سے آزادی ملنے پہ خوش ہو پر اُس معصوم کا کیا؟ جو تمہارے اور اُس کے بیٹے ایک معاہدے کی شکل اختیار کرتے کبھی ماں کے

پاس اور کبھی تمہارے پاس رہے گا۔ جنید بیٹا میں مانتی ہوں کہ حنانے غلطی کی ہے پر اُس نے کوئی گناہ نہیں کیا جو تم اُسے اتنی بڑی سزا بغیر کسی جواز کے سنار ہے ہو۔ وہ بھی ہمارے جیسی انسان ہے کوئی فرشتہ نہیں اسلیے پلیز تم جلد بازی میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار اپنے بچے کے بارے میں ضرور سوچ لینا، اپنے ہاتھ کا دباؤ اُس کے کندھے پہ ڈالتے عابدہ بیگم نے ایک اچھی ماں ہونے کا فرض ادا کرتے اُسے بہتر الفاظ میں سمجھایا تاکہ وہ اپنی انا اور ضد میں آکر اپنا گھر تباہ نہ کرے۔

نائلہ بیگم اور رضا کور خست کرتے زارون واپس اندر آیا تو ایمان کو اپنے چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ اپنی جانب آتا دیکھ رک گیا۔

”چا... چو...“ اپنے دونوں ہاتھ اٹھاتے اُس نے زارون کو پکارا جس نے اُس کی بات کا مفہوم سمجھتے اُسے اپنی گود میں اٹھالیا۔

”کیا ہوا میری پرنسسز کو؟ کچھ چاہیے کیا؟“ اُسے اٹھاتے ہی زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑتے اپنے لبوں سے لگاتے پیار کیا۔

”چا... چوآئسکر... یم“، تین سال کی ایمان نے اپنی تو تلی زبان میں انکلتے ہوئے اُسے اپنی فرمائش بتائی تو زارون نے مسکراتے ہوئے اُس کی پیشانی سے بالہٹائے اور اُسے گود میں اٹھائے ہی باہر جانے کے لیے پلٹا۔

”کہاں لے کر جا رہے ہو تم ایمان کو؟ اور تمہاری ہمت کیسے ہوئی میری بیٹی کو ہاتھ لگانے کی؟“ اس سے پہلے وہ بیرداںی دروازہ پار کرتا ہمانے کمرے سے انکلتے ایمان کو اُس کے ہاتھوں میں دیکھ جلدی سے آگے بڑھتے اُسے جھپٹنے والے انداز میں اُس سے لیا۔

”بھا بھی وہ ایمان آئسکریم کا بول رہی تو میں بس اُسے وہی دلانے لے کر جا رہا تھا“، ہما کے رویے پہ ناصبحی سے زارون نے وضاحت دی۔

”وہ تو پچھی ہے ناصبح ہے اُسے اپنے اچھے برے کا بھی پتا نہیں پر تم تو سمجھدار ہونا؟ اچھے سے جانتے ہو کہ تمہارا اس طرح کسی بچے کو چھونا کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے“، کوئی بھی لحاظار کے بغیر ہمانے ایمان کو اپنے ساتھ لگاتے زارون کو اُس کی بیماری کے متعلق یاد دہانی کروائی۔

”جی، سمجھ گیا اور سوری میں دوبارہ ایمان کو نہیں اٹھاؤں گا“، اُن کے طنز پہ بُرا لگنے کے باوجود بھی زارون نے اُسے کچھ کہنے کی بجائے معذرت کی اور خاموشی سے سرجھکائے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔

”ہونہ آیا بڑا میری بیٹی کو اٹھانے والا، حد ہے پتا نہیں یہ اچھوت کب ہماری جان چھوڑے گا“، اُس کے جاتے ہی اُس کی پشت کو گھورتے ہمانے ایمان کو چپ کر واپس جو زارون کو جاتا دیکھ کر رونے لگ تھی۔

”کیا ہوا؟! اتنے غصے میں کیوں ہوا اور یہ ایمان کیوں رو رہی ہے؟“ ہما کے کمرے میں داخل ہوتے ہی مزمل جو اپنے موبائل پر کچھ دیکھنے میں مصروف تھا، اٹھ کر ایمان کو اُس سے لیتے پوچھنے لگا۔

”غصہ؟ یہ بات آپ اپنے اُس بیمار بھائی سے جا کر پوچھیں، حد ہے کیسے میری بیٹی کو اٹھائے دلیری کے ساتھ باہر جا رہا تھا؟“، دانت پیستے ہمانے مزمل کا خوف (جس کی وجہ سے وہ آج تک کبھی اُس کے گھروالوں کے سامنے زبان نہیں کھول پائی تھی) ایک سائیڈ پر رکھتے طرز کیا۔

”کیا مطلب؟ کون باہر لے جا رہا تھا؟“، ایمان کو چپ کر واتے مزمل نے کچھ ناتمثیجی سے معاملہ جاننے کی کوشش کی۔

”ذارون صاحب اور کون، حد ہے جب اُسے پتا ہے کہ اسے اتنی بڑی بیماری ہے تو کیوں بچوں کو ہاتھ لگاتے انہیں بھی اپنے ساتھ بیمار کرنا چاہتا ہے۔ مزمل میں آپ کو بتا رہی ہوں میں ایمان کے معاملے میں کسی قسم کی کوئی لاپرواںی برداشت نہیں کروں گی، اس لیے پلیز آپ ذارون کو اپنی زبان میں سمجھادیں کہ وہ دوبارہ ہماری بیٹی کو ہاتھ نہ لگائے“، دیدہ دلیری دکھاتے ہمانے جیسے ہی اپنی بات مکمل کی مقابل نے ضبط کے مارے اپنے جبڑوں کو بھینچتے ماتھے پہ بل ڈالے۔

”پہلی بات کہ میرا بھائی کوئی مستقل بیمار نہیں ہے اور دوسری بات کیسی کوئی ایسی بیماری نہیں جو کسی کے چھوٹے سے لگ جائے اور تیسرا اور آخری بات آج تم نے ذارون کے متعلق ایسی بات منہ سے نکال لی ہے جسے میں تمہاری غلطی سمجھ کر معاف کر رہا ہوں اگر دوبارہ تم نے ایسی کوئی بھی فضول بات اپنی زبان سے نکالی تو میں تمہاری زبان کا ٹنتے دیر نہیں کروں گا“، ایمان کو اپنا موبائل پکڑا کر بیٹڈ پہ بٹھاتے مزمل نے ہما کی آنکھوں میں بے خوف دیکھ کر سخت الفاظ میں تنبیہ کی۔

”ٹھیک ہے کاٹ دیں پر اب میں خاموش نہیں رہوں گی۔ اپنے ساتھ کی جانے والی زیادتی پہ تو ہر کوئی چپ ہو جاتا ہے پر اپنی اولاد کے لیے کوئی بھی یہ بات برداشت نہیں کرتا کہ اُسے کوئی تکلیف پہنچے اور آپ کیسے باپ ہیں؟ جو سب کچھ نظر وہ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی خود تو چپ ہیں

ہی ساتھ ساتھ مجھے بھی خاموش کروار ہے ہیں، اُس کی نظر وہ سے خائف ہوتے ہمانے اس بار اپنے لبجے کو کچھ نرم رکھتے مزمل کو ایمان کے حوالے سے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

”تو میں اپنی ہی اولاد کی تکلیف پہ آواز اٹھا رہا ہوں جس طرح ایمان تمہیں عزیز ہے نا اور تم اُس کے لیے آج میرے سامنے یہ گز بھر لمبی زبان کھول رہی اسی طرح زارون بھی مجھے پیارا ہے جسے بچپن سے لے کر آج تک بھائی سے زیادہ میں نے اپنا بیٹا سمجھا اور آج تم اُسی کے بارے میں مجھے ور غلار ہی ہو؟ مجھے یہ سبق دے رہی کہ میں تم جیسی جاہل عورت کی خاطر جس نے زندگی میں صرف کتابوں کو پڑھ کر خود کو علم والا تصور کر لیا اپنے بھائی کا مزید دل دکھاؤں وہ بھی اُس وقت جب وہ پہلے سے ہی تکلیف سے گزر رہا ہے؟ نہیں ہما میڈ، نہیں میں جنید کی طرح بالکل بھی نہیں ہوں جو پہلے خود ڈھیل دے کر حنا کو سب بولنے کا موقع دیتے تھے اور اب ایک ہی بار رسی کھینچتے اپنے ہر قصور سے بری ہو گئے۔ میں مزمل ہوں جو یہ اچھے سے جانتا کہ عورت اگر پیار اور نرمی کی زبان نہ سمجھے تو اسے سختی کی زبان سے سمجھانے کا حق بھی مرد کو حاصل ہے، کہنے کے ساتھ ہی مزمل جس نے آج تک صرف ہما کو اپنے الفاظ سے ڈراتے قابو میں رکھا تھا آگے بڑھنے اُس کے جبڑوں کو اپنے ہاتھ میں دباتے اُس کی تمام تر چالاکیوں کو اپنی ایک گھوری میں نکالا۔

”مزمل کیا کر رہے ہیں آپ پلیز مجھے معاف کر دیں میں دوبارہ ایسی کوئی بھی بات نہیں کروں گی“، اُس کے غصے سے واقف ہونے کی وجہ سے ہمانے مزید اُس کے کسی سخت قدم سے پہلے ہی اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے اپنی غلطی قبول کرتے معدرت کی۔

”ٹھیک ہے اگر دوبارہ میں نے تمہاری زبان سے کچھ سنایا میرے گھروالوں کے لیے تم نے کوئی الٹی سیدھی بات اپنے منہ سے نکالی تو میں جنید کی طرح طلاق دینے کا آسان راستہ نہیں چنou گا بلکہ تمہارا اسی کمرے میں گلاڈ باکر اپنی عزت کو جگہ جگہ اچھلنے سے بچاؤں گا“، اُس کے جسم کی کپکپاہٹ محسوس کرتے مزمل جو ہنا کے جاتے ہی اُس کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا اُس نے کسی قسم کی نرمی کی گنجائش رکھے بغیر اسے تنبیہ کی جو نظروں میں خوف لیے جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے اُس کی ہر بات پہلیک کہہ چکی تھی۔

”آپ یہاں بیٹھے ہیں اور میں آپ کو نیچے ڈھونڈ رہی تھی“، کمرے میں داخل ہوتے ہی زارون کو خاموشی سے بیڈ کی بیک سے سر ٹکائے بیٹھاد کیچھ نور نے ایک گہر اسنس لیا۔

”کیوں ڈھونڈ رہی تھیں مجھے؟ کوئی کام تھا؟“ اُس کی آواز پہ سیدھے ہو کر بیٹھتے اُس نے اپنے چہرے سے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر سوال کیا۔

”جی، خیریت ہی ہے مجھے لگا شاید آپ ارحم بھائی کی طرف چلے گئے ہیں“، جواب دینے کے ساتھ ہی نور نے بیڈ پہ پڑے، دھلے کپڑوں کو اٹھاتے صوفے پر رکھا۔

”نہیں، بس طبیعت کچھ بو جھل سی ہو رہی تھی اسی لیے جانے کا رادہ ترک کر دیا“، ہماکی کوئی بھی بات نور کو بتانے کی بجائے زارون نے معقول سا بہانہ بنایا۔

”کیوں کیا ہوا طبیعت کو؟ رات بھی آپ کے سر میں درد تھا اور اب بھی طبیعت خراب ہے بس اُٹھ جائیں چلیں ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں“، اپنی بات ادھوری چھوڑتے نور نے اُس کے قریب آتے اُس کا ہاتھ پکڑا۔

”اب اتنی بھی خراب نہیں ہے کہ ڈاکٹر کے پاس چلا جاؤں اور یہ تمہیں گھر میں گھونمنے پھرنے اور میری جاسوسی کرنے کے علاوہ کوئی اور کام نہیں ہے کیا؟ میرا مطلب پڑھائی وڑھائی کا کوئی ارادہ ہے یا بس دو سمسٹر پہ ہی بس ہو گئی؟“، اُس کا دھیان بٹانے کے لیے زارون نے بات بدلتے اُس کی کلاس لی جو کافی دونوں نے یونیورسٹی سے چھٹیاں کر رہی تھیں۔

”بس نہیں ہوئی پر اب میرا دل نہیں کرتا پڑھنے کو، وہ دراصل میں سوچ رہی تھی جو باقی کی پڑھائی رہ گئی ہے وہ میں اپنے بچوں کو کروالوں گی“، اپنی ہی دھن میں بولتے وہ کتنے غلط وقت پہ یہ بات بول چکی تھی اُسے شاید خود بھی اندازہ نہیں ہوا۔

”بچے؟ پہلے خود تو بڑی ہو جاؤ پھر بچوں کا بھی سوچ لینا“، خود کو سنبھالتے زارون نے حتی المکان اپنے لبھ کو ہموار رکھتے بات کو مذاق میں اُڑایا۔

”بچوں کے لیے بڑے ہو ناضروری نہیں ہے اور جب ذمہ داری پڑتی ہے ناتوہر بے عقل انسان بھی سمجھدار ہو جاتا ہے اور ہمارے اپنے بچے ہوں گے تو آپ انہیں جیسے مرضی پیار کریے گا میں آپ کو نہیں روکوں گی“، نور جو ہما کو زارون کے ہاتھ سے ایمان کو جھپٹتا دیکھ چکی تھی اُس نے آنکھوں میں نمی لیے اپنی بات مکمل کی۔

”لوگوں کی باتوں پہ دھیان نہیں دیتے وہ جو کچھ بھی بولتے ہیں یہ ان کا ظرف ہے اور یہ تم کیا ہر وقت میری جاسوسی پہ لگی رہتی ہو“، اُس کے رخسار پہ ہاتھ رکھتے زارون جو یہ سمجھ رہا تھا کہ نور نے بے دھیانی میں بچوں کا ذکر کیا ہے اُس کے پیار کا کہنے پہ فوراً سمجھ گیا کہ اُس نے ہما کی باتیں سن لیں ہیں۔

”جاسوسی نہیں کی میں توڈرائیگ روم سے برتن اٹھا کر باہر آرہی تھی جب ہما بھا بھی کی آواز میرے کانوں میں پڑی اور آپ کو کوئی ضرورت نہیں ہے دوبارہ ایمان کو اٹھانے کی یا اُسے پیار کرنے کی“، اُس کی بات کا جواب دیتے نور نے اُسے سختی سے تنبیہ کی۔

”ٹھیک ہے نہیں اٹھانا اور ایسے کسی کی بات کو دل پہ نہیں لیتے، بھا بھی نے تو ویسے ہی ایک عام سی بات کی تھی“۔

”عام سی بات نہیں تھی وہ اور میں نے بس بول دیا نا آپ سے کہ آپ دوبارہ ایمان کو ہاتھ نہیں لگائیں گے تو بس، کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو کسی اور کاچھ اٹھانے کی اور یہ لوگ کیا سمجھتے ہیں کہ ہمارے پچھے نہیں ہو....، جذبات میں اگر اُس کی بات کا ٹھنڈنے نور نے ہو لفظ پہ رکتے زارون کی طرف دیکھا جو بغور اُس کی بات سن رہا تھا۔

”رُک کیوں گئی بولونا؟ وہ کیا بات کر رہی تھیں تم کہ ہمارے پچھے...“، اُس کے شرم سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ زارون نے اُس کی بات دھراتے تصدیق چاہی۔

”وہ میں... کہہ رہی تھی... مجھے مامنے چائے کا بولا تھا اور یہاں آپ نے مجھے باتوں میں لگایا“، اُس کی نظر وہ میں شرارت دیکھ کر نور نے اُس کا ہاتھ چھوڑا اور جلدی سے اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔

”اُفف پاگل ہے یہ لڑکی“، اُس کے جاتے ہی اپنی مسکراہٹ چھپاتے زارون نے سر جھٹکا اور ہما کی باتوں کا سار بوجھ دل سے اُٹھ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگتا کہ ارحم کی طرف جا سکے۔

---

”پھپھو پلیز اپنے غصے کو کم کریں اور یہ لیں تھوڑا پانی پئیں“، شاستہ بیگم کو مسلسل علیزے کو کوستا دیکھ بلآخر حنا نے کچن سے پانی لاتے اُن کے قریب رکھا۔

”کیا؟ کم کروں غصہ؟ تم نے دیکھا نہیں کیسے میری ہی اولاد مجھے ہی اُٹھ کر باتیں سنار ہی ہے، کیا میں نے یہ دن دیکھنے کے لیے بڑا کیا تھا انہیں؟“ گلاس میں سے دو گھونٹ پانی کے لیتے شاستہ بیگم نے حنا کی تسلی پہ اپناد کھبیاں کیا۔

”پھپھو کیوں آپ علیزے کی باتوں کو دل پہ لے رہی ہیں۔ وہ تو ناسمجھ ہے اس لیے جو منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے پر آپ تو سمجھدار ہیں نا اس لیے پلیز اُس کی باتوں کو دماغ پہ سوار کرتے اپنی طبیعت خراب مت کریں“، سبحان کو گود میں اٹھاتے حنا نے شاستہ بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی جو اُس کے مسئلہ کو چھوڑ کر اپنے ہی کھاتے کھول کر بیٹھ گئی تھیں۔

---

”نا سمجھ نہیں ہے وہ، بلکہ پوری مکار ہے بالکل اپنے باپ کی طرح اور سب اچھے سے جانتی ہے کہ ماں کو کس وقت اپنی ان زہریلی باتوں سے ڈنگ لگانا ہے“، حنا کی بات کامل ہوتے ہی شائستہ بیگم نے دانت پسیے اور دو گھونٹ مزید پانی کے بھرتے اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”ہم یہ تو ہے بس انسان سب کی باتیں برداشت کر لیتا پرا گرا اپنی ہی اولاد دیوار بن جائے تو ساری تدابیر دھری کی دھری رہ جاتی ہیں“، اُن کے قریب بیٹھتے اس بار حنا نے جلتی پہ تیل کا کام کرتے اُنہیں مزید جذباتی ہونے سے روکا۔

”اچھا تم چھوڑو ان سب باتوں کو یہ بتاؤ کہ اب آگے کیا کرنا ہے؟ میرا مطلب احسان تو کسی صورت بھی جنید کے خلاف بات نہیں کریں گے“، بات اپنے پہ آئی تو شائستہ بیگم نے فٹ سے موضوع بدلا۔

”تو آپ جائیں نا، آپ بات کریں اُن سے۔ ویسے بھی پھوپھا سے زیادہ آپ کا بات کرنا اور کہنا میری ساس پہ اثر کرے گا“، اُن کی بات سنتے ہی حنا نے چالاکی کے ساتھ مشورہ دیا۔

”ہاں یہ تو ہے پرمجھے لگتا ہے میرا بات کرنا تمہارے معاملے میں مزید بگاڑ پیدا نہ کر دے۔ میرا مطلب میں اپنی باتوں سے عابدہ کو تود بالوں گی پر جنید؟ وہ کہیں تیش میں آکر کچھ غلط نہ کر بیٹھے“، کسی خدشے کے تحت شائستہ بیگم نے حنا کو خبردار کیا۔

”پہلی بات کہ جنید میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ کچھ غلط کرے اور دوسری بات میرے ساس سر کو اپنی عزت بہت پیاری ہے اس لیے وہ تو خود کوئی سخت فیصلہ کریں گے اور نہ ہی اپنے بیٹے کو کرنے دیں گے“، دل میں خوش نہیں پالے حنانے اس بار کے جھگڑے کو بھی عام تصور کرتے شاائستہ بیگم کو مزید شے دی۔

”اچھا ٹھیک ہے پر پھر بھی میرا مشورہ ہے کہ تم ایک بار ذوالفقار بھائی (حناء کے ابو) سے بات کر لو یا مجھے کرنے دو میں خود ہی ان کو سارے معاملے کے متعلق بتادوں گی تاکہ کل کو کوئی ایسی ولیسی بات ہو تو تمہاری ماں سارا الزام میرے سر نہ ڈال دے“، طاہرہ بیگم کی طبیعت سے خائف ہوتے شاائستہ بیگم نے حنا کی بات سے اتفاق کرتے ایک بار پھر سے مشورہ دیا۔

”پھچھو پلیز آپ امی کی فکر نہ کریں میں خود ہی انہیں سن بھال لوں گی اور ابو سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں انہوں نے تو ہمیشہ کی طرح مجھے درس دینے بیٹھ جانا کہ نہیں شوہر کا قصور ہوتا بھی اُسے معاف کر دینا چاہیے“، اپنے ابو کی نقل اُتارتے حنانے شاائستہ بیگم کو انہیں کچھ بھی بتانے سے منع کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں پھر احسان سے دوبارہ بات کرتی ہوں، ہو سکتا ہے کہ وہ میری بات مان جائیں“، حنا کے ارادے انہیں چاروں طرف سے بُرا بنانے کے تھے جس کو اچھے سے سمجھتے شاہستہ بیگم نے حامی بھرنے کی بجائے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔

”چلیں ٹھیک ہے پر پلیز جلدی بات کر لیجیے گا، یہ نہ ہو وہاں میری ساس کوئی اور نیا محاذ بناؤ کر بات ابو تک پہنچادیں“، ان کی ٹال مٹول کو دیکھ حنا نے تاکید کی اور سبحان کو ان کے پاس لیٹاتے اُس کا فیڈر لینے چلی گئی۔

”اُفف یہ لڑکی مجھے چاروں طرف سے پھنسوائے گی پر ابھی موقع ہے عابدہ کو اُس کے کیے کا جواب دینے کا اس لیے میں بالکل بھی پچھے نہیں ہٹوں گی“، دل میں اراداہ کرتے شاہستہ بیگم نے چہرے پر ایک مکروہ مسکراہٹ سجائی اور موبائل اٹھاتے اپنی دیواری کا نمبر ملانے لگیں تاکہ انہیں یہاں کی ساری خبریں دے سکیں۔

-----

”یار کہاں رہ گئے تم؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں“، زارون کی گاڑی پورچ میں آکر رکی تو ارجمند جولان میں موجود اُسی کا منتظر تھا اُس کے قریب آتے پوچھنے لگا۔

”ہاں بس وہ کچھ کام پڑ گیا تھا اسی لیے لیٹ ہو گیا۔ تم بتاؤ گھر رکنا ہے یا کہیں جانے کارادا ہے؟“

پیٹ میں معمولی سادہ دم حمос کرتے زارون نے بات کو طول دینے کی بجائے مطلب کی الفاظ ادا کرتے سوال کیا۔

”باہر جانا ہے تھوڑا شاپنگ کا رادا ہے اور ویسے بھی گھر رہ کر بور ہو گیا ہوں میں“، بتانے کے ساتھ ہی ارحم نے گاڑی کے دوسری طرف جاتے دروازہ کھولا تو زارون نے بھی کوئی اعتراض کیے بغیر ڈرائیور نگ سیٹ سنبھال لی۔

”شادی کی شاپنگ کرنے کا رادا ہے کیا؟“ گاڑی گیٹ سے نکلتے سڑک پہ ڈالتے ہی زارون نے نظروں میں شرارت لیے استفسار کیا۔

”شادی ایک مہینے بعد ہے اور میں کوئی لڑکی نہیں ہوں جو ابھی سے شاپنگ شروع کر دوں۔ بس موسم گرم ہو رہا ہے تو سوچا کچھ ٹی شرٹس وغیرہ لے لوں“، اس کی بات سنتے ہی بھنویں اچکاتے ارحم نے اپنی خریداری کے متعلق تفصیل سے بتایا۔

”اچھا چھا میں سمجھا کہ شاید شادی کی شاپنگ کرنے کا رادا ہے وہ کیا ہے ناتر سے ہوئے لوگوں کی شادی اتنی جلدی تھے پاجائے تو سنائے ہوں کاذ ہنی تو ازن کچھ بگڑ سا جاتا“، اپنی مسکراہٹ چھپاتے زارون نے اُسے چھیڑا۔

”کیا مطلب ہے تمہارے کہنے کا؟ میں کوئی ترسا ہوا کنوار ہوں جو شادی کا سنتے ہی بے ہودہ حرکتیں شروع کر دوں؟“ اُس کی بات سنتے ہی ارحم نے اُس کی جانب سیدھا ہو کر بیٹھتے تصدیق چاہی۔

”نہیں، میں نے اب ایسا بھی نہیں کہا۔ میں تو بس اتنا کہہ رہا تھا کہ اپنا خیال رکھنا یہ نہ ہو خوشی کے مارے دماغ کی کوئی رگ وغیرہ متاثر ہو جائے“، نظریں سامنے سڑک پر رکھتے زارون نے اپنے ہونٹ سکریٹے چہرے پر سنجیدگی طاری کرتے ارحم کو مشورہ دیا جو ماتھے پہ بل لیے اُسے کھاجانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔

”فکر نہ کرو اگر تمہارا قائم ہے نہ تو میرا بھی خراب نہیں ہوتا اور تمہاری ان فضول باتوں کا مطلب میں اچھے سے سمجھتا ہوں اس لیے میرے بے عزتی کر کے یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں یو نہیں بخش دوں گا“، اُس کے چہرے پہ اپنی بات سے الٹنے والی مسکراہٹ کو دیکھا ارحم نے دانت پیستے دھمکی دی اور آج کی ساری شاپنگ اُس کے پیسوں سے کر کے اُس کو سبق سیکھانے کا ارادہ کرتے اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوا جہاں ہاشم صاحب کی کال آر ہی تھی۔

”آپ نے مجھے بلا یا تھا؟“ دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوتے جنید نے ایک نظر عابدہ بیگم پر ڈالتے احمد صاحب سے استفسار کیا۔

”ہاں، مجھے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ آؤ یہاں بیٹھو،“ اپنی ٹانگیں سیمٹ کر اُس کے لیے جگہ بناتے احمد صاحب نے اُس کے اُترے ہوئے چہرے کو دیکھا۔

”جی بولیں،“ اُن کی ضروری بات کا موضوع جاننے کے باوجود بھی جنید نے انہیں بولنے کا موقع دیا۔

”میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ حنانے جو کچھ بھی کیا وہ اُس کی غلطی تھی پر یہ کہنا لازمی ہے کہ تم اُس کے پاگل پن کواب کوئی سخت فیصلہ کر کے گناہ میں نہ بدلو،“ عابدہ بیگم کی زبانی جنید کے الفاظ کا سن کر احمد صاحب نے مناسب الفاظ میں اپنی بات کا آغاز کیا۔

”دیکھو بیٹا میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ بھی ہو اُس نے تمہاری عزت نفس کو مجروح کیا ہے۔ حنانے اپنے رویے اور عمل سے تمہارے احساسات اور اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے پر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی اُس کے ساتھ ویسا ہی رویہ اختیار کرتے معاملے میں مزید بگاڑ پیدا کرو،“ اُس کی خاموشی پر اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر احمد صاحب نے احسن طریقے سے اُسے اپنی بات سے قائل کرنے کی کوشش کی۔

”زندگی انسان سے بہت بڑے امتحان لیتی ہے جن میں سے کچھ کے فیصلہ ہماری سوچ اور خیالات کے مطابق ہوتے ہیں اور کچھ ہماری سوچ کی مخالفت کرتے ہمیں وہ سب کرنے پر مجبور کرتے جس کے بارے میں ہم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا“، اُس کے چہرے کے تاثرات دیکھنے کے لیے وہ کچھ سینکڑے کے لیے رکے۔

”ہنا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اپنے اندر اس قدر کرو اہٹ بھرے ہوئے ہے۔ اُس کے رویے سے ہمیں اتنی تکلیف پہنچی ہے تو تم تو پھر اُس کے شوہر ہو، میں سمجھ سکتا ہوں کہ اُسے معاف کرنا تمہارے لیے آسان نہیں مگر سمجھان کے خاطر تمہیں یہ سمجھوتا کرنا پڑے گا“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے ہنا کے رویے اور باتون کو اپنی انکا مسئلہ بنانے کی بجائے بہت نرمی اور پیار سے جنید کو سمجھایا۔

”سمجھوتا؟ پچھلے پانچ سالوں سے اُس جیسی بد زبان عورت کے ساتھ سمجھوتا ہی تو کرتا آیا ہوں جسے نہ تو کسی بڑے کا لحاظ ہے اور نہ ہی چھوٹے کا اور ابو میرے ساتھ وہ جیسے بھی کرتی جو بھی بولتی میں سب کچھ برداشت کر رہا تھا پر اب اُس نے آپ سب سے بد تیزی کر کے اچھا نہیں کیا“، سمجھوتا لفظ پر طنزیہ مسکراتے جنید نے اپنے لبجے کے ساتھ ساتھ اپنے الفاظ میں بھی تنگی سموئے جواب دیا۔

”عورت مخلوق ہی ایسی ہے، یہ ٹڑھی ہڈی سے بنی ہے اگر تم اس کے ساتھ سختی کرو گے تو یہ ٹوٹ تو جائے گی پر سیدھا ہونے کی گنجائش باقی نہیں رکھے گی اس لیے جو کچھ بھی ہو گیا اس کو ہماری خاطر پس ولپشت ڈال کر حنا کو گھر لے آؤ“، اس کی تلخی پہ مسکراتے احمد صاحب نے پختہ الفاظ استعمال کرتے اُس کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے میں آپ لوگوں کی خاطر اُسے معاف کرنے کے لیے تیار ہوں پر میری ایک شرط ہے“، احمد صاحب کے اصرار پہ جنید کو مزید اپنی ضد برقرار رکھنا مناسب نہیں لگا۔

”کیا شرط؟ ہمیں تمہاری ہر شرط منظور ہے“، عابدہ بیگم جوتب سے خاموش بیٹھی تھی اُس کی بات سن کر اُس کے قریب آئیں۔

”حنا اپنے رویے کے لیے سب سے معافی مانگے گی اور میں اُسے لینے نہیں جاؤں گا، اگر اُس کا دل ہو تو وہ یہاں آسکتی ہے“، اپنی بات مکمل کرتے ہی جنید نے اُن کا جواب سنے بغیر باہر کا رخ کیا۔

”اُفف یہ لڑکا ضرور کوئی نئی مصیبت کھڑی کرے گا ہمارے لیے، ہم تو پہلے ہی زارون کی وجہ سے پریشان ہیں اور اب یہ ایک اور تماشہ...“، جنید کے جاتے ہی عابدہ بیگم نے اپنا سر پکڑتے فکر مندی ظاہر کیا۔

”اچھا آپ تسلی رکھیں کچھ نہیں ہوتا اتنا بیو قوف بھی نہیں ہے جنید جتنا آپ سمجھ رہی اور اچھا ہے کچھ دن حنا کو بھی دوسروں کے درپرہ رہ کے دیکھ لینے دیں ہو سکتا ہے اُسے ہی کچھ عقل آجائے“، جنید کی شرط پر کسی رد عمل کا اظہار کیے بغیر احمد صاحب نے اُس کی سائیڈلی۔

”کیسی عقل؟ اُس کی تو شائستہ بھا بھی کے ساتھ رہ کر رہی سہی عقل بھی جانتی رہے گی، بھا بھی تو پہلے ہی ہمارے اتنے خلاف ہیں اور سے حنانے اُن کی طرف جا کر مزید انہیں باتیں کرنے کا موقع فراہم کر دیا“، اپنی اصل فکر بتاتے عابدہ بیگم نے احمد صاحب کی طرف دیکھا۔

”اچھا آپ پریشان نہ ہوں، کچھ نہیں ہوتا اور جو بات کسی کو پتا چلنی وہ تو اب تک پتا چل ہی چکی ہو گی اس لیے پلیز آپ یوں خود کو پریشان کر کے اپنابی پی ہائی مت کریں“، احمد صاحب کو شائستہ بیگم کی ایک بات کی چار چار لگا کر بتانے والی عادت سے اچھے سے واقف تھے، اُن کی فکر مندی دیکھ کر انہیں تسلی دینے لگے جو بار بار ایک ہی بات مختلف طریقوں سے دہراتی تھیں۔

-----

”کیا ہوا؟ یہاں کیوں بیٹھ گئے ہو؟“، مارکیٹ میں پہنچتے ابھی وہ پہلی ہی دکان میں داخل ہوئے تو زارون نے وہاں موجود ایک کرسی پر بیٹھتے اپنے بھاری ہوتے سر کو جھٹکا۔

”کچھ نہیں، بس سر ایک دم سے چکرانے لگ گیا ہے“، اپنی پیشانی کو مسلتے اُس نے ارحام سے پانی کا کہا۔

”طبعیت خراب تھی تو تم مجھے پہلے بتاسکتے تھے نا“، کاونٹر پر موجود لڑکے کو پانی کا بو لتنے ارحام نے فکر مندی سے اُس کا ہاتھ تھاما جو بالکل ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

”پتا نہیں، پہلے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا یہ ایک دم سے ہی چکر آنے لگ گئے“، اُس لڑکے کے ہاتھ سے گلاس تھامتے زارون نے دوچار گھونٹ بھرتے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کی۔

”اچھا بس چھوڑ و سب، اٹھو میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر چلتا ہوں“، اُس کی زرد پڑتی رنگت کو دیکھ ارحام نے اُس کی مزید کوئی بات سنے بغیر اصرار کیا۔ ”نہیں یار میں ٹھیک ہوں، ڈاکٹر کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں“، ڈاکٹر کا نام سنتے ہی زارون نے فوراً سے نفی میں سر ہلا یا اور ارحام کو دکھانے کے لیے کہ اُس کی طبیعت ٹھیک ہے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

”پتا مجھے جو ٹھیک ہو تم، بس میں نے کہانا کہ ڈاکٹر کے پاس چلو تو بس چلو“، اُس کی ساری محنت پر پانی پھیرتے ارحام نے اُس کی چالاکی پہ آنکھیں نکالیں اور اُس کے منع کرنے کے باوجود بھی اُسے اپنے ساتھ لیے دکان سے نکلتے باہر پار کنگ میں آیا۔

”یار میں کہہ رہا ہوں ناکہ میری طبیعت ٹھیک ہے اب تو کیا ضرورت ہے ڈاکٹر کے پاس جانے کی؟ بس مجھے نہیں جانا تم مجھے گھر چھوڑ دو“، مسلسل آتے چکر اور پیٹ میں ہوتے درد کے باوجود زارون نے اپنی ضد برقرار رکھتے ایک بار پھر سے انکار کیا۔

”زیادہ بہانے مت بناؤ اور خاموشی سے اندر بیٹھو“، اُسے گاڑی کا دروازہ تھامے کھڑا دیکھ کر ارحمنے دوسری طرف آتے پہلے اُسے اندر بٹھایا اور پھر سے واپس آتے ڈرائیونگ سیٹ سنبحال لی۔

”اول درجے کے خبیث انسان ہوتم، جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ٹھیک ہوں تو کیا ضرورت پڑی ہے مجھے اُن قصائیوں کے پاس لے جانے کی“، گاڑی کا رخ گھر کی بجائے کسی اور راستے پر دیکھ کر زارون نے اس بار تھوڑا غصہ دکھاتے اُسے کوسا۔

”ضرورت ہے اور بہت زیادہ ضرورت ہے اس لیے بے شک تم مجھ پر چیخنا یا چلاو میں تمہیں چیک کرو کے ہی دم لوں گا“، اُس کے غصے پر بے حد نرمی کے ساتھ ارحمنے اپنے الفاظ پر دباو ڈالا۔

”بھاڑ میں جاؤ تم“، اُسے کسی صورت بھی مانتا نہ دیکھ بلآخر زارون نے ایک کھاجانے والی نظر اُس پر ڈالی اور مزید کچھ بھی کہے بغیر باہر گزرتے لوگوں اور گاڑیوں کو دیکھنے لگا۔

-----

”علیزے پلیز کچھ دیر کے لیے سجان کو کپڑا لو میں بس پھوپھا کی بات سن کر آتی ہوں“، اوپر آتے اُس کے کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر حنا جو اسی نیت سے اوپر آئی تھی سجان کو اُس کے حوالے کرتے خود واپس نیچے آگئی تاکہ احسان صاحب کی بات تسلی سے سن کر حاضر دماغی سے اُن کا جواب دے سکے۔ ”آجائیں“، دستک کی آواز سنتے احسان صاحب نے چشمے کے اوپر سے ہی دروازے کی جانب دیکھا۔

”حنا بیٹا آؤ آؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا“، اُسے دیکھتے ہی احسان صاحب نے ہاتھ میں کپڑی کتاب چشمے سیمت سائیڈ ٹیبل پر رکھتے اُسے سامنے صوف پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی پھوپھا کوئی خاص بات تھی؟ میرا مطلب سب خیریت ہے نا؟“، کمرے میں شاہستہ بیگم کی غیر موجودگی پر تھوڑا ہچکاتے ہوئے حنانے اُن کے بلاوے کی وجہ دریافت کی۔

”ہاں بس میں نے تم سے تمہارے ہی سلسلے میں بات کرنے کے لیے بلا یا ہے۔ دیکھو بیٹا میں تمہار بڑا ہوں اور بڑے ہونے کے ناتے میرا یہ فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں تمہاری غلطیوں اور نادانیوں پر مزید شے دینے کی بجائے تمہیں اُن کے بُرے اثرات کے متعلق آگاہ کروں“، اُس کی جھجک کو پیش نظر رکھتے احسان صاحب نے ادھر ادھر کی باتوں کی بجائے سیدھا مدعے پر آتے اپنی بات کے لیے تمہید باندھی۔

”ویسے تو اصولاً جنید اور تمہارے درمیاں جس بھی بات پہ بدمزگی ہوئی وہ تمہارا اور اُس کا ذلتی مسئلہ ہے جس میں مجھے کیا بلکہ کسی کو بھی بولنے کا کوئی حق نہیں پر چونکہ تم نے اس معاملے کو گھر سے قدم نکالتے دوسروں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا ہے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ گھر بننے میں سالہا سال گزر جاتے ہیں مگر ان کو تباہ کرنے کے لیے بس ایک لمحہ ہی کافی ہوتا اور وہ لمحہ تم جنید کو فراہم کر چکی ہو جسے بنیاد بنا کر وہ چند ہی پلوں میں تمہیں کوئی بھی فیصلہ سناسکتا ہے اس لیے پلیز شاستتے کے پچھے لگ کر یا اپنے دل میں موجود کسی بھی بد گمانی کی وجہ سے اپنا گھر خراب مت کرو۔ طلاق دے دینا یا علیحدگی اختیار کرنا مرد کے لیے بھی تکلیف دہ ہوتا مگر عورت کے لیے یہ لفظ ایک گالی بن جاتا جس کی وجہ سے اُسے سارے معاشرے میں شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ لوگ اُس کی عزت کرنا چھوڑ دیتے ہیں اور جگہ جگہ اُس کے کردار پہ فضول با تیں کر کے اُسے ذلیل کرتے۔ کیا تم چاہتی ہو کہ ایک عزت دار اور خوبصورت زندگی کو چھوڑ کر تم ایسی بد صورت زندگی کا انتخاب کرو؟“ عابدہ بیگم کی زبانی جنید کا فیصلہ سن کر احسان صاحب نے حنا کو آنے والے وقت سے آگاہ کرتے اپنی بات ادھوری چھوڑی جو طلاق لفظ پہ انکی بے یقینی سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”یہ سب آپ سے جنید نے کہا ہے؟ میرا مطلب طلاق کا؟“ ان کی بات کا جواب دینے کی بجائے حنا نے دماغ میں چلتے سوال کو زبان سے ادا کیا۔

”نہیں جنید نے.....“، اس سے پہلے کے احسان صاحب اُس کی بات کا جواب دیتے علیزے کی چیخ نے اُن کے ساتھ ساتھ حنا کو بھی اپنی جانب متوجہ کیا۔ ”علیزے کیا ہوا؟“، کمرے سے نکلتے ہی احسان صاحب کے الفاظ اُن کے منہ میں ہی رہ گئے۔

”کیا ہوا ہے؟“ اوپر سیر ھیوں پہ کھڑی علیزے کو ہکابا کاسا کھڑادیکھ کر حنا نے بھی کمرے سے نکلتے استفسار کیا اور ساتھ ہی فرش پہ بکھرے خون کو دیکھ کر اُس کے منہ سے چیخ نکلی۔

”سبحان....“ اپنے دوسال کے معصوم بیٹے کو خون میں لٹ پٹ پڑادیکھ حنا کے حواس باختہ ہوئے تو احسان صاحب نے جلدی سے ہوش میں آتے اپنے ملازم کو آواز لگاتے کپڑا لانے کا کہا اور آگے بڑھتے سبحان کو اپنے ہاتھوں میں اٹھایا جس کے سر سے نکلتے خون نے اُس کے سارے چہرے کو خون سے بھر دیا تھا۔

-----

ہسپتال کے سامنے گاڑی روکتے ارحم نے اُسے اُتر نے کا بولا جو اپنی ہٹ دھرمی قائم رکھتے سیٹ پہ جما بیٹھا تھا۔

یار مسئلہ کیا ہے تمہیں؟ جب میں نے کہہ دیا ہے کہ مجھے نہیں جانا کسی ڈاکٹر پاس تو کیوں میرے ساتھ زبردستی کر رہے ہو؟، اپنی ضد برقرار رکھتے زارون نے بے زاری سے کہا۔

”کیوں نہیں جانا؟ جاہل ہو یا عقل کام کرنا چھوڑ گئی ہے جو یہ فضول قسم کی ضد لگائے بیٹھے ہو“، ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے ارحم نے اُس کا دماغ درست کرنے کا فیصلہ کرتے تھوڑا غصہ دکھایا۔

”مجھے اس موضوع پہ کوئی بحث نہیں کرنی اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھے گھر چھوڑ دو“، اصل بات بتانے کی بجائے زارون نے اُس سے نظریں ملائے بغیر سنجدگی سے کہا۔

”میں بحث نہیں کر رہا بس تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ایک باشعور پڑھے لکھے انسان ہونے کے باوجود ایسی ضد کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ بیماری لگ جانا کوئی بڑی بات نہیں پر اُس کے معلوم ہونے پر یوں ہٹ دھرمی دکھانا اور علاج میسر ہونے کے باوجود بھی خود کو اذیت میں رکھنا نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ اپنے ساتھ جڑے ان رشتتوں کے ساتھ بھی زیادتی ہے جن کی

زندگیاں آپ کے ساتھ منسلک ہوتی، اُس کے انکار پر اپنے لفظوں میں زور دیتے ارحام نے اُسے  
قاصل کرنے کی کوشش کی۔

”اپنے ساتھ جڑے رشتہوں کو ہی تو بچا رہا ہوں اور تم کیا سمجھتے ہو میں جان بوجھ کے ایسا کر رہا  
ہوں؟“ اُس کی بات سننے زارون نے طنزیہ اپنے الفاظ کو ادھورا چھوڑا۔

”تو اور کیا سوچ سمجھ کر خود کو موت کے کنوں میں دھکیل رہے ہو؟“ سوالیہ نظرؤں سے اُس کی  
طرف دیکھتے ارحام نے اُس کے چہرے سے کچھ جانچنے کی کوشش کی۔

”ایسا ہی کچھ سمجھ لو اور ڈاکٹر کے پاس جانے کا کوئی فائدہ نہیں، سب نے ایک ہی بات کرنی کہ  
جلد از جلد کیمود شروع کروادو“، سر جھکتے زارون نے بات کو ٹالنا چاہا۔

”تو کیا مسئلہ ہے کیمود میں؟ جانتا تھوڑی تکلیف دہ ہے پر روز رو زکی اس اذیت سے تو بہتر ہے کہ  
انسان ایک ہی بار تکلیف برداشت کر لے۔“

”تکلیف کی بات نہیں ہے یا، ٹھیک ہونے کے لیے تو میں بڑی سے بڑی تکلیف بھی برداشت  
کرنے کے لیے تیار ہوں پر....“، اُس کی بات کا ٹھے اب کی بار زارون نے اپنے لہجے میں الجھن  
لیے بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا پر؟ کیا پر یشانی ہے؟ زارون جو بھی بات ہے مجھے کھل کے بتاؤ“، اُسے پر لفظ پر رکتے ارحم نے نظروں میں کشمکش لیے استفسار کیا۔

”کچھ نہیں ہے یار چلو چل کر چیک کرواتے ہیں“، اُسے خود کو کریدتا دیکھ زارون نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”نہیں، جب تک تم مجھے اصل بات نہیں بتاؤ گے میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔ بس جو بھی بات ہے بتاؤ مجھے“، اُس کی ٹال مٹول پر اُس کا بازو پکڑتے ارحم نے اُسے گاڑی سے باہر نکلنے سے روکا۔

”افف یار کچھ نہیں ہے اور کیا یہ تم شکی بیویوں کی طرح ہر وقت میری جاسوسی میں لگے رہتے ہو“، اُس کا ہاتھ ہٹاتے زارون نے اُسے آنکھیں نکالتے بات کو گھومنا چاہا۔

”شکی بیوی سمجھو یا کچھ بھی پریٹا میں بھی تمہیں یہاں سے بتائے بغیر جانے نہیں دوں گا“، اُس کی چالاکی پہ اپنی طرف سے بٹن دباتے ارحم نے تمام دروازوں کو لاک کیا۔

”بہت ہی زیادہ خبیث انسان ہو تم“، اُس کی بد تمیزی پہ دانت پیستے زارون نے اُسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”میں جو بھی ہوں اُس کو چھوڑو اور اپنی بات کرو۔ کیا چل رہا ہے تمہارے دماغ میں؟“ پھر سے اُسی بات پر آتے ارحم نے اُسے چاروں طرف سے بے بس کیا۔

”کچھ نہیں چل رہا یار، بس مجھے نہیں کروانی کیمو۔“

”کیوں نہیں کروانی؟ وجہ؟“ اُس کی بات سنتے ارحم نے سنجیدگی سے وجہ پوچھی۔

”بد صورت کر دیتی ہے وہ انسان کو۔ تمہیں پتا تو ہے اُس کے کتنے زیادہ نقصانات ہیں“، کافی دونوں سے اپنے دل میں چھپی بات کو اُس کے سامنے بیان کرتے زارون نے اپنی نظریں اُس سے ملانے سے مکمل غرض بر تا۔

”کیا مطلب؟ تم بد صورت ہونے کے ڈر سے کیمو کروانا نہیں چاہتے؟“ اُس کے عجیب سے جواز پر ارحم نے اُس کے الفاظ دہراتے تصدیق چاہی۔

”میں اپنی بد صورتی سے نہیں بلکہ اُس کی وجہ سے کسی کے معصوم دل میں ہونے والی اذیت کے ڈر سے انکار کر رہا ہوں۔ تم جانتے ہونا کہ کیمو کی وجہ سے انسان کے سر کے سارے بال جھٹر جاتے اس کے علاوہ بالوں میں سفیدی آجائی تو میں نہیں چاہتا کہ یہ سب چیزیں نور کو تکلیف دیں۔ یار وہ تو مجھے کلین شیو کرنے نہیں دیتی تو پھر یہ سب....“، اُس کے الفاظ کو درست کرتے زارون نے بے بسی سے اُسے اپنی الحصہ سے آگاہ کیا۔

”اُفف تو بہ ہے پتا نہیں کیا کیا سوچتے رہتے ہو تم اور بالوں کے نہ ہونے سے اُس کی تکلیف نظر آرہی تھیں پر تمہارے نہ ہونے سے اُس پہ کیا بیتے گی؟ اُس کا کچھ اندازہ ہے؟“ اُس کی وضاحت پر ارحم نے اپنا سر پکڑتے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”اگر وہ تم سے محبت کرتی ہے نا تو تمہارے یوں بد صورت ہونے پہ بھی تھیں نہیں چھوڑے گی اور تمہاری بد صورتی اگر اسے آنے والے وقت میں لوگوں کا محتاج ہونے سے بچا رہی ہے تو پلیز اللہ کا واسطہ ہے مجنوں بننے کی بجائے انسان بن کر اپنے فیصلہ پہ نظر ثانی کرو“، اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ارحم نے اُسے سوچ میں ڈالا۔

”تم نے سوچا ہے کہ اللہ نہ کرے اگر تمہاری اس بیو قوفی کی وجہ سے تھیں کچھ ہو گیا تو نور کا کیا ہو گا؟ جسے تم آج زراسے تکلیف دینا نہیں چاہتے وہ لوگوں کے رحم و کرم پہ اُن کی کتنی کتنی باتیں سنے گی؟ ایک ایک خوشی کو ترستے وہ کتنی اذیت برداشت کرے گی؟ یقیناً نہیں سوچا ہو گا کیوں کہ اگر سوچا ہوتا تو تمہارا رد عمل اُس کے حق میں ہوتا“، خود ہی سوال کرتے ارحم نے ایک گھری سانس لیتے جواب دیا۔ ”پاگل مت بنوا بھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے“، اُسے ملال سے نظریں جھکائے خاموش بیٹھا دیکھا اب کی بار ارحم نے نرمی کے ساتھ اُسے قائل کیا۔

”ہم ٹھیک ہے میں اب ٹھیک سے اپنا علاج کرواؤ گا“، اُس کی بات سن کر شرمندگی محسوس کرتے زارون نے آہستہ آواز میں حامی بھری۔

”شکر ہے کچھ عقل آئی، چلواب اندر چلتے ہیں“، اُس کی رضامندی پہ ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کرتے ارجمنے درواز کو ان لاک کیا اور اُسے ساتھ لیے ہسپتال کی عمارت کے اندر ونی حصے کی جانب بڑھ گیا۔

”امی کیا آپ ہر وقت کاموں میں لگی رہتی ہیں، چھوڑیں یہ سب اور ادھر انہیں مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے“، عابدہ بیگم کو لاوچ میں موجود نسرین سے صفائی کرواتا دیکھ مامہم نے ان ہاتھ پکڑتے انہیں اپنے کمرے میں لے جا کر دم لیا۔

”کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا؟“ اُسے دروازہ بند کر کے اپنا قریب آتا دیکھ عابدہ بیگم نے استفسار کیا۔

”جی سب خیریت ہے۔ آپ بیٹھیں“، ان کے چہرے پہ فکر دیکھ کے ماہم نے تسلی دیتے اپنا مو باکل اٹھایا۔

”یہ دیکھیں کیسی ہے؟“ ایک لڑکی کی تصویر نکال کر ان کے سامنے کرتے ماہم نے رائے طلب کی۔

”اچھی ہے ماشاء اللہ“، ایک نظر تصویر پہ ڈالتے عابدہ بیگم نے نظروں میں ستائش لیے تعریف کی۔

”یہ میری ایک دوست کی کزن ہے۔ پڑھی لکھی، سمجھی ہوئی سمجھدار لڑکی ہے۔ گھر بھی اچھا ہے صرف دو بہنیں ہیں اور ایک بھائی، یہ سب سے چھوٹی ہے باقی دونوں کی شادی ہو چکی ہے اور اُس کے والدین اس کے لیے بھی لڑکا دیکھ رہے، میری دوست نے مجھ سے اس سلسلے میں بات کی تو میرے ذہن میں فٹ سے معاذ کا خیال آیا“، انہیں ساری تفصیل بتاتے ماہم نے اپنے اردے سے آگاہ کیا۔

”معاذ کا؟ میرا مطلب تمہیں اُس کا پتا تو ہے وہ کہاں ابھی شادی کے لیے حامی بھرتا ہے“، اُس کی بات سنتے عابدہ بیگم نے ماہی سی سے کہا۔

”نہیں بھرتا تواب بھر لے گا حامی، بس آپ لڑکی پسند کریں اور معاذ کی رضامندی کیسے حاصل کرنی ہے وہ مجھ پہ چھوڑ دیں“، ان کے خدشے پہ تسلی دیتے ماہم نے ان کے دماغ کو ایک نئی راہ دکھانی۔

”ٹھیک ہے اگر وہ مان جائے تو لڑکی تو پہلے سے ہی میری نظر میں ہے،“ اُس کی بات سننے عابدہ بیگم نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

”کیا مطلب؟ آپ پہلے سے لڑکی پسند کیے بیٹھی ہیں؟“ صدمے کے زیر اثر ماہم نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”ہاں لڑکی تو میں نے زارون کے لیے پسند کی تھی وہ بھی آج سے کافی سال پہلے اب جبکہ زارون کی شادی ایسے اچانک ہو گئی تو میں سوچ رہی ہوں کہ معاذ کے لیے اُس کا ہاتھ مانگ لوں،“ موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے عابدہ بیگم نے اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”کس کی بات کر رہی ہیں آپ؟ علیزے کی؟“ ان کے اشارے پر اندازہ لگاتے ماہم نے تصدیق چاہی۔

”ہاں، علیزے کا، ہی سوچ رہی تھی ایک تو گھر کی بچی ہے اور مجھے پسند بھی...“

”اور اگرامی نے انکار کر دیا تو؟ میرا مطلب وہ تو پہلے ہی آپ کے اتنی خلاف ہیں اس صورت میں بیٹی کا رشتہ دینا مجھے کچھ ناممکن سالگلتا ہے،“ اُن کی بات کا ٹھٹھے ماہم نے اپنا خدشہ بیان کیا۔

”انکار کر دیں گی تو پھر اور بہت لڑکیاں ہے تم اس بات کی فکر نہ کرو اور کسی طرح معاذ کو راضی کروتا کہ ہم اپنی زندگی میں اُس کے فرض سے بھی ادائیگی پالیں،“ اُس کے ذمے ایک اہم کام

لگاتے عابدہ بیگم نے تاکید کی اور نسرین کی آواز پر پھر اس موضوع پر بات کرنے کا کہتے باہر کی جانب بڑھیں۔

---

ڈاکٹر کوچیک کروانے کے بعد وہ دونوں باہر آئے تو زارون کی نظر اپنے سے کچھ فاصلہ پر موجود کاؤنٹر پر کھڑے احسان صاحب پر پڑی۔

”یہ ماموں یہاں کیا کر رہے ہیں“، خود کلامی کرتے زارون نے ارحم کو کچھ بھی بتائے بغیر قدم ان کی جانب بڑھائے۔

”کہاں جا رہے ہو یا رہے کچھ بتاؤ تو سہی“، اُس کے یوں بناء کچھ کہے دوسری جانب تیز قدموں سے بڑھنے پر ارحم نے اُس کے پیچھے آتے سوال کیا۔

”ماموں آپ یہاں کیا کر رہے ہیں اور یہ آپ کے کپڑوں پر خون کیوں لگا ہے؟“ ارحم کو جواب دینے کی بجائے زارون نے کاؤنٹر پر پہنچتے احسان صاحب کو اپنی جانب متوجہ کیا۔

”زارون سبحان کی حالت بہت خراب ہے اور یہ ہسپتال والے پچھلے دس منٹ سے ہمیں یہ کہہ کر طال رہے ہیں کہ ان کے پاس ایسہ جنسی کیس کے لیے کوئی ڈاکٹر موجود نہیں ہے“، زارون کو

---

دیکھتے ہی احسان صاحب کی جان میں جان آئی تو انہوں نے اُسے سجان کے سیڑھیوں سے گرنے اور سرپہ چوٹ لگنے کے متعلق سگاہ کیا۔

”انکل آپ پریشان نہ ہوں میں ابھی یہاں کے سرجن سے بات کرتا ہوں وہ میرے ابو کے دوست ہیں“، اُن کی بات سنتے ہی زارون سے پہلے ارحم نے ذمہ داری اٹھاتے اُنہیں تسلی دی اور کاؤنٹرپہ موجود لڑکے سے ڈاکٹر آصف کی موجودگی کے متعلق پوچھتے جلدی سے اُن کے کمرے کی جانب بڑھا۔

”زارون پلیز جو کرنا ہے جلدی کرو سجان کی حالت بہت خراب ہے اُس کے سر سے بہت زیادہ خون بہہ چکا ہے“، ارحم کے جاتے ہی احسان صاحب نے اُس سے درخواست کی جو اُنہیں تسلی دیتے سجان کے پاس جانے کا بولتے خود بھی ارحم کے پیچھے بھاگا جو اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی ڈاکٹر کو ساتھ لیے کمرے سے باہر آچکا تھا۔

”کہاں ہے سجان؟“، زارون کو اپنے قریب آتا دیکھ ارحم نے استفسار کیا تو اُس نے اُنہیں آنے کا اشارہ کرتے احسان صاحب کے پیچھے ہی ایک ویدر کی جانب قدم بڑھائے جہاں شائستہ بیگم کی غیر موجودگی کی وجہ سے حنا کیلی ہی سجان کو گود میں لیے اُس کے سرپہ کپڑا رکھے بدحواسی بیٹھی۔

”مجھے دیں“، سبھاں کو اُس کے قریب آتے ہی زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اُسے حنا کی گود سے لیا اور ڈاکٹر کے اشارہ کرنے پہ اُسے لے کر ایک کمرے کی جانب بڑھا جہاں کچھ ضروری ٹریمنٹ دیتے ڈاکٹر نے خون روکا اور پھر زخم کا جائزہ لیتے اسٹپنگ لگائے۔

”سری ہوش میں کیوں نہیں آ رہا؟“ ڈاکٹر اپنے کام سے فارغ ہوا تو زارون نے سبھاں کو ابھی تک بے ہوش دیکھ فکر مندی ظاہر کی۔

”گھبرا نے کی کوئی بات نہیں، بس خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے کمزوری ہے اور آپ اللہ کا شکر ادا کریں کہ چوت سر کے پچھلے حصے میں نہیں آئی“، زارون کی بات سنتے ڈاکٹر نے اُسے تسلی دی اور اپنے مو باسل سے ایک اور ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرنے لگاتا کہ اُسے کسی نرس کو سمجھنے کا کہہ سکے۔

”فکر نہ کرو اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، اُسے حوصلہ رکھنے کا کہتے ارحمنے ڈاکٹر کو مصروف دیکھ کر باہر کا رخ کیا تاکہ احسان صاحب اور حنا کو سبھاں کے ٹھیک ہونے کے متعلق بتا سکے۔

”کیسا ہے میرا بیٹا؟ وہ ٹھیک ہے نا؟“ ارحمنے سے نکلتا دیکھ کر حنا نے احسان صاحب سے پہلے اُس کی جانب آتے استفسار کیا۔

”جی اللہ کا شکر ہے ٹھیک ہے اب، بس ابھی بے ہوش ہے پر ڈاکٹر کہہ رہا ہے کہ کچھ دیر میں ہوش آجائے گا اس لیے آپ پریشان نہ ہوں“، حنا کی رونے کی وجہ سے سرخ آنکھوں کو دیکھ ارحمن ساری بات بتاتے اُسے تسلی دی۔

”شکر ہے اللہ کا جس نے ہمارے بچے کو کسی بڑے خطرے سے بچالیا ورنہ میری تو سبحان کی حالت دیکھ کر جان ہی نکل گئی تھی“، اُس کے ٹھیک ہونے کے متعلق سنتہ ہی احسان صاحب نے شکر ادا کیا۔

”جی، ڈاکٹر بتار ہاتھا کہ گرنے سے تو شاید کوئی زیادہ چوت نہیں آئی بس پیشانی پہ کوئی نوکیلی چیز لگی ہے“، ارحم نے ڈاکٹر کے بتائے گے الفاظ ان کی گوش گزار کرتے معاملہ جانے کی کوشش کی۔

”ہاں، بس علیزے کی بیو قوفی کی وجہ سبحان کو اتنی تکلیف اٹھانی پڑی۔ پہلے تو اُسے اکیلا چھوڑ کے واش روم چلی گئی پھر اُسے سیڑھیاں اُترتا دیکھ جلدی سے پکڑنے کے لیے پیچھے بھاگی تو سبحان بھی تیزی میں آخری چار سڑھیوں سے نیچے گر گیا اور سیڑھی کا کونہ لگا اُس کی پیشانی پہ“، علیزے کی زبانی سنی ہوئی بات تفصیل سے ارحم کو بتاتے احسان صاحب نے بیٹی کی لاپرواںی پہ خفگی کا اظہار کیا۔ ”اچھا خیر ہے بچوں کو چوٹیں لگتی رہتی بس آپ یہ شکر ادا کریں کہ اللہ پاک نے کسی بڑی

مصیبت سے بچالیا، ان کو شرمندہ دیکھ کر ارحم نے تسلی دی اور حنای کی جانب متوجہ ہوا جو اُس سے سمجھان کو دیکھنے کا پوچھ رہی تھی۔

”ابھی تو ڈاکٹر اندر ہے اسیلے آپ کچھ دیر میں مل لیجیے گا اور فکر نہ کریں زارون سمجھان کے پاس ہی ہے، اُسے مطمئن کرتے ارحم نے موبائل پہ آنے والی ہاشم صاحب کی کال پہ ان سے معتدرت کی اور تھوڑا سائیڈ پہ جا کر ان سے بات کرنے لگا۔

”شکر ہے زارون اور ارحم مجھے وقت پہ مل گئے ورنہ جیسے ڈاکٹر لاپرواں دیکھا رہے تھے خدا نخواستہ کوئی بڑا مسئلہ بن سکتا تھا، ارحم کے جاتے ہی احسان صاحب نے پھر سے اللہ کا شکر ادا کرتے حنا سے کہا۔

”مل گئے مطلب؟ آپ نے انہیں کال کر کے نہیں بلا یا؟“ حنا جو زارون کی وہاں موجودگی پہ ابھی تک کشمکش میں تھی خود کو سنبھالتے پوچھنے لگی۔

”نہیں، مجھے کہاں ہوش تھا کہ میں کسی کو کال کرتا یہ تو پتا نہیں کیسے ایک فرشتے کی صورت میرے قریب آئے اور مجھ سے ہسپتال میں موجودگی کی وجہ پوچھنے لگے، تب ہی میں نے انہیں سمجھان کا بتایا اور انہی کی کوشش سے ڈاکٹر فوراً سے چیک کرنے آگیا،“ مختصر الفاظ میں ساری بات تفصیل سے بتاتے احسان صاحب نے حنا کو مزید شرمندگی میں ڈالا۔

”میں علیزے کو بتا دوں بار بار کال کر رہی ہے“، حنا کی خاموشی پر احسان صاحب نے اُسے بتاتے نمبر ڈائل کیا اور دوسری طرف سبحان کے ٹھیک ہونے کی اطلاع دینے لگے۔

---

کچھ ہی دیر میں ڈاکٹر نے نرس کو کچھ ہدایات دیتے باہر کا رخ کیا تو زارون نے کمرے سے نکلتے حنا کو اندر آنے کا بولا تاکہ وہ ایک نظر سبحان کو دیکھ سکے۔

”پلیز بھا بھی مت روں میں دیکھیں اب تو سبحان بالکل ٹھیک ہے“، اندر داخل ہوتے ہی حنا نے اپنے بیٹے کو دیکھنے کی بجائے اُس کا ہاتھ تھامتے آنسو بھائے تو زارون نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے حوصلہ دیا جو شرمندگی کے زیر اثر کوئی بھی بات کرنے سے قاصر تھی۔

”پلیز بھا بھی حوصلہ کریں، آپ ایسا کریں گی تو سبحان کو کون سن بھالے گا“، اُسے سرجھ کائے مسلسل آنسو بھا تادیکھ زارون نے ایک بار پھر سے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”زارون۔۔۔ پلیز۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔“ دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑتے اٹکتے ہوئے حنا نے شکستہ لمحے میں اپنے گزشتہ رویے پر مذدرت کی۔

---

”کیسی باتیں کر رہیں ہیں آپ؟ پلیز یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے“، نرس کو اپنی جانب متوجہ پا کر زارون نے جلدی سے اُس کے ہاتھ پہنچے کیے۔

”یہی وقت ہے، میں نے تمہیں سب کے سامنے ذلیل کیا تھا اور اب تمہارا حق بتتا ہے کہ میں تم سے معدومت بھی سب کے سامنے ہی کروں۔ پتا نہیں کیوں میں اپنی حسد اور انامیں اتنی پاگل ہو گئی تھی کہ مجھے اپنے رشتؤں کی تکلیف اُن کی ناراضگی سمجھ ہی نہیں آئی“، زارون کے منع کرنے کے باوجود بھی ہنا نے خاموشی اختیار کرنے کی بجائے احساس ندامت سے اپنی پچھلی تمام غلطیوں کو دھرا یا۔

”بھا بھی پلیز میں کہہ رہا ہوں ناکہ ہم یہ باتیں گھر جا کر کر لیں گے تو پھر کیوں آپ انہیں دھرا ہی ہیں،“ اس کی نظروں میں شرمندگی دیکھ زارون نے بات کوٹانے کی کوشش کی۔

”تم چاہتے تو مجھ سے بد لے سکتے تھے نا؟ تم چاہتے تو میرے بیٹے کو یو نہی سسکتے ہوئے چھوڑ دیتے پر نہیں تم نے اعلیٰ طرفی دیکھاتے میری مدد کی، اس عورت کی جس نے تمہیں بچا دیکھانے اور تکلیف پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تم نے میرے بیٹے کی زندگی بچائی اور اُس کے لیے میسح اثابت ہوئے۔ میں نے تمہارے ساتھ دنیا کی دولت کی خاطر برائی کرتے بلند ہونا چاہا پر تم نے آج اُس برائی کے بد لے میری اولاد کے ساتھ بھلائی کرتے خود کو اتنا بلند کر لیا ہے کہ میں چاہ کر

بھی کبھی تمہاری برابری نہیں کر سکتی،“،زارون کے کہنے کے باوجود بھی حنانے خاموش رہنے کی بجائے پھر اُسی موضوع کو چھیڑا۔

”تم بہت اچھے ہو زارون، میں اس قابل تو نہیں ہوں پر پھر بھی تم سے اپنے رویے کی معدرت کرتی ہوں، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا،“،پھر سے دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑتے حنانے ایک بار پھر سے اُس سے معدرت کی۔

”بھا بھی کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ اور آپ میری بڑی بہنوں کی طرح ہیں، اگر آپ نے مجھے کچھ بول دیا یا کہہ دیا تو وہ آپ کا حق تھا، اس میں معافی مانگنے یا خود کو شرمندگی میں ڈالنے کی کوئی ضرورت نہیں“، اُن کے ہاتھوں کو تھامتے زارون نے اپنادل صاف کرتے نرمی کے ساتھ اُسے سمجھایا جو سجان کی تکلیف دیکھ کے ایک دم سے خوف زدہ ہو چکی تھی۔

”بول دینے کا حق ہوتا پر دل دکھانے کا نہیں، میں نے تمہارا دل دکھایا تمہاری بیماری کو تماشہ بناتے سب کے سامنے پیش کیا اور یہ سب کرتے ہوئے ایک بار بھی نہیں سوچا کہ میری اولاد بھی ہے جسے اللہ پاک نے شادی کے تین سال بعد مجھے ترستے ہوئے عطا کیا۔ میں بھول چکی تھی کہ ہر عمل کا مکافات ہوتا جو کسی کو دی گئی تکلیف کہ بد لے اُتنی ہی تکلیف اپنی ذات پہ برداشت کرتے چکانا

پڑتا۔ ہاں، میں بھول گئی تھی میرے حصے کے اعمال کا بوجھ میرے بیٹھ پڑ رہا، دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپاتے ہنانے اپنے لفظوں پہ ندامت کا ظہار کیا۔

”اللّد نہ کرے کہ سبحان کو کچھ ہوا اور کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ؟ مکافات عمل انسان کو اپنے کیے کا خود ہی بھرن پڑتا ہے۔ اللّد پاک انصاف پسند ہے اور وہ کیسے کسی انسان کے اعمال کی تکلیف اُس کے ساتھ جڑے رشتؤں کو دے کر نا انصافی کر سکتا ہے۔ سبحان کو چوتھ صرف بداحتیاطی کی وجہ سے گئی اس میں آپ کا یا آپ کے اعمال کا کوئی عمل دخل نہیں، اس لیے پلیز دوبارہ ایسی بات مت کیجیے گا،“، ہنا کی زبان سے مکافات کا سنتے زارون نے ایک نظر اُس معصوم پہ ڈالی اور سختی سے اُسے ڈپٹتے دوبارہ ایسے الفاظ ادا کرنے سے منع کیا۔

”ٹھیک ہے میں دوبارہ ایسی کوئی بات نہیں کروں گی پر پلیز تم مجھے معاف کر دو،“، اُس کی سختی پہ بُرا ماننے کی بجائے ہنانے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کرتے درخواست کی۔

”معاف؟ ٹھیک ہے معاف میں آپ کو تکرلوں گا جب آپ گھر واپس آ جائیں گی اور اپنے اور جنید بھائی کے نجی سب ٹھیک کر لیں گی،“، کچھ سوچتے ہوئے زارون نے معافی کے لیے اپنی شرط بتائی تو ہنانے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اُس کی بات پہ اثبات میں سر ہلایا۔

”بس سجان کو ڈسچارج کر دیں تو ہم اسے لے کر سیدھا اپنے ہی گھر جائیں گے“، زارون کی شرط مناتے ہنانے کہا اور اُس کے اشارہ کرنے پہ اپنے بیٹے کی جانب متوجہ ہوئی جو ابھی تک نیم بے ہوشی کی حالت میں تھا۔

---

”ہاں بھی ہو گئی ساری تیاری مکمل؟“، حبہ اور سارہ بیگم کو سامان پیک کرتا دیکھ آفندی صاحب نے استفسار کیا۔

”جی بس ہو گئی، باقی ساری چیزیں تو پیک کر لیں ہیں بس کپڑے وغیرہ رہ گئے ہیں“، اُن کی بات سنتے سارہ بیگم نے انہیں آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے بس جو جو ضرورت کی چیزیں ہیں بس وہی پیک کر دیے گا، باقی ساری چیزیں وہاں گھر میں موجود ہوں گی“، انہیں ایک کے بعد ایک کارٹن تیار کرتا دیکھ آفندی صاحب نے تاکید کی۔

”جی ابو بس ضرورت کی چیزیں ہی کی ہیں آپ پریشان نہ ہوں“، ایک آخری کارٹن کو بند کر کے ٹیپ لگاتے حبہ نے انہیں تسلی دی۔

---

”ہاں بس خیال رکھنا ورنہ تمہیں اپنی امی کا توپتا ہی ہے ان کا بس چلے تو پوar گھر اٹھا کر امریکہ شفت کر لیں“، بات کو مذاق میں ڈالتے انہوں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

”اب اتنی بھی پاگل نہیں ہوں میں جو پورا گھر اٹھا کر امریکہ شفت کر لوں، بس ضرورت کی کچھ چیزیں رکھی ہیں وہ بھی اگر آپ ہمیں اُدھر سے دلا دیں گے تو ہم یہی رہنے دیتے ہیں“، اُن کی بات پہ تیوری چڑھاتے سارہ بیگم نے اپنی کمرپہ ہاتھ رکھتے لاپرواں سے کہا۔

”نہیں اب اتنی بھی بات نہیں ہے ضرورت کی چیزیں تو ساتھ لے کے ہی جائیں گے نا“، بات بدلتے آفندی صاحب نے سوالیہ نظرؤں سے حبہ کو دیکھا جس نے بس اُن کی نوک جھوک پہ مسکرانے پر اکتفا کیا۔

”ویسے ابوآپ بھی ہمارے ساتھ چلتے تو کتنا اچھا ہوتا“، بات لڑائی تک پہنچتی دیکھ حبہ نے سارہ بیگم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی افسردگی کا اظہار کیا۔

”ہاں چاہتا تو میں بھی یہی تھا مگر بنس سمسینے میں مجھے ٹائم لگے گا اور تم لوگوں کا اتنی دیر یہاں رہنا مناسب نہیں، احتشام کی بچوں کو حاصل کرنے کی رگ ایک بار پھر سے پھڑک رہی ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ جتنا جلدی ممکن ہو سکتا ہے تم لوگ یہاں سے امریکہ شفت ہو جاؤ“، آفندی صاحب نے دبے الفاظ میں اتنی جلدی یہ فیصلہ لینے کی وجہ اُن دونوں کو بتائی۔

”کیا مطلب؟ احتشام تو بچوں کو حبہ کے حوالے کر چکا ہے نا؟ میرا مطلب اُس نے قانونی طور بچوں کے تمام حقوق حبہ کے نام لکھ دیے تھے“، آنندی صاحب کی زبانی احتشام کا نام سنتے سارہ بیگم نے ایک دم سے حیران ہوتے سوال کیا۔

”ہاں قانونی طور پر تو سب حق حبہ کے نام ہے پر پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ وہ حق شکنی ظاہرنہ کر دے اس لیے بس تم لوگ میری فکر چھوڑوا اور اپنی تیاری مکمل کروتا کہ میں ایک دودن میں تم لوگوں کی سیٹ کنفرم کرواتے اس فکر سے آزادی پاسکوں“، ان کے سامنے اپنی پریشانی بیان کرتے آنندی صاحب نے احتشام کے آفس آکر انہیں دھمکیاں دینے والی بات کو گول کیا۔

”پھر بھی آپ ہمارے ساتھ ہی چلتے تو اچھا تھا ایسے تو وہاں جا کر بھی ہمیں آپ کی ہی فکر لگی رہے گی“، سارہ بیگم نے ساری بات سننے کے بعد ایک بار پھر سے اصرار کیا۔

”میری فکر مت کرو، میں یہاں سے سارے کام ختم کر کے آجائوں گا اور ہاں حبہ بیٹا تم بچوں کے اور اپنے پاسپورٹ مجھے لادو میں نے صحیح تم لوگوں کی سیٹس کنفرم کروانی ہے“، انہیں جواب دیتے آنندی صاحب نے حبہ کی طرف متوجہ ہوتے کہا جو ان کی باتیں سن کر کسی گھری سوچ میں گم تھی۔

”ج... جی لاتی ہوں“، اپنے نام کی پکار پر ہوش میں آتے اُس نے اثبات میں سر ہلا یا اور کمرے سے پاسپورٹ اور دوسری کاغذات وغیرہ لینے چلی گئی تاکہ انہیں آندھی صاحب کے حوالے کر سکے۔

---

سبحان کی طبیعت کچھ دیر میں سنبھلی تو ڈاکٹر نے میدیسین کے ساتھ کچھ ضروری احتیاطیں بتاتے اُسے ڈسچارج کر دیا۔

”لاو بیٹا مجھے پکڑاؤ“، احسان صاحب نے حنا کے آگے ہاتھ پھیلاتے سبحان کو اُس سے لینا چاہا۔  
”نهیں ماموں میں پکڑ لوں گی اور اب میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی“، سبحان کو انہیں پکڑنے سے انکار کرتے حنانے وجہ بتائی۔

”کیا مطلب؟ میرے ساتھ نہیں جاؤ گی تو کہاں جاؤ گی پھر؟“، اُس کے انکار کو اُس کی ناراضی سمجھتے احسان صاحب نے فکر مندی سے پوچھا۔

”بھا بھی میرے ساتھ گھر جائیں گی، آپ پریشان نہ ہوں“، سبحان کی میدیسین لے کر ان کی قریب آتے زارون نے احسان صاحب کی بات سننے بتایا۔

”گھر؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ جاؤ بیٹا اللہ پاک تمہیں خوش رکھے“، اُس کے سرپہ ہاتھ رکھتے احسان صاحب نے اُس اچانک آنے والی تبدیلی پر اپنی حیرت چھپاتے دعا دی۔

”آمین اور پھوپھا آپ پلیز علیزے کو بتا دیجیے گا کہ میں اُس سے ناراض نہیں ہوں۔ سجان کی قسمت میں یہ چوت لکھی تھی اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں ہے“، گھر میں علیزے کی فکر اور بار بار آنے والی کالزپہ حنا نے نرمی کے ساتھ احسان صاحب کو اُسے اپنی طرف سے مطمئن رہنے کا بولا۔

”ہاں میں اُسے سمجھادوں گا تم فکرنا کرو۔ وہ بس سجان کی حالت دیکھ ٹھوڑا پریشان ہو گئی تھی“، اُس کی تاکید پر تسلی دیتے احسان صاحب نے ارحم کاشکریہ ادا کیا جس کی وجہ سے ڈاکٹرنے اُن کی فوراً سے بات سنتے سجان کا علاج شروع کر دیا۔

”پلیز انکل اس میں شکریہ کی کیا بات ہے یہ تو میرا فرض تھا“، اُن سے مصافحہ کرتے ارحم نے عاجزی دکھائی اور اُن کے ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھا۔

”ارحم آجاو میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا“، احسان صاحب کے جاتے ہی زارون نے اُس کے پاس گاڑی نہ ہونے کی وجہ سے آفر کی۔

”نہیں، میں نے ڈرائیور کو کال کی ہے وہ مجھے لے جائے گا تم بس بھا بھی اور سبحان کو لے کر سیدھا گھر جاؤ اور ہاں گاڑی تھوڑی احتیاط سے چلانا“، ڈاکٹر کی ہدایات سننے کے بعد ارحام نے اُسے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے احتیاط سے چلاوں گا اور تم بھی ڈرائیور کے آتے ہی مجھے بتانا“، اُس کو یوں وہاں اکیلے چھوڑ کر جانے پر فکر ظاہر کرتے زارون نے اُسے کہا جو حنا کی وجہ سے اُسے کوئی ٹکسا ساجواب دینے کی بجائے بس اثبات میں سر ہلا گیا۔ ”ہونہہ میرا بڑا کوئی لڑکی ہوں جو ڈرائیور کے آتے ہی اس کھڑوس کو بتاؤ“، زارون نے گاڑی اسٹارٹ کرتے بیرونی گیٹ سے باہر نکالی تو ارحام نے اُس کی ہدایت پر خود کلامی کی اور جیب سے موبائل نکالتے ڈرائیور کا نمبر ڈائل کرنے لگا جو بیس منٹ پہلے کی گئی کال پر بھی ابھی تک اُسے لینے نہیں پہنچا تھا۔

”نور یہ زارون کہاں ہے؟ دوپھر سے کہیں نظر نہیں آیا“، رات کے کھانے کے لیے ٹپبل پہ برتن رکھتے ماہم نے اُس سے پوچھا جو پہلے سے ہی اُس کے اتنی دیر باہر رہنے پر تپی ہوئی تھی۔

”مجھے تو احمد بھائی کی طرف جانے کا کہہ کر گئے تھے پر لگتا کوئی پرانی سہیلی مل گئی جو دوپھر سے نہ گھر کا ہوش ہے اور نہ ہی میری کوئی پروا،“ پانی کا جگ ٹیبل پر رکھتے نور نے دانت پسیتے اپنی بات کمل کی۔

”اُفف اتنا غصہ، لگ رہا ہے میں نے غلط وقت پر غلط سوال پوچھ لیا ہے،“ اُس کے غصے سے بھرے چہرے کو دیکھتے ماہم نے نظر وہ میں شرارت لیے اندازہ لگایا۔

”مسئلہ سوال میں نہیں بلکہ آپ کے بھائی میں ہے جو گھر سے نکلتے ہی اپنی یادداشت کھو بیٹھتے ہیں، حد ہے انسان ایک میسح کر کے ہی بتا دیتا ہے میں یہاں ہوں اور اتنی دیر میں واپس آؤں گا پر نہیں، یہاں کسی کی فکر ہوتب نا،“ غصے کے مارے منہ میں آئے الفاظ کو ایک ہی سانس میں ادا کرتے نور نے ماہم کو مسکرانے پر مجبور کیا۔

”اُفف یار، کہیں مصروف ہو گا تم کیوں اپنا خون جلا رہی ہو، خود ہی آجائے گا،“ جگ سے پانی نکال کر گلاس میں ڈالتے ماہم نے اُس کی جانب بڑھایا۔

”خون میں نہیں بلکہ آپ کا بھائی میرا جلاتا ہے وہ بھی ہر وقت، حد ہے اتنا وقت شادی کے بعد مجھے نہیں دیا جتنا اپنے اُس بد تیز دوست کو دے چکے ہیں،“ اُس کی بات کا جواب دیتے نور نے ایک ہی سانس میں گلاس میں موجود پانی ختم کیا۔

”اُفف اتنے شکوئے؟ بس آج آئینے دو اسے گھر ایسے کان کھپچوں گی کہ ساری زندگی یاد رکھ گا،“ اُس کی آنکھوں میں نمی دیکھ ماہم نے زارون کی کلاس لینے کا کہتے نور کو تسلی دی اور عابدہ بیگم کی آواز پر اُن کی جانب متوجہ ہوئی جو انہیں جلدی کھانے لگانے کا کہہ رہی تھیں۔

---

”حنا کہاں ہے؟ وہ آپ کے ساتھ نہیں آئی کیا؟“ شائستہ بیگم جو اُن کے ہی انتظار میں لان میں ہی ٹہل رہی تھیں احسان صاحب کو اکیلا گاڑی سے اُترتے دیکھ کر پوچھنے لگیں۔

”نہیں وہ نہیں آئی“ دروازہ بند کرتے احسان صاحب نے مختصر سا جواب دیتے اندر کا رخ کیا۔

”کیا مطلب نہیں آئی؟ وہ یہاں نہیں آئی تو پھر کہاں گئی ہے؟“ اُن کے پیچھے ہی اندر داخل ہوتے شائستہ بیگم نے نظر وہ میں حیرت لیے سوال کیا۔

”اپنے گھر چلی گئی ہے۔“

”کون سے گھر؟ بھائی صاحب اور طاہرہ واپس آگئے ہیں کیا؟“ اُن کی بات سنتے ہی شائستہ بیگم نے پھر سے پوچھا۔

”نہیں، وہ زارون کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی گئی ہے“، اپنی بات کی وضاحت کرتے احسان صاحب نے ساتھ ہی زارون کا حوالہ دیتا کہ شائستہ بیگم کو اچھے سے سمجھ آجائے کہ حنا کس گھر گئی ہے۔

”کیا مطلب وہ اپنے سرال چلی گئی؟ ایسے کیسے وہ اتنی آسانی سے وہاں جا سکتی ہے؟ اور وہ بھی زارون کے ساتھ جس کی وجہ سے جنید نے اُس پر ہاتھ اٹھایا“، احسان صاحب کی بات سننے شائستہ بیگم نے صدمے کے زیر اثر ایک ساتھ کئی سوال کیے۔

”پہلی بات کہ وہ اُس کے شوہر کا گھر ہے جہاں جانے کے لیے اُسے کسی کی اجازت یا وجہ کی ضرورت نہیں اور دوسری بات کہ تم شکر ادا کرو کے اُس کے بیٹے کو زیادہ چوت نہیں آئی ورنہ جیسے اُس نے ایک ہی پل میں اپنے گھروالوں کے لیے رنگ بد لے ناہما�ے معاملے میں بھی اُس نے کسی صورت کوئی رعایت نہیں بر تھی“، حنا کے پل پل بدلتے رویوں وک دیکھتے احسان صاحب نے شائستہ بیگم کو خبردار کرتے مزید کوئی بات کرنے سے روکا۔

”ارے بھئی ایسے کیسے وہ ہمارے ساتھ کوئی بد کلامی کرتی، میرا مطلب ہم نے دو دن تک اُس کی اور اُس کے بیٹے کی خدمت کی اور اب زراسی چوت کیا آئی اُس نے ہم سے آنکھیں ہی پھیر لیں۔ تو بہ توبہ اللہ بچائے ایسی چالاک اور شاطر عورتوں سے جو ہمدردی سیمٹنے کا کوئی بھی موقع اپنے

ساتھ جانے نہیں دیتیں، ”احسان صاحب کی بات پہ کانوں کو ہاتھ لگاتے شائستہ بیگم نے حنا کے اس طرح انہیں بتائے بغیر سرال جانے پر اچھی خاصی خفگی کا اظہار کیا۔

”اچھا بس آپ دوسروں کے معاملوں کو چھوڑیں اور زراپنے میٹے پہ دھیان دیں جو آئے دن اپنی نئی نئی کرتوں سے مجھے پریشان کیے ہوئے ہے، ”اُن کے واویلا کرنے پہ احسان صاحب نے تیوری چڑھاتے بات مکمل کی اور کپڑوں پہ لگے خون کو دیکھتے کمرے کی جانب بڑھے تاکہ انہیں تبدیل کر سکیں۔

”اس حنا سے تو میں اچھے سے نمٹوں گی، غصب خدا کا یہاں میرے سامنے تو اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی تھی اور اب زراسی تکلیف پہ مجھے بناء بتائے ہی سرال بھاگ گئی، ”احسان صاحب کے جاتے ہی شائستہ بیگم نے غصے سے لال ہوتے خود کلامی کی اور علیزے کو دیکھنے کے لیے اُس کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں جو سجان کو چوٹ لگنے کے بعد سے اُس کی تکلیف کا خود کو ذمے دار ٹھہراتے دروازہ لاک کیے بیٹھی آنسو بہار ہی تھی۔

زارون حنا اور سجان کو لے کر گھر پہنچا تو سب لوگ میز پہ موجود کھانا کھانے میں مشغول تھے۔

”آپی؟“ سب سے پہلے ہما کی نظر ان دونوں پہ پڑی تو وہ زیر لب بڑ بڑا تے جلدی سے اٹھ کر ان کے قریب آئی۔

”سبحان، اسے کیا ہوا؟ یہ چوت کیسے لگی؟“ حنا کے ہاتھوں میں موجود سبحان پہ نظر پڑتے ہی ہمانے حیرت کے ساتھ اُس کے سر پہ بندھی پٹی کو دیکھا تو اُس کی آواز پر سب لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

”سبحان، کیا کیا ہے تم نے میرے بیٹے کے ساتھ؟“ سبحان کے نام پہ جنید جس کی پشت حنا کی طرف تھی جلدی سے تڑپ کر اپنی کرسی سے اٹھا۔

”یہ؟ یہ چوت کیسے لگی؟“ سبحان کو اُس کی گود سے لیتے جنید نے اُس کے سر پہ بندھی پٹی کو دیکھ چکھنے ہوئے سوال کیا۔

”بھائی پلیز، حوصلہ رکھیں کچھ نہیں ہوا بس معمولی سے چوت ہے“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے زارون نے حنا کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بتایا۔

”معمولی؟ شرط دیکھی ہے تم نے اس کی کیسے خون سے بھری ہوئی ہے“، زارون کے جھوٹ پر ظفر کرتے جنید نے ایک غصیلی نظر حنا پہ ڈالی جو خاموشی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔

”جنید پلیز تسلی رکھو، بکوں کے چوٹیں لگ جاتیں ہیں۔ دیکھو سبھاں ٹھیک ہے“، اُسے آپ سے باہر ہوتا دیکھ احمد صاحب نے آگے بڑھتے مداخلت کی۔

”کیسے لگ جاتی ہیں چوٹیں؟ آج تک ہمارے گھر میں تو کبھی کسی بچے کو اتنی چوٹ نہیں لگی اور میں سب جانتا ہوں یہ سارا اس عورت کی لاپرواپیوں کا نتیجہ ہے جو ہر وقت دماغ کو دوسروں کو نیچا دکھانے کے منصوبے بننے میں استعمال کرتی اسے بھلا کہاں اپنے بیٹے کو سنبھالنے کا ہوش ہو گا“، حنا کے سر ہوتے جنید جو پہلے ہی اُس سے خفاظت اب سبھاں کی حالت دیکھ کر مزید تپتے ہوئے کہنے لگا۔

”بھائی پلیزاں میں بھا بھی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ سبھاں علیزے کی غلطی کی وجہ سے گرا ہے“، حنا کی سائیڈ لیتے زارون نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو ایک سخت نظر اس پر ڈالتے سبھاں کو ساتھ لیے اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔

”پلیز آپی اب آپ اپنادل خراب مت کریں“، جنید کے جاتے ہی حنا جوتب سے ضبط کیے کھڑی سب کو حیران کر رہی تھی ایک دم سے ہاتھوں میں چہرے چھپائے رونے لگی۔

”پانی پلانیں بھا بھی کو اور بیٹھنے دیں ان کو“، سب کی زبانوں کو حنا کی اچانک آمد سے قفل پڑتے دیکھ زارون نے ہما سے کہا جو اثبات میں سر ہلاتے حنا کو اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئی۔

”یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ سمجھان کے چوت کیسے لگی اور یہ حنا بھا بھی تمہارے ساتھ کیوں آئیں ہیں؟“  
 میرا مطلب تم انہیں لے کر آئے ہو؟“ ماہم جو تب سے زارون کا حنا کے ساتھ اتنا ہمدردی والا نرم رو یہ دیکھ جیران و پریشان سی کھڑی تھی اُن دونوں کے کمرے میں جاتے ہی اُس کے سامنے آتے پوچھنے لگی۔

”نہیں وہ خود آئی ہیں“، مختصر سا جواب دیتے زارون نے نور سے پانی لانے کا کہا۔

”کیا مطلب خود آئی ہے اور تم اُسے کہاں ملے؟ نور تو بتا رہی تھی کہ تم ارحم کی طرف گئے ہو؟“ اُس کے پیچھے ہی ڈائنگ ٹیبل کی جانب بڑھتے ماہم نے ایک اور سوال کیا۔

”اُفف سانس تو لے لینے دو پھر بتا دیتا ہوں“، گلاس نور کے ہاتھ سے لیتے زارون نے اُسے بھی اپنے ساتھ والی چیز پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”تم سانس لے لو، ہماری بے شک حیرت سے یہاں جان نکل جائے“، اپنی چیز پیچھے کر کے بیٹھتے مزمل نے بھی بے چینی ظاہر کی۔

”اُفف ایک تو یہ پورا گھر ہی جلد باز ہے“، پانی کے دو گھونٹ لیتے زارون نے مزمل کی بات پہ بیزاری سے کہا۔

”ہاں تو اب ہم ایک دم سے اتنی بڑی تبدیلی پہ وجہ جانے بغیر کیسے خاموش رہ سکتے ہیں اس لیے پلیز زیادہ نخرے مت دکھاؤ اور جو بھی بات ہے جلدی بولو“، حنا کے جنید کے اتنی باتیں سنانے کے بعد بھی چپ رہنے اور پھر اچانک سے رونے پہ ماہم جس کا دماغ کسی بڑی گہری وجہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا اس نے بے چینی دکھاتے زارون کے ہاتھ سے گلاس پکڑتے ٹیبل پہ رکھا۔

”مطلوب کے آپ لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے؟“، ایک نظر مدد طلب نظر وں سے احمد صاحب کو دیکھتے زارون نے ایک گہری سانس لیتے خود کو پر سکون کیا اور سب کو اپنی جانب متوجہ دیکھ ہسپتال سے لے کر سبجان کے چوت لگنے اور حنا کے معذرت کرنے تک کی ساری بات تفصیل سے ان کے گوش گزار کی۔

”اس نے معافی مانگی اور تم نے اتنی آسانی سے معاف کر دیا؟“، بات مکمل ہوتے ہی سب سے پہلا سوال ماہم نے کیا۔

”ہاں تو، اسے میں معاف نہ کرنے کا کوئی جواز ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اگر کسی انسان کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور وہ ہمارے سامنے اُس کا اعتراف کرتے معذرت کرے تو میرا نہیں خیال کہ آگے سے کم ظرفی دکھاتے ہوئے اُس کو مزید ملال میں ڈالنا بہتر ہو گا“، ماہم کے بے تکے سے سوال

پہ اُس کے بڑے ہونے پہ افسوس کرتے زارون نے بڑی نرمی کے ساتھ جواب دیتے زارون نے اُن سب کو بھی اپنا دل بڑا کرنے کا مشورہ دیا۔

”بہت اچھا فیصلہ کیا تم نے اور ہو سکتا ہے تمہارے معاف کر دینے کی وجہ سے ہی حنانے گھروالپ آنے کا رادہ کیا ہو“، زارون کی بات سننے احمد صاحب نے اُس کے عمل کی تعریف کرتے اندازہ لگایا۔

”جی، شاید ایسا ہی ہے اور جب اللہ پاک ہمیں ہماری ہزاروں غلطیوں پہ صرف ایک آنسو گرنے کے بد لے معاد فرمادیتا ہے تو ہم بندے کیوں بندوں کے غلطیوں کو پکڑ کر بیٹھ جاتے، حنا بھا بھی نے جو کچھ بھی کیا یا کہا میں مانتا ہوں کے اُس سے آپ سب کی دل آزاری ہوئی مگر اب جب کہ اُن کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے اور وہ خود چل کر گھروالپ آئیں ہیں تو میری درخواست ہے کہ آپ سب اُن کی طرف سے اپنا دل صاف کر لیں“، عابدہ بیگم کی طرف دیکھتے زارون نے اُن کی خاموشی کی وجہ سے اپنے الفاظ پہ دباؤ ڈالتے تاکید کی۔

”ہماری طرف سے حنا کو کوئی شکایت نہیں ہو گی ہم لوگ تو پہلے ہی یہ چاہ رہے تھے کہ وہ گھروالپ آجائے اور ہمارے بیٹے کا گھر ٹوٹنے سے بچ جائے“، زارون کو اپنی طرف متوجہ دیکھ عابدہ بیگم نے اُسے اپنی جانب سے مطمئن کیا۔

”ٹھیک ہے بس آپ سب بھی ان سے اپنا اپنارو یہ ٹھیک رکھیے گا“، نور کو نظریں جھکائے بیٹھاد کیا۔  
زارون نے ایک بار پھر سے سب کوتاکید کی اور جنید سے بات کرنے کا کہتے اُس کے کمرے کی  
جانب بڑھ گیا۔

---

”کیا مسئلہ ہے تمہیں؟“ دروازے پہ مسلسل دستک کی آواز پہ جنید نے بلا آخر سجان کی نیند خراب  
ہونے کے ڈر سے دروازہ کھولتے زارون کو سامنے پا کر غصے سے پوچھا۔

”مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں بہر حال آپ کی طبیعت اور دماغ دونوں ہی خراب لگ رہے مجھے“، بڑے  
احترام کے ساتھ کہتے زارون اُس کی سائیڈ سے گزر کر اندر داخل ہوا۔

”زیادہ فضول بولنے کی ضرورت نہیں ہے بڑا ہوں میں تم سے“، اُس کی ہٹ دھرمی دیکھ جنید  
نے آنکھیں نکالتے دروازہ پھر سے لاک کیا۔

”شکر ہے آپ کو یہ تو اندازہ ہوا کہ آپ مجھ سے بڑے ہیں ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج والے  
معاملے میں مجھے بڑا بن کر آپ کو سمجھانا پڑے گا“، ایک نظر بیڈ پہ سکون سے سوئے سجان پہ  
ڈالتے زارون نے طنزیہ اپنی بات ذو معنی انداز میں ادھوری چھوڑی۔

---

”مجھے کچھ سمجھانے کی ضرروت نہیں ہے اور اگر تم حنا کے متعلق مجھ سے کوئی بات کرنے آئے تو پلیز اس وقت میرا دماغ پہلے ہی بہت خراب ہے“، اُس کی بات سننے ہی جنید نے موضوع شروع ہونے سے پہلے، ہی اُس پر بحث کرنے سے انکار کیا۔

”آپ کا دماغ خراب ہو یا مود، پرمیں آج یہ لڑائی ختم کر کے ہی دم لوں گا، اس لیے پلیز یہاں بیٹھیں اور تحمل سے میری بات سنئیں“، اُس کا بازو پکڑ کر اُسے صوفے پر بٹھاتے وہ خود بھی اُس کے قریب بیٹھا۔

”میں نے کہانا کہ مجھے اس معاملے میں کوئی بحث نہیں کرنی تو کیوں تم میرے پچھے پڑے ہو؟“ اس بار تھوڑی سختی دکھاتے اُس نے زارون کی ضد کے آگے بے زاری کا انظہار کیا۔

”ٹھیک ہے بھا بھی کے موضوع پر بات نہیں کرتے ہم لوگ سمجھان کی بات کر لیتے ہیں جو آپ دونوں کی ضد کی نظر چڑھتے آج اتنی تکلیف میں ہے“، اُس کے بار بار انکار پر زارون نے حنا کے نام کی بجائے سمجھان کا حوالہ دیتے جنید کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

”میری ضد؟ وہ ضد میری نہیں تھی بلکہ اُس عورت کی تھی جو میرے بیٹے کو دوسروں کے درپہ لے کر گئی۔ آج تک کس چیز کی کمی رکھی میں نے؟ زندگی کی ہر آسائش سے لے کر اپنا آپ تک اُس

کے لیے واقف کر دیا اور بد لے میں اُس نے کیا کیا...“، زارون کی بات پہ دکھ کے ساتھ کہتے جنید نے نظروں میں شکوہ لیے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”پہلی بات کہ آپ نے بھا بھی کے لیے آج تک جو کچھ بھی کیا وہ آپ کا فرض تھا اور ان کا حق بھی، اس میں آپ کا کوئی احسان نہیں ہے جس کا بدلہ وہ چکا تیں اور دوسرا بات ہم سب انسان ہیں کوئی فرشتہ نہیں اور ہو سکتا ہے آج بھا بھی سے غلطی ہوئی ہے تو کل آپ سے بھی ہو جائے تو بس اگر آج آپ ان کی غلطی پہ انہیں معاف کریں گے تو کل ہو سکتا ہے وہ آپ کی معدرت سے پہلے ہی آپ کی غلطی کو در گزر کر دیں اور یہ موقع ہے اگر آپ چاہیں تو! انہیں معاف کر کے ہمیشہ کے لیے اپنا احسان مند بن سکتے ہیں۔ اس وقت وہ احساس نداشت لیے آپ کے پاس آئیں ہیں بس اب یہ آپ پہ منحصر ہے کہ آپ ان کی یہ شر مندگی مٹا کر انہیں سدھرنے کا ایک موقع دیتے ہیں یا مزید اپنی ناراضی بڑھا کر اپنے ساتھ ساتھ سبحان کو بھی مشکل میں ڈالتے ہیں“، جنید کی خاموشی پہ زارون نے بغیر رکے نرمی کے ساتھ اسے اپنی بات سے قائل کیا۔

”غلطی نہیں اُس نے سب کا دل دکھایا ہے، خاص کر تمہارا بس وہ سب سے معافی مانگ لے تو میرا کوئی گلہ نہیں اُس سے“، اُس کی بات ختم ہوتے ہی جنید نے لاپرواں سے کندھے اچکاتے اپنی شرط بتائی۔

”وہ مجھ سے اپنے روئے کی معافی مانگ چکی ہیں اور اب میرے دل میں ان کے لیے کوئی میل نہیں اور رہی باقی سب کی بات تو وہ ان سے بھی مغدرت کر لیں گی پر ابھی ان کو آپ کی ضرورت ہے وہ سجان کی وجہ سے بہت پریشان ہیں“، اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے زارون نے تھوڑا باؤ ڈالتے اپنی بات مکمل کی۔

”ٹھیک ہے تم پریشان نہ ہو اور جا کر آرام کرو مجھے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی“، اپنے غصے سے نکل کر جنید نے اُس کے زرد پڑتے رنگ کو دیکھ کر تاکید کی۔

”جی بس کچھ کھا کر آرام کرتا ہوں، آپ بھی اسیں کھانا کھالیں“، زارون نے اُسے سجان کی وجہ سے کھانے کے درمیان سے ہی اٹھتا دیکھ پیشکش کی۔

”نہیں بس میں نے کھالیا تھا تم جاؤ کھاؤ کچھ اور آرام کرو“، دروازے پہ دستک کی آواز پر اُس جانب متوجہ ہوتے جنید نے اُسے کہا جو حنا کو دیکھتے ہی جانے کے لیے کھڑا ہو چکا تھا۔

”سجان کا خیال رکھیے گا اور جب بھی اُٹھے اسے کچھ میڈ لیسن دے دیجیے گا“، ایک نظر حنا کے سے ہوئے چہرے پہ ڈالتے زارون نے جنید کو یادداہی کروائی اور مزید وہاں رکے بغیر خاموشی سے کمرے سے نکل گیا۔

-----

”ناراض ہیں مجھ سے؟“زارون کے کمرے سے جاتے ہی حنانے ایک نظر سبحان پہ ڈالتے قدم جنید کی جانب بڑھائے جو خود کو لا تعلق ظاہر کرتے اپنا موبائل اٹھا چکا تھا۔

”نہیں مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ناراض ہونے کی“، کندھے اچکاتے اُس نے نظریں موبائل کی اسکرین پہ جمائیں۔

”میں یہاں کمرے میں سبحان کو دیکھنے آئی تھی اگر آپ کو بُرالگ رہا ہے تو میں چلی جاتی ہوں“، اپنے وہاں آنے کا مقصد بیان کرتے حنانے اپنی بات ادھوری چھوڑتے سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھا۔

”مرضی ہے تمہاری، اگر اپنی اولاد کو یوں تکلیف میں چھوڑ کر کھیں اور جاسکتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں“، براہ راست اُسے رکنے کا کہنے کی بجائے جنید نے اپنی ناراضی برقرار رکھتے فیصلہ اُس پہ چھوڑا جو کچھ کہنے کی بجائے خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھی اور اُسے لاک کرتے والپس اُس کے قریب آئی جو اُس کے پلنے پہ اُس کے کمرے سے جانے کا خیال دل میں لیے چور نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

”مجھے اپنی اولاد کے ساتھ ساتھ آپ کے دل دکھنے کا بھی احساس ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے لاچ لج اور حسد نے اتنا پاگل کر دیا کہ میں اچھے برے میں تمیز کرنا بھول چکی تھی“، اُس کے قریب ہی نیچے زمین پہ بیٹھتے ہنانے نظریں جھکائے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”دولت کی حوس میں رشتؤں کا قدس فراموش کیے میں ان دنیاوی چیزوں کو خوشی اور سکون کا باعث سمجھنے لگی تھی تب ہی میں نے سب کے ساتھ بد تمیزی کی اور سب کا دل دکھایا“، آنکھوں میں نمی لیے پلکیں اٹھائے اُس نے جنید کی طرف دیکھا جو خاموشی سے اُس کی تمام باتیں سن رہا تھا۔

”بہت بڑی ہوں میں، میں نے زارون کی بیماری پہ اُس کی تکلیف محسوس کرنے کی بجائے اُسے بڑھا چڑھا کے سب کے سامنے بیان کیا۔ میں نے علم سے آراستہ ہونے کے باوجود بھی جہالت دکھائی تو اللہ پاک نے مجھے سزاد یعنی کی بجائے میری ممتا کو ہلاکا سا جھٹکا دیتے مجھے ہوش دلا یا کہ اگر میں کسی کی اولاد کا دل دکھار ہی تو وہ نعمت تو میرے پاس بھی موجود ہے جسے میں نے تین سال تک ترستے ہوئے اپنی گود میں پایا تھا اور جس کے بعد میری کوک ہمیشہ کے لیے ویران ہو گئی۔ اللہ پاک نے تو مجھے آج سے دو سال پہلے ہی پھر ماں بننے کے حق سے محروم کر دیا تھا اور مجھ نا سمجھ کو

دیکھیں خود میں اتنی بڑی کمی ہونے کے باوجود بھی دوسروں پہ انگلیاں اٹھا رہی تھی، تو اتر سے بہتے آنسوؤں پہ بند باندھنے کی بجائے حنا نے لڑکھراتے ہوئے لبجے میں اپنی بات مکمل کی۔

”اُس وقت جو کچھ بھی ہوا اُس میں اللہ پاک کی کوئی مصلحت تھی۔ میں نے آج تک تمہیں کبھی یہ احساس ہونے دیا کہ تم مجھے مزید و راث نہیں دے سکتیں؟“ اُس کے صبر کا مزید امتحان لینے کی بجائے جنید نے نرمی سے اُس کا ہاتھ تھامتے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”احساس نہیں ہونے دیاتب ہی تو آج میں اس مقام پہ کھڑی ہوں کہ سب میری وجہ سے تکلیف میں ہیں، اگر آپ مجھے احساس دلاتے تو ہر وقت میری جیسی عورت کو لعن طعن کرتے تو ہو سکتا ہے میں آج اپنی زبان کے تیر آپ کے گھروالوں پہ نہ برساتی،“ اپنے دوسرے ہاتھ سے اُس کا ہاتھ تھامتے حنا نے کانپتی ہوئی آواز پہ اپنا جرم قبول کیا۔

”اچھا خیر جو ہونا تھا ہو گیا اب تم ان باتوں کو چھوڑو اور سبحان کی فکر کرو،“ ہاتھ سے اُس کا چہرہ صاف کرتے جنید نے اُسے مزید شرمندہ کیے بغیر نرمی سے کہا۔

”میں سب سے معافی مانگ لوں گی امی ابو سے اور نور سے بھی بس آپ مجھے معاف کر دیں میں دوبارہ ایسی غلطی کبھی نہیں دھراؤں گی،“ اُس کے ہاتھ پہ اپنے چہرہ ٹکاتے حنا نے معدرت کی تو

جنید نے اُس کے اس بد لے ہوئے روپ کو دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا جس نے ایک چھوٹی سے ٹھوکر سے حنا کو اتنا بڑا سبق سکھا دیا۔

”کر دیا معاف اب بس رونا بند کرو اور اٹھا کے منہ ہاتھ دھو، میں جب تک تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں“، اُس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں بھرتے جنید نے نرمی کے ساتھ اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیا تو حنا نے اثبات میں سر ہلاتے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا۔

”افف یہ عورتیں بھی عجیب ہی ہو تیں ایسے بات بات پہ رنگ بدلتیں کہ کوئی گمان تک نہیں کر سکتا کہ ابھی کچھ وقت پہلے ہی ان سے کوئی سنگین غلطی ہوئی ہے“، حنا کے رویے میں واضح تبدیلی دیکھ کے جنید نے ایک جھر جھری لی اور اُس کے کھانے کے لیے کچھ لانے کے لیے باہر کا رخ کیا جہاں اب ہر طرف خاموشی تھی۔

”آج خیر ہے نا؟ بڑی جلدی سونے کے لیے لیٹ گئی ہو“، کپڑے وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد وہ کمرے میں آیا تو نور کو کمفرٹ راوٹھے لیٹا دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”میں جلدی سوؤں یاد ریسے آپ کو اس سے کیا؟ آپ جائیں اپنے دوست کے پاس جو خود تو فارغ ہے ہیں ساتھ آپ کو بھی نکما کر دیا“، اُس کی طرف دیکھے بغیر ہی نور نے طنز کرتے اپنی خفگی کا اظہار کیا۔

”مطلوب غصے میں ہو؟“ اُس کے قریب آگر بیڈ پہ بیٹھتے زارون نے تصدیق کے لیے بات ادھوری چھوڑی۔

”نہیں مجھے کیا ضرورت ہے؟ غصہ کر کے اپنا خون جلانے کی، میں تو آپ کے دن دن بھر گھر سے غائب رہنے پہ بہت خوش ہوتی ہوں“، ایک کھا جانے والی نظر اُس کے چہرے پہ ڈالتے نور نے پھر سے طنز کیا تو زارون نے لب سکریٹرے اپنی مسکراہٹ کو دبایا۔

”اچھا نا سوری دوبارہ زیادہ دیر تک باہر نہیں رکوں گا۔ میں تو آج بھی جلدی آجائتا پر سمجھان کی وجہ سے دیر ہو گئی“، اپنے ہسپتال میں احسان صاحب سے ملاقات والی بات کو گھروالوں کی طرح نور کے سامنے بھی گول کرتے زارون نے اپنے دونوں کان پکڑتے معذرت کی۔

”بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی سوری، دوسرے شوہروں کو جا کر دیکھیں زرا کیسے اپنی بیوی کا بر تھوڑے نہ صرف یاد رکھتے بلکہ ان کو اتنے اچھے گفت بھی دیتے اور ایک آپ ہیں جسے بر تھ

ڈے چھوڑ کر یہ بھی بھول جاتا کہ میں بھی آپ کی زندگی کا حصہ ہوں،“ اپنی ناراضی کی اصل وجہ پر آتے نور نے آنکھوں میں نمی لیے شکوہ کیا۔

”کیا مطلب؟ تمہارا آج بر تھڈے تھا؟“ اُس کے شکوے پہ ایک دم سے حیران ہوتے زارون نے تصدیق چاہی۔

”تو اور کیا مجھے تو خود یاد نہیں تھا ابھی کچھ دیر پہلے رضانے وش کیا تو یاد آیا پر آپ مجھ سے بات نہ کریں،“ منہ پھلانے نور نے اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھتے پچھے کیا۔

”ہونہہ جب تمہیں خود ہی یاد نہیں تھا تو مجھ سے کیسا گله؟ اور میری جان تم نے پہلے کبھی مجھے بتایا کیا کہ اس دن تمہارا بر تھڈے ہوتا؟“ اُس کے پھولے ہوئے گالوں کو دیکھ زارون نے اُس کی ناک دبائی جو غصے سے سرخ ہو رہی تھی۔

”تو؟ میں نہ بھی بتاؤں آپ کو تب بھی پتا ہونا چاہیے تھا کہ کس دن میرا بر تھڈے ہوتا ہے،“ اُس کا ہاتھ ہٹاتے نور نے آنکھیں سکریٹے اُسے گھورا۔

”میری جان پہلی بات کہ میں کوئی ولی نہیں ہوں جیسے ہر بات کا الہام بغیر بتائے ہو جائے اور دوسری بات قصور تمہارا ہے تم مجھے بتا دیتیں تو میں گفت بھی لے کر آتا ساتھ کیک اور چاکلٹیں بھی پر اب بھی اگر میرا ہی قصور نکل رہا تو یہ لوگان پکڑ لیے ہیں۔ سوری دوبارہ میں تمہارے بتائے

بغیر ہی تمہارا برتھڈے یاد رکھوں گا، سیدھا ہو کر بیٹھتے زارون نے باقاعدہ اپنے دونوں کان پکڑے معدرت کی۔

”ٹھیک ہے معاف کر دوں گی پر ایک شرط پر....“ کچھ سینڈز سوچنے کے بعد نور نے اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”کیا شرط؟“ حامی بھرنے سے پہلے زارون نے اُس کے شیطانی دماغ میں چلنے والے ارادے کے متعلق جاننا ضروری سمجھا۔

”یہی کہ کل آپ مجھے گفت بھی لا کر دیں گے اور چاکلیٹس بھی،“۔

”ٹھیک ہے لادوں گا بلکہ کل کیوں ابھی چلتے ہیں۔ میں تمہیں چاکلیٹس بھی لے دوں گا اور تمہاری پسند کا گفت بھی دلادوں گا، اُس کی شرط سنتے زارون نے طبیعت ڈھملی ہونے کے باوجود بھی پیشکش کی۔

”ابھی؟ ٹھیک ہے پھر میں آسکریم بھی کھاؤں گی“، اُس کی پیشکش پر پوری آنکھیں کھولے نور نے جلدی سے کمرٹر ہٹاتے ایک اور فرماش کی۔

”ٹھیک ہے بابا جو دل کیا کھالینا“، اُس کا جوش دیکھتے زارون نے مسکراتے ہوئے حامی بھری۔

”پر گفت میں آپ کی پسند کالوں گی“، الماری سے کپڑے نکالتے اُس نے واش روم کی طرف جاتے جاتے ایک اور خواہش ظاہر کی۔

”ٹھیک ہے بس کپڑے تبدیل کر کے جلدی نیچے آجائو۔ میں جب تک امی کو بتا دیتا ہوں“، اُس کی ساری باتیں مانتے زارون نے کلاک کی طرف دیکھا (جہاں رات کے گیارہ نجح رہے تھے) وہ گاڑی کی چابی، والٹ اور موبائل اٹھاتے کمرے سے نکلا۔

-----

”امی وہ میں اور نور کچھ دیر کے لیے باہر جا رہے ہیں“، دروازے پہ دستک دیتے زارون نے اندر سے اجازت ملنے پر کمرے میں داخل ہوتے عابدہ بیگم کو بتایا۔

”اس وقت؟ میرا مطلب ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو تم گھر آئے ہو“، کلاک پہ گیارہ سے اوپر ہوتا وقت دیکھ عابدہ بیگم نے اعتراض کیا۔

”جی بس وہ نور کا برتھڈے ہے آج، مجھے پتا ہی نہیں تھا اب اُس نے بتایا تو مجھے اچھا نہیں لگا کہ میں اُس کے اتنے خاص دن پہ اُسے کوئی گفت وغیرہ لے کرنہ دوں“، عابدہ بیگم کی فکر پہ مختصر آزارون نے اپنے اتنی رات کو باہر جانے کی وجہ بتائی۔

”ہاں توکل لے دینا بر تھڈے کا کیا ہے یہ توہر سال ہی آ جاتا“، اُس کی طبیعت کے پیش نظر عابدہ بیگم نے ایک بار پھر سے اُسے منع کیا۔

”بر تھڈے توہر سال آجائے گا پر ہو سکتا ہے اگلی بار مجھ میں اُس کے خزرے اٹھانے کی سکت نہ ہو یا میں ہی نہ رہوں، اسی لیے چاہتا ہوں کے زندگی میں ایک بار ہی سہی پر میں بھر پور طریقے سے اُس کا یہ خاص دن مناسکوں“، عابدہ بیگم کے انکار پہ ناچاہتے ہوئے بھی زارون کی زبان نے تلخ الفاظ ادا کیے۔

”کیا فضول بول رہے ہو، اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہوا اور آپ؟ جب وہ جانے کا کہہ رہا ہے تو کیا ضرورت ہے بار بار منع کرنے کی“، اُس کی بات سنتے جہاں عابدہ بیگم نے پتھرائی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا وہیں احمد صاحب جوتب سے خاموش بیٹھے اُن دونوں کی بحث سن رہے تھے اٹھ کر قریب آئے۔

”سوری، پتا نہیں کیوں میری زبان سے ایسے الفاظ نکلے امی پلیز آپ پریشان نہ ہوں میں ٹھیک ہوں“، احمد صاحب کے ڈانٹنے پر اپنے لفظوں پہ غور کرتے زارون نے جلدی سے آگے بڑھتے عابدہ بیگم کا ہاتھ تھما۔

”ہم کوئی بات نہیں جاؤ تم دیر ہو، ہی ہے“، اپنے آنسو ضبط کرتے انہوں نے اُس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔

”مجھے پتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں اور میں کہیں نہیں جاتا آپ پلیز پریشان نہ ہوں“، انہیں ہاتھ چھڑوا کے پلٹتاد کیکھ زارون نے اُن کے سامنے آتے روکا۔

”نہیں میں ناراض نہیں ہوں بس دوبارہ ایسے الفاظ اپنے منہ سے نہ نکالنا۔ ہم لوگ تو تمہیں دیکھ کر، ہی زندہ ہیں“، حوصلہ کرنے کے باوجود بھی دو انسو ٹوٹ کر اُن کی آنکھ سے گرے۔

”نہیں نکالوں گا، پلیز مجھے معاف کر دیں میرا رادہ آپ کو تکلیف پہنچانے کا ہر گز بھی نہیں تھا“، انجانے میں منہ سے نکلے الفاظ پہ شرمندہ ہوتے زارون نے اُن کے دونوں ہاتھوں کو تھامے معدرات کی۔

”اچھانا کوئی بات نہیں تم جاؤ نور تمہارا انتظار کر رہی ہو گی بلکہ اُسے پہلے ہمارے پاس بھیجو ہم بھی تو اُسے بر تھڈے پہ کوئی گفت دیں“، اُسے ملال سے نکالتے عابدہ بیگم نے چہرے پہ مسکراہٹ سجاتے اپنی آنکھوں کو صاف کیا۔

”ہاں ہاں، جاؤ لے کر آؤ اسے اور اپنا موڈ ٹھیک کرو“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے اُس کے چہرے پہ چھائی افسردگی کو دور کرنے کے لیے عابدہ بیگم کی بات کی تائید کی اور

دروازے کی جانب متوجہ ہوئے جہاں دستک دیتے نور زارون کے بلاں سے پہلے ہی اندر داخل ہوئی۔

”بھی آج ہماری بیٹی کا بر تھڈے تھا اور ہمیں کسی نے بتایا ہی نہیں“، اُسے دروازے پہ ہی رکا دیکھ کر احمد صاحب نے اپنے قریب بلا تے شکوہ کیا۔

”وہ بابا مجھے خود بھی یاد نہیں تھا اگر یاد ہوتا تو آپ کو بتاتی بھی اور آپ سے گفت بھی لیتی“، اُن کی شفقت پہ مسکراتے نور نے انہیں اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”اچھا تو گفت ہم ابھی لے کر تو نہیں دے سکتے پر یہ لو یہ رکھو اور زارون کے ساتھ جا رہی ہونا تو جو پسند آئے لے لینا“، اپنے والٹ سے کچھ ہزار کے نوٹ نکالتے احمد صاحب نے نور کی جانب بڑھائے جیسے بناء انکار کیے اُس نے تھام لیا۔

”بابا کو پیسوں سے انکار نہیں کرتے کیوں کہ اُن پہ بیٹیوں کا بھی حق ہوتا“، زارون نے اُس کی ہٹ دھرمی پہ اُسے گھورا تو نور نے وضاحت دیتے احمد صاحب کو مسکرانے پہ مجبور کیا۔

”ہاں تمہارا تو کچھ زیادہ ہی ہے“، منہ میں بڑھاتے وہ عابدہ بیگم کی جانب متوجہ ہوا جو الماری سے ایک چھوٹی ڈبیہ نکال کر نور کے پاس آئیں تھیں۔

”یہ لو، یہ میں نے تمہارے لیے بنوائے تھے سوچا تھا کہ جب بھی کوئی خوش خبری ہوئی تو تمہیں دوں گی“، ڈبیہ میں سے دو گنگن نکال کر اُس کے دونوں ہاتھوں میں پہناتے عابدہ بیگم نے آہستہ آواز میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”خوش رہو ہمیشہ“، اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیتے انہوں نے دعا دی تو نور نے ستائشی نظرؤں سے اپنے ہاتھوں میں موجود گنگن کو دیکھا۔

”ماما یہ تو بہت مہنگے لگ رہے ہیں“، اُن کی خوبصورتی کو دیکھ نور نے حیرت کے ساتھ اُن کی قیمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

”تحفہ مہنگا یا ستابندھ نہیں ہوتا، تحفہ بس اپنے پیار کا اظہار ہے جو ہم ان چیزوں کی صورت کسی دوسرے انسان سے کرتے ہیں“، اُس کی حیرت پہ مسکراتے عابدہ بیگم نے نرمی کے ساتھ سمجھایا۔

”بہت پیارے ہیں یہ، بہت شکر یہ آپ کا“، ایک نظر زراون کی طرف دیکھتے نور نے اُن کے خلوص پہ اُن کا شکر یہ ادا کیا۔

”چلو، جاؤ اب پہلے ہی کافی ٹائم ہو گیا ہے“، اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے عابدہ بیگم نے اُس سے کہا۔

”جی بس آپ فکر مت کریئے گا ہم لوگ کچھ دیر میں واپس آجائیں گے“، نور کو چلنے کا کہتے زارون نے ایک بار پھر سے عابدہ بیگم کو تاکید کی جو اثبات میں سر ہلاتے اُن کے ساتھ ہی باہر کی جانب بڑھیں۔

---

”زار...“ زارون نے گھر سے گاڑی نکالتے سڑک پہ ڈالی تو نور نے باغور اپنے دونوں ہاتھوں میں موجود گنگن کو دیکھتے اُسے مخاطب کیا۔

”ہاں جی؟“ موڑ کا ٹنے زارون نے اُس کی پکار پہ ایک سرسری سی نظر اُس پہ ڈالی۔  
”یہ خوش خبری کیا ہوتی ہے؟ میرا مطلب وہ ماں کہہ رہی تھیں ناکہ یہ گنگن انہوں نے مجھے خوش خبری پہ دینے تھے“، عابدہ بیگم کی بات جوا بھی تک نور کے دماغ میں اُنکی تھی اُسے زارون کے سامنے بیان کرتے اُس نے وضاحت چاہی۔

”جان امی تمہیں عقل آنے والی خوش خبری کی بات کر رہی تھیں۔ وہ کیا ہے ناکہ امی کو بھی پتا کہ میری چھوٹی بہو کا عقل والا خانہ خالی ہے تب ہی انہوں نے اُس خانہ کے بھرنے کی خوشی میں یہ گنگن تمہارے لیے بنوائے تھے تاکہ جس دن تم اپنا دماغ استعمال کرتے اُن کی باتیں سمجھنے لگو تو وہ

---

تمہیں یہ دے سکیں،“ اُس کے سوال پر بڑی سنجیدگی کے ساتھ زارون نے عابدہ بیگم کے مقصد کی وضاحت کی۔

”کیا مطلب؟ کیا مجھے عقل نہیں ہے؟ اور اگر مامانے اسی لیے بنائے تھے تو پھر مجھے دیئے کیوں؟“ آنکھیں سکریٹرے نور نے اُس کی طرف ہو کر بیٹھتے استفسار کیا۔

”میں نے یہ کب کہا کہ تم میں عقل نہیں؟ میرا مطلب عقل ہے پر تم استعمال کرتے ہوئے تھوڑا ہچکچاتی ہوا سی لیے امی نے ان گنگنوں کے خراب ہونے کے ڈر سے تمہیں وقت سے پہلے ہی یہ تھفہ دے دیا کیوں کہ وہ بھی اچھے سے جانتی ہیں کہ عقل کا استعمال کرنا تمہارے بس کی بات نہیں،“ اپنی مسکراہٹ چھپاتے زارون نے پھر سے اُسے چھیڑا جو خوش خبری لفظ کو کسی اور ہی معنوں میں لیے خوش ہو رہی تھی۔

”بھاڑ میں جائیں آپ اور آپ کی وضاحت اور اتنا ہی مجھ سے تنگ ہیں تو کوئی عقل مند ڈھونڈ لیں جو آپ کے اور آپ کی امی کے معیار کی ہو،“ اُس کے جواب پر غصے سے لال ہوتے نور نے لفظوں کو چباتے ہوئے ادا کیا۔

”بہت شکر یہ تم نے میری مشکل حل کر دی، ویسے میں بھی یہی سوچ رہا تھا کہ ایک بیوی تو نکمی بن مانگے ہی مجھے مل گئی ہے دوسری خود ڈھونڈ لوں“، اُس کے غصے پہ مزید اُسے تپاتے زارون نے مسکین سی صورت بناتے اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”ڈھونڈ لیں بلکہ ابھی جا رہے ہیں نا، تم باہر آپ وہاں پسند کر لیجیے گا تاکہ میں اپنے ہاتھوں سے آپ کے ساتھ ساتھ اُس کا بھی گلا د باسکوں“، دانت پیست نور نے ڈیش بورڈ پہ پڑا شو کا ڈبہ اُٹھاتے اُسے رسید کیا جواب قہقہہ لگاتے اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے اُس کا ہاتھ پکڑتے اپنے لبوں سے لگا چکا تھا۔

”ہاتھ مت لگائیں مجھے“، اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے کھنچتے نور نے غصے سے دروازے کے بالکل ساتھ لگتے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

”ہاتھ کب لگایا؟ میں تو بس پیار کر رہا تھا“، اُس کی بات پہ ٹشو کا ڈبہ واپس رکھتے زارون نے وضاحت دی تو نور نے ایک کھا جانے والی نظر اُسے پہ ڈالی اور خاموشی سے باہر گزرتی گاڑیوں کو دیکھنے لگی۔

”کیوں رورہی ہیں اب؟“ ان دونوں کے جانے کے بعد کافی دیر تک لان میں ٹھلتے رہنے کے بعد جب عابدہ بیگم کا دل کچھ ہلاکا ہوا تو واپس کمرے میں آتے پھر سے رونے لگیں۔

”آپ نے زارون کی بات سنی تھی؟ اُس کے الفاظ میں اپنے دل و دماغ سے چاہ کر بھی نکال نہیں پا رہی،“ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپاتے عابدہ بیگم نے احمد صاحب کے پوچھنے پر لڑکھڑاتی آواز میں اپنی بات مکمل کی۔

”اُسکے کچھ کہنے سے آپ اُس کی زندگی اور موت کا فیصلہ کر سکتیں ہیں؟ اور اگر ایسے کہنے سے زندگی اور موت کے فیصلے ہونے لگتے تو کوئی کسی اپنے کومرنے نہ دیتا۔ زندگی اور موت کا اختیار صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کب، کیسے اور کس جگہ رونما ہونی اُن سب کا فیصلہ صرف وہی ذات کرتی ہے،“ اُن کی ہچکیوں پر سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے پانی گلاس میں ڈالتے احمد صاحب نے گلاس اُن کی طرف بڑھایا۔

”زارون نے جو کچھ بھی کہا وہ صرف وقتی اثر ہے۔ وہ اپنی بیماری کو لے کر تھوڑا پریشان ہے اور ساتھ خوف زدہ بھی ہے اپنے سے جڑے رشتؤں کے لیے،“ اُن کے قریب بیٹھتے احمد صاحب نے اُنہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

”پھر بھی جو بھی تھا اس نے پہلے کبھی بھی کوئی ایسی بات نہیں کی۔ احمد پلیز آپ جلد کسی اچھے ڈاکٹر سے بات کریں اور زارون کا علاج شروع کروائیں“، گلاس ان کے ہاتھ سے لینے کی بجائے عابدہ بیگم نے ان کا ہاتھ تھامتے درخواست کی۔

”میں بات کر چکا ہوں، اگلے ہفتے سے ڈاکٹر کی مو شروع کر دیں گے پر اس کے لیے آپ کو بھی اپنا دل بڑا کرنا پڑے گا کیوں کہ اس وقت زارون جن حالات سے گزر رہا ہے اس میں ایسی چھوٹی مولیٰ باتوں کا ہونا مقرر ہے۔ کہتے ہیں ناکہ انسان سانپ کے زہر سے نہیں بلکہ اس کے خوف سے مرتا ہے بالکل اسی طرح کینسر بھی عام بیماریوں جیسی بیماری ہے جس کے زہر سے زیادہ اس کا خوف انسان کو بے بس کر دیتا ہے اور اس وقت زارون کے ذہن پر بھی وہ ہیبت سوار ہے جس کے زیر اثر وہ ایسی باتیں کر رہا ہے“، گلاس سائیڈ ٹیبل پر واپس رکھتے احمد صاحب نے ہمت رکھتے عابدہ بیگم کو بھی سمجھانے کی کوشش کی جو بیٹے کی بات پہ دل برداشتہ ہو رہی تھیں۔

”اللہ پاک نے موت لکھی ہو تو انسان معمولی سے بخار سے بھی اپنی جان ہار بیٹھتا اور اگر وہ زندگی دینا چاہے تو بڑی سے بڑی بیماریوں کو بھی شکست دینے کی طاقت رکھتا، اس لیے پلیز یہ رو رو کے اپنی طبیعت خراب کرنے کی بجائے آپ اللہ سے زارون کی صحت اور زندگی کی دعا کریں اس یقین

کے ساتھ کہ وہ ماں کی دعاوں کو رد نہیں کرتا، ان کا ہاتھ اپنے مضبوط ہاتھوں میں نرمی سے دباتے  
احمد صاحب نے انہیں امید دلاتے مایوسی سے نکلا۔

”ٹھیک ہے بس میں زارون کی بات سن کر تھوڑا پریشان ہو گئی تھی“، اثبات میں سر ہلاتے انہوں  
نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے آنسو صاف کیے۔

”نه پریشان ہوا کریں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا“، ان کا ہاتھ چھوڑتے احمد صاحب نے  
پانی کا گلاس ان کے سامنے کیا جسے اب خاموشی کے ساتھ تھامتے عابدہ بیگم نے اپنے لبوں سے  
لگایا۔

بچوں کو سلانے کے بعد جب نے اپنے کچھ ضروری کاغذات ڈھونڈنے کے لیے الماری کھولی۔  
”اُفف ایک تو ان کا غذات کا بھی انبار لگا ہوا ہے۔ ضروت کی کوئی چیز ڈھونڈنے لگ جاؤ تو گھنٹوں  
گزر جاتے“، منہ میں بڑھاتے بے زاری سے مختلف کاغذات کو دیکھ دیکھ کر سائیڈ پر رکھتے اُس کی  
نظر اپنی پرانی ڈائری پہ پڑی۔

”یہ یہاں پڑی ہے اور میں اسے اپنی کتابوں میں ڈھونڈ رہی تھی“، ڈائری اٹھاتے اُس نے خود کلامی کرتے اُسے کھولا جس میں آج سے چند برس پہلے کی کچھ یادیں قید تھیں۔

”کتنے خوبصورت لمحات تھے نا۔ جس میں تم میرے ساتھ تھے“، کچھ پنے پلٹتے حبہ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ڈائری میں موجود تصویر کو اٹھاتے سیدھا کیا۔

”میں بہت بد قسمت ہوں جس نے تمہاری محبت کو یوں انتہاء پہ لا کر اپنی ماں کی اناکی نظر کرتے تمہیں تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا اور گزرے سالوں میں ایک بار بھی توپٹ کر نہیں پوچھا کہ تم کیسے ہو؟ میری بے وفائی نے تمہیں زندہ رکھا ہے یا مار دیا“، تصویر پہ ہاتھ پھیرتے آنسو بے اختیار ہو کر اُس کی آنکھوں سے نکلے۔ ”میں نے تمہیں تڑپایا تھا نا؟ تو دیکھو آج سکون میں، میں بھی نہیں ہوں۔

جس شخص کی خاطر میں نے تمہیں چھوڑا اُس نے ایک ہی ٹھوکر میں مجھے اپنی زندگی سے نکال پھینکا۔ میں جانتی ہوں تم نے مجھے بد دعا نہیں دی پر پھر بھی مجھے تمہاری آہ لگ گئی۔ مجھے تمہارا دل توڑنے کی سزاد و بچوں کے بوجھ کے ساتھ طلاق کے دھبے کی صورت دی گئی ہے“، اُس کے نقوش کو با غور دیکھتے حبہ نے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ سجاتے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔

”جانتے ہو؟ طلاق دینے میں احتشام کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ قصور میرا تھا جو نکاح کے پاکیزہ رشتے میں بندھ کر بھی تمہیں اپنے دل سے نکال نہیں پائی۔ میں نے اُس رشتہ کو نبھایا ضرور تھا مگر صدق دل کے ساتھ نہیں“، اُس کے نقوش پہ ہاتھ پھیرتے حبہ نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”اور جانتے ہو ناجور رشتے ایمانداری اور وفاداری کے ساتھ نہ نبھائیں جائیں وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتے“، ایک گھری سانس لیتے اُس نے اپنی ادھوری بات کو مکمل کیا۔ ”پتا نہیں تم اب کیسے ہو گے؟ ہو سکتا ہے بدلتے ہو اور اس تصویر سے بھی بڑھ کر خوبصورت ہو چکے ہو“، نم آنکھوں سے مسکراتے اُس نے ایک بار پھر سے اُس کے نقوش پہ غور کیا۔

”شاملہ میری طرح تم بھی زندگی میں آگے بڑھ گئے ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے میری جگہ کسی اور کو دے دی ہو، پھر بھی صرف ایک بار میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔ تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں، تم سے معافی مانگنا چاہتی ہوں تاکہ پوری زندگی یہ ملال میرے دل میں نہ رہے کہ میں نے کسی کی دل آزاری کی ہے۔ ہاں بس ایک بار میرا دل میری آنکھیں تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں، ایک آخری بار میں تمہارا عکس اپنے اندر بسانا چاہتی ہوں تاکہ پوری زندگی آسانی سے گزار سکوں“، اپنے دل میں چھپی خواہش کو زبان تک لاتے حبہ نے اُس کی تصویر کو واپس ڈائری میں رکھا اور اپنا موبائل اٹھاتے میسج ٹائپ کرنے لگی۔

”نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی“، مسح ٹائپ کرنے کے بعد اُسے سینڈ کرنے سے پہلے جب نے ایک بار پھر سے اپنے فیصلے پہ نظر تانی کی تو کسی خوف کے تحت اُس نے اپنے لکھے تمام الفاظ مٹائے اور موبائل واپس رکھتے اٹھ کر زمین پر پڑے کاغذات کو سمیٹنے لگی۔

---

مسلسل دو گھنٹے اُسے اُس کی پسند کی چیزیں کھلانے اور شاپنگ کروانے کے بعد تقریباً دو بجے کے قریب زارون نے گاڑی کا رخ گھر کی جانب کیا تو نور نے نیند سے بو جھل ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ایک اور آئسکریم کھانے کی فرماکش کی۔

”پہلے ہی تم دو آئسکریم کھا چکی ہواب اور کھائی تو گلا خراب ہو جائے گا“، اُس کا بمشکل ٹھیک ہوا مود پھر سے خراب ہونے کے ڈر سے زارون نے نرمی کے ساتھ اُسے منع کیا۔

”آپ ہیں ہی برے، پہلے بھی مجھے اتنی مشکل سے دو آئسکریم لے کر دیں اور اب پھر میرا دل کر رہا ہے تو آپ مجھے منع کر رہے ہیں حالانکہ آپ نے ریஸورنٹ میں کہا تھا کہ راستے سے ایک اور لے دوں گا“، نور نے اُس کی بات یاد دلاتے شکوہ کیا۔

---

”اُفف میری اماں گلا خراب ہو جانا تھا تمہارا اسی لیے ریسٹورنٹ میں تمہاری بربک لگوانی اور اب بھی بے شک تم غصہ کرو یا مجھے برا بھلا کھوپر میں تمہیں آئسکریم لے کر نہیں دوں گا“، اُس کے جذباتی ڈرامے کا اثر لیے بغیر زارون نے اُس کی طبیعت خراب ہونے کے پیش نظر اس بار تھوڑی سختی دکھائی۔

”ٹھیک ہے نہ لے کر دیں، میرے پاس بھی پسیے ہیں میں صحیح ہوتے ہی ان سب کی آئسکریم منگوا کے کھاؤں گی اور ساتھ آپ کی بابا سے شکایت بھی کروں گی کہ آپ نے مجھے ڈانٹا“، احمد ساحب کے دیے پسیے اُس کی نظروں کے سامنے لہراتے نور نے منہ ب سورے دھمکی دی۔

”ٹھیک ہے کھالینا پھر گلا خراب ہو تو مجھے مت کہنا کہ ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو“، اُس کی دھمکیوں کا اثر لیے بغیر زارون نے سڑک خالی دیکھ کے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔

”ٹھیک ہے نہ لے کر جائیے گا۔ ویسے بھی مجھے آپ جیسے کھڑوس انسان کے ساتھ کہیں جانے کا شوق نہیں جو گھومتا کم اور باتیں زیادہ سناتا ہو“، اُس کی بات سنتے نور نے آنکھیں سکیڑے اُسے گھورا اور مزید کوئی بات کیے بغیر خاموشی سے شاپر سے اُس کا دیا گیا گفت نکال کر دیکھنے لگی جو ابھی تک پیک تھا۔

”میں نے کہا تھا ناکہ گھر جا کر کھولنا“، اُسے ڈبے پہ لپٹا پپر اتارتاد یکھ زارون نے جلدی سے گفت اُس کے ہاتھ سے لیا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ حد ہے میرا گفت ہے میں جب مرضی کھولوں آپ کو کیا“، اُس کے گفت پکرنے پہ بُرا مناتے نور نے اُسے واپس لینا چاہا۔

”نہیں نابس گھر جا کر کھولنا اور یہ لوگھر بھی آگیا“، گاڑی موڑتے زارون نے گیٹ کے سامنے رکتے ہارن دیا تو ایک شخص نے جھٹ سے اُن کے سامنے آتے نور سمیت زارون کو بھی حیرت میں

ڈالا...

”یہ اس وقت یہاں کیا کر رہا ہے؟“ ایک نظر سامنے کھڑے معاذ پہ ڈالتے زارون نے حیرت کے ساتھ پاس بیٹھی نور کو دیکھا جو اس شخص کو پہچانے کے باوجود بھی دم سادھے بیٹھی تھی۔

”زار، نہیں آپ پلیز باہر مت جائیے گا“، اُس سے نظریں ہٹاتے زارون نے دروازہ کھول کر باہر نکالنا چاہا تو نور نے جلدی سے آگے بڑھتے دروازہ بند کرنے کے ساتھ ہی اُسے بھی باہر جانے سے روکا۔

”کیوں نہ جاؤ؟ میرا بھائی آیا ہے اب کیا اُس سے بھی نہ ملوں“، اُس کی بے تکنی بات پر زارون نے بھنویں اچکاتے اُس کا ہاتھ دروازے سے ہٹایا۔

”نہیں پلیز آپ نہ جائیں۔ آپ کو نہیں پتا اس وقت بہت سے چڑیلیں اور بھوت انسانوں کو روپ دھارے پھر رہے ہوتے ہیں“، لاک پہ ہاتھ رکھنے نور نے نفی میں سر ہلاتے اُسے منع کیا۔

”افف تم اور تمہاری فلاسفی اور جان بے فکر ہو دنیا کی سب سے بڑی چڑیلیں میرے ساتھ ہے اس لیے کوئی بھی جن یا بھوت میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا“، باہر کھڑے شخص کو دلچسپی کے ساتھ اپنی طرف متوجہ پا کر زارون نے آدھی سے زیادہ خود پر جھکی اپنی بیوی کو تسلی دیتے سائیڈ پر کیا جو کسی صورت اُسے باہر جانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

”یہ تم دونوں کارو مینیس ختم ہو گیا ہے تو مجھ غریب کو بھی پوچھ لو جو اپنے ہی گھر سامنے پچھلے ایک گھنٹے سے لاوارثوں کی طرح بیٹھا ہے“، ان دونوں کو آپس میں مسلسل کھسر پھسر کرتا دیکھ معاذ نے بلا آخر شیشے کی سائیڈ پر آتے زارون کو اُسے نیچے کرنے کا اشارہ کیا۔

”تو کس نے کہا تھا کہ بغیر بتائے یوں چوروں کی طرح گھر آؤ“، اُس کے طنز پہ جہاں نور جلدی سے نظروں میں خوف لیے پیچھے ہٹی وہیں زارون نے مسکراتے ہوئے اُس کی ٹانگ کھینچی اور دروازہ کھول کر باہر نکلتے اُس سے بغل گیر ہوا۔ ”ہاں، مجھ غریب کو تو الہام ہوا تھا کہ گھروالے نیند کی گولیاں کھا کر سوئے ہیں اور یہ چو کیدار کھاں ہے؟“ اُس سے الگ ہوتے معاذ نے سہی ہوئی اپنی بھا بھی کو سلام کیا جو جواب دینے کی بجائے کھٹی ہوئی نظروں سے اُس کے کسی بھوت میں بدلنے کا انتظار کر رہی تھی۔

”چو کیدار میرے ہوتے ہوئے تو گیٹ پہ ہی تھا بعد کا پتا نہیں“، اُس کی بات کا جواب دیتے زارون نے ہارن پہ ہاتھ رکھا تو گیٹ کھولنے پہ ہی ہٹایا۔

”معاذ؟“ حمد صاحب نے جمائی روکتے گیٹ کھولا تو سامنے زارون کے ساتھ کھڑے شخص پہ نظر پڑتے ہی جیران ہوئے۔

”جی میں ہی ہوں جو پچھلے ایک گھنٹے سے باہر مسکینیوں کی طرح بیٹھا بیل پہ بیل دیتے گیٹ کھلنے کا انتظار کر رہا“، آگے بڑھ کر اُن سے بغل گیر ہوتے اُس نے شکوہ کیا۔

”بیل توکل سے خراب ہے اور چوکیدار کی بیوی کی طبیعت خراب تھی وہ زارون کے نکلنے کے بعد ہی گھر چلا گیا تھا“، اُس کے شکوئے پہ احمد صاحب نے زارون کو گاڑی اندر کرنے کا کہتے اُسے آگاہ کیا جواب اپنا سامان اٹھاتے اندر رکھ رہا تھا۔

”ہونہہ تو مجھے کیا پتا تھا کہ آپ لوگوں کی بیل خراب ہے اور اوپر سے یہ موبائل عین موقع پہ بند ہو جاتا“، اپنی صحیح سے چلتی بری قسمت پہ خود کو کوستے معاذ نے کھا جانے والی نظر زارون پہ ڈالی جو اُس کے سر پر اُن کاستیا ناس ہونے پہ مسکرا رہا تھا۔

”تو کس نے کہا تھا یوں بغیر بتائے بن بلائے مہماں کی طرح نازل ہوا اور بیٹا اگر میں نہ آتا تو ساری رات باہر ہی گزارنی پڑتی تمہیں“، دوسری طرف سے آکر گاڑی کا دروازہ کھولتے اُس نے نور کو اُترنے کا شارہ کیا۔

”ہونہہ اتنی بھی بات نہیں ہے اب اور ہاتھ پاؤں سلامت ہیں میرے اگر اگلے پانچ منٹ میں کوئی گیٹ نہ کھولتا تو میں دیوار کو دنے کا مکمل انتظام کر چکا تھا“، اُس کے طنز پہ فخر یہ انداز میں اپنا کارنامہ بتاتے اُس نے اُسے سامان لانے کا کہتے احمد صاحب کے ساتھ ہی اندر کا رخ کیا۔

”تمہیں کیا ہوا ہے؟ اندر نہیں جانا کیا؟“، ان دونوں کے جاتے ہی زارون نے نور کی طرف متوجہ ہوتے سوال کیا۔

”وہ.... بھوت“، اپنا سکتہ توڑتے نور نے لڑکھڑاتی زبان میں بیرونی دروازہ کی جانب اشارہ کیا جہاں سے ابھی ابھی معاذ اندر گیا تھا۔

”اُفف نور حد ہے وہ میرا بھائی ہے معاذ، ویسے شکل تو اُس کی بھوت توں جیسی ہی ہے پر تم پریشان نہ ہو، بھوت کسی بھی چڑیل کو نقصان نہیں پہنچاتے“، اُس کا ہاتھ تھامتے زارون نے نظرؤں میں شرارت لیے اُس کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگوں کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟ اور یہ آپ نے چڑیل کس کو کہا؟“، تھوک نگتے نور نے چڑیل لفظ پہ اٹکتے سوالیہ نظرؤں سے اُسے دیکھا جواب اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے مسکرا رہا تھا۔

”تمہیں کہا ہے چڑیل وہ بھی خونوار چڑیل“، ڈرنے کی بجائے زارون نے بہادری کے ساتھ جواب دیا جس پہ ایک کھاجانے والی نظر اُس پہ ڈالتے نور نے بغیر کچھ کہے اندر کارخ کیا جہاں معاذ اب تک سب لوگوں کو جگا چکا تھا۔

”بھی یہ آپ عورتوں کا مجھ سے ملنے ملانے کا سلسلا ختم ہو گیا تو کوئی چائے پانی کا انتظام کر لیں“، ان سب کو اپنے قریب بیٹھتا دیکھے معاذ نے انہیں خود ہی شرم دلائی۔

”چائے پانی کا انتظام بتا کر آنے والوں مہمانوں کے لیے ہوتا ہے بن بلائے مہمانوں کے لیے تو بس دعائیں ہی ہو تیں“، اُس کا کان پکڑ کر کھینچتے ماہم نے اُس کے اس طرح اچانک چھپا مارنے پر تنقید کی۔

”ہاں تو، میں تو آپ سب کو سرپرائز دینا چاہتا پر مجھے کیا پتا تھا اس سرپرائز کے چکر میں مجھے اتنا خوار ہونا پڑے گا“، منہ بسو رتے معاذ نے اپنی بات مکمل کرتے نور کی جانب دیکھا جو بغور اُس کا جائزہ لیتے عابدہ بیگم کے قریب آکر بیٹھ چکی تھی۔

”زارون یہ بھا بھی مجھے دیکھ کر سکتے میں گئی ہیں یا میرے جانے کے بعد ان کے سرپرائیز کوئی چوٹ وغیرہ لگ گئی تھی جو اس طرح مجھے گھور رہی ہیں“، اُس کے کان کے قریب ہوتے معاذ نے آہستہ آواز میں سرگوشی کی تو زارون کا دھیان نور کی طرف گیا جو شاید ابھی تک بھوت کا خیال اپنے دماغ میں لیے بیٹھی تھی۔

”چوٹ تو بچپن سے لگی ہوئی ہے شاید، مگر اثر تمہاری یہ ڈراؤنی شکل دیکھ کر ہوا ہے“، اپنی بیوی کے بارے میں معاذ کے خیالات سننے کے بعد زارون نے دانت پسیے اپنی بات مکمل کی۔

”اچھا اچھا مطلب قدرتی مسئلہ ہے مجھے لگا شاید میرے آنے کی خوشی میں کومہ میں چلی گئی ہیں۔ ویسے میں ہوں ہی اتنا ہند سم کہ ہر کوئی مجھے دیکھ کر دیکھتا ہی رہ جاتا ہے“، بے عزتی محسوس کرنے کی بجائے معاذ نے شان بے نیازی کے ساتھ اپنی تعریف کی۔

”ہاں کچھ زیادہ ہی ہینڈ سم ہوتا ہی نور کو گاکے تم کوئی بھوت ہو جو معاذ کا روپ دھارے ہمیں نقصان پہنچانا چاہتے ہو۔ ویسے وہ غلط بھی نہیں تھی“، آنکھوں میں شرات لیے زارون نے آخری بات پہ اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

”مطلوب وہ تمہیں اس لیے گاڑی سے اُترنے نہیں دے رہی تھیں؟ اُس کی بات سنتے معاذ کو گاڑی کا منظر یاد آیا جس پہ معنی خیزی سے مسکراتے اُس نے زارون کو چھیڑا۔

”ہاں اسی لیے اُترنے نہیں دے رہی تھی اور یہ تم گاڑی والی بات کرتے جو میسنوں کی طرح مسکرا رہے ہو ناسب اچھے سے جانتا ہوں میں“، جنید کے اُن کے پاس آکر بیٹھنے پر زارون نے اُسے آنکھیں نکالیں جو مزید اُسے تنگ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

”اور بھئی کیا حالات ہیں سعودیہ کے؟ اور ایسے اچانک آنے کا پروگرام کیسے بنالیا؟“، معاذ کا حال احوال پوچھنے کے بعد جنید نے گفتگو کا رخ سیاست کی طرف موڑا تو زارون نے سامان کا یاد آنے پر باہر کا رخ کیا۔

-----

معاذ کے کھانا کھاتے ہی حنا اور ماہم نے مل کر سب لوگوں کے لیے چائے بنائی اور عابدہ بیگم کے بتانے پر سب نے نور کو سالگرہ کی مبارک دینے کے ساتھ ہی زارون سے ایک اچھی سی پارٹی دینے کا کہا۔

”اچھا بس اب بہت ٹائم ہو گیا سب لوگ اٹھو اور اپنے اپنے کمرے میں جا کر نماز ادا کرنے کے بعد آرام کرو“، فجر کی اذان کی آواز سننے عابدہ بیگم نے ان سب سے جانے کا بولا۔

”افف مجھے تو سچ میں بہت نیند آ رہی ہے اب“، ان کی بات سننے سب سے پہلے معاذ نے ہی محفل سے اٹھتے انگڑائی لی اور اپنے کمرے کا رخ کیا تو باقی سب بھی اٹھ کر اپنے اپنے کمروں کی جانب بڑھے۔

”میرا گفت کہاں ہے؟“ کمرے میں آتے ہی نور نے شاپر زکی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا۔  
”اوو، وہ تو میں گاڑی سے نکالنا ہی بھول گیا“، اُس کے یاد دلانے پر زارون نے پریشانی سے جواب دیا۔

”تونکال لائیں نامجھے دیکھنا ہے کہ آپ نے مجھے کیا لے کر دیا ہے“، فوراً سے مسئلے کا حل بتاتے نور نے بے چینی ظاہر کی تو زارون نے ناچاہتے ہوئے بھی قدم باہر کی جانب بڑھائے۔

”جب تک زار آتے ہیں میں وضو کر لیتی ہوں پھر نماز پڑھ کر سکون سے گفت دیکھوں گی“، اُس کے باہر نکلتے ہی نور نے خود کلامی کی اور وضو کرنے کی غرض سے اُس نے واش روم کی طرف قدم بڑھائے۔

”یہ لڑکی بھی نا، نہ دن میں مجھے سکون کرنے دیتی ہے اور نہ ہی رات میں“، آہمگی سے بیرونی دروازہ کھول کر باہر پورچ میں آتے زارون نے گاڑی کھول کر سارے شاپرز اُس میں سے نکالے۔ ”میں بھی پورا بد لے کر گفت کھولنے دوں گا“، ایک ہاتھ میں شاپر پکڑے دوسرے ہاتھ سے اُس نے گاڑی لاک کی اور بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے اُسے بھی بند کیا۔

”حد ہے شادی کر کے تو انسان مصیبت میں ہی پھنس جاتا“، سیڑھیاں چڑھتے اُس نے ہاتھ میں پکڑے چھ سے سات شاپرز میں سے اپنے گفت والا شاپر الگ کیا اور کمرے میں داخل ہوا۔

”اب میدم پتا نہیں کہاں غائب ہو گئیں ہیں“، سارے شاپرز صوفے پر رکھتے زارون نے اُس کی غیر موجودگی پر خود کلامی کی۔

”ویسے موقع اچھا ہے یہ کہیں چھپا دیتا ہوں“، کچھ سینڈ زکٹ ہاتھ میں پکڑے گفت کو دیکھنے کے بعد زارون نے شرارت سوجھتے ہی اُس شاپر کو بیڈ کے نیچے رکھ دیتا کہ نور کو تنگ کر سکے جس نے آج اُس کا اتنا سر کھایا تھا۔

”لے آئے ہیں شاپر ز؟“ وہ گفت بیڈ کے نیچے رکھ کر سیدھا ہوا تو نور نے واش رومن کا دروازے کھولتے صوف پر کھے شاپر ز کو دیکھ کے سوال کیا۔

”ہاں لے آیا ہوں، تم دیکھو میں جب تک نماز پڑھ لوں“، چہرے سے کچھ بھی ظاہر کیے بغیر وہ وضو کی نیت سے اٹھا۔

”نہیں میں نماز پڑھ کر سکون سے دیکھوں گی“، اُسے واش رومن کی جانب بڑھتا دیکھ نور نے بے چینی کے باوجود بھی حوصلہ کرتے اپنا فیصلہ سنایا۔

”اچھا ٹھیک ہے جب مرضی دیکھ لینا“، ایک سرسری سی نظر اُس پہ ڈالتے زارون نے جواب دیا اور واش رومن کی جانب بڑھ گیا تو نور نے الماری سے جائے نماز نکال بچھاتے نماز شروع کی۔

-----

کچھ ہی دیر میں وہ نماز سے فارغ ہوئی تو اُس نے اپنی جائے نماز تھہ کر کہ ٹیبل پر رکھی اور چہرے پہ جوش لیے جلدی سے سارے شاپر اٹھا کر بیڈ پر رکھے۔

”زار؟ وہ گفت والا شاپر کہاں ہے؟“ باری باری سارے شاپر زکوا چھے سے دیکھنے کے بعد بھی نور کو وہ کہیں دکھائی نہ دیا تو اُس نے زارون کو مخاطب کرتے سوال کیا جو ابھی دعا مانگ رہا تھا۔

”ہائے اللہ کہاں چلا گیا؟ مجھے لگتا زار وہ پھر سے گاڑی میں ہی بھول آئے ہیں“، دوسری طرف سے جواب نہ ملنے پہ اندازہ لگاتے اُس کا موڈا یک بار پھر سے خراب ہوا۔

”مجھے پتا ہے آپ جان بوجھ کے وہ شاپر گاڑی میں چھوڑ کر آئے ہیں“، بیڈ سے اٹھتے اُس کے سامنے آتے نور نے اُس کا راستہ روکا جو جائے نماز تھہ کر کہ الماری کی طرف بڑھ رہا تھا۔

”اُفف میری جان اُن میں ہی کہیں ہو گا اچھے سے دیکھو“، اُس کی سائیڈ سے گزرتے اُس نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں ہے اُن میں، میں دس بار دیکھ چکی ہوں۔ آپ یقیناً گاڑی میں ہی چھوڑ آئے ہوں گے“، پلٹ کر اُس کی پشت کو دیکھتے نور نے پریشانی سے بتایا۔

”اچھانا خیر ہے صح اٹھ کر میں گاڑی میں دیکھ لوں گا، ابھی فی الحال تو تم یہ سب اٹھاؤ مجھے نیند آرہی ہے“، بیڈ پہ بکھری چیزوں کی طرف اشارہ کرتے زارون نے لاپرواے انداز میں اپنی بات مکمل کی۔

”کیا مطلب صح دیکھ لوں اور صح تو ہو گئی ہے نا؟ اس لیے پلیز آپ جائیں اور مجھے وہ لا کر دیں“، ایک نظر بیڈ پہ بکھری چیزوں کو دیکھتے نور نے اُس کی منت کی۔

”یار میں نہیں جا رہا یہ لوچابی اور تم خود ہی نکال کر لے آؤ“، اُس کی بات پہ بیزاری کے ساتھ کہتے زارون نے گاڑی کی چابی اٹھا کر اُس کے ہاتھ پر رکھی۔ آپ ہیں ہی بد تمیز اور آپ کو پتا ہے نامجھے اس وقت اندر ہیرے میں ڈر لگ رہا تھا ہی مجھے جانے کا کہہ رہے۔ ٹھیک ہے نہ لا کر دیں میں بھی آپ سے بات نہیں کروں گی اور نہ ہی آپ کی طرف کروٹ لے کر سوؤں گی“، اُس کی بات پہ غصے سے دھمکی دیتے نور نے اُسے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے جو دل کرتا ہے کرو، بھی مجھے تو بہت نیند آرہی ہے“، خود ہی بیڈ سے چیزیں اٹھا کر صوف پر رکھتے زارون نے اُس کے ڈراموں میں آنے کی بجائے صاف انکار کیا تو نور نے ایک کھا جانے والی نظر اُس پہ ڈالی اور ناراضی کے اظہار کے لیے پاؤں پٹختے اپنی سائیڈ پہ آکر خاموشی سے لیٹ گئی۔

”ویسے تم کہیں اس شاپر کی بات تو نہیں کر رہیں؟“ لائٹ آف کرنے کی بجائے زارون نے اپنی سائیڈ پر آتے اُسے مزید تنگ کرنے کا ارادہ ترک کرتے بیڈ کے نیچے سے شاپر نکالتے اُسے اپنی جانب متوجہ کروایا۔

”یہ آپ کو کہاں سے ملا؟“ اُس کی بات سنتے ہی نور نے پیچھے دیکھتے اُس کے ہاتھ میں موجود شاپر کو پہچانتے ہی سوال کیا۔

”وہ تم نے آج مجھے تنگ کیا نا تو سوچا میں بھی تھوڑا کرلو“، اُس کی حیرت پر مسکراتے زارون نے گفت نکال کر اُس کی طرف بڑھا یا جواب اُس کے مذاق پر خفاسی اُسے تھامنے کی بجائے واپس کروٹ لے گئی۔

”مجھے نہیں چاہیے اور لائٹ بند کر دیں مجھے نیند آرہی ہے“، اپنی ناراضی کے اظہار کے لیے بس اتنی سی بات کہتے اُسنے اپنی طرف کا یہ پر آف کیا۔

”پر مجھے تو دینا ہے نا اور مجھے نیند بھی نہیں آرہی“، خود ہی ڈبے سے پیپر ہٹاتے زارون نے اُس کا رخ اپنی جانب کیا۔

”دیکھو تو اچھا ہے نا؟“ نور جو اُس کے جیولری شاپ میں جانے پر یہ تو جان چکی تھی کہ اُس نے اُس کے لیے کوئی جیولری ہی لی ہے پر اُسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس قدر خوبصورت ہے۔

”بہت پیارا ہے، بہت زیادہ خوب صورت“، نظر وں میں ستائش لیے ایک دم سے اپنی ساری ناراضی کو بھولتے وہ اٹھ کر بیٹھی اور زارون کے ہاتھ میں موجود ڈبے میں پڑے چھوٹے چھوٹے طالپس اور چین کو دیکھنے لگی۔

”تم سے زیادہ پیار انہیں ہے“، ڈبے بیڈ پہ رکھتے زارون نے کہنے کے ساتھ، ہی اُس کے باعث کان میں موجود طالپس کو اُتارا۔

”میں خود پہن لوں گی“، اُس کے ہاتھوں کا لمس محسوس کرتے ہی نور نے جھجکتے ہوئے منع کیا۔ ”نهیں، میں خود پہناؤں گا“، دائیں کان سے طالپس اُتارتے زارون نے اُسے اپنے ارادا سے آگاہ کیا اور اپنے لائے ہوئے طالپس باری باری اُس کے دونوں کانوں میں پہنانے لگا۔

”زار میں پہن لوں گی“، اُس کے قریب آنے سے نور کا دل زور سے دھڑکا تو اُس نے گھبرا تے ہوئے ایک بار پھر سے اُسے منع کیا۔

”چپ کر کے بیٹھو اور میرے پہنانے پہ کوئی مسئلہ ہے کیا؟“، طالپس بند کرتے زارون نے کہنے کے ساتھ، ہی اُس پہ اپنے ہونٹ لگائے تو نور نے مضبوطی سے اپنی آنکھوں کو بند کیا۔

”یہ میرا لایا ہوا تمہارے لیے پہلا خاص تھفہ ہے اور ہو سکتا ہے آخری بھی ہو، اس لیے ایسے کبھی خود سے الگ مت کرنا“، اُس کے شرم سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھتے زارون نے اُس کے کان کے قریب ہوتے سر گوشی کی جس پر نور نے فٹ سے آنکھیں کھولے اُسے دیکھا۔

”پہلا تو سمجھ آتا ہے پر آخری کیسے؟“ اُسے اب چین اٹھا کر اپنے گلے میں پہناتا دیکھ کے نور نے ناممتحنجی سے سوال کیا۔

”وہ کیا ہے ناگے جا کر ہو سکتا کہ میرا تم جیسی چڑیل کو اتنا مہنگا تھفہ دینے کا دل نہ کرے اور یہ بھی ہو سکتا کہ میرے پاس اتنے پیسے ہی نہ ہوں اس لیے تمہیں پہلے سے ہی آگاہ کر رہا ہوں کہ مجھ سے ہمیشہ بر تھڈے پہ اتنے مہنگے تھفے کی امید مت رکھنا“، اپنی بیماری کی بات کر کے اس وقت اُس کا دل دکھانے کی بجائے زارون نے بات بدلتے اُس کے گردن میں موجود چین کو دیکھا۔

”آپ ہیں ہی برے، حد ہے میں نے اب بھی کب کہا تھا کہ مجھے مہنگا تھفہ چاہیے“، اُسے خود میں محدود یکھ نور نے بات بدلتے پیچھے ہٹنا چاہا۔

”پر میرا دل تھا کہ میں تمہیں اس دنیا کا سب سے خوبصورت تھفہ دوں، یہ دنیا کا تو نہ سہی پر خوبصورت ضرور تھا اس لیے میں نے اسے تمہارے لیے پسند کیا“، اُس کا ہاتھ تھامتے زارون نے

ٹکلٹکی باندھے اُس کی گردن میں چمکتی ہوئی چین کو دیکھا جو اپنی خوبصورتی بڑھنے پہ بار بار اُسے اپنے حصار میں لے رہی تھی۔

”اچھا بس بہت ہو گئی تعریف، مجھے نیند آرہی ہے سوتے ہیں“، اُس کی آنکھوں میں دیکھے بغیر نور نے اُس کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نکالا اور لائٹ آف کرنے کے لیے اٹھی تو زارون نے ایک گہری سانس لیتے اپنے آپ کو اُس کے حصار سے نکالنے کی کوشش کی۔

”طبعیت ٹھیک ہے آپ کی؟“ وہ اپس آگر اُس کے کندھے پہ سر رکھتے نور نے اُس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر اُس کی پیشانی پہ ہاتھ لگایا۔

”ہاں ٹھیک ہوں“، جواب دینے کے ساتھ زارون نے اُسے اپنے قریب کیا۔

”بہت پیاری لگ رہی ہے یہ چین تم پہ“، اپنی طرف کے لیمپ کی روشنی میں ایک بار پھر سے اُس کی گردن میں چمکتے موتیوں کو دیکھ زارون نے تعریف کی اور ساتھ ہی جھک کر ان پہ بوسہ دیا تو نور نے اُس کی شرط کو اپنی مٹھی میں قید کیا جواب خاموشی سے سرو ہیں رکھے آنکھیں موند چکا تھا۔

-----

”امی یہ آپ صحیح ہی صحیح کہاں جانے کی تیاری کیے بیٹھی ہیں؟“، تقریبادس بجے کے قریب علیزے اپنے کمرے سے نکلتے نیچے آئی تو شاستہ بیگم کو کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”عبدہ کی طرف جا رہی ہوں حنا کی خبر لینے“، پاس کھڑی ملازمہ کو جانے کا اشارہ کرتے انہوں نے علیزے کو اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”امی آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے فضول میں اُن کے گھر کے معاملے میں بولنے کی۔ میرا مطلب حنا آپی تواب تک سب سے معافی مانگ کر اچھی بن گئیں ہوں گی اور آپ ایسے ہی اُن کے حق میں کوئی بات کر کے بری بن جائیں گی“، ٹیبل سے سیپ اٹھاتے علیزے نے ماں کو ہوش کے ناخن لینے کی تاکید کی۔

”ہاں تو پہلے بڑے میرے سر پہ اچھائی کے تنگ لگے ہیں ناجویہ بات کرنے سے بری بن جاؤں گی۔ ویسے بھی رات سے حنا کی حرکت پہ میرا خون کھول رہا ہے اور جب تک میں اُس سے دودو ہاتھ نہیں کر لیتی مجھے سکون نہیں آئے گا“، بیٹی کی بات پہ جذباتی ہوتے شاستہ بیگم نے حنا کے یوں رنگ بدلنے پہ غصے کا اظہار کیا۔

اچھا چھوڑیں اور ادھر آئیں یہاں سکون سے بیٹھ کر میری بات سنیں“، اُن کا غصہ دیکھ کر سیپ واپس ٹیبل پہ رکھتے علیزے نے انہیں اپنے ساتھ لیے ڈرائیگ روم کا رخ کیا۔

”ہاں بولو کیا بات ہے؟“ صوفیہ بیٹھتے شاستہ بیگم نے اُس سے پوچھا جو خود بھی اُن کے قریب بیٹھ چکی تھی۔

”بات یہی ہے کہ آپ کا اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں۔ ایک تو معاملہ اس وقت سارا کاسار اتنا آپی کے ہاتھ میں ہو گا اور دوسرا آپ ابو کے ساتھ ساتھ ماموں کی نظر میں بھی بری بن جائیں گی اس لیے پلیز جو کچھ ہو گیا ہے اُسے بھول جائیں اور مزید بات کو بڑھا کر اپنے لیے مشکلات کھڑی نہ کریں،“، انہیں اُن کے نقصان سے آگاہ کرتے علیزے نے تاکید کی۔

”معاملہ ہاتھ میں ہو یا نہ ہو پر حنا کو یوں اس طرح مجھے بناتا ہے گھر واپس جانا نہیں چاہیے تھا،“، اُس کی بات سنتے تھوڑی برداشت کے ساتھ شاستہ بیگم نے اپنے غصے کا انظہار کیا۔

”اب تو وہ چلی گئی ہیں نا اور انہوں نے آپ کو بغیر بتائے جا کر یہ ثابت کر دیا کہ اُن کی نظر میں آپ کی اہمیت صرف ضرورت کے وقت تک محدود تھی۔ دیکھیں امی کوئی باشوار انسان کسی کی خاطر یا اُس کی باتوں میں آکر اپنا گھر تباہ نہیں کرتا، ہر کسی کو اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہوتا ہے۔ حنا آپی جو کچھ دیر کے لیے بھٹک گئی تھیں انہیں سمجھان کے یوں گرنے اور چوٹ لگنے سے احساس ہو گیا تھا کہ جس طرح اُس کے اپنے سنہال سکتے ہیں اور کوئی نہیں سنہال سکتا اور کوئی سنہالے گا بھی کیوں؟ ہر کوئی اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہے کسی کے پاس کسی کے لیے وقت نہیں تو پھر

کیوں آپ اپنا وقت اور دماغ دونوں ایسے فضول جھگڑوں میں صرف کرتی ہیں؟ کیوں آپ دوسروں کے لیے ساز شیش بنتیں اور انہیں الٹے سیدھے مشورے دیتی ہیں؟ کیا آخرت میں یہ سب لے کر اللہ کے سامنے جائیں گی آپ؟، اپنی بات کو ادھورا چھوڑتے علیزے نے جواب طلب نظر و دیکھا۔

”جب پوچھا جائے گا کہ اپنے شوہر کی فانبرداری کی؟ تو کیا جواب دیں گی؟ جب سوال ہو گا کہ اولاد کی کیسی تربیت کی؟ تو کیا کہیں گی کہ بیٹے کو دوسروں کی زندگی تباہ کرنا سکھائی؟ یہ سیکھایا کہ چند دن کسی سے دل بھلا کر اگلے راستے پہ چل پڑو۔ ابھی بھی دیر نہیں ہوئی ہے اس لیے پلیز آپ دوسروں کی زندگیوں کی منصوبہ بندی کرنے سے اچھا اپنے گھر پہ دھیان دیں اور خاص کر اپنے بیٹے پہ جو آپ کی بے جا ڈھیل کی وجہ سے دن بدن ہاتھوں سے نکل رہا ہے،“ ان کے رتبے کا لحاظ کرتے علیزے نے حتی الامکان اپنے لمحے کو نرم رکھتے انہیں سمجھایا جو اس کی باتوں پہ غور کرتے شرمندگی سے سرجھ کائے کسی گھری سوچ میں گم تھیں۔

-----

”کتنی دیر تک سونے کا ارادہ ہے؟“ نیند سے بیدار ہوتے ہی نور کو کمرے میں نہ پا کر زارون نے  
نیچے جانے کی بجائے معاذ کے کمرے کا رخ کرتے اُس کے چہرے سے کفر ٹھہٹا یا۔

”یار سونے دونا، کل کا تھکا ہوا ہوں“، کفر ٹھہٹ سے اپنے چہرے پہ تانے معاذ نے ستی سے  
دوسری طرف کروٹ بدلتی۔

”کون سا ہل چلا یا تھا کل جو تھک گئے؟ اور اُٹھ جاؤ تھوڑی دیر مجھ سے با تین کرلو پھر مجھے ایک کام  
کے سلسلے میں یونیورسٹی جانا ہے“، پھر سے کفر ٹھہٹ کھینچتے زارون نے اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا  
تاکہ وہ بعد میں اُسے سارا دن گھر سے غائب رہنے پہ طعنے نہ مارے۔

”یونیورسٹی کیوں جانا ہے؟ میرا مطلب تمہاری پڑھائی تو مکمل ہو گئی ہے نا؟“ اس کی بات سن کر  
ایک انگڑائی لیتے معاذ نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے تصدیق چاہی۔

”ہاں پڑھائی تو مکمل ہی ہے بس کچھ دنوں تک ایک پراجیکٹ جمع کراونا ہے بس اُسی سلسلے میں کچھ  
کام تھا“، زمین پہ پڑا کشن اٹھا کر بیڈ پر رکھتے اُس نے اپنے یونیورسٹی جانے کی وجہ تفصیل سے بتائی۔

”اچھا ٹھیک ہے جو بھی کام ہو جلدی کر لینا شام میں تمہیں میرے ساتھ کہیں جانا ہے“، اُٹھ کر  
بیٹھتے معاذ نے سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

”کہاں جانا ہے؟“ حامی بھرنے سے پہلے زارون نے تحقیق کرنا ضروری سمجھا۔ ”ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“

”کیوں تمہاری طبیعت خراب ہے کیا؟“ اُس کی بات کا ٹتے زارون نے فکر مندی ظاہر کی۔ ”نہیں، تمہاری خراب ہے طبیعت بھی اور دماغ بھی جواب تک ایک ہی ضد پہ قائم ہو کر اپنی زندگی کو مزید مشکل بنارہے ہو،“ کفر ٹرنسائیڈپہ کرتے معاف نے اُس کی کلاس لینے کا رادہ کرتے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”اوو تو یہ خبر تم تک بھی پہنچ گئی، تب ہی میں کہوں اتنی بھی کیا ایم جنسی پڑی تھی جو تم دو، ہی مہینوں بعد منہ اٹھائے واپس آگئے،“ اُس کی بات سے اپنی بیماری کے پتا چلنے کا اندازہ لگاتے زارون نے طنز کیا۔

”ہاں تو، تمہیں سیدھا کرنے کے لیے تو مجھے پوری زندگی بھی پاکستان رکنا پڑے تو میں رک جاؤں۔ یہ تو بس دو مہینے کی بات تھی اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے معاف نے بھر پور اعتماد کے ساتھ اُسے اپنے ہونے کا احساس دلایا۔

”ہاں جانتا ہوں مجھے سدھارنے کے لیے تو تم بچپن سے ہی تیار بیٹھے اور یہ بات تمہیں بتائی کس نے؟ یقیناً مہم نے بتائی ہو گی، کیوں کہ اس گھر میں ایک وہی تمہاری جاسوس ہے“، بات بدلنے کی کوشش کرتے زارون نے صحیح ہی صحیح اس موضوع سے ہٹانا چاہا۔

”جس نے بھی بتایا ہو یہ بات اہم نہیں ہے بلکہ کیوں بتایا یہ جاننا ضروری ہے۔ دیکھو زارون میں تمہارا بڑا بھائی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا دوست بھی ہوں۔ ہم دونوں نے بچپن سے لیکر اب تک ہر اچھے برے وقت میں ایک دوسرے کو سنبھالا ہے اور اسی بناء پہ میں تمہاری ضد کا سنتے تمہیں فون پہ سمجھانے یا کہنے کی بجائے خود چل کر تمہارے پاس آیا ہوں تاکہ تمہیں اس کٹھن وقت میں کسی دوسرے کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پڑے۔ مجھے پتا ہے جنید بھائی لوگ مصروف ہیں وہ کچھ دنوں تک واپس چلے جائیں گے ظاہر سی بات ہے ان کے بیوی بچے ہیں بزنس ہے۔ وہ اپنی وہاں کی زندگی چھوڑ کر تمہارے پاس نہیں رک سکتے اور نہ ہی ابو میں اتنی طاقت ہے کہ اگر کل تو تم بستر پہ پڑ جاؤ تو وہ اکیلے تمہیں سنبھال سکیں“، اُس کے چہرے کے تاثرات جانچنے کے لیے معاذ نے اپنی بات میں کچھ وقفہ قائم کیا۔

”اسی لیے میں اپنی جا ب چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاکستان آگیا ہوں تاکہ اچھے سے تمہارا اعلان کرو اسکوں۔ میں جانتا ہوں کہ یہ عمل تکلیف دہ ہو گا مگر چھوٹی سی تکلیف کے بعد اگر تمہاری

زندگی میں آسانی آرہی ہے تو اس میں کیا برائی ہے؟ کیوں تم بار بار علاج کے لیے منع کر رہے ہو؟“، معاذ نے اتنی لمبی تمہید جس مقصد کے لیے باندھی تھی اُس پر آتے سوال کیا۔

”میں نے پہلے انکار کیا تھا پر اب مجھے سمجھ آگئی ہے کہ میرا اعلان کروانا ضروری ہے باقی زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ تم اتنے سالوں کی محنت سے حاصل کی گئی جا ب کیوں چھوڑ آئے ہو؟ پاگل ہو کیا؟! بھی تو موقع تھا کہ اپنے مستقبل کو مزید ترقی یافتہ بناسکو اور تم ہو کے ایک فضول سی بات کے لیے سب چھوڑ چھاڑ کر یہاں میرا اعلان کروانے پہنچ گئے“، اُس کی بات سننے زارون نے اُس کی بیوی قوئی پر کوستے ہوئے تنقید کی۔

”میرے لیے کوئی بھی ترقی تم سے زیادہ اہم نہیں ہے باقی میرا رزق اُس جگہ پر اتنا ہی لکھا تھا اس لیے خود کو اس بات کا قصور وار مانتے میرے خلوص اور محبت کی تو ہیں مت کرو“، اُس کی تنقید پر جذباتی ہوتے معاذ نے ڈائیلاگ مارا تو زارون نے اُس سے گھورتے ہوئے اپنے بازو پھلانے۔

”حد ہے کوئی اپنی محبوبہ کے لیے بھی اتناسب نہیں کرتا جتنا میں نے تمہارے لیے کر دیا اور تم ہو کہ خالی سینے سے لگانے سے کام چلا رہے ہو“، اُس سے بغل گیر ہوتے معاذ نے اُس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر چھیڑا۔

”ہاں ہاں چلا جاؤں گا شام کو ڈاکٹر کے پاس اب تمام جذباتی مت ہوا اور اٹھ کر فریش ہو کر نیچے آجائے میں جب تک ناشتے کا بولتا ہوں“، اُس کی بات کا مقصد سمجھتے زارون نے اپنی رضامندی ظاہر کی اور باہر کی جانب بڑھا۔

---

”رابعہ آپ کا آج بھی شاپنگ کرنے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟“، اُس سے خاموشی سے ٹوٹی کے سامنے بیٹھے کسی ڈرامے میں مگن دیکھ کر حدیہ نے فکرمندی سے سوال کیا۔

”ارادہ ہے پر موڈ نہیں“، ساتھ میں موجود باؤل میں سے چیپس اٹھا کر کھاتے اُس نے انکار کرتے حدیہ کو مزید تپایا جو کافی دونوں سے اُس کے آسرے پہ بیٹھی اپنا ایک بھی سوت خرید نہیں پائی تھی۔

”کیا مطلب موڈ نہیں ہے؟ آپ نے کل کہا تھا ناکہ آج آپ سارا دن میرے ساتھ میری شاپنگ کریں گی“، اُس کے انکار پہ صدمے سے ہکلاتے حدیہ نے اُس کے الفاظ کے متعلق یاد اہانی کروائی۔

”ہاں بھئی کہا تھا پرمی نے صحیح ہی مجھے فضول کاموں کے لیے بلاوجہ گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا ہے،“ ایک اور چیس اٹھا کر منہ میں رکھتے رابعہ نے اُس کے زخموں میں نمک چھڑ کا۔

”مطلوب آپ کو میں اور میرے کام فضول لگتے ہیں،“ ٹھیک ہے بھئی ابھی تو شادی کے دن فائیل ہوئے ہیں تو بہن سے یوں نظریں پھیر رہیں اُسے فضول کہہ رہی، شادی کے بعد تو پتا نہیں کیا کریں گی،“ رابعہ کی بات پہ اچھا خاصاً برا مناتے حدیہ نے منہ پھلاتے وہاں سے جانا چاہا۔

”اچھا اچھار کو، تم تو سچ میں ناراض ہو گئی یار میں تو ویسے ہی تمہیں تنگ کر رہی تھی،“ باول جلدی سے صوف پہ رکھتے اُس نے اٹھ کر حدیہ کو روکا جو اُس کی بے رخی پہ باقاعدہ رو نا شروع کر چکی تھی۔

”تو اور کیا کروں امی ہیں اُن کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں ابو اور بھائی اپنے کاموں میں مصروف ہیں اور ایک آپ ہیں جو پچھلے ایک ہفتے سے مجھے نخرے دکھار ہیں۔ حد ہے مجھے کسی سے بات ہی نہیں کرنی،“ اپنے کندھے پہ دھر اُس کا ہاتھ ہٹاتے حدیہ نے دلبر داشتہ ہوتے شکوہ کیا۔

”اُفف میں نے کب نخرے دکھائے ہیں، میں تو خود چاہار ہی تھی کہ مجھے موقع ملے تو میں تمہیں بھئی اچھی سی شاپنگ کروادوں تاکہ میری چھوٹی سی بہن سب سے پیاری لگے،“ اُس کی تھوڑی پکڑتے رابعہ نے لاڈ سے کہا تو حدیہ نے کچھ کہنے کی بجائے اُسے اپنے حصار میں لیا۔

”کیا ہوا؟ خیریت ہے نآج بہن پہ بہت پیار آرہا ہے“، کافی دنوں سے اُس کی الجھی ہوئی طبیعت اور بات بات پہ چڑنے کی عادت کو دیکھتے جہاں سب لوگ پریشان تھے وہیں رابعہ کو اچھے سے معلوم تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔

”آپ پلیز آپ شادی نہ کریں، میرا مطلب ابھی نہ کریں م وہ آپ کے بغیر میرا دل کیسے لے گا۔ آپ کے جانے کے بعد میں کس سے لڑوں گی؟ کس سے اپنے دل کی باتیں کیا کروں گی؟ میں بالکل اکیلی ہو جاؤں گی، پلیز آپ ارحم بھائی کو ابھی منع کر دیں“، اُس کے اُس گھر سے چلے جانے پہ جذباتی ہوتے حدیہ نے ایک ہی سانس میں اپنی بات مکمل کی۔

”ہاں تاکہ وہ میرے انکار پہ کوئی اور لڑکی پسند کر کے اُس سے شادی کر لے اور میری جان میں کون سا ہمیشہ کے لیے یہاں سے جا رہی ہوں، یہی پاس ہی بمشکل دس پندرہ منٹ کے فاصلے پہ تو گھر ہے کون سادوسراے شہر میری شادی ہو رہی ہے۔ تم جب کہو گی میں آجاوں گی اور جب تمہارا دل چاہے گا تم مجھ سے ملنے آ جانا“، اُس کے آنسو صاف کرتے رابعہ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے پر آپ وعدہ کریں کہ میں جب بھی آپ کو آنے کا کہوں گی آپ کوئی بہانہ نہیں بنائیں گی اور فوراً سے میرے پاس آ جائیں گی“، ہاتھ آگے بڑھاتے حدیہ نے اُس کی بات سمجھنے کے بعد بھی

بے یقینی دکھاتے اُس سے وعدے لیا۔ ”ٹھیک ہے میری بہن جب بھی مجھے بلائے گی میں آجائوں گی بس اب تم یہ رونے دھونے میں وقت ضائع نہ کرو اور جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ پھر ہم شاپنگ کے لیے نکلتے ہیں“، اُس کے ہاتھ میں ہاتھ رکھتے رابعہ نے اُس کے دل کی تسلی کے لیے اُس کامان رکھا۔

”ٹھیک ہے میں بس دس منٹ میں تیار ہو کر آتی ہوں آپ بھی جب تک چینچ کر لیں“، اُسے گھر کے کپڑوں میں دیکھ حدیہ نے خوش ہوتے اپنا چہرہ صاف کیا اور اُسے تاکید کرتے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

”آف ف یہ لڑکی بھی ناپاگل ہی ہے مجھے بھی رلا دیا“، اُس کے جاتے ہی اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتے رابعہ نے خود کلامی کی اور ایک نظر پورے گھر پہ ڈالتے جلد ہی وہاں سے رخصت ہونے کے خیال پہ ایک دم سے افسردہ ہوئی۔

”حبہ بیٹا یہ لو اپنے ٹکٹ اور پاسپورٹ سن بھالو“، تقریباً دوپھر دو بجے کے قریب آندھی صاحب نے سارے معاملات نمائانے کے بعد گھر واپس آتے دونوں چیزیں اُس کے حوالے کیں۔

”کس دن کی سیسیٹس کنفرم ہوئیں ہیں؟“، حبہ کو ٹکٹکھوں کر دیکھتا پا کر سارہ بیگم نے سوال کیا۔  
 ”پرسوں شام کی ہیں اور لاہور سے ہو نہیں رہی تھیں تو میں نے اسلام آباد سے کروادیں اس لیے  
 اب تم لوگ شام کی نہیں بلکہ صحیح کی تیاری کر کے رکھنا تاکہ جانے میں کوئی تاخیر نہ ہو“، ان کی  
 بات کا جواب دیتے آفندی صاحب نے ساتھ ہی انہیں تاکید کی۔

”اسلام آباد سے کیوں؟ میرا مطلب پہلے ہم لوگ چار گھنٹے کا سفر کر کے اسلام آباد جائیں گے اور پھر  
 آگے بھی اتنا مبارکہ سفر وہ بھی بچوں کے ساتھ“، اسلام آباد کے نام پر چونکتے سارہ بیگم نے بمشکل اپنے  
 لہجے کو ہموار کیا۔

”ہاں میں تو یہی چاہ رہا تھا کہ لاہور سے ہی ہو جائیں پر جس ائیر لائن کی سیسیٹس مل رہی تھیں ان کی  
 کار کر دی گی کچھ خاص نہیں اسی لیے میں نے تم لوگوں کے تحفظ کی خاطر لمبے سفر کو ترجیح  
 دی“، آفندی صاحب نے تفصیل کے ساتھ انہیں آگاہ کرتے حبہ کو چائے لانے کا کہا جوا بھی تک  
 ٹکٹھا تھا میں لیے گم صم سی کھڑی تھی۔

”جی ابو میں بس یہ کمرے میں رکھ کر بناتی ہوں“، ان کی بات پہ ہوش میں آتے وہ بمشکل مسکراتی  
 اور سست قدم اٹھاتے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئی۔

”یہ آپ نے اچھا نہیں کیا، بھلا کیا ضرورت تھی آپ کو اسلام آباد سے لکٹ کروانے کی“، حبہ کے جاتے ہی سارہ بیگم نے کسی خدشے کے تحت آفندی صاحب کو ان کی غلطی کا احساس دلایا۔

”کیا مطلب؟ اس میں اچھا نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟“، ان کی بات پہنچھی سے سوال کرتے انہوں نے سوالیہ نظرؤں سے مقابل کو دیکھا۔

”مسئلہ تو کوئی نہیں ہے پر پھر بھی آپ کو پتا تو ہے زارون اسلام آباد میں رہتا ہے۔ میرا مطلب حبہ کو ایک بار پھر سے اُس کے شہر میں جا کر پریشانی ہو گی“، پہلیاں بجھوانے کی بجائے سید حامد ع کی بات پہنچھی سارہ بیگم نے فکر مندی ظاہر کی۔

”اففف سارہ بیگم حبہ اب پانچ سال پہلے والی ایک عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ اب بڑی ہو چکی ہے دو بچوں کی ماں ہے اور اپنے اچھے اور بے عمل کے بارے میں ہم سے بہتر سمجھتی اور جانتی ہے اس لیے پلیز آپ ایسی فکریں پال کر خود کو کسی نئی بد گمانی میں گرفتار نہ کریں“، ان کی بات پر سختی سے ڈپٹے آفندی صاحب نے ان کی سوچوں کو وہیں پہ بریک لگوائی۔

”میں کون سا کہہ رہی کہ وہ بچی ہے پر آپ نے دیکھا نہیں کہ اسلام آباد کے نام پہ اُس کے چہرے پہ کیسی چمک آگئی تھی۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ کوئی بیو قوئی کرے گی مگر پھر بھی میرے دل میں

ایک چور سا بیٹھ گیا ہے، ان کی سختی پر برہم ہونے کی بجائے سارہ بیگم نے نرمی کے ساتھ انہیں اپنی پریشانی بتائی۔

”اففف کیوں پریشان ہو رہی ہیں آپ؟ بے فکر ہیں کچھ نہیں ہوتا“، حبہ کو واپس سیرھیاں اُترتا دیکھ آفندی صاحب نے سارہ بیگم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا جو مزید کچھ بولنے والی تھیں۔

-----

یونیورسٹی سے فارغ ہوتے زارون نے گھر کا رخ کیا جہاں معاذ اُسی کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

”یار میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ وقت پہ واپس آ جانا پر تم نے پھر بھی پانچ بجاء دیا تو معاذ نے گیٹ سے باہر آتے اُس کی کلاس لی۔

”ہاں بس کچھ کام نکل آیا تھا“، اُس کے بیٹھتے ہی گاڑی ریورس کرتے زارون نے معذرت کے ساتھ اُسے آگاہ کیا۔

”جو بھی تھا کام صحت سے زیادہ ضروری نہیں ہیں اور تمہیں پتا تھا ناکہ ڈاکٹر کا پانچ بجے کا ٹائم لیا ہے تو کیوں اتنی لاپرواںی بر تھے ہو“، ایک بار پھر سے موقع ملنے پہ معاذ نے اُس کی کھنچائی کی۔

”اچھا نابس کرو صح سے لتنی بارڈانٹ چکے ہو مجھے“، منہ بسورتے زارون نے اب کی باراؤں کی سختی پہ خفگی کا اظہار کیا۔

”ہونہ بس ڈرامے کروا لو، حد ہے انسان خود بھی تھوڑا دھیان رکھتا ہے پر نہیں یہاں تو شروع سے لا پرواپیاں کرنے کی عادت ہے جناب کو“، اُس کے جذباتی پن سے متاثر ہونے کی بجائے معاذ نے صاف الفاظ میں اُس کی بے عزتی کی۔

”ٹھیک ہے مجھے جانا ہی نہیں ہے۔ حد ہے ایک تو میں نے بغیر منتیں کروائے تمہاری بات مانی اور ڈاکٹر کے پاس جا رہا اور تم ہو کہ مجھے باتیں سنائے جا رہے ہو“، گاڑی سائیڈ پہ کرتے زارون نے بریک لگائی۔

”تھپٹر بھی کھاؤ گے مجھ سے اگر یہاں سڑک پہ کوئی بد تمیزی کی اور چپ کر کے گاڑی چلاو ورنہ میں ابو کو کال کر کے بتا دوں گا“، اُس کی اکڑ دیکھے معاذ نے احمد صاحب کا نام لیتے دھمکی دی۔

”ٹھیک ہے کرو، اپنا شوق پورا کر کے دیکھ لو مگر جب تک تم مجھ سے وعدہ نہیں کرتے میں یہ گاڑی ایک انج بھی یہاں سے نہیں ہلاوں گا“، اپنی ہٹ دھرمی قائم رکھتے زارون نے چابی نکالتے اپنے ہاتھ میں پکڑی۔

”کیسا وعدہ؟“، ابر و اچکاتے معاذ نے سوالیہ نظر وں سے اُسے دیکھا۔

”یہی کہ تم اب مجھے کسی بات پہ نہیں ڈالن گے اور یہ بھی کہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو تم نور کا خیال رکھو گے“، اُس کا ہاتھ تھامتے زارون نے مذاق والے لمحے کو ایک دم سے سنجیدہ بناتے اُس کی طرف دیکھا۔

”بکواس نہ کرو اور چپ کر کے گاڑی چلاو، پتا نہیں کیا کیا سوچتے رہتے ہو“، اپنا ہاتھ چھڑواتے معاذ نے اُس کی بات پہ گڑ بڑاتے ہوئے آنکھیں نکالیں۔

”ہونہ بس اپنے پہ بات آئی تو ساتھ ہی بھیگی بلی بن گئے“، اپنے الفاظ پہ غور کرتے زارون نے نظر کرتے خاموشی اختیار کی اور گاڑی اسٹارٹ کرتے ہسپتال کی جانب موڑتے اپنی موبائل کی جانب متوجہ ہوا جہاں کسی اجنبی نمبر سے کال آر ہی تھی۔

-----

”ہیلو“، کال ریسیو کرتے زارون نے دوسری جانب موجود شخص کو مخاطب کیا۔

”ہیلو؟ کون ہے بھئی؟ ہیلو؟“، دوسری طرف مسلسل خاموشی پہ اُس نے موبائل کان سے ہٹاتے مقابل کے لائے پہ ہونے کا یقین کیا۔

”ہیلو؟ کون ہے؟“ پھر سے موبائل کان سے لگاتے اُس نے کچھ سینڈز کے لیے دوسری جانب سے جواب کا انتظار کیا۔

”اُفف پتا نہیں کہاں کہاں سے اٹھ کر آ جاتے ہیں جب بات نہیں کرنی تو دوسروں کو تنگ کرنے کا مقصد“، بے زاری کی ساتھ کال کاٹتے اُس نے موبائل سامنے ڈیش بورڈ پر رکھا۔

”ہاں تو جو نمبر پہچان میں نہیں آتا اُس سے کال ریسیو کیا ہی نہ کرو“، اُس کی بات سنتے معاذ نے مشورہ دیا۔

”ہونہہ اتنی سمجھ مجھ میں بھی ہے پر پھر بھی میں انجان نمبر سے کال اس لیے ریسیو کر لیتا ہوں کہ ہو سکتا کوئی اپنا مصیبت میں ہو“، اُس کے مشورے پر عقل مندی کے ساتھ زارون نے اپنے کال ریسیو کرنے کا مقصد بتایا۔

”اچھا بس زیادہ باتیں نہ کرو اور گاڑی کی اسپیڈ تھوڑی تیز کرو ہمیں پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے“، موبائل پر ساڑھے پانچ ہوتے دیکھ معاذ نے اُسے باتوں کی بجائے ڈرائیونگ پر دھیان دینے کا کہا تو زارون نے اُس کے غصے پر مسکراتے گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔

-----

”کیا کر رہی ہو؟“، کچن میں آتے نور کو کچھ بنانے میں مصروف دیکھ جنانے اُسے مخاطب کیا۔

”کچھ نہیں، بس نوڈ لز کھانے کا دل چاہ رہا تو وہی بنارہی ہوں“، جنانے کے لمحے میں مٹھاس دیکھ نور نے اپنی حرمت چھپاتے نرمی سے بتایا۔

”اچھا ٹھیک ہے تھوڑے زیادہ بنالینا میں بھی تمہارے ساتھ کھالوں گی“، ایک نظر چوہہ پہ رکھے پین میں جھانکتے جنانے للچاتے ہوئے اُس سے درخواست کی۔

”جی ٹھیک ہے۔ میں بنادیتی ہوں“، اُس کے اپنے ساتھ بدلتے ہوئے دوستانہ رویے پر پیشان ہوتے نور نے اُس کی بات سننے اثبات میں سر ہلا کیا اور واپس سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔

”تم ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟“، اُس کی خاموشی پہ جنا جو اُسے اکیلا پا کر اُس سے معذرت کرنے آئی تھی مدعے کی بات پہ آتے پوچھنے لگی۔

”نہیں میں بھلا آپ سے کیوں ناراض ہوں گی؟“، اُسے سلیپ کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا دیکھ نور نے حتی الامکان اُس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔

”میں نے تمہارے ساتھ بُرا کیا، تمہیں بتیں سنائی اور تمہاری امی کے گھر جا کر جو تماشہ کیا وہ سب کسی بھی صورت قابل معافی نہیں ہے پر پھر بھی یہ تمہاری اور زارون کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ تم

دونوں نے مجھے میری غلطیوں پہ شرمندہ نہیں کیا، اُس کی بات سنتے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ سجائے حنا نے شرمندگی کے ساتھ سر جھکایا۔

”وہ سب پرانی باتیں تھیں جو مجھے اب یاد بھی نہیں اس لیے پلیز آپ بھی یوں ان باتوں کا ذکر کر کے خود کو تکلیف نہ دیں“، چولہابند کرتے نور نے اُسے شرمندہ دیکھ بات کو بدلنے کی کوشش کی۔

”یہ تکلیف میری اپنی ہی خریدی ہوئی ہے اس لیے پلیز اگر تمہارے دل میں میرے کیے گئے عمل پہ کوئی بھی غصہ یا ناراضی ہے تو میں تم سے اُس کے لیے معافی مانگتی ہوں“، اُس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے حنا نے ایک بار پھر سے ندامت کا اظہار کیا۔

”بھا بھی پلیز آپ بڑی ہیں میری اور مجھے سچ میں آپ کی کسی بات پہ کوئی غصہ نہیں اس لیے آپ بھی یہ سب خدشات اپنے دل و دماغ سے نکال دیں“، جلدی سے آگے بڑھ کر اُن کے ہاتھ پنج کرتے نور نے کھلے دل کے ساتھ اُسے معاف کرتے اپنی طرف سے مطمئن کیا۔

”بہت اچھی ہو تم اللہ پاک تمہیں اس اعلیٰ طرفی کا اجر دے“، اُس کے عمل پہ مسکراتے حنا نے اپنی نم ہوتی آنکھوں کو صاف کیا۔

”آپ بھی بہت اچھی ہیں بس کبھی کبھی تھوڑی غصے والی بن جاتیں“، اُس کی تعریف پر نظر وں میں شرارت لیے نور نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو حنا نے اُسے مصنوعی گھوری سے نوازا جواب نوڈ لز باؤل میں نکالتے ٹیبل پر رکھ چکی تھی۔

---

”امی کیا سوچا ہے پھر آپ نے؟ کب رشتہ لے کر جا رہی ہیں ماہوم کی طرف؟“، اُن کے ساتھ اُن کی الماری کے کپڑے سیٹ کرواتے ماہم نے اُن کے ارادے کی بارے میں استفسار کیا۔

”کیا معاذ مان گیا؟ میرا مطلب تم نے اُس سے اس بارے میں بات کی؟“، اُس کے ذکر کرنے پر عابدہ بیگم نے ایک دم سے خوش ہوتے سوال کیا۔

”جی میں نے بات کر لی تھی، پہلے تو انکار کر رہا تھا پھر میں نے تھوڑا سمجھایا تو مان گیا“، اپنی کار کردگی بتاتے ماہم نے فخر کے ساتھ انہیں یہ خبر دی۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے ایک مسئلہ توصل ہوا، بس اب میں جلد ہی تمہارے ابو سے بات کر کے احسان بھائی کی طرف جاؤں گی“، اُس کی زبانی معاذ کی رضامندی جان کر عابدہ بیگم نے چہرے پر چمک لیے اپنی بات مکمل کی۔

---

”جی بس ہمارے ہوتے ہوتے ہی بات پکی کر لیں تاکہ اگلی بار جب ہم لوگ انہیں تو معاذ کی شادی کریں“، ماہم نے پر جوش ہوتے ماں کو تاکید کی جو اثبات میں سر ہلاتے اُسے جلدی ہاتھ چلانے کا کہتے تھے کیے کپڑے اٹھا کر الماری میں رکھنے لگیں۔

---

تقریباً نوبجے کے قریب وہ ڈاکٹر کو چیک اپ کروانے اور اُس کے لکھے گئے کچھ ٹیسٹ کے نمونے دینے کے بعد فارغ ہوئے تو معاذ نے واپسی پہ خود ڈرائیونگ سیٹ سنپھال لی۔

”یہ تم کہاں لے کر جا رہے ہو مجھے؟“ گاڑی کا رخ گھر کی بجائے کسی اور راستہ پر دیکھ زارون نے سوال کیا۔

”کہیں نہیں یا روہ جب تم لبارٹری میں تھے ناتوت شر جیل بھائی (ماہم کا شوہر) کی کال آئی تھی، کہہ رہے تھے کہ مجھے گھر سے آکر لے جاؤ گاڑی خراب ہے میری“، نظریں سامنے سڑک پہ مرکوز رکھنے معاز نے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”شر جیل بھائی؟ انہیں کس گھر سے لینا ہے؟“ اُس کی بات پہ نامسحیحی کے ساتھ زارون نے ایک اور سوال کیا۔

---

”اُن کے امی ابو کے گھر سے لینا ہے وہ کل میرے ساتھ ہی پاکستان آئے تھے اور میری طرح اُن کے سرپر بھی ماہم کو سرپر ائزدینے کا بھوت سوار تھا اسی لیے مجھے انہوں نے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا“، پوری بات تفصیل سے بتاتے معاذ نے اُس کی حیرت کو ختم کیا۔

”اچھا اتویہ بات ہے، میں بھی کہوں کہ شر جیل بھائی کا ذکر اس وقت کہاں سے آٹپکا اور اُن کی ملاقات تم سے کیسے ہوئی؟ میرا مطلب وہ تو الگ ملک میں ہیں نا؟“ اُس کی ساری بات سننے کے بعد زارون نے اُن کی چالاکیوں پہ مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

”ہاں بس وہ کسی کام کے سلسلے میں سعودیہ آئے تھے، میں نے پاکستان آنے کی بات کی تو اُن کا وہیں سے پرو گرام بن گیا“، اُس کی الجھن دور کرتے معاذ نے سڑک خالی پا کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھائی۔

”ہم اچھا کیا اب بچوں کے ساتھ ہی کچھ دن رک جائیں گے“، اُس کی بات سننے زارون نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور معاذ سے اُس کے اگلے ارادے کے بارے میں پوچھنے لگا۔

-----

”آپی؟ کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ آپ کیوں ایک دم سے اتنی اچھی بن گئیں ہیں؟ میرا مطلب یہ اچھے پن کا صرف ڈرامہ ہے یا حقیقت؟“، ہما جو حنا کے بد لے ہوئے روئے کو دیکھ کل سے ہی پریشان تھی اب اُسے کافی دیر تک نور کے ساتھ بیٹھے با تین کرتادیکھ کر پوچھنے لگی۔

”یہ حقیقت ہے جس سے تم بھی جتنی جلدی سبق حاصل کر لو بہتر ہے۔ یہ بعض اور حسد کسی دوسرے انسان سے زیادہ آپ کی اپنی ذات کو نقصان پہنچاتا ہے اس لیے تم بھی میرے کسی بھی مشورے پر عمل کر کے خود کو اس آگ کی لپیٹ میں قید مت کرنا“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے حنا نے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”میں نے سب کو ہارنے اور نیچا دکھانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، چال پہ چال چلتی گئی یہ سوچ بغیر کہ کل کو یہ چالیں مجھ پر الٹی پڑ سکتی ہیں اور جانتی ہو؟ جب میں نے سبھاں کو خون میں لٹپٹ اپنے ہاتھوں میں بے جان ہوتے دیکھا تو میں ہار گئی، میری ساری چالاکیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ میں جو سب کو نیچا دکھانا چاہتی تھی خود ہی اُن لوگوں کے سامنے تماشہ بن گئی“، اپنے ہاتھ کا ہلاکا دباو اُس کے کندھے پر ڈالتے حنا نے بہن کی آنکھوں میں دیکھا جہاں اس وقت حیرت کے سوا کچھ نہ تھا۔

”جس زارون کو میں نے سب کے سامنے نشر کیا اُس کی بیماری کو تماشہ بنانے کی کوشش کی اُسی کی وجہ سے بروقت علاج سے میرے بیٹے کی جان بچ گئی۔ اللہ پاک نے مجھے اُسی انسان کے ہاتھوں بے بس کیا جسے میں نے اپنی طاقت دکھاتے رسوأ کرنا چاہا تھا“، ایک گہری سانس لیتے ہنانے اُس کے سامنے اپنے احساسات کو بیان کیا جو اُس کے رویے کو بس ڈرامہ تصور کرتے اُس سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھی۔

”مطلوب آپ کو سچ میں اپنی غلطیوں کا احساس ہے؟“ بے یقینی کے ساتھ ہمانے ایک بار پھر سے سوالیہ نظر وں سے اُسے دیکھا۔

”احساس ہے تب ہی تو میں نے سب سے معافی مانگی ہے اور ہاں تم جو کہتی تھیں ناکہ مزمل سختی کرتے وہ مجھے ایسی ولیسی کوئی بات نہیں کرنے دیتے تو وہ بالکل ٹھیک کرتا ہے۔ مرد کی سختی عورت کو کئی برا بائیوں سے روک لیتی ہے اس لیے دوبارہ اُس کی ڈانٹ پر اُسے بُرا بھلا کہنے کی بجائے اس بات پر غور کرنا کہ اُس نے کس وجہ سے تمہیں اُس کام یا بات سے روکا“، زندگی میں پہلی بار بڑی بہن ہونے کا فرض نبھاتے ہنانے اُسے تاکید کی اور جنید کی آواز پر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

”اُفف یہ آپی کادماغ سچ میں ہل گیا ہے“، اُس کے منہ سے اتنی اچھی باتیں سن کر ہمانے جھر جھری لی اور چائے بنانے کا رادہ ترک کرتے کچن سے نکلتے ایمان کو دیکھنے کے لیے لان کی جانب بڑھی جہاں وہ عبیرہ کے ساتھ کھلینے میں مصروف تھی۔

---

کچھ ہی دیر میں وہ دونوں شر جیل کو لے کر گھر پہنچ تو سب نے حیران ہوتے اُس کا استقبال کیا۔ عبیرہ اور عثمان باپ کو دیکھ کر چہروں پہ چمک لیے اُس سے ملے جس کی نظریں مسلسل ایک نئے چہرے کا طواف کرنے میں مصروف تھیں۔

”نور تم وہاں کیوں کھڑی ہو؟ ادھر آؤنا“، شر جیل کی نظریوں میں الجھن دیکھ ماہم نے سب سے الگ کھڑے اُس فرد کو آواز دی۔

”السلام علیکم“، اُس کے پاس آتے نور نے شر جیل کو سلام کیا۔

”و علیکم السلام، یہ نور ہے؟“ اُس کے سر پہ ہاتھ رکھتے شر جیل جو اسے ماہم کی دکھائی گئی تصویروں میں دیکھ چکا تھا تصدیق کے لیے پوچھنے لگا۔

”جی یہ نور ہی ہے۔ دیکھا میں نے کہا تھا انکہ یہ تصویروں میں نظر آنے والی نور سے بھی زیادہ پیاری اور معصوم ہے“، اس کے کندھوں کو تھامے ماہم نے شر جیل کی نظروں میں حیرانگی دیکھ فخر سے کہا۔

”ہاں، ماشاء اللہ بہت پیاری ہے“، ایک نظر پھر سے اس کے چہرے کو دیکھتے شر جیل نے تعریف کی اور اپنے جیب سے والٹ نکالتے چند ہزار کے نوٹ نکالتے اس کی جانب بڑھائے۔

”نہیں بھائی آپ رہنے دیں“، نور جو اسے دیکھ کر پہلے ہی کچھ کنفیوژنی تھی اس کے بڑھائے ہوئے پسیوں سے انکار کرتے نفی میں سر ہلاکئی۔

”کیوں بھئی؟ رہنے کیوں دیں شر جیل بڑے ہیں تم سے اور ان کی ملاقات تم سے پہلی بار ہوئی ہے نا اسی لیے دے رہے ہیں۔ رکھ لو“، کسی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ماہم نے کہنے کے ساتھ ہی شوہر کے ہاتھ سے پسیے لیتے نور کو تھامے جو پریشان سی نظروں سے سامنے کھڑے زارون کو دیکھنے لگی۔

”شکر یہ بھائی“، دوسری طرف سے اجازت ملنے پسیے لیتے نور نے شر جیل کا شکر یہ ادا کیا جواب جنید کو بیرونی دروازے سے اندر آتا دیکھ اس کی جانب متوجہ ہوا۔

-----

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ سب کے ساتھ بیٹھا باتوں میں مصروف تھا جب پھر سے شام والے نمبر سے اُسے کال موصول ہوئی جسے رسیسو کرنے کی بجائے منقطع کرتے اُس نے موبائل آف کر دیا۔

”معاذ تمہیں تمہارے ابو کمرے میں بلار ہے ہیں“، احمد صاحب جو کچھ دیر پہلے ہی آرام کی غرض سے اٹھ کر کمرے میں گئے تھے انہوں نے عابدہ بیگم کے ہاتھ معاذ کو بلا وابھیجا جو اثبات میں سر ہلاتے سب کے درمیان سے اٹھتے لاونچ سے نکل گیا۔

”آجائیں“، دروازے پہ دستک کی آواز سننے احمد صاحب نے اجازت دینے کے ساتھ ہی آنے والے کو دیکھا۔

”او معاذ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا“، اُس پہ نظر پڑتے ہی انہوں نے ٹانگیں سیمٹتے اُسے اپنے قریب ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”جی ابو، کہیں کوئی کام تھا؟“، اُن کے تاثرات سے اندازہ لگاتے معاذ نے اُن کے قریب ہی بیڈ پہ بیٹھتے سوال کیا۔

”نہیں، اس وقت کیا کام ہونا مجھے بس تم سے یہ پوچھنا تھا کہ ڈاکٹر نے کیا کہا؟ مطلب کب تک وہ کیموشروع کریں گے؟“ مدعا کی بات پر آتے احمد صاحب نے اُسے بلا نے کا مقصد بیان کیا۔

”چیک اپ کیا ہے اور کچھ ٹیسٹ کے نمونے لیے ہیں جن کی رپورٹ آنے کے بعد ہی وہ کیموا بتائے گے“، معاذ نے ڈاکٹر کی بتائی گئی بات سے اُن کو آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے بس تم اب کل یاد سے رپورٹ لے کر ڈاکٹر کو چیک کروالینا تاکہ جو بھی علاج وہ کرنا چاہتے ہیں اُس میں مزید تاخیر نہ ہو“، اُسے ہدایت دیتے احمد صاحب نے تاکید کی۔

”جی میں لے لوں گا اور آپ پریشان نہ ہوں۔ زارون ماشاء اللہ سے ٹھیک ہے اب“، اُن کی فکر دیکھ معاذ نے اثبات میں سر ہلانے کے ساتھ ہی انہیں تسلی دی جو زارون کی بیماری کو لے کر کافی پریشان تھے۔

”تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ سو جانا“، تقریباً رات دو بجے کے قریب وہ کمرے میں آیا تو نور کو اپنے موبائل میں مصروف دیکھ کہنے لگا۔

”آپ کو پتا ہے ناجھے آپ کے بغیر نیند نہیں آتی“، اسکرین سے نظریں ہٹاتے اُس نے مقابل کی جانب دیکھتے شکوہ کیا۔

”ہاں پتا ہے اور اس بات کو میں اچھے سے سمجھتا بھی ہوں کہ تمہیں کیوں میرے بغیر نیند نہیں آتی“، اپنی بات ادھوری چھوڑتے زارون نے لائٹ آف کی اور بیڈ پر اپنی سائیڈ پر آگر لیٹ گیا۔

”کیوں نہیں آتی؟“ اس کے لیٹتے ہی نور نے موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھتے آگے ہو کر اس کے کندھے پر سر رکھ کے سوال کیا۔

”اسی لیے کہ سونے سے پہلے جب تک تم مجھے تنگ نہ کرو تمہیں سکون نہیں آتا اور ہاں دو تین بار لڑنا بھی تو ہوتا ہے ناتم نے“، اس کی طرف کروٹ لیتے زارون نے نظروں میں شرارت لیے اُسے چھیڑا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ حد ہے، میں کب لڑتی ہوں؟“ نور جو اس کے منہ سے اپنی تعریف کے انتظار میں تھی سرخ ہوتی آنکھوں سے اُسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کب نہیں لڑتیں؟ صبح، دوپہر، شام رات ہر وقت بس ایک ہی بات زار آپ بُرے ہیں، میں آپ سے بات نہیں کر رہی، بھاڑ میں جائیں آپ“، اس کی نقل اُترتے زارون نے اس کی کمرپہ دباو ڈالتے اپنے قریب کیا۔

”تو یہ میرا حق ہے۔ میں جب چاہے لڑوں اور جب چاہے آپ سے پیار کروں میری مرضی“، شان بے نیازی سے کہتے نور نے اُس کے باعث رخسار پہ بوسہ دیتے سر اُس کے سینے سے ٹکایا۔

”ہاں بس سارے حق تمہارے ہی ہیں۔ مجھ غریب کے حصے میں تو بس ہر وقت تمہاری تابعداری کرنا اور بتیں سننا ہی آتا“، اُس کی حرکت پہ مسکراتے زارون نے نرمی سے اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا جو ہمیشہ کی طرح آج بھی کھلے تھے۔

”کیا ہوا؟ طبیعت ٹھیک ہے؟“ کچھ سیکنڈز تک دوسری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر زارون نے پیچھے ہوتے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا جو آج پہلے کی نسبت کچھ چپ چپ سی تھی۔ ”جی ٹھیک ہوں بس سر میں درد ہے اور نیند بھی آرہی ہے“، اُس کی فکر پہ جواب دیتے نور نے آنکھیں موندیں۔

”ہاں جب رات دو دو بجے تک موبائل پہ گیم کھیلتی رہو گی تو سر ہی درد کرنا نا؟“ تینی بار میں نے تمہیں سمجھایا ہے کہ رات کو موبائل استعمال مت کیا کرو پر تم میں توازن نام کی کوئی چیز ہی نہیں، ہاتھ اُس کی پیشانی پہ رکھتے زارون نے ہلاکا ساد باؤڈا لتے اُسے ڈانٹا جو جواب دینے کی بجائے واپس سر اُس کے سینے ساتھ لگا چکی تھی۔

”نور کیا مسئلہ ہے؟ کوئی بات ہے کیا؟ کسی نے کچھ کہا ہے تو مجھے بتاؤ؟“ اُسے یوں خاموش دیکھ زارون نے فکر کے ساتھ اُس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھاما۔

”نہیں، کسی نے کچھ نہیں کہا، پتا نہیں مجھے گھبراہٹ سی ہو رہی ہے“، اُس کے پوچھنے پہ جواب دینے کے ساتھ ہی نور نے بیٹھتے ہوئے ایک گھرا سانس لیتے خود کو پر سکون کرنے کی کوشش کی۔

”کیوں گھبراہٹ ہو رہی ہے؟ طبیعت نہیں ٹھیک تو مجھے بتا دیتیں میں ڈاکٹر کے پاس لے جانا“، اٹھ کر لائٹ آن کرتے زارون نے کہنے کے ساتھ ہی سائیڈ ٹیبل پر رکھی بوتل سے پانی گلاس میں نکالا۔

”ٹھیک تھی طبیعت ابھی پتا نہیں ایک دم سے دل گھبرانے لگ گیا ہے“، گلاس اُس کے ہاتھ سے لیتے نور نے دو گھونٹ پانی کے بھرتے کمرٹر اپنے اوپر سے ہٹایا۔

”اچھا انھوں آؤ بالکوئی میں چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے اے سی کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہو“، اُس کی بے چینی دیکھ زارون نے خود ہی اُس کا ہاتھ تھماتے اُسے بیڈ سے اُتارا اور اپنے ساتھ لیے باہر آگیا جہاں ہر طرف خاموشی اور اندر ہیرا تھا۔

”زیادہ گھبرا رہا ہے دل تو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟“ اُسے کرسی پہ بٹھاتے زارون نے خود نیچے زمین پہ اُس کے سامنے بیٹھتے ہاتھوں کو تھام جو بالکل برفیلے ہو رہے تھے۔

”نہیں ٹھیک ہوں میں“، اُس کی آنکھوں میں دیکھنے سے مکمل گریز بر تئے نور نے نفی میں سر ہلا کیا۔

”کہاں سے ٹھیک ہو؟ رنگ دیکھو کیسے زرد پڑ رہا اور ہاتھ بھی کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں“، کمرے سے آتی روشنی میں اُس کے چہرے کو دیکھتے زارون نے اُس کے پاؤں کو ہاتھ لگایا جو ہاتھوں کی طرح ہی بر فیلے لگے تھے۔

”زار“، اُس کی فکر پہ پلکیں اٹھاتے نور نے اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اُسے مخاطب کیا جو اب اُس کے پاؤں کو اپنے ہاتھوں سے گرم کرنے کی کوشش میں لگا تھا۔

”مجھے ڈر لگ رہا ہے“، اُسے اپنی جانب متوجہ پا کر نور نے لبجے میں نہیں سموئے اپنا مسئلہ بتایا۔

”ڈر؟ کیسا ڈر؟ نور کیا بات ہے بتاؤ مجھے“، زارون جو پہلے ہی اُس کے یوں ایک دم سے خراب ہونے والی طبیعت پہ بوکھلا سا گیا تھا اب اُس کے منہ سے ڈر کا سنتے مزید پریشان ہوا۔

”آپ مجھے چھوڑ کر تو نہیں جائیں گے نا؟ میرا مطلب آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گئے نا؟“ ٹوٹے ہوئے لبجے میں بے جان سے الفاظ کے ساتھ نور نے اُس کے سامنے اپنے ڈر کو بیان کیا۔

”یار میں تمہارے پاس ہی ہوں اور میں نے تمہیں چھوڑ کر کہاں جانا ہے؟“ اُس کی بات پر سنجیدگی کے ساتھ کہتے زارون نے اب اُس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔

”نہیں آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائیں گے“، اُس کی بات پہ بے یقینی کے ساتھ کہتے نور نے اپنا دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا۔

”کیا ہوا ہے پہلے بات بتاؤ مجھے؟ کسی نے کچھ کہا ہے کیا جو تم اس طرح کی باتیں کر رہی ہو؟“ وعدہ کرنے کی بجائے زارون نے اُس کے یوں اچانک سے بے چین ہونے کی وجہ پوچھی۔

”نہیں کسی نے کچھ نہیں کہا اور وہ میں گیم نہیں کھیل رہی تھی“، نظریں جھکاتے نور نے آنکھوں میں نمی لیے اُسے دیکھا۔

”تو کیا کر رہی تھیں؟“ سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتے زارون نے استفسار کیا۔

”میں ایف بی پہ دیسے ہی چیزیں دیکھ رہی تھی کہ میری ایک پرانی کلاس فیلو نے پوسٹ لگائی ہوئی تھی کہ اُس کی بہن کا انتقال ہو گیا سب اُس کی مغفرت کے لیے دعا کریں“، پلکیں جھپکاتے نور نے اپنے آنسوؤں کو باہر نکلنے سے روکا۔

”اوواللہ پاک جنت میں جگہ دے اور موت تو برحق ہے ہر ذری روح نے اُس کا مزہ چکھنا ہے پر اس بات سے میرے چھوڑ کے جانے کا کیا تعلق؟“، زارون نے افسوس کے ساتھ اُس کی مغفرت کے لیے دعا کیا اور کچھ الححتے ہوئے نور کی جانب دیکھا۔

”میں نے اُس کی موت کی وجہ پوچھی تو اُس نے بتایا کہ میری بہن کو کینسر تھا“، سیدھا جواب دینے کی بجائے نور نے اپنی دوست کے کہے ہوئے الفاظ اُس کو بتائے۔

”أفف تو تم اس بات سے پریشان ہو رہی ہو؟ حد ہے نور تم بھی نا، پاگل ہی ہو“، اُس کی زبان سے کینسر کا لفظ سنتے جہاں کچھ سیکنڈز کے لیے زارون کی دھڑکنیں منتشر ہوئیں وہیں پر خود کو سنبھالتے اُس نے اپنی بیوی کو تسلی دی جواب رو نا شروع کر چکی تھی۔

”بس آپ مجھ سے وعدہ کریں آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جائیں گے“، اُس کی بات پہ کان دھرنے کی بجائے نور نے اپنی ضد برقرار رکھتے اُس کا ہاتھ تھاما۔

” وعدہ اُس بات کا ہوتا جو انسان کے اپنے اختیار میں ہو، جو بات یا چیز اُس کے اختیار میں ہی نہیں تو اُس پہ کیسا وعدہ؟ دیکھو نور میں نہیں چاہتا کہ میں حقیقت سے نظریں چرا کر تمہیں تسلی دوں اور تمہیں مزید کمزور کرتے تم پہ آنے والی زندگی کو مشکل بنادوں“، اُس کی تکلیف کا احساس ہونے کے باوجود بھی زارون نے اس موضوع سے منہ موڑنے کی بجائے اُسے تحمل کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کی۔

”زندگی اور موت کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے۔ کس شخص نے کب دنیا میں آنا اور کب جانا اُس کا وقت مقرر ہے“، اُس کے ہاتھوں کو مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑتے اُس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

”میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں اس بیماری سے مر جاؤں گا پر میں تمہیں اپنی زندگی کا یقین دلا کر کمزور نہیں کرنا چاہتا۔ ہو سکتا ہے میں زندگی بھر کے لیے تمہارے ساتھ رہوں یا شاید ہمارا یہ ساتھ بس کچھ پلوں کا ہو مگر! جو بھی ہو تم خود کو اُس کے لیے تیار رکھو کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ میری نور میری وجہ سے تکلیف میں رہے اس لیے پلیزا پنے آپ کو مضبوط کرو“، اُس کے ہاتھوں پہ دباؤ ڈالتے زارون نے اُس کی آنکھوں میں جھانکتے اپنی بات کہی۔

”جانتا ہوں کہ میں خود غرض ہوں۔ بیماری کا پتا ہونے کے باوجود بھی میں نے چاہا کہ تم مجھ سے دور نہ ہوا اور اب بھی میں خود غرضی دکھاتے تم سے یہ سب کہہ رہا ہوں۔ تم سچ کہتی ہو، بہت برا ہوں میں“، نظریں اُس کے ہاتھوں پہ جمائے زارون نے چہرے پہ تنخ مسکراہٹ سجائے نم آنکھوں سے اُسے دیکھا جو اُس کی سفاک باتوں پہ ساکت سی بیٹھی سب سن رہی تھی۔

”مجھے نیند آرہی ہے“، اپنے ہاتھ اُس کے ہاتھوں سے نکلتے نور نے بے بسی کی انہتاء پر پہنچتے، اُس کی کسی بھی بات کا جواب دینے کی بجائے بس اتنا کہا اور اُسے وہیں بیٹھا چھوڑ کر کمرے میں آگئی۔

”یہ آپ کے سر پہ معاذ والا بھوت کب سے سوار ہو گیا؟“ شر جیل کے کمرے میں آتے ہی ماہم نے اُسے آڑے ہاتھوں لیتے سوال کیا۔

”کون سا بھوت؟“ اپنی گھٹری اُندر کر سائیڈ ٹیبل پر رکھتے شر جیل نے نامجھی سے اُس کی طرف دیکھا۔

”یہی بناء بتائے گھر آنے کا“، عثمان کو گود سے نکال کر بیڈ پر لٹاتے ماہم نے اپنی بات کیوضاحت کی۔

”کیوں؟ تمہیں یوں میرے آنے پر کوئی اعتراض ہے کیا؟ مطلب تمہیں میرے سر پر انز سے خوشی نہیں ہوئی؟“ اُس کی بات پر شر جیل نے اندازہ لگاتے استفسار کیا۔

”اُفف میں نے کب کہا کہ خوشی نہیں ہوئی؟ میں تو بس یہ کہہ رہی کہ آپ بتا کر آتے تو میں اور بچے آپ کے استقبال کے لیے گھر پہ موجود ہوتے۔ میں تو اس لیے یہاں امی کی طرف آئی تھی کہ کچھ دن ان کے ساتھ بھی گزار لوں“، اُس کی بات سن کر ماہم نے اپنے شکوئے کی وجہ بتائی۔

”اچھا ناخیر ہے۔ میں نے کون ساتھا ری یہاں موجودگی میں کوئی اعتراض کیا ہے جو تم ایسی باتیں کر رہی ہو“، اُس کی بات کا مقصد سمجھتے شر جیل نے مسکراتے ہوئے اُس کی پریشانی کو کم کیا۔

”پھر بھی، بے شک آپ نے اعتراض نہیں کیا پر میرا فرض تھا کہ میں آپ کی آمد پہ گھر پہ موجود ہوتی“، کمفرٹر کھول کر دونوں بچوں کے اوپر دیتے ماہم نے ایک بار پھر سے شرمندگی کا اظہار کیا۔

”اچھا بھئی آگے سے جب بھی آیا تو تمہیں بتا کر آؤں گا اس لیے پلیز اب اس بات کو چھوڑواور میرے لیے ایک کپ چائے بنادو سر میں بہت درد ہے“، اپنی پریشانی دباتے شر جیل نے اُسے بار بار ایک ہی بات دھراتا دیکھ دی خواست کی۔

”اس وقت چائے؟ اور کیوں درد ہے سر میں؟ کوئی میدی لیسن دوں؟“ کلاک پر تین بجتے دیکھ ماہم نے اُس کے قریب آتے فکر مندی ظاہر کی۔

”رات ٹھیک سے نہیں سویا اور دن بھی سارا بس امی ابو کے ساتھ لگا رہا۔ نیند پوری نہیں ہوئی نا اسی لیے شاید درد ہو رہا ہے“، اُس کی بات کا جواب دیتے اُس نے پاس لیٹی عبیرہ کی پریشانی پہ بوسے دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے آپ لیٹیں میں بس پانچ منٹ میں چائے بنائے کر لاتی ہوں“، ماہم نے کہنے کے ساتھ ہی باہر کا رخ کیا تو شر جیل نے اُس کے مشورے پر عمل کرتے تکیہ سیدھا کیا اور آنکھیں بند کیے لیٹ گیا۔

---

کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کمرے میں داخل ہوا تو نور کو دوسرا جانب کروٹ لیٹا دیکھ کر اُس نے ایک گہری سانس لیتے خود کو پر سکون کیا اور قدم اُس کی جانب بڑھائے جو اُس کی امید کے عین مطابق رونے میں مصروف تھی۔

”ناراض ہو مجھ سے؟“ اُس کے پاس بیٹھتے ہی نور نے جلدی سے بازو اپنی آنکھوں میں رکھا تو زارون نے اُسے ہٹاتے ہوئے سوال کیا۔

”پلیز، مجھے آپ سے کوئی بات نہیں کرنی،“ اُس کا ہاتھ جھکلتے نور نے غصے کے ساتھ اُسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

”ٹھیک ہے تم کوئی بات نہ کرو، جو کہنا ہوا میں خود ہی کہہ دوں گا“، اُس کے بھیگے ہوئے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے صاف کرتے زارون نے دوستانہ انداز میں اپنی بات کہی۔

”مجھے کچھ سننا بھی نہیں ہے اس لیے پلیز آپ اپنا وقت مجھ پر ضائع مت کریں،“ اُس کی کچھ دیر پہلے کہی گئی باتوں کو دل پر لیتے نور نے آج پہلی بار اُس سے سختی سے بات کی۔

”یار کیا ہو گیا ہے تمہیں اور کس بات کا غصہ کر رہی ہو؟ میں نے بس تمہیں سمجھانے کے لیے وہ باتیں کی تھیں،“ اُسے دوسری طرف کروٹ لیتا دیکھ زارون نے اُسے بازو سے پکڑتے ایسا کرنے سے روکا۔

”تو میں نے کب کہا کہ مجھے آپ کی باتوں کی سمجھ نہیں آئی؟ اور مجھے کوئی غصہ نہیں اس لیے پلیز سو جائیں اور مجھے بھی سونے دیں،“ بے رخی دکھاتے نور نے اُسے اُس کے الفاظ کی شدت کا احساس دلایا جو وہ اُس کے بھلے کے لیے اسے سمجھا رہا تھا۔

”اچھا نا سوری، نہیں چھوڑ کر جاتا میں کہیں تمہیں،“ اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگاتے زارون نے مزید کوئی بات کر کے اُس کا دل دکھانے کے بجائے ہار مانتے معدرت کی۔

”نہیں معاف کرنا، جب آپ کو پتا تھا کہ میں پہلے ہی پریشان ہوں تو کیوں آپ نے اتنی فضول باتیں کر کے میرا مزید دل دکھایا؟ وعدہ نہیں کرنا تھا تو نہ کرتے پر یوں غلط موقع پر مجھے سمجھانے کی کیا ضرورت تھی؟“ سفا کی کے ساتھ نور نے اُس کی معدرت کو قبول کرنے کی بجائے شکوہ کیا۔

”اچھا میری ماں معاف کر دو، سچ میں مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تمہارے دماغ کو اتنی جلدی میری باتیں سمجھ آجائیں گی۔ قسم سے اگر پتا ہوتا تو کبھی بھی ایسی بات نہ کرتا“، نظروں میں شرارت لیے زارون نے اُس کے غصے سے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھا۔

”کم عقل ہوں پر بیو قوف نہیں کہ اگلا انسان کیا کہہ رہا ہے اور کیوں کہہ رہا ہے یہ سمجھنے سکوں“، اُسے اپنے چہرے پہ جھکتا دیکھ نور نے بات مکمل کرنے کے ساتھ ہی اُس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھا۔

”کوئی ضرورت نہیں ہے یہ محبت جتنا نے کی، پہلے تلخ الفاظ استعمال کر کے میرا دل جلاتے ہیں پھر اگلے ہی لمحے یوں پیار دیکھا کر سمجھتے کہ میرے دل و دماغ سے اُن کی کرواہٹ مٹ جائے گی۔ دور رہیں مجھ سے“، ہاتھ اُس کے ہونٹوں پہ رکھے ہی نور نے اُسے تنبیہ کی اور اُس کے حصار سے نکلتے بیڈ کی دوسری سائیڈ پہ جا کر لیٹ گئی۔

”ٹھیک ہے رہونا راض میں بھی اب نہیں مناؤں گا“، اُس کی پشت کو گھورتے زارون نے اوپھی آواز میں خود کلامی کی اور اٹھ کر لائٹ آف کرتے اُس کی جگہ پہ آکر لیٹ گیا۔

”پتا نہیں کیا سمجھتی ہے خود کو، میں نے اس کی بھلائی کی خاطر ہی سمجھایا تھا پر نہیں میدم کو کوئی کام کی بات تو کبھی سمجھ ہی نہیں آتی“، ہنوز اُسے دوسری جانب کروٹ لے کر لیٹا دیکھ زارون نے منه میں بڑھاتے اپنا موبائل اٹھاتے آن کیا جو کافی دیر سے آف تھا۔

”اُفف ایک تو یہ پتا نہیں کون میری جان کا دشمن بن ہوا ہے“، موبائل کھولتے ہی اُسی انجان نمبر سے کچھ میسج زد دیکھ زارون نے اُنہیں پڑھنے سے پہلے ہی بے زاری کا اظہار کرتے موبائل پھر سے آف کر دیتا کہ رات کو اُس کے ٹنگ پر نور کو مزید لڑائی کا موقع نہ ملے۔

---

صحح زارون کی آنکھ متنی محسوس ہونے پہ کھلی تو اُس نے بستر چھوڑتے واش روم کا رخ کیا۔

”اُفف یہ کام پھر سے شروع ہو گیا ہے“، بیسن کوتازہ خون سے بھرتا دیکھ اُس نے آنکھوں کے آگے آنے والے اندھیرے پہ سر جھٹکا اور نل کھولتے اُسے صاف کیا۔

”پتا نہیں یہ تکلیف کب تک مجھے یوں تڑپائے گی“، چہرے پہ پانی ڈالتے اُس نے خود کلامی کی اور چکراتے ہوئے سر کی وجہ سے دیوار کا سہارا لیتے وہاں سے باہر نکلا پر کچھ قدم اٹھاتے ہی اُسے پھر سے اپنے گلے میں جلن محسوس ہوئی جس کے باعث وہ واپس پلٹتے بیسن کے اوپر جھٹکا۔

---

”کس مصیبت میں بھنس گیا ہوں میں“، غل کھول کر منہ میں پانی ڈالتے اُس نے بیسیں کو صاف کیا جو ایک بار پھر سے خون سے بھر چکا تھا۔

”یا اللہ میرے حال پر رحم فرم اور مجھ سے جو بھی غلطی کوتا ہی ہو گئی ہے اُسے معاف کر دے“، واش رو م سے باہر نکلتے اُس نے بے جان سے وجود کے ساتھ پاس پڑے صوف پہ بیٹھتے التجاء کی اور اپنے سینے پہ ہاتھ پھیرتے خود کو پر سکون کرنے لگا مگر درد کی شدت برداشت سے باہر ہوتی دیکھ اُس نے نور کو جگانے کی بجائے خود ہی ہمت کرتے بیڈ کی جانب قدم بڑھائے تاکہ سائبیڈ ٹیبل میں موجود دوائیوں میں سے ڈاکٹر کی دی گئی پین کلر کھا سکے۔

”یہ آج درد پتا نہیں کیوں اتنا زیادہ ہو رہا ہے“، پین کلر لینے کے بعد بیڈ کی بیک سے سرٹکاتے اُس نے اپنے سینے پہ ہاتھ پھیرا اور کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند تے بیٹھا اپنی تکلیف کو برداشت کرتا رہا جو آج اُس کی طاقت سے باہر ہو چکی تھی۔

”کیا ہوا ہے ایسے کیوں بیٹھے ہیں؟“، آنکھ کھلنے پہ کروٹ بدلتے نور نے اُسے بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا دیکھ اپنی رات والی ساری ناراضی بھولتے ہوئے سوال کیا۔

”کچھ نہیں، بس ویسے ہی“، نڈھال سے انداز میں جواب دیتے وہ سیدھا ہو کر لیٹا تو نور نے اُسے سینے پہ ہاتھ پھیرتا دیکھ مزید سونے کا رادہ ترک کیا۔

”طبعت ٹھیک ہے؟“ اٹھ کر بیٹھتے اُس نے خود اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھتے استفسار کیا۔

”ہاں ٹھیک ہوں تم پریشان نہ ہو اور سو جاؤ۔ رات بھی دیر سے سوئی تھیں،“ تکلیف کے آثار چہرے پہ ظاہر کیے بغیر زارون نے اُس کا دھیان اپنے آپ سے ہٹانا چاہا۔

”نہیں، بس اب نہیں سونا اور مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی،“ اُس کی پریشانی پہ ہاتھ لگاتے نور نے پریشانی سے پھر اُسی بات پہ آتے تصدیق چاہی۔

”ہاں بس تھوڑا درد ہے پیٹ میں پر تم پریشان نہ ہو میں نے پین کلر کھائی ہے ٹھیک ہو جائے گا کچھ دیر میں،“ اُس کا ہاتھ تھام کر اپنے دل پہ رکھتے زارون نے اُسے تسلی دی۔

”میں بابا کو بتاتی ہوں ڈاکٹر کو دکھالیں اور ایسے لاپرواٹی نہ کریں،“ اُس کی بات سنتے ہی نور نے اُٹھنا چاہا۔

”نہیں یارا ب اتنا بھی بیمار نہیں ہوں اور شام کا جانا ہے نارپورٹ لینے تو چیک کروالوں گا تم فکر نہ کرو،“ صبح صح گھروالوں کی پریشانی کا سوچتے زارون نے اُسے روکا۔

”تو شام کو بھی چیک کروانا ہی ہے نا اگر اب بھی کروالیں گے تو کیا ہو جانا۔ بس میں بابا کو بولتی ہوں آپ جائیں اُن کے ساتھ،“ اُسکی کوئی بھی بات ماننے کی بجائے نور نے ہٹ دھرمی دکھاتے اپنی بات کہی۔

”اچھا کچھ دیر میں چلا جاؤں گا بس ابھی تم میرے پاس رہو“، اُس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں دباتے زارون نے درخواست کی تو نور نے اُس کی طبیعت کے پیش نظر ضد کرنے بجائے خاموشی اختیار کی اور اُسے آنکھیں بند کرتا دیکھ دوسرا ہاتھ اُس کے چہرے پہ پھیرنے لگی۔

---

”شر جیل کیا بات ہے؟ رات بھی آپ ٹھیک سے نہیں سوئے اور اب بھی صحیح ہی اٹھ گئے ہیں“، آنکھ کھلتے ہی ماہم نے اُسے کمرے میں ٹھہلاتا دیکھ اپنا بستر چھوڑا اور اُس کے قریب آتے پوچھنے لگی۔

”کچھ نہیں، بس طبیعت میں عجیب بے چینی سی ہو رہی تھی اسی لیے اٹھ گیا“، ایک نظر اُس کے چہرے کو دیکھتے اُس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اپنا مسئلہ بتایا۔

”کیسی بے چینی؟ میرا مطلب کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتائیں“، اُس کے قریب ہی صوفے پہ بیٹھتے ماہم نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا جو اُسے رات سے کچھ الجھا الجھا سالگ رہا تھا۔

”نہیں بات تو کوئی نہیں بس جب سے میں نے نور کو دیکھا ہے میرا دل بہت پریشان ہے۔ مجھ اُس میں عائزہ کی جھلک نظر آئی، ایسا لگا کہ میری بہن پھر سے زندہ ہو کر میرے سامنے آکھڑی ہے“، اپنے منتشر ہوتے اعصاب پہ قابو پاتے شر جیل نے اپنی چھوٹی بہن کا حوالہ دیا جو آج سے دس سال پہلے اُس کی غفلت کی وجہ سے ہوئے ایکسیڈنسٹ کے نتیجے میں اپنی جان کی بازی ہار چکی تھی۔

”تم نے غور کیا ہے اُس کی معصومیت، ہچکچا ہٹ اور بات کرنے کا انداز بالکل عائزہ جیسا ہے“، آنکھوں میں نبی لیے شر جیل نے ماہم کی طرف دیکھتے تصدیق چاہی۔

”شر جیل پلیز خود کو سنبھالیں پہلے ہی کتنی مشکل سے میں نے آپ کو اس احساسِ ندامت سے نکالا ہے اور آپ پھر سے اُسی بات کو سرپہ سوار کرتے خود کو تکلیف دے رہے ہیں“، اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ماہم نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو کافی عرصے تک عائزہ کی موت کا ذمے دار خود کو ٹھہر اتا آیا تھا۔

”یہ احساسِ ندامت میری زندگی کا حصہ ہے۔ اُس دن نہ میں بائیک کو ایک پہیے پہ چلانا کی کوشش کرتا اور نہ ہی میرے پیچے بیٹھی میری بہن سڑک پہ گرتی۔ میری ایک شرارت کی وجہ سے عائزہ نے اپنی زندگی کو کھو دیا“، اپنی اذیت سے جلتی ہوئی آنکھوں پہ ہاتھ رکھتے شر جیل نے ایک بار پھر

سے اُسی قصے کو دہرا یا جس نے بہت وقت تک اُسے ایک نہ کر دہ گناہ کے ملاں میں گھیر رکھا تھا۔ ”شر جیل پلیز میں پہلے بھی آپ کو کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ وہ صرف ایک حادثہ تھا جو عائزہ کی موت کی وجہ بنا، اگر اس کی زندگی کے دن بڑھے ہوتے تو اللہ پاک ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ وہ چاہتا تو اُسے صحت دے سکتا تھا“، اُس کے کندھے پر دباؤ ڈالتے ماہم نے اُسے نرمی سے سمجھایا۔ ”hadathہ میرے ہاتھوں ہی ہونا تھا کیا؟ اُس کی موت کی وجہ مجھے ہی بننا تھا کیا؟ ماہم میں بہت بُرا ہوں“، اُس کے ہاتھ تھامنے شر جیل نے شر مندگی سے سر جھکاتے اپنی تکلیف بیان کی۔

”بہت اچھے ہیں آپ تب ہی تو عبیرہ کی صورت میں اللہ پاک نے آپ کو ایک اور عائزہ سے نوازا ہے اگر آپ برے ہو تے تو وہ کبھی بھی آپ کو اس رحمت کا حق دار نہ بناتا“، اُس کے چہرے پر ہاتھ رکھ کر اپنی طرف کرتے ماہم نے بہت پیار سے اُس کی آنکھوں میں دیکھا جو ضبط کی شدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔

”ہاں، بس دعا کیا کرو کہ اللہ پاک مجھے معاف کر دے“، مزید اس موضوع پر بات کر کے اپنی تکلیف میں اضافہ کرنے کی بجائے شر جیل نے اُس سے درخواست کی جو اثبات میں سر ہلاتے اُس کے ہاتھوں کو اپنے ہونٹوں سے لگا چکی تھی۔

اپنے چہرے پہ مسلسل اُس کی نظروں کی تپش محسوس کرتے زارون نے اپنی آنکھیں کھو لے اُسے دیکھا۔

”کیا ہوا؟ رو کیوں رہی ہو؟“ اُس کے گال پہ بہتے آنسو کو ہاتھ بڑھا کر صاف کرتے اُس نے اپنا سر اُس کی گود میں رکھا۔

”پچھے نہیں بس ایسے ہی آنکھوں میں کچھ چلا گیا تھا،“ اُسے یوں نڈھال دیکھ نور جو پہلے ہی رات سے پریشان تھی مزید فکر مند ہوتے اپنی بے بسی کو آنسوؤں میں بہانے لگی۔

”یار ٹھیک ہوں میں بس ذرا سے درد تھا جواب بالکل ختم ہو گیا ہے،“ اُس کے چہرے پہ ہوا یاں اڑی دیکھ زارون نے تکلیف کے باعث بھی مسکراتے ہوئے تسلی دی۔

”آپ پلیز ڈاکٹر کو چیک کروالیں، جب پتا ہے طبیعت ٹھیک نہیں تو پھر کیوں لا پرواٹی کرتے ہیں؟“ اپنا چہرہ صاف کرتے اُس نے ایک بار پھر سے اصرار کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے کروالیتا ہوں بس تم پریشان مت ہو اور میں نے کتنی بار سمجھایا ہے کہ ایسے چھوٹی چھوٹی باتوں پر رویانہ کرو،“ اُس کو مطمئن کرنے کے لیے حامی بھرتے زارون نے کئی بار دھراٹی جانے والی بات کو ایک بار پھر سے دھراتے اُسے تاکید کی۔

”میں کب روئی ہوں، وہ تو بس ایسے ہی آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا“، اُس کی نصیحت پہ جلدی سے نظریں چراتے نور نے صاف ہی مکرتے جھوٹ بولا۔

”ہونہہ جانتا ہوں میں جو تمہاری آنکھوں میں کچھ گیا تھا اور ہاں یہ میرے سامنے زیادہ چالاک بنے کی کوشش مت کیا کرو“، اُس کا ہاتھ پکڑ کر واپس اپنے دل پر رکھتے زارون نے اُسے گھورا جواب اپنی تکلیف بھی اُس سے چھپانے لگی تھی۔

”میں کب چالاک بنی ہوں؟ اور یہ آپ کس خوشی میں میری گود میں گھس گئے ہیں“، اُس کی بات دھرا کر سوال کرتے نور نے رات والی بات یاد آنے پہ خفگی ظاہر کی۔

”تمہارے عقل مند ہونے کی خوشی میں لیٹا ہوں، وہ کیا ہے نارات تم مجھ سے لڑ کے سوئی پر صحوج اٹھتے ہی تم نے میری طبیعت خراب دیکھ مجھ سے ناراض ہونے یا لڑنے کی بجائے سکون سے بات کی تو بس تمہارا اتنا اچھا رہیہ مجھ سے ہضم نہیں ہوا اسی لیے تمہاری گود میں سر رکھ کے چیک کر رہا ہوں کہ یہ تم ہی ہو یا تمہارا کوئی بھوت“، نظروں میں شرارت لیے زارون نے اُس کا دھیان اپنی طبیعت سے ہٹانے کے لیے چھپیرا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ، حد ہے یہاں آپ کی حالت دیکھ میرا دل بند ہو رہا تھا اور آپ کو مذاق سو جھرہا ہے،“ اُس کی سپید پڑتی رنگت کو دیکھ نور نے ایک سخت نظر اُس پہ ڈالی جو اُس کی بات سننے مسکرا نے لگا تھا۔

”ٹھیک ہوں میں، تم تو ایسے ہی ہر بات پر پریشان ہو جاتی ہو۔ دیکھو کچھ نہیں ہوا مجھے،“ اُسے پھر سے رو نے کے لیے تیار دیکھ زارون نے ہمت کی اور اٹھ کر اُس کے سامنے بیٹھا۔ ”ٹھیک ہیں یا نہیں، بس مجھے کچھ نہیں سننا آپ انھیں اور ڈاکٹر کے پاس جائیں،“ اُس کو بات ٹالتا دیکھ نور نے اپنی ضد پہ قائم رہتے اصرار کیا۔

”اچھا بس کچھ دیر آرام کر کے جاتا ہوں، تم بھی لیٹ جاؤ ابھی میرے ساتھ،“ اپنے چکراتے ہوئے سر کی وجہ سے واپس تکیہ پہ لیٹتے زارون نے اُس کا ہاتھ تھما جو خالی نظروں سے اُسے دیکھتے خاموشی سے سر اُس کے سینے سے ٹکاچکی تھی۔

-----

”ارحم تم آج فارغ ہو تو مجھے کچھ دیر کے لیے مار کیٹ لے جاؤ گے؟“ ناشتے کی ٹیبل پہ آئمہ بیگم نے اُسے مخاطب کیا جو سیب کھانے میں مصروف تھا۔ ”مار کیٹ؟ امی پلیز میں آپ عورتوں کے ساتھ

مارکیٹ نہیں جا سکتا۔ تو بہ آپ لوگوں کو تو کوئی چیز پسند ہی نہیں آتی اور اگلا بندہ آپ کے ساتھ چل چل کے پاگل ہو جائے، اپنا ہاتھ روک کے ارحم نے صاف گوئی سے انہیں منع کیا۔

”ہاں مال کے ساتھ جانے میں تو تمہیں ہمیشہ سے ہی مسئلہ رہا ہے اب بیوی آجائے گی نا تودیکھوں گی کیسے اُسے اکیلا سمجھتے ہو“، اُس کے انکار پر جذباتی ہوتے آئمہ بیگم نے نظر وہ میں خفگی لیے شکوہ کیا۔

”آپ کی غلط فہمی ہے اور ہاں میں اُسے اکیلا نہیں بلکہ آپ ساس بہو کو اکٹھے شاپنگ کرنے کا مشورہ دوں گاتا کہ میری بھی جان چھٹی رہے اور آپ دونوں کا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے“، ہاشم صاحب کو اپنی نشست سن بھالتا دیکھ کر ارحم نے بڑی عقل مندی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کیا۔

”کیا ہوا بھئی؟ ماں بیٹے میں کس بات پر صحیح ہی صحیح بحث چل رہی ہے“، ارحم کی آخری بات سنتے ہاشم صاحب نے گلاس میں جوس نکالتے استفسار کیا۔

”میں نے آپ کے صاحبزادے سے کہا کہ مجھے آج مارکیٹ لے جائے تو ماں کا لحاظ کیے بغیر اس نے صاف ہی میرے منہ پر انکار کر دیا اور تو اور ساتھ مشورہ بھی دے دیا کہ شادی کے بعد بیوی اور ماں کو اکٹھے شاپنگ پر بھیج کر خود کو اس مسئلے سے بری کر لیں گے جناب“، ان کی پلیٹ میں انڈہ رکھتے آئمہ بیگم نے اپنی ناراضی برقرار رکھتے ہاشم صاحب کو مختصر اگر ارحم کے کارنامے سے آگاہ کیا۔

”تو اس میں کیا مسئلہ ہے، یہ تو اچھی بات ہے کہ اس بہانے آپ ساس بہو کی دوستی بھی ہو جائے گی اور میں تو کہتا ہوں آپ ایسا کریں ابھی رابعہ کو کال کر کے ساتھ چلنے کا کہیں۔ ایک تو آپ کی مدد ہو جائے گی اور دوسرا وہ اپنے لیے اپنی پسند سے ساری چیزیں لے لے گی“، ارحم کی بات کی تاکید کرتے ہاشم صاحب نے ایک معقول سامشورہ دیتے آئمہ بیگم کی پریشانی دور کی۔

”ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں، بس ٹھیک ہے میں رابعہ کو کال کر کے ساتھ چلنے کا کہہ دوں گی“، چہرے پہ چمک لیے انہوں نے اپنا مسئلہ حل ہونے پہ خوشی خوشی ہاشم صاحب کی بات پہ غور کیا۔

”ٹھیک ہے پھر میں بھی آپ دونوں کے ساتھ چلوں گا۔ وہ کیا ہے ایک بندہ شاپر زو غیرہ پکڑنے کے لیے بھی ساتھ ہونا چاہیے نا“، رابعہ کے جانے کا سنتے ہی ارحم نے سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات مکمل کی۔

”نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے، جہاں ہم اکیلے شاپنگ کر سکتے وہاں شاپر زو اٹھانا بھی ہمارے لیے کوئی مشکل بات نہیں“، اُس کی بات سنتے آئمہ بیگم نے فٹ سے جواب دیتے اُس کی ساری امیدوں کا خاک میں ملا یا۔

”ٹھیک ہے جیسے آپ کی مرضی، میں توبس مدد کی غرض سے کہہ رہا تھا،“، ایک نظر ہاشم صاحب کی طرف دیکھتے جو اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے مسکرار ہے تھے ارجمنے دھیسی سی آواز میں ایک کمزور سی وضاحت دی اور اپنی بے وقوفی پہ خود کو کوستے خاموشی سے بریڈا ٹھاتے اُس پہ لکھن لگانے لگا۔

-----

”جبہ بیٹا؟ ساری تیاریاں مکمل ہو گئیں ہیں آپ کی؟“، آندھی صاحب نے لاونچ میں رکھے ڈبوں پہ ایک نظر ڈالتے سوال کیا۔

”جی ابو ساری تیاری مکمل ہے۔ آپ بتائیں ہمیں آج شام کو نکلنا ہے یا صحیح؟“، چائے کا کپ انہیں تھماتے جب نے اُن کی بات کا جواب دیتے پوچھا۔

”شام کو نکلیں گے، فلاٹیٹ صحیح سات بجے کی ہے تو اُس حساب سے صحیح جانا مناسب نہیں ہو گا“، اُس کی بات کا تفصیلی جواب دیتے آندھی صاحب نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔

”آپ بھی ہمارے ساتھ جائیں گے؟ میرا مطلب اسلام آباد؟“، اپنا کپ اٹھاتے اُن کے قریب ہی دوسرے صوفے پہ بیٹھتے اُس نے تصدیق چاہی۔

”ہاں ارادہ تو یہی ہے پر کل دس بجے میری ایک ضروری میٹنگ ہے اگر وہ کنفرم ہو گئی تو میرا جانا مشکل ہو جائے گا“، اپنی مصروفیت کے بارے میں بتاتے آفندی صاحب نے خدشے کا اظہار کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے بس آپ پریشان نہ ہوں اگر آپ کی میٹنگ ہوئی تو ہم خود ہی ڈرائیور کے ساتھ چلے جائیں گے“، انہیں فکر مند یکھ جبے نے تسلی دی اور سارہ بیگم کی طرف متوجہ ہوئی جو کمرے سے نکلتے ان کے قریب آچکی تھیں۔

”یہ پچے کہاں ہیں صحیح سے نظر نہیں آ رہے؟“ جبے نے کپ میں چائے نکالتے ان کی جانب بڑھائی تو انہوں نے گھر میں خاموشی محسوس کرتے استفسار کیا۔

”وہ رات کو کافی دیر تک کھلیتے رہے تقریباً ایک بجے سوئے تھے تو بس اسی لیے اب تک نیند پوری کر رہے ہیں“، ان کی بات کا جواب دیتے جبے نے کلاک کی طرف دیکھا جہاں گیارہ نجح چکے تھے۔

”اچھا ہے اپنی نیند پوری کر لیں گے تو راستہ میں زیادہ تنگ نہیں کریں گے اور تم نے اپنے کاغذات وغیرہ رکھ لیے تھے؟“ اس کی بات سنتے سارہ بیگم نے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”اوہ ان کا تو مجھے یاد ہی نہیں رہا، میں بس ابھی رکھ لیتی ہوں“، اس نے جواب دیتے جلدی سے اپنی چائے ختم کی اور اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھی تاکہ اپنے اور بچوں کے ضروری کاغذات وغیرہ بیگ میں رکھ سکے۔

کچھ دیر میں زارون کے سونے کا لقین ہوتے نور نے احتیاط سے اُس کا ہاتھ اپنے بالوں سے نکالا۔

”پتا نہیں کیا کرتے ہیں۔ اتنی بار کہا ہے طبیعت خراب ہو تو ڈاکٹر کو دیکھالیا کریں پر نہیں بس ہر بار اپنی ہی مرضی کرنی ہوتی ہے“، اُس کے سینے سے سر اٹھا کر اُس کے چہرے کو دیکھتے نور نے خود کلامی کی اور تھوڑا اوپر ہوتے آہستگی سے اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیا جو میدی لیسن کے زیر اثر سوچ کا تھا۔

”پتا نہیں یہ تکلیف آپ کے حصے میں ہی کیوں آئی، اُس انسان کے حصے میں جس نے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا، کسی کا برا نہیں سوچا“، اُس کے چہرے کو بغور دیکھتے نور نے بے ساختہ ہی چہرے پہ تلخی لیے سوچا۔

”جانتی ہوں آپ اپنی بہت سے تکلیفیں مجھ سے چھپاتے ہیں، میری خوشی کی خاطر مجھ پہ کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتے پر زندگی میں ہر انسان کا چہرہ پڑھنے کے قابلیت نہ رکھنے کے باوجود بھی میں ایک انسان کی مسکراہٹ کے پچھے پچھے درد کو محسوس کر سکتی ہوں، اُس کی آنکھوں میں نہ بیان کر دہ“

الفاظ کو پڑھ سکتی ہوں،” اُس کے بالوں کو اُس کی پیشائی سے ہٹاتے نور نے نرمی سے اُن پہ ہاتھ پھیرتے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”مگر میں اپنی تمام تربے و قوفیوں کے باوجود بھی یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ اُس کا درد مجھے اپنے دل میں محسوس ہوتا ہے، وہ تکلیف میں ہوتے ہوئے مسکراتا ہے تو میرے اندر ملال کی دیوار میں ایک اور اینٹ کا اضافہ ہو جاتا ہے پر میں چاہ کر بھی اُس کے سامنے رو نہیں پاتی۔ میں بھلا کیسے اُس شخص کے سامنے رو سکتی ہوں جو میری ایک مسکراہٹ کی خاطر بڑی سے بڑی تکلیف کو اپنی ذات پہ سہ جاتا ہے۔ میرے سکون کی خاطر خود کی بے سکونی کی پروانہیں کرتا،“ نم آنکھوں سے مسکراتے نور نے گلے میں اٹکنے آنسوؤں کی وجہ سے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا اور خود پہ ضبط کرتے اٹھ کر واش روم کی جانب بڑھی تاکہ وہاں جا کر آنسو بہاتے اپنادل ہلکا کر سکے۔

-----

ناشستے سے فارغ ہونے کے بعد عابدہ بیگم ماہم کو کچھ اپنے لائے ہوئے کپڑے دکھانے میں مصروف تھیں جب دروازے پہ دستک دیتے معاذ نے کمرے میں قدم رکھا۔

”یہ آپ لوگ کون سا اتوار بازار لگائے بیٹھی ہیں“، کمرے میں بید پہ بکھرے کپڑوں اور جیولری کو دیکھ معاذنے صوفے پہ بیٹھتے سوال کیا۔

”ہونہہ ہمیشہ کوئی الٹی بات ہی کرنا اور شرم کرواتے اچھے کپڑوں کو اتوار بازار سے تشبیہ دے رہے“، اس کی بات کا بُرا مانتے ماہم نے اُسے آڑے ہاتھوں لیا۔

”افف میرے کہنے کا مطلب تھا کہ یہ اتنے سارے کپڑے بکھیرے کیوں بیٹھی ہیں آپ لوگ؟“  
کوئی فنگشن وغیرہ ہے کیا؟“ ماہم کا مود خراب ہوتا دیکھ معاذنے جلدی سے اپنی بات کی وضاحت دیتے سوال کیا۔

”ہاں ارجمند کی شادی ہے اگلے ہفتے تو بس اُسی کی تیاری کے لیے کچھ کپڑے لیے تھے“، ماہم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی عابدہ بیگم نے اُسے جواب دیا۔

”ارجمند کی شادی؟ میرا مطلب اتنی جلدی؟ ابھی کچھ مہینے پہلے ہی تو منگنی ہوئی تھی“، شادی کے نام پہ گڑ بڑاتے معاذنے اپنے لبھ کو ہموار کھتے اپنی حیرت کو چھپایا۔

”ہاں تو کچھ مہینے پہلے ہوئی تھی کل نہیں جو تم ان کی شادی کی خبر سن کر یوں حیران ہو رہے ہو اور بھائی جان، لوگ آپ کی طرح بوڑھے ہو کر شادی کرنے کے قائل نہیں ہیں نا اسی لیے چٹ منگنی

پٹ بیاہ والا کام کرتے،“ موقع ملتے ہی ماہم نے طنز کرتے اُس سے اپنی (اتوار بازار والی) بے عزتی کا بدله لیا۔

”ہم اچھی بات ہے یہ کام بھی جتنا جلدی ہو جائے اُتنا ہی اچھا ہوتا اور تم میری فکر نہ کرو میں اتنی جلدی بوڑھا نہیں ہوتا،“ ایک دم ہی اپنی دھڑکنوں کی رفتار تیز ہونے پہ معاذ نے اُس کے طنز کا جواب دیا اور کسی ضروری کام کا کہتے باہر کی جانب بڑھ گیا۔

”اب اسے کیا ہو گیا؟“ اُس کے یوں اچانک سے اٹھ کر جانے پہ ماہم نے حیرت کا اظہار کرتے عابدہ بیگم کی جانب دیکھا جنہوں نے کندھے اچکاتے لا علمی کا اظہار کیا۔

”ہو سکتا ہے تمہاری بات بری لگ گئی ہو۔ میں نے کتنی بار تمہیں کہا ہے کہ مذاق کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان بڑی سے بڑی بات برداشت کر لیتا پر کچھ وقت ایسے ہوتے جب انسان چھوٹی سی بات کو بھی دل پہ لے لیتا ہے،“ معاذ کے اترے ہوئے چہرے کا سوچتے عابدہ بیگم نے ماہم کو ڈالنا۔ ”افف امی آپ کو تو بس موقع چاہیے مجھے بتیں سنانے کا اور چھوڑیں اُس سڑی ہوئی سوچ کے مالک انسان کو اور مجھے یہ بتائیں کہ یہ سوٹ مجھ پہ کیسا لگے گا،“ ایک دوپٹہ اٹھا کر اپنے کندھے پہ رکھتے ماہم نے نظروں میں ستائش لیے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا جو معاذ کے یوں جانے پہ پریشان سی بیٹھی تھیں۔

کمرے میں آتے ہی معاذ نے دروازہ لاک کیا اور بکھرے ہوئے وجود کے ساتھ چند قدم آگے بڑھتے وہیں زمین پہ بیٹھ گیا۔

”یک طرفہ محبت اتنی شدید ہوتی ہے میں نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا پر آج تمہیں کسی اور کا ہوتے دیکھ پیغیں آیا کہ میری شدت میری سوچ سے کہیں زیادہ بڑھ کر تمہارے لیے پختہ ہے۔ کیا زندگی میں ایک پل کے لیے بھی تمہیں یہ احساس نہیں ہوا کہ کوئی تمہیں ارحم سے بھی زیادہ چاہتا ہے، اُس کے دل میں تمہاری خواہش اُس دوڑتے ہوئے خون کی ماند ہے جو اگر سیکنڈ کے ہزارویں حصے کے لیے بھی اپنی گردش روک دے تو انسان کی سانسیں تھم سکتی ہیں۔ کیا تم اتنی بے حس ہو کہ میری تڑپ تمہارے دل کو ایک بار بھی چپونہ سکی؟“ تلنخی کے ساتھ معاذ نے سوال کرتے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”نہیں تم بے حس نہیں ہو، تم تو خود کسی اور کی محبت میں گرفتار ہوا یک ایسی محبت جو دو طرفہ ہے بالکل تمہاری خواہش کے مطابق تو پھر کیوں تم ایک ایسے انسان کی فریاد سنوگی جس نے اپنے دل کی بات بتانے میں اتنی دیر کر دی، جس نے تمہاری کسی اور کے لیے پسندیدگی دیکھ کے بغیر کسی

جنگ کے ہار مان لی، ہاں میں نے محبت کے میدان میں بغیر جنگ کے شکست کھائی، ہاں میں ایک بزدل انسان ہوں، میں کبھی بھی تمہارے قابل نہیں تھا، اپنے دونوں ہاتھ آنکھوں میں رکھتے معاذ نے انہیں رگڑا جو کسی کو کھونے کے احساس پہ بار بار نم ہوتے اُسے اپنی شکست کا یقین دلار ہی تھیں۔

---

دو پھر تین بجے کے قریب زارون کی آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے بھاری ہوتے سر کو بمشکل اٹھاتے نور کی تلاش میں کمرے میں نظر دوڑائی۔

”افف اتنا نامم ہو گیا ہے اور اُس چڑیل نے مجھے اٹھایا ہی نہیں“، کلاک پہ نظر پڑتے ہی سستی کے باوجود بھی اٹھ کر بیٹھتے زارون نے اپنی کمر بیڈ کے ساتھ لگائی۔

”آج تو بالکل ہی نشیوں کی طرح سویا میں، نہ خود کا ہوش تھا اور نہ ہی کسی اور کی فکر“، منہ میں بڑ بڑا تے اُس کی نظرا پنے موبائل پہ پڑی جورات سے بند تھا۔

”افف یہ بھی کوئی ڈھیٹ قسم کا انسان ہے“، اسکرین پر میسجز کی تعداد پچاس کے قریب دیکھ اُس نے زیر لب خود کلامی کی اور میسج کھول کر پڑھنے لگا۔

---

”زارون پلیز میری کال ریسیو کرو“، پہلے مسجح پہ اپنا نام دیکھ کرو تھوڑا جیران ہوا تب ہی باقی میسجز کو ویسے ہی ڈیلیٹ کرنے کی بجائے انہیں پڑھنے لگا۔

”میں حبہ ہوں اور میں تم سے ملنا چاہتی ہوں“، دس بارہ میسجز دیکھنے کے بعد حبہ نام پر رکتے وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”میں ہمیشہ کے لیے امریکہ جا رہی ہوں پر وہاں جانے سے پہلے یہ چاہتی ہوں کہ صرف ایک بار تمہیں دیکھ لوں“، مختلف میسجز پڑھتے وہ اُس کی ملاقات والی بات پر ہٹھرا۔

”کل صبح سات بجے کی فلاٹیٹ ہے میری اسلام آباد سے اگر ممکن ہو تو پلیز تم ایئر پورٹ پر آ جانا“، آخری مسجح پڑھنے کے بعد زارون نے اتنے سالوں بعد اُس کے پیغامات دیکھ اپنی افیت سے جلتی آنکھوں کو بند کیا اور ساتھ ہی کئی سوالات اُس کے دماغ کے پنوں پر ابھرے۔

”اتنے سالوں بعد کیا ضرورت پڑ گئی اسے مجھ سے ملنے کی؟“، آنکھیں کھولتے ایک بار پھر سے سارے میسجز کو پڑھتے اُس نے تلخی سے سوچا اور ایک گھری سانس لیتے ان کو ڈیلیٹ کیا۔

”جس دن تم نے مجھے محبت کی انتہاء پہ چھوڑا کر کسی اور کا انتخاب کیا تھا نا تو تم اُسی دن میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا چکی تھیں تو اب تم شہر بدلو یا ملک مجھے اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا،“، موبائل کو واپس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے زارون نے اُسے کوئی بھی جواب دینے کی وجہے خود کلامی کی اور اٹھ کروش روم کی جانب بڑھاتا کہ فریش ہو کر نیچے جاسکے۔

---

”زہ نصیب، آئیے آئیے زرامیرے پاس تشریف فرمائیں“، زارون کو سیڑھیوں سے اُتر کر نیچے آتا دیکھ جنید جودو سے تین بار نور سے اُس کا پوچھ چکا تھا اُسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔

”واہ بڑی عزت دی جا رہی ہے مجھے، سب خیریت ہے نا؟“ جنید کے اتنے احترام سے بلانے پر زارون نے کسی غیر معمولی بات کے احساس کے تحت مسکراتے ہوئے وجہ پوچھی۔

”جی سب ہماری طرف سے سب خیریت ہے پر سناء ہے آپ کی طبیعت صبح سے کچھ ناساز ہے“، بڑی عزت کے ساتھ جنید نے اُس کی چوری پکڑتے تصدیق چاہی۔

”نہیں تو، میری طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے۔ لگتا ہے آپ کے ذرائع نے آپ تک غلط اطلاع پہنچائی ہے“، بڑی مہارت سے جھوٹ بولتے زارون نے اُسے شک میں ڈالا۔

---

”میرے روپورٹ کی خبر بھی غلط نہیں ہوتی وہ ہمیشہ صحیح بولتی ہے اس لیے میرے سامنے یہ زیادہ ڈرامہ مت کرو اور بتاؤ کیا مسئلہ ہے؟“ مذاق چھوڑتے جنید نے سنجیدہ ہوتے پوچھا۔

”تو مطلب یہ بات یقیناً آپ کو نور نے بتائی ہے، بھائی میں ٹھیک ہوں وہ تو ایسے ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جاتی ہے، خبر پہنچانے والی شخصیت کا اندازہ لگاتے زارون نے اُسے تسلی دی۔“  
”ایسے پریشان ہوتی ہے یا ویسے بس مجھے کوئی بات نہیں سننی ابھی جاؤ کپڑے تبدیل کر کے نیچے آؤ۔ بس ہم ابھی ڈاکٹر کے پاس چلیں گے“، جنید جو نور کی زبانی زارون کی طبیعت خرابی کا سن چکا تھا اُس نے سختی کے ساتھ اُس کی بات کا ٹھیٹا کیا۔

”افف ایک تو آپ سب لوگ ایسا کریں کے یا تو گھر میں ایک ڈاکٹر کھلیں یا پھر مجھے پکاپکا ہی ہسپتال داخل کروادیں۔ حد ہے ابھی کل ہی تو سارے ٹیسٹ کروائے ہیں اب اُن کی رپورٹ آئے گی تو ڈاکٹر اُسے دیکھ کر کچھ بتائے گا نا؟ اور میں نے نور سے بھی کہا تھا کہ شام کو میں نے روپورٹ لینے جانا ہے تو ساتھ چیک بھی کروالوں گا پر اس چڑیل کو تو بس سب سے میری شکایات لگانا آتی ہیں“، جنید کی ڈانٹ سنتے زارون نے تفصیل کے ساتھ اُسے ساری بات بتاتے آخر پر نور پر غصہ کرتے اُس کی کلاس لینے کا سوچا۔

”کب ملنی ہے روپورٹ؟“ اُس کے غصے کی پرواکیے بغیر جنید نے اگلا سوال کیا۔

”چھ بے ملنی ہے، میں بس کچھ کھاپی کے معاذ کو ساتھ لے کر جاتا ہوں آپ پر یشان نہ ہوں“، اُسے ٹھنڈا پڑتے دیکھ زارون نے تسلی دی تو جنید نے معاذ کے نام پہ مطمئن ہوتے شر جیل اور مزمل کو اپنی طرف آتا دیکھ خاموشی اختیار کی۔

---

”یہ تم کیوں کرہ اور لا ٹھس بند کیے یوں مجنوؤں کی طرح بیٹھے کس بات کا سوگ منار ہے ہو؟“ ناشته وغیرہ کرنے کے بعد زارون نے معاذ کے کمرے کا رخ کیا جوا بھی تک دروازہ لا ک کیے بیٹھا تھا۔

”کچھ نہیں یا بس سر میں درد ہو رہا تھا“، مسلسل دستک کی آواز پہ بلا آخر اُس نے ہمت کر کے دروازہ کھولا اور زارون کی بات کا جواب دیتے لائٹ آن کی۔ ”سر میں کیوں درد تھا؟ کیا یوں خود کو بند کرنے سے درد ختم ہو جاتا ہے؟“ اُس کی سوچ بھی ہوئی آنکھوں کے نیچے بکھری سرخی کو بغور دیکھتے زارون نے سوال کیا۔

”نہیں بس باہر سب کا شور تھا اسی لیے دروازہ بند کیا تاکہ کچھ دیر سکون سے سو سکوں“، اُسے اپنی جانب متوجہ پا کر معاذ نے جواب دینے کے ساتھ ہی واش روم کا رخ کیا تاکہ اپنا چہرہ دھو سکے۔

---

”ویسے تمہارا چہرہ دیکھ کے لگ تو نہیں رہا کہ تم سور ہے تھے“، اُسے واش روم میں جاتا دیکھ پچھے سے زارون نے اوپنجی آواز میں اندازہ لگایا۔

”سو نہیں رہا تھا بلکہ سونے کی کوشش کر رہا تھا پر نیند نہیں آئی، پتا نہیں شاید اس بار مجھے یہاں کا موسم مجھے راس نہیں آیا“، چند سیننڈ بعد تو لیے سے اپنا چہرہ صاف کرتے اُس نے باہر آتے زارون کی بات کا جواب دیا جواب بیٹھا اُسی کا منتظر تھا۔

”اندر کا موسم خوشنگوار ہو تو انسان کو سارے موسم ہی راس آجائتے ہیں اور مجھے باہر کا نہیں بلکہ تمہارے دل کا موسم خراب لگ رہا، کیا ہوا ہے؟ کوئی پریشانی ہے کیا؟“ اپنی بات کہتے زارون نے اُس کے سامنے آتے سوال کیا۔

”یار کوئی پریشانی نہیں ہے، بتایا تو ہے سر میں درد ہے اور یہ تم ابھی تک تیار کیوں نہیں ہوئے؟ پتا ہے ناپانچ بجے ہمیں ڈاکٹر کی طرف جانا ہے“، اُس کا دھیان ٹلانے کے لیے معاذ نے بات بدلتے اُسے یاد دہانی کروائی۔

”ہاں، یاد ہے اور میں تیار ہی ہونے لگا تھا پر امی نے بتایا کہ تم دوپھر سے اپنے کمرے میں ہو تو سوچا پہلے تمہیں دیکھ لوں“، اُس کے بات بدلنے کو محسوس کرنے کے باوجود بھی زارون نے زیادہ زور

دینے کی بجائے اپنی بات مکمل کی اور پھر کسی وقت اُس سے اُس کی بے چینی کی وجہ پوچھنے کا سوچتے، اُسے تیار ہونے کا بولتے باہر کی جانب بڑھا۔

”افف شکر ہے جلدی جان چھوٹ گئی“، اُس کے جاتے ہی معاذ نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ زارون نے زیادہ اصرار نہیں کیا اور نہ آج وہ جس کیفیت میں تھا اُس کے زیر اثر اپنا حال دل بیان کرتے دیر نہ لگاتا۔

”یہ تم میرے موبائل میں کیا تلاش کر رہی ہو؟“ کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنا موبائل نور کے ہاتھ میں دیکھ (جسے وہ چار جنگ پہ لگا کر گیا تھا) ایک دم سے پریشان ہوا۔

”کیوں میں آپ کے موبائل کو ہاتھ نہیں لگا سکتی یا میرا ہاتھ لگانا منع ہے؟“ اُسے دیکھ کر بھی نور نے موبائل رکھنے کی بجائے نظریں اُس کی اسکرین پہ جمائے سوال کیا۔

”منع نہیں ہے پر اس کی بیڑی لو تھی اس لیے چار جنگ پہ لگا کر گیا تھا“، اُس سے موبائل لے کر اُسے کسی بھی شک میں ڈالنے کی بجائے زارون نے تحمل سے جواب دیا۔

”میں نے ابھی چار جنگ پہ سے ہٹایا ہے پتا نہیں بار بار کسی کی کال آرہی تھی“، گیم بند کرتے نور نے کہنے کے ساتھ ہی موبائل اُس کی جانب بڑھایا۔

”کس کی کال تھی؟“ کچھ گڑ بڑاتے ہوئے زارون نے سوالیہ نظر وہ سے اُسے دیکھا۔

”مجھے کیا پتا؟ کوئی نمبر تھا اور آپ پریشان نہ ہوں میں نے آپ کی کسی سہیلی کا میسج نہیں پڑھا، میں تو بس گیم کھیل رہی تھی“، اُسے ماتھے پہ بل لیے اسکرین پہ نظریں جمائے کھڑا دیکھ نور نے لاعلمی کا اظہار کرتے اُسے تسلی دی۔

”ہونہہ مجھے کیا ضرورت ہے پریشان ہونے کی اور جان اگر تم نے میری سہیلی کا میسج پڑھا ہوتا تو اب تک پورا گھر رود کے سر پہ اٹھا لینا تھا“، اُس کی بات پہ مطمئن ہوتے زارون نے پھر سے حبہ کا نمبر دیکھ کے اُسے چھیڑا۔

”اب اتنی بھی بات نہیں ہے اور مجھے پتا آپ کی کوئی سہیلی نہیں ہے اگر ہوتی بھی تو اب تک میرے ہاتھوں مر چکی ہوتی“، اُس کی خوش فہمی پہ اُسے ایک گھوری سے نوازتے نور نے بیڈ پہ پڑے دھلے ہوئے کپڑوں کو تہہ کیا۔

”ہاں بس تب ہی تو میں بناتا نہیں، کیوں کہ مجھے پتا کہ میری بیوی خونخوار چڑیل ہے جو سب کچھ برداشت کر سکتی پر میرے ساتھ کسی اور کو دیکھنا اُس کے بس کی بات نہیں“، موبائل واپس

چار جنگ پہ لگاتے زارون نے اُس کی ناک دبائی جو چڑیل لفظ پہ ہو نقوں کی طرح منہ کھولے بیٹھی تھی۔

”برے ہیں آپ، حد ہے تعریف بھی کرتے تو وہ بھی اتنے بُرے الفاظ میں“، ہاتھ میں پکڑی اُس کی شرط گول کرتے اُس کو مارنے کے ساتھ ہی نور نے اپنا حساب برابر کیا۔

”ہاں تم بڑی اچھی ہو، جو ہر وقت اپنے مجازی خدا کو کبھی کشن سے اور کبھی شرط کے گولے بنانا کے مارتی ہو“، واپس شرط روں کر کے زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اُس کی طرف اچھالی تو وہ سیدھا اُس کے چہرے پہ جا کر گئی۔

”بھاڑ میں جائیں آپ اور خبردار اگر اب مجھ سے بات کی تو“، اُس کے مارنے پہ دلبر داشتہ ہوتے نور نے سختی کے ساتھ اُسے نسبیہ کی اور بیڈ سے اُترتے کمرے سے باہر نکل گئی۔

”ہونہہ اپنی باری پہ ایسے منہ پھلا لیتی ہے جیسے پتا نہیں کتنا ظلم کر دیا ہو میں نے“، اُس کے جاتے ہی زارون نے منہ میں بڑھاتے اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوا جہاں پھر سے حبہ کی کال آر ہی تھی۔

دوچار بیل ہونے کے بعد زارون نے دوسری طرف مقابل کی ہٹ دھرمی برقرارد یکھ موبائل اٹھاتے بالکوئی کارخ کیا۔

”ہیلو“، کال ریسیو کرتے اُس نے اپنے ہونے کا یقین دلا یا۔

”کال کر لی ہے تو اب بات بھی کر لو“، دوسری جانب مسلسل خاموشی پہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنے لہجے میں سختی نہ لاسکا۔

”میں نے تمہارے میسجز پڑھ لیے تھے پر تمہاری ملاقات کی خواہش کو پورا کرنا اب میرے بس میں نہیں“، اُس کے پکارنے پر بھی مقابل نے کوئی پیش رفت نہ کی تو زارون نے خود ہی بات کا آغاز کیا۔

”میں بھی تمہاری طرح اپنی زندگی میں آگے بڑھ چکا ہوں اور اپنی زندگی میں شامل اُس شخص کو دھوکہ دینا میرے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہے اس لیے پلیز مجھے اس بات کے لیے مجبور نہ کرو جس کا اختیار میں ایک سال پہلے کسی اور کے نام کر چکا ہوں“، اُسے کسی بھی قسم کی تسلی دینے کی بجائے زارون نے صاف لفظوں میں انکار کیا۔

”بہت خوش نصیب ہے وہ“، اپنے آنسوؤں کو ضبط کرتے اس بار دوسری طرف آواز ابھری تو زارون کے دل کی دھڑکنیں کچھ سینکنڈز کے لیے تھم سی گئیں۔

”بہت زیادہ خوش نصیب ہے وہ جسے تم جیسا محبت کرنے والا شخص ملا اور میں بہت بد قسمت جس نے ایک لاپچی اور بے حس انسان کو تم پر ترجیح دی۔ میں نے اپنے ماں باپ کی خاطر تمہیں چھوڑا تھا نا؟ تم سے بے وفائی کی تمہارا دل دکھایا، دیکھو آج میں بھی اُسی مقام پر کھڑی ہوں جہاں مجھے بھی نہ صرف کسی نے ٹھکرا�ا بلکہ اپنی زندگی سے نکالتے طلاق کا دھبہ میرے سر پر سجادیا۔ مجھے سزا ملی ہے، تمہارا دل توڑنے کی سزا...“ ایک سکلی لیتے اس نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا تو زارون کو ہوش آیا۔

”کیا مطلب؟ تمہارے شوہرنے تمہیں چھوڑ دیا؟ پر کیوں؟“ اس کی تکلیف پر لفظوں کو توڑ کر ادا کرتے وہ خود کو بھی بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

”میں اسی قابل تھی اس لیے چھوڑا دیا، تم اس بات کی فکر نہ کرو بس ایک بار مجھ سے مل لو۔ میں بس تمہیں ایک آخری بار دیکھنا چاہتی ہوں، تم سے اپنے کیے کی معافی مانگنا چاہتی ہوں تاکہ اپنی اگلی زندگی اس ملال سے بری ہو کر گزار سکوں کہ میں نے کسی کی دل آزاری کی تھی،“ نیچے گاڑی کے ہارن کی آواز سنتے ہبہ نے بات ختم کرتے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

”ٹھیک ہے میں آجائوں گا بس تم مجھے یہ بتا دینا کہ کب اور کہاں آنا ہے،“ دماغ کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی دل نے اس کی پکار پر لبیک کہا تو زارون نے حامی بھرتے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے میں مسح کر کے بتا دوں گی“، سارہ بیگم کی آواز سنتے اُس نے کہنے کے ساتھ ہی کال منقطع کی اور اپنا چہرہ صاف کرتے کمرے سے باہر آئی۔

”کہاں رہ گئی تھیں تم؟ ڈرائیور کب سے ہارن دے رہا ہے؟“، اُسے دیکھتے ہی سارہ بیگم جو سیڑھیاں چڑھتے اور پر آرہی تھی کہنے لگیں۔

”جی بس وہ مجھے میرا بیگ نہیں مل رہا تھا“، ان سے نظریں ملائے بغیر حبہ نے جان بوجھ کر کمرے میں چھوڑے ہوئے بیگ کو ان کی نظروں کے سامنے کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے آجاو، ابھی ہمیں کچھ دیر تمہاری خالہ کی طرف بھی رکنا ہے“، سارہ بیگم نے کہنے کے ساتھ ہی نیچے کی طرف قدم بڑھائے تو حبہ نے بھی ان کی تاکید کرتے اپنارخ بیرونی دروازے کی جانب کیا۔

-----

”پتا نہیں کیا سمجھتے ہیں خود کو، حد ہے اتنی زور سے شرٹ ماری میرے چہرے پہ“، آنکھوں میں نمی لیے نور نے لان میں ٹھلتے ہوئے کوئی بیسویں بار زارون کو کو سا جو اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی اُسے دیکھنے نہیں آیا تھا۔

”مجھے پتا کوئی اور سہیلی مل گئی ہے تب ہی مجھے یوں اگنور کر رہے ہیں ورنہ پہلے تو میرا زرا سا بھی منہ بنتا تو فوراً ہی منا لیتے تھے“، بلاوجہ ہی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو ہاتھ کی پشت سے رگڑتے اُس نے ایک نیا وہم دل میں پالتے کچھ فاصلے پہ بنی سیڑھیوں کا رخ کیا۔

”میں بھی اندر نہیں جاؤں گی جب تک مجھے منانے نہیں اسکیں گے۔ میں بھی یہی بارش میں بیٹھی رہوں گی“، گھاس پہ گرتی ہلکی ہلکی بوندوں کو دیکھتے اُس نے اپنی ضد کو مزید پختہ کرتے ارادہ کیا اور وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھتے زارون کا انتظار کرنے لگی جو حبہ سے بات کرنے کے بعد اُس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا سن کر دلبر داشتہ سا بھی تک بالکلونی میں موجود اُس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

”پتا نہیں کیوں زندگی اتنی پیچیدہ ہے اور جانے کیوں یہ اتنے بل پھیر کھانے کے بعد بھی انسان کو اُسی شخص کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے جس کا سامنا کرنا تو دور کی بات انسان اُس کے تصور کو بھی

سوچنا نہیں چاہتا،“ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرتے زارون نے آنکھیں بند کرتے ایک گہر اسائنس فضا کے سپرد کیا۔

”ماش میں تمہیں انکار کر سکتا، کاش کہ میں تمہیں یہ بتا سکتا کہ میں نے تمہیں تمہاری یادوں کے ساتھ ہی اپنے دل کے کسی بے کار کو نے میں دفن کر دیا ہے۔ شاید میں تمہیں یہ سمجھا سکتا کہ میری زندگی کے ساتھ ساتھ اب میرے دل میں بھی تمہارے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی پر!...“ آنکھیں کھولتے اُس نے بارش کی تیز ہوتی بوندوں کو دیکھتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”پہلی محبت مر کے بھی کہیں نہ کہیں اپنی باقیات چھوڑ دیتی ہے اور کچھ ایسے فوسلز کی شکل اختیار کر لیتی ہے جو گل سڑ کر اپنی اصل شکل گنوانے کے بعد بھی آنے والی زندگی میں اپنے نشان برقرار رکھتے کسی کے قیام کا پتا دیتے ہیں،“ ہاتھ بڑھا کر پانی کی بوندوں کو ہتھیلی میں جذب کرتے زارون نے خود کلامی کی۔

”انسان کے اختیار میں پہلی محبت کو مارنا تو ہے مگر اُس کے لگے سڑے وجود کو اپنے دل سے نکالنا نہیں، تب ہی تو کچھ محبتوں کا انجام موت کی صورت دیکھا جاتا ہے کیوں کہ چاہتوں کو مارنے کے چکر میں انسان اُن فوسلز کی تعداد بڑھا لیتا جو اپنی بدبو سے ایک ناسور کی مانند ہمارے پورے جسم

میں گردش کرتے ہمیں اندر سے بالکل کھو کھلا اور بے جان کر دیتے ہیں،“، ہتھیلی میں آئی بوندوں کو قید کرتے زارون نے ایک تلخ مسکراہٹ چہرے پہ سجائی۔

”تمہاری محبت بھی میرے جسم میں اُسی ناسور کی مانند گردش کر رہی تھی جس کے زیر اثر میں تمہیں انکار نہیں کر پایا۔ میں تمہیں اپنے دل سے مردہ کر کے بھی نکال نہیں پایا، ہاں میں تمہاری اُن یادوں کی گلی سڑی باقیات کو ابھی تک سنبھالے ہوئے ہوں،“، آنسوؤں پہ ضبط کرتے زارون نے ایک بار پھر سے اپنی بات ادھوری چھوڑتے مضبوطی سے اپنی آنکھوں کو بند کرتے کھولا اور اپنے اندر بڑھتی گھٹن سے گھبراتے پانی پینے کی غرض سے کمرے کی جانب بڑھا۔

”یہ لڑکی اب آدمی رات کو پتا نہیں کہاں غائب ہو گئی ہے؟ ہونہہ بس ہر وقت منہ بنانے کا موقع چاہیے،“، پانی پینے کے بعد کچھ دیر تک خود کو پر سکون کرتے زارون نے باہر تیز ہوتی بارش کو دیکھتے پریشانی سے خود کلامی کی اور نور کو دیکھنے کے لیے کمرے سے نکلا۔

”حد ہے یہاں تو کہیں بھی نہیں ہے،“، سب کے کمروں کے دروازے بند دیکھ اُس نے گھر کے اندر تمام جگہوں پہ اُسے تلاش کیا۔

”کہاں جاسکتی ہے؟ پہلے تو ماہم کے کمرے میں ہوتی پر اب شر جیل بھائی آئے ہیں تو وہاں بھی نہیں جاسکتی“، لاوُنچ سے نکلتے زارون نے خود کلامی کی اور اس وقت کسی کے کمرے کے دروازے پر دستک دینا مناسب سمجھتے بیرونی دروازہ کھلا دیکھ کسی خیال کے تحت باہر کی جانب بڑھا۔

”تم یہاں بیٹھی بارش کے مزے لے رہی ہو اور میں تمہیں اندر ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا“، بیرونی دروازے سے ہٹ کر دوسرا جانب موجود سیڑھیوں پر اُسے بیٹھاد دیکھ اُس نے قدم اُس کی جانب بڑھائے جو مکمل طور پر بارش میں بھیگ چکی تھی۔

”میں جہاں بھی رہوں آپ کو کیا؟ آپ جائیں کمرے میں سکون کریں“، اُس کی آواز پر سر اٹھا کر دیکھتے نور نے غصے سے جلنے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

”کمرے میں تمہارے بناء سکون نہیں تھانا اسی لیے تمہیں لینے کے لیے یہاں آیا ہوں“، اُس کے جواب پر مسکراتے زارون نے ایک جذبے کے تحت کہتے اُس کے سامنے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا اور آپ کے ساتھ تو بالکل بھی نہیں“، ایک نظر اُس کے ہاتھ کو دیکھتے نور نے درشتگی سے انکار کیا اور سر گھٹنوں پر رکھتے بارش کو دیکھنے لگی جس میں مزید تیزی آچکی تھی۔

”ہم تو ٹھیک ہے میں بھی بیہیں بیٹھا ہوں تمہارے پاس“، اُس کی ہٹ دھرمی دیکھ زارون نے معذرت کرنے کی بجائے اُسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔

”بیٹھے رہیں مجھے کیا“، سردی محسوس ہونے کے باوجود بھی نور نے لاپرواں سے کندھے اچکاتے اُس کے وہاں بیٹھنے پہ بغیر کسی تاثر کے اپنی بات مکمل کی۔

”تو بیٹھا ہی ہوں، ویسے غصہ ہے کس بات کا؟“ مطلب میرے شرط مارنے کا ہے یا اتنی دیر سے منانے آنا کا؟“ اپنے کپڑوں کے بھیگنے کی پرواکیے بغیر زارون نے وہیں اُس کے قریب بیٹھتے سوال کیا۔

”مجھے کوئی غصہ نہیں اور غصہ ان سے کیا جاتا ہے جن کو آپ کی پرواہ ہو، جس شخص کو آپ کی کوئی فکر ہی نہ ہو اُس سے کیسی ناراضگی؟“ طنز کرتے نور نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”مطلب تمہیں لگتا ہے کہ مجھے تمہاری فکر نہیں ہے؟ اور نہ ہی تمہارے غصے کی پروا؟“ جواب دینے کی بجائے زارون جو پہلے ہی حبہ کی وجہ سے دلبرداشتہ تھا اُس نے نظر وہ میں تلخی لیے سوال کیا۔

”ہاں تو فکر ہوتی تو آپ مجھے اُسی وقت منانے آجاتے پر آپ نہیں آئے اور اب پورے دو گھنٹے بعد جب میں بارش میں پوری طرح بھیگ چکی ہوں تو آپ کو میری یاد آگئی۔ بس مجھ سے بات نہ کریں“، آنکھوں میں آئی نمی کو چھپانے کے لیے اُس نے دوسری جانب رخ پھیرا۔

”یار مجھے کیا پتا تھا کہ تمہارا دماغ اتنا گھوما ہوا ہے کہ تم اندر رکنے کی بجائے یہاں باہر لان میں آگر بیٹھ جاؤ گی“، بجلی کی زوردار چمک کے ساتھ ہی پورے گھر کی لائٹ بند ہوئی تو زارون نے اُس کے خوفزدہ ہونے سے پہلے ہی اُسے اپنے حصار میں لیتے وضاحت دی۔

”جو بھی تھا آپ کو آکر مجھے دیکھنا چاہیے تھا پر آپ پتا نہیں کس سہیلی کے ساتھ مصروف تھے“، چاروں طرف اندر ہیرے پہ جھر جھری لیتے نور نے سر اُس کے کندھے پر رکھتے شکوہ کیا۔ ”ہاں بس اب مجھ معصوم پر یہ بھی الزام لگادو، حد ہے یار“، اُس کے شکوے پر بُرا مناتے زارون نے نفی میں سر ہلا کیا۔

”ہاں توجہ شوہربیوی کی پروانہ کرے تو مطلب اُس کا کہیں اور چکر چل رہا اور پہلے تو کبھی آپ مجھ سے یوں غافل نہیں ہوئے۔ مطلب میں آدھا گھنٹہ کمرے میں نہ آؤں تو آپ مجھے دیکھنے آ جاتے“، ہوا میں بڑھتی خنکی کو محسوس کرتے نور کے ہونٹ کپکپائے تو اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”اندر چلتے ہیں باقی جتنا بھی لڑنا ہو اندر جا کر لڑ لینا“، اُسے کانپتا دیکھ زارون نے مزید کچھ کہنے یا سننے کی بجائے وہاں سے اٹھتے اُسے بھی اپنے ساتھ کھڑا کیا تو نور نے قدم آگے بڑھانے کی بجائے رکتے ہوئے اندر جانے سے انکار کیا۔

”نور پیز ضد نہ کرو، دیکھو بہت ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اور سے تمہارے کپڑے بھی گیلے ہیں سردی لگ گئی تو طبیعت خراب ہو جائے گی“، اُس کی ضد پہ غصہ کرنے کی بجائے نرمی سے سمجھاتے زارون نے اُسے ساتھ لیے آگے بڑھنا چاہا۔

”ٹھیک ہے پہلے کان پکڑ کر سوری بولیں اور یہ بھی کہ آپ مجھے دوبارہ کبھی نہیں ماریں گے“، پھر سے رکتے نور نے اپنی شرط بتائی۔

”اُفف یہ لو میری اماں پکڑ لیے کان“، اُس کے سامنے یچے زمین پہ گھٹنوں کے بل بیٹھتے زارون نے باقاعدہ اپنے دونوں کانوں کو تھما۔

”سوری بھی بولیں“، شان بے نیازی سے دونوں ہاتھ باندھتے اُس نے اپنی اگلی شرط بتائی۔ ”سوری میری جان میں دوبارہ کبھی بھی تمہیں شرط یا کشن مارنے کی گستاخی نہیں کروں گا، بس اب بہت ہو گیا بچپ کر کے اندر چلو ورنہ میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا“، کہنے کے ساتھ ہی زارون نے کھڑے ہوتے اُس کا ہاتھ تھامتے دھمکی دی۔

”ٹھیک ہے اٹھا لیں“، اُس کی بات سنتے ڈرنے کی بجائے نور نے نظروں میں شرارت لیے اپنے دونوں بازو پھیلاتے فرمائش کی۔

”بہت ہی بد تینیزی ہو، قسم سے انسان تھوڑی ہی شرم کر لیتا ہے“، اُس کی بات سننے زارون نے ایک گھری سانس لی اور آگے بڑھتے اُسے اپنے بازوں میں اٹھایا۔

”توبہ موٹوکم کھالیا کروحد ہے کتنا وزن ہے تمہارا“، اُسے اٹھاتے ہی زارون نے شراری مسکراہٹ چہرے پہ سجاتے اُسے چھپڑا جو کوئی بھی جواب دیے بغیر اپنا چہرہ اُس کے سینے میں چھپا چکی تھی۔

”چلو جھولے پورے ہو گئے ہیں تمہارے اب اُترو“، بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے ہر طرف اندھیرا دیکھ زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اُسے اپنے بازوں سے نکالتے کھڑا کیا۔

”تم یہیں رکو میں جزر یڑ چلا کر آتا ہوں“، اُسے وہیں رکنے کا بولتے زارون نے قدم باہر کی جانب بڑھانا چاہے۔

”نهیں، مجھے بھی آپ کے ساتھ جانا ہے مجھے اندھیرے میں ڈر لگتا ہے“، جلدی سے اُس کا ہاتھ تھامنے نور نے وہاں رکنے سے انکار کیا۔

”یا رباہر بارش ہو رہی ہے اور بس ایک منٹ کا کام ہے میں ابھی آجائوں گا“، اُسے تسلی دیتے زارون نے مزید اُس کی کوئی بات سے بغیر باہر کا رخ کیا تو نور نے ایک خوف زدہ نظر اندر ہیرے میں ڈوبے لاوٹھ پہ ڈالی۔

”اُفف یہ اندر ہیرا کتنا وحشت زدہ سا محسوس ہوتا ہے“، جھر جھری لیتے اُس نے خود کلامی کی اور زارون کے جلدی واپس آنے کی دعا مانگنے لگی تب ہی کسی کے قدموں کی آواز نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا اور ساتھ ہی پورا گھر روشنی میں نہا گیا۔

”شکر ہے کسی کو توجہ ٹرچلانے کا خیال آیا“، معاذ جو کمرے سے یہی کام کرنے والا تھا اُس نے لائٹ آنے پہ شکر ادا کرتے سامنے کھڑے وجود کو حیرت سے دیکھا۔

”بھا بھی آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ ہاتھ میں پکڑی ٹارچ بند کرتے معاذ نے قدم اُس کی جانب بڑھائے جو اپنے گیلے کپڑوں کی وجہ سے تھوڑا گھبرا گئی تھی۔

”ہم لوگ بارش انجوائے کر رہے تھے۔ کیوں تمہیں کوئی مسئلہ ہے؟“ بیرونی دروازے سے اندر داخل ہوتے اس سے پہلے کہ نور کوئی جواب دیتی زارون نے نامحسوس طریقے سے اُس کے سامنے آتے اُسے معاذ کی نظروں میں آنے سے پہلے ہی اپنے پیچھے چھپا یا۔

”ہونہے مجھے کیا مسئلہ ہو گا، میں تو بس بھا بھی کواس وقت یہاں دیکھ کے پریشان ہو گیا تھا اسی لیے بس سوال کر لیا“، زارون کے لبھ میں واضح تنبیہ محسوس کرتے معاذ نے اُسے ایک گھوری سے نوازا۔

”اچھا بس مل گیا ناجواب، جاؤ اب اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو اور ہاں لائٹ آئی تو جز ٹبند کر دینا“، وہیں نور کے آگے جمے کھڑے زارون نے اُسے تاکید کی جو نور کی وجہ سے بس ایک غصیلی نظر اُس پہ ڈالتے خاموشی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

”چلو کمرے میں کپڑے تبدیل کرو“، معاذ کے کمرے میں جانے کا لیقین ہوتے ہی زارون نے اپنا رخ اُس کی جانب کیا جوا بھی تک وہیں کھڑی اُس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔

”آپ بہت اچھے ہیں زار“، اُس کی اتنی احتیاط پہ آنکھوں میں نمی لیے نور نے خوشی سے اپنے بازو اُس کی کمرے کے گرد لپیٹے۔

”یہ تعریف کمرے میں جا کر کرنا بھی تم جاؤ اور کپڑے تبدیل کرو، میں دروازہ لاک کر کے آتا ہوں“، کسی اور کے آجائے کے ڈر سے زارون نے اُسے خود سے الگ کرتے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے بس آپ جلدی آجائیں“، ضد کرنے کی بجائے نور نے اُس کی بات مانتے اثبات میں سر ہلا کیا اور سیڑھیاں چڑھتے اوپر کمرے میں آگئی۔

-----

بیرونی دروازہ لاک کرنے کے بعد وہ اوپر جانے کی بجائے معاذ کے کمرے کی طرف آیا تاکہ اُس سے اپنے رویے کی معافی مانگ سکے۔

”کون ہے؟“ دستک کی آواز پہ معاذ جو ابھی بیڈ پہ لیٹا تھا اٹھ کر دروازے کی طرف آیا۔

”اب کیوں آئے ہو؟“ دروازہ کھولتے ہی سامنے زارون کو کھڑا دیکھ اُس نے درشناگی سے اپنی بائیں آئی ابر واچ کائی۔

”بات کرنے آیا ہوں“، اُسے دروازے میں جمادیکھ زارون نے کہنے کے ساتھ ہی اُسے پیچھے کی جانب دھکیلا۔

”بات باہر رہ کے بھی ہو سکتی تھی یوں زبردستی مجھے دھکا دے کر میرے کمرے میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟“، اُسے گیلے کپڑوں کے ساتھ کرسی پہ بیٹھتا دیکھ معاذ نے غصے سے کہتے دروازہ بند کیا۔

”ہاں توجہ تم میرے سامنے سیسیہ پلاٹی دیوار بن کر کھڑے تھے تو مجھے کسی طرح تو اندر آنا، ہی تھا اور اتنی اکڑد کھانے کی ضرورت نہیں ہے میں بس تم سے معذرت کرنے آیا تھا“، اُس کے ماتھے پہ بل دیکھ زارون نے اپنے آنے کی وجہ بتائی۔

”کس بات کی معذرت؟ جب تم نے اپنی بیوی کے سامنے میرے بڑے ہونے کا احساس نہیں کیا تواب کیوں یہ مسکین سی صورت بنائے میرے کمرے میں آئے ہو“، دونوں بازوں سینے پہ باندھتے معاذ نے اُسے آڑے ہاتھوں لیتے اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔

”بڑے ہونے کا ہی احساس تھا کہ میں نے تمہیں چار جو تے نہیں مارے ورنہ جیسے تم میری بیوی سے سوال کر رہے تھے کوئی اور ہوتا تواب تک میں اُس کا گلاد بادیتا“، زارون نے اصل بات کہنے کی بجائے معاذ کے سوال کرنے کو بنیاد بنتے دانت پسیے۔

”بس بس زیادہ جھوٹ مت بولو، جانتا ہوں تمہیں کیوں اتنا بُرا الگ۔ ویسے جب اُس کی اتنی پروا کرتے ہو تو اس دن یہ بات کیوں ہی کہ میرے جانے کے بعد نور کا خیال رکھنا؟“، معاز جوز زارون کی حرکت پہ سمجھ چکا تھا کہ وہ نور کے کپڑوں کی وجہ سے اُس سے یوں بات کرتے کمرے میں جانے کا بول رہا ہے اُس نے دماغ میں آئی بات یاد آنے پہ سوال کیا۔

”دماغ خراب ہو گیا تھا اس دن میرا اس لیے تم سے یہ بات کہہ دی اور ابھی میں زندہ ہوں اس لیے اس بات پر عمل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے“، اس کے سوال پر ایک دم سے بھڑکتے زارون نے اُسے آنکھیں نکالیں جواب اُس کی حالت سے محفوظ ہوتے مسکرا رہا تھا۔

”شرم کرو مجھے کیا ضرورت پڑی ہے ایسی فضول بات پر عمل کرنے کی اور یہ لو میرے جڑے ہوئے ہاتھوں کو دیکھو اور بھائی مجھے بخش دو۔ میرے تو ابو کے ابو کی بھی توبہ جو میں تمہاری بیوی کو دوبارہ سے مخاطب کروں“، معاذ نے باقاعدہ دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑتے بات کو ختم کیا۔

”ہونہہ تمہارے لیے اچھا بھی یہی ہے“، اس کی مسکراہٹ پر مصنوعی گھوری سے نوازتے زارون نے ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھتے دھمکی دی اور دروازے کی جانب بڑھا۔

”اففف اس مجنوں کا کچھ نہیں ہو سکتا“، اس کے کمرے سے نکلتے ہی معاذ نے ایک گہری سانس لیتے خود کلامی کی اور دروازہ لاک کرتے واپس بیڈ پر آکر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

-----

”کہاں رہ گئے تھے آپ؟“، کمرے میں داخل ہوتے ہی نور کی آواز اُس کے کانوں میں پڑی جو کمفرٹر اچھے سے اپنے گرد لیپٹے بیٹھی تھ۔

”کہیں نہیں بس غیر ضروری لا یُمُّس وغیرہ بند کرنے لگ گیا تھا“، معاذ کے پاس جانے والی بات کو گول کرتے زارون نے بیڈ پہ پڑے اپنے کپڑوں کو اٹھایا (جو یقیناً انور نے نکال کر رکھے تھے) اور انہیں تبدیل کرنے کے لیے واش روم کی جانب بڑھ گیا۔

”افف کتنی سردی ہے“، زارون کے واش روم میں گھستے ہی انور نے کانپتے ہوئے خود کلامی کی اور ویسے ہی سمٹ کر لیٹتے اُس نے خود کو کمفرٹر میں چھپایا۔

”زیادہ سردی لگ رہی ہے تو کمبل نکال دوں؟“ کچھ سینکڑ ز بعد وہ کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو انور کو سمٹ کر لیٹا دیکھ کر پوچھنے لگا۔

”نکال لیں، اس میں تو مجھے بہت سردی لگ رہی“، چہرے سے کمفرٹر ہٹائے بغیر ہی انور نے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”تو کس نے مشورہ دیا تھا کہ باہر لان میں جا کر ناراض ہو، خفا ہی ہونا تھا تو اندر کسی کو نہ میں بیٹھ کر ہو جاتیں“، اسٹول رکھ کر الماری کے اوپر والے خانے سے کمبل نکالتے زارون نے اُس کی عقل مندی پہ تبصرہ کیا۔

”حد ہے، مطلب ناراض ہونے کے لیے بھی جگہ کا انتخاب سوچ سمجھ کر کرتے ہیں کیا؟“ اُس کی انمول بات پہ چہرے سے کمفرٹر ہٹاتے انور نے نظر وہ میں حیرت لیے سوال کیا۔

”سوچ سمجھ کر تو نہیں البتہ ناراضگی کے لیے بھی تھوڑی عقل استعمال کر لی جائے تو انسان اپنا نقصان کرنے سے بچ جاتا“، کمبل بیڈپر رکھتے زارون نے اُسے مشورہ دیا جو سردی لگنے کی وجہ سے اب چھینک رہی تھی۔

”اُفف مجھے نہیں سمجھ آتی آپ کی اتنی مشکل باتیں“، ڈبے سے ٹشوں کاں کرنا ک صاف کرتے وہ ایک بار پھر سے چھینکی۔

”ہاں تب ہی یہ حال ہے“، زیر لب بڑھاتے زارون نے اس وقت مزید کوئی لڑائی کرنے کے بجائے کمبل کھول کر اُس کے اوپر دیا اور لائٹ بند کرتے اپنی جگہ پر آکر لیٹا۔

”زارمیر اسرد بادیں پلیز“، مزید ٹشوں کاں کر ہاتھ میں پکڑتے نور نے اُس کے لیٹتے ہی سر اُس کے کندھے پر رکھا۔

”منع کر رہا تھا کہ نہ بیٹھو باہر پر تمہیں اثر نہیں ہوتا، اب دیکھانا طبیعت خراب ہو گئی“، ہاتھ اُس کی پیشانی پر رکھتے زارون نے اُسے ڈالنا۔

”تو یہ سب آپ کی وجہ سے ہوانہ آپ مجھے مارتے اور نہ مجھے غصہ آتا اور نہ ہی میں باہر سردی میں جا کر بیٹھتی“، اُس کے ڈالنٹے پر معدرت کرنے کی بجائے نور نے سارا الزام اُس کے سر ڈالتے خود کو بے قصور ثابت کیا۔

”اففٹھیک ہے میری ہی غلطی تھی اب پلیز رونامت اور سو جاؤ بس، صحیح ہمیں کہیں جانا بھی ہے“، اُس کے لمحے کی نمی کو محسوس کرتے زارون نے کمبل اپنے اوپر لیتے تاکید کی۔

”کہاں جانا ہے؟“ کہیں جانے کا سنتے ہی نور نے فٹ سے آنکھیں کھولتے سوال کیا۔

”کسی سے ملوانا ہے تمہیں بس اب یہ مت پوچھنا کہ کس سے“، اس سے پہلے کے وہ کوئی سوال کرتی زارون نے اُس کے ہونٹوں پہ انگلی رکھتے تنبیہ کی۔

”ہونہہ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے پوچھنے کی، آپ جس سے بھی ملوائیں گے مل لوں گی بس یہ بتادیں کہ وہ لڑکی ہے یا لڑکا؟“ اُس کا ہاتھ ہٹاتے نور نے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہوتے سوال کیا۔

”جان سر پر اُرٹہ ہے تمہارے لیے بس اب سو جاؤ اور صحیح خود ہی دیکھ لینا“، اپنی سائیڈ کالیمپ بند کرتے زارون نے اُسے اپنے حصار میں لیا تو نور نے بے چینی کے باوجود بھی سر درد کی وجہ سے خاموشی اختیار کرتے آنکھیں موند لیں۔

-----

اُسے سلاتے سلاتے زارون خود بھی نیند کی وادی میں اُتراتو صحیح اُس کی آنکھ موبائل پہ ہونے والی بیل کی آواز پہ کھلی۔

”اُف یہ صحیح کس کی کال آگئی،“ سر اٹھاتے اُس نے نور کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے جلدی سے موبائل اٹھاتے نمبر دیکھے بغیر ہی کال ریسیو کی۔

”ہیلو،“ آہستگی سے دوسری طرف موجود شخص کو پکارتے اُس نے ایک نظر نور کے چہرے کی طرف دیکھا جو اُس کے کندھے پر سر کھے بے خبر سور ہی تھی۔ ”زارون میں حبہ ہوں،“ اُس کی آواز سننے مقابل نے اپنا تعارف کروایا تو زارون نے موبائل کان سے ہٹاتے اسکرین کی طرف دیکھا۔

”زو میں کال بیک کرتا ہوں،“ نور کی وجہ سے زارون نے بس اتنا کہتے کال منقطع کی اور اُس کا سر احتیاط سے تنکیے پر رکھتے موبائل لیے باہر بالکونی میں آیا۔

”جی اب بولو،“ دوبارہ نمبر ملاتے اُس نے دوسری طرف کال ریسیو ہونے پر سوال کیا۔

”وہ میں نے بتانا تھا کہ ہم لوگ ایئر پورٹ پہنچ گئے ہیں اور دو گھنٹے بعد ہماری فلاٹ ہے،“ حال احوال کے بغیر ہی حبہ نے اپنے فون کرنے کا مقصد بیان کیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں آدھے گھنٹے میں آتا ہوں۔ تمہارے امی ابو بھی ساتھ ہیں کیا؟“ اُس کی بات سننے زارون نے اپنے آنے کا بتاتے سوال کیا۔

”نہیں امی ہیں ساتھ اور میرے بچے مگر میں تم سے اکیلے ہی باہر آگر مل لوں گی اس لیے تم ائیر پورٹ پہنچ کر مجھے کال کر دینا یا مسج“، تفصیل سے اپنے ارادے کے متعلق بتاتے حبہ نے اُسے جلد پہنچنے کی تاکید کرتے کال کاٹ دی۔

”اُفف اتنی صبح صح تو نور نے اٹھنا بھی نہیں“، زارون جو اُسے اپنے ساتھ لے جانے کا رادہ رکھتا تھا اُس نے خود کلامی کرتے موبائل جیب میں رکھا اور کمرے کی جانب بڑھا۔

”کس سے بات کر رہے تھے آپ اتنی صبح؟“، اس سے پہلے کہ زارون اُسے اٹھا تا نور نے خود ہی آنکھیں مسلتے سوال کیا۔

”بات کو چھوڑ وار اٹھو میں نے رات کو بتایا تھانا کہ مجھے تمہیں کسی سے ملوانا ہے“، زارون نے اُس پر سے کمبل ہٹاتے اپنی بات کی وضاحت دی۔

”نہیں مجھے کہیں نہیں جانا۔ میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہے“، وہ جو بخار کی حدت بڑھنے پر اُٹھی تھی زارون کی بات سننے جلدی سے نفی میں سر ہلا گئی۔

”ہونہ کچھ نہیں ہوتا اٹھو بس میرے ساتھ چلو“، اُس کے منع کرنے کے باوجود بھی زارون نے اپنی ضرب قرار رکھتے اُس کا ہاتھ پکڑتے اٹھایا۔

”زار میں کہہ رہی ہوں نامیرے سر میں درد ہے پلیز میں کسی اور وقت مل لوں گی“، پھر سے انکار کرتے نور نے اُس سے درخواست کی۔

”نہیں ابھی ملنا ضروری ہے پھر اُس نے امریکہ چلے جانا ہمیشہ کے لیے، اس لیے پلیز تنگ مت کرو اور اٹھ کر جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ تمہارے پاس بس دس منٹ ہیں“، کلاک کی طرف دیکھتے زارون نے اُسے دونوں بازوں سے پکڑ کر بیڈ سے اٹا را۔

”حد ہے بخار میں بھی سکون نہیں لینے دیتے“، نور نے تجسس کے ہاتھوں مجبور اُسے ایک گھوری سے نوازا اور الماری سے اپنے کپڑے نکالنے فریش ہونے کے لیے واش روم کی جانب بڑھ گئی۔

-----

اُس کے تیار ہوتے ہی زارون اُسے ساتھ لیے اگلے چالیس منٹ میں ائیر پورٹ پہنچا تو نور نے کوئی دسویں بار اُس سے اُس شخص کے متعلق سوال کیا جس سے وہ اُسے ملوانے لایا تھا۔

”یار صبر کر لو“، موبائل پہ نمبر ڈائل کرتے اُس نے نور کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں میں پہنچ گیا، پارکنگ میں ہی کھڑا ہوں“، دوسری طرف کال ریسیو ہوتے زارون نے کہنے کے ساتھ ہی دروازہ کھولا۔

”ٹھیک ہے آجائو“، گاڑی سے باہر نکلتے زارون نے دوسری طرف جواب سنتے کال منقطع کی۔

”زار بتائیں ناکس نے ملوانے لائے ہیں آپ؟“ اُس کے پیچھے ہی گاڑی سے نکلتے نور نے ایک بار پھر سے اپنا سوال دھرا یا۔

”میری پرانی دوست تھی“، تھی پہ زور دیتے اُس نے نور کو آگاہ کیا۔

”تھی مطلب؟ کوئی لڑکی ہے کیا؟“ اُس سے سوال کرتے نور نے نظروں میں حیرت لیے سامنے دیکھا۔

”ہاں لڑکی ہی ہے پر تم پریشان نہ ہو دوست تھی پر اب نہیں ہے“، اُس کے چہرے کے گبڑتے تاثرات پہ زارون نے مسکراتے ہوئے جلدی سے وضاحت دی۔

”بھاڑ میں جائیں آپ حد ہے، مطلب آپ صحیح مجھے یہاں اپنی پرانی دوست سے ملوانے لائے ہیں؟“ اُس کے انکشاف پہ صدمے کے ساتھ سوال کرتے نور نے تصدیق چاہی۔

”صرف دوست نہیں تھی میں پسند کرتا تھا اسے اور وہ بھی مجھے پر اُس کے والدین غیر برادری ہونے کی وجہ سے شادی کے لیے رضامند نہیں ہوئے اس لیے یہ قصہ آج سے پانچ سال پہلے ختم ہو گیا تھا۔ اُس کی بھی شادی ہو گئی اور میں بھی اپنی زندگی میں آگے بڑھ گیا“، اُس سے کچھ بھی چھپانے کی بجائے زارون نے صاف الفاظ میں اُسے مختصر اَحبابہ کے متعلق بتایا۔

”اوو تو مطلب یہ معاملہ تھا، میں بھی کہوں کہ یہ لڑکی کون ہے؟ جو بار بار آپ کا نام لے کر مسجح کر رہی ہے اور ساتھ ملنے کا بھی بول رہی“، نور جو کل شام اُس کے موبائل سے جبکہ کے مسجح پڑھ کے ڈیلیٹ کر چکی تھی اُس نے پوری بات سننے کے بعد بے دھیانی میں اپناراز فاش کیا۔

”کیا مطلب؟ تم میرے موبائل سے میسجز پڑھ چکی تھیں تو مجھے کیوں نہیں بتایا؟“ اُس کے منه سے میسجز کا سنتے زارون نے ایک دم سے بوکھلاتے ہوئے سوال کیا۔

”پہلے مجھے لگا کہ شائد کوئی ویسے ہی تنگ کر رہا پر پھر جب آپ کا نام پڑھا تو مجھے شک ہوا کہ ضرور کوئی چکر ہے تب ہی تو میں نے رات کو آپ سے کہا تھا کہ پتا نہیں کون سی سہیلی کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے“، نور نے پوری بات بتاتے اُس کی آنکھوں میں دیکھا جو مسلسل اُسے گھور رہی تھیں۔

”تو تم نے پوچھا کیوں نہیں مجھ سے؟ مطلب جب تم نے میسجز پڑھ ہی لیے تھے تو مجھ سے پوچھ لیتی کہ کون ہے؟ ایسے شک کرنے کی کیا ضرورت تھی“، اُس کی بات سننے زارون نے گاڑی سے ٹیک لگاتے اُس کی عقل پہ ماتم کیا۔

”کیوں پوچھتی؟ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی پوچھنے کی جب آپ کو خود خیال نہیں تو میرا کون سادماں خراب تھا کہ میں آپ سے آپ کی پرانی محبوبہ کے متعلق سوال کرتی پھروں“، اُس کے سامنے آتے نور نے ایک ہاتھ کمر پہ رکھتے لٹرنے والے انداز میں اُس کے سوال کا جواب دیا۔

”ہاں تو تمہارا حق تھا، تم مجھ سے کوئی بھی سوال کر سکتی تھیں پر نہیں جان تمہیں منہ بنانے سے فرصت ملے تو ایسی باتوں پہ غور کرونا“، اُس کے دھلے ہوئے شفاف چہرے کو دیکھتے زارون نے اُسے چھیڑا۔

”ہونہے عقل تو ساری آپ میں آگئی ہے ناجواپنی پرانی محبوبہ سے ملانے مجھے یہاں لے آئے۔ ویسے زار لوگ تو اپنے افسیر چھپاتے نایویوں سے تو آپ کو کیا سوچھی جو آپ مجھے اٹھا کر ساتھ لے آئے“، اپنے دماغ میں گھومتے سوال کو زبان پہلاتے نور نے سوالیہ نظرؤں سے اُسے دیکھا۔

”بس جان کیا کروں لوگ تو صرف مریدی تک محدود رہتے پر میرا تو معیار ان مریدوں سے کہیں زیادہ آگے کا ہے اسی لیے اپنے پاؤں کے ساتھ کلہاڑی بھی لایا ہوں“، سیدھا جواب دینے کی بجائے زارون نے ایک بار پھر سے اُسے تنگ کیا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ حد ہے آپ ہیں، ہی بُرے“، اس سے پہلے کے وہ مزید کچھ کہتی پیچھے سے زارون کے نام کی آواز پہ اُس کی زبان کو بریک لگی۔

زارون کے نام کی پکار پہ نور نے پلٹ کر اپنے پیچھے کھڑے وجود کو غور سے دیکھا جو تقریباً ستائیں اٹھائیں سال کے لگ بھگ خوب صورت نقوش کی حامل ایک خوش شکل لڑکی تھی۔

”السلام عليکم، کیسی ہو؟“ اُس کی محیت پہ زارون نے دل کی دھڑکنیں منتشر ہونے کے باوجود بھی ہمت کر کے حبہ کو مخاطب کیا جو خود بھی نور کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

”وعلیکم السلام میں ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو؟“ نظر وں میں الجھن لیے اُس نے زارون کی آواز پہ ہوش میں آتے زبردستی مسکرانے کی کوشش کی۔

”میں ٹھیک ہوں، اس سے ملویہ نور ہے میری بیوی“، اُس کی نظر وں میں واضح سوال دیکھ زارون نے اُس کا تعارف کروایا تو حبہ کارنگ ایک دم سے پھیکا پڑا۔

”السلام عليکم، کیسی ہیں آپ؟“ کسی بھی جلن کے بغیر نور نے خوش دلی کے ساتھ اپنا ہاتھ آگے برٹھایا۔

”میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے تم سے اکیلے میں ملنا ہے۔ کیا تم کچھ سینڈز کے لیے پوری دنیا سے ہٹ کر مجھے وقت دے سکتے ہو؟“ ایک حقارت بھری نظر نور کے ہاتھ پہ ڈالتے ہبہ نے اُسے تھامنے کی بجائے زارون کو مخاطب کیا۔

”تو میں اکیلا ہی ہوں، بس تم یہ سمجھو کہ میرا وجود جو تم کھو کھلا کر کے گئی تھیں اُسے اپنے پیار اور محبت سے اس لڑکی نے بھرا ہے جو اس وقت میرے ساتھ کھڑی تمہاری اس بے معنی جلن کو سمجھنے کی کوشش کر رہی ہے“، ہبہ کی حرکت پہ زارون نے اپنے غصے کو ضبط کرتے بڑے تحمل سے اُسے آئینہ دکھایا۔

”مطلوب تم یہاں اس کو ساتھ لا کر مجھ سے میری کی گئی زیادتی کا بدلہ لینا چاہتے ہو؟“ اُس کی بات کو کسی اور معنی میں لیتے ہبہ نے ایک نظر نور پہ ڈالی جواب خاموشی سے کھڑی اُن کی باتیں سن رہی تھیں۔

”نهیں، میں تم سے کیوں بدلہ لوں گا اور بدلہ لینا ہوتا تو کبھی بھی یہاں تم سے ملنے نہ آتا اور رہی بات نور کو ساتھ لانے کی تو تم کیا چاہ رہی تھیں کہ میں اپنے کھو کھلے وجود کے ساتھ تمہارے سامنے آتا؟“ نور کا ہاتھ تھامتے زارون نے اُسے روکا اور بناء کسی خوف کے ہبہ کی آنکھوں میں دیکھتے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”میں چاہتا تھا کہ تم مجھے میرے مکمل وجود کے ساتھ دیکھو تو اکہ تمہاری نظروں میں میرے ساتھ ساتھ میری محبت، میرے جنون کا عکس بھی جذب ہو جائے تاکہ پھر دوبارہ کبھی تمہارا دل میری جانب کھنچے یا مجھ سے ملنے پہ اکسائے تو تم یہ سوچ سکو کہ اب میں اکیلا نہیں ہوں“، اپنے لہجے میں سختی لائے بغیر زارون نے لفظوں کے نشتر حبہ پہ چلائے تو اُس کی آنکھیں ایک دم سے بھر گئیں۔

”ہمم ٹھیک ہے میں بس جا رہی ہوں۔ میری فلاں سیٹ کا وقت ہو رہا ہے“، نم لہجے میں وہ جو اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی، اُسے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی رو داد سناتے کچھ وقت کے لیے ہی سہی پر اپنے لیے اُس کی نظروں میں محبت دیکھنے کی خواہ شمند تھی، ایک دم سے مر جھاتے جانے کے لیے پلٹی۔

”میں نے تمہیں معاف کیا اس لیے دل پہ کوئی بوجھ لے کر یہاں سے مت جانا اور ہاں زندگی میں پیچھے چھوڑے گئے انسانوں کو پلٹ کر دیکھنے کی عادت چھوڑ دیکیوں کہ بعض اوقات ہم جو امیدیں دل میں لیے پلٹتے ہیں وہ ہمارے آگے کے تمام راستے بند کر دیتی ہیں“، اس سے پہلے کہ وہ واپسی کے لیے قدم اٹھاتی زارون نے اپنی تیز ہوتی دھڑکنوں کو قابو کرتے اُسے پکارا۔

”پچھلی زندگی میں جو کچھ بھی ہو چکا ہے اُسے بھول کر اپنے بچوں کے ساتھ خوش رہو اور خیال رکھنا کہ اپنی محبت کی ناکامی کی سزا کبھی اُن سے اُن کی محبت چھین کر مت دینا“، آخری بات پہ مسکراتے

ہوئے زارون کی آنکھیں نم ہوئیں تو نور نے اُس کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے اُسے سہارا دیا جس کی نظریں اب حبہ کے بغیر پلٹے کوئی جواب دیے بناء ہی اندر ورنی حصے کی جانب بڑھتے ہوئے قدموں کو دیکھ دو رتک اُس کا تعاقب کرنے لگیں۔

”آپ ٹھیک ہیں؟“ اُس کے ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کرتے نور نے اُسے مناطب کیا۔

”ہاں ٹھیک ہوں چلو گھر چلتے ہیں،“ اُس سے نظریں ملائے بغیر زارون نے مسکرانے کی کوشش کی اور گاڑی کا دروازہ کھولتے ڈرائیونگ سیٹ سن بھائی تو نور نے بھی خاموشی کے ساتھ ایک نظر اُس دروازے کو دیکھا جہاں سے کچھ سیکنڈ پہلے وہ لڑکی اندر گئی تھی اور دوسری جانب سے آتے دروازہ کھول کر زارون کے برابر میں بیٹھ گئی۔

-----

”کہاں رہ گئی تھیں تم؟“ سارہ بیگم جودو سری باراپنے نام کی اناو نسمت سن کر بچوں کو ساتھ لیے اُسے دیکھنے کے لیے دروازے کی جانب بڑھ رہی تھیں انہوں نے اُسے اندر دا خل ہوتا دیکھ کر سکون کا سانس لیا۔

”یہیں تھی بس اندر والی کینٹن سے چیزیں نہیں ملیں تو باہر چلی گئی،“ وہ جو بچوں کی کچھ چیزیں لینے کا بہانہ بنائے تھے اُس نے ماں سے نظریں ملائے بغیر جھوٹ بولा۔

”اچھا چھوڑوان سب باقتوں کو اور اندر چلو، فلاٹیٹ کا وقت ہو چکا ہے،“ اُس کے خالی ہاتھوں کو دیکھتے کوئی بھی سوال پوچھنے کی بجائے سارہ بیگم نے پھر سے اناؤ نسمٹ سنتے بچوں کے ساتھ ہی اندر ونی حصے کی جانب قدم بڑھاتے اُسے بھی آنے کا کہا۔

”سوچا تھا کہ پوری دنیا مجھے تکلیف دے سکتی ہے پر تم نہیں، سارے رشتے میرا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں مگر تم نہیں....،“ ہاتھ میں پکڑے موبائل سے زارون کا نمبر نکالتے اُس نے نم آنکھوں سے ایک آخری بار اُس کے ہندسوں پہ غور کرتے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔ ”مجھے محسوس ہوا تھا کہ تم دنیا جیسے ظالم اور سفاک نہیں ہو پر میری سوچ غلط تھی۔ میرے تمہارے متعلق لگائے گئے سب اندازے بے معنی اور بے کار تھے۔ تم بدل گئے ہو،“ دھنڈ لائی ہوئی نظروں سے موبائل سے اُس کا نمبر ڈیلیٹ کرتے ہبہ نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں شکوہ کرتے ایک بار پھر سے پلت کر دیکھا تو سارہ بیگم کی آواز نے اُسے اپنی جانب متوجہ کرتے آگے کی منزل کے سفر میں تاخیر کے بارے میں آگاہ کیا۔

”جی آرہی ہوں“، اپنے پھوٹ پر نظر پڑتے ہی زارون کے ساتھ ساتھ ہر چیز کو پیچھے چھوڑتے جب نے اپنی مامتا کی خاطر ہر خیال کو دل و دماغ سے جھٹکا اور ایک نئی منزل کی جانب قدم بڑھائے۔

---

”یہ تم دونوں صحیح کہاں سے سیر کر کے آرہے ہو؟“ ان دونوں کو گاڑی سے اُتر تاد کیجھ ماہم جو پھوٹ کے ساتھ ہی لان میں موجود تھی اُس نے اُن کی جانب قدم بڑھاتے نظروں میں شرارت لیے چھیڑا۔

”واک کرنے گئے تھے“، اس سے پہلے کہ زارون کوئی معقول ساجواب دیتے ماہم کو مطمئن کرتا نور نے فٹ سے قریب آتے عقل مندی دکھائی۔

”واہ جی واہ یہ دنیا کی پہلی نایاب واک ہو گی جو تم دونوں نے پیدل چلنے کی بجائے گاڑی پہ کی ہے“، نظروں میں شرارت برقرار رکھتے ماہم نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے نور کے ساتھ ساتھ زارون کو بھی شر مندہ کیا۔

”نہیں میرا مطلب تھا کہ ہم گاڑی میں پار ک تک گئے تھے پھر وہاں کچھ دیر واک کی اور والپس آگئے“، زارون کے گھورنے پہ نور نے جلدی سے اپنی بات کی وضاحت دی۔

”اچھا سمجھ گئی مطلب آج تم لوگوں نے موسم کو انجوائے کیا وہ بھی اچھے خاصے رومنٹک طریقے سے“، اپنی آخری بات پر دباؤ ڈالتے اس نے ایک بار پھر سے انہیں چھیرا تواب کی بار زارون نے اس کے بڑے ہونے کا لحاظ کیے بغیر ہی اُسے آنکھیں دکھائیں۔

”یہ تم دوسرے ملک رہ کر کچھ زیادہ ہی تیز نہیں ہو گئیں؟ میں ابھی شر جیل بھائی سے شکایت کرتا ہوں کہ تمہیں زرا سختی سے رکھیں“، نور کے سرخ ہوتے چہرے کو دیکھ زارون نے مصنوعی غصہ دکھاتے ماہم کی کلاس لی جو بلا وجہ ہی اُن پر الزام لگا رہی تھی۔

”بس بس چھوٹے ہو تو چھوٹے ہی رہو زیادہ بڑے بننے کی ضرورت نہیں اور نور تم کیا صحیح صحیح اس سڑے ہوئے انسان کے ساتھ اپنا وقت ضائع کر رہی ہو۔ آدمیرے ساتھ، ناشتہ بناتے ہیں“، زارون کی بات کا بُرا مناتے ماہم نے اُسے سنانے کے ساتھ ہی نور کا ہاتھ پکڑتے اپنے ساتھ اندر کی جانب کھینچا۔

”ہونہے خود بڑی خوش اخلاق ہے جو مجھے سڑیل کہہ رہی“، اُن دونوں کے جاتے ہی منه میں بڑ بڑاتے زارون نے اپنے سینے پہ ہاتھ پھیرا اور درد محسوس کرتے اندر جانے کی بجائے وہیں لان میں رکتے بچوں کو دیکھنے لگا جو فٹ بال کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔

”یہ تمہارا دوست آج کل کہاں غائب ہے؟ کافی دونوں سے نظر نہیں آیا“، ارحم کے آتے ہی ہاشم صاحب نے ہاتھ میں کپڑا اخبار نیچے ٹیبل پر رکھتے زارون کے بارے میں دریافت کیا۔

”یہیں ہے، بس اُس کے بھائی آئے ہوئے ہیں اسی لیے اُن کے ساتھ تھوڑا مصروف ہے“، گلاس میں جوس ڈالتے ارحم نے انہیں اُس کی مصروفیت کے متعلق آگاہ کیا۔

”اچھا ٹھیک، میں بھی کہوں کہ تمہاری شادی سرپرہ ہے اور اُس کا کچھ اتنا پتا ہی نہیں“، ارحم کی پوری بات سننے کے بعد ہاشم صاحب نے اپنے سوال پوچھنے کی وجہ بتائی۔

”جی بس تقریباً دو سال بعد سب اکٹھے ہوئے ہیں، سستر بھی آئی ہوئی ہیں اُس کی اسی وجہ سے اُس نے مجھے ایک سائیڈ پر لگایا ہوا ہے“، انہیں پوری تفصیل بتاتے ارحم نے آخر میں شکوہ کرتے آج ہی اُس کے گھر جا کر اُس کی خبر لینے کا سوچا جو کافی دونوں سے اُسے فراموش کیے ہوئے تھا۔

”ہاہاہا بالکل مجھے بھی یہی لگ رہا، حد ہے اپنے بہن بھائی آگئے تو کیا انسان اپنے دوستوں کو بھول جاتا ہے؟ وہ بھی اُس وقت جب اُن کی شادی سرپرہ ہو“، اُس کا غصہ دیکھ ہاشم صاحب نے نظروں میں شرارت لیے اُسے مزید بھڑکایا۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ اور فکر نہ کریں میں آج ہی اُس کی خبر لیتا ہوں“، اپنے ارادے سے اُن کو آگاہ کرتے اُس نے آئمہ بیگم کو آواز دیتے جلدی ناشستہ لانے کا بولا جو آج اُس کی فرمائش پہ اپنی نگرانی میں جمال سے آلو کے پر اٹھے بنوار ہی تھیں۔

---

”زارون کیا ہوا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟“ ناشستہ کی ٹیبل پہ سب کی موجودگی میں احمد صاحب نے اُس کے چہرے پہ عجیب سے وحشت دیکھ سوال کیا۔

”جی ابو ٹھیک ہوں، بس نیند پوری نہیں ہوئی اس لیے تھوڑی سستی پڑی ہوئی ہے“، سینے میں ہونے والی درد کا بتانے کی بجائے زارون نے نیند پوری نہ ہونے کا بہانہ بناتے اُنہیں مطمئن کیا۔

”تو کس نے کہا تھا کہ رات کو بارش انجوائے کرنے لان میں نکل جاؤ اور رات سونے کے لیے ہوتی دوسروں کی بے عزتی کرنے کے لیے نہیں“، احمد صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی معاذ جو اُس کے قریب ہی بیٹھا تھا اُس کے کان کے قریب ہوتے بڑ بڑا یا۔

”رات تو صرف بے عزتی کی اب تم نے کسی کے سامنے کوئی ایسی ولیسی بات کی تو میں باقاعدہ تمہاری دھلائی کروں گا“، اس سے پہلے کہ وہ اونچی آواز میں کوئی بات کرتے اُس سے اپنا بدله لیتا زارون نے اُس کا ہاتھ پکڑتے دھمکی دی۔

”شرم کر لو تم سے پورے دوسال بڑا ہوں میں“، اُس کی دھمکی پہ وہ جو حساب برابر کرنے کا رادہ رکھتا تھا آنکھیں نکالتے اُسے اپنی حیثیت یاد کروانے لگا۔

”ہاں یاد ہے اور دوسال صرف عمر میں بڑے عقل میں نہیں“، نوالہ بنائے کر اُس کے منہ میں ڈالتے زارون نے اُسے مزید غصہ دلا یا۔

”شرم کرلو حصہ ہے مطلب بڑے بھائی کی تو کوئی اہمیت ہی نہیں“، اپنی بے عزتی پہ بمشکل نوالہ نگتے معاذ نے اُسے کھاجانے والی نظر وہ سے گھورا۔

”بس کرو یہ کیا تم دونوں ایک دوسرے کے کانوں میں سر گوشیاں کر رہے ہو“، جنید جو ان کے سامنے بیٹھا اُن دونوں کی حرکتوں کو دیکھ رہا تھا ایک دم سے ناشستہ سے ہاتھ روکتے کہنے لگا۔

”بھائی یہ معاذ مجھے تنگ کر رہا ہے“، معاذ کے صفائی دینے سے پہلے ہی زارون نے سارا الزام اُس پہ لگایا جو کچھ بولنے کے لیے بس زبان ہلاتا رہ گیا۔

”معاذ شرم کرو اور سب کی موجودگی میں ایسے کانوں میں باقی میں کرنا کہاں کی شرافت ہے“، زارون کی شکایت سننے ہی جنید نے اُسے آڑے ہاتھوں لیتے محفل میں بیٹھنے کے آداب کے متعلق لیکھ رہا تو معاذ نے زارون کی خبر ناشتے کے بعد اچھے سے لینے کا رادہ کرتے سامنے بیٹھے اپنے بڑے بھائی سے معدرات کی جو آج اُسے تمام آداب اچھے سے سمجھانے کے موڑ میں تھا۔

---

ناشته کرنے کے بعد زارون نے کچھ دیر سونے کا بولتے اپنے کمرے کا رخ کیا تو باقی سب بھی کھانے پینے سے فارغ ہوتے اپنے اپنے کاموں پہ لگ گئے۔

”نوراب تمہارا یونیورسٹی جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کیا؟“، ہما جو کافی دنوں سے اُسے گھر پہ دیکھ رہی تھی اُس نے کچن میں برتن دھوتے دیکھ کر اُسے مخاطب کیا۔

”جی بھا بھی یونیورسٹی میں ہڑتاں ہے کچھ سیاسی پارٹیز کے جھگڑے وغیرہ چل رہے ہیں اس لیے دو ہفتے سے کوئی کلاس نہیں ہو رہیں“، سلیپ سے چیزیں اٹھا کر ان کی جگہ پہ رکھتے نور نے اپنے یونیورسٹی نہ جانے کی وجہ بتائی۔

”اچھا اچھا ٹھیک ہے مجھے لگا شائد تم ویسے ہی چھٹیاں کر رہی ہو“، اُس کی بات سنتے ہمانے مسکراتے ہوئے اپنا اندازہ بتایا۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ تو یہ مسئلہ بنانا ہوا ہے اسی لیے ہم لوگ نہیں جا رہے“، اُس کی غلط فہمی دور کرتے نور نے دھونے والے برتن اٹھا کر سینک کے قریب رکھے۔

”اچھا ٹھیک ہے پھر تو تم اگلے کچھ دن فری ہی ہو، وہ دراصل میں سوچ رہی تھی کہ میں جانے سے پہلے کچھ شاپنگ کر لوں مگر ایمان کو ساتھ لے جا کر مجھے کوئی چیز خریدنا بہت مشکل لگتا اس لیے پلیزا اگر تم اُسے سنبھال لو تو میں آسانی سے اپنی ضرورت کی کچھ چیزیں خرید لوں گی“، ہمانے اپنا مقصد بتاتے اُس کے یونیورسٹی نہ جانے کی تحقیق کرنے کی اصل وجہ بیان کی۔

”جی ٹھیک ہے کوئی مسئلہ نہیں، میں ایمان کو سنبھال لوں گی آپ کو جب بھی جانا ہو بے فکر ہو کر چلی جائیے گا“، اُس کی درخواست پہ مسکراتے نور نے فٹ سے حامی بھرتے اُسے تسلی دی۔

”بہت شکر یہ، بس آج میں نے تھوڑی ہی چیزیں خریدنی ہیں تو تقریباً دو تین گھنٹوں میں واپس آجائیں گی“، اُس کی رضامندی ظاہر کرنے پہ ہمانے نل بند کرتے خوشی سے اپنے آج کے ارادے سے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے آپ پر بیشان نہ ہوں اور سکون سے جائیں، میں ایمان کو دیکھ لوں گی“، ایک بار پھر سے اُسے مطمئن کرتے نور نے چوہہ پر کھے دودھ میں اُبال آتا دیکھ جلدی سے آگے بڑھتے اُسے بند کیا تو ہما بھی نسل کھولتے سینک میں پڑے باقی برتن دھونے لگی۔

---

”امی میں سوچ رہی تھی آج ہم پھوپھو کی طرف چکر لگا لیتے ہیں۔ وہ جنید بھائی لوگوں کو آئے ہوئے کافی دن گزر چکے ہیں اور سنائے ہے ماہم آپی بھی آئی ہوئی ہیں تو چلیں اسی بہانے اُن سے ملاقات ہو جائے گی“، علیزے نے اُن کا موڈ خوشگوار دیکھ اپنی خواہش کا اظہار کرتے وضاحت دی۔

”نہیں کوئی ضرورت نہیں ہے جانے کی، وہ لوگ آئے ہیں تو خیال اُن کو ہونا چاہیے کہ ماموں کا گھر چند منٹ کی دوری پہ ہے۔ انسان چلو کچھ گھنٹے کا وقت نکال کر ہی چکر لگا لیتا ہے“، علیزے کی بات پہ ایک دم سے شاستہ بیگم کے چہرے کے تاثرات بدلتے۔

”پلیز امی، حق ہمارا بنتا تھا کہ وہ لوگ اتنے عرصہ بعد پاکستان آئے ہیں تو ہم اُن سے ملنے جاتے مگر پہلے وقت نہیں ملا اور پھر آپ نے حنا آپی کے چکر میں پڑ کروہاں جانے سے انکار کر دیا“، اُن کے

منع کرنے پہ علیزے نے ایک بار پھر سے اصرار کرتے اُن کے دل سے ناراضگی ختم کرنے کی کوشش کی۔

”نہیں، میرا نہیں دل مانتا اور اگر ہم نہیں گئے تو وہ لوگ آجاتے، یہاں آنے سے اُن کی شان میں کون سافر قبڑ جانا تھا“، اپنی بات پہ قائم رہتے شامائستہ بیگم نے ہٹ دھرمی برقرار رکھتے لفی میں سر ہلاایا۔

”تو وہاں جانے سے آپ کی شان میں بھی کوئی فرق نہیں پڑنا بلکہ اُن سب کی نظروں میں آپ کی عزت اور بڑھ جانی“، اُن کا ہاتھ تھماتے علیزے نے نرمی کے ساتھ مان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے اپنی بات کو جاری رکھا۔

”پلیزامی ہمارے پاس کون سار شتوں کی ریل پیل لگی ہے جو آپ ایسے اپنی انابر قرار رکھتے ہم سے ہمارے یہ چند گنے پختے بھی دور کرنا چاہتی ہیں اور غلطی آپ کی طرف سے ہوتی تھی، یاد کریں جب ابو ہسپتال میں تھے تو آپ نے کس طرح پھوپھو کو با تیں سنائیں اور زارون کی بیوی کو بھی مگر پھر بھی پھوپھو اور پھوپھانے آپ کا ساتھ نہیں چھوڑا بلکہ وہ تو کبھی بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتے“، اُن کے ہاتھ پہ دباؤ ڈالتے علیزے نے آخری بات مسکراتے ہوئے کہی۔

”نفرت ایک ایسا احساس ہے جس کی تھوڑی سی مقدار بھی سالہا سال کی محبتوں کو خراب کر دیتی تو سوچیں کہ جب آپ اس احساس کو دماغ پہ حاوی کر لیں تو کتنے بڑے بڑے نقصان ہوتے ہوں گے؟ اس لیے پلیز دل سے تمام شکوئے شکایات کو مٹا کر اپنے رشتؤں کی قدر کریں۔ یقین جانیں آپ ایک قدم ان کی طرف چل کر جائیں گی تو وہ لوگ دوڑتے ہوئے آپ کے پاس آجائیں گے، آنکھوں میں نمی لیے علیزے جو بچپن سے ہی شاستہ بیگم کی ضد اور ان سے واقف تھی اُس نے چھوٹی عمر میں بڑے ہونے کا فرض نبھایا۔

”اُفف تو بہ ہے کہاں سے سیکھی ہیں تم نے یہ اتنی بڑی بڑی باتیں؟ میں نے تو ہمیشہ اگر عابدہ سے نفرت کی، اُس کے عیبوں کو سب کے سامنے اچھالا تو تم لوگوں کو بھی تو یہی کچھ سیکھایا تھانا؟ پھر یہ سب کہاں سے سمجھ لیا تم نے؟“ بیٹی کی باتیں سن جہاں شاستہ بیگم کے دماغ سے جہالت کا پردہ ہٹا وہیں انہوں نے حیرت کا اظہار کرتے سوال کیا۔

”آپ سے ہی سیکھی ہیں بس آپ کو نہیں پتا کہ آپ بے شک اوپر سے سخت ہیں مگر دل کی بہت اچھی ہیں،“ ان کی حیرت پہ مسکراتے علیزے نے اب کی بارا نہیں مکھن لگایا تو شاستہ بیگم نے اُسے اپنے ساتھ لگاتے اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔

-----

ہما کے ساتھ ساتھ حنا اور ماہم بھی شر جیل اور معاذ کو لے کر مار کیٹ کے لیے روانہ ہوئیں تو عابدہ بیگم نے بچوں کی نگرانی اپنے ذمے لیتے نور کو نسرین کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کروانے کا بولا۔ ”افف تھک گئی ہوں میں“، مسلسل دو گھنٹے تک نسرین کے ساتھ لگے رہنے کے بعد نور نے سارا کام ختم ہونے پہ سکھ کا سانس لیا۔

”بی بی جی بس آپ کا کمرہ رہ گیا ہے، آپ بتادیں ابھی صاف کرنا ہے یا کچھ دیر بعد؟“ کلاک پہ دوپہر کے دو بجتے دیکھ نسرین نے چہرے پہ سستی سجائے سوال کیا۔

”نهیں، آپ رہنے دیں جب زارِ ٹھیس گے تو میں خود ہی صاف کر لوں گی بس اب آپ بھی یہ صفائیوں کا کام چھوڑ دیں اور کھانے کی تیاری کریں“، اُسے لاونج میں پڑی چیزوں کو صاف کرتا دیکھ نور نے کچن میں جانے کا کہا۔

”بس جی یہ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے میں یہ ختم کر کے جاتی ہوں“، اُس کی بات سنتے نسرین نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر سے اپنے کام میں لگ گئی تو نور نے وہاں سے اٹھتے عابدہ بیگم کے کمرے کا رخ کیا۔

”یہ سب اتنے آرام سے کیوں بیٹھے ہیں؟“ کمرے کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے بغیر دستک کے اندر قدم رکھتے نور نے حیرت سے بچوں کو دیکھا جو خاموشی سے عابدہ بیگم کے ارد گرد بیٹھے تھے۔

”میں انہیں کہانی سنارہی تھی اسی لیے اتنی تمیز سے بیٹھے ہیں،“ اُس کی حیرت پر مسکراتے عابدہ بیگم نے اُن کی خاموشی کا راز بتایا۔

”اچھا ااتب ہی اتنا سکون ہے،“ خود بھی قدم آگے بڑھاتے اُس نے عابدہ بیگم کے جواب پر مطمئن ہوتے ایک نظر ان معصوم شراری چہروں کو دیکھا جو ہر وقت گھر میں ادھم مچائے رکھتے تھے۔

”وہ ماما میں آپ سے پوچھنے آئی تھی کہ دوپہر کے کھانے میں کیا بنانا ہے؟“ اپنے آنے کا مقصد بتاتے نور نے اُن کے قریب بیٹھتے سوال کیا۔

”کوئی سبزی بنالو بلکہ پرسوں فرنج میں جو مٹر نکال کر رکھے تھے ناسرین سے بولو کے وہ آلو ڈال کر پکالے۔ باقی رات کی بریانی اور گوشت بھی ابھی تک فرنج میں رکھا ہے اگر کسی نے سبزی نہ کھانی ہوئی تو خود ہی وہ کھالے گا،“

اُس کی بات سنتے عابدہ بیگم نے تفصیل سے جواب دیا۔

”اچھا ٹھیک ہے میں بول دیتی ہوں اور اگر آپ تھک گئی ہیں تو آرام کر لیں میں خود ہی بچوں کو سنبحال لوں گی،“ اُن کے صح سے بی پی ہائی ہونے کے پیش نظر نور نے نرمی سے کہا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں اور بچوں کے ساتھ کیا تھا کا وٹ تم جاؤ نسرين کی مدد کر دو اور یہ زارون صح سے سویا ہوا ہے کیا؟“ اس کی ہمدردی پہ عابدہ بیگم نے خلوص سے منع کرتے سوال کیا۔

”پتا نہیں، میں تو صح سے نچے ہی ہوں بس ابھی کچھ دیر میں جا کر دیکھتی ہوں“، ان کی بات سنتے نور نے تسلی دی اور نسرين کو کھانے کا بتانے کے لیے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

-----

”ارحم کہاں جا رہے ہو تم؟“ اسے انگلی میں چابی گھماتے باہر کی جانب بڑھتا دیکھ آئمہ بیگم نے پچھے سے آواز لگائی۔

”زارون کی طرف جا رہا ہوں، کیوں کوئی کام تھا آپ کو؟“ ان کی بات کا جواب دیتے اس نے انہیں کہیں جانے کے لیے تیار دیکھ سوال کیا۔

”ہاں وہ مجھے رابعہ کی طرف جانا ہے، ڈرائیور تو تمہارے ابو کو لے کر گیا ہے تو تم پلیز مجھے اُس کی طرف چھوڑ دو“، اپنے روکنے کا مقصد بتاتے آئمہ بیگم نے درخواست کی۔

”کیوں ان کی طرف کیا کرنے جانا ہے؟ مطلب آپ دونوں کا آج پھر سے شاپنگ کرنے کا ارادہ ہے؟“ رابعہ کے گھر کا سنتے ہی ارحم نے بھنوئیں اچکاتے تحقیق کی۔

”نہیں، شاپنگ کا ارادہ تو نہیں ہے بس ریحانہ کی کل کال آئی تھی کہ کچھ ضروری کام ہے“، اُس کی بات کا جواب دیتے آئمہ بیگم نے اپنا بیگ اٹھانے کے لیے کمرے کا رخ کیا۔

”اُفف ف ان عورتوں کے ضروری کام شادی کے دن تک ختم نہیں ہونے“، ان کے کمرے میں جاتے ہی ارحم نے خود کلامی کی اور انہیں جلدی آنے کا بولتے باہر کی جانب بڑھا۔

-----

نسرين کو سبزی بنانے کا بولتے نور نے زارون کو دیکھنے کے لیے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔

”اُفف یہ زار بھی ناپتا نہیں کیسے اتنی دیر تک سولیتے ہیں“، سیڑھیاں چڑھتے اُس نے خود کلامی کی اور اپنے کمرے کے سامنے رکتے اُس کا دروازہ کھولا۔

”ہونہہ ابھی تک سور ہے ہیں حد ہے یہاں آدھا دن گزر چکا ہے پران کو بس نیند پوری کرنے کی پڑی ہے“، اُسے آڑے تر پچھے انداز میں اونڈھے منہ بیڈ پہ لیٹا دیکھ نور نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے تعجب سے قدم اُس کی جانب بڑھائے۔ ”زار اٹھ جائیں“، اُس کی پشت پہ آتے نور نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے پکارا۔

”زار اٹھ جائیں نا، دیکھیں دوپہر کے تین بجے چکے ہیں“، اُس کے جسم میں کوئی بھی حرکت محسوس نہ کرتے نور نے اُس کے کندھے کو ہلاتے ہوئے وقت بتایا۔

”زار کیا ہوا ہے؟ اٹھ جائیں کیا آج ہی ساری نیند پوری کرنے کا ارادہ ہے؟“، نظر وں میں شرارت لیے اُس نے کہنے کے ساتھ ہی اُس کی پشت سے جھک کر اُس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی تو چادر پہ لگے خون پر نظر پڑتے ہی اُس کے تمام ارداء خاک میں ملے۔

”ز....ا....ر“، نظر وں میں خوف لیے جلدی سے پیچھے ہٹ کر نور نے اُسے سیدھا کیا جو ہوش و حواس سے بیگانہ خون میں لٹ پٹ پڑا اُس کے دل کی دھڑکنوں کو بند کر چکا تھا۔

”ز....ا....ر“ سکتے کی سی کیفیت میں اُس نے زیر لب اپنی زبان کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ ”کیا ہوا ہے آپ کو؟“، اُس کے بے حس و حرکت وجود کو دیکھا اُس نے کاپتے ہوئے ہاتھوں سے اُس کے چہرے کو تھاما۔

”زار پلیز آنکھیں کھولیں؟“، اُس کے ناک اور منہ سے نکلتے خون کو اپنے دوپٹے سے صاف کرتے نور نے بڑی نرمی سے اُسے مخاطب کیا۔

”آپ... نے کہا تھا کہ آپ مجھے چھوڑ کر... کہیں نہیں جائیں گے... آپ نے مجھ سے... وعدہ کیا تھا انکا کہ آپ... ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گے؟ تو اب کیوں ایسے خاموشی سے لیٹے ہیں... پلیز اُٹھیں مجھ سے بات کریں... ز... ا... ر.... پلیز آنکھیں کھولیں“، تکلیف کی شدت سے اُس کے دماغ کے خلیے منتشر ہونے لگے تو اُس نے پوری قوت سے چیختے ہوئے اُس کا نام پکارا۔

”نہیں... آپ کو کچھ نہیں ہو گا۔ میں آپ کو کچھ ہونے ہی نہیں دوں گی“، ہاتھ کی پشت سے آنسوؤں کو رگڑتے اُس نے پاگلوں سی حالت میں پھر سے زیر لب بات کو دھرا یا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مخدود ہونے پر کسی کو پکارنے کی بجائے پھر سے زارون کا نام لیتے زور سے چلائی تو اوپر سے آتی شور کی آواز پر عابدہ بیگم کے ساتھ ساتھ جنید اور مزمول بھی اپنے کمروں سے نکلے۔

”کیا ہوا ہے؟“، ان تینوں نے بیک وقت سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے معاملہ سمجھنے کی کوشش کی اور نور کے چلانے کی آواز سننے جلدی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھے۔

”زارون...“، دروازہ کھلا دیکھ جہاں جنید اور مزمول نے اندر قدم رکھتے زارون کی حالت دیکھ آگے قدم بڑھائے وہیں عابدہ بیگم نے اُس کے چہرے کو خون سے بھرا دیکھ اپنے دونوں ہاتھ منہ پہ رکھتے خود کو چیخنے سے روکا۔

”کیا ہوا ہے میرے بیٹے کو؟ جنید کیا ہوا ہے میرے زارون کو؟“ بھرائی ہوئی آواز میں قدم دروازے کے پاس ہی زمین پہ جمائے عابدہ بیگم نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھا۔

”امی پلیز خود کو سنبھالیں کچھ نہیں ہوابس اُس دن کی طرح بے ہوش ہو گیا ہے“، جنید نے گھبراہٹ کے باوجود بھی ہمت سے کام لیتے پہلے اُس کی نبض پکڑ کر دیکھی اور پھر عابدہ بیگم کے ساتھ ساتھ نور کو بھی حوصلہ دیا جواب پتھر ائی ہوئی نظروں سے ٹکٹکی باندھے زارون کے چہرے کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ ”آپ پلیز نور کو سنبھالیں“، زارون کی دھڑکنوں کی رفتار نارمل حد سے آہستہ پا کر جہاں جنید کے اپنے ہاتھ پاؤں پھولے وہیں اُس نے عابدہ بیگم کو تسلی دیتے نور کو سنبھالنے کا کہا اور مزید وقت ضائع کیے بغیر مزمول کو گاڑی نکالنے کا بولا جو چھوٹے بھائی کی ایسی حالت دیکھ بالکل ساکت سا کھڑا تھا۔

”میں بھی ساتھ جاؤں گی“، مزمول سے کہتے ہی جنید نے زارون کو پیچے لے جانے کے لیے اپنے کندھے پہ اٹھایا تو نور نے ہوش میں آتے مداخلت کی اور اُس کے پیچھے ہی باہر کی جانب بڑھی تو عابدہ بیگم نے اپنی تیز ہوتی دھڑکنوں پہ قابو پاتے آگے بڑھ کر اُسے اپنے حصار میں لیتے نسرین کو پانی لانے کا بولا جو شور کی آوازوں پہ کچن سے نکلتے سیڑھیوں کی جانب بڑھ رہی تھی۔

”ارحم دھیان سے ڈرائیو کرو“، اُس نے دوسری بار ایک گاڑی کے بالکل قریب جاتے بریک لگائی تو آئمہ بیگم نے ڈلش بوڈر پہ ہاتھ رکھتے اپنا بچاؤ کیا۔

”سوری، بس مجھے پتا نہیں چلا“، اپنی پیشانی پہ آئے پسینے کی نشی بوندوں کا صاف کرتے ارحم نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پانے کی کوشش کی۔

”کیا ہوا ہے؟ طبیعت نہیں ٹھیک تو گاڑی کچھ دیر کے لیے سائیڈ پر روک لو“، اُس کے سپید پڑتے رنگ کو دیکھ آئمہ بیگم نے فکر مندی ظاہر کرتے مشورہ دیا۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں بس پتا نہیں ایک دم سے دل کو عجیب سے گھٹن محسوس ہونے لگ گئی تھی“، ڈبے سے ٹشو نکال کر اپنی پیشانی پہ پھیرتے ارحم نے گاڑی کی اسپیڈ آہستہ کی۔

”تب ہی تو کہہ رہی ہوں کہ کچھ دیر کے لیے رک جاتے ہیں بلکہ ایسا کرو کہ یہ مارت آرہا ہے نا یہاں سے پانی یا کوئی جو س وغیرہ لے لو“، اُس کی اڑی ہوئی رنگت کو دیکھ آئمہ بیگم نے چہرے پہ فکر لیے کچھ ہی فاصلے پہ موجود بلڈ نگ کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں، میں ٹھیک ہوں بس آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ بس ایسے ہی شائد گرمی کی وجہ سے دل گھبرا گیا تھا“، اے سی کی اسپیڈ بڑھاتے ارحم نے اُن کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دی تو آئمہ بیگم نے

مزید کچھ کہنے کے بجائے آیت الکریٰ پڑھ کر اس کے اوپر پھونگی اور شام کو ہر حال میں اُسے ڈاکٹر کو چیک کرنے کا ارادہ کرتے سامنے سڑک کی جانب دیکھنے لگیں۔

---

”اُفف یہ میری زندگی کی سب سے پہلی اور آخری غلطی تھی جو میں ان خواتین کے ساتھ شاپنگ کرنے آگیا، ان تینوں کے ساتھ مسلسل ایک دکان سے تقریباً میں پچیس سوٹ دیکھ لینے کے بعد بھی جب ماہم نے ناپسندیدگی ظاہر کی تو دکان دار کے ساتھ ساتھ معاذ کی پیشانی پہ بھی بل پڑے۔ ”ہاں تو تمہیں کس نے بیوقوف نے مشورہ دیا کہ ان لوگوں کو ڈرائیور کے فرائض سرانجام دینے کی پیشکش کرو، ”شر جیل جو خود بھی ان تینوں کی حرکت اور دکان دار کے چہرے کے تاثرات دیکھ کچھ خالق ساتھا معاذ کی بات سننے ایک دم سے بھڑکا جو اپنے ساتھ ساتھ اُسے بھی قربانی کا بکرا بنائے مار کیٹ لے آیا تھا۔

”تو مجھے کیا پتا تھا کہ عورتوں کی شاپنگ اس حد تک خطرناک ہوتی ہے پر! آپ کو تو تجربہ تھانا؟ تو پھر آپ نے مجھے ان سنگین نتیجے سے آگاہ کرتے روکا کیوں نہیں؟“ دکان دار کی کھاجانے والی نظروں کو

---

دیکھ معاذ نے خود کو ہر الزام سے بری کرتے اُسے آڑے ہاتھوں لیا جو اس کی کسی بھی بات کا جواب دینے کی بجائے ماہم کی طرف متوجہ تھا۔

”بس کرو اگر کچھ نہیں پسند آ رہا تو کیا ضرورت ہے اور کپڑے کھلوانے کی؟“، نظر وہ میں واضح تنبیہ لیے شر جیل نے اُسے ایک دو مزید سوٹوں کی طرف اشارہ کرتے دیکھ ٹوکا۔

”ہاں ٹھیک ہے رہنے دیں ہم کسی اور دکان سے دیکھ لیں گے“، اُس کی بات سے متفق ہوتے ماہم نے کہنے کے ساتھ ہی حنا اور ہما کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔

”باجی جب کچھ لینا ہی نہیں تھا تو کیا ضرورت تھی اتنے تھان کھلوانے کی؟“، ماہم کی بات سنتے ہی دکان دار جو کافی دیر سے ضبط کیے کھڑا تھا اپنی زبان کھولتے ان پانچوں پہ برسا۔

”کیا مطلب ہے آپ کا؟ اور یہ آپ کس لمحے میں ہم سے بات کر رہے ہیں؟“، اس سے پہلے کہ معاذ یا شر جیل میں سے کوئی معدرت کرتے اُس کا غصہ ٹھنڈا کرتا ماہم نے جلدی سے پلٹ کر اُسے جواب دیا۔

”اُفف پلیز چپ ہو جاؤ اور شر جیل بھائی آپ انہیں لے کر جائیں میں آتا ہوں“، اس سے پہلے کے دکان دار ماہم کی بات پہ مزید برہم ہوتے اُسے کچھ کہتا معاذ نے درمیان میں مداخلت کرتے

شر جیل کو مخاطب کیا اور خود واپس پہنچتے اُس شخص سے معذرت کرنے کے ساتھ ساتھ کپڑوں کے لگے ڈھیر میں سے پانچ سوٹ پسند کرتے اُنہیں پیک کروانے کا بولا۔

---

اگلے بیس منٹ کے اندر وہ دونوں زارون کو لے کر ہسپتال پہنچے تو ڈاکٹر نے چیک اپ کے ساتھ ہی ایم جنسی کی صورت اُسے فور آئی سی یو میں شفت کروایا۔

”مزمل تم معاذ کو کال کر کے گھر جانے کا بولو، میں جب تک ڈاکٹر سے زارون کی طبیعت کے متعلق جاننے کی کوشش کرتا ہوں“، دس منٹ گزرنے کے بعد بھی جب اندر سے کوئی خبر نہ آئی تو جنید نے چہرے پہ فکر لیے اُسے تاکید کی اور قدم آئی سی یو کی جانب بڑھائے۔

”معاذ کا ریسیو کرو“، جنید کی بات سنتے مزمل نے اپنا موبائل نکالتے اُس کا نمبر ڈائل کیا جو مسلسل بیل جانے کے بعد بھی دوسری طرف سے ریسیونہ ہوا۔

”پتا نہیں کس کنویں میں موبائل رکھا ہوا ہے“، تین سے چار بار کا ملانے کے بعد بھی معاذ سے رابطہ بحال نہ ہوا تو مزمل نے جھنجھلاتے ہوئے شر جیل کا نمبر ڈائل کیا۔

”السلام علیکم“، دوسری بیل پہ ہی دوسری طرف سے آواز ابھری تو مزمل نے سکھ کا سانس لیا۔

---

”شر جیل کہاں ہو تم لوگ اور یہ معاذ کہاں ہے؟ میں کب سے اُس کے موبائل پہ کال کر رہا ہوں“، سلام کا جواب دینے کی بجائے مزمل نے مدعاۓ کی بات پہ آتے سوال کیا۔

”معاذ ہمارے ساتھ ہی ہے پر آپ اتنے گھبراۓ ہوئے کیوں ہیں؟“ اُس کی آواز کی لڑکھڑاہٹ محسوس کرتے شر جیل نے کہنے کے ساتھ ہی ان تینوں خواتین کو وہاں کیفے میں چھوڑ کر باہر کا رخ کیا۔

”ہاں وہ زارون کی طبیعت خراب ہو گئی تھی میں اور جنید اسے ہسپتال لے کر آئے ہیں تم پلیز میری معاذ سے بات کروادو“، اُسے کچھ کہنے کی بجائے مزمل نے زارون کی طبیعت کا بتاتے درخواست کی۔

”ہاں یہ لو بات کرو“، معاذ کو دکان سے باہر آتا دیکھ شر جیل جو اُسی جانب بڑھ رہا تھا مزمل سے کہتے موبائل اُس کی جانب بڑھایا۔

”کون ہے؟“ ہاتھ میں کپڑے شاپر سنبھالتے معاذ نے سوالیہ نظرؤں سے شر جیل کی جانب دیکھا جو مزمل کا بتاتے موبائل اُس کے کان سے لگا گیا۔

”السلام علیکم“، شاپر ایک ہاتھ میں کرتے معاذ نے دوسرے ہاتھ سے موبائل تھاما۔

”معاذ تمہارا موبائل کہاں ہے؟ میں کب سے تمہیں کال کر رہا ہوں؟“ دوسری جانب ایک دم سے زارون کی طبیعت کا بتانے کی بجائے مزمل نے تخلی سے سوال کیا۔

”موبائل گاڑی میں رہ گیا تھا میرا، کیوں کیا ہوا؟ سب خیریت ہے نا؟“ دل میں کسی غیر معمولی خیال کے آتے ہی معاذ نے اُس کی بات کا جواب دیتے سوال کیا۔

”ہاں وہ زارون کی طبیعت خراب ہے میں اور جنید اسے ہسپتال لے کر آئے ہیں...“

”کیا ہوا زارون کو؟ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ زیادہ طبیعت خراب ہے کیا؟“ اُس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی معاذ نے زارون کے نام پر ساکت ہوتے ایک ساتھ کئی سوال پوچھے۔

”ابھی کچھ پتا نہیں ہے، ڈاکٹر نے آئی سی یو میں شفت کر دیا ہے۔ تم بس سارے کام چھوڑ و اور گھر کے لیے نکلو ایم اور نورا کیلی ہیں،“ اُسے تاکید کرتے مزمل نے کال بند کی تو معاذ نے موبائل شر جیل کے حوالے کرتے اُن تینوں کو بلانے کا بولتے اپنارخ باہر کی جانب کیا تاکہ اُن کے آنے تک گاڑی پار کنک سے نکال سکے۔

-----

”نور بیٹا پلیز ہمت کرو اور اللہ سے دعا کرو ان شاء اللہ زارون بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا“، اپنے آنسوؤں پہ بند باندھے عابدہ بیگم نے اُس کی حالت غیر ہوتی دیکھ تسلی دی۔

”اما، پلیز مجھے زار کے پاس لے جائیں مجھے اُن کے ساتھ رہنا ہے“، ہچکیوں کے درمیان اُس نے اُن کی نصیحت پہ عمل کرنے کی بجائے اپنی بات دھرائی۔

”ٹھیک ہے تم یہ پانی پیو پھر میں معاز کو کال کرتی ہوں وہ تمہیں ہسپتال لے جائے گا“، ٹبل سے گلاس اٹھاتے عابدہ بیگم نے زبردستی اُس کے لبوں سے لگایا۔

”مجھے کچھ نہیں پینا مجھے بس زار کے پاس جانا ہے۔ اُنہیں دیکھنا ہے“، حواس باختہ سی حالت میں اُن کا ہاتھ پیچھے کرتے نور نے اپنی بات پہ زور دیا تو عابدہ بیگم کے آنسو بھی آنکھوں سے باہر نکلے۔

”زارون...“ اُسے سنبھالتے سنبھالتے خود کب سے اپنے جگر کے ٹکڑے کی حالت پہ صبر کیے بیٹھی عابدہ بیگم کا ضبط ٹوٹا تو وہ ایک دم سے اُس کا نام پکارتے پیچھے صوفے پہ ڈھے سی گئیں۔

”اما پلیز آنکھیں کھولیں“، اُن کے ہاتھ میں پکڑا گلاس نیچے زمین پہ گرتے کر پھی کر پھی ہوا تو نور نے ہوش میں آتے اُنہیں سہارا دیا۔

”کیا ہوا ہے آپ کو؟ پلیز کوئی پانی لائے“، اُن کے گال پہ ہاتھ رکھتے اُس نے نئی افتاد پہ بوکھلاتے ہوئے کسی کو مدد کے لیے پکارا۔

”بی بی جی کیا ہوا ہے بڑی بی بی کو؟“، نسرین جو عابدہ بیگم کے کہنے پہ ہی پھوں کے ساتھ کمرے میں موجود تھی نور کی آواز پہ جلدی سے باہر آئی۔

”پانی لائیں، پلیز جلدی کریں“، زارون کے بعد اب عابدہ بیگم کو بھی یوں بد حواس دیکھ اُس کی زبان اڑ کھڑائی۔

”ماما پلیز آنکھیں کھولیں“، انہیں یوں نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھ نور نے ایک بار پھر سے انہیں پکارا اور نسرین کے پانی لاتے ہی چند چھینٹے اُن کے چہرے پہ مارے۔

”ماما پلیز آنکھیں کھولیں“، گھبراہٹ کے مارے کا نیت ہوئے ہاتھوں سے گلاس واپس ٹیبل پہ رکھتے اُس کی ہمت جواب دینے لگی تو نسرین نے آگے بڑھتے عابدہ بیگم کی ناک دبائی تاکہ انہیں ہوش میں لاسکے۔

”بی بی جی آنکھیں کھولیں“، ناک دبانے سے بھی کوئی خاطر خواہ فائدہ ہوتا نہ دیکھ نسرین نے اُن کے ہاتھوں کو رگڑا اور باہر گاڑی کا ہارن سنتے جلدی سے اٹھ کر بیرونی دروازے کی جانب بڑھی۔

”صاحب جی شکر ہے آپ گھر آگئے“، احمد صاحب (جو ایک میٹنگ کے سلسلے میں آفس گئے تھے مگر طبیعت میں بے چینی محسوس کرتے اسٹاف کے لوگوں کو کل کا وقت دیتے آرام کی نیت سے گھر واپس آگئے) کو گاڑی سے نکلتا دیکھ اُس نے اپنار کا ہوا سانس بحال کیا۔

”کیوں کیا ہوا ہے؟ اور یہ تم اتنا بوكھلائی ہوئی کیوں ہو؟“ اس کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگوں کو دیکھ احمد صاحب جو پہلے ہی پریشان تھے گاڑی کا دروازہ بند کرتے اُس کی جانب متوجہ ہوئے۔

”وہ صاحب جی، بڑی بی بی جی بے ہوش ہو گئیں ہیں“، اندر کی جانب اشارہ کرتے نسرين نے آگے کچھ بولنا چاہا مگر اُس کی بات سنے بغیر ہی احمد صاحب نے تیزی کے ساتھ اندر ونی حصے کی جانب قدم بڑھائے۔

”باباد یکھیں ماما کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے“، وہ لاٹنچ میں داخل ہوئے تو نور نے اپنی جگہ سے اٹھتے انہیں عابدہ بیگم کی جانب متوجہ کروایا جو صوفے پہ بے سدھ پڑی تھیں۔

”عابدہ آنکھیں کھولو“، اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے آگے بڑھتے ٹیبل پہ پڑے گلاس میں سے پانی کے کچھ چھینٹے اُن کے چہرے پہ مارتے احمد صاحب نے انہیں پکارا اور وقت ضائع کیے بغیر اپنی جیب سے موبائل نکالتے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کرنے لگے۔

-----

”سر کیسی طبیعت ہے میرے بھائی کی؟“، چالیس منٹ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد ایک ڈاکٹر آئی سی یو سے باہر آیا تو جنید نے جلدی سے آگے بڑھتے اُس سے زارون کے متعلق استفسار کیا۔

”بھائی؟ آپ اُس پیشنسٹ کے ساتھ ہیں جن کو بلڈ نگ ہو رہی تھی؟“ تصدیق کے لیے ڈاکٹرنے نام کی بجائے بیماری کا حوالہ دیا۔

”جی جی ہم اُسی کے ساتھ ہیں، کیسی طبیعت ہے اب اُن کی؟“ گھبرائے ہوئے لمحے میں سرخ آنکھوں کے ساتھ جنید نے اثبات میں سر ہلاتے پھر سے اپنے سوال کو دہرا ایا۔

”طبیعت کے بارے میں ابھی تو کچھ کہا نہیں جا سکتا البتہ ہم نے کچھ ضروری ٹرینمنٹ دے دیا ہے جس سے امید ہے کہ انہیں کچھ دیر میں ہوش آجائے گا“، جنید کی گھبراہٹ دیکھ ڈاکٹرنے بتانے کے ساتھ ہی اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے حوصلہ دیا۔

”کیا مطلب طبیعت کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا؟“ ڈاکٹر کی بات کو دہراتے مزمل جوتب سے خاموش کھڑا تھا سوالیہ نظر وہ سے انہیں دیکھتے پوچھنے لگا۔

”مطلوب یہ کہ ایسے ناک اور منہ سے بروقت خون آنا کسی بڑی بیماری کی علامت ہے، کیا پہلے بھی کبھی ان کے ساتھ ایسا ہوا ہے؟“ اپنا ہاتھ ہٹاتے ڈاکٹرنے اپنا خدشہ ظاہر کرتے سوال کیا۔

”جی پہلے بھی ایک بار ایسا ہو چکا ہے، ہم نے ٹیسٹ وغیرہ کروائے تو معدے میں السر کا پتہ چلا“، ڈاکٹر کے لحصن کو دور کرتے جنید نے انہیں زارون کی میڈیکل ہسپتاری کے متعلق چند اہم باتوں سے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں سمجھ گیا ہوں اور ابھی تو ہم لوگوں نے ایک عام پیشہ کی طرح انہیں کچھ ضروری علاج مہیا کر دیا ہے مگر ان کے لیے بہتر یہی ہو گا کہ آپ انہیں کسی اچھے کینسر ہسپتال میں منتقل کر دیں کیوں کہ جس طرح کی حالت میں آپ لوگ انہیں یہاں لائے تھے ہو سکتا ہے مناسب علاج نہ ملنے پہ اگلے چند گھنٹوں میں پھر سے وہی اثرات ان کی طبیعت پہ ظاہر ہونے لگیں“، جنید کی زبانی تمام بات سننے کے بعد ڈاکٹر نے اپنے تجربے کی بناء پہ انہیں مشورہ دیا۔

”ٹھیک ہے، آپ بتا دیں زارون کو کب تک ہوش آجائے گا پھر اب اُس حساب نے اسے یہاں سے لے جائیں گے“، ڈاکٹر کی بات پہ گھبرا نے کی بجائے جنید نے ہمت رکھتے ایک اور سوال پوچھا۔

”ہوش آبھی گیا تب بھی ان کی ایسی حالت نہیں ہے کہ آپ انہیں کسی عام گاڑی میں دوسرے ہسپتال لے جائیں، ان کا بی پی خطرناک حد تک لو تھا جس کی وجہ سے ان کے دل کی دھڑکن اپنی مقررہ رفتار سے بیس فیصد کم ہو گئی ہے اور اسی وجہ سے انہیں سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے تو مناسب یہی ہے کہ ہوش آنے کی صورت میں بھی آپ انہیں آسیجن کے ساتھ ہی کہیں دوسری جگہ منتقل کریں“، زارون کی حالت کے متعلق تفصیل سے اُن دونوں کو اگاہ کرتے ڈاکٹر نے انہیں تاکید کی اور ابھی کچھ دیر انتظار کا بولتے اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔

”جنید اب کیا ہو گا؟“ مزمل جوزارون کے معاملے میں پہلے ہی کافی حساس تھاڈاً کٹر کی باتیں سننے کے بعد پریشان سی نظر وہیں سے اُسے دیکھنے لگا۔

”اللہ سب بہتر کرے گا بس تم دعا کرو اور یہاں زارون کے پاس رہو میں ایمبو لینس کا انتظام کر کے آتا ہوں“، اپنے آپ پہ ضبط کرتے جنید نے اُسے تسلی دی اور باہر کی جانب جانے کے لیے پلتے اپنے آنسو صاف کیے جو بے اختیار ہی اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

-----

معاذ کی گاڑی گیٹ کے سامنے رکی توار حم (جو آئندہ بیگم کو رابعہ کی طرف چھوڑنے کے بعد وہاں رکنے کی بجائے سیدھا زارون کی طرف آگیا تھا) نے بھی اُس کے مقابل آتے بریک پہ پیر رکھا۔ ”شر جیل بھائی آپ ان سب کو لے کر گھر جائیں میں اب ہسپتال جاؤں گا“، ایک نظر احمد پہ ڈالتے معاذ نے اپنے ساتھ بیٹھتے شر جیل کو مخاطب کیا۔ ”نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی“، ماہم جوزارون کی طبیعت خرابی کا سن کر پورے راستے روئے ہوئے آئی تھی معاذ کے ہسپتال جانے کا سنتے نفی میں سر ہلا گئی۔

”ہم لوگ بعد میں چلے جائیں گے، ابھی آئی اور نور کو تمہاری ضرورت ہے“، اس سے پہلے کے معاذ اُسے منع کرتا شر جیل نے مناسب الفاظ میں سمجھاتے سب کو اترنے کا کہا۔

”معاذ تم پلیز وہاں پہنچتے ہی ہمیں زارون کی طبیعت کے بارے میں بتانا“، ہما جو کافی بار مزمول کے نمبر پہ کال کر چکی تھی اُس نے دوسری طرف سے کوئی جواب نہ ملنے پہ اُسے تاکید کی۔

”جی میں بتادوں گابس آپ لوگ امی کا خیال رکھیے گا“، اثبات میں سر ہلاتے معاذ نے عابدہ بیگم کی فکر کرتے انہیں نصیحت کی جو اُسے گھر کی طرف سے تسلی رکھنے کا بولتے گاڑی سے نکل کر گیٹ کی جانب بڑھا تو ارحمنے گاڑی وہیں ایک سائیڈ پہ لگاتے اپنا مو باکل لیتے اُس کی جانب قدم بڑھائے۔

”السلام علیکم“، اس سے پہلے کے معاذ گاڑی ریورس کرتا ارحمنے اُس کے قریب جھکتے اُسے مخاطب کیا۔

”وعلیکم السلام، کیسے ہو؟“ اُس کے سلام کا جواب دیتے معاذ نے مرد تاؤس کا حال پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں، زارون گھر ہی ہے کیا؟ وہ میں کافی دیر سے اُس کے نمبر پہ کال کر رہا تھا مگر اُس نے رسیو نہیں کی“، مدعا کی بات پہ آتے ارحمنے اُسے روکنے کا مقصد بیان کیا۔

”ہاں وہ زارون کی طبیعت خراب ہے جنید اور مزمل بھائی اُسے ہسپتال لے کر گئے ہیں۔ میں بھی اُسی کے پاس جا رہا ہوں“، اپنی پریشانی پہ قابو پاتے معاذ نے اُسے اطلاع دی۔

”کیا مطلب طبیعت خراب ہے؟ کیا ہوا ہے زارون کو؟ اور کسی نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“، معاذ کی بات سنتے ارجمند کے تاثرات ایک دم سے سنبھیڈھ ہوئے۔

”مجھے خود ابھی کچھ دیر پہلے پتا چلا ہے ہم لوگ تو مار کیٹ گئے تھے وہیں جنید بھائی کی کال آئی“، اُس کی پریشانی دیکھ دیکھنے والے تمام صورت حال سے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے میں بھی ساتھ چلوں گا اور ہسپتال کیوں لے کر گئے ہیں؟ زیادہ طبیعت خراب ہے کیا؟“، کہنے کے ساتھ ہی ارجمند نے جلدی سے دوسری طرف سے آتے معاذ کے برابر ہی سیٹ سنبھالی۔

”پتا نہیں جنید بھائی کال رسیو نہیں کر رہے“، اُس کی بات پہ لامعی کا اظہار کرتے معاذ نے گاڑی سٹارٹ کرتے سڑک پہ ڈالی اور اپنا موبائل اٹھاتے ایک بار پھر سے جنید کا نمبر ڈائل کیا۔

”یہ باقی سب کہاں ہیں؟ اور عابدہ کابی پی ایک دم سے اتنا ہائی کیسے ہو گیا؟“ ڈاکٹر انہیں سکون آوار انجکشن لگا کر آرام کرنے کا مشورہ دیتے واپس گئے تو احمد صاحب نے گھر میں باقی سب کی غیر موجودگی محسوس کرتے نور سے سوال کیا۔

”صاحب جی وہ زارون صاحب کی طبیعت اچانک سے خراب ہو گئی تھی، جنید اور مزم مل بھائی انہیں ہسپتال لے کر گئے ہیں اور اسی وجہ سے بی بی جی کابی پی اتنا ہائی ہوا ہے“، نور کو ساکت بیٹھاد کیجھ نسرین نے ہمت کرتے احمد صاحب کو اصل وجہ سے آگاہ کیا۔

”ہسپتال؟ کیا ہوا ہے زارون کو؟ اور مجھے اتنی دیر ہو گئی ہے گھر آئے تم لوگوں نے پہلے مجھے کیوں نہیں بتایا؟“، زارون کے نام پہ ایک دم سے کرسی سے اٹھتے احمد صاحب نے فکر ظاہر کی تو نسرین نے شرمندگی سے سر جھکایا جبکہ زارون کا نام سنتے ہی نور کی آنکھوں میں لرزش پیدا ہوئی۔

”زار... ہاں مجھے زار کے پاس جانا ہے۔ بابا پلیز مجھے زار کے پاس لے چلیں“، پلکیں جھپکاتے اُس نے کچھ یاد آنے پہ احمد صاحب کو مخاطب کیا جو کب سے اُسے خاموش دیکھیا یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ عابدہ بیگم کی وجہ سے پریشان ہے۔

”بابا پلیز مجھے لے جائیں“، بیڈ سے اٹھتے احمد صاحب کے سامنے آتے اُس نے نم آنکھوں سے اُن کی منت کی جو اُس کی حالت دیکھ زارون کی طبیعت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے تھے۔

”ہاں بیٹا چلتے ہیں تم پر بیشان نہ ہو سب ٹھیک ہو گا“، اُس کے سرپہ ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے سائیڈ ٹبل سے اپنا موبائل اٹھاتے مزمل کا نمبر ڈائل کیا۔ ”مزمل کہاں ہو تم لوگ؟ اور کس ہسپتال میں لے کر گئے ہو زارون کو؟“ باہر سے آنے والے شورپہ نسرین کو کمرے سے جاتا دیکھ احمد صاحب نے دوسری طرف کا لریسیو ہونے پہ سلام و دعا کے بغیر ہی سوال کیا۔

”کیا مطلب دوسرے ہسپتال لے جا رہے؟ دماغ ٹھیک ہے تم لوگوں کا؟ کیا مسئلہ ہے بتاؤ مجھے؟“ مقابل کی بات سنتے احمد صاحب کی زبان کے ساتھ ہی اُن کے قدم ڈگمگائے تو انہوں نے نور کو اپنی جانب متوجہ دیکھ وہاں رکنے کی بجائے باہر کارخ کیا تاکہ تسلی سے مزمل سے ساری تفصیل پوچھ سکیں۔

ارحم و معاذ ہسپتال پہنچ تو جنید انہیں سامنے ہی کاریڈور میں کھڑا نظر آیا۔

”بھائی کیسی طبیعت ہے اب زارون کی؟“ جلدی سے قدم آگے بڑھاتے معاذ نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا تو ارحם بھی سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔

”طبعت ٹھیک نہیں ہے زارون کی، پہلے تو ڈاکٹر ز تسلی دے رہے تھے کہ کچھ دیر میں ہوش آجائے گا پر اب حالت میں کوئی بہتری نہ دیکھ کے جواب دے دیا ہے۔ بس تم لوگ ایمبو لینس کے ساتھ لے جانے کے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کرو ہمیں جلد از جلد اسے دوسرے ہسپتال منتقل کرنا ہے“، ہوش و حواس قائم رکھتے جنید جو پہلے ہی کسی کی مدد چاہتا تھا معاذ اور ارحام کو اپنے سامنے پا کر شکر ادا کرتے کہنے لگا۔

”کیا مطلب جواب دے دیا ہے؟ میں خود بات کرتا ہوں ڈاکٹر سے“، جنید کی پوری بات سننے ہی ارحام نے بھڑکتے ہوئے پلٹنا چاہا۔

”ارحام پلیز یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ زارون کا علاج اس عام سے ہسپتال میں ممکن نہیں بس میں نے تم لوگوں سے جو کہا ہے وہ کرو“، اس سے پہلے کہ ارحام کسی ڈاکٹر کو جا کر گریبان سے پکڑتا جنید نے مداخلت کرتے اُسے ایسا کرنے سے روکا۔

”میں ابھی کسی ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں“، اُسے تسلی دیتے معاذ نے تحمل سے کام لیتے کاریڈور سے نکلتے نیچے کارخ کیا تو جنید نے ارحام کو حوصلہ دیا جو ایک دم سے گھبراتے اُس کے لگ لگ چکا تھا۔

”بابا کیا کہہ رہے تھے بھائی؟ کیسی طبیعت ہے اب زار کی؟“، کچھ دیر تک کمرے میں اُن کی واپسی کا انتظار کرنے کے بعد نور نے بے چینی سے باہر آتے احمد صاحب کو سامنے ہی شر جیل سے بات کرتا دیکھ اپنے قدم اُن کی جانب بڑھائے۔

”ہاں ٹھیک ہے اب زارون، تم فکرناہ کرو“، اُس کے سر پر ہاتھ رکھتے احمد صاحب نے حقیقت بتا کر اُسے مزید پریشان کرنے کی بجائے تسلی دی۔

”تو پھر وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں آئے؟ بابا پلیز آپ مجھے ہسپتال لے جائیں“، اُن کی بات پر مطمئن ہونے کی بجائے نور نے امید بھری نظروں سے اُن کی جانب دیکھا۔

”بیٹا پلیز حوصلہ رکھو، جنید لوگ کچھ دیر میں زارون کو گھر لے آئیں گے“، اُس کی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھرتا دیکھ احمد صاحب نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی تو نور نے اثبات میں سر ہلاتے وہاں رکنے کی بجائے سیڑھیاں چڑھتے اپنے کمرے کا رخ کیا۔

”انکل پھر آپ بھی اب ہسپتال جائیں گے؟“، نور کے جاتے ہی شر جیل نے بات کا سلسلہ وہیں سے جوڑا۔

”ہاں میں بھی جا رہا ہوں تم بس سب کا خیال رکھنا اور عابدہ کو ہوش آئے تو اسے بھی تسلی دے دینا کہ زارون اب ٹھیک ہے“، مزمول سے بات کرنے کے بعد احمد صاحب جو کافی پریشان تھے انہوں نے گھر کی ساری ذمے داری شر جیل کے سپرد کی۔

”جی بس آپ آنٹی کی فکر نہ کریں انہوں میں سنبھال لوں گا اور پلیز آپ بھی حوصلہ رکھیں ان شاء اللہ زارون بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا“، ان کے جسم میں پیدا ہوتی لرزش کو دیکھ شر جیل نے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے تسلی دی۔

”ہاں بس دعا کرنا“، اپنے موبائل پہ آنے والی میخبر کی کال کو کاٹتے احمد صاحب نے کمرے کی جانب قدم بڑھائے تاکہ اپنا والٹ لے کر ہسپتال کے لیے روانہ ہو سکیں۔

-----  
کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس نے خالی نظروں سے وہاں پڑی چیزوں کو دیکھا جو اپنے مکینوں کے دل میں اُترتی ادا سی کے ساتھ ہی ویران ہو چکی تھیں۔

”مجھے پتا ہے بابا نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے“، بیڈ کی طرف قدم بڑھاتے نور نے چادر پہ لگے خون کو نم آنکھوں سے دیکھتے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”کیوں کہ اگر آپ ٹھیک ہوتے تو میرا دل یوں بے چین نہ ہوتا، میرے دماغ کی نسیں یوں منتشر ہوتے مجھے خوف زدہ نہ کرتیں“، نیچے زمین پہ بیٹھتے اُس نے ساکنِ نظروں سے اپنے ہاتھوں کی لکریوں کو بغور دیکھا۔

”کیا میری قسمت اتنی بری تھی؟ کیا میرے اعمال میں کوئی نیکی شامل نہیں تھی؟ یا اللہ کیا ساری آزمائشیں میرے لیے ہی رکھی ہیں؟ مجھ سے ایسی کون سے خطاء ہو گئی ہے جو آپ اس طرح مجھے بار بار سزادیتے ہیں۔ جانتی ہوں میں بہت گناہ گار ہوں پر کیا میں آپ کے لیے اتنی ناپسندیدہ ہوں جو آپ یوں مجھ سے میری ہر خوشی چھین لیتے ہیں؟“ ٹوٹے ہوئے لہجے میں خدا سے شکوہ کرتے اُس کا ضبط ٹوٹا تو اُس نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھتے رونا شروع کر دیا۔

”ما کہتی ہیں کہ آپ ستر ماوں سے زیادہ اپنے بندے سے پیار کرتے ہیں، آپ انسان کو کبھی بھی اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے تو!“ بس میری طاقت اب ختم ہو چکی ہے مجھ میں اتنی سکت نہیں ہے کہ میں مزید کوئی دکھ برداشت کر سکوں“، ہاتھ کی پشت سے اپنے آنسو صاف کرتے اُس نے بے بسی سے اپنے رب کو اپنا حال سنایا۔

”یا اللہ پاک میں اس بار آپ کی آزمائش پہ پورا نہیں اُتر سکوں گی۔ مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ میں اُس شخص کو کھو سکوں جو میری زندگی کی وجہ ہے، میں زار کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔ زندگی میں

جتنے بھی امتحان آئے میں نے آپ سے کوئی شکوہ نہیں کیا، کبھی شکایت نہیں کی اور اس بار بھی میں شکایت نہیں کر رہی بس دعا کر رہی ہوں کہ مجھے اپنی بے پناہ رحمت میں سے کچھ ذرے رحم کے عطا فرماء، میرے شوہر کو زندگی دے، مجھے نامیدی کے اندر ہیروں میں گھرنے سے بچا لے، دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھاتے اُس نے اپنے خالق سے التجاء کی اور وہیں سجدے میں گرتے زار و قطار رونے لگی۔

-----

کچھ دیر میں زارون کو ایمبولینس کے ذریعے دوسرے ہسپتال منتقل کیا گیا تو احمد صاحب بھی وہاں پہنچے۔

”ارحم پلیز حوصلہ کرو“، وہ جو زارون کی حالت دیکھ بالکل خاموش بیٹھا تھا معاف نے اُس کے قریب آتے تسلی دی۔

”میرے حوصلے اُس اندر لیئے شخص کے ساتھ جڑے ہیں معاز پلیز تم زارون کو بولو کہ وہ ٹھیک ہو جائے“، اُس کا ہاتھ کپڑتے ارحم نے نم آنکھوں سے التجاء کی۔

”ٹھیک ہو جائے گا پلیز تم تسلی رکھو اور دعا کرو“، اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے معاذ جس کا اپنادل کسی خطرے کے سبب تیز تیز دھڑک رہا تھا اُس نے ارحم کے زرد پڑتے رنگ کو دیکھتے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”میرا دل صبح سے پریشان تھا پر کیوں تھا؟ اس کی سمجھ نہیں آرہی تھی، میں دن میں اتنی بار زارون کا کال کرتا ہوں مگر کل سے میں نے کوئی کال نہیں کی۔ میں کیسے اپنے یار سے یوں بے خبر ہو گیا؟ مجھے کیسے اُس کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوا؟ میں کیوں نہیں سمجھ پایا کہ میری بے چینی بے سبب نہیں ہے“، ضبط سے سرخ ہوتی آنکھوں سے آئی سی یو کے دروازے کو دیکھتے ارحم نے اپنی بے خبری پہ خود کو کوسا تو معاذ کی آنکھیں بھی نم ہونے لگیں۔

”ٹھیک ہو جائے گا زارون، تم جیسے بد تمیز انسان کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاتا وہ“، اُسے یوں بکھرا ہوا دیکھے معاذ نے نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اپنے ساتھ ساتھ اُس کا بھی دل بڑا کرنے کی کوشش کی جواب دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھے رونے لگا تھا۔

”شر جیل پلیز آپ کسی کو کال کر کے زارون کی خیریت معلوم کریں“، مسلسل تین گھنٹے گزرنے کے بعد بھی ہسپتال سے کوئی خبر نہ آئی تو ماہم نے عابدہ بیگم کے کمرے سے باہر آتے شر جیل کو مخاطب کیا جو بچوں کے ساتھ لاونچ میں موجود تھا۔

”ہاں میری کچھ دیر پہلے جنید بھائی سے بات ہوئی ہے، کہہ رہے تھے کہ زارون کی طبیعت اب بہتر ہے پر کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹرا بھی کچھ وقت کے لیے اُسے ہسپتال میں ہی رکھیں گے“، اُس کی سو جھی ہوئی سرخ آنکھوں کو دیکھ شر جیل نے حقیقت بتانے کی بجائے جھوٹ بولا۔

”کیسی کمزوری؟ اور کتنی دیر ہسپتال میں رکھیں گے؟ شر جیل پلیز آپ مجھے سچ سچ بتائیں کہ کیا بات ہے؟“ اُس کے لمحے کی لڑکھڑاہٹ محسوس کرتے ماہم نے نظروں میں الجھن لیے ایک بار پھر سے سوال کیا۔

”یار میں کیوں تم سے جھوٹ بولوں گا؟ بس تم دعا کرو کہ اللہ پاک زارون کو جلد از جلد مکمل صحت یاب کر دے تاکہ وہ پہلے کی طرح ہنستے مسکراتے ہوئے ہم سب کے ساتھ موجود ہو“، اُس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے شر جیل نے نرمی کے ساتھ اُسے دعا کرنے کا بولا۔

”مطلوب زارون ٹھیک نہیں ہے؟“ اس کی بات سنتے ہی ماہم نے تلخ لمحے میں کہتے اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”ابھی تک آئی سی یو میں ہے“، ایک گھری سانس لیتے شر جیل نے بو جھل ہوتے دل کے ساتھ اُس کے اندازے کی تصدیق کی۔

”دیکھو ماہم اس وقت تمہیں بہت صبر سے کام لینا پڑے گا، میں نے تمہیں زارون کی حالت متعلق اس لیے آگاہ کیا ہے تاکہ تم خود کو مضبوط کرتے آئٹی اور نور کو سنبھال سکو“، اُسے ایک دم سے اپنا ہاتھ کھینچنے دیکھ شر جیل نے واپس اُس کے ہاتھ کو تھاما۔

”زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے بس تم دعا کرو اللہ پاک سب ٹھیک کر دے گا“، اُس کی آنکھوں سے نکلتے آنسوؤں کو اپنی پوروں میں جذب کرتے شر جیل نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی جو زارون کے آئی سی یو میں ہونے کا سن کر ہی ہمت ہار چکی تھی۔

”پتا نہیں کس بد بخت کی نظر لگ گئی ہے میرے بھائی کو، کتنا خوش تھا وہ اپنی زندگی میں“، گلے میں اٹکلتے آنسوؤں کو اندر جذب کرتے ماہم نے بمشکل اپنی بات مکمل کی۔

”اب بھی وہ خوش ہی رہے گا بس تم اللہ کے گھر سے اچھے کی امید رکھو اور جاؤ نور کو دیکھو وہ کب سے اپنے کمرے میں بند ہے“، اُس کے آنسو صاف کرتے شر جیل نے فکر مندی کے ساتھ اُس کا دھیان بٹایا۔

"میں دیکھتی ہوں آپ پلیز ایک بار پھر سے کال کر کے زارون کی طبیعت کا پوچھیں،" عابدہ بیگم کی حالت اور گھر میں چھائی افسردگی کے سبب ماہم نے اُسے تاکید کی اور نور کو دیکھنے کے لیے اوپر کمرے کا رخ کیا۔

---

"سر پلیز آپ ہمیں ہمارے بھائی کی طبیعت کے متعلق کچھ بتائیں گے یا پھر ہم اپنے پیشنش کے لیے کسی اور ہسپتال کا انتظام کریں،" ایک گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد دو ڈاکٹر اکٹھے آئی سی یو سے باہر آئے تو جنید نے آگے بڑھتے اپنے غصے کا اظہار کیا۔

"بیٹا پلیز صبر سے کام لیں، ایک تو آپ پہلے ہی پیشنش کو غلط ٹرینمنٹ دلواچکے ہیں اور سے اپنا قصور ماننے کی بجائے آپ الٹا ہم پہ بر سر ہے ہیں،" جنید کو غصے میں دیکھ ڈاکٹر جو پہلے ہی کافی بر ہم تھا اُس نے کسی بھی لحاظ کے بغیر اسے کھری کھری سنائی۔

"کیا مطلب غلط ٹرینمنٹ؟ ہم تو پہلے بھی پیشنش کو ہسپتال ہی لے کر گئے تھے،" جنید کے کندھے پہ ہاتھ کا دباؤ ڈالتے مزمل نے اُسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ڈاکٹر کی بات پہ حیرت کا اظہار کیا۔

”مطلوب یہ کہ خون روکنے کے لیے جو ادویات استعمال ہوئیں وہ ایک کینسر پیشٹ کے لیے بالکل بھی موثر نہیں تھیں اور آپ لوگوں کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ ایک کینسر پیشٹ کو کسی بھی ڈاکٹر کے پاس لے جا کر اس کا اعلان شروع کروادیں“، زارون کی حالت دیکھ ڈاکٹرنے اپنے تجربے کی بناء پر ہر کوشش کرنے کے بعد بھی اس کی طبیعت میں کوئی سدھارناہ دیکھا اُن سب کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔

”سر پلیز، ہمیں اس بارے میں اندازہ ہوا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا تو ہم زارون کو کبھی کسی اور ڈاکٹر کے پاس لے کر نہ جاتے اور پریشانی میں انسان کو سمجھ کہاں آتی ہے کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں اس لیے پلیز آپ ایسی باتیں کر کے ہمیں مزید پریشان نہ کریں اور پیشٹ کی طبیعت کے بارے میں بتائیں، کیا کچھ بہتری آئی ہے؟“ اس سے پہلے کے جنید ڈاکٹر کی بد لحاظی پہ اُسے کچھ کہتا معاذ نے درمیان میں آتے مداخلت کی۔

”بہتری کا فیصلہ میریض کو ہوش آنے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے البتہ ہم نے اپنی طرف سے انہیں کچھ ضروری ٹریٹمنٹ دے دیے ہیں امید ہے کہ کچھ دیر میں ہوش آجائے گا“، معاذ کی بات پہ ٹھنڈے پڑتے ڈاکٹر نے انہیں زارون کی حالت کے متعلق سچا ہی دی اور اپنے ساتھ کھڑے دوسرے ڈاکٹر کو اشارے کرتے اپنے کمرے میں آنے کا بولا۔

”نور یہاں نیچے کیوں بیٹھی ہو؟“، کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسے سامنے زمین پہ بیٹھا دیکھ ماہم نے اُس کی جانب قدم بڑھائے۔

”نور میری جان پلیز ہمت کرو، تم ایسے حوصلہ ہارو گی تو زارون کو کون سنجا لے گا؟“، اُس کے پاس ہی زمین پہ بیٹھتے ماہم نے اُسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”زار کہاں ہیں؟ وہ گھر آگئے ہیں کیا؟“، اُس کی بات سنتے نور کی زبان نے فوراً ہی حرکت کی۔

”نهیں، ابھی آیا نہیں ہے پر کچھ دیر میں آجائے گا“، اُس کی آنکھوں کے گرد پڑے حلقوں کو دیکھ ماہم نے اُس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرا۔

”مجھے پتا ہے آپ سب لوگ مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں، آپ چاہتے ہیں میں پریشان نہ ہوں اسی لیے مجھے تسلی دے رہے ہیں“، اُس کی آنکھوں میں جھانکتے نور نے جس اعتماد کے ساتھ اپنی بات کہی کچھ سیکنڈز کے لیے ماہم بھی گڑ بڑا سی گئی۔

”نه... ہیں میری جان ایسی بات نہیں ہے، ابھی جنید بھائی کی کال آئی تھی بتار ہے تھے زارون کی طبیعت اب بہتر ہے“، اُس کی حالت دیکھ ماہم نے اپنی زبان کی لڑکھڑاہٹ پہ قابو پاتے تھوک نگلا۔

”آپ کو پتا ہے آپی؟“ اُس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے سے ہٹاتے نور نے طنزیہ انداز میں مسکراتے سوالیہ نظروں سے اُس کی جانب دیکھا۔

”کیا؟“ اُس کے چہرے پہ اترتی و حشمت کو دیکھ کچھ پل کے لیے ماہم کے الفاظ اُس کے گلے میں اٹکے۔

”یہی کہ زار ٹھیک ہوتے تو میرا دل یوں بے جان نہ ہوتا، میری دھڑکنیں یوں رک رک کرنا چلتیں، اس لیے پلیز آپ مجھ سے جھوٹ نہ بولیں“، آنسو آنکھوں کے بند توڑتے اُس کے رخساروں میں بہہ نکلے تو نور نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے التجاء کی۔

”جب جانتی ہو تو دعا کرو اس سے تمہارے یوں پریشان ہونے یارو نے کی نہیں بلکہ دعاوں کی ضرورت ہے“، اُس کا ہاتھ پکڑتے ماہم نے مزید کوئی جھوٹ بول کر اُس کا دل رکھنے کی بجائے حقیقت بیان کی اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ ”میں کیسے دعا کروں؟ میری دعاوں میں تو اثر

ختم ہو گیا ہے، میری انجامیں شاید اب آسمان تک نہیں پہنچتیں،“، ماہم کے جاتے ہی نور نے تنخ  
مسکراہٹ چہرے پہ سجائتے اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں میں جکڑا۔

”میری ہر فریاد بے سود ہے میرے الفاظ اس قابل نہیں ہیں کہ وہ کسی کی زندگی کی بھیگ مانگ  
سکیں اگر میری پکار میں طاقت ہوتی تو آج بھی بھی زار اس حالت میں نہ ہوتے۔ میں نے توہر  
سانس کے ساتھ ان کی صحت مانگی تھی تو پھر کیوں مجھے اس امتحان میں ڈالا گیا؟“، منہ میں بڑھاتے  
اُس نے اذیت کے باعث پاگلوں کی سی حالت میں اپنے بالوں کو زور سے اپنی مٹھیوں میں دبایا۔

”سر وہ پیشہ کو ہوش آگیا ہے پر ان کی سانس بار بار اکھڑ رہی ہے،“، ڈاکٹر جوزارون کی ہی  
روپورٹس چیک کرنے میں مصروف تھا اُس نے نرس کی بات سننے ہی فائل ٹیبل پر رکھتے اُس کے  
ساتھ باہر کا رخ کیا۔

”اوووان کی دھڑ کن تو بہت آہستہ ہو رہی ہے پلیز آپ ڈاکٹر مستقلم کو بلائیں،“، آئی سی یو میں داخل  
ہوتے ہی زارون کو آکسیجن ماسک کے اندر سے ہی منہ کھولے زور زور سے سانس لیتا دیکھ ڈاکٹر نے  
آگے بڑھتے ایک سینئر ڈاکٹر کا نام لیتے انہیں بلانے کا کہا تو نرس اثبات میں سر ہلاتے تیز قدموں  
سے باہر کی جانب بڑھی۔

”مسٹر کیا ہوا؟ میرا بھائی ٹھیک ہے؟“ نرس کو دوسرا بار گھبرائی ہوئے چہرے کے ساتھ باہر آتا دیکھ معاذ نے آگے بڑھتے سوال کیا جو جواب دینے کی بجائے بس نفی میں سر ہلاتے کو روپور سے باہر نکلی۔

”پتا نہیں یہ ڈاکٹر کیا کر رہے ہیں، جنید پلیز تم کسی سے بات کرو“، نرس کے انکار پہ احمد صاحب نے اپنے سینے پہ ہاتھ پھیرا۔

”ابو پلیز آپ تسلی رکھیں میں بات کرتا ہوں کسی سے“، ان کی حالت غیر ہوتی دیکھ جنید نے معاف کو پانی لانے کا بولا۔

”انکل پلیز خود کو سنبھال لیں اور جنید بھائی آپ رکیں میں خود بات کرتا ہوں“، ارحم جو کافی حد تک اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا اس نے جنید کو اشارہ کرتے احمد صاحب کے پاس رہنے کا کہا اور خود وہاں سے اٹھتے اُسی ڈاکٹر کے کمرے کی جانب بڑھا جہاں ابھی ابھی اُس نے نرس کو داخل ہوتے دیکھا تھا۔

اس سے پہلے کہ ارحم دروازے پہ دستک دیتا نرس کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر بھی کمرے سے باہر آیا۔

”سر کیا مسئلہ ہے؟ کیوں آپ ہمارے پیشنت کو اتنی دیر سے آئی سی یو میں رکھے ہوئے ہیں؟“ ان کے ساتھ ہی کوریڈور کی جانب بڑھتے ارحم نے فکرمندی سے استفسار کیا۔

”کس پیشنت کی بات کر رہے ہیں آپ؟“ ایک سینئنڈ کے لیے رکتے ڈاکٹرنے سوالیہ نظرؤں سے اُس کی جانب دیکھا اور پھر سے قدم آگے بڑھا۔

”زارون کی بات کر رہا ہوں، وہی جسے آپ نے کچھ دیر پہلے چیک کیا تھا“، ان کے ساتھ ہی چلتے ارحم نے کینسر پیشنت کہنے کی بجائے نام بتاتے اپنی پہچان کروائی۔

”آن کو ہوش آچکا ہے مگر نزس کے مطابق ان کی سانس اکھڑ رہی ہے۔ میں بس ان کا ہی چیک اپ کرنے جا رہا ہوں آپ یہاں رکیں میں کچھ دیر میں ان کی حالت کے متعلق آپ کو آگاہ کرتا ہوں“، اس بارا پنے لبھے میں نرمی سموئے ڈاکٹر نے مختصر ان سے زارون کی طبیعت کے متعلق بتاتے نزس کے پیچھے ہی آئی سی یو کا رخ کیا۔

”سانس کیوں اکھڑ رہی ہے؟“ معاذ جو ڈاکٹر کو دیکھا ان کے پیچھے ہی آرہا تھا ان کی بات دہراتے سوالیہ نظرؤں سے ارحم کی جانب دیکھنے لگا جو خود بھی چہرے پہ لاعلمی لیے کھڑا تھا۔

”پتا نہیں کیا کر رہے ہیں یہ سب، میں ابو سے بات کرتا ہوں ہو سکتا ہے وہ یہاں کسی کو جانتے ہوں،“ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا موبائل نکالتے ارحم نے اُس کے کندھے پہا تھر کھا جواب فکر مندی سے آئی سی یو کے بندرووازے کی جانب دیکھ رہا تھا۔

---

”زارون...“ اپنے حواس بیدار ہوتے ہی نیم و آنکھوں سے عابدہ بیگم نے اُس کا نام پکارا۔ ”امی کیسی طبیعت ہے اب آپ کی؟“ ماہم جوان کے پاس ہی موجود تھی اُس نے انہیں بیدار ہوتا دیکھ جلدی سے اُن کے قریب آتے سوال کیا۔

”میں ٹھیک ہوں، زارون ٹھیک ہے نا؟“ ماہم کی آواز پر انہوں نے مکمل آنکھیں کھولیں۔ ”جی زارون بھی ٹھیک ہے آپ اُنھیں یہ پانی پئیں،“ اُن کی بات کا سرسری سے انداز میں جواب دیتے ماہم نے ٹیبل پر سے گلاس اٹھایا۔

”گھر آگیا ہے؟“ اُس کے سہارے اٹھ کر بیٹھتے عابدہ بیگم نے پانی پینے سے پہلے ایک اور سوال پوچھا۔

”جی کچھ دیر میں لے آئیں گے ابھی کمزوری ہو گئی تھی نا اس لیے ڈرپ وغیرہ لگ رہی،“ اُن کے لبوں سے گلاس لگاتے ماہم نے چہرے سے کسی قسم کی کوئی بھی پریشانی ظاہر کیے بغیر ان کو تسلی دی۔

”ٹھیک ہے جنید کو کال کرو اس سے کہو کہ زارون سے میری بات کروائے“، دل میں اٹھتی بے چینی کے سبب عابدہ بیگم نے ماہم کی بات سنتے بھی بے یقینی ظاہر کی۔

”میں کہتی ہوں پر پہلے آپ اٹھیں اور کچھ کھالیں“، حنا کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا ماہم نے تکمیل پیچھے کرتے عابدہ بیگم کو بیڈ کی بیک کا سہارے دیتے بھایا۔

”نهیں تم پہلے جنید کو کال کرو، میں زارون کی آواز سن لوں گی تو مجھے تسلی ہو جائے گی“، اپنی ضد برقرار رکھتے عابدہ بیگم نے پھر سے اپنی بات دھرائی تو ماہم نے مدد طلب نظر وں سے حنا کی جانب دیکھا۔

”امی میری ابھی بات ہوئی ہے جنید سے وہ بتا رہے تھے کہ ڈاکٹر نے زارون کو سکون کے لیے کچھ انجیکشن لگائے تھے جس کی وجہ سے ابھی تک غنوادگی کی حالت میں ہے اور اسی لیے وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا“، ماہم کی مشکل دور کرتے حنا نے ایک معقول سا بہانہ بناتے عابدہ بیگم کو تسلی دی تاکہ وہ مزید پریشانی لے کر اپنی طبیعت خراب نہ کریں۔

”اچھا ٹھیک ہے، بس تم جنید سے بول دو کہ زارون کو جب بھی ہوش آئے میری بات کروا دے“، ناچاہتے ہوئے بھی ان کی باتوں میں یقین کرتے عابدہ بیگم نے ان دونوں کوتائید کی جو اس مرحلے کے پار ہونے پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

---

”آپ میں سے معاذ کون ہے؟“ آئی سی یوسے باہر آتے ڈاکٹر نے ان کی طرف دیکھتے سوال کیا۔

”جی میں ہوں“، اپنے نام کی پکار پر وہ کچھ فاصلے پر کھڑا جنید سے بات کر رہا تھا کال بند کرتے جلدی سے ڈاکٹر کے قریب آیا۔

”پیشٹ آپ سے ملنے چاہتے ہیں مگر احتیاط کیجیے گا وہ زیادہ بات نہ کریں“، اُسے اندر جانے کی اجازت دیتے ڈاکٹر نے تاکید کی تو معاذ نے اثبات میں سر ہلاتے دروازے کی جانب قدم بڑھائے۔

”آپ میں سے جو پیشٹ کے زیادہ قریبی ہے رشتے میں وہ میرے ساتھ کمرے میں آئے“، معاذ کے جاتے ہی ڈاکٹر نے ان چاروں کی طرف دیکھا۔

”میں والد ہوں“، اس سے پہلے کہ جنید آگے بڑھتا احمد صاحب نے اپنا تعارف کرواتے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔

”ٹھیک ہے، آپ میرے ساتھ آئیں“، اپنے کمرے کی جانب بڑھتے ڈاکٹر نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا بولا تو احمد صاحب کے ساتھ ہی جنید نے بھی ان کے پیچھے قدم بڑھائے۔

”بیٹھیں“، کمرے میں داخل ہوتے ڈاکٹر نے اپنی نشست سنبحا لتنے ڈاکٹر مستقیم نے ان دونوں کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”آپ غالباً پیشٹ کے بھائی ہیں؟“ سوالیہ نظروں سے جنید کی جانب دیکھتے ڈاکٹر نے اندازہ لگایا جو ابھی کچھ دیر پہلے اُس کی جانب سے ہوئی بد تمیزی سے اُسے پہچان چکا تھا۔

”جی میں بھائی ہوں، آپ بتائیں زارون کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اُسے ہوش آگیا ہے؟“ معاذ کو اندر بلانے سے جنید اُس کے ہوش میں آنے کے بارے میں تو جان ہی چکا تھا اسی لیے اُس نے اندازہ لگاتے تصدیق چاہی۔

”جی بالکل پیشٹ کو ہوش آگیا ہے مگر آپ لوگوں سے ہوئی غفلت کی وجہ سے جو میڈیسین ڈاکٹر نے انہیں دی ہیں وہ کافی برے طریقے سے اپنار د عمل ظاہر کر رہی ہیں اس لیے میرا مشورہ یہی

ہے کہ آپ جتنا جلدی ممکن ہے پیشنسٹ کو آپریشن کی طرف لے جائیں، نرمی کے ساتھ ڈاکٹرنے اُنہیں خوش خبری کے ساتھ ساتھ آنے والے خطرے سے بھی آگاہ کیا۔

”آپریشن؟ ٹھیک ہے ہمیں کوئی مسئلہ نہیں جیسے آپ کو بہتر لگتا ہے آپ زارون کا اعلان کریں،“ ڈاکٹر کی ادھوری بات سنتے ہی جنید نے جلد بازی میں اُنہیں اجازت دی۔

”آپریشن کرنا اتنا آسان نہیں ہے، میڈیسین کی وجہ سے جو خون رکاوہ سانس کی نالیوں میں داخل ہو تپینسٹ کو سانس لینے میں داشوری دے رہا ہے اور یہی وجہ سے ہم ابھی تک اینڈوسکوپی کی طرف جانے کا خطرہ بھی مول نہیں لے رہے،“ ان کے چہروں پر فکر دیکھ ڈاکٹر نے تفصیل کے ساتھ اُنہیں ساری صورت حال سے آگاہ کرتے آگے کے لائجے عمل کے بارے میں مشورہ دیا۔

-----

کمرے میں داخل ہوتے سامنے ہی زارون کو مختلف مشینوں میں جکڑا دیکھ معاذ کے قدم وہیں دروازے پہنچتے۔

”سر پلیز پیشنسٹ سے زیادہ بات مت کریں گا،“ اُسے دروازے پر رکا دیکھ نرس نے آگے بڑھتے اُسے تاکید کی اور وہاں سے نکلتے باہر جا کر بیٹھ گئی۔

”م...ع...اڑ“ سانس میں دشواری کی وجہ سے زارون نے ماسک کے اندر سے ہی زیر لب اُس کا نام پکارا۔

”ہاں میں پاس ہی ہوں تمہارے، بس زیادہ بات نہ کرو“، اُسے اپنی جانب متوجہ ہوتے دیکھ معاذ نے اپنی آنکھوں کی نمی کو صاف کرتے اُس کی جانب قدم بڑھائے۔

”ن...و...ر...“ تکلیف کی شدت سے آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں اُس کے رخساروں میں بھے تو معاذ نے انہیں جلدی سے اپنی پوروں میں جذب کیا۔

”ہاں نور بھی ٹھیک ہے“، لفظوں کو جوڑتے وہ اُس کی بات کا مفہوم سمجھا تو اُس نے اُس کی آدھی ادھوری بات کا جواب دیا۔

”ن...ور کا خی...ال...ر کھ...نا“، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ماسک اپنے چہرے سے ہٹانے کی کوشش کرتے زارون نے بمشکل اپنے الفاظ کو زبان سے ادا کیا۔

”میں کیوں رکھوں خیال تمہاری بیوی کا؟ بھی مجھے کوئی شوق نہیں ہے تمہارے ہاتھوں مرنے کا“، اُس کی بات کو مذاق میں ڈالتے معاذ نے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ سجائے اُس کا ماسک ٹھیک کیا۔

”وعدہ... کرو... میر...ے لع... دتم... اُس کا خی... ال رکھو... گے... اُسے سہار... ا... د... و... گے“، اُس کا ہاتھ دباتے زارون نے لفظوں کو توڑتے ہوئے اپنی بات اُس تک پہنچائی۔

”پاگل ہو گئے ہو، اللہ نہ کرے کہ تمہیں کچھ ہو۔ کیسی فضول باتیں کر رہے ہو؟“، اُس کی بات سمجھ میں آتے ہی جلدی سے اُس کا ہاتھ جھکلتے معاذ نے غصے کے باوجود بھی دبی آواز میں اُسے تنبیہ کی جو آج بے بسی کی انتہا پہ پہنچتے اپنی زندگی کو کسی اور کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرتے خود بالکل بے جان ہو چکا تھا۔

”زارون....“، کچھ سینڈز سے دوسری جانب سے کوئی جواب نہ آنے پہ معاذ نے اُسے پکارا۔ ”زارون..... کیا ہوا ہے تمہیں؟ ڈاکٹر... ڈاکٹر....“، سامنے لگی مشین پہ سیدھی ہوتی لائن کو دیکھ معاذ نے چلاتے ہوئے کسی کو مدد کے لیے پکارا تو باہر بیٹھی نرس جلدی سے اندر آئی۔ آپ پلیز ڈاکٹر کو بلائیں“، اُسے حواس باختہ دیکھ نرس نے جلدی سے آکسیجن ماسک ٹھیک کرتے معاذ کو ہوش دلا یا جو اُس کی بات سنتے جلدی سے باہر کی جانب بھاگا۔

دو سال بعد ...

”تم ابھی تک یو نہی بیٹھی ہو؟ میں نے تمہیں کہا بھی تھا کہ وقت پہ تیار ہو جانا“، کمرے میں داخل ہوتے، ہی اُسے شام والے کپڑوں میں بیٹھا دیکھ وہ خفا ہوا۔

”مجھے کہیں نہیں جانا“، اُس کی بات سنتے ہی نور نے اپنے پاؤں صوفے پر رکھتے انکار کیا۔

”کیوں نہیں جانا؟“ اُس کی بے وقت ضد پہ سوال کرتے اُس نے قدم صوفے کی جانب بڑھائے۔

”مجھے شرم آتی ہے“، آنکھوں میں نمی لیے نور نے اُسے اپنے نہ جانے کی وجہ بتائی۔

”کس بات کی شرم؟“ اُس کے جواز پہ بھنوئیں اچکاتے مقابلے وضاحت چاہی۔

”بس مجھے نہیں جانا آپ جائیں“، اُس کی بات کا جواب دینے کی بجائے نور نے پھر سے اپنی بات دھرائی۔

”اُفف یار کیا مسئلہ ہے؟ جو بھی بات ہے کھل کر بتاؤ“، اُس کے بار بار انکار پہ گہری سانس لیتے اُس نے اُسے بولنے پہ آکسایا۔

”بس مجھے شرم آتی ہے، مطلب سب کیا سوچیں گے کہ میں اس حالت میں منه اٹھا کر شادی پہ آگئی“، اُس کے بار بار اصرار پہ نور نے اُس کی توجہ اپنے بھرے ہوئے وجود پہ دلائی جس پہ ایک نئی زندگی کی کرنیں اب واضح ہونے لگی تھیں۔

”ہونہے اس میں کون سی شرم کی بات ہے، مطلب ساری دنیا کی لڑ کیاں ہی اس موڑ سے گزرتی ہیں“، اُس کی بات پہ اپنی مسکراہٹ چھپاتے اُس نے نظریں اُس کے الجھے ہوئے چہرے پہ مرکوز کیں۔

”بس مجھے نہیں جانا، مجھے تو گھروالوں کے سامنے اتنی شرم آتی اور وہاں تو اتنے لوگ ہوں گے“، اُس کی بات سننے کے بعد بھی نور نے اپنی ضد برقرار رکھتے نفی میں سر ہلایا۔

”تو کیا ہے؟ لوگ کون سا تمہیں کھا جائیں گے۔ بس تم اب یہ بہانے ختم کرو اور اٹھوشا باش جلدی سے تیار ہو جاؤ“، کافی دنوں سے اُس کے اندر پیدا ہوتی ایک قدرتی جھجھک کو محسوس کرتے زارون نے نرمی کے بجائے تھوڑا سختی سے کام لیاتا کہ وہ مزید سست پڑتے دیر نہ کرے۔

”آپ ہیں ہی بُرے اور آپ لڑکی نہیں ہیں ناتب ہی میری بات سمجھ نہیں پار ہے“، اس کے لمحے کی سختی پہ شکوہ کناں نظروں سے اُسے گھورتے نور نے منه پھلایا۔

”اففف جان میں تمہاری بات سمجھ رہا ہوں پر میں چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت ہر موقعے پر میری نظروں کے سامنے رہو“، اُس کے خفا سے چہرے کو اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھرتے اُس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”ہونہ جانتی ہوں میں، آپ کیوں مجھے اپنے سامنے رکھنا چاہتے ہیں حد ہے اب تو میں نے پورے ایک ہفتے سے کوئی چاکلیٹ نہیں کھائی“، اُس کے ہاتھ ہٹاتے نور نے سارے رومنیں کاستیاناں کرتے منہ بسورا۔

”اففف تم کبھی نہیں سدھ سکتیں، اچھا بس اب زیادہ باتیں نہ کرو اٹھ جاؤ ورنہ ارجمند اپنے ساتھ ساتھ میرا بھی بینڈ بجادے گا“، کلاک پر شام کے آٹھ بجتے دیکھ زارون نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔

”ٹھیک ہے میں چلی جاؤں گی پر میں آپ کو بتا رہی ہوں میں وہاں زیادہ دیر کے لیے نہیں رکوں گی“، اُٹھنے سے پہلے نور نے اپنی شرط بتاتے اُسے تنبیہ کی۔

”ٹھیک ہے نہ رکنا اور کوئی شال وغیرہ لے لینا، باہر کافی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے“، صبح سے ہوتی بارش کی وجہ سے کمرے میں بھی خنکی محسوس کرتے زارون نے اُسے تاکید کی جواب اُٹھ کر الماری سے اپنے کپڑے نکالنے لگی تھی۔

”یہ زارون کا بچہ پتا نہیں کہاں رہ گیا ہے، پہلے بھی اس کی وجہ سے میری شادی پورے دو سال لیٹ ہوئی ہے اور آج پھر یہ دیر کر کے مجھے سرال سے جوتے پڑوائے گا“، موبائل سے اُس کا نمبر ڈال کرتے وہ منہ میں بڑا بڑا یا۔

”ارحم پیٹا کتنی دیر ہے؟ تمہارے ابو دس بار تمہارا پوچھ چکے ہیں“، اُس کے کمرے میں داخل ہوتے آئمہ بیگم نے اُسے موبائل کان سے لگائے کھڑاد کیھ اطلاع دی۔

”جی امی بس میں تو تیار ہوں پروہ زارون ابھی تک نہیں آیا“، موبائل کان سے ہٹاتے ارحم نے انہیں نیچے نہ آنے کی وجہ بتائی۔

”اچھا وہ بھی آجائے گا پر تم تو چلو، سب نیچے تمہارا انتظار کر رہے ہیں“، آئمہ بیگم جو پچھلے کچھ سالوں میں زارون کے لیے ارحم کا جنون دیکھ چکی تھیں انہوں نے مسکراتے ہوئے اُسے تسلی دی۔

”جی بس ایک بار میں زارون کو کال کر کے پوچھ لوں کہ وہ کہاں ہے پھر آتا ہوں“، ان کی بات سننے کے بعد بھی ارحم نے چند منٹ کا وقت مانگتے موبائل سے نمبر ڈال کیا تو آئمہ بیگم نے اُسے جلدی آنے کی تاکید کرتے باہر کا رخ کیا۔

”یار کہاں رہ گئے ہو تم؟“ دوسری طرف رابطہ بحال ہوتے ہی ارحم نے ماتھے پہ بل ڈالتے سوال کیا۔

”ہاں بس آرہا ہوں“، ایک نظر نور کی جانب دیکھتے زارون نے اُسے جواب دیا۔  
 ”کہاں آرہے ہو؟ پچھلے ایک گھنٹے سے تم مجھے یہی بات کہہ کر ٹال رہے ہو پر اب میں تمہیں آخری بار وار ان کر رہا ہوں کہ اگلے دس منٹ میں اگر تم یہاں نہ پہنچے تو میں تمہارے بغیر ہی بارات لے کر روانہ ہو جاؤں گا“، غصے سے دھمکی دیتے ارحم نے رابطہ منقطع کیا تو زارون نے موبائل کان سے ہٹاتے اسکرین کو گھورا۔

”نور یار جلدی کرو، پچھلے ایک گھنٹے سے تم تیار ہو رہی ہو“، اُسے ابھی بھی شیشے کے سامنے کھڑا دیکھ زارون نے کوئی دسویں بار اُسے جلدی کرنے کا بولا۔

”میں تیار رہی ہوں پر دیکھیں نا اس فراک میں کچھ زیادہ موئی نہیں لگ رہی میں؟“ اُس کی جانب رخ پھیرتے نور نے ایک بار پھر سے الجھتے ہوئے سوال کیا۔

”موئی ہو تو موئی ہی لگو گی نا، اسی لیے کہتا ہوں کہ میٹھا کم کھایا کرو“، ایک نظر سرتاپاؤں اُس کی تیاری کو ستائشی نظروں سے دیکھتے زارون نے تعریف کرنے کی بجائے اُسے مزید پریشانی میں ڈالا۔

”کیا مطلب ہے؟ کیا میں سچ میں زیادہ موٹی لگ رہی ہوں؟“ اُس کی بات سننے ہی پلٹ کر شیشے میں اپنا عکس دیکھتے نور نے فکر مندی ظاہر کی۔

”ہاں موٹی لگ رہی ہو پر پہلے سے کہیں زیادہ پیاری بھی اس لیے یہ فکریں چھوڑوا اور جلدی کرو ارحام کا پارہ بہت چڑھا ہوا ہے“، اُسے نرمی سے اپنے حصار میں لیتے زارون نے اُس کے بائیں گال پہ بوسہ دیا تو نور نے اُس کی بے ڈھنگی تعریف پہ اُسے شیشے کے اندر سے ہی گھورا۔

”بھاڑ میں جائیں آپ، حد ہے تعریف بھی کرتے تو دل جلانے والی“، اُس کے ہاتھ ہٹاتے نور نے اُس کے حصار سے نکتے الماری سے اپنی سینڈل نکالی۔

”ہیل مت پہنو، پہلے بھی کتنی بار میں نے تمہیں منع کیا ہے“، اُس کے ہاتھ میں موجود سینڈل کی طرف دیکھتے ہی زارون نے اُسے ٹوکا اور آگے بڑھتے الماری سے کوئی سادہ اور آرام دہ سینڈل تلاش کرنے لگا۔

”میں نہیں پہنوں گی، حد ہے زار میں شادی پہ جا رہی ہوں“، اُس کے ہاتھ میں موجود ایک سادہ سی سینڈل دیکھ نور نے فوراً سے انکار کیا۔

”شادی میں جا رہی تب ہی یہ نکالی ورنہ سلیپر زنکال کر دیتا“، اُس کے بڑھتے ہوئے خزوں پر آنکھیں نکالتے زارون نے اُس کے منہ بنانے کی پرواکیے بناء، ہی اپنی نکالی ہوئی سینڈل اُس کے سامنے رکھی۔

”پتا نہیں کس بات کا بدله لے رہے ہیں مجھ سے“، غصے سے سینڈل پہنٹے نور نے شال اٹھا کر اپنے گرد لپیٹی۔

”بدله لے نہیں رہا بلکہ بدله چکانے کی کوشش کر رہا ہوں کیوں کہ گزرے دنوں میں جو کچھ تم نے میرے لیے کیا وہ ناقابل فراموش تھا۔ تمہیں پتا ہے جب آئی سی یو میں میری سانسیں رک رہی تھیں تو مجھے موت سے زیادہ تمہاری تکلیف سے ڈر لگ رہا تھا، اس دنیا میں تمہاری تھہائی کا خوف مجھے اندر تک ویران کر چکا تھا، ہی میرے دل نے اپنے رب سے بس تھوڑی سی مہلت مانگی، صرف اتنی کہ وہ تمہیں مضبوط کر سکے، تمہیں اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ سیکھا سکے“، اپنا ہاتھ اُس کے باہمیں رخسار پر رکھتے زارون کی آنکھیں تشکر سے نم ہوئیں۔

”میں جانتا ہوں، ان دو سالوں میں تم نے میرے لیے اپنی نیندوں کے ساتھ ساتھ اپنی خواہشات کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا، اپنی تمام ضدوں کو چھوڑ کر میرے ساتھ بد ذاتیہ کھانے کھانا، میری زرا سے تکلیف پر ساری ساری رات میرے ساتھ جا گنا، میرا چڑچڑا پن خاموشی سے سسہ جانا اور

میرے غصے پہ بھی مسکرا دینا۔ کیا سمجھتی ہو تم کیا میں انجان تھا؟ کیا مجھے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ میری نور بڑی ہو چکی ہے، براہ راست اُس کی آنکھوں میں جھانکتے زارون نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”اب اتنی بھی بڑی نہیں ہوئی جتنا آپ سمجھ رہے، حد ہے اتنی مشکل سے تیار ہوئی تھی آپ نے رلا کر سارا کا جل خراب کر دیا، پرانے دنوں کی یاد پہ نور نے بات بدلتے اپنے ساتھ ساتھ زارون کا دھیان بھی اُن تلخ لمحات سے ہٹانا چاہا۔

”ہونہہ ٹھیک ہے بالکل اب پلیز دوبارہ سے شیشے کے سامنے کھڑی مت ہو جانا، پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے، اُس کے کترانے پہ زارون نے مزید کوئی بھی بات دھرانے سے غرض برتنے اُس کی پیشانی پہ بوسہ دیا اور اُسے جلدی نیچے آنے کا بولتے خود اپنی چیزیں اٹھاتے باہر کی جانب بڑھاتو نور نے اپنی آنکھوں کے نم ہوتے کناروں کو احتیاط سے صاف کیا اور اپنا موبائل اور پاوچ اٹھاتے اُس کے پیچے ہی کمرے سے نکلی۔

-----  
کچھ دیر میں وہ دونوں ارحم کے گھر پہنچے تو بارات روائی کے لیے بالکل تیار تھی۔

”اب بھی کیا ضرورت تھی آنے کی؟ حد ہے خود شادی کروائے کے باپ بننے کی تیاری میں ہوا اور یہاں میری کسی کو فکر ہی نہیں“، زارون کو دیکھتے ہی ارحم نے غصے سے اُسے پیچھے دھکیلا جو اس کے گلے لگنے کی کوشش میں تھا۔

”ہونہہ فکر تھی تو تمہیں ابھی شادی کے لیے منایا ورنہ تمہارا ارادا تو لٹل زارون کو اپنا شہہ بالا بنانے کا تھا“، اُس کی بات پہ مسکراتے زارون نے اُس کے کان کے بالکل قریب ہوتے سر گوشی کی۔

”ہاں ارادا تو میرا اب بھی ہے پر اس بار میں نے مزید انتظار کا بولا تو سرال والوں سے پہلے دو لہن، ہی میرا سر پھاڑ دے گی“، لٹل زارون کے نام پہ اپنا غصہ بھلائے ارحم نے اپنی بائیں آنکھ دباتے شرارت سے کھا اور ہاشم صاحب کی جانب متوجہ ہوا جو اسے گاڑی میں بیٹھنے کا بول رہے تھے۔

”تم کہاں جا رہے ہو؟“، زارون کو اپنی گاڑی کی جانب بڑھتا دیکھا ارحم نے پکارا۔

”میں نور کو ساتھ لے کر اپنی گاڑی میں آتا ہوں تم آنٹی اور انکل ساتھ بیٹھو“، پلٹ کروضاحت دیتے زارون نے نور کی طرف دیکھا جو چہرے پہ بے زاری لیے ارحم کی کرز نز کے ساتھ کھڑی تھی۔

”ہونہ بس ہر وقت بیوی کے مرید ہی بنے رہا کرو، حد ہے یار دوست کی توکوئی اہمیت ہی نہیں“، اُسے طعنہ مارتے ارجمنے ہاشم صاحب کے پھر سے پکارنے پہ ان کی جانب قدم بڑھائے تو زارون نے اس بات کا بدلہ کسی اور وقت چکانے کا فیصلہ کرتے نور کو آواز دی۔

”حد ہے ماما کو بھی اسی وقت ہی جانا تھا، وہ میرے ساتھ ہو تیں تو مجھے اتنا عجیب محسوس نہ ہوتا“، گاڑی میں بیٹھتے ہی نور نے عابدہ بیگم کی غیر موجودگی پر افسردگی کا اظہار کیا۔

”امی نہیں ہیں تو کیا ہوا، میں تو ہوں نا اور تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ بلا خرات نے طویل انتظار کے بعد امی ابو کو عمرے کی ادائیگی کا موقع مل گیا“، گاڑی اسٹارٹ کر کے بھیڑ میں سے نکلتے زارون نے اُس کے شکوئے پہ احساس دلا یا۔

”ہاں تو میں خوش ہی ہوں پرمجھے ماما کے بغیر کسی کام کا مزہ نہیں آتا“، اُس کی بات کی درستگی کرتے نور نے ایک بار پھر سے ادا ہوتے اپنی بات مکمل کی۔

”اچھا بس اب پریشان مت ہوا گر تمہارا ان کے بغیر دل نہیں لگتا تو وہ بھی وہاں بیٹھی تمہاری فکر میں آدھی ہو گئی ہوں گی“، ان دونوں کی دوستی سے اچھے سے واقف ہونے کی وجہ زارون نے مسکراتے ہوئے اندازہ لگایا تو نور اپنے موبائل کی جانب متوجہ ہوئی۔

”ماما کی کال ہے“، خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ کہتے اُس نے کال ریسیو کی تو ان ساس بہو کے پیار کو دیکھ زارون کو جلن محسوس ہوئی۔

---

ہال پہنچتے ہی نور نے براہنڈل روم کا رخ کیا تاکہ رابعہ کو اُس کی طرف سے شرکت نہ کرنے پہ معذرت کر سکے۔

”کیسی ہو؟“، کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی کزن کی وہاں موجودگی کی وجہ سے نور نے سب سے رسی سلام و دعا کے بعد رابعہ کو مخاطب کیا جو اپنی ناراضگی کے اظہار کے لیے خود کو سارے ماحول سے بالکل لا تعلق ظاہر کیے بیٹھی تھی۔

”میں جیسی بھی ہوں تمہیں اس سے کیا؟ تم جاؤ اپنے بھائی کا حال چال دریافت کرو“، اُس کی طرف دیکھے بغیر رابعہ نے غصے سے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”یار پلیز سچ میں، میں تو تمہاری طرف سے ہی شرکت کرنا چاہ رہی تھی پر زار کا تو تمہیں بتا ہی ہے وہ میری طبیعت کی وجہ سے ایک سینند کے لیے مجھے اکیلانہیں چھوڑتے“، سب کی موجودگی کی وجہ سے نور نے آواز آہستہ رکھتے وضاحت دی۔

---

”تواب کیوں اکیلا چھوڑا ہے؟ اب بھی جاؤ اپنے زار کے پاس“، اُس کا اپنے ہاتھ پر دھرا ہاتھ جھکتے رابعہ نے اُس کی بات پر مزید تپتے غصہ دکھایا۔

”اچھا سوری ناپلیز مان جاؤ، دیکھو آج تمہاری زندگی کا اتنا اہم دن ہے اور کیا تم اس موقع پر بھی مجھ سے ناراض رہو گی؟“ نور نے نرمی سے بات بنتی نہ دیکھ اُسے جذباتی کیا۔

”ہاں تو میرا اہم دن ہے، تمہارا تو نہیں نا؟ اس لیے پلیز مجھ سے بات مت کرو“، اپنی بات مکمل کرتے رابعہ نے ٹیبل پر پڑے گلاس میں سے دو گھونٹ جوس کے بھرے تو اُس کی بے رخی پر نور کی آنکھیں نم ہوئیں۔

”اب رونا شروع مت کر دینا، حد ہے میں تو ویسے ہی تمہیں ٹنگ کر رہی تھی، کچھ سیکنڈز کی خاموشی کے بعد رابعہ نے اُسے سر جھکایا بیٹھا دیکھا تو ایک گھری سانس لیتے اُس سے مخاطب ہوئی۔“ نہیں میں رو تو نہیں رہی، وہ تو بس آنکھ میں کچھ چلا گیا تھا، جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کرتے نور نے اُس کی بات کی تردید کی جواب بازو پھیلاتے اُسے اپنے گھیرے میں لے چکی تھی۔

-----

تمام فلگشن ختم ہوئے تو بارات دلہن کو ساتھ لیے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

”شکر ہے یا اللہ لوگوں کی ان گنت سازشوں کے بعد بھی میں شادی شداوں کی فہرست میں شامل ہو گیا،“ گھر آتے ہی دو لہاد لہن کو اکٹھے ڈار نگ روم میں بٹھایا گیا تو ارحمنے سب کی نظرؤں سے بچتے رابعہ کے کان کے قریب ہوتے سر گوشی کی جس نے سب لوگوں کی موجودگی کے باعث کوئی بھی جواب دینے کی بجائے صرف اُسے گھورنے پہ اکتفا کیا۔

”لو بھئی اب مجھے اور نور کو اجازت دو، بہت ٹائم ہو گیا ہے“، کلاک پر رات کے دو بجتے دیکھ زارون نے ارحمنے کو مخاطب کیا۔

”ہاں ہاں جاؤ بڑا احسان کیا نا تم نے میری شادی میں شریک ہو کر“، اُس کے جانے کا سنتے ہی ارحمنے منہ بسوار۔

”شرم کرو، شام سے ذلیل کر کے دل نہیں بھرا جواب پھر سے شروع ہو گئے ہو“، اُس کی بات پہ آنکھیں نکالتے زارون نے سب سے نظر بچا کر ہاتھ کا مکابنا کر اُس کی پسلی میں رسید کیا۔

”اُفف اتنی زور سے مارنے کی کیا ضرورت تھی“، ڈرامے بازی چھوڑتے ارحمنے اپنی پسلی پہ ہاتھ پھیرتے اُسے کھاجانے والی نظرؤں سے گھورا جواب آگے بڑھتے ہاشم صاحب سے مصافحہ کرنے لگا تھا تو نور بھی اٹھ کر رابعہ سے ملی۔

”صحیح جلدی آجانا“، اُس سے الگ ہوتے رابعہ نے اُسے تاکید کی۔

”ٹھیک ہے آجائوں گی تم اپنا خیال رکھنا“، اُس کے چہرے پر پیشانی کے آثار دیکھ نور نے مسکراتے ہوئے تسلی دی اور زارون کے ساتھ ہی گھر کے لیے روانہ ہوئی۔

---

”زار رابعہ آج کتنی پیاری لگ رہی تھی نا؟“، زارون نے گاڑی گھر سے نکالتے سڑک پہ ڈالی تو نور نے بات کرتے اُس سے تصدیق چاہی۔

”ہاں ماشاء اللہ دونوں ہی بہت پیارے لگ رہے تھے بس اللہ پاک ان کی خوشیوں کو سلامت رکھے“، اثبات میں سر ہلاتے زارون نے ان دونوں کی تعریف کرنے کے ساتھ ہی دعا دی۔

”آمین“، اُس کی بات سنتے نور نے دل سے آمین بولا اور سردی کی وجہ سے شال کو اپنے گرد لپیٹتے سیٹ کی بیک سے سر ٹکایا۔

”کیا ہوا؟ تھک گئی ہو؟“، اُسے یوں سست سا پا کر زارون نے سڑک خالی دیکھ گاڑی کی اسپیڈ بڑھاتے سوال کیا۔

”جی بس سر میں درد ہو رہا ہے“، آنکھیں موندتے نور نے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”ہاں شور بھی کافی تھا وہاں“، ایک ہاتھ سے اسٹرینگ سنبھالتے زارون نے فکر مندی سے دوسرا ہاتھ اُس کی پیشانی پہ لگایا۔

”ٹھیک ہوں میں، آپ پریشان نہ ہوں“، اُس کے چہرے پہ اپنے لیے آنے والی فکر کو دیکھ نور نے مسکراتے ہوئے اُس کے کندھے پہ سر رکھتے تسلی دی۔

”ہونہ جانتا ہوں کہ دکھ چھپانے آگئے ہیں تم تھیں پر تم جتنی بھی کوشش کرو مجھ سے اپنی تکلیف کبھی نہیں چھپا پاؤ گی“، گاڑی کی اسپیڈ آہستہ کرتے زارون نے ایک ہاتھ سے اسٹرینگ سنبھالتے دوسرا ہاتھ اُس کے کندھے پہ رکھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو؟ کیوں ایسی باتیں کر رہے ہیں؟ اور میں بھلا کیوں آپ سے اپنے دکھ چھپاؤں گی؟“، ایک بار پھر سے اُسے شام والے موڑ میں دیکھ نور نے پیچھے ہٹتے وضاحت چاہی۔

”کیوں کہ اب تم بڑی ہو گئی ہو، پہلے جیسی شرارتیں نہیں کرتیں اور نہ ہی ضد“، اُس کے پرانے رویے کو کہیں کھو یا ہوا پا کر زارون نے آج دوسری بار اس بات کا شکوہ کیا تھا۔

”میں دنیا کے لیے بڑی ہو سکتی ہوں مگر آپ کے لیے میں وہی پا گل اور نادان سی نور ہوں جسے آپ کے ساتھ اڑنا، بات بات پہ ضد کرنا پسند ہے پر ماما کہہ رہی تھیں کہ ماں کی سب عادتوں کا اثر بچے پہ پڑتا ہے اسی لیے میں اب زیادہ ضد نہیں کرتی کیوں کہ میری ضد تو آپ برداشت کر لیتے مگر اللہ

نے ہمیں بیٹھ دے دی تو ہو سکتا ہے اُسے کوئی ضد برداشت کرنے والا ملنے ملے،“ نور نے نم آنکھوں سے اپنے بد لے ہوئے رویے کی وضاحت دی تو کچھ سینڈز کے لیے زارون کی زبان پہ بھی قفل پڑا۔

”اللہ سب بہتر کرے گا اگر ہم نے آج تک ہر مصیبت پہ صبر کیا کبھی کسی کا بُر انہیں چاہا تو ہماری اولاد کے ساتھ بھی کچھ بُر انہیں ہو گا اس لیے پلیزان بالتوں کو اپنے دماغ سے نکال کر بالکل پر سکون رہو“، اُس کی فکر پہ نرمی کے ساتھ سمجھاتے زارون نے اُسے تسلی دی جو مزید کچھ کہنے کی بجائے اثبات میں سر ہلاتے گاڑی سے باہر دیکھنے لگی۔

-----

”تم اوپر جاؤ میں معاذ کو دیکھ کر آتا ہوں“، اُس کے کمرے کی لائٹ آن دیکھ زارون نے گھر پہنچتے نور سے کہا جو اُسے جلدی آنے کی تاکید کرتے سیڑھیوں کی جانب بڑھ چکی تھی۔

”تم ابھی تک جاگ رہے ہو؟“ دروازے پہ دستک دیتے زارون نے اندر قدم رکھا تو سامنے معاذ کو اٹھا ہوا پاکر حیران ہوا۔

”ہاں وہ بس تم لوگوں کا ہی انتظار کر رہا تھا“، اپنے لب پر ضبط رکھتے معاذ نے اُس سے نظریں ملائے بغیر جواب دیا۔

”طبعیت ٹھیک ہے؟“ اُس کی آواز میں بھاری پن محسوس کرتے زارون نے واپس پلنٹ کی بجائے بیڈ کی جانب قدم بڑھائے۔

”ہاں ٹھیک ہوں بس سر میں درد ہے تھوڑا“، مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے معاذ نے اُس کی طرف دیکھا جواب اُس کے قریب بیٹھ چکا تھا۔

”کیا بات ہے؟ میں کافی دنوں سے دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ پریشان ہو“، اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے زارون نے نظریں اُس کے چہرے پر مرکوز رکھتے کچھ جانچنے کی کوشش کی۔

”کوئی بات نہیں ہے، جو تھی وہ اب ختم ہو چکی ہے“، معاذ کو لگا کہ اگر آج بھی وہ کسی سے اپنا درد نہیں بانتے گا تو وہ اندر ہی اندر بالکل ختم ہو جائے گا تب ہی اُس نے تلخی مسکراہٹ چہرے پر سجائے بات کا آغاز کیا۔

”کیا مطلب ختم ہو چکی ہے؟ کیا مسئلہ ہے؟ پلیز مجھے بتاؤ“، اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے زارون نے اُسے بولنے کے لیے اکسایا۔

”مسئلہ نہیں محبت تھی یا شاید عشق....“، برداشت سے سرخ ہوئی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتے معاذ نے اپنی بات ادھوری چھوڑی۔

”محبت؟ کس سے؟“ اُس کی زبان سے محبت کے لفظ پہ ایک دم سے چونکتے زارون نے نامجھی سے اُس کی جانب دیکھا۔

”اُسی سے جسے تم آج اپنے دوست کے ساتھ بیاہ کر لائے ہو“، نظریں جھکاتے معاذ نے جوانشاف کیے وہ چند لمحوں کے لیے زارون کو بالکل ساکت کروائ گئے۔

”را... بعہ سے؟؟“ تصدیق کے لیے اُس نے اٹکتے ہوئے اُس کا نام لیا تو معاذ نے اُس سے نظریں ملانے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جب پہلی بار میں تمہارے ساتھ ارحام اور رابعہ سے ملا تھا وہ تب سے میرے دل میں ایک خاص مقام پہ فائز ہے۔ میں نے لاکھ چاہا کہ میں اُس کے خیال کو اپنے دل سے نکال دوں مگر میں ایسا نہیں کر سکا۔ ارحام اور رابعہ کی پسندیدگی کا سن کر بھی میں اُسے اپنے دل سے نکال نہیں پایا، میں اپنے آپ کو اُس سے محبت کرنے سے روک نہیں سکتا“، کہنے کے ساتھ ہی معاذ نے بے بسی کے ساتھ زارون کے گلے لگتے اپنے آنسوؤں پہ بند باندھنے کی کوشش کی جو آج بے اختیار ہو کر اُس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اتنی بڑی بات تم نے مجھ سے کیوں چھپائی؟“ وہ جو اس کے اقرار پہ بالکل ساکت سا بیٹھا تھا اس کے گلے لگتے ہی ہوش میں آیا۔

”کہنے کے لیے کچھ تھا، ہی نہیں اور کیا میں تمہیں اتنا بے حس لگتا ہوں کہ اپنے مفاد کے لیے اُس کی خوشیاں بر باد کرتا؟ میں جانتا تھا کہ وہ بھی ارحم کو پسند کرتی ہے اسی لیے پیچھے ہٹ گیا“، اپنا چہرہ صاف کرتے اُس نے تنخ لبھے میں زارون کو سچائی بتائی جو خود بھی بھائیوں جیسے دوست اور دوست جیسے بھائی میں سے ایک کا انتخاب کرنے سے قاصر تھا۔

”اللہ کے ہر فیصلے میں بہتری ہوتی ہے اگر تم نے کسی کی خوشیوں کی خاطر خود تکلیف سہی ہے تو یقین جانو وہ رب تمہیں اس کے عوض بہتر سے بہترین عطا کرے گا۔ جانتا ہوں اُس شخص کو بھلانا بہت مشکل ہے جس کے لیے پہلی بار ہمارے دل نے اُس نرم و گرم احساس کو محسوس کیا ہوا جسے لوگ محبت کا نام دیتے ہیں۔ زندگی کچھ پانے اور کچھ کھو دینے کا ہی نام ہے اور ہو سکتا ہے جو ہم نے کھو دیا وہ آگے چل کر زندگی میں ہمارے لیے بہتر ثابت نہ ہوتا مگر انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ لا حاصل کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اپنے آپ کو اتنا تھکا دیتا ہے کہ حاصل کی اہمیت بھی اُس کے دل

سے ختم ہو جاتی ہے اس لیے پلیز جو چیز تمہاری زندگی سے جا چکی ہے اُس پر افسوس کرتے خود کو یوں تباہ نہ کرو، اُس کے کندھے پر ہاتھ سے دباؤ ڈالتے زارون نے اپنی بات کہی۔

”حبہ میری زندگی سے گئی تو مجھے لگا تھا کہ اب میرے پاس کچھ نہیں بچا، تم تو جانتے ہی ہو کہ کیسے میں نے اپنی زندگی کو اُس کے لیے داؤ میں لگادیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ ساتھ امی ابو کو بھی پریشان کیا اور شاید یہ جو تکلیف میں نے کچھ سالوں میں برداشت کی ہے یہ اُسی کا نتیجہ ہے۔ ہم جو بے وجہ اپنی ذات کو تکلیف دیتے اور صبر نہیں کرتے ہماری زندگی میں مصیبتیں بھی اسی وجہ سے آتی ہیں۔ میں نے دو سال تک خود کو اذیت میں رکھا اللہ سے ہزاروں شکوے کیے، میں نے صبر کرنے میں بہت دیر کر دی تھی اسی لیے اللہ پاک نے مجھے موت کے منہ میں دھکیلتے اتنا بے بس کیا کہ مجھے سمجھ آگئی کہ لا حاصل تو وہ چیزیں ہوتیں جو ہمارے لیے بہتر نہیں ہوتی اور حاصل ہی ہمارا حاصل ہے۔ نور کی جگہ اگر حبہ ہوتی تو وہ شاید اس تکلیف میں کبھی بھی میرا ساتھ نہ دیتی، وہ مجھے محبت کے بد لے محبت تدوے سکتی تھی مگر محبت کے بد لے عشق کرنا اُس کے بس کی بات نہیں تھی، چہرے پر مسکراہٹ سجاتے زارون نے معاذ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

”میری سکھائی ہوتی باتیں مجھے مت پڑھاؤ اور اگر نور تم سے عشق کرتی ہے تو، تم نے موت کے دہانے پر کھڑے ہو کر بھی اُس کی فکر کی جو شاید عشق اور محبت سے بہت آگے کا کوئی احساس تھا۔ پتا

ہے جب تم نے مجھے نور کا خیال رکھنے کا بولا اور تمہاری سانس رکنے لگیں تو میرے دل نے بس کسی معجزے کی دعا مانگی اور سننا ہے اللہ پاک ٹوٹے ہوئے دلوں کی دعا نہیں رد نہیں کرتا، اُس کی نصیحتوں پہ اپنی ساری افسرداری ایک سائیڈ پر رکھتے معاذ نے اُس وقت کو یاد کیا۔ ”ہاں ہاں جانتا ہوں یہ بات تم مجھے ان دو سالوں میں کوئی ہزار بار بتاچکے ہو کہ اگر تم بروقت ڈاکٹر کونہ بلا تے اور وہ میرے خون کو پتلا کرنے کے لیے فوراً نجیکش نہ لگاتے تو میں کب کا اوپر پہنچ چکا ہوتا، ویسے جب ڈاکٹر کو پتا تھا کہ میری نسوں میں خون گاڑھا ہونے کی وجہ سے جم چکا ہے تو انہوں نے پہلے کیوں نہیں میراٹھیک سے علاج کیا؟ اُس کی بات کا جواب دیتے زارون نے کافی دنوں سے دماغ میں چلتا سوال معاذ سے کیا۔

”دماغ خراب تھا ڈاکٹر ز کا اس لیے انہیں سمجھ ہی نہیں آئی کے اصل مسئلہ کیا ہے وہ تو احمد بروقت دوسرے سینئر ڈاکٹر کونہ بلا تا تو پتا نہیں کیا سے کیا ہو جاتا، اُس وقت زارون کی حالت یاد آتے ہی معاذ نے خوف سے جھر جھری لی اور پھر سے اُس کے گلے لگا۔

”تمہیں کھونے کی تکلیف یاد آتی ہے تو مجھے اپنی محبت کا کھو جانا بے معنی لگتا ہے، ایسا محسوس ہوتا کہ یہ درد اور اڑیت اُس تکلیف کے آگے کچھ بھی نہیں ہے جو میں نے اُس مشین پر تمہاری رکتی ہوئی

سانسون کو دیکھ کر محسوس کی تھی، اُسے اپنے سینے میں بھینچتے معاذ نے اپنی آنسوؤں سے ڈگ گاتی ہوئی آنکھوں کو بند کیا۔

”میں نے اُس دن سیکھا کہ اپنے کسی رشتے کو یوں آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لیے کھو دینے کی تکلیف سے بڑھ کر دنیا کی کوئی بھی تکلیف کوئی و قوت نہیں رکھتی اس لیے تم فکرناہ کرو میں اپنے آپ کو، ہتھ جلد سنبھال لوں گا“، نم آنکھوں سے مسکراتے معاذ نے اُسے اپنے لیے فکر مند دیکھ کے تسلی دی۔

”ہم تمہارے لیے بہتر بھی یہی ہے کیوں کہ امی اور ابو واپس آتے ہی تمہارے بارے میں ایک اہم فیصلہ کرنے کاراداہ رکھتے ہیں“، اُس کا چہرہ صاف کرتے زارون نے تجسس پھیلاتے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔۔۔

”کیسا فیصلہ؟“

”تمہاری شادی کا فیصلہ وہ بھی علیزے کے ساتھ، دراصل ابو اور امی جانے سے پہلے ماموں اور ممانی سے بات کر چکے ہیں اور انہیں بھی اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں“، زارون نے ایک اہم راز سے پر دھٹایا تو معاذ کا منہ حیرت سے کھولا کا کھولارہ گیا۔

”علیزے سے؟ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میرا مطلب وہ تو مجھ سے کافی چھوٹی ہے،“ علیزے کا نام پہ ایک دم سے اچھلتے معاذ نے سوالیہ نظرؤں سے اُسے دیکھا۔

”پہلی بات کہ وہ چھوٹی نہیں ہے اور دوسری بات اور اہم بات میں نے حتباً بھی کی زبانی سناتھا کہ وہ تمہیں پسند کرتی ہے اسی لیے ممانی نے کسی اعتراض کے بغیر اس رشتے کے لیے ہاں کر دی۔

”پسند اور مجھے؟ پاگل ہو گئے کیا تم؟“ معاذ جو علیزے کی نظرؤں سے کئی بار یہ بات محسوس کر چکا تھا اُس نے زارون کی بات کی تردید کرنے کے ساتھ ہی اپنے دل کو بھی ڈپٹا۔

”جی بالکل، یہ بات اُس نے خود حتباً بھی کو بتائی تھی وہ بھی تب جب شاستہ ممانی اُس کا رشتہ کہیں اور طے کرنی والی تھیں،“ زارون نے بات کی تصدیق کرنے کے ساتھ ہی ایک اور انکشاف کیا تو معاذ نے حیرت زدہ سی نظرؤں سے اُسے دیکھا۔

”دیکھو معاذ ہو سکتا ہے علیزے تمہارے لیے رابعہ سے کہیں زیادہ بہتر ثابت ہواں لیے پلیز اُسے وہ تکلیف مت دینا جو تم خود اس وقت محسوس کر رہے ہو،“ اُس کی خاموشی پہ زارون نے اُس کے ہاتھ پہ ہلاکا ساد باوڈا لتے تاکید کی اور اُسے سوچوں میں گم چھوڑ کے اٹھ کر باہر کی جانب بڑھاتا کہ وہ اس معاملے میں اپنے دل اور دماغ کو اپنی مرضی سے قائل کر سکے۔

-----

”نور تم یہاں اتنی سردی میں کیوں بیٹھی ہو؟“ اپنے کمرے میں داخل ہوتے ہی زارون نے اُسے سامنے بالکونی میں بیٹھاد کیکھ اُس کی جانب قدم بڑھائے۔

”ویسے ہی بس نیند نہیں آرہی تھی تو یہاں آگر بیٹھ گئی“، اُس کی آواز سنتے ہی اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

”نیند کیوں نہیں آرہی؟ کیا ہوا ہے طبیعت ٹھیک ہے؟“ اُس کے قریب آتے اُس نے نیچے زمین پہ بیٹھتے فکر مندی سے پوچھا۔

”جی ٹھیک ہوں میں اور آپ نیچے کیوں بیٹھ گئے ہیں، انھیں چھیر پہ بیٹھیں“، اُسے یوں زمین پہ بیٹھنا دیکھ نور نے اُس کی بات کا جواب دینے کے ساتھ ہی ٹوکا۔

”بس دل ہے میرا اس لیے بیٹھا ہوں“، کہنے کے ساتھ ہی زارون نے اُس کی گود میں سر رکھا۔  
”معاذ بھائی جاگ رہے تھے کیا؟“ اُس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے نور نے اُس کے اتنی دیر نیچے رکنے پہ سوال کیا۔

”ہاں ہمارا ہی انتظار کر رہا تھا“، اصل بات بتانے کی بجائے زارون نے مختصر اجواب دیا۔

”زار آپ کو کیا لگتا ہے؟“

”کس بارے میں؟“

”یہی کہ بے بی لڑکا ہو گایا لڑکی؟“ نور نے نظروں میں تجسس لیے سوال کیا۔

”اُفف جان جو بھی ہو بس تم دعا کرو کہ اللہ پاک ہمیں صحت مندا اور نیک اولاد عطا کرے“، اُس کے ہر روز پوچھے جانے والے سوال پر زارون نے ہمیشہ کی طرح لفظوں کے رد و بدل کے ساتھ وہی جواب دیا۔

”پرمجھے پیٹا چاہیے پتا نہیں مجھے بیٹیوں سے بہت ڈر لگتا ہے“، گاڑی میں کی جانے والی بات کو ایک بار پھر سے دھراتے نور نے اپنی فکر ظاہر کی۔

”کیوں ڈر لگتا ہے اور بھلا کوئی رحمت سے بھی ڈرتا ہے کیا؟“ ڈرنا تو نعمت سے چاہیے جس کے بارے میں سوال ہو گا“، گزرتے دنوں کے ساتھ نور کے دماغ میں بیٹی کو لے کر بڑھتی کشمکش پر زارون نے بڑے پیارے اُسے سمجھایا۔

”ڈر مطلب مجھے خوف آتا ہے کہ زندگی کے کسی موڑ پر ہم اپنی بیٹی سے بد گمان نہ ہو جائیں۔ پتا نہیں کیوں میرے دل میں یہ خدشہ پیدا ہو رہا کہ جو کچھ زندگی میں میرے ساتھ ہو اللہ نہ کرے اگر میری بیٹی کے ساتھ ہوا تو؟“

”کیسی فضول باتیں کر رہی ہو؟ میں نے تمہیں پہلے بھی سمجھایا تھا کہ ایسے وہم اپنے دل میں لانے سے افیت اور پریشانی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا، بس اپنی اولاد کے نیک نصیب کی دعا کرو، باقی جو ہو گا ان شاء اللہ اچھا ہو گا“، اُس کی بات کمل ہونے سے پہلے ہی زارون نے سر اٹھاتے اُسے ڈانٹنے کے ساتھ ساتھ سمجھایا۔

”ہونہہ بیٹی ابھی دنیا میں آئی نہیں ہے اور آپ نے پہلے ہی اُس کی طرف داری شروع کر دی ہے، جب وہ دنیا میں آجائے گی تو آپ تو مجھے ڈانٹ ڈانٹ کر رہی مار دیں گے“، اُسے کسی اور کسی سائیڈ لیتا دیکھ نور نے دماغ سے ہر بد گمانی جھٹکتے خفگی سے کہا۔

”ہاں توجہ تم بار بار میری بیٹی سے پریشان ہو گی تو میں ایسے ہی تمہیں ڈانٹوں گا“، بھنوئیں اچکاتے زارون نے اُسے اپنے ارد اے سے آگاہ کیا۔

”زار میں آپ کو بتار ہی ہوں اگر آپ نے بچے کے آتے مجھے اگنور کیا یا آپ نے مجھ سے زیادہ اُسے پیار دیا تو میں آپ کا گلاد بادوں گی“، اُس کے ارد اے سنتے ہی نور نے غصے سے دھمکی دی تو زارون نے اُس کے جلنے پہ ایک زور دار قہقهہ لگاتے اُس کی پریشانی پہ بوسہ دیا جو آنکھیں موندیں اُس کے لمس کو محسوس کرتے اللہ کا شکر ادا کرنے لگی کہ اُس نے اُس کی دعاؤں کو رد نہیں کیا تھا۔ ”تمہیں

پتا ہے تم میرا عشق ہو، میرا جنون میں بھلام سے زیادہ پیار کسی کو کر سکتا ہوں؟“، باری باری اُس کی بند آنکھوں پہ بوسہ دیتے زارون نے سوال کرتے اپنی بات کی تصدیق چاہی۔

”کرتونہیں سکتے مگر آپ جیسے بد تمیز انسان کا کوئی بھروسہ بھی نہیں“، نظروں میں شرارت لیے نور نے آنکھیں کھولتے براہ راست اُس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”مطلوب تمہیں ابھی بھی میرا یقین نہیں؟ حد ہے لوگ سچ کہتے ہیں شوہربیوی کے لیے جان بھی دے دے تو وہ تب بھی کہے گی کہ آپ کے مرنے کا سائل مجھے کچھ خاص پسند نہیں آیا“، بد مزہ ہوتے زارون نے منہ بسورا تو نور اُس کی بات پہ کھلکھلاتے ہوئے مسکراتی۔

”ایسے ہی مسکراتی رہا کرو چھی لگتی ہو“، اپنے دونوں ہاتھ اُس کے دائیں اور باعینیں رخسار پہ رکھتے زارون نے اُس کی ناک پہ بوسہ دیا جو سردی سے سرخ ہو رہی تھی۔

”آپ کو پتا ہے؟“ اُسے ایک دم سے سنجیدہ ہوتے دیکھ نور نے بھی لب سیکڑے سوال کیا۔ ”کیا؟“ پیچھے ہوتے زارون نے نرمی سے اُس کے باعینیں رخسار کو سہلا کیا۔

”یہی کہ میری اور رضا کی شرط لگی ہے“، نظروں میں فکر لیے نور نے اُسے ایک اہم اطلاع دی۔ ”شرط؟ کس بات کی؟“ ناممتحنی سے اُس کی جانب دیکھتے زارون نے سوال کیا۔

”وہ رضاماما سے بول رہا تھا کہ بھانجی ہو گی مگر میں نے کہا نہیں لڑکا ہی ہو گا تو اس نے مجھ سے شرط لگائی وہ بھی پورے پانچ ہزار کی، پلیز زار آپ دعا کریں نا اس بار بے بی بوائے ہو جائے اگلی بار بے شک اللہ پاک ہمیں بیٹی دے دیں“، نور نے اُسے پوری بات تفصیل سے بتائی تو زارون نے اپنا سر پکڑا۔

”یہ بھی کوئی شرط لگانے والی بات تھی؟ حد ہے شرم کرو بھائی سے ایسی شرطیں لگاتے ہوئے، افف تم اور رضا کبھی بڑے نہیں ہو سکتے“، اُس کی عقل پہ افسوس کرتے زارون نے آنکھیں سکیرٹے اُسے گھورا جو اُس کی ڈانٹ سنتے بُرے بُرے منہ بنارہی تھی۔

”بُرے ہیں آپ، حد ہے کبھی کہتے بڑی ہو گئی ہو اور کبھی کہتے کہ بڑی نہیں ہو سکتی، ایک جگہ رکیں ناتا کہ مجھے سمجھ آئے کہ مجھے بڑے ہونا ہے یا چھوٹے رہنا ہے“، اُس کی بات پہ منہ پھلاتے نور نے خفاسی نظر اُس پہ ڈالی جواب اُس کے غصے پہ مسکرا رہا تھا۔

”بڑی ہی رہو پر کبھی کبھی شرار تیں کر لیا کرو کیوں کہ میں تمہاری سنجیدگی زیادہ دیر تک براشت نہیں کر سکتا وہ دراصل تم کچھ دیر کے لیے عقل مندی کی با تیں کرو تو میرے سر میں درد ہونے لگ جاتا ہے اس لیے پلیز تم پہلے جیسی ہی رہو“، اپنے دونوں ہاتھ اُس کے سامنے جوڑتے زارون

نے اتجاء کی تو نور کو سمجھ نہیں آیا کہ اُس کی تعریف کی ہے یا بے عزتی اسی لیے کوئی بھی تاثر دیے بغیر اُس نے خاموشی میں ہی بھلانی سمجھی۔

”کیا ہوا؟ یار سچ میں، میں نے اس بار تعریف کی نیت سے ہی یہ بات کی ہے“، اُس کے چہرے پہ اجھن دیکھ زارون نے اپنی مسکراہٹ چھپاتے وضاحت دی۔

”بھاڑ میں جائیں آپ، حد ہے میں اتنی بھی پاگل نہیں ہوں کہ یہ نہ سمجھ سکوں کہ آپ میری تعریف کر رہے ہیں یا بے عزتی“، اُس کے اس قدر صحیح اندازے پہ ایک دم سے بوکھلاتے نور نے وہاں سے اٹھنا چاہا۔

”کہاں جا رہی ہو؟ بیٹھی رہو ناکچھ دیر باقیں کرتے ہیں“، اُس کا ہاتھ تھامتے زارون نے خود دوسری چیز پہ بیٹھتے اُسے اپنی گود میں بٹھایا۔

”آپ کو یاد ہے؟“

”کیا؟“

”یہی کہ جس دن آپ کا آپریشن تھا تو ڈاکٹر زنے کہا تھا کہ بس کامیابی کے تیس فیصد تک امکان ہیں۔ پتا ہے آپ کو؟ آپ کتنا گھبرائے ہوئے تھے پر میں نے اُس وقت بھی آپ سے ایک بات کہی

تھی اور اب بھی کہہ رہی ہوں کہ مجرزے اسی دنیا میں ہوتے ہیں اس لیے نامید ہو کر یہ سوچ لینا کہ یہ لفظ صرف کتابوں تک محدود ہے، انسان کی سب سے بڑی بے وقوفی ہے، ایک ہاتھ اس کے چہرے پر رکھتے نور نے نظروں میں محبت لیے اپنی بات مکمل کی۔

”یاد ہے، مجھے ہر بات از بر ہے۔ کیا انسان خود پہ بیتی وہ تکلیف بھول سکتا ہے جس کی وجہ سے اُس نے اتنی اذیت برداشت کی ہو؟“ لبھ کی تلخی کو اپنی دھیمی آواز میں چھپانے کی ناکام کوشش کرتے زارون نے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا۔

”مجھے لگتا ہے ہمیں اُن تکلیفیں کو اذیت کے لیے نہیں بلکہ ایک سبق کے طور پر یاد رکھنا چاہیے تاکہ ہم اپنے رب کا شکر ادا کر سکیں کہ اُس نے اگر ہم پہ آزمائش ڈالی تو اسے اپنی رحمت سے ختم بھی کیا، ہماری التجاویں اور دعائیوں کو سنتے ہمیں اُن تمام مصیبتوں سے با حفاظت نکالا جن کے آنے پر ہم ہر امید چھوڑ چکے تھے، جھک کر اُس کے بائیں رخسار پہ بو سہ دیتے نور نے چہرے پر مسکراہٹ سجائی تو زارون نے جلدی سے دوسری طرف چھرہ کیا۔

”ایک یہاں بھی کر دو“، اپنی دائیں رخسار کی جانب اشارہ کرتے اُس نے ماحول پر چھائی افسردگی کو دور کرنے کی کوشش کی۔

”ہونہے زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں ہے وہ تو میں نے ویسے ہی کی تھی“، ہاتھ اُس کے چہرے پر رکھتے سیدھا کرتے نور نے سروالپس اُس کے سینے پہ لٹکایا۔

”عشق ہو تم میرا زار کا عشق“، جھک کر اُس کی آنکھوں میں دیکھتے زارون نے ایک بار پھر سے اظہار محبت کیا تو اب کی بار نور نے جواب میں اُس کے دل کے مقام پہ بوسہ دیا جو صرف اُس کے لیے دھڑکتے اُسے یہ کہنے پہ مجبور کر گیا تھا کہ پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھੰٹاؤ گے۔

ختم شد

جملہ حقوق بحق مصنف اور راہ ادب رائٹر زایسو سی ایشن آف پاکستان محفوظ ہیں۔ بن اجازت ناول نقل کرنے والے کے خلاف کا پی رائٹ ایکٹ کے تحت سائبر کرامہ سے رجوع کیا جائے گا۔